جلد ۲

مرتب

ڈاکٹر نواز دیوبندی

سوانح علمائے دیوبند
جلد دوم
مرتب
ڈاکٹر نواز دیوبندی
ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی
نواز پبلی کیشنز دیوبند
toobaa-elibrary.blogspot.com

نام کتاب : سوانح علمائے دیوبند جلد دوم

مرتب : ڈاکٹر نواز دیوبندی

کمپیوٹر کتابت : نواز پبلی کیشنز دیوبند

سن اشاعت : جنوری ۲۰۰۰ء

باہتمام : اشرف عثمانی

ہدیہ : Rs. 164/-

رابطہ :

نواز پبلی کیشنز دیوبند
ضلع سہارنپور یوپی
انڈیا۔ 247554

Phone. 01336-(Off)24824
(Fax) 22822 (Resi) 22822

Nawaz Publications Deoband
Distt. Saharanpur U. P. India Pin - 247554

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

توضیحات

دار العلوم دیوبند

اور

اس کے ہم مشرب دینی اداروں کے مؤسسین،
اکابرین اور علماء وفضلاء کے حالات، مجاہدات، خدمات
اور بے مثال کارناموں کا قابل قدر اور وقیع وزریں سلسلہ،
اکابر دیوبند کی سوانح کا ایک حسین مجموعہ، جس میں ان
علماء کے مفصل حالات زندگی بھی موجود ہیں
جن کی سوانح ابھی تک نامکمل اور
تشنہ قلم رہی ہیں۔

سوانح علمائے دیوبند جلد اوّل کی شخصیات

شخصیات

- حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ
- حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ
- حضرت مولانا محمد مظفر حسین کاندھلویؒ
- حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ
- حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ
- حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ
- حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ
- حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ
- حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ
- حضرت مولانا مظہر نانوتویؒ
- حضرت مولانا احسن نانوتویؒ
- حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

سوانح علمائے دیوبند جلد دوم کی شخصیات

شخصیات

تشکرات

الحمدللہ پیش نظر کتاب سوانح علمائے دیوبند کے سلسلے کی دوسری جلد ہے جلد اول آپ پہلے ملاحظہ فرما چکے ہیں، غیر ضروری طوالت اور اختصار سے گریز کرتے ہوئے اس بات کا پورا لحاظ رکھنے کی کوشش کی ہے کہ ہر شخصیت سے متعلق مضمون مفصل اور جامع ہو۔ اور اس شخصیت کا اصلی جوہر سامنے آسکے۔

حالانکہ جن نفوس قدسیہ کی سوانح کا یہ سلسلہ ہے ان میں ہر فرد ایک انجمن اور ہر شخص ایک ادارہ ہے۔ ایک ایک شخص نے دین ودُنیا کی ایسی اور اتنی خدمات انجام دیں کہ اداروں کو رشک آئے اور جماعتیں تعجب کریں۔

مجھے اپنی نااہلی اور کم علمی کے ساتھ ساتھ اس مہتم بالشان موضوع کی عظمت کا بھی مکمل احساس ہے کہ یہ کام اہل علم اور صاحبان قلم کا تھا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدۂ شکر بجالاتا ہوں کہ اس نے اس کام کے لئے میرا انتخاب کیا اور اپنی رحمت کاملہ سے پہلی جلد کے بعد دوسری جلد کا کام بھی مکمل کرادیا۔ الحمدللہ!

دیگر جلدیں طباعت کے مراحل میں ہیں دعاء فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ اور میری تمام لغزشوں اور کوتاہیوں کو درگزر فرمائے۔ آمین ثم آمین

(ڈاکٹر) نواز دیوبندی

سوانح علمائے دیوبند

حجۃ الاسلام

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

فہرست

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

مولانا عبد الرشید ارشد

حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ پر یہ مضمون حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی تالیف سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد سرفراز صاحب صفدر گکھڑوی کی کتاب "بانی دارالعلوم دیوبند"، مفتی عزیز الرحمٰن کی تالیف تذکرۂ مشائخ دیوبند اور عظیم مدنی نمبر سے ماخوذ ہے ہمارا کام صرف ترتیب ہے۔

نام و ولادت

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا تاریخی نام خورشید حسن ہے۔ آپ ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دوست حضرت مولانا محمد یعقوب مؤلف سوانح عمری مولانا محمد قاسم فرماتے ہیں، مولانا صاحب کی پیدائش کا سن مجھے ان کے تاریخی نام سے معلوم تھا مہینہ یاد نہیں تھا ربیع الثانی یا جمادی الثانی ذہن میں تھا جن حضرات کے بارے میں خیال تھا کہ ان سے مہینہ اور تاریخ معلوم ہو جائے گی وہ بھی ناواقف نکلے۔ ایک صاحب نے پندرہویں شعبان کہا۔ مگر اعتبار نہ آیا ایک نے ۱۹ر رمضان المبارک اور ایک صاحب نے ۲۷ر محرم تاریخ ولادت بتائی۔ یہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوئی۔

نسب نامۂ خاندان

مولانا کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحب تھے۔ جو بامروت و صاحب اخلاق، کنبہ پرور، مہمان نواز، نمازی و پرہیزگار تھے۔ مولانا مملوک علی صاحب کے ساتھ دہلی جاکر شاہنامہ وغیرہ بھی پڑھی تھیں۔ ان کی عمر کا زیادہ حصہ کھیتی باڑی میں گزرا۔ مولانا محمد قاسم کے دادا شیخ غلام شاہ تھے۔ ان کی بھی تعلیم زیادہ نہ تھی مگر بڑے ذاکر و شاغل بزرگ تھے۔ درویشوں کی خدمت

کرتے تھے خواب کی تعبیر دینے میں مشہور تھے۔ مولانا محمد قاسم صاحب کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔ مختصر نسب نامہ یہ ہے محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش بن علاؤالدین بن فتح محمد بن محمد مفتی بن عبدالسمیع بن مولوی ہاشم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ۔(۱)

ابتدائی تعلیم وغیرہ

مولوی محمد ہاشم شاہجہاں بادشاہ کے دور میں مقرب شاہی تھے، چند دیہات اور مکان جاگیر میں تھے۔ لیکن تغیرات زمانہ نے خاندان والوں کے پاس کچھ نہ چھوڑا۔ مولانا محمد قاسم بچپن ہی سے ذہین، طباع، بلند ہمت، تیز، وسیع حوصلہ، جفاکش، جری اور چست تھے، مکتب میں اپنے ساتھیوں میں ہمیشہ اوّل رہتے تھے۔ قرآن مجید بہت جلد ختم کرلیا تھا۔ خط بھی سب ساتھیوں میں اچھا تھا۔ شاعری کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ اپنے کھیل اور بعض قصے نظم کرلیا کرتے تھے، حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا ننہیالی رشتہ مولانا محمد قاسم کے خاندان سے ملتا تھا اور حضرت کی بہن نانوتہ میں بیاہی ہوئی تھیں، آپ اسی وجہ سے اکثر اپنی بہن سے ملنے نانوتہ تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سے جلد سازی سیکھی تھی۔ اپنی اپنی کتابوں کی جلد خود باندھ لیا کرتے تھے۔ نانوتہ میں آپ کے خاندان میں ایک ایسا قضیہ پیدا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے آپ کو نانوتہ سے دیوبند بھیجا گیا شیخ کرامت حسین کے گھر پر شیخ نہال احمد صاحب پڑھتے تھے مولوی صاحب کو انہوں نے عربی پڑھائی۔ پھر سہارنپور اپنے نانا کے پاس آگئے۔ وہاں مولوی محمد نواز صاحب سہارنپوری سے کچھ پڑھا، فارسی عربی کی ابتدائی کتابیں حاصل کیں۔ اس کے بعد مولانا مملوک علی صاحب کے ہمراہ ۲؍محرم ۱۲۶۰ھ کو دہلی پہنچے۔ مولانا نے کافیہ شروع کی، معقول کی مشکل کتابیں میرزاہد، قاضی، صدرا، شمس بازغہ ایسے پڑھا کرتے تھے جیسے حافظ فرفرسناتا ہے۔ حدیث آپ نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب سے تحصیل کی۔ اسی زمانہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے،(۲) مولوی مملوک علی صاحب نے آپ کو مدرسہ عربی یعنی دہلی کالج میں داخل کیا اور مدرس ریاضی کو فرمایا کہ ان کے حال پر معترض نہ ہونا۔ میں ان کو پڑھادوں گا۔ اور مولانا نے فرمایا کہ تم اقلیدس کو دیکھ لو اور حساب کے قواعد کی مشق کرلو۔ چند روز کے بعد مشہور

(۱) تذکرہ علماء ہند، ص ۲۱۰
(۲) سوانح عمری مولانا محمد قاسم، ص ۷

ہوا کہ مولانا محمد قاسم نے حساب پورا کر لیا ہے۔ اور مقالے بھی دیکھ لئے۔ چنانچہ مفتی ذکاءاللہ صاحب کسی ماسٹر کے بتائے ہوئے چند سوال لائے جو نہایت مشکل تھے، مولانا سے پوچھے تو آپ نے فوراً حل کر دیئے، اس سے آپ کی حساب دانی کی بڑی شہرت ہوئی، دہلی کالج سے امتحان دیئے بغیر علیحدہ ہو گئے تھے۔ اور مطبع احمدی میں کتب کی تصحیح فرمانے لگے تھے۔ ۱۲ر ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو آپ کے استاذ مکرم مولانا مملوک علی صاحب کا انتقال ہو گیا تو آپ اپنے استاذ زادہ مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس مقیم ہو گئے۔ مولانا مملوک علی صاحب کا مکان کوچہ چیلان میں تھا۔

حاشیہ بخاری شریف

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد کے بعد ایک سال دہلی میں رہے، جب اجمیر میں ملازمت مل گئی تو اجمیر چلے گئے، مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اجمیر جانے کے کچھ دن بعد مولانا محمد قاسم نے مطبع احمدی میں سکونت اختیار کر لی پھر دار البقا میں چند روز رہے۔ اسی زمانہ میں مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سہارنپوری نے تحشیہ بخاری کا کام شروع کر رکھا تھا پانچ چھ پارے آخر کے رہ گئے تھے، وہ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کر دیئے۔ مولانا نے ان کو لکھا اور قابل رشک لکھا۔ لیکن بعض لوگوں نے اعتراض کیا اور مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا آپ نے یہ کیا کام کیا۔ آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کر دیا۔ اس پر مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بغیر سوچے سمجھے ایسا کروں اور پھر مولوی صاحب کا تحشیہ انہیں دکھلایا۔ تب لوگوں نے مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی قابلیت کو سمجھا اور جانا۔ یہ پارے بخاری میں اور پاروں سے مشکل ہیں خاص طور پر مذہب حنفیہ کا جو التزام ہے اس جگہ پر امام بخاری نے حنفیہ پر اعتراض کئے ہیں ان کے جواب لکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ اس حاشیہ میں یہ بھی ضروری تھا کہ کوئی بات بلا سند کے نہ لکھی جائے۔(۱)

---

(۱) آج تک برصغیر پاک و ہند میں بخاری شریف جتنی دفعہ جہاں کہیں چھپی ہے۔ اسی حاشیے کے ساتھ چھپی ہے۔ دارالعلوم کے علاوہ [illegible]

بچپن کا ایک خواب

آپ نے ایام طفلی میں یہ خواب دیکھا تھا کہ گویا میں اللہ جل شانہ کی گود میں بیٹھا ہوا ہوں۔ تو ان کے دادا نے (جو تعبیر خواب میں مشہور تھے) یہ تعبیر بتائی کہ تم کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے گا اور بہت بڑے عالم ہوگے۔ (۱)

حضرت مولانا جیسے پڑھنے میں سب سے بڑھ کر رہتے تھے ہر کھیل میں خواہ ذہانت کا ہو خواہ محنت کا سب سے اول اور غالب رہتے تھے۔ خوب یاد ہے کہ اس زمانہ میں ایک کھیل جوڑ توڑ نام کا ہم کھیلتے تھے اور بہت پرانے مشاق لوگ اس کو عمدہ کھیلتے تھے، اور ہم نئے کھیلنے والے مات کھا جاتے تھے۔ مولانا نے جب اسکا قاعدہ معلوم کرلیا۔ پھر یاد نہیں کسی سے مات کھائی ہو بہت ہوا تو برابر رہے۔ بلکہ ہر کھیل میں جو مرتبۂ کمال ہوتا تھا وہاں تک اس کو پہنچا کر چھوڑتے (۲)

طالب علمی میں ایک خواب

ایام طالب علمی میں آپ نے ایک اور خواب دیکھا تھا کہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور مجھ سے نکل کر ہزاروں نہریں جاری ہو رہی ہیں۔ اپنے استاد مولانا مملوک علی ؒ (۴) سے ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ تم سے علم دین کا فیض بکثرت جاری ہوگا (۳) اور اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ دارالعلوم دیوبند نے برصغیر پاک وہند میں خصوصاً پورے عالمِ اسلام میں عموماً جو کتابؐ وسنت وفقہ کی اشاعت کی ہے اس کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ توحید و رسالت، خدا خوفی اور فکر آخرت پیدا کر کے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کو باخدا بنادیا۔ معاشرتی اور تمدنی زندگی حقوق العباد کا صحیح جذبہ پیدا کیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ کسی بھی حال میں اسلام کے تیرہ سوسالہ تسلسل اور اسلاف کی وابستگی میں سرمو فرق نہیں آنے دیا۔ دارالعلوم دیوبند اور اس کی شاخوں سے کسبِ فیض کرنے والے علماء وفضلاء کی اگر فہرست تیار

---

(۱) سوانح عمری مولانا محمد قاسم ؒ از مولانا محمد یعقوب نانوتوی ؒ ص ۳۔

(۲) سوانح عمری مولانا محمد قاسم ؒ از مولانا محمد یعقوب نانوتوی ؒ، ص ۵۔

(۳) مولانا مملوک علی ؒ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی ؒ کے والد اور حضرت گنگوہی ؒ، حضرت نانوتوی اور سرسید احمد خاں مرحوم کے استاد تھے۔

(۴) سوانح عمری مولانا محمد قاسم ؒ

ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔ میں کہتا ہوں اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا، جو کمالات تھے وہ کس قدر تھے کیا ان میں سے ظاہر ہوئے اور آخر سب کو خاک میں ملا دیا۔ اپنا کہنا کر دکھلایا مسئلہ کبھی نہ بتلاتے کسی کے حوالے فرماتے، فتویٰ پر نام لکھنا اور مہر کرنا تو درکنار اول امامت سے بھی گھبراتے، آخر کو اتنا ہوا کہ وطن میں نماز پڑھا دیتے تھے۔ وعظ بھی نہ کہتے، جناب مولوی مظفر حسین صاحب مرحوم کاندھلوی (جو اس آخری زمانہ میں قدماء کے نمونہ تھے) نے اول وعظ کہلوایا اور خود بھی بیٹھ کر سنا اور بہت خوش ہوئے(۱)

والد کی شکایت

مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے والد کی معاشی حالت بہت اچھی نہ تھی ان کو رنج تھا کہ میرے بھائی پڑھ کر نوکر ہو گئے، کوئی پچاس کا، کوئی سو کا، کوئی کم کوئی زیادہ سب خوش وخرم ہیں۔ آپ نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے شکایت کی کہ بھائی میرے تو یہی ایک بیٹا ہے اور مجھے اس سے کیا کچھ امیدیں تھیں، کچھ کماتا تو ہمارا یہ افلاس دُور ہوتا، تم نے اس پر خدا جانے کیا کر دیا نہ کچھ کماتا ہے اور نہ نوکری کرتا ہے۔ حضرت اس وقت تو ہنس کر چپ ہو گئے، پھر کہلوا کر بھیجا کہ قاسم کو وہ مرتبہ ملے گا کہ وہ سو پچاس والے سب اس کی خدمت کریں گے۔ اور ایسی شہرت ہوگی کہ اس کا نام ہر طرف پکارا جائے گا، اور تم تنگیٔ معاش کی شکایت کرتے ہو خدا تعالیٰ بے نوکری ہی اسے اتنا دیگا کہ ان نوکروں سے اچھا رہیگا۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم کے والد کی حیات ہی میں مالی حالت ایسی ہوگئی کہ شکایت نہ رہی۔

نکاح، سخاوت ومہمان نوازی

آپ کے والد ماجد کو بڑی فکر تھی کہ کچھ ذریعہ معاش اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی نکاح کرتے ہیں، بالآخر آپ کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا۔ حاجی صاحب نے حکم دیا تو ناچار نکاح پر راضی ہو گئے۔ مگر شرط یہ لگائی کہ میرے ساتھ جیسی حالت میں ہوں گا بیوی رہے گی۔ غربت ہو یا تنگدستی سسرال نے یہ شرط قبول کی، ایک چھاپہ خانہ میں پانچ روپے ماہوار پر تصحیح کا کام کرنے لگے۔ مزاج میں مہمان نوازی اور سخاوت۔ بچے کیا؟ جب گھر آتے تو

(۱) سوانح عمری مولانا محمد قاسم ص ۹،۸

مہمان بہت آتے بالآخر بیوی کی اجازت سے اس کا زیور فروخت کر دیا(۱)۔ وہ بھی نہایت تابعدار تھیں پہلے والدین کی بے حد خدمت کی بعد میں شوہر کی۔ آخر میں اللہ جل شانہ نے کشادگی عنایت فرمائی تو جو کچھ ہوتا بیوی کو لا کر دیتے اور بیوی بھی ایسی کشادہ دست کہ حضرت مولانا کے جب کوئی مہمان آتا اسی وقت کھانا پکا کر کھلاتیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مہمان آیا اور فوراً کھانا نہیں ملا، خود فرمایا کرتے کہ ہماری سخاوت احمد کی والدہ کی بدولت ہے۔ جو میں قصد کرتا ہوں وہ مہمان نوازی میں بڑھ جاتی ہے، آپ نے لڑکپن میں ایک خواب دیکھا تھا کہ میں مر گیا ہوں، اور لوگ مجھے دفن کر آئے تب قبر میں حضرت جبرئیل تشریف لائے اور کچھ نگیں سامنے رکھے اور کہا یہ تمہارے اعمال ہیں، ان میں ایک نگین بہت خوشنما اور کلاں ہے۔ اس کو فرمایا کہ یہ علم حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ہے۔ اس خواب کی تعبیر یہی سخاوت تھی۔ (۲)

جہادِ آزادی کا آغاز

انگریزوں کے ہندوستان میں قدم رکھنے کے بعد علماء کے طبقے یعنی حضرت شاہ ولی اللہؒ نے یہ دیکھ کر کہ یہ دوسروں کے مذہبوں کو پامال کرنے اور عیسائی مذہب کو پھیلانے کیلئے شرمناک ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں، ان کی انسداد کی تدبیریں شروع کر دیں۔ اور ایک انقلابی جماعت کی داغ بیل ڈال دی چنانچہ اس جماعت کے تیسرے امام حضرت شاہ عبد الغنیؒ کے ۱۸۴۶ء میں انتقال کے بعد حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ چوتھے امام مقرر ہوئے، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ابتدا ہوئی یہ حضرات بھی تیار تھے۔ حضرت حاجی صاحب کے شریک کار مولانا

(۱) مہمانوں کی کثرت میں اخراجات کی زیادتی کے باعث جو زیور فروخت کرنے کی بات ہے یہ وضاحت طلب معلوم ہوتی ہے۔ سوانح قاسمی میں مستند حوالوں سے حضرت نانوتویؒ کی شادی کی جو تفصیلات تحریر کی گئی ہیں۔ ان میں صاف درج ہے کہ آپ نے بیوی کے جہیز کا سامان (قیمتی کپڑے، برتن اور زیورات وغیرہ) ان کی رضامندی سے چندۂ سلطانی میں دیدیا تھا۔ اور چونکہ آپ کے سسر شیخ کرامت حسین صاحب دیوبند کے رئیس تھے۔ اس لئے انہوں نے جب از سر نو پھر لڑکی کو مکمل جہیز دیا تو حضرت نے پھر یہی عمل دوہرایا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شادی کا زیور تو بیوی کے پاس تھا ہی نہیں .... ہو سکتا ہے کہ بعد میں ان کے والد نے وقتاً فوقتاً کچھ زیور دیدیا ہو یہ اسی کا ذکر ہو یا حضرت نے ہی ان کی دلجوئی کے لئے کچھ زیور دلوا رکھے ہوں۔ رہا یہ شبہ کہ اگر حضرت زیور بنواتے تو شروع میں چندہ ہی میں کیوں دلواتے؟ تو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ عمل حب مال اور عورتوں کی نفسیات کے مطابق خصوصاً حب زیورات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے ارادے سے اصلاح کے طور پر کیا گیا ہو۔ حضرت کی اہلیہؒ کے اس جملہ "اس کے بعد میرے قلب سے روپیہ پیسہ اور زیور وغیرہ کی محبت قطعاً نکل گئی" سے احقر راقم الحروف کے اس خیال کی تائید بھی ہوتی ہے۔ (محمد عمران قاسمی بگیانوی)

(۲) سوانح عمری مولانا محمد قاسم ص ۱۰۔۱۱ ملخصاً

رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے جہاد وحریت کے سلسلہ میں تبادلۂ خیال ہوا۔ مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بے سروسامانی کا ذکر فرما کر جہاد حریت کی مخالفت کی، مولانا قاسم نے فرمایا کہ ہم اصحاب بدر سے بھی زیادہ بے سروسامان ہیں؟ حضرت امیر امداد اللہ نے طرفین کی گفتگو سنی۔ فرمایا کہ الحمد اللہ انشراح ہوگیا، اور جہاد کی تیاری شروع کردی۔ امیر امداد اللہ نے امامت قبول کی اور مولانا نانوتوی سپہ سالار مقرر ہوئے۔ اور مولانا رشید احمد گنگوہی قاضی مقرر ہوئے، اسی طرح قصبہ تھانہ بھون دارالاسلام قرار پایا۔

میرٹھ کے بعد دہلی اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر جنگ آزادی چھڑ گئی تھی، ان حضرات نے بھی مورچہ لگایا۔ قاضی عنایت اللہ خاں اور ان کے چھوٹے بھائی عبدالرحیم ان کے ساتھ سہارنپور پہنچے اور سرائے میں ٹھہرے، ایک بنئے نے بتکھی صاحب سے جو انتظام سہارنپور پر مامور تھا مخبری کی کہ تھانہ کا رئیس بھی کمپنی سے باغی ہوگیا ہے۔ اس کا بھائی دہلی میں کمک بھیجنے کیلئے ہاتھی خریدنے آیا ہے اور کئی دن سے سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک گارد بسمت سرائے روانہ کیا گیا اور عبدالرحیم اور ان کے ساتھیوں کو قید کر کے جیل خانہ بھیج دیا اور ان لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا، اگلے دن قاضی عنایت اللہ خاں کو اپنے بھائی کی پھانسی کی اطلاع ہوئی یہ اپنے رفقاء اور رعایا کو چند فوجی سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوسوں کی کئی بہنگیاں لدوائے سہارنپور سے کیرانہ کی طرف جارہے تھے کہ قاضی صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی، وہ اپنے رفقاء اور رعایا کو ساتھ لے کر شیر علی باغ کی سمت سڑک پر جا پڑے۔ اور جس وقت وہ سوار سامنے سے گزرے ان پر حملہ کر کے میگزین چھین لیا۔ ایک سوار اس جنگ میں زخمی ہو کر بسمت جنگل بھاگا مگر تھوڑے ہی فاصلہ پر گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس واقعہ کی خبر مظفر نگر پہونچی تو حاکم ضلع کی طرف سے تھانہ پر فوج کشی کا حکم ہوگیا، جس پر عنایت علی خاں اور اس کے ساتھیوں نے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا، اس معرکہ میں حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ، مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ضامن رحمۃ اللہ علیہ ہمراہ تھے۔ بندوقچیوں سے مقابلہ ہوا یہ نبرد آزما جتھہ بھاگ جانے والا یا ہٹ جانے والا نہ تھا۔ اس لئے پہاڑ کی طرح جم کر مقابلہ پر ڈٹ گئے۔ اور دوسرا گروہ ہاتھوں میں تلواریں لئے بندوقچیوں کے سامنے ایسے جارہا تھا گویا زمین نے پاؤں پکڑ لئے۔ چنانچہ ان حضرات پر فائر ہوئے۔ اور حضرت حافظ ضامنؒ نے

زیر ناف گولی کھائی اور شہید ہوئے۔ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے جس نے دیکھا جانا کہ کنپٹی پر گولی لگی ہے اور دماغ پار کر کے نکل گئی۔ حضرت حاجی صاحب نے لپک کر زخم پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ کیا ہوا میاں، عمامہ اُتار کر سر جو دیکھا کہیں گولی کا نشان تک نہیں۔ تعجب یہ تھا کہ خون سے تمام کپڑے تر تھے، معرکۂ جنگ جاری ہے اسی گھمسان کے میدان میں حضرت حافظ ضامن شہید نے مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو پاس بلایا اور فرمایا کہ میاں رشید! میرا دم نکلے تو میرے پاس ضرور ہونا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ حافظ ضامن صاحب دھم سے زمین پر گر پڑے۔ معلوم ہوا کہ گولی کاری لگی اور خون کا فوارہ بہنا شروع ہوگیا، حافظ صاحب زخمی ہو کر گرے کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے لپک کر نعش کو کندھے پر اٹھالیا اور قریب کی مسجد میں لائے اور حضرت کا سر اپنے زانو پر رکھ کر تلاوتِ قرآن مجید میں مشغول ہوگئے۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہاں تک کہ حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا آپ کے زانوں پر وصال ہوگیا۔ اہل کاران تحصیل اس جنگ میں کام آئے اور خزانہ پر مجاہدین نے قبضہ کرلیا۔ جب کچھ سکون ہوا تو تھانہ بھون کو انگریزی فوج نے گھیرلیا اور شرقی جانب سے گولی باری شروع کی۔ دن نکلنے پر فوج قصبہ میں داخل ہوگئی اور قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوگیا، رات کی تاریکی چھانے سے پہلے شہر پناہ کے چاروں دروازے کھول دیئے گئے اور مکانات پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگادی گئی۔ اس کسمپرسی کے عالم میں لوٹ مار خوب ہوئی، غرض یہ کہ رات کی تاریکی ختم ہونے سے پہلے تھانہ بھون مٹی کا ڈھیر بن گیا تھا۔

گرفتاری کے وارنٹ

ان تینوں حضرات۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوگئے تھے کہ تھانہ بھون کے فساد میں شاملی کی تحصیل پر حملہ کرنے والے یہی لوگ تھے۔ تھانہ کی بستی کی دکانوں کے چھپرائیوں نے تحصیل کے دروازے پر چھپر جمع کئے اور ان پر آگ لگادی۔ یہاں تک کہ جس وقت آدھے کواڑ جل گئے ابھی آگ بجھنے نہ پائی تھی۔ ان نڈر مولویوں نے جلتی آگ میں گھس کر خزانہ لوٹ لیا۔

حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قصبہ میں مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

کو الوداع کہا اور حجاز جانے کے لئے روانہ ہو گئے۔ ان ایام میں مولانا محمد قاسم مرحوم احباب کے اصرار پر تین دن تک روپوش رہے۔

اتباعِ سنت در رُوپوشی

تین دن پورے ہوتے ہی ایک دم باہر نکل آئے اور کھلے بندوں چلنے پھرنے لگے لوگوں نے پھر بمنت روپوشی کیلئے عرض کیا تو فرمایا کہ تین دن سے زائد روپوش رہنا سنت کے خلاف ہے۔ کیونکہ جناب نبی کریم ﷺ ہجرت کے وقت غارِ ثور میں تین ہی دن تک روپوش رہے۔(۱)

قیامِ دارالعلوم دیو بند کے اسباب

دُنیا کا کوئی کام بغیر کسی سبب، داعیہ اور محرک کے معرض وجود اور منصۂ شہود پر نہیں آتا۔ ہم جب ٹھنڈے دل کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں سرہنری ایلیٹ کی مسخ شدہ تاریخ سے پہلے ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی تاریخ کسی اور صورت میں نظر آتی ہے۔ سیاست کی باتیں تو سیاسی حضرات بہتر جانتے ہیں کیونکہ لکل فن رجال ہم صرف مذہبی نقطۂ نظر سے یہ دیکھتے ہیں، کہ ہندوستان میں کم و بیش ایک ہزار سال تک مسلمانوں کی حکومت اور دور اقتدار رہا ہے، جس میں نہایت فراخدلی سے بلکہ بعض بادشاہوں کی طرف سے نرے ملحدانہ انداز میں ہر فرقہ اور اہل مذہب کو اپنے مذہب پر پابند رہنے اور مذہبی رسوم بجالانے کی کھلی آزادی تھی۔ جب گردش زمانہ سے سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہو گیا۔ اور اپنوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے ظالم اور جابر برطانیہ قہرالٰہی کی صورت میں ہندوستان پر آچکا تو اس کے مقابلہ کیلئے ہندوستان کی دیگر اقوام عموماً اور مسلمان خصوصاً میدان میں نکلے۔ اور عملی طور پر اس کے ساتھ جہاد کیا جس کو انگریز کے منحوس دور میں نمک خواران برطانیہ غدر ۱۸۵۷ء کیساتھ تعبیر کرتے رہے ہیں۔ اس جہاد میں کون کون حضرات شریک تھے۔ اور کس کس مقام پر لڑے؟ اور ہر مقام پر اسکا نتیجہ کیا برآمد ہوا" یہ اور اسی قسم کے دیگر کئی امور ہمارے حیطۂ امکان سے باہر ہونے کے علاوہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ ہمیں تو اثبات مدعا کیلئے بانیٔ دارالعلوم دیو بند اور ان کے چیدہ چیدہ بعض احباب واصحاب کا تذکرہ کرنا تھا کہ انہوں نے کس حد تک انگریز کے خلاف جہاد کیا۔ اور انگریز نے ان کے خلاف کیا رائے قائم کی اور اس وقت انگریز کے اہل ہند اور خصوصاً

(۱) سوانح قاسمی: ج ۲، ص ۱۷۲، ۱۷۳) مناظر احسن گیلانی

مسلمانوں کے خلاف کیا عزائم تھے۔ اور وہ ہندوستان میں کیا دیکھنا اور کرنا چاہتا تھا اور کس حد تک وہ کر چکا ہے، جب ہم تاریخ کے اس موڑ پر آتے ہیں اور تاریخ کے اوراق میں وہ دلگداز واقعات پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں۔ ہاتھ میں قلم لرزتا ہے، دل سیماب کی طرح بے قرار ہو جاتا ہے۔ سانس رکنے لگتا ہے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ سب واقعات تو تاریخ میں پڑھیے ہم "مشتے نمونہ از خروارے" چند حقائق کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں جن میں عقلمندوں کے لئے بڑی عبرت ہے۔ فاعتبروا یااولی الابصار۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

جب لاکھوں انسانوں پر برطانیہ یہ مظالم کر چکا تو بیرونی دنیا کی مزید بدنامی سے بچنے کے لئے اور اہل ہند پر اپنا فرعونی احسان جتلانے کی خاطر کچھ عرصہ بعد ہزاروں علماء کو تختہ پر لٹکانے۔ جلاوطن کرنے اور لاکھوں افراد کو تہ تیغ کرنے کے بعد کچھ جاری کردہ وارنٹ گرفتاری اور دیگر کئی سخت احکام واپس لے لئے گئے۔ اور اس طرح مظلوموں کی ظالم کے ہاتھ سے گلوخلاصی ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد اور ہنگامہ میں اہل ہند اس قدر حق بجانب تھے کہ خود ظالم انگریز اس کا اقرار کیے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ مسٹر لیکی اس ہنگامہ کے بارے میں اپنا یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جا سکتی ہے تو وہ ہندوستان کے ہندو مسلمان کی بغاوت تھی (بحوالہ حکومت خود اختیاری، ص ۴۲) اور اس ہنگامہ میں انگریز نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس کا بھی کچھ نمونہ دیکھتے جایئے۔

مسٹر رسل کا یہ مقولہ ہے کہ مسلمانوں کو خنزیر کی کھالوں میں سی دیا گیا اور قتل کرنے سے پہلے خنزیر کی چربی ان کے بدن پر ملی گئی اور پھر انہیں جلایا گیا۔ (۱)

ملاحظہ کیجئے کہ ظالم برطانیہ نے کس قدر سفاکانہ اور حیا سوز حرکتیں مسلمانوں پر روا رکھیں اور کس طرح ان کے بے گناہ خون سے ہولی کھیلی گئی، مگر بایں ہمہ مسلمان مردانہ وار اس ظلم کے سامنے ایمان سے بھرپور سینے تان کر پیش ہوتے رہے اور زبان حال سے یوں خطاب کرتے تھے کہ ؎

گئے وہ دن کہ ہمیں زندگی کی حسرت تھی
فضول قتل کی دیتا ہے دھمکیاں صیاد!

---

(۱) تمغہ کا دوسرا رخ - مخزنہ لیڈر زنامس ص ۴۸۰

عزائم برطانیہ

انگریز کو جب ہندوستان پر سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا تو شیخ چلی کی طرح اس کے دل میں خفتہ اور نہاں آرزوئیں اور ارادے زبان اور قلم کی نوک سے بھی ظاہر ہونے لگے۔

گورنر ہند لارڈ ایلن برانے ۱۸۴۳ء میں ڈیوک آف ولنگڈن کو لکھا ہے کہ:

"میں اس عقیدہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کی قوم اصولاً ہماری دشمن ہے، اس لئے ہماری حقیقی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی رضا جوئی کرتے رہیں۔(۱)

انڈیا کی سپریم کونسل کے باوقار رکن سر چارلس ٹریلوین جو حکومت کی طرف سے گورنری کے بلند عہدہ پر فائز تھا۔ پورے وثوق سے یہ کہتے ہوئے کہ یہ میرا یقین ہے یہ امیدیں قائم کیے ہوئے تھا کہ۔

"جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے اسی طرح یہاں (ہندوستان میں) بھی ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے۔(۲)

اور برطانیہ کی پارلیمنٹ کے ممبر مسٹر منگلس نے آغاز ۱۸۵۷ء میں پارلیمنٹ کے دار العوام میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہا کہ:۔

"خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیر نگیں ہے، تاکہ عیسیٰ مسیح علیہ السلام کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنا چاہئے۔ اور اس میں کسی طرح تساہل نہ کرنا چاہئے۔"(۳)

اور لارڈ برٹس نے کہا کہ:۔

"ان بدمعاش مسلمانوں کو بتادیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے۔"(۴)

---

(۱) ان ٹپی انڈیا ص ۳۹۹　(۲) بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۴۳
(۳) حکومت خود اختیاری ص ۱۳۶، اور علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے ج ۱ ص ۱۶
(۴) علماء ہند کا شاندار ماضی کا آخری حصہ، تصویر کا دوسرا رخ ص ۳۴ طبع اول)

غور فرمایئے کہ سایۂ بوم وظالم برطانیہ کے منحوس دور اقتدار میں ہندوستان کی سرزمین پر کس طرح زبوں حالی کا گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ اور جس میں رائے قائم کرنے والوں نے یہاں تک رائے قائم کی کہ:۔

''اب اسلام صرف چند سالوں کا مہمان ہے۔''(۱)

اس نازک دور اور نامساعد حالات میں علماء دیوبند کثر اللہ جماعتہم نے جس طرح ہمت و استقلال کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں ان کا کوئی شریک نہیں ہوسکتا۔ آخر بتلایئے کہ اس وقت تمام گمراہ کن تحریکوں کا مقابلہ کس نے کیا؟ ظلم برطانیہ کے فولادی پنجہ سے کس نے ٹکر لی؟ جان عزیز کو ہتھیلی پر رکھ کر کس نے جہاد کیا ۱۸۵۷ء میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آریوں اور پادریوں کا تعاقب کس نے کیا؟ ان کی تردید میں کتابیں اور رسالے کس نے لکھے؟ کس نے تقریروں کے ذریعہ اسلام کی حقانیت واضح کرتے ہوئے ان باطل فرقوں کے مکائد اور دسیسہ کاریوں سے مسلمانوں کو آگاہ کیا؟ اور اس ہنگامے میں کس طبقہ کے علماء کے ساتھ انتہائی بہیمانہ سلوک روا رکھا گیا؟ اور نہایت بے دردی کے ساتھ درختوں پر کن کو لٹکایا گیا۔ اور ملکِ عزیز سے جلاوطنی کی وحشیانہ سزائیں کس طبقہ کی اکثریت کو دی گئیں۔ اور تختۂ دار پر لٹکنے کیلئے زبان حال سے یہ کہتے ہوئے کس نے خوشیاں منائیں کہ ؎

فنا فی اللہ کی تہ میں بقا کا راز مضمر ہے جسے مرنا نہیں آتا اُسے جینا نہیں آتا!

برطانیہ کا ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جس میں ان کا دعویٰ تھا کہ ہماری حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا۔ اگر ایک جگہ غروب ہوتا ہے تو دوسری جگہ طلوع ہوتا ہے اور برطانیہ کے مغرور وزیر اعظم مسٹر گلیڈسٹون نے یہ کہا تھا کہ اگر آسمان بھی ہمارے سروں پر گرنا چاہے تو ہم سنگینوں کی نوک پر اسے تھام سکتے ہیں، (معاذ اللہ) اس دور میں بھی علماء دیوبند نے اس ظالم برطانیہ کے خلاف صدائے حق بلند کی اور اس سے نبرد آزما رہے ہیں۔ چنانچہ یوپی کے گورنر سر جیمس امپنسٹن نے اسیر مالٹا حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۳۹ھ) کے بارے میں ایک موقعہ پر کہا تھا کہ :۔

''اگر اس شخص کو جلا کر خاک بھی کر دیا جائے، تو وہ بھی اس کوچہ سے نہیں اڑے گی جس میں کوئی انگریز ہوگا۔''

---

(۱) موج کوثر ص ۱۰۸، شیخ محمد اکرام صاحب ایم اے

نیز یہ بھی ان کا ہی مقولہ ہے کہ :۔

”اگر اس شخص کی بوٹی بوٹی کردی جائے تو ہر بوٹی سے انگریزوں کے خلاف عداوت ٹپکے گی۔“(۱)

غالباً ایسے ہی موقعہ کے لئے کہا گیا ہے کہ :۔

وہی مومن ہے جس کو باطل دیکھ کر پکار اٹھے
کہ اس مرد خدا پر چل نہیں سکتا فسوں میرا

عیسائی بنانے کے لئے طریق کار

آپ باحوالہ پہلے یہ پڑھ آئے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان میں زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی تمام ہندوستانیوں کو ایک ساتھ عیسائی بنانے کا خواب دیکھنا شروع کیا۔ اور اس کے لئے ملازمتوں اور میموں نوکریوں اور چھوکریوں کی پیش کش کے علاوہ اور بھی کئی حربے اختیار کیے گئے۔ ان میں ایک طریق یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو اتنا غریب اور مفلوک الحال کر دیا جائے کہ وہ عیسائیوں کی جھولی میں پڑنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔ چنانچہ عوام کی غربت اس حد تک عمداً پہنچادی گئی تھی کہ بقول سرسید صاحب ڈیڑھ آنہ یومیہ یا ڈیڑھ سیر اناج پر ہندوستانی اپنی گردن کٹوانے پر بخوشی تیار ہو جاتا تھا۔(۲)

اور سب سے زیادہ خطرناک اور مہلک طریقہ جو انگریز نے تجویز اور اختیار کیا تھا وہ یہ تھا کہ قرآن پاک اور اس کی تعلیم اور علوم اسلامیہ کو یکسر مٹادیا جائے۔ تاکہ ایمان وایقان کی جو پختگی مسلمانوں کو حاصل ہے بالکل ختم ہو جائے اور عیسائیت کا راستہ ان کیلئے سہل اور ہموار ہو جائے، اور اس کے مقابلہ میں انگریزی تعلیم کو اس قدر عام اور رائج کر دیا جائے کہ کوئی شخص اپنے لئے اسکے سوا چارۂ کار نہ پائے۔ چنانچہ قرآن کریم جیسی جامع ومکمل، بے نظیر اور انقلاب انگیز کتاب کی بے پناہ قوت اور طاقت سے خائف اور بدحواس ہوکر برطانیہ کے مشہور ذمہ دار وزیر اعظم گلیڈ اسٹون نے بھرے مجمع میں قرآن کریم کو اٹھاتے ہوئے بلند آواز سے یہ کہا تھا کہ :

”جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہو سکتی۔“(۳)

---

(۱) (حاشیہ سوانح قاسمی ج ۲ ص ۸۴) مصنفہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ (۲) اسباب بغاوت ہند ص ۴۰
(۳) بحوالہ خطبۂ صدارت، ص ۱۵۔ اجلاس پنجاہ سالہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ از حضرت مدنیؒ

اور ہنری ہرینگٹن طامس نے کہا کہ :۔

"مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہو سکتے۔" (۱)

الغرض قرآن کریم کو اور مسلمانوں کے اسلامی جذبات کو ہندوستان سے نیست ونابود کرنے کے لئے ایسے ایسے حربے استعمال کیے گئے کہ شیطان بھی دم بخود ہو کر رہ جاتا ہے اور لارڈ میکالے نے تو صاف لفظوں میں کہا کہ :۔

"ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ ونسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں اور دل ودماغ کے اعتبار سے انگلستانی"۔ (۲)

اور سچ پوچھئے تو اس میں ان کو کافی حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ جیسا کہ کسی بھی صاحب علم پر یہ مخفی نہیں ہے۔

یہ طریقہ تو وہ تھا جو براہ راست حکومتِ برطانیہ اور اس کے ذمہ دار اصحاب نے اختیار کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ پادری صاحبان کی طرف سے (جن کی حفاظت اور مالی سرپرستی خود انگریز کر رہا تھا۔) عیسائیت کی جارحانہ تبلیغ ہندوستان میں جو شروع کی گئی وہ اپنے مقام پر ایک سانحۂ عظیم اور آفاتِ ارضی میں سے ایک بہت بڑی آفت تھی۔ مسلمانوں پر تو حکومت کی طرف سے صدہا آئینی پابندیاں عائد تھیں کہ وہ انگریز کے خلاف لب کشائی کرنے کے مجاز نہیں، مگر (العیاذ باللہ) اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پادریوں پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی۔ بقول کسے :۔

ہے اہل دل کیلئے اب یہ نظم بست وکشاد
کہ سنگ وخشت مقید ہیں اور سگ آزاد (۳)

---

(۱) بحوالہ حکومت خود اختیاری، ص ۵۵   (۲) بحوالہ مدینہ بجنور ۲۸ر جنوری ۱۹۳۶ء

(۳) ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریز باقاعدہ ہندوستان پر قابض ہوگئے۔ تو چونکہ حکمراں ہونے کے سبب اس وقت سب سے زیادہ ان کا مقابلہ اور دفاع مسلمانوں کی طرف سے کیا گیا تھا، بنابریں قابض ہوتے ہی انہوں نے ہر طرح کے مظالم اسلام اور مسلمانوں پر روا رکھے اور ان کے ہم وطن دوسرے مذہب کے افراد کو بڑھاوا دیا۔ یہ ایک فطری بات تھی اور مذہب واخلاق میں گو اس بدسلوکی اور ظلم وزیادتی کی کوئی جگہ نہیں تاہم حکمرانی وجہانداری کا یہ اصول ہے کہ آپ جس طاقت سے ملک چھینیں گے یا جس کے آپ کو مقابل میں آنے کا ڈر ہوگا اگر خود کو باقی رکھنا ہو تو اسے کچل ڈالیں گے۔

انگریزی حکومت اپنی اول نصف مدت میں اس اصول پر سختی سے کاربند نظر آتی ہے۔ لیکن بعد میں ان کے نقطۂ نظر میں بھی تبدیلی ہوئی (اس کے اسباب جو بھی رہے ہوں) اور انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ بھی مروت وعنایت سے کام لیا۔ تبلیغ اسلام کی آزادی بھی ہوئی۔ اور یہ بھی تاریخ کی زندہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں بھی بہت سے انگریزوں نے اسلام قبول کیا، مسلمانوں اور خصوصاً عالموں کو اچھے عہدوں، جاگیرداروں اور وظائف وغیرہ سے نوازا گیا، چنانچہ ایک وقت تھا کہ علماء اہل حق کے اندر انگریز سے اس قدر بغض وتنفر تھا کہ ان کے وجود اور ان کی طرف منسوب کسی چیز کو دیکھنا تک گوارا نہ تھا، (بقیہ اگلے پر)

تاریخ قیام دارالعلوم دیو بند

یہ تھے وہ مختصر دل گداز اسباب وعلل جن کی وجہ سے حجتہ الاسلام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقائے کار نے فراستِ ایمانی اور دیدۂ بصیرت سے اندازہ کرلیا کہ اگر ان نازک حالات میں مذہبی اور دینی طور پر مسلمانوں کی حفاظت وتربیت کا کوئی معقول اور خاطر خواہ انتظام نہ کیا گیا اور قرآن وحدیث، فقہ، تاریخ اسلامی، اور سلف صالحین کے اعلیٰ کارناموں اور اقدار سے ان کو باخبر نہ رکھا گیا تو سخت خطرہ ہے کہ (العیاذ باللہ) مسلمان کہیں نصرانیت اور دیگر فتنوں کے دامِ ہمرنگ زمین ہی میں نہ الجھ جائیں۔ جس جال کو بچھانے میں شاطرانِ فرنگ اور پنڈتوں اور دیگر باطل پرستوں کے عزائم ومساعی کوئی رازِ پنہاں نہ تھے، مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی کو پراگندہ کرنے اور آئندہ ان کو دینی ماحول اور فنون سے بے بہرہ رکھنے کی جو کوشش وکاوش اس ملک میں ہورہی تھی، ان تمام پریشانیوں کو سوچنے اور سمجھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء کار کو نتیجہ رس دماغ اور سیماب کی طرح بے قرار دل مرحمت فرمایا تھا، اور متلاشیانِ حق کے ایک ایک فرد کو زبانِ حال سے پکار کر یہ کہہ رہے تھے۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دَور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء بروز جمعرات (اسی دن ہفتہ بھر کے نیک اعمال اللہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) پھر وہ وقت بھی آیا کہ علماء نہ صرف انگریز حکومت کے عطیات وملازمت قبول کرنے لگے بلکہ بعض بڑے مدارس میں انکی آمد پر مسرت کا اظہار اور انکو ایڈریس بھی پیش کیے گئے، اور یہی وجہ ہے کہ انگریز کو ہندوستان سے نکالنے کے مسئلہ پر تحریک آزادی اور اس کے طریق کار میں علماء میں اختلاف رونما ہوا۔

انگریزی دور ہی میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کی اشاعت جاری تھی جن میں متعدد جگہ عیسائی تہذیب پر صاف صاف تنقید ہے، مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتنی تصانیف اس دور میں منظرعام پر آئیں۔ دارالعلوم کے ماہنامے القاسم اور الرشید بھی انگریزی دور ہی کے اندر بے باکانہ طور پر اپنے فرائض کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ لہٰذا انگریزوں کا دور حکومت دو حصوں پر منقسم ہوسکتا ہے اور ان دونوں حصوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے جو ظاہر وباہر ہے۔ (محمد عمران قاسمی بگیانوی)

تعالیٰ کے ہاں پیش ہوتے ہیں۔) تاریخ کا وہ مبارک دن ہے جس میں پیغمبر خدا ﷺ کی دی ہوئی امانت کا چشمہ علم سرزمین دیو بند سے پھوٹا، اور رشد و ہدایت کا پورا شجرۂ طوبیٰ بن کر پھیلا، جس کے لذیذ پھل سے دنیائے اسلام کی علمی بھوک ختم ہوئی اور جس کی سرسبز و شاداب شاخوں کے سایہ کے نیچے جہالت اور غفلت کی باد سموم میں جھلسنے والوں کو چین اور اطمینان نصیب ہوا، اور اس صاف اور شفاف چشمہ سے نہریں اور ندیاں پھوٹ پھوٹ کر نکلیں۔ اور ایشیا بھر کے مردہ دلوں کو زندہ اور اجڑے ہوئے قلوب کو لہلہاتا ہوا چمن بنا دیا۔

اس مبارک تقریب میں بہت سے باخدا بزرگ جمع ہوئے اور دارالعلوم دیو بند کی موجودہ عالیشان عمارت کے متصل جنوب کی طرف مسجد چھتہ میں انار کے درخت کی ٹہنیوں کے سایہ میں اس مدرسہ کا افتتاح ہوا۔ اور سب سے پہلے معلم حضرت مُلا محمود صاحبؒ اور سب سے پہلے متعلم حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیو بندی قرار پائے۔

اہم ترین اصول و ہدایات

دارالعلوم کی تاریخ میں ان کو اصول ہشت گانہ کہا جاتا ہے، چونکہ یہ حضرت نانوتویؒ کے انداز فکر کی ترجمان تحریر ہے اور انہیں کے قلم سے ہے اس لئے بلفظہ یہاں نقل کر دینا ضروری ہے۔

(۱) اصل اول یہ ہے کہ تابمقدور کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں، اوروں سے کرائیں، خیر اندیشان مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے۔

(۲) ابقائے طعام طلبہ بلکہ افزائش طلبہ میں جس طرح ہو سکے، خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

(۳) مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو، اپنی بات کی پچ نہ کی جائے، خدانخواستہ جب اس طرح کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا، القصہ تہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبیٔ مدرسہ ملحوظ رہے۔ سخن پروری نہ ہو، اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں، اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں، یعنی

یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگر چہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بہ دل وجان قبول کریں گے اور نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد وصادر جو علم وعقل رکھتا ہو۔ اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو، اور نیز اس وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے اہل مشورہ سے مشورے کی نوبت نہ آئے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا، ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

(۴) یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل روزگار خود بیں اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

(۵) خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور اندازہ مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے، ورنہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا، اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

(۶) اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ، تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ، تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

(۷) سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

(۸) تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو، بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے[1]

اس مبارک مدرسہ کے آغاز کی خبر جب بتانے والوں نے مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ

---

(۱) تاریخ دار العلوم دیو بند جلد اص ۱۵۳۔۱۵۴

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بتائی اور یہ کہا کہ حضرت ہم نے دیو بند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ اس کے لئے دعا فرمائی جائے تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:۔

سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں۔ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سر بسجود ہو کر گڑگڑاتی ہیں کہ خداوند ہندوستان میں بقاء اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔(۱)

بلاشبہ دارالعلوم دیو بند ہندوستان میں تحفظ اور بقائے اسلام کا ذریعہ ہے، اور اس کی وجہ سے ہزاروں پیاسوں کو سیرابی نصیب ہوئی ہے۔

سرسیّد اور حضرت نانوتویؒ

اگر حقیقتاً دیکھا جائے تو دہلی کے تعلیم یافتہ حضرات نے ہندوستان میں تعلیم پھیلانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے سرسید مرحوم و مغفور، مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ، مولانا محمد حسین آزاد۔ مسٹر پیارے لال آشوب دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دیو بند میں اور سرسید نے علی گڑھ میں مدرسہ و کالج قائم کیئے۔ مسٹر پیارے لال آشوب، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد نے پنجاب میں وہ تعلیمی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ جو حیات جاوید کے مالک ہیں۔ سرسید مرحوم مولانا محمد قاسم کی بہت عزت کرتے تھے۔ بعض مذہبی مسائل کے علاوہ تعلیم پھیلانے میں دونوں متفق تھے علوم جدیدہ اور علوم قدیمہ کے پڑھنے میں بھی دونوں ہم خیال تھے۔ چنانچہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ مورخہ یکم ذی الحجہ ۱۲۹۰ھ میں مضمون بعنوان "مدرسہ دیو بند" میں مولانا محمد قاسم کی تقریر اپنی علوم قدیمہ اور جدیدہ کے پڑھانے کے بارے میں درج ہے۔ اور اس پر جزوی اختلاف کے ساتھ سرسیّد مرحوم نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ مضمون نقل کیا جاتا ہے۔ اس مدرسہ کی سالانہ مجلس میں جناب مولوی محمد قاسم صاحب نے ایک نہایت لمبی اور دِل میں اترنے والی اور صداقت سے بھری ہوئی گفتگو کی۔ اسکے پڑھنے سے ہم کو اس بات کی بڑی خوشی ہوتی ہے کہ جناب مولوی صاحب ممدوح بھی مسلمانوں کے حق میں علوم و فنون جدیدہ حاصل کرنا ضروری تصور کرتے ہیں۔

---

(۱) علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے حصہ اول ص ۱۷، و سوانح قاسمی جلد ۲، ص ۲۲۳ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ۔

سرسیدؒ مرحوم کو کسی دینی درسگاہ سے اختلاف نہیں تھا(۱)اور خاص طور پر مدرسہ دارالعلوم دیوبند جس کے بانی مولانا محمد قاسم تھے۔ وہ اس کے حامی تھے اور اسکی کامیابی چاہتے تھے۔ چنانچہ جب مدرسہ دیوبند کے مہتمم صاحب نے سرسیدؒ کے پاس مدرسہ کی سالانہ رپورٹ بھیجی جس میں

---

(۱) جب فاضل مرتب نے دیوبند اور علی گڑھ کے مکاتب فکریہ کے بانیین (سرسید احمد خاں اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) کے مابین رشتوں، تعلقات اور اپنے اپنے میدان میں انکی جد و جہد و خدمات کا ذکر چھیڑ ہی دیا (جس میں ان کا انداز تحریر سرسید احمد صاحب پر لگے بعض الزامات کی صفائی پیش کرنا محسوس ہوتا ہے) تو اب ہم مختصر طور پر (ایک ایسی شخصیت کی تحریر سے اقتباسات پیش کر کے جو عہد حاضر کی ایک مسلم ترین اور ایک عالمگیر احترام و وقعت کی مالک ہے اور جس کی نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کی اسلامی تاریخ پر گہری نظر ہے، میری مراد مولانا سید ابوالحسن ندوی مدظلہم العالی سے ہے) اس امر کا جائزہ لیں گے کہ سرسید احمد اور مولانا محمد قاسم کی تحریک، قیادت، مکتب فکر، جد و جہد، مسلم ہمدردی حمیت دینی اور تفہیم و تشریح شریعت میں کتنی موافقت اور کتنی مخالفت ہے نیز اس موافقت و مخالفت کے عوامل و محرکات کیا ہیں۔

ایک انصاف پسند ان اقتباسات سے یہ اندازہ بھی بخوبی لگا سکتا ہے کہ علماء دیوبند نے اپنی بعض تحریرات جو سرسید احمد صاحب اور نیچریوں کے رد میں لکھی ہیں وہ تنقید برائے تنقید نہیں بلکہ تاویل کا راستہ نہ ملنے پر تنقید برائے تبلیغ دین اور احقاق حق کی خاطر تھیں۔ مفکر اسلام حضرت مولانا ندوی لکھتے ہیں کہ

"ہندوستان میں انگریزی حکومت (جو مشرق میں تہذیب مغرب کی نمائندہ اور وکیل تھی) کے قدم اچھی طرح جم چکے تھے، وہ اپنے ساتھ جدید علوم اور جدید تنظیمات اور اس کے متعلقہ آلات و مصنوعات اور افکار و خیالات کا ایک بڑا لشکر ساتھ لائی، ہندوستانی مسلمان اس وقت زخم خوردہ، مضمحل اور شکستہ خاطر تھے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ان کی عزت و خودداری پر ضرب کاری لگی تھی، دوسری طرف ان کو نئے فاتح کا رعب، نئے حالات کی دہشت، ناکامی کی شرم اور مختلف شکوک و شبہات اور تہمتوں کا سامنا تھا، ان کے روبرو ایک ایسا فاتح تھا جو قوت و خود اعتمادی سے لبریز تھا، ایک ایسی تہذیب تھی جو جدت و نشاط انگیزی اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھی، بہت سے ایسے مشکلات اور مسائل تھے، جو فوری اور دور اندیشانہ حل اور فیصلہ کن اور واضح موقف (پالیسی) کے طلب گار تھے۔"

دینی قیادت اور دارالعلوم دیوبند

اس پیچیدہ نفسیاتی کیفیت اور نازک حالت میں دو قسم کی قیادتیں ابھر کر سامنے آئیں، پہلی قیادت دینی قیادت تھی، جس کے علمبردار علماء تھے، دوسری قیادت کے علمبردار سرسید احمد خاں، ان کے حلقہ بگوش اور جدید مکتب خیال کے افراد تھے۔

جہاں تک علماء کا تعلق ہے، ان کو رسوخ فی الدین، زہد و تقویٰ، ایثار و اخلاص، دینی غیرت و حمیت اور اس کی راہ میں قربانی کے میدان میں عالم اسلام کی سب سے طاقتور دینی شخصیت اور عنصر قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن اس ظلم و بربریت اور غیر معمولی سنگ دلی اور بے رحمی کی وجہ سے جس کا مظاہرہ انگریزی حکومت نے مسلمانوں کے معاملہ میں کیا تھا، جن کو وہ ۵۷ء کے غدر کا اولیں رہنما اور حقیقی قائد تسلیم کرتی تھی۔ نیز عیسائیت کی ترویج و اشاعت میں حکومت کی سرگرمی اور گرمجوشی اور مغربی تہذیب کی عوام میں غیر معمولی تیزی کیساتھ مقبولیت اور مسلمانوں کے عقائد اور اخلاق و معاشرت میں اس کے اثرات کی وجہ سے ان لوگوں کو اقدام کے بجائے دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا، انہوں نے اس کی فکر شروع کی کہ دینی جذبہ، اسلامی روح اسلامی زندگی کے مظاہر اور تہذیب اسلامی کے جتنے بچے کھچے آثار باقی رہ گئے ہیں، انکو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے اور اسلامی تہذیب اور ثقافت کے لئے قلعہ بندیاں کرلی جائیں۔ اور پھر ان قلعوں میں (جن کو عربی مدارس کے نام سے پکارا گیا ہے) مبلغ اور داعی تیار کئے جائیں۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

مدرسہ کی طرف سے مسلمانوں کی بے توجہی اور غفلت کا رونا رویا گیا تھا۔ اسکو پڑھ کر سرسیّد کے دل پر بہت اثر ہوا، اور انہوں نے یکم جمادی الثانی ۱۲۹۰ھ کے تہذیب الاخلاق میں عربی مدرسہ دیوبند اور مسلمانوں کا جھوٹا دعویٰ دینداری کے عنوان پر تین صفحہ کا ایک مقالہ تحریر کیا اس میں مولانا

(بقیہ گذشتہ صفحہ کا) (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "ہندوستانی مسلمان" از مؤلف)
اس عظیم اصلاحی اور تعلیمی تحریک کے (جس کا آغاز ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں ہوا) سربراہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند تھے............ اس تحریک اور اس کے قائدین نے ہندوستانی مسلمانوں کے اندر دین کی محبت، شریعت کا احترام اور اسکے راستہ میں قربانی کی طاقت اور مغربی تہذیب کے مقابلہ میں زبردست استقامت و صلابت (جو کسی اور ایسے اسلامی ملک میں دیکھنے میں نہیں آئی جس کو مغربی تہذیب اور مغرب کے اقتدار سے واسطہ پڑا ہو) پیدا کردی، دیوبند اس رجحان کا علمبردار اور ہندوستان میں قدیم اسلامی ثقافت و تہذیب و تربیت کا سب سے بڑا مرکز تھا............ دوسری قیادت جس کا علم سرسید احمد خان مرحوم (حالات و سوانح کے لئے ملاحظہ ہو "حیات جاوید" از خواجہ الطاف حسین حالی و علی گڑھ میگزین سرسید نمبر) نے بلند کیا وہ مغربی تہذیب اور اس کی مادی بنیادوں کی تقلید اور جدید علوم کو اس کے عیوب و نقائص کے ساتھ اور بغیر کسی تنقید و ترمیم کے اختیار کر لینے کی داعی تھی، وہ اسلام اور قرآن کی اس طرح تفسیر اور توجیہ کرتی تھی، جو انیسویں صدی کے آخر کے سائنسی معلومات اور مغربی تمدن کے معیاروں کے مطابق ہو اور اہل مغرب کے ذوق و مزاج کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ وہ ان غیبی حقائق اور طبعی اسرار کے انکار پر قائم تھی، جو حواس اور تجربہ کی دسترس سے بہت دور ہیں، اور بادی النظر میں جدید علوم کے مطابق نظر نہیں آتے ہیں۔ (یہ زمانہ جیسا کہ سب جانتے ہیں طبعی علوم کے طفولیت کا زمانہ تھا اور اس کا نشو و نما ہو رہا تھا اور یہ علوم ابھی اپنے مکمل نتائج تک نہیں پہنچے تھے۔)............ ملازمت، رفاقت اور دوستی و تعارف کے ذریعہ ان کو انگریزوں سے طویل واسطہ پڑا تھا، اور بہت قریب سے ان کی زندگی کے مطالعہ کا موقعہ ملا تھا، وہ ان کی ذہانت، قوتِ عمل اور ان کے تمدن سے متاثر ہوئے، وہ ایک ذہین، نہایت ذکی الحس سریع الانفعال اور درد مند قسم کے آدمی تھے، انہوں نے متوسط درجہ کی دینی تعلیم پائی تھی، اور دینی علوم اور کتاب و سنت پر ان کی نظر گہری اور وسیع نہ تھی، جلد رائے قائم کر لینے اور جرأت کے ساتھ اس کا اظہار کرنے کے عادی تھے، وہ انگریزوں سے اس طرح متاثر ہوئے جس طرح کوئی مغلوب غالب سے یا کوئی کمزور طاقتور سے متاثر ہوتا ہے۔ انہوں نے شخصی طور پر انگریزی تہذیب اور طرز معاشرت کو اختیار کیا اور دوسروں کو بھی بڑی گرمجوشی اور قوت کے ساتھ اس کی دعوت دی............ وہ اس تہذیب اور معاشرہ سے اس طرح متاثر ہوئے کہ ان کے دل و دماغ، اعصاب اور ساری فکری صلاحیتیں اس سے وابستہ ہو گئیں۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۸۷۰ء میں وہ اس تہذیب کے گردیدہ اور ہندوستان کی مسلم سوسائٹی میں ان اقدار اور اصولوں کی بنیاد پر اصلاح و تغیر کے پرجوش داعی اور مبلغ بن کر اپنے ملک واپس ہوئے، اور پورے خلوص اور گرمجوشی کیساتھ انہوں نے اس تحریک و دعوت کا علم بلند کیا اور اپنی ساری صلاحیتیں اور قوتیں اس کیلئے وقف کر دیں، ان کا نقطۂ نظر خالص مادی ہو گیا، وہ مادی طاقتوں اور کائناتی قوتوں کے سامنے بالکل سرنگوں نظر آنے لگے، وہ اپنے عقیدہ اور قرآن مجید کی تفسیر بھی اسی بنیاد پر کرنے لگے، انہوں نے اس میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ عربی زبان و لغت کے مسلمہ اصول و قواعد اور اجماع و تواتر کے خلاف کہنے میں بھی ان کو باک نہ رہا، چنانچہ ان کی تفسیر نے دینی و علمی حلقوں میں سخت برہمی پیدا کر دی............ یہ انتہاپسندانہ مادی رجحان، عقل انسانی کی تقدیس اور اس کے حدود اور دائرہ عمل کی ضرورت سے زائد توسیع، خدا کی قدرت و مشیت کو قوانین فطرت اور اسباب ظاہری کا پابند سمجھنا، قرآن کی جسارت کے ساتھ تاویل و تشریح، وہ چیزیں تھیں، (باقی اگلے صفحہ پر)

محمد قاسم اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے بارے میں کیسے حقائق بھرے محبت آمیز الفاظ استعمال کئے ہیں ان کے خلوص پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا اس مضمون کے اقتباس میں پڑھیے۔

مولوی رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ عربی دیوبند نے اس مدرسہ کی رپورٹ سالانہ ۱۲۶۹ھ ہمارے پاس بھیجی ہے جسکے دیکھنے سے ہم کو نہایت ہی رنج ہوتا ہے اور مسلمانوں اور مسلمانوں کی حالت پر کس قدر افسوس آتا ہے۔ اب ہم اس رپورٹ پر متعدد طرح پر نظر ڈالتے ہیں۔

"اول۔ بلحاظ مسلمانوں کے جوش مذہبی کے ہم سمجھتے تھے کہ جو مدرسہ ہم قائم کرنا چاہتے ہیں، جس میں علوم انگریزی اور دیگر علوم دنیاوی بشمول علوم دینی پڑھائیں گے۔ اس پر جو پکے مسلمان یا متعصب دیندار اعتراض کرتے ہیں اور اس کو کرسٹانی مدرسہ ٹھہراتے ہیں اور اسی سبب سے لوگوں کو اس میں چندہ دینے سے منع کرتے ہیں، تو عربی مدرسہ دیوبند میں جس میں بجز مسلمانی کے اور کچھ نہیں ہے۔ جس میں وہی پرانے علوم پڑھائے جاتے ہیں

(بقیہ گذشتہ کا)

(جنہوں نے ایک نئے فکری انتشار اور بے راہ روی اور بے باکی کا دروازہ کھول دیا اور آگے چل کر لوگوں نے اس سے ایسا غلط فائدہ اٹھایا کہ دین کی تشریح اور قرآن کی تفسیر بازیچہ اطفال بن گئی .... سرسید کی دعوت اور تعلیمی نظریہ، مغربی تہذیب کی دعوت کیساتھ لازم وملزوم سا ہو گیا، اور اس وجہ سے ان کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں بہت سے شبہات پیدا ہو گئے، دینی حلقوں میں اس کے خلاف نفرت وبیزاری کی ایک لہر دوڑ گئی اور اس تحریک کیساتھ اسکے مقاطعہ اور بائیکاٹ کی تحریک بھی شروع ہو گئی، اور اس نے اس کے راستہ میں بہت سی غیر ضروری مشکلات پیدا کر دیں، علماء دین نے جو انگریزی تعلیم اور مفید علوم کے حصول کے ابتداء میں مخالف نہ تھے۔ (ملاحظہ ہو حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی کا فتوی درباب تعلیم زبان انگریزی (فتاوی عزیزیہ) یہ دیکھ کر کہ یہ تحریک ابتدا ہی سے غلط رخ پر پڑ گئی ہے، اور اس میں بہت سے غیر ضروری اور غلط عناصر شامل ہو گئے ہیں، مثلاً اس میں مغربی تمدن سے کھلی ہوئی مرعوبیت اور اس کی دعوت ہے، اخلاق و عقائد پر اس کے مضر اثرات پڑ رہے ہیں، انگریز پروفیسر اور پرنسپل کے غیر محدود اثر ونفوذ کی وجہ سے ملت اسلامیہ کے منتخب اور ذہین نوجوان جو اس کالج میں زیر تعلیم ہیں انگریزی معاشرت وتمدن اور برطانوی سیاست سے متاثر ومسحور ہوتے جا رہے ہیں، انہوں نے اس کی مخالفت میں پوری سرگرمی کا مظاہرہ کیا، دوسری طرف ان اثرات اور مغربی ماحول کی وجہ سے جو کالج پر چھایا ہوا تھا، ایک ایسی اسلامی نسل پیدا ہوئی جو نام کے لحاظ سے مسلمان اور ذہن ودماغ کے لحاظ سے خالص مغربی تھی، معاشرت وتمدن میں انگریزی طور وطریق کی پابند اور حامی، عقائد میں بعض اوقات کمزور اور متزلزل۔

(اقتباسات از کتاب مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش از صفحہ ۸۷ تا ۱۰۲)

مندرجہ بالا اقتباسات سے کوئی بھی صاحب نظر اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے کہ دونوں حضرات کی تعلیم وتحریک، عقائد وفکر، رجحان وذوق کے درمیان کیا فرق ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تحریر بعض ان جدید تعلیم یافتہ، دروغ گو اور متعصب حضرات کے واسطے اپنی زبان درازیوں کیلئے توبہ کی توفیق کا سامان بھی بن جائے جو حقیقت کو جانے بغیر علماء دیوبند کو "جدید تعلیم" کا مخالف سمجھ کر ان پر طعن وتشنیع کرتے ہیں اللھم احفظنا منہ واللہ الموفق وھو المستعان (محمد عمران قاسمی بگیانوی)

جن کو مسلمان چاہتے ہیں، بڑے بڑے مسلمانوں نے ضرور مدد کی ہوگی مگر رپورٹ کے دیکھنے سے ہم کو نہایت مایوسی ہوئی۔ بڑے سے بڑا چندہ فہرست میں آٹھ روپیہ ماہوار کا ہے، اس کے بعد پانچ روپے ماہوار کا۔ اس کے بعد چار روپے ماہوار کا اور اس کے بعد تین روپے ماہوار کا۔ اور یہ چاروں قسم کے چندے غیر وصولی ہیں۔ بعض پر دو دو برس اور بعض پر ایک ایک برس کا باقی ہے۔ اس کے بعد بہت تھوڑے چندے دو روپیہ اور ایک روپیہ ماہوار کے ہیں، اور اس کے بعد تو پھر روپیہ دو روپیہ تین روپے آٹھ آنے، چار آنے سال پر نوبت پہنچ چکی ہے اور وہ بھی با آسائش وصول نہیں ہوتا۔ بمجبوری مہتمم نے تجویز کی ہے کہ چندہ لانے کیلئے ایک آدمی نوکر رکھا جائے۔ بس یہ کارروائی ہمارے لئے قطعی ثبوت اس بات کا ہے کہ جو لوگ اپنے تئیں مقدس اور متقی اور پکا مسلمان ظاہر کر کے مدرستہ العلوم مسلمانان میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے اپنی دینداری ظاہر کرتے ہیں، صرف سخنی ساختہ اور حیلہ نامشروع ہے وہ عربی مدرسہ دیوبند میں جس میں بجز مسلمانی کے اور کچھ نہیں ہے کیوں مدد نہیں کی۔ حقیقت میں مسلمانوں پر نہایت افسوس ہے کہ ایسے مدرسہ میں جیسا کہ دیوبند کا عربی مدرسہ ہے اور جس میں مولوی محمد قاسم سا فرشتہ سیرت شخص نگراں ہے اور مولوی محمد یعقوب صاحب سا شخص مدرس ہے کچھ مدد نہ کریں۔

دوم۔ بلحاظ استقلال مدرسہ کے:۔ تمام رپورٹ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدرسہ خود اپنے پیر یا مسلمانوں کی ہمدردی پر قائم نہیں ہے بلکہ ایک شخص کی ذات پر بس اسکا مدار ہے، مولوی محمد قاسم درحقیقت نہایت بزرگ و نہایت مادر زاد ولی ہیں۔ تمام ضلع سہارنپور اور میرٹھ ان کا معتقد ہے۔ دوسرا بڑا سبب مولوی محمد یعقوب صاحب کا ہے جو مدرس اول اس مدرسہ کے ہیں۔ اور انہوں نے صرف ۳۵ روپیہ ماہواری مدرسہ سے لینا قبول کیا ہے، اور قناعت اور زہد سے اس قدر قلیل تنخواہ میں اوقات بسر کرتے ہیں اگر وہ نہ ہوں تو کیا کوئی دوسرا شخص اس قلیل مشاہرہ پر ان علوم کے پڑھانے کو ملے گا جو اس میں پڑھائے جاتے ہیں۔ پس یہ مدرسہ صرف ان دو بزرگوں کی دعا پر قائم ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس مدرسہ میں ۱۴۵ طالب علم ہیں جن میں تراسی خاص دیو بند کے رہنے والے ہیں اور باسٹھ بیرونجات کے ہیں، اور ان میں سات طالب علم تو ایسے ہیں۔ جو اپنے پاس سے روٹی کھاتے ہیں اور پچپن وہ ہیں جو دیو بند کے رہنے والوں سے یا مدرسہ سے روٹی کھاتے ہیں کسی کو کچھ کپڑا اور رضائی بھی مل جاتی ہے۔

صورت تقسیم انعام یوں تجویز ہوئی کہ طلباء مکتب قرآن میں جو اعلیٰ دو حافظ اور ادنیٰ دو لڑکے۔ کل چار مستحق انعام ہوئے۔ ان کے لئے ڈیڑھ روپیہ تجویز ہوا۔ اور طلبہ فارسی ادنیٰ جو سات تھے ان کے گیارہ انعامات کے لئے ایک روپیہ چھ آنے تجویز ہوا کہ تخمیناً ہر انعام کے موازی دو آنے ہوئے۔ اور فارسی کے طلبہ اعلیٰ جو چھ تھے۔ سات انعام ملے۔ بحساب فی انعام پانچ آنہ کل دو روپیہ تین آنے مقرر ہوئے، اور عربی میں ادنیٰ درجہ کے چوبیس طالب علموں کو ترپین انعام ملے۔ بحساب فی انعام پانچ آنہ ان کا کل ۱۶ روپے ۹ آنے ہوئے اور اوسط کے گیارہ طلباء کو اکیس انعام، ان کو فی انعام سات آنہ تخمین کئے۔ کل نو روپے تین آنے ہوئے اور طلباء اعلیٰ عربی کے ۱۹ قابل انعام ہوئے اور چھیاسٹھ انعام انہوں نے پائے۔ فی کتاب چودہ آنے تخمین کیے تو کل روپیہ انکا ستاون روپے بارہ آنے ہوا۔ اول تو ہم مسلمانوں کی اس حالت پر افسوس کرتے ہیں کہ ان کی قوم کا مسلمانی مدرسہ اور ایسی خراب اور محتاج حالت میں ہے۔ کہاں ہیں بڑے بڑے دینداری کا دعویٰ کرنے والے، اور کیوں مذہب اسلام کے مدرسہ کو ایسی حالت میں ڈال رکھا ہے۔

دیکھو تمہارے ہی ملک میں ایک تربیت یافتہ قوم یعنی پادریوں کے مذہبی مدرسے ہیں، ان کی تائید بھی غریب آدمی اور بیوہ عورتیں زیادہ تر کرتی ہیں، اور خود انصاف کرو کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے، اس کا سبب صرف یہی ہے کہ اس قوم میں تعلیم و تربیت عمدہ ہے ان کے سب کام اچھے ہیں۔

ہماری قوم میں تعلیم و تربیت نہایت خراب ہے۔ گو تعلیم تو برائے نام ہے اور تربیت کا تو نام بھی نہیں ہے۔ اسی سبب سے ہمارے سب کام کیا دینی اور

کیا دنیوی سب خراب اور برباد و ذلیل ہیں۔

ہماری غرض اس تحریر سے مسلمانوں کو اس بات کی غیرت دلانا ہے کہ ان کے دونوں کام دین و دنیا سب خراب و ابتر ہیں۔ ان کو چاہئے کہ اس مدرسہ کی مدد کریں اور ایسی اعلیٰ ترقی پر پہنچائیں جو اسلام کی رونق و شان کا نمونہ ہو۔(۱)

ہم نے سرسید احمد خاں کا یہ طویل اقتباس اس لئے نقل کیا ہے تاکہ قارئین کو معلوم ہو کہ وہ مدرسہ جس کی ابتدائی حالت وہ تھی جس کا نقشہ مندرجہ بالا اقتباس میں کھینچا گیا ہے۔ لیکن چونکہ اس کا مدار سراسر اخلاص وللّٰہیت اور نظریہ اشاعت کتاب و سنت پر تھا۔ لہٰذا اس کو اتنی ترقی ہوئی کہ پورے عالم اسلام میں کوئی غیر سرکاری ادارہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور اس مدرسہ اور اس قسم کے دُوسرے مدارس میں تعلیم پانیوالے حضرات نے جو خدمت اسلام کی، اس کی مثال بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ سرسیدؒ کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کے علم و ذہانت اور ان کے خلوص و تقویٰ پر اس قدر اعتماد تھا کہ جب ۱۲۹۱ھ میں علی گڑھ اسکول کی ابتدا ہوئی تو اس کی مشاورتی کمیٹی میں ہر دو حضرات کے نام کو شامل کیا گیا۔ مگر ہر دو حضرات نے انکار فرمایا کہ ہمیں معذور سمجھو۔ اس معذوری کی وجہ انہی کے خط میں پڑھیے وہ خط یکم رمضان ۱۲۹۱ھ کے تہذیب الاخلاق میں سرسید نے شائع فرمادیا ہے وہ یہ ہے۔

جناب مولوی محمد قاسم صاحب اور جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے جو خط متضمن عذرات شرکت مجلس مدیران تعلیم مذہب اہل سنت والجماعت سے کیا ہے بعینہٖ ذیل میں مندرج ہے۔

بخدمت منبع عنایات بے غایات مجمع الطاف بے نہایات سلامت

بعد سلام مسنون معروض ہے

پرچہ تجویز اصلاح قانون درباب مدرسۃ العلوم دینیہ سے ہے۔ پہنچا اور مجوزہونا حاجی علی بخش خاں صاحب کا مہتمم اس امر کا واضح ہوا ہے۔ اب امید ہے کہ کوئی خلاف باقی نہ رہے گا احقر کا نام اور جناب مولانا محمد قاسم صاحب قبلہ کا نام اس فہرست میں نظر آیا کہ جن کو اہل شوریٰ نے تجویز فرمایا ہے۔ ہر چند تائید مذہب اہل تشیع اس مدرسہ میں ایک جداگانہ چیز ہے۔ مگر ہم لوگوں

(۱) راقم سید احمد

کے دل میں یہ امر خلجان کرتا ہے کہ ایسے مجمع میں جس میں ایک شعبہ تائید ایسے لوگوں کا ہے جن پر فرض ہمارے مذہبی بزرگوں کو برا کہنا ہے ایسے مجمع کے موئیدوں میں شامل ہو کر خدا و رسول کو کیوں کر منہ دکھائیں گے قال تعالیٰ ولاتر کنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار۔ آپ لوگوں کو بڑی ہمت اور نہایت قوی جرأت ہے۔ ہمارے حوصلے یہاں پست ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنی پناہ میں محفوظ رکھے، ہر چند تجویز مذکورہ بالا ہم ناقص عقلوں کے نزدیک سفسطہ محض ہے بات وہی کی وہی ہے اور شامل ہونا جناب مولوی علی بخش خاں صاحب کا خلاف عقل تو نہیں کہہ سکتے مگر بیشک کسی مصلحت عقلی پر مبنی ہے، مگر یہ عمل قابل التفات تھا البتہ اس میں اتنا ہی تھا اتقوا مواضع التہم۔ کتنے ہی مسلمان، ہم لوگوں کی وضع اور عقائد اور اعمال اور رائے اور طرز کو ایک کیفیت خاص پر سمجھے ہوئے ہیں اس صورت میں اگر متزلزل نہ ہو جاتے تو مسترد ہو جانے میں کچھ تردد نہ تھا۔ بالجملہ اب ہم خاک نشینوں کو آپ گوشہ عنایت وتوجہ سے ایسا منسی و محو فرمادیں کہ پھر کبھی بھولے سے بھی یاد نہ آویں۔ جناب محمد قاسم صاحب نے منشی عارف سے بروقت ملاقات جب انہوں نے اس تجویز کا ذکر کیا تھا۔ بعینہ یہی مضمون ارشاد فرمایا تھا۔ انہوں نے آپ کی خدمت میں ذکر کیا ہوتا، اب بروقت پہنچنے ان پرچوں کے جناب مولانا یہاں تشریف رکھتے تھے احقر کو ارشاد فرمایا کہ تو ہی یہ جواب لکھ بھیج چنانچہ حسب ارشاد معروض ہوا۔“ (محمد یعقوب) (۱)

پادریوں کی تبلیغ

ہندوستان میں مسلمان کے ہاتھوں سے سلطنت اور اقتدار جانے کی دیر تھی کہ مختلف قسم کے مذہبی فتنے عذابِ الٰہی کی صورت میں نمودار ہوئے، اور ساون کے مینڈکوں کی طرح بازاروں اور کوچوں، گلیوں اور محفلوں میں پادری صاحبان جوق در جوق اور جماعت در جماعت گردش کرتے ہوئے اور مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکے ڈالتے ہوئے نظر آنے لگے، اور

(۱) اس مکتوب سے علماء دیو بند کی جرأت حق گوئی اور فریضہ تبلیغ کی ادائیگی نمایاں ہے۔ الحمد للہ (محمد عمران قاسمی بگیانوی)

ہندوستان میں شاید ہی کوئی قابل ذکر شہر اور خوش نصیب قصبہ ہوگا جس کو پادری صاحبان نے اس دور میں اپنے منحوس پاؤں سے نہ روندا ہو، اور اسلام کے خلاف خوب زہر اگل کر مسلمانوں کی دل آزاری نہ کی ہو، اور جارحانہ رنگ میں عیسائیت کی تبلیغ میں کوئی کمی چھوڑی ہو اور مسلمانوں کو چیلنج نہ دیا ہو، ایسے تمام واقعات کا استیعاب اور احاطہ نہ تو ہمارے بس کا روگ ہے اور نہ ان پر ہمارا مدعیٰ موقوف ہے۔ اس لئے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں۔ صرف دو تین واقعات بطور نمونہ عرض کیے دیتے ہیں۔ ہر عقلمند انسان ان سے بخوبی حقیقت کی تہ کو پہنچ سکتا ہے اور نادان کے لئے تو دفتر بھی بے سود ہیں۔

چاندپور کا مذہبی اجتماع

مشہور شہر شاہجہاں پور سے پانچ چار میل کی مسافت پر ایک قصبہ تھا جس کا نام چاندپور تھا۔ وہاں کے ایک ہندو رئیس منشی پیارے لال کبیر پنتھی نے ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء میں ایک مذہبی جلسہ بنام میلہ خداشناسی مقرر کیا۔ جس میں مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کا باہمی مباحثہ طے پایا اور تینوں فریق اس میں شریک ہوئے۔ مگر لالہ جی نے کمال ہوشیاری اور انتہائی چالاکی سے ایک مختصر سی لیکن نہایت بے معنی اور مہمل لکھی ہوئی تقریر کرنا شروع کی، کہ میاں کبیر نے کنول کے پھول میں جنم لیا اور ان کے پنتھ میں جاگتے سوتے سانس چلتا رہتا تھا (الخ) جس کو چیستاں اور پہیلی کہنا زیادہ مناسب ہوگا، اور اس طرح اپنی اور اپنے ہم مذہبوں کی جان چھڑالی اور اصل گفتگو مسلمانوں اور عیسائیوں میں رہی۔ عیسائیوں کی طرف سے ان کے دیگر نامی گرامی پادریوں کے علاوہ پادری نولس صاحب انگلستانی بھی تھے جو بڑے لسان، عمدہ مقرر اور چوٹی کے مناظر تھے۔ پادری نولس صاحب کا یہ بے بنیاد دعویٰ تھا کہ مسیحی دین کے مقابلہ میں محمدی دین کی کچھ حقیقت نہیں، (معاذ اللہ) اور اہل اسلام کی طرف سے جو حضرات اس موقع پر موجود تھے۔ ان میں مشاہیر میں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا سید ابوالمنصور صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ امام فن مناظرہ اہل کتاب خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر حضرات علماء اور اہل دل اور دیندار مسلمانوں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ پہلے دن تو اس مباحثہ میں متعدد حضرات نے حصہ لیا،

اور پادری نولس صاحب کے مزعوم دلائل کے جواب دیتے رہے اور اپنے دعاوی کا اثبات کرتے رہے، مگر دوسرے دن مناظرہ میں صرف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے حصہ لیا اور ایسے زبردست دلائل اسلام کی حقانیت پر پیش کیے کہ مجمع داد تحسین دیئے بغیر نہ رہ سکا اور دین مسیحی کے منسوخ اور ناقابل اتباع ہونے پر ایسے ٹھوس براہین پیش کئے کہ پادری باہم کہتے تھے۔ آج ہم مغلوب ہو گئے۔(۱)

اس مناظرہ کی مکمل روئداد حوالہ کی کتاب میں ملاحظہ فرمایئے کہ پادریوں کا مغرور سر کیسے سرنگوں ہوا اور اسلام کی حقانیت اور صداقت کس طرح آشکارا ہوئی سچ ہے کہ :؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

شاہجہاں پور

اس مناظرہ کے تقریباً دو سال بعد ۱۲۹۵ھ ۱۸۷۸ء میں شاہجہاں پور میں اہل اسلام اور مختلف باطل فرقوں کا مناظرہ اور مباحثہ طے ہوا، جس میں پنڈت دیانند سرسوتی، منشی اندرمن، پادری اسکاٹ مفسر انجیل اور پادری نولس صاحب وغیرہ نے حصہ لیا اور اہل اسلام کی طرف سے متعدد علماء حق اور مشاہیر اس وقت اور اس مقام پر حاضر اور موجود تھے۔ مگر مناظرہ پادریوں اور مسلمانوں کا ہوا۔ اور لالے وقت کی نزاکت سے فائدہ اٹھا گئے۔ اس میں حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مناظر تھے۔ انہوں نے عقلی و نقلی رنگ میں ایسی صحیح اور قطعی دلیلیں پیش فرمائیں کہ پادری صاحبان سے انکا کوئی معقول جواب نہ بن سکا۔ اور اس موقعہ پر بھی اسلام اور اہل اسلام کا بول بالا ہوا۔ مسلمانوں کی کھلی فتح کا مسلمانوں اور عیسائیوں کے علاوہ متعصب ہندوؤں نے بھی اقرار کیا، چنانچہ منشی پیارے لال نے یہ کہا کہ مولوی قاسم صاحب کا حال کیا بیان کیجئے؟ ان کے دل پر علم کی سرسوتی علم کی دیوی بول رہی تھی۔(۲)

پورے بیانوے صفحات پر اس مناظرہ کی روئداد بارہا طبع ہو چکی ہے اہل علم اس سے استفادہ کریں

اس کے علاوہ حجۃ الاسلام نے پادری تاراچند سے بھی مناظرہ کیا، چنانچہ سوانح قاسمی ص ۱۵، از مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں ہے۔

(۱) گفتگوئے مذہبی بلقب تاریخی میلۂ خداشناسی ص ۳۸ (۲) مباحثہ شاہجہاں پور ص ۹۲

"ایک پادری تاراچند نام کا تھا۔ اس سے گفتگو ہوئی آخر وہ بند ہوا اور گفتگو سے بھاگا، سچ ہے۔ شیروں کا مقابلہ لومڑیاں کیا کرسکیں۔"

پادری فنڈر کا فتنہ

پادری ڈاکٹر کارل فنڈر (جو ایک جرمنی مشنری تھا، جسے روسی سلطنت نے جورجیا کے قلعے شوشا سے بدر کردیا تھا، جس نے فارسی میں میزان الحق نامی ایک کتاب شائع کی اور پھر اس کا اُردو ترجمہ بھی کیا۔ ملاحظہ ہو اہل مسجد ص، ۳۱۴ مصنفہ ایل بیون جونز، بی اے، بی ڈی لندن، مترجمہ جے عبدالسبحان بی اے، بی ڈی، پنجاب رلیجس بک سوسائٹی انارکلی لاہور) نے ہندوستان میں پہنچ کر اور انگریز کی سرپرستی حاصل کرکے جس دریدہ دہنی سے عیسائیت کی تبلیغ شروع کی اور اہل اسلام کے خلاف جو زہر اگلا اور پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں جو جو بہتان تراشی اور اتہام بازی اس نے اختیار کی، اس سے مسلمان تو آخر مسلمان ہیں منصف مزاج غیر مسلم بھی صدائے نفریں کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پادری فنڈر جو اپنی بے باکی میں مشہور تھا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تبلیغ عیسائیت کے سلسلہ میں سرگرم عمل تھا، چنانچہ حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب عثمانی کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۲ر رمضان ۱۳۰۸ھ جو حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی قدس سرہ العزیز کی اولاد میں تھے۔ اور سلسلہ ولی اللہی میں منسلک ہو کر دہلی میں تعلیمی اور تبلیغی خدمت انجام دے رہے تھے ،اور آپ کی ولادت جمادی الاولیٰ ۱۲۳۳ھ میں کیرانہ ضلع مظفر نگر میں ہوئی تھی) نے پادری فنڈر کے ساتھ خط وکتابت کی اور مناظرہ کا چیلنج دیا۔ اور تمام ابتدائی مراحل طے کرلینے کے بعد اکبر آباد (آگرہ) میں کئی دن کیلئے مناظرہ طے ہوا۔ یہ مناظرہ ۱۱ر اپریل ۱۸۵۴ء مطابق ۱۲ر رجب ۱۲۷۰ھ کو ہوا تھا جو اسلام اور عیسائیت کی صداقت اور حقانیت واضح کرنے کے لئے فیصلہ کن اور تاریخ ہندوستان میں اس موضوع پر سب سے پہلا اور عظیم الشان مناظرہ تھا، جس میں طرفین سے معزز مسلمان، ہندو اور انگریز اس مناظرہ کے جج اور منصف قرار دیئے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے آخری دین کا حامی و ناصر ہے۔ اس نے اسلام کی صداقت کا ظاہری سبب اس موقع پر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کو بنایا، جنہوں نے اپنی خداداد قابلیت، عمدہ ذہانت اور تبحر علمی سے تین

روز کے متواتر مناظرہ میں دلائل قاہرہ اور براہین ساطعہ سے اس امر کو ثابت کر دیا کہ موجودہ انجیل جس پر آج پادری صاحبان کو فخر و ناز ہے، بالکل محرف ہے۔ جس میں ذرہ بھر شک اور شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور خود عیسائیوں کے مایۂ ناز اور چوٹی کے مناظر پادری فنڈر صاحب کو عام جلسہ میں انجیل مقدس کی تحریف تسلیم کیے بغیر اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رات کی تاریکی میں پادری فنڈر صاحب اپنے چیلوں سمیت بھاگ گئے۔ جب چوتھے دن حسب معمول مناظرہ کا وقت آیا تو پبلک اور منصف تو سبھی حاضر ہو گئے۔ مگر پادری فنڈر صاحب کا کہیں نام و نشان نہ ملا۔ ناچار تمام ججوں اور منصفوں کو جو طرفین سے حکم قرار دیئے گئے تھے۔ عیسائیت کے خلاف فیصلہ کرنا پڑا اور پادری فنڈر صاحب نے ہندوستان کو چھوڑ کر دیگر ممالک اسلامیہ میں اپنے دجل کا جال پھیلانے کی سعی کی۔ چنانچہ وہ پھرتا پھراتا ترکی بھی جا پہنچا اور وہاں کے علماء کو چیلنج کرتا پھرا، چونکہ وہ بیچارے اسکے ہتھکنڈوں سے واقف نہ تھے۔ اس لئے اس دریدہ دہن کے منہ نہ آتے تھے۔ بالآخر مسلمانوں اور عبد العزیز خاں ترکی کی خواہش اور صدرِ اعظم خیر الدین پاشا تونسی کی تحریک پر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے عربی زبان میں ایک محقق اور مدلل کتاب تصنیف فرمائی، جس کا نام اظہار الحق رکھا، جس کا ترکی فارسی اور یورپ کی مختلف اور متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ جب ۱۸۹۱ھ میں انگریزی میں اس کا ترجمہ شائع ہوا تو مشہور اخبار ٹائمز آف لندن نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا کہ اگر لوگ اس کتاب کو پڑھتے رہے تو دنیا میں عیسائی مذہب کی ترقی بند ہو جائے گی۔ (۱)

راقم الحروف نے آج سے تقریباً سولہ سترہ سال پہلے اظہار الحق کے عربی نسخہ کا مطالعہ کیا ہے، بلا شبہ ردِ عیسائیت کیلئے بہترین اور لاجواب کتاب ہے مگر صرف اہل علم حضرات کیلئے ؂

ان مسائل میں ہے کچھ ژرف نگاہی درکار
یہ حقائق ہیں تماشائے لبِ بام نہیں

حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب کے علاوہ اس وقت حضرت مولانا رحم علی صاحب منگلوری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عنایت رسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ چریاکوٹی اور ڈاکٹر وزیر خاں صاحب آگروی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی عیسائیت کا خوب رد کیا اور اسلام کے ناقابل شکست قلعہ کو محفوظ رکھنے کی سعیٔ بلیغ کی۔

---

(۱) ملاحظہ ہو علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے حصہ اول ص ۳۶

آریہ کا فتنہ

آپ اوراقِ گزشتہ میں یہ پڑھ چکے ہیں کہ انگریز نے اقتدار اور حکومت کے بل بوتے پر اور پادری صاحبان نے حکومتِ برطانیہ ہی کے زیر سایہ رہ کر تبلیغ کے ذریعے کس طرح مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالا اور کیا کیا کوششیں کیں۔ یہ مصائب مسلمانوں کے لئے کیا کم تھے؟ مگر جب مصائب و آفات کے گھنگھور بادل چھا جاتے ہیں تو ان سے مصیبت کا صرف ایک ہی قطرہ نہیں ٹپکتا بلکہ ایسی موسلادھار بارش ہوتی ہے کہ مشکلات و بلیات کے سیلاب اُمڈ آتے ہیں۔ ایک طرف انگریز اور عیسائیوں کا عظیم فتنہ تھا اور دوسری طرف انگریزوں کے چہیتے ہندوؤں اور آریاؤں کا کرتا دھرتا سوامی دیانند سرسوتی، جو اپنے منطقیانہ اور فلسفیانہ استدلالات میں مشہور تھا۔ پورے ہندوستان میں لوگوں کو آریہ بنانے اور مسلمانوں کو مرتد کرنے کی معاذ اللہ مہم چلا رہا تھا۔ بیسیوں اس کے چیلے اور شاگرد تھے، جو اسی کی ڈگر پر اسلام کے خلاف زہر اگلتے تھے، سرسوتی کی حماقت اور دریدہ دہنی کا اندازہ لگانا ہو تو اس کی کتاب ستیارتھ پرکاش کا چودھواں باب ملاحظہ کیجئے۔ جس میں اس نے بخیال خویش قرآن کریم کی بسم اللہ سے لے کر والناس تک کی تمام سورتوں پر اعتراضات کیے۔ اور ان کی کمی و خامی بتلائی ہے۔ (العیاذ باللہ) سرسوتی ہر مقام پر اسلام اور اسلامی عقائد پر خوب برستا تھا۔ اور اہل اسلام کو جواب کے لئے للکارتا تھا۔ چنانچہ اپنا تبلیغی دورہ کرتا ہوا۔ ۱۲۹۵ھ ۱۸۷۸ء میں وہ رڑکی جا پہنچا اور وہاں قیام کر کے اسلام کے خلاف خوب دل کھول کر زہر اگلتا رہا۔ چونکہ وہاں اس وقت کوئی ایسا مستعد اور مناظر عالم نہ تھا جو اس کے فلسفیانہ اعتراضات کا جواب دے سکتا۔ اس لئے میدان کو خالی دیکھ کر اس کی ہمت اور دو چند ہو گئی۔ حتیٰ کہ سر بازار اس نے اسلام کے خلاف نازیبا اور واہی تباہی باتیں کہنا شروع کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت ان دنوں حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو پہلے ہی سے ضیق النفس کے موذی مرض سے دوچار تھے بخار اور کھانسی کے شدید مرض میں مبتلا تھے۔ اور ان کی حالت کی خبریں ان کے احباب اور تلامذہ اور عقیدت مندوں کو پہنچتی رہتی تھیں۔ سرسوتی کے کانوں میں بھی حجۃ الاسلام کی بیماری کی خبر پہنچ گئی تھی، جب روڑکی کے کچھ دردِ دل رکھنے والے اور غیرت مند مسلمانوں نے سرسوتی کا حسبِ استطاعت جواب دینا ضروری سمجھا تو پنڈت صاحب یہ کہہ کر بات ٹال گئے کہ ہم

تو جاہلوں سے گفتگو کرنے کیلئے بالکل آمادہ ہی نہیں۔ اپنے کسی بڑے مذہبی عالم کو بلاؤ پھر ہم گفتگو کریں گے۔ پنڈت جی نے حالات سے یہ بھانپ لیا تھا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ اس شدید علالت میں کیونکر اور کیسے آسکتے ہیں۔ لہٰذا کوئی ایسی شرط لگاؤ کہ گفتگو کی نوبت ہی نہ آئے، اور نہ پنڈت جی کے مبلغ علم کا بھرم کھلے، اور نہ شرمندگی حاصل ہو بقول شخصے:۔ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔

جب لوگوں نے شدید اصرار کیا کہ پنڈت جی آپ مولانا نانوتویؒ ہی سے گفتگو کرنے پر کیوں مصر ہیں تو وجہ تخصیص یہ بیان کی کہ میں تمام پورب میں پھرا اور اب تمام پنجاب میں پھر کر آیا ہوں۔ ہر اہل کمال سے مولانا کی تعریف سنی۔ ہر کوئی مولانا کو یکتائے روزگار کہتا ہے اور میں نے بھی مولاناؒ کو شاہجہاں پور کے جلسہ میں دیکھا ہے۔ ان کی تقریر دلآویز سنی ہے اگر آدمی مباحثہ کرے تو ایسے کامل و یکتا سے کرے جس سے کچھ فائدہ ہو کچھ نتیجہ نکلے۔ (۱)

اہل روڑکی نے جب حضرت نانوتویؒ سے پرزور استدعا کی تو حضرت کے لئے خود شدت علالت میں وہاں پہنچنا تو ناممکن تھا، آپ نے اپنی طرف سے چند نمائندے بھیجے جن میں خصوصیت سے حضرت مولانا شیخ الہند محمود الحسن صاحبؒ اور حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ اور مولانا حافظ عبدالعدل صاحبؒ قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات پاپیادہ جمعرات کے دن مغرب سے پہلے روانہ ہوئے اور شام کی نماز دیوبند کے باغوں میں پڑھی گئی علی الصبح رڑکی پہنچے حتی کہ نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد مقامی باشندوں کے ہمراہ پنڈت جی کی کوٹھی پر پہنچے اور بحث و مباحثہ کی دعوت دی۔ مگر پنڈت جی اسی پرانی ضد پر مُصر تھے کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ آئیں تو مباحثہ کروں گا۔ اور کسی سے مباحثہ ہرگز نہ کروں گا۔ جب وہ کسی صورت مباحثہ کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو یہ حضرات واپس ہوگئے اور اہل روڑکی نے باوجود حضرت نانوتویؒ کی علالت کے محض اتمام حجت کیلئے وہاں پہنچنے کی استدعا کی، تو مولاناؒ باوجود علالت ضعف اور کمزوری کے جس طرح بھی ہوسکا روڑکی تشریف لے گئے۔

روڑکی میں اجتماع

حضرت مولانا بمعہ اپنے تلامذہ اور احباب کے شہر میں مقیم تھے اور سرسوتی صاحب روڑکی

---

(۱) بحوالہ مقدمہ انتصار الاسلام ص ۵۰۴، از مولانا فخر الحسن صاحب

چھاؤنی میں براجمان تھے۔ بحث ومباحثہ کے لئے ابتدائی مراحل طے کرنے کیلئے خط وکتابت ہوتی رہی مگر سرسوتی صاحب اور ان کے معتقدین اس سے بھی گھبرا گئے اور بہانہ کیا کہ:

”ہمارے سارے کام بند ہو گئے، آج سے ہمارے پاس کوئی اور تحریر نہ آئے۔ ہم ہرگز جواب نہ دیں گے۔“(۱)

دوسرے روز حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بمعہ مولوی احسان صاحب میرٹھی اور اپنے چند رفقاء کے چھاؤنی چلے گئے۔ اور کرنل صاحب کی کوٹھی پر انتظام کیا گیا، کپتان صاحب اور کرنل صاحب نے مولانا کی بڑی آؤ بھگت کی اور ان سے مختلف مضامین پر تبادلہ خیال کیا اور داد وتحسین دیتے رہے، اور پنڈت سرسوتی کو وہاں بلاکر کرنل صاحب نے کہا کہ تم مولوی صاحب سے کیوں گفتگو نہیں کر لیتے؟ مجمع عام میں تمہارا کیا نقصان ہے۔ پنڈت جی نے کہا مجمع عام میں فساد کا اندیشہ ہے۔ (جب پنڈت جی سر بازار اسلام کے خلاف اعتراضات کرتے تھے اور لوگوں کو خوب سنا سنا کر کہتے تھے۔ اس وقت تو کوئی خطرہ اور اندیشہ نہ تھا مگر اب اندیشہ پیدا ہو گیا؟ ......) اس پر کپتان صاحب نے کہا، اچھا، ہماری کوٹھی پر گفتگو ہو جائے۔ ہم فساد کا بندوبست کر لیں گے۔ پنڈت جی نے کہا کہ ہم تو اپنی ہی کوٹھی پر گفتگو کریں گے اور پھر بھی اگر مجمع عام نہ ہو۔ جناب مولانا نے پنڈت جی سے کہا کہ لیجئے اب تو مجمع عام نہیں دس بارہ ہی آدمی ہیں۔ اب سہی، آپ اعتراض کیجئے ہم جواب دیتے ہیں۔ پنڈت جی نے کہا میں تو گفتگو کے ارادے سے نہیں آیا تھا۔ (تو مولبی کاسم کو کاہے کو للکارتے تھے اور ان کے ساتھ گفتگو کرنے پر کیوں مصر تھے؟ صفدر) مولانا نے فرمایا اب ارادہ کر لیجئے ہم آپ کے مذہب پر اعتراض کرتے ہیں۔ آپ جواب دیجئے۔ یا آپ ہم پر اعتراض کیجئے اور ہم سے جواب لیجئے۔ پنڈت جی نے ایک نہ مانی۔ شرائط کے باب میں گفتگو رہی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، مجلس برخاست ہوئی۔ جناب مولانا بھی اپنی فرودگاہ پر تشریف لائے اور کئی روز تک شرائط میں رد وبدل رہی۔ آخر الامر مولانا نے یہ کہلا بھیجا کہ پنڈت جی کسی جگہ مباحثہ کر لیں۔ بر سر بازار کر لیں، خواص میں کر لیں، عوام میں کر لیں، تنہائی میں کر لیں مگر کر لیں۔ پنڈت جی اپنی رہائشی کوٹھی پر مباحثہ کرنے کو راضی ہوئے اور وہ بھی اس شرط پر کہ دو سو سے زیادہ آدمی نہ ہوں۔ مولانا مرحوم پنڈت جی کی کوٹھی پر جانے کو تیار تھے مگر سرکار کی طرف سے ممانعت ہو گئی کہ چھاؤنی کی حد

---

(۱) بحوالہ مقدمہ انتصار الاسلام ص ۵

میں کوئی شخص گفتگو کرنے نہ پائے۔ شہر میں جنگل میں جہاں کہیں بھی جی چاہے گفتگو کر لے۔ مولانا نے پنڈت جی کو لکھا کہ نہر کے کنارے یا عیدگاہ کے میدان میں یا اور کہیں مباحثہ کر لیجئے۔ مگر پنڈت جی کو بہانہ ہاتھ آگیا۔ انہوں نے ایک نہ سنی یہی کہا کہ میری کوٹھی پر چلے آؤ۔ چونکہ سرکار کی طرف سے ممانعت ہوگئی تھی (بلکہ پنڈت جی اور ان کے حواریوں نے ممانعت کروا دی تھی ......) اس لئے جناب مولانا رحمۃ اللہ علیہ کوٹھی پر نہ جاسکے۔ اور پنڈت جی کوٹھی سے باہر نہ نکلے۔ (۱)

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا حافظ عبدالعدل صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کئی روز سر بازار پنڈت جی کے اعتراضات کے جوابات دیئے اور پنڈت جی کے مذہب پر اعتراضات کیے اور پنڈت جی اور ان کے حواریوں کو غیرت دلائی کہ جواب دو، مگر پنڈت جی اور ان کے شاگردوں اور معتقدوں کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگی۔ آخر مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اچھا پنڈت جی مع اپنے شاگردوں اور معتقدوں کے میرا وعظ ہی سن لیں۔ مگر پنڈت جی وعظ میں تو کیا آتے روڑکی سے بھی چل دیئے اور ایسے گئے کہ پتہ بھی نہ چلا کہ کدھر گئے۔ آخرش مولانا نے بہ نفس نفیس بر سر بازار تین روز تک وعظ فرمایا۔ مسلمان ہندو عیسائی اور سب چھوٹے بڑے انگریز جو روڑکی میں تھے۔ ان وعظوں میں شامل تھے ہر قسم کے لوگوں کا ہجوم تھا، مولانا نے وہ وہ دلائل مذہب اسلام کے حق ہونے پر بیان فرمائے کہ سب حیران تھے۔ اہل جلسہ پر سکتہ کا عالم تھا ہر شخص متاثر معلوم ہوتا تھا، پنڈت جی کے اعتراضوں کے وہ دندان شکن جوابات دیئے کہ مخالف بھی مان گئے۔ (۲)

پنڈت سرسوتی صاحب نے بزعم خود اصولی طور پر اسلام پر گیارہ اعتراضات کئے ہیں، جن میں سے دس کے جوابات حجۃ الاسلام حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے انتصار الاسلام میں اور گیارہویں اعتراض کا مجمل اور مفصل جواب قبلہ نما میں دیا ہے۔ دونوں کتابیں اہل علم حضرات کے لئے غنیمت اور علمی خزانہ ہیں۔

روڑکی کے بعد میرٹھ

جب پنڈت سرسوتی صاحب روڑکی سے بھاگ گئے تو پھرتے پھراتے میرٹھ پہنچے، اور

---

(۱) مقدمہ انتصار الاسلام ص ۶، ۷   (۲) مقدمہ انتصار الاسلام ص ۷

وہاں بھی مذہب اسلام پر بے سروپا اعتراضات شروع کر دیئے۔ حضرت حجتہ الاسلام مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ مرض اور ضعف میں مبتلا تھے پھر بھی رضائے الٰہی حاصل کرنے اور مذہب اسلام سے مدافعت کرنے کے لئے آپ باایں ضعف و بیماری میرٹھ پہنچے، چنانچہ پنڈت جی وہاں سے کافور ہو گئے۔ اور خود پنڈت جی تو وہاں سے چل بھی دیئے البتہ ان کے حواری لالہ انندلال نے مذہب اسلام کے خلاف ایک مضمون لکھا جس کا جواب حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "جواب ترکی بہ ترکی" میں دیا ہے۔ چنانچہ اسی کتاب "ترکی بہ ترکی" میں لکھا ہے کہ پھر پنڈت دیانند کہیں پھر پھرا کر میرٹھ پہنچے اور وہاں بھی ان کے وہی دعوے تھے۔ اور نیز اسی میں تصریح میں ہے کہ ہر چند مرض کے بقیہ اور ضعف کے سبب قوت نہ تھی، مگر ہمت کر کے میرٹھ پہنچے، اور پھر لکھا ہے کہ مولوی محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرٹھ سے بھگا کر کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ ص ۳۹، اور وہ (پنڈت جی) وہاں سے بہانہ کر کے کافور ہو گیا۔ اس سب واقعہ کی تفصیل سوانح قاسمی (جلد دوم، ص ۵۱۲، ۵۱۳) مصنفہ (گیلانی) میں مذکور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کچھ ایسے حواس باختہ ہو گئے تھے کہ ان کو نہ تو فرار کے علاوہ کوئی راہ نظر آتی تھی اور نہ سر چھپانے کے لئے کوئی اوٹ ؎

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبال دوش ۔۔۔ صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

ان حضرات کی یہ اسلامی خدمات صرف ہندوستان ہی میں مشہور نہیں بلکہ مرکز ایمان مکہ مکرمہ وغیرہ میں بھی معروف ہیں۔ چنانچہ مکہ مکرمہ کے ایک رسالہ میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ :-

"اور حقیقت یہ ہے کہ آریوں کے دیانند سرسوتی کے مقابلہ کے لئے خاص طور پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور تائید غیبی ہی کا نشان ہے۔ اور پھر جس طرح عقائد حقہ کی اشاعت اور رد بدعات کا اہم کام مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور اس جماعت کے دیگر مقدس افراد کے ذریعہ انجام پایا اس کے آثارِ باقیہ اب بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔"(۱)

اور مؤرخ اسلام حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے حیات شبلی کے دیباچہ میں ان اکابر کی علمی اور اصلاحی خدمات کا عمدہ تذکرہ کیا ہے۔

---

(۱) ملاحظہ ہو ایک مجاہد معمار، ص ۷، شائع کردہ مرکزی دفتر دار العلوم حرم صولتیہ مکہ مکرمہ۔

کچھ اپنوں کے بارے میں

یہ جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے کہ جابر برطانیہ پادریوں اور آریوں کے فتنے اسلام کے خلاف جو کچھ کرتے رہے وہ تو انہوں نے کیا ہی مگر صد افسوس ہے کہ پیغمبر عربی ﷺ کے لگائے ہوئے اور خون پسینہ سے سینچے ہوئے باغ کو ویران کرنے کی کوشش میں صرف دشمن ہی نہیں بلکہ محبّ نما دوست بھی مصروف تھے۔ معصیت اور جہالت کی گھنگھور گھٹائیں امنڈ امنڈ کر ہندوستان پر محیط ہوگئی تھیں، بھولے بھالے مسلمان ہندوؤں کی روش اور ان کے رسم ورواج کے کچھ ایسے غلام اور دلدادہ بن چکے تھے۔ کہ بجائے سنت نبوی (علی صاحبها الف الف تحية) انہی رسوم ورواجوں میں ان کو جس کروٹ کوئی لٹاتا وہ لیٹتے اور جس پہلو ان کو کوئی بٹھاتا وہ بیٹھتے، دین سے غفلت اور بے خبری اکثر مسلمانوں کے دلوں پر اس طرح چھائی ہوئی تھی جس طرح موسم برسات میں سیاہ اور گھنے بادل آفتاب کو ڈھانپ لیتے اور دن کو رات بنا دیتے ہیں۔ غرضیکہ دلوں کی کایا کچھ ایسے رنگ میں پلٹی ہوئی تھی کہ بربادی کا نام شادی، جہل کا نام علم، مشرکانہ رسوم کا نام دین، اور خرافات وشعبدہ بازی کا نام کشف وکرامت تجویز کر رکھا تھا۔ ضلالت اور گمراہی کا طوفان ہدایت ورشد کی مضبوط دیواروں سے ٹکراتا اور شور مچاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ علم شریعت کی تحقیر اور سنت نبویہ کی تذلیل وتوہین بڑھتی جاتی تھی۔ عوام علماء حق سے اپنے آپ کو مستغنی اور بے نیاز سمجھتے، محدثات اور بدعات کو جزو اسلام بنالیا گیا تھا۔ کہیں نیچریت سر اٹھاتی تھی تو کہیں اہل بدعت بدعات میں منہمک تھے۔ کہیں رفض وتشیع کا غلبہ تھا تو کہیں عدم تقلید جنم لے رہی تھی۔ کہیں ڈھولی وسارنگی کھڑکتی اور قوالیاں ہوتی تھیں تو کہیں بازاری عورتوں کے گانے پر وجد وحال کی محفلیں گرم دکھائی دیتی تھیں، کہیں گورپرستی اور تعزیہ پرستی کا عروج تھا تو کہیں حب جاہ ومال اور طمع نفسانی کی امنگیں پورے جوبن پر تھیں۔

اس وقت ایسے حالات کو دیکھ کر اہل دل حضرات پر کیا گزرتی ہوگی۔ پوچھنا ہی کیا! ؎

بیمار غم کا حال خود آنکھوں سے دیکھ لو
کیا پوچھتے ہو دل پہ جو گزری گزر گئی!

یہ وہ حالات تھے جن میں دار العلوم قائم ہوا اور اس نے پھر جو خدمات سرانجام دیں اس کا ایک خاکہ اس کتاب میں موجود ہے۔

عشقِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر چند واقعات

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء کار اور عقیدت مندوں کو جس درجہ اور جس قدر والہانہ عشق ومحبت اور اخلاص وعقیدت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اس کا انکار بغیر کسی تعصب اور سوائے کسی معاند وجاہل کے اور کوئی نہیں کرسکتا۔ رومانی افسانوں میں مجنوں بنی عامر کے عشق ومحبت کے بڑے بڑے افسانے زبان زدِ خلائق ہیں۔ لیکن اگر مجنوں سگِ کوچہ لیلیٰ پر فدا تھا تو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقائے کار مدینہ طیبہ کی مبارک گلیوں کے ذرّات پر قربان ونثار تھے۔ اگر مجنوں لیلیٰ کے عشق میں مجبور ومقہور تھا تو یہ حضرات عشق محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں بے چین وبے قرار تھے، اگر مجنوں لیلیٰ کی اداؤں پر مفتون تھا تو یہ حضرات اپنے آخر الزماں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری سنتوں کے شیدائی تھے۔ اگر مجنوں لیلیٰ کے اُنس والفت کے دام میں گرفتار تھا تو یہ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق وعلاقہ پر نثار تھے۔ اور آپ کے لگاؤ اور آپ کی پسند کو جانِ عزیز سے بھی زیادہ قیمتی سمجھتے تھے، کیونکہ وہ یہ جانتے تھے اور دل سے مانتے تھے کہ دینی اور دنیوی تمام لذتوں کا سرچشمہ ہی اس برگزیدہ ہستی کے ساتھ مؤدت اور عقیدت ہے، جن کے ارشاد فرمودہ ایک جملہ کے مقابلہ میں دنیا بھر کے لعل وگوہر ہفت اقلیم کی دولت اور خزانے قطعاً کوئی وقعت وحیثیت نہیں رکھتے، اور جن کے پیارے اقوال وافعال اور اسوۂ حسنہ کے مقابلہ میں کوئی لذیذ سے لذیذ اور خوش آئند سے خوش آئند چیز بھی ایک رتی بھر کا وزن نہیں رکھتی، جن کا اسم گرامی دنیا کی تمام شیرینیوں اور شربتوں سے میٹھا اور جن کی ایک ادنیٰ سنت بھی جواہرات سے مرصّع تاج شاہی سے بھی زیادہ مرغوب وپسندیدہ ہے۔ کیا ہی خوش قسمت ہے وہ قوم جس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا افضل المخلوقات نبی اور آپ کی شریعت جیسی بیش بہا شریعت مل گئی۔ جس کے بعد کسی اور خوبی کی سرے سے کوئی حاجت ہی باقی نہیں رہتی کیا خوب کہا گیا ہے کہ ؎

شراب خوش گوارم ہست ویار مہرباں ساقی
ندارد ہیچ کس یارے چنیں یارے کہ من دارم

حضرت حجتہ الاسلام مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے عشق نبوی (علی صاحبہ الف الف تحسیة وسلام) کے واقعات قولی اور فعلی تو بہت کچھ ہیں جن کے بیان کرنے کے لئے دفتر درکار ہیں ہم صرف چند واقعات بطور نمونہ پیش کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ہندوستان میں بعض حضرات (سبز رنگ) کا جوتا بڑے شوق سے پہنتے تھے اور اب بھی پہنتے ہیں لیکن حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا جوتا مدّت العمر کبھی نہیں پہنا، اور اگر کوئی تحفہ لادیتا تو اس کے پہننے سے اجتناب وگریز کرتے اور آگے کسی کو ہدیہ دے دیتے۔ اور سبز رنگ کا جوتا پہننے سے محض اس لئے گریز کرتے کہ سرور کائنات آقائے دوجہاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے گنبدِ خضراء کا رنگ سبز ہے، پھر بھلا ایسے رنگ کے جوتے پاؤں پر کیسے اور کیونکر استعمال کیے جاسکتے ہیں؟ چنانچہ شیخ العرب والعجم حضرت استاذ المکرّم مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۷۷ھ ۱۹۵۷ء) حجتہ الاسلام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بیان کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ :۔

"تمام عمر سبز رنگ کا جوتا اس وجہ سے کہ قبہ مبارک سبز رنگ کا ہے نہ پہنا اگر کوئی ہدیہ لے آیا تو کسی دوسرے کو دے دیا۔"(۱)

اندازہ کیجئے اس نظر بصیرت اور فریفتگی کا، گنبد خضراء کے ظاہری رنگ کے ساتھ کس قدر عقیدت والفت ہے۔ جس کے اندر عظیم المرتبت مکین آرام فرما ہیں، جن کی نظیر، جن کی مثال اور جن کا ثانی خدا تعالیٰ کی ساری مخلوق میں نہ آج تک وجود میں آیا اور نہ تا قیامت آسکتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے شاید اسی کی ترجمانی کی ہے ؎

رُخِ مصطفیٰ ہے وُہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزمِ خیال میں نہ دوکانِ آئینہ ساز میں

(۲) حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جب حج کے لئے تشریف لے گئے تو مدینہ طیبہ سے کئی میل دُور ہی سے پابرہنہ چلتے رہے۔ آپ کے دل اور ضمیر نے یہ اجازت نہ دی کہ دیارِ حبیبؐ میں جوتا پہن کر چلیں۔ حالانکہ وہاں سخت نوکیلے سنگریزے اور چبھنے والے پتھروں کی

---

(۱) الشہاب الثاقب ص ۵۴

بھر مار ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ، جناب مولانا حکیم منصور علی خاں صاحب حیدر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں جو اس سفر حج میں حجۃ الاسلام کے رفیق سفر تھے کہ :۔

"مولانا مرحوم مدینہ منورہ تک کئی میل آخر شبِ تاریک میں اسی طرح چل کر پابرہنہ پہنچ گئے"۔(۱)

اور نیز حکیم موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ ہی سے ارقام فرماتے ہیں کہ :۔

"جب منزل بہ منزل مدینہ شریف کے قریب ہمارا قافلہ پہنچا، جہاں سے روضۂ پاک صاحبِ لولاک نظر آتا تھا۔ فوراً جناب مولانا (محمد قاسم صاحبؒ مرحوم) نے اپنے نعلین اتار کر بغل میں دبالیں اور پابرہنہ چلنا شروع کیا۔"

ملاحظہ فرمایئے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو مدینہ طیبہ اور گنبدِ خضراء کے ساتھ کس قدر عقیدت اور کیسی فریفتگی تھی، اور دیکھئے کہ تادّب حسن کا کیا ہی بہترین طریقہ اختیار فرما کر اپنی فرطِ محبت کا اظہار فرمایا، اور یہ ساری عقیدت و محبت جناب امام الانبیاء خاتم الرسل حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے۔ ورنہ اس سنگلاخ رقبہ اور پتھریلی زمین کی فی نفسہٖ کیا قدر ہے؟ جو کچھ بھی ہے اور جتنی کچھ بھی ہے وہ حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی بدولت ہے، اور آپ ہی کے واسطہ سے ہے، اور ایسے ہی موقع کے لئے کشتۂ عشق نے یہ کہا ہے کہ :۔

وما حب الدیار شغفن قلبی

ولکن حب من نزل الدیارا

میرا اور میرے تمام اکابر کا یہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کا وہ حصہ جو آپ کے جسد اطہر سے لگتا ہے۔ عرش سے بھی زیادہ مرتبہ اور فوقیت رکھتا ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو وفاء الوفاء، ج ۱ ص، ۱۹، سیرت حلبی ج ۲ ص، ۳۲ اور روح المعانی ج ۱۵ ص، ۲۲۱) اور اس کی وجہ بھی صرف اور صرف یہ ہے کہ ؎

عرش پر گر فرش بھاری ہے تو ہے اس خاک سے
جس میں محو خواب ہے کون و مکاں کا تاجدار

(۳) انگریز کے خلاف جہاد ۱۸۵۷ء میں دیگر اکابر کی طرح حضرت حجۃ الاسلام

---

(۱) سوانح قاسمی ج ۳ ص ۶۱ (۲) ایضاً ص ۶۰، ۶۱

مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بھی بہ نفس نفیس خود شاملی وغیرہ میں شامل تھے اور زخمی بھی ہوئے تھے۔ اور تذکرۃ الرشید کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ جب ظالم انگریز کی طرف سے حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے اور گرفتار کنندہ کے لئے صلہ تجویز ہو چکا تھا۔ اس لئے لوگ تلاش میں ساعی اور حراست کی تگ ودو میں پھرتے تھے۔ تو چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو کمال شجاعت، استقلال اور ہمت قلب عطا فرمائی تھی اس لئے وہ ہر قسم کے نتیجہ سے بے نیاز ہو کر کھلے بندوں پھرتے تھے۔ مگر اعزہ اور اقارب اور ہمدردوں کی طرف سے جب شدید اور بلیغ اصرار ہوا کہ حضرت وقت کی نزاکت کے پیش نظر ضرور روپوش ہو جائیں۔ تو ان کے اصرار کی وجہ سے تین دن روپوش رہے اور لکھا ہے کہ:۔

> "تین دن پورے ہوتے ہی ایک دم باہر نکل آئے اور کھلے بندوں پھرنے چلنے لگے۔ لوگوں نے پھر بمنت روپوشی کیلئے عرض کیا تو فرمایا کہ تین دن سے زیادہ روپوش ہونا سنت سے ثابت نہیں، کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غار ثور میں تین ہی دن روپوش رہے ہیں" (۱)

داد دیجئے اس جذبۂ اتباعِ سنت کی، کہ ظالم انگریز ان دنوں اہل ہند پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً سفاکانہ اور قاتلانہ حربے استعمال کر رہا تھا۔ اور نہایت بے دردی کے ساتھ مظلوموں کے ناحق خون سے ہولی کھیلتا تھا وہ کونسی حیا سوز اور دل آزار حرکت تھی جو اس ظالم نے مجاہدوں کے خلاف روا نہ رکھی تھی، اور وہ کونسی غیر انسانی کارروائی تھی جو اس نے چھوڑی تھی؟ اس وقت انگریز کا ظلم وجور اور تعدی وستم اپنے نقطۂ عروج پر تھا۔ لیکن حجۃ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اپنی حیات سے بے نیاز ہو کر اس موقعہ پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اضطراری کو ترک کرنے پر باوجود شدید اصرار کے آمادہ نہ ہوئے اور تین دن کے بعد فوراً باہر نکل آئے اور کھلے بندوں پھرنے لگے۔ اور اس روپوشی کی حالت میں بھی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے عشق ومحبت کا تعلق اور رابطہ مستحکم ہی رکھا، اور اس نازک حالت میں بھی سنت پر نگاہ جمی رہی ؎

تھا اسیری میں بھی کچھ ایسا تعلق رُوح کو
ہم قفس میں روز خوابِ آشیاں دیکھا کیے

(۱) سوانح قاسمی ج ۲ ص ۱۷۲، ۱۷۳۔ از مولانا گیلانی

(۴) حضرت حجتہ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے نظم اور نثر میں آنحضرت ﷺ کی جو مدح اور تعریف بیان کی ہے اور جس خلوص و عقیدت سے اس کا اظہار کیا ہے ان کی کتابوں کو پڑھنے اور دیکھنے والا بجز کسی متعصب کے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تمام کتابوں کی عبارتیں جو نظم و نثر میں آپ نے سرور دو جہاں ﷺ کی توصیف و تعریف میں بیان فرمائی ہیں نقل اور پیش کرنا تو کارے دارد، صرف بطور نمونہ ہم قصائد قاسمی کے پہلے قصیدہ سے (جو ایک سو اکیاون اشعار پر حاوی ہے۔) صرف چند اشعار بلا رعایت ترتیب پیش کرتے ہیں ۔

فلک پہ عیسیٰ و ادریس ہیں تو خیر سہی | زمیں پہ جلوہ نما ہیں محمد مختار
فلک پہ سب سہی پر ہے نہ ثانی محمدؐ | زمیں پہ کچھ نہ ہو پر ہے محمدی سرکار

تو فخر کون و مکاں زبدۂ زمین و زماں | امیر لشکر پیغمبراں شہ ابرار
خدا تیرا ہے تو خدا کا حبیب اور محبوب | خدا ہے آپ کا عاشق تم اسکے عاشق زار
تو بوئے گل ہے اگر مثل گل ہیں اور | نبی تو نور شمس اگر اور انبیاء ہیں شمس نہار

جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں | تیرے کمال کسی میں نہیں مگر دو چار
بجز خدائی نہیں چھوٹا تجھ سے کوئی مکاں | بغیر بندگی کیا ہے لگے جو تجھ کو عار

کہاں بلندیٔ طور اور کہاں تری معراج | کہیں ہوئے ہیں زمین آسمان بھی ہموار
جمال کو ترے کب پہنچے حسن یوسف کا | وہ دل ربائے زلیخا تو شاہد ستار
رہا جمال پہ تیرے حجاب بشریت | نجانا کون ہے کچھ بھی کسی نے جز ستار!
سوا خدا کے بھلا تجھ کو کوئی کیا جانے | تو شمس نور ہے شپرّ نمط اولوا الابصار!

کفیل جرم اگر آپ کی شفاعت ہو | تو قاسمی بھی طریقہ ہو صوفیوں میں شمار
ترے بھروسہ پہ رکھتا ہے غرۂ طاعت | گناہ قاسم برگشتہ بخت بداطوار
گناہ کیا ہے اگر کچھ گناہ کیے میں نے | تجھے شفیع کون کہے گر نہ ہوں بدکار
تمہارے حرف شکایت پہ عفو ہے عاشق | اگر گناہ کو ہے خوف غصۂ قہار،
یہ سن کے آپ شفیع گناہ گاراں ہیں | کیے ہیں میں نے اکٹھے گناہ کے انبار

مدد کر اے کرمِ احمدی کہ تیرے سوا
نہیں ہے قاسم بیکس کا کوئی حامی کار

دیا ہے حق نے تجھے سب سے مرتبہ عالی
کیا ہے سارے بڑوں چھوٹوں کا تجھے سردار

جو تو ہی ہم کو نہ پوچھے تو کون پوچھے گا
بنے گا کون ہمارا ترے سوا غم خوار

امیدیں لاکھوں ہیں لیکن بڑی امید یہ ہے
کہ ہو سگانِ مدینہ میں میرا نام شمار

جیوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے پھروں
مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مرغ و مار

جو یہ نصیب نہ ہو اور کہاں نصیب میرے
کہ میں ہوں اور سگانِ حرم کی تیرے قطار

اڑا کے باد مری مشتِ خاک کو پس مرگ
کرے حضور کے روضہ کے آس پاس نثار

ولے یہ رتبہ کہاں مشت خاکِ قاسم کا
کہ جائے کوچۂ اطہر میں تیرے بن کے غبار (۱)

تدبر فرمایئے، کہ ایک ایک شعر میں کس طرح حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (اور آپ (۲) ہی کی بدولت مدینہ طیبہ) سے اظہار عقیدت کیا ہے اور کس طرح ایک ایک مصرع سے عشق نبوی ٹپک اور چھلک رہا ہے، اور کس شان جلالت کا اظہار ان اشعار (بلکہ سارے قصیدہ) میں کیا ہے۔ ہر باخدا اور منصف مزاج آدمی اس سے صحیح طور پر اندازہ لگا سکتا ہے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کس طرح انتہائی عقیدت اور بے حد محبت تھی اور کس طرح سوز و گداز کے ساتھ وہ اپنی بے چارگی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوِ مرتبت کا ترانہ گاتے ہیں۔ اور آپ کے عشق میں کس بے تابی، بے چینی اور بے قراری کا ذکر فرماتے ہیں۔ اور کس بیحد خوش عقیدگی کے ساتھ مدینہ طیبہ کی گلیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

(۵) نثر میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف میں جو کچھ فرمایا۔ اس پر ان کی تمام کتابیں شاہد عدل ہیں۔ ہم ان کی تصنیف لطیف قبلہ نما کا ایک حوالہ عرض کیے دیتے ہیں۔ حضرت موصوف رحمۃ اللہ علیہ پنڈت دیانند سرسوتی کے اس اعتراض کا کہ مسلمان بھی (معاذ اللہ) بت پرست ہیں کیونکہ وہ بھی قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے

---

(۱) قصیدۂ قاسمی (از صفحہ ۵ تا ۹ ملتقطا)

(۲) مولانا مرحوم ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی مکان کی طرف ہو جاتا ہے تو مکین مقصود ہوتا ہے اس طرف کو آداب و نیاز بجالاتا ہے تو آداب و نیاز کو ہر شخص صاحب خانہ کے لئے سمجھتا ہے (قبلہ نما ص ۴)

ہیں جواب دیتے ہوئے چھٹا جواب یہ تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

چھٹے۔ اہل اسلام کے نزدیک مستحق عبادت وہ ہے۔ جو بذات خود موجود ہو۔ اور سوا اس کے سب اپنے وجود و بقا میں اس کے محتاج ہوں، اور سب کے نفع و ضرر کا اس کو اختیار ہو، اور اس کا نفع و ضرر کسی سے ممکن نہ ہو۔ اس کا کمال و جمال و جلال ذاتی ہو اور سوا اس کے سب کا کمال و جلال اس کی عطا ہو۔ مگر موصوف بایں وصف ان کے نزدیک بشہادت عقل و نقل سوا ایک ذات خداوندی کے اور کوئی نہیں یہاں تک کہ ان کے نزدیک بعد خدا سب میں افضل محمد رسول اللہ ﷺ ہیں نہ کوئی آدمی ان کی برابر نہ کوئی فرشتہ نہ عرش نہ کرسی ان کے ہمسر نہ کعبہ ان کا ہم پلہ مگر بایں ہمہ ان کو بھی ہر طرح خدا تعالیٰ کا محتاج سمجھتے ہیں۔ ایک ذرہ کے بنانے کا ان کو اختیار نہیں ایک رتی برابر کسی کے نقصان کی ان کو قدرت نہیں، خالق کائنات خواہ فاعل خواہ افعال اہل اسلام کے نزدیک خدا ہے وہ نہیں۔ اسی لئے کلمہ شہادت میں مدار کار ایمان ہے یعنی اشهدان لآاِله الاالله واشهدان محمداً عبده ورسوله، خدا کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کی عبدیت اور رسالت کا اقرار کرتے ہیں۔ اس صورت میں اہل اسلام کی عبادت سوائے خدا اور کسی کے لئے متصور نہیں، اگر ہوتی تو رسول اللہ ﷺ کے لئے ہوتی، مگر جب ان کو بھی عبد ہی مانا معبود نہیں مانا۔ بلکہ ان کی فضیلت کی وجہ ان کی کمالِ عبودیت اور عبدیت کو قرار دیا تو پھر خانہ کعبہ کو ان کا معبود اور مسجود قرار دینا بجز تہمت یا کم فہمی و جہالت اور کیا ہو سکتا ہے"۔ الخ(۱)

اس سے پہلے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ پانچ جوابات اور بیان فرما چکے ہیں۔ جن میں سے بعض کا مختصر سا خلاصہ یہ ہے کہ :۔

"اہل اسلام کعبہ کی طرف منہ تو ضرور کرتے ہیں لیکن عبادت کعبہ کی نہیں کرتے، اور نہ ہی اس کو مسجود سمجھتے ہیں۔ عبادت وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی کرتے ہیں، کعبہ تو صرف ایک جہت ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار مصلحتوں

---

(۱) قبلہ نما ص ۵

کے علاوہ ایک اس مصلحت کے لئے بھی متعین فرمایا ہے تاکہ مسلمانوں کا اس یک جہتی کی وجہ سے اتفاق واتحاد قائم رہے"۔(۱)

قبلہ نما کی اس عبارت سے جہاں اللہ تعالیٰ کی خالص توحید اور جناب رسول اللہ ﷺ کی جلالت شان اور منصب رسالت واضح ہوتا ہے اس سے "مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا" وغیرہ اشعار وعبارات کا مطلب بھی بالکل عیاں وآشکار ہو جاتا ہے، کہ نہ تو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ آنحضرت ﷺ کو نافع اور ضار سمجھتے ہیں۔ اور نہ اس ارادہ سے آپ کو پکارتے اور مدد مانگتے ہیں۔ جیسا کہ بعض اہل بدعت نے سوء فہم سے یہ سمجھ رکھا ہے، بلکہ محض عشق ومحبت کے طور پر یہ نداء اور خطاب ہے نہ یہ کہ حاضر ناظر سمجھ کر ان سے استمداد کی گئی ہے وہ تو اس کو کفر لکھتے اور سمجھتے ہیں۔(۲)

---

(۱) مخلصہ بتوضیح (۲) ملاحظہ ہو فیوض قاسمی ص ۴۸

حج

اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے تین مرتبہ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو حج کرنے کی توفیق اور حبیب کبریاء صلی اللہ علیہ وسلم کے گنبدِ خضراء کی زیارت سے متمتع ہونے کا شرف عطا فرمایا ہے۔ پہلا حج انہوں نے ۱۲۶۷ھ ۱۸۶۰ء میں دوسرا ۱۲۸۶ھ ۱۸۶۹ء میں اور تیسرا ۱۲۹۴ھ ۱۸۷۷ء میں کیا ہے، اور ان اسفار میں جو روحانی لذت انہوں نے محسوس کی وہ صرف انکا قلب مبارک ہی ادراک کرسکتا تھا۔ دوسرا بھلا اس کو سمجھے تو کیونکر سمجھے، اور بیان کرے تو کیسے بیان کرے ۔

واعظم ما یکون الشوق یوماً
اذا دنت الخیام من الخیام

حفظِ قرآن کریم

حضرت نانوتویؒ تصحیح کتب اور دینی بحث ومباحثہ اور سرگرمیوں میں ایسے منہمک رہتے تھے کہ ان اہم دینی کاموں سے فراغت کا موقعہ ہی ہاتھ نہ آتا تھا۔ اور دل میں قرآن کے حفظ کا جو شوق تھا وہ کب چین لینے دیتا تھا۔ بالاخر دو سال کے صرف دو رمضان میں قرآن پاک یاد کرلیا اور ایسی روانی کے ساتھ سناتے تھے کہ کوئی کہنہ مشق پختہ کار حافظ بھی شاید ایسا نہ سنا سکتا ہو، چنانچہ خود ان کا اپنا بیان سوانح قاسمی ۱۴، از مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں ہے۔

”فقط دو سال رمضان میں میں نے یاد کیا ہے اور جب یاد کیا پاؤ سیپارہ کے قدر یا کچھ اس سے زائد یاد کرلیا اور جب سنایا ایسا صاف سنایا جیسے اچھے پرانے حافظ“۔

اور یہ کلام اللہ کی عظمت اور اس کی طرف پوری توجہ اور محبت کا نتیجہ تھا کہ اس کا ایک ایک حرف سینہ میں نقش ہوگیا:۔

ترکی بھی شیریں تازی بھی شیریں
حرف محبت نہ ترکی نہ تازی

زندگی کے آخری ایّام (۱)

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جب ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں حج کیلئے تشریف لے گئے تھے، جس سفر حج میں جلیل القدر اور اس دور کے مشاہیر علماء کی ایک بڑی جماعت شریک تھی، اسی حج سے واپسی میں جہاز کے اندر آپ سخت بیمار ہو گئے، جہاز میں علاج کی سہولتوں کے نہ ہونے سے مرض بڑھتا چلا گیا، جہاز میں وبائی بیماری پھیل چکی تھی، روزانہ ایک دو آدمی انتقال کر رہے تھے، صورت حال انتہائی تشویشناک تھی، ہمارے ملک کی آب و ہوا اور مزاج کے لحاظ سے جو علاج ہونا چاہئے تھا وہ میسر نہ ہو سکا، اس لئے کمزوری اور نقاہت اس درجہ بڑھ گئی کہ اٹھنے بیٹھنے سے معذوری ہوگئی تھی، جہاز کے ڈاکٹر نے بعض دوائیں دیں اور مرغ کا جوس پلانے کیلئے کہا اور خود ہی مرغ بھی فراہم کر دیا جس کی وجہ قدرے افاقہ رہا۔ عدن کے مقام پر جہاز روک دیا گیا۔ مگر جہاز والوں کو جہاز سے اترنے اور شہر میں جانے سے روک دیا گیا، اس لئے یہاں بھی ضرورت کی دوائیں میسر نہیں ہوئیں۔ البتہ کچھ لیموں اور سنترے مل گئے جب اس کا استعمال ہوا تو طبیعت قدرے سنبھلی۔ آپ کی بیماری کی حالت میں جہاز بمبئی پہونچا۔ اس سفر میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمد منیر نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حکیم منصور احمد مرادآبادی خصوصی تیمار دار تھے، ہمہ وقت ایک شخص آپ کے پاس ضرور رہتا تھا بمبئی پہنچ کر قدرے افاقہ ہوا اور اتنی بدن میں طاقت آ گئی کہ اٹھنے بیٹھنے لگے تھے۔ لیکن ضعف و نقاہت کی وجہ سے جہاز سے اترنے کے بعد فوراً بعد ہی ٹرین سے سفر شروع نہیں کیا گیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہاں کچھ دن ٹھہر کر بہتر علاج و معالجہ کے بعد جب جسم میں کچھ طاقت آجائے تب ٹرین کا سفر کیا جائے۔ تقریباً تین چار دن آپ حضرات حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا بمبئی میں علاج کراتے رہے۔ طبیعت صحت کی طرف لوٹ رہی تھی، جسم میں طاقت بھی

---

(۱) حضرت نانوتوی کی حیات مبارکہ کے آخری ایام کے یہ حالات جناب مولانا اسیر ادروی صاحب کی تالیف "مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے" از ص ۲۲۰ تا ۲۳۲ سے ماخوذ ہیں۔ (محمد عمران قاسمی)

کچھ آنے لگی تھی تب پھر ٹرین کا سفر شروع ہوا، اور اپنے وطن کیلئے بمبئی سے روانہ ہوئے۔

وطن آنے کے بعد اصل مرض تو ختم ہو گیا لیکن ضیق النفس اور کھانسی جم گئی، اور دورے پڑنے لگے، جب بھی کچھ دیر گفتگو فرماتے تو کھانسی بڑھ جاتی، مگر اسی حالت میں آپ نے اسباق شروع کرادیئے اور ترمذی شریف طلبہ کی ایک جماعت کو پڑھانے لگے، مولانا عبد الرحمٰن محدث امروہوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی دور میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے شرف تلمذ حاصل کیا اور آپ کے اسی درس ترمذی میں وہ شریک تھے۔

اسی بیماری کے زمانہ میں آپ نے روڑکی اور میرٹھ کے دو سفر بھی کئے، جو پنڈت دیانند سرسوتی کی فتنہ انگیزی کی وجہ سے کرنا پڑے تھے۔ آپ نے ان اسفار میں گھنٹوں کئی دن تقریریں بھی کیں جس کا اثر آپ کی صحت پر پڑا۔ اور مرض میں شدت ہوتی گئی، اس طرح دو سال تک مسلسل طبیعت ناساز رہی، کبھی بیماری بڑھ جاتی، کبھی کم بھی رہتی کلی طور پر اس دوران کبھی صحت نہیں ہوئی علاج کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس شدید بیماری سے قبل اگر کبھی طبیعت ناساز ہوتی تھی تو علاج و معالجہ پر زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے، اولاً تو اللہ کے فضل سے شاذ و نادر ہی بیمار پڑتے تھے اگر بیمار پڑتے تو علاج اپنی صواب دید سے خود ہی کر لیتے تھے۔ لیکن اپنی عادت اور مزاج کے برخلاف اب کی بار اس مرض میں جو دوا بتائی گئی اور کھلائی گئی بلا تکلف کھالی اور کسی دوا سے انکار نہیں فرمایا۔

علاج و معالجہ

وطن واپسی کے بعد حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک جاں نثار و فداکار ارادت مند حکیم مشتاق احمد دیوبندی نے آپ کا علاج اپنے ہاتھوں میں لے لیا، حکیم صاحب طبیب حاذق تھے اور بہت ہی ذہین و فطین اور بڑے تجربہ کار اور ماہر مانے جاتے تھے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ان کی ذہانت و فطانت کے معترف تھے، ان کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے بے پناہ عقیدت تھی، اس لئے پوری دل جمعی اور بڑی تندہی سے علاج کر رہے تھے۔ دوائیں تجویز کرنا، تیار کرانا، استعمال کرانا، یہ سارا کام آپ اپنی نگرانی میں کراتے تھے، اور مسلسل رفتار صحت پر نظر رکھتے تھے اور ہر تبدیلی کو ذہن پر نوٹ کرتے رہتے تھے۔ اور اسی کے پیش نظر دواؤں میں تبدیلی کرتے رہتے تھے۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود مرض نہیں جاتا تھا اور دواؤں سے

کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ مرض بڑھتا جارہا تھا۔ بہتر سے بہتر یونانی ادویہ فراہم کی گئیں لیکن مرض بدستور رہا، ضیق النفس اور سانس کی شکایت بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک اور مخلص عقیدت مند ڈاکٹر عبد الرحمٰن تھے جو مظفر نگر جیل کے سرکاری ڈاکٹر تھے۔ ان کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی بیماری کی تفصیل معلوم ہوئی تو انہوں نے از خود اپنی خدمات پیش کیں، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے جب منظور فرمالیا تو ڈاکٹر صاحب آپ کو مظفر نگر لے گئے، اب معالج بھی وہی تھے اور تیمار دار بھی وہی، بلکہ ساری خدمت وہی انجام دیتے تھے۔ مظفر نگر جانے کے بعد علاج کے ابتدائی مرحلے میں افاقہ ہوا اور آرام کی صورت نظر آئی مگر اصل مرض باقی رہا اور ہر وقت خفیف سی حرارت رہا کرتی تھی، یونانی، ایلوپیتھک اور آیورویدک طریقۂ علاج اختیار کیا جاتا رہا، مہنگی اور بیش قیمت سے بیش قیمت دوائیں فراہم کی گئیں اور استعمال کرائی گئیں لیکن کوئی فائدہ نظر نہیں آرہا تھا۔

سانس کا دورہ بڑھتا ہی جارہی تھا جس کی وجہ سے لاغری اور ضعف اپنی انتہائی کو پہنچ چکا تھا، اب اٹھنا بیٹھنا دشوار ہوتا جارہا تھا لیکن قوت ارادی اب بھی پہلے جیسی تھی، تحمل وضبط جو آپ کا ایک امتیازی وصف تھا وہ اس بیماری میں بھی اپنی جگہ قائم رہا۔

محدث سہارنپوریؒ کی عیادت

مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ سے آپ نے ابوداؤد شریف پڑھی تھی اس لئے آپ کے استاذ تھے، وہ مصحح بخاری بھی تھے اور احادیث کی کتابوں کے ہندوستان میں سب سے پہلے ناشر بھی، ان پر فالج کا حملہ ہوا، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو اسکی اطلاع ملی تو سن کر بے چین ہوگئے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو ان سے تلمذ کا بھی تعلق تھا اور انہیں کے مطبع میں عرصہ تک تصحیح کتب، تصحیح بخاری اور تحشیہ کی خدمات بھی انجام دی تھیں، اسی طرح محدث سہارنپوریؒ کیلئے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں بڑی عظمت اور بڑا احترام تھا فالج کے حملہ کی خبر سنتے ہی آپ نے تیمار داروں سے فرمایا کہ مجھے سہارنپور لے چلو، عرض کیا کہ آپ سفر کے متحمل نہیں ہوسکتے، لیکن آپ کا اصرار بحال رہا، آخر آپ کو سہارنپور لے جایا گیا اور عیادت کے بعد اسی شام کو سہارنپور سے دیوبند لایا گیا، اتنی ہی نقل وحرکت کا اثر کمزور جسم پر زیادہ پڑا چند دنوں میں کچھ افاقہ ہوا، تو پھر سہارنپور کے لئے اصرار کیا جانے لگا، کسی نے انکار نہیں کیا

اور حسب الحکم آپ کو محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچا دیا گیا، محدث سہارنپوری پر فالج کی شدت کا اثر اب کچھ کم ہو چکا تھا اور گفتگو کرنے لگے تھے، آپ نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ اب آپ چند دنوں تک میرے یہاں قیام کریں، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے تسلیم کر لیا اور دو ہفتے تک وہیں قیام فرمایا، مگر معمول بدل جانے سے یہاں پھر ضیق النفس کا دورہ ہونے لگا اور اسی کیساتھ ذات الجنب کی شکایت مزید پیدا ہوگئی، دیو بند اطلاع پہنچی تو یہاں سے حافظ انوار الحق صاحب بھیجے گئے۔ اور اسی دن حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو لے کر دیو بند واپس آئے۔ یہ ربیع الثانی ۱۲۹۷ء کی آخری تاریخیں تھیں، معالجین کے مشورہ سے فصد لی گئی جس سے فوری طور پر فائدہ یہ ہوا کہ درد کی شدت کم ہوگئی اور بظاہر آرام معلوم ہونے لگا لیکن درد پھر عود کر آیا، دوسری تدابیر اختیار کی گئیں، انہیں دنوں دہلی سے کچھ مقوی دوائیں منگائی گئی تھیں تاکہ جسم میں کچھ طاقت آجائے، دوا استعمال کرائی گئی مگر ان مقوی دواؤں کے استعمال سے حرارت میں شدت پیدا ہوگئی اور کبھی کبھی تو غفلت ہو جاتی تھی۔

حکیم صاحب نے مشورہ دیا کہ معدہ کا تنقیہ کیا جائے تو شاید حرارت میں کمی آئے، دوبار ملین دوائیں دی گئیں جس کی وجہ سے اجابت تو ہوئی، مگر کمزوری حد سے بڑھ گئی اور زیادہ وقت غفلت اور بیہوشی میں گذرتا تھا، یہ منگل کا دن تھا، ظہر کا وقت ہو چکا تھا، اذان ہوئی تو بتایا گیا کہ ظہر کی نماز کا وقت ہوگیا ہے اسی غفلت میں ہلکی سی آواز میں "اچھا" کہا اور پھر غفلت طاری ہوگئی، شب میں تشنج شروع ہوا، چہار شنبہ کا پورا دن بھی غفلت اور کبھی کبھی تشنج میں گذرا، امید و بیم کے یہ تین دن خدام اور ارادتمندوں کیلئے بڑے جان گسل تھے، مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دار العلوم دیو بند نے اطراف و جوانب کے متعلقین اور ارادت مندوں کو خطوط لکھ کر اس خطرناک علالت سے مطلع کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے مراد آباد، امروہہ، میرٹھ سہارنپور، گنگوہ، نانوتہ وغیرہ سے ایک بھیڑ دیو بند میں جمع ہوگئی، جمعرات کو دن میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو آپ کے رہائشی مکان میں لے جایا جائے، خدام نے مل کر چارپائی اٹھائی اور آپ کو مکان پر پہنچایا گیا۔ ایک دن قبل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی تشریف لا چکے تھے اور جب سے تشریف لائے تھے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی چارپائی سے لگے بیٹھے رہے، نمازوں اور دعاؤں میں مستقل مشغول رہے، طالب علمی کے دور سے جس کا ساتھ رہا ایک شیخ کے دونوں خلیفہ ہوئے، ایک ساتھ دین کی سربلندی کیلئے دونوں

میدانِ جہاد میں اترے، اسلام کی مدافعت میں خارجی فتنوں سے مقابلہ کرتے رہے اور مسلمانوں کو داخلی غلطیوں اور مشرکانہ عقائد کی گمراہیوں سے نجات دلانے کیلئے شب و روز نبرد آزما رہے۔ زندگی کی کئی دہائیوں سے جس کی رفاقت حاصل تھی آج وہی مخلص، صداقت شعار رفیق اور ساتھی جدا ہو رہا ہے۔

وفات

۴ر جمادی الاول ۱۲۹۷ھ (اپریل ۱۸۷۹ء) کی تاریخ اور جمعرات کا دن تھا کہ بعد نماز ظہر حجتہ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند نے اس جہان فانی سے کوچ کیا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ہر طرف صف ماتم بچھ گئی۔ جاں نثاروں اور عقیدت مندوں میں کہرام مچ گیا، ہر چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا، انتقال کے وقت آپکی عمر ۴۹ سال تھی۔

تدفین

آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ مجھے گور غریباں میں دفن کیا جائے۔ حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک زمین خرید کر کے اس کو قبرستان کیلئے وقف کر دیا تھا، اسی زمین میں قبر کی جگہ تجویز کی گئی۔ عصر کے وقت جنازہ تیار ہو گیا اور مدرسہ کے صحن میں لا کر رکھ دیا گیا، نماز جنازہ میں شرکت کرنے والوں کی کثرت کی وجہ سے یہاں نماز جنازہ کی گنجائش نہیں تھی اس لئے قصبہ کے باہر میدان میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور نماز مغرب کے بعد تدفین عمل میں آئی۔

اولاد و احفاد

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی شادی دیوبند کے رئیس شیخ کرامت حسین صاحب کی صاحب زادی سے ہوئی تھی، اگرچہ وہ ایک رئیس گھرانے کی فرد تھیں، لیکن حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ذہن و مزاج کے سانچے میں ڈھل گئی تھیں، ریاست کے سارے طور طریق ترک کر دیئے تھے۔ زیورات اور ساز و سامان کی کثرت اب ان کیلئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی، بہت منتظم اور امور خانہ میں ماہر تھیں۔ تنگدستی کے زمانہ میں بھی گھر کی عزت و آبرو کو بچائے رکھا اور بعد میں فارغ البالی کے زمانہ میں فیاضی و سخاوت کا اعلیٰ نمونہ بھی پیش کیا، حضرت

نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ان سے دس اولاد ہوئیں، تین لڑکے مولانا حافظ محمد احمد، محمد ہاشم اور محمد میاں۔ محمد میاں بچپن ہی میں انتقال کر گئے، محمد ہاشم نے عنفوان شباب میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی، آپ کا خاندان حافظ احمد صاحب سے چلا، مرحوم ریاست حیدر آباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے، دار العلوم دیوبند کے عرصۂ دراز تک مہتمم رہے۔ آپ کے تین صاحب زادے ہوئے، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دار العلوم دیوبند، دوسرے مولانا محمد طاہر اول، تیسرے محمد طاہر ثانی، قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کی پانچ لڑکیاں اور چار لڑکے ہوئے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاف میں مسلسل اہل علم پیدا ہوتے رہے۔

ذیل میں ہم اس علمی خاندان کا نقشہ نقل کر رہے ہیں جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس میں کیسے کیسے گوہر آبدار پیدا ہوتے رہے ہیں۔

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ

محمد ہاشم — محمد میاں — حافظ احمد — رفیعہ — خدیجہ — مریم — عائشہ — اکرام النساء

اکرام النساء: اسم نا معلوم — اسم نا معلوم

حافظ احمد: قاری محمد طیب — طاہر اول — طاہر ثانی — فاطمہ — طیبہ

قاری محمد طیب: محمد سالم — محمد عاصم — محمد اسلم — محمد اعظم — فاطمہ — ہاجرہ — حمیرا — عذراء — رشیدہ
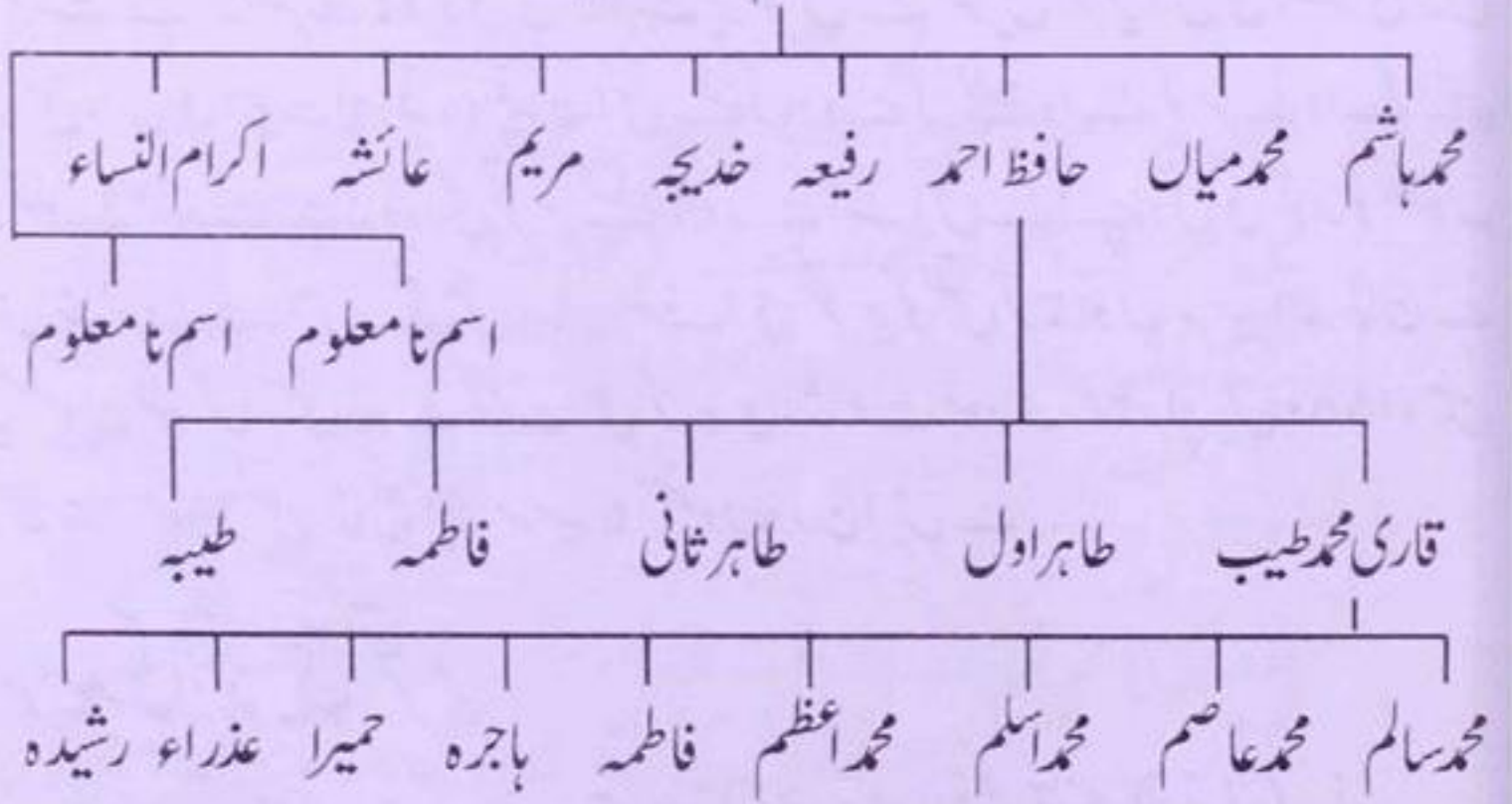
مرثیے اور تعزیتی تحریریں

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے سانحۂ وفات کے بعد جلیل القدر علماء، مشائخ اور ممتاز اہل علم نے اپنے تاثرات کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا، امام العارفین قدوۃ السالکین حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے وقت آپ کی چارپائی کے پاس موجود تھے، جب طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا تو اپنی دل کی شدید

چوٹ کے اظہار کے لئے جو الفاظ استعمال فرمائے وہ آج بھی پڑھئے تو آپ کے درد وکرب کی شدت کا احساس جاگ جاتا ہے، آپ نے فرمایا۔

''اگر وہ بات نہ ہوتی تو میں مولانا کے صدمہ کا تحمل نہیں کر سکتا تھا بلکہ مر جاتا''

اکابر علماء میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر المدرسین دار العلوم دیوبند، مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے اردو، فارسی اور عربی میں دردناک اور طویل مرثیے لکھے ہیں۔

ایک تعزیتی تحریر ایک ایسے حلقہ کی ہے جس سے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی رسم وراہ نہیں تھی، اور نہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اس طبقہ کی سرگرمیوں سے مطمئن تھے۔ بلکہ اس کے طریقہ کار پر آپ نے ایک بار تنقید بھی فرمائی تھی اس طبقہ کے سربراہ سرسید احمد خان تھے جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بانی ہیں، انہوں نے جو تعزیتی تحریر لکھی وہ ایسا اعتراف حقیقت ہے کہ حضرت نانوتوی کی شخصیت پر طویل سے طویل تحریر اس کی ہمسری نہیں کر سکتی، اس کی اہمیت اور قدر و قیمت اس لئے زیادہ ہے کہ لکھنے والے کو مرنے والے سے نہ غلوئے عقیدت ہے نہ وہ رسمی تحریر کیلئے مجبور ہے، بلکہ اس نے اپنے دل کی آواز کو لفظوں میں بند کر دیا ہے۔ اس لئے میں یہاں صرف اسی تحریر کو نقل کرتا ہوں سرسید احمد خان نے یہ مضمون لکھ کر انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ کی اشاعت مورخہ ۲۴/ اپریل ۱۸۸۰ء میں صفحہ ۴۶۷، ۴۶۸ پر شائع کیا۔ سرسید کا مضمون درج ذیل ہے:۔

سرسید کی تعزیتی تحریر

''افسوس ہے کہ جناب ممدوح (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی) نے ۱۵/ اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا، زمانہ بہتوں کو رو یا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا، لیکن ایسے شخص کیلئے رونا جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آئے تو نہایت رنج اور غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دہلی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم و فضل اور تقویٰ اور ورع میں معروف و مشہور تھے، ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بھی بے مثل تھے، لوگوں کو خیال

تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کوئی شخص ان کی مثل ان صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے، مگر مولوی محمد قاسم مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دین داری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دلی کے تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ۔

بہت لوگ زندہ ہیں جنہوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمر میں دلی میں تعلیم پاتے دیکھا تھا، انہوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں، ابتدا ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان کے اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے۔ اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا ۔

بالائے سرش زہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

زمانۂ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغ اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے، ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے۔ ان کو جناب مولوی مظفر حسین کاندھلویؒ کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رتبے کا دل بنا دیا تھا، خود بھی پابند شریعت اور سنت تھے اور لوگوں کو بھی پابند شریعت اور سنت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے، بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو خیال تھا، انہیں کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کیلئے نہایت مفید مدرسہ دیو بند میں قائم ہوا، اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی، علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی انکی سعی اور کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے، وہ کچھ خواہش پیر و مرشد بننے کی نہیں رکھتے تھے، لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں ہزاروں آدمی ان کے معتقد تھے، اور ان کو اپنا پیشوا اور مقتداء جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے، مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو اور خواہ کسی سے خوشی کا ہو، کسی طرح ہوائے نفسانی یا ضد اور عدوات پر محمول نہیں کر سکتے، ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کہ تھے بلاشبہ للّٰہیت اور ثوابِ آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اس کی پیروی کرتے تھے، ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے واسطے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا کسی شخص کو مولوی محمد قاسم صاحب اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے، بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ برے کام کرتا ہے، یا بری بات کہتا ہے خدا کے واسطے برا جانتے تھے، مسئلہ حب لِلّٰہ اور بغض لِلّٰہ کا خاص ان کے برتاؤ میں تھا، ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں، ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے ہیں اور اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔

اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے تسلیم کرتے ہوں گے، مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلوماتِ علمی میں شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ کم ہو الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا، مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا، اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کیلئے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے، زبانی عقیدت اور ارادت بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے، ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت وافسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں یا چند آنسو آنکھ سے بہا

کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کر لیں، بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں۔

دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگاری ہے، اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے، اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جمار ہے(۱)"

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ (بانی دارالعلوم دیوبند) جب حج کو تشریف لے گئے تو بیر علیؓ کے پاس سواری پر آپ گذر رہے تھے کہ سواری پر سے اچھل پڑے اپنا جوتا اتار لیا اور فرمانے لگے:۔

"جس زمین اور جس گلی کوچوں میں پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے قدم مبارک لگے ہوں وہاں جوتے سمیت کیسے چلا چلوں؟ رسول کریم ﷺ سے نسبت کی وجہ سے وہ مکانات باعظمت بن گئے وہاں کے اشخاص باعظمت ہو گئے، عربوں سے بغض وعناد رکھنا نفاق کی علامت ہے اور ان سے الفت ومحبت کی پینگیں بڑھانا ایمان کی علامت ہے۔

---

(۱) اس تعزیتی تحریر کو شیخ اکرام نے موج کوثر کے ص ۳۶۷ پر نقل کیا ہے، سوانح قاسمی جلد سوم کے ص ۱۷۲ پر اور تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد ۱ ص ۱۰۴ پر بھی نقل کیا گیا ہے۔ سرسید کا یہ مضمون علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ کے ص ۳۶۷ و ۳۶۸ پر شائع ہوا تھا۔

مآثر و معارف

آپ کی سب سے بڑی اور زندہ و جاوید علمی و روحانی یادگار ایشیاء کی عظیم مذہبی تعلیم و تربیت گاہ دارالعلوم دیوبند ہے جس کا مختصر تذکرہ و تاریخ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

تصانیف قیمہ (۱)

حضرت نانوتویؒ کی متعدد تصانیف ہیں جو اپنے مرتبہ کی آپ ہی کی نظیر ہیں حضرت تھانویؒ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ اگر ان کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر دیا جائے اور نام نہ بتایا جائے تو یہی کہا جائے گا کہ یہ کتابیں امام رازیؒ یا امام غزالیؒ کی ہیں (قصص الاکابر) اور ان کتابوں کے متعلق بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جسے زمانہ مل کر آفتاب کرتا ہے۔ وہ چنگاری ان ہی کتابوں میں پوشیدہ ہے، حضرت کی یہ تصانیف نہایت علمی ہیں عام علماء کے بھی فہم سے بالاتر ہیں اور ان کتابوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ علم کسے کہتے ہیں۔

موضوع اور مباحث

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا دور اسلامی ہند کیلئے ایک طوفانی اور بلاخیز دور تھا، اقتصادی، معاشی اور سیاسی انقلابات کے ساتھ ذہنی و فکری انقلاب کا بھی دور تھا، جب کسی قوم کے ہاتھ سے اقتدار نکل جاتا ہے اور کوئی دوسری قوم عنان اقتدار اپنے ہاتھوں میں لیتی ہے تو قدرتی طور پر سیاسی، سماجی اور اقتصادی ڈھانچے جو پہلے دور میں تھے ایک ایک کر کے شکست و ریخت کا شکار ہو جاتے ہیں، معاشیات کا سب سے مضبوط رشتہ حکومت سے ہوتا ہے اور انسان کے ذہن و فکر کی باگ ڈور اسی معاشی مسئلہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ جس رخ ملک کے عوام کو موڑ دے وہ مڑ جاتے ہیں۔

---

(۱) تصانیف کے موضوعات، مباحث اور مختصر تعارف کی ترتیب میں جناب مولانا اسیر ادروی صاحب کی تالیف "مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے" اور حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری کی کتاب "دنیائے اسلام کی عظیم ترین شخصیت" سے استفادہ کیا گیا ہے۔ (محمد عمران قاسمی بگیانوی)

ہندوستان میں جب مسلمانوں کے ہاتھوں سے زمام حکومت نکل کر انگریزوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تو جن لوگوں کے معاشی مسئلہ کا حل مدارس عربیہ کی تعلیم تھی ان کے لئے روٹی روزی کا دروازہ بند ہوگیا، اب روٹی روزی اس کے نصیب میں آسکتی ہے جو سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرے، حکومت کی زبان پڑھے ان کے علوم وفنون سیکھے، اگر نہیں پڑھتا ہے اور ان علوم وفنون کو نہیں سیکھتا ہے تو بھوکوں مرے یا مزدور بن جائے یا گداگر، ہاتھ میں کاسۂ گدائی لے لے، عزت کی روٹی اس کے مقدر سے چھن جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا متوسط طبقہ انگریزی تعلیم کی طرف ٹوٹ پڑا، اب عربی فارسی مدارس میں وہی لوگ رہ گئے جن کے نزدیک معاشی مسئلہ سے زیادہ دین کی حفاظت کو اہمیت حاصل تھی، جس کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ وہ ہمیشہ معاشی پستی میں رہیں گے، خوش حالی و فارغ البالی ان کے حصہ میں چلی جائے گی جو سرکاری اسکولوں میں جدید علوم وفنون حاصل کرتے ہوں گے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں یہ مسئلہ پوری طاقت سے ابھرا، اس سلسلہ میں دس بارہ برسوں میں دو نقطۂ نگاہ کے لوگ پیدا ہوگئے، ایک نے انگریزی حکومت کو ہندوستان کیلئے رحمت وبرکت تصور کیا، دوسرے طبقہ نے انگریزی حکومت کو اسلام اور مسلمانوں کیلئے سراپا لعنت سمجھا۔ دونوں طرف کچھ مجبوریاں تھیں، ایک کو اسلام کی فکر دامن گیر تھی دوسرے کیلئے معاشی مسئلہ سوہان روح بنا ہوا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طبقوں میں دوری ہوتی چلی گئی، دونوں دو کیمپوں میں تقسیم ہوگئے۔ اگر یہ انقلاب صرف حکومت کی تبدیلی ہوتی، ایک حاکم کی جگہ دوسرا حاکم آگیا ہوتا تو دونوں طبقوں میں شاید یہ دوری نہ پیدا ہوتی، دوری کی بنیادی وجہ یہ ہوئی کہ نئی حکومت نے ایک نئے مذہب کو جاری کرنے پر اپنی پوری طاقت لگانی شروع کردی اور چاہا کہ ہندوستان سے اسلام اور وید دھرم دونوں کو مٹا کر تیسرا مذہب عیسائیت اور یسوع مسیح کی الوہیت کا مذہب رائج کیا جائے، اور جو طبقہ مسلمانوں کا حکومت کی موافقت وحمایت میں تھا اس نے اپنا طرزِ عمل ایسا رکھا جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عیسائیت کے فروغ اور اسلام کی مظلومیت کے مسئلہ سے اس کو کوئی دلچسپی اور کوئی تعلق نہیں وہ ہر حال میں حکومت کی حمایت کرتے رہیں گے، دوسرے نقطۂ نگاہ کے لوگوں کا ماننا تھا کہ تحفظ اسلام اور تہذیب اسلامی کی بقاء کے

ساتھ اگر جدید تعلیم حاصل کی جاتی ہے تو ہمیں کوئی شکایت نہیں ورنہ اسلامی افکار اور اسلامی تہذیب کے سودے پر یہ سودا منظور نہیں۔

اس جدید ذہنی و فکری انقلاب کی مدافعت حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا اہم ترین کارنامہ ہے، عیسائیت کے مقابلہ میں اسلام کی ترجمانی کو آپ نے اپنی زندگی کا مشن بنالیا، اس لئے آپ کے بیانات اور تقریریں جو ضبط کر کے شائع کی گئیں وہ سب اسی جذبۂ مدافعت کے زیر اثر ہیں، آپ کی بہت سی تحریروں کا اسی مشن سے تعلق ہے۔

اسی دور میں اسلام کو ایک دوسرے دشمن کا سامنا کرنا پڑا وہ ایک نو مولود مذہب تھا، جس کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی گجراتی تھے، انہوں نے اسلام کے خلاف جو محاذ بنایا ایک دور میں اس کے اندر بڑی شدت تھی، اسلام پر ان کے اعتراضات اور الزامات واتہامات بالکل نئے تھے، قدیم علماء کو اس طرح کے اعتراضات و تشکیکات سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا، اس لئے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی فکر رسا نے جودتِ ذہن کی روشنی میں ان کی ساری تنقیدات و تشکیکات کا بھرپور اور مسکت جواب دیا، متعدد کتابوں کا تعلق اسی فتنہ سے ہے۔ اور آریوں کے جواب میں یہ کتابیں لکھی گئیں۔

آپ کی بہت سی تحریروں اور رسالوں کا تعلق "رافضیت و شیعیت کے مسئلہ سے ہے۔ شیعیت کا فتنہ قدیم ضرور تھا لیکن سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں اور نئی انگریزی حکومت کے بعد اس میں شدت پیدا ہوگئی، ہمارے اسلاف نے جن بحثوں کو تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا تھا، اب ان پر پڑی ہوئی مرور ایام کی گرد کو صاف کرنے کی ضرورت نہیں تھی، مگر شیعوں نے ان قدیم بحثوں کو از سر نو پھر سے زندہ کر دیا تھا، فدک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کا مسئلہ اور خلافت راشدہ کی بحثیں پھر سے اٹھائی جارہی تھیں، نرم گوشہ رکھنے والے سنی ان سے متاثر ہو رہے تھے، آپ کے کئی رسالے اور بہت سے تفصیلی خطوط انہیں مسائل سے بھرے ہوئے ہیں۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ راہ سلوک و طریقت کے امام بھی تھے بقول مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کہ ان کو:

"کم عمری ہی میں ولایت مل گئی تھی"

اس لئے بہت سے حضرات حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے، اس

لئے ان کی تعلیم وتربیت کا بار بھی آپ پر تھا، اس لئے بعض لمبے لمبے خطوط تصوف وطریقت کے سلسلہ کے ہیں، بعض میں مسترشدین کو ہدایات دی گئیں، اور کچھ رموز واسرار طریقت بھی سمجھائے گئے ہیں، آپ کے خطوط کے جو چھوٹے چھوٹے مجموعے شائع ہوئے ہیں ان میں یہ خطوط بھی شامل ہیں۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف ایک حد تک نئے نئے موضوعات پر تو نہیں ہیں لیکن اندازبیان بالکل نیا ہے، پیرایۂ بیان، ترتیب مقدمات، دلائل وبراہین اور ثبوت وشہادت سب کچھ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی فکر رسا اور ذاتی غور وفکر کا نتیجہ ہیں، نہ بحث میں کسی کا تتبع کیا گیا ہے۔ نہ دوسروں کی تصانیف سے استفادہ کیا گیا ہے، اور نہ استفادہ کی ضرورت محسوس کی گئی ہے، جو کچھ بھی ہے اپنا ہے، اپنے ذہن کی خلاقی کا ثمرہ ہے، بحث کا انداز عالمانہ ومحققانہ ہی نہیں بلکہ خالص متکلمانہ ہے، آپ کی ساری تصانیف اور ساری تحریروں پر علم کلام کی اتنی گہری چھاپ ہے کہ ہر ہر سطر میں نئی اصطلاحیں مخصوص الفاظ، مخصوص ترتیب مقدمات پائی جاتی ہیں، عوامی ذہن اور کم تعلیم یافتہ یا علم کلام سے ناواقف تعلیم یافتہ افراد کے لئے بہت سی بحثوں کا سمجھنا آسان نہیں، بلکہ ان کو سمجھانا بھی آسان نہیں ہے۔

حالانکہ آپ کی اکثر تصانیف اردو میں ہیں۔ چونکہ دور حاضر میں اُردو کو سہل سے سہل تر بنانے کے رجحان کی وجہ سے قدیم زبان اور انداز بیان متروک ہی نہیں ہوگیا بلکہ اب نیا طبقہ اس سے بالکل ناآشنا ہوگیا ہے۔ اگر ان کتابوں کی تلخیص کی جائے یا تسہیل کی کوشش کی جائے تو فنی اصطلاحوں اور مخصوص الفاظ کو بدلا نہیں جاسکتا، کیوں کہ ان میں تبدیلی کی جاتی ہے تو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا اصل علمی کمال ہی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اس لئے صرف موضوع اور مباحث کی نشاندہی کی جاسکتی ہے اور دلائل وبراہین اور طریقۂ استدلال کی طرف کہیں کہیں اشارات کئے جاسکتے ہیں۔

مکتوبات

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کا بہت ہی مختصر سا حصہ شائع ہوسکا ہے، ان خطوط کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے، مگر پھر بھی ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عام رسمی خطوط کی طرح نہیں ہیں بلکہ کسی بھی مسئلہ پر گہرے مطالعہ، غور وفکر، تحقیق وتنقید کی روشنی میں

مختصر اور چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں، انہیں خطوط سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ پیچیدہ اور اہم ترین مسائل میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا، اگر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے سارے خطوط تلاش کر کے شائع کر دیئے گئے ہوتے تو بہت سے پیچیدہ مسئلوں اور نازک ترین بحثوں میں ذہن کی گرہیں کھل جاتیں، بہت سے ایسے مسائل جن میں بڑے بڑے اہل علم شرح صدر کے ساتھ کوئی قطعی اور حتمی رائے نہیں دیتے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دشوار ترین سوالات کے دوٹوک جوابات دیئے ہیں، آپ کے مکاتیب چھوٹے چھوٹے کئی رسالوں میں مختلف ناموں سے شائع کیے گئے ہیں، مجھے جتنے مجموعے دستیاب ہوئے ہیں ان کا تعارف یہاں پیش کرتا ہوں۔

جمال قاسمی

یہ ۱۶ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے، یہ اردو میں ایک طویل ترین خط ہے جو ۱۴ صفحات میں آیا ہے، دہلی کے ایک بزرگ مولانا جمال الدین علوی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے صوفیاء کی اصطلاح وحدۃ الوجود اور سماعِ موتی کے بارے میں سوال کیا تھا اور پوچھا تھا کہ اس کی کیا نوعیت ہے؟ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طویل خط میں ان دونوں مسئلوں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

مکتوباتِ قاسمیہ

یہ بھی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے چند مکتوبات کا مجموعہ ہے جو صرف ۱۳ صفحات پر مشتمل ہے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک صاحب بیعت تھے جن کو خلیفہ بشیر احمد دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کہا جاتا تھا، وہ محکمہ بندوبست میں سرکاری ملازم تھے اور بسلسلۂ ملازمت زیادہ ضلع بجنور میں مقیم رہے، وہ اپنے ذکر و شغل اور احوال و کیفیات حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بذریعہ خطوط پیش کرتے رہتے تھے، اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے ان کو اوراد و وظائف کی ہدایات دی جاتی تھیں، قبض وبسط میں کچھ رہنمائیاں ہیں کسی خط کے اندر وظیفہ میں بعض جملوں کے اضافہ کرنے کا ذکر ہے۔ خلیفہ بشیر احمد کے نام ایسے آٹھ خطوط ہیں، بقیہ ان کے ساتھ جو خطوط شائع کئے گئے ہیں ان میں سے بعض حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی

مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں جس کی صراحت ہے، بقیہ خطوط میں یہ صراحت نہیں ہے مگر یہ خطوط حضرت نانوتوی کے نہیں ہیں۔ یہ خطوط خلیفہ بشیر احمد کے ان خطوں کے جواب میں ہیں جو انہوں نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے سانحہ انتقال ۴ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ کے بعد دوسرے بزرگوں کو لکھے تھے اور ان کی جانب سے جوابات آئے تھے، جن میں اوراد و وظائف کے سلسلہ کی ہدایات ہیں، یہ مجموعۂ خطوط کتب خانہ قاسمی دیوبند نے شائع کیا ہے۔

فیوض قاسمیہ

یہ بھی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مکاتیب کا ایک مختصر مجموعہ ہے جو ۱۵ خطوط پر مشتمل ہے۔ لیکن خطوط مفصل ہیں، اس لئے ۵۶ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، ان میں اکثر خطوط تو مستقل ایک مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں مسائل پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔ ان میں چھ خطوط تو اردو میں ہیں اور بقیہ خطوط فارسی زبان میں ہیں۔ ان خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شیعی مسائل بہت زیادہ پائے جاتے تھے، اس لئے زیادہ تر استفسارات شیعی مسائل و عقائد سے متعلق ہیں، اس لئے زیادہ تر خطوط میں انہیں عقائد کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ البتہ مکتوب الیہ کا نہ کہیں نام ہے نہ پتہ، نہ خطوط پر تاریخ ہے اور نہ سنہ اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خط کہاں سے لکھا گیا ہے اور کہاں بھیجا گیا ہے؟ جب کہ آج ان کی سخت کمی محسوس کی جارہی ہے، اگر یہ تمام تفصیلات مکتوبات کے ساتھ درج ہوتیں تو اس کی قدر و قیمت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا اور بہت سی گرہیں کھلتیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف تبرکات سمجھ کر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں کو محفوظ کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے، نہ مرتب کی طرف سے کوئی حاشیہ ہے اور نہ کسی طرح کی وضاحت ہے۔(۱)

اضافہ :۔ ان مکاتیب میں جن موضوعات و مباحث پر کلام کیا گیا اور محققانہ بحث کی گئی ہے وہ اسطرح ہیں (۱) شیعہ مسلمان ہیں یا کافر؟ انکی عورتوں سے شادی اور انکے ذبیحہ کا کیا حکم ہے۔ (۲) زیارت قبور، خصوصاً عورتوں کے بارے میں حکم۔ (۳) مصائب اہل بیت پر رونے کا حکم (۴) واقعات کربلا کا بیان۔ (۵) ذوالفقار کیا ہے؟ (۶) وراثت نبوی (۷) شفاعت اہل بیت خصوصاً خلفاء ثلاثہ کے متعلق سوال کا تحقیقی جواب۔ (۸) حیات النبیؐ۔

---

(۱) مولانا محمد قاسم نانوتوی از مولانا اسیر ادروی از ص ۳۲۶ تا ۳۴۷

(۹) فَعلیٌ مولاہٗ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے متعلق حضور اکرم ﷺ کی اس حدیث کی تشریح۔ (۱۰) فدک کا مسئلہ۔ (۱۱) دیہات میں جمعہ (جمعہ فی القری نام کے اس مکتوب کے مضمون کا ترجمہ کرکے ''احکام الجمعہ'' کے نام سے علیحدہ بھی شائع کیا گیا ہے) (۱۲) تصور شیخ (۱۳) بعض احکام وامور شرعیہ کے اسرار وحکمت (۱۴) یزید کا کفر وایمان (۱۵) نذر لغیر اللہ (۱۶) نمازوں میں قرأت (۱۷) بدعت وسنت (۱۸) مسئلہ علم غیب (۱۹) نفس کیا چیز ہے؟ (۲۰) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر ایک الزام کا تحقیقی جواب۔ (تلخیص از، محمد عمران قاسمی بگیانوی)

لطائف قاسمی

یہ بھی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے جو ۲۸ صفحات پر مشتمل۔ ہے اس میں نو خطوط ہیں، جن میں ایک مکتوب مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، بقیہ آٹھ خطوط حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں، ان میں ایک خط جو سب سے طویل ہے وہ ''جمعہ فی القریٰ'' کے مسئلہ پر ہے، یہ دوسرے مجموعۂ مکاتیب میں بھی آچکا ہے، اور اس کا تعارف کرایا جاچکا ہے، کتاب کے آغاز میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک فارسی نعت ہے اس کے بعد مکتوبات کا آغاز کیا گیا ہے۔

اضافہ:۔ اس مجموعے میں شامل مکاتیب میں جن موضوعات پر کلام کیا گیا ہے وہ اس طرح ہیں (۱) مسئلہ حیات النبیؐ (۲) تراویح (۳) دیہات میں جمعہ (۴) علم دین کی اہمیت (۵) رہن اور سود، (محمد عمران قاسمی بگیانوی)

تصفیۃ العقائد اُردو

اس رسالے میں اصولی اور کلامی مباحث ہیں۔

اضافہ:۔ یہ ایک طویل مکتوب ہے جو سرسید احمد خاں کے اس خط کے جواب میں ہے جس میں سرسید صاحب نے اپنے بعض عقائد ونظریات کی وضاحت کی ہے، جب حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس یہ خط پہنچا تو انہوں نے سرسید صاحب کے ان عقائد و نظریات کا اسلامی نقطۂ نظر سے تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ (محمد عمران قاسمی بگیانوی)

---

(۱) مولانا محمد قاسم نانوتوی از مولانا اسیر ادروی از ص ۲۶۲

تحفہ لحمیہ

یہ بارہ صفحات کا ایک مختصر سا رسالہ ہے جس میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر گوشت خوری کے سلسلہ میں الزامات عائد کئے گئے تھے ان الزامات کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔(۱)

اسرار قرآنی

بیس صفحوں کا یہ رسالہ ہے، مولانا محمد صدیق مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیری سلسلہ کے کچھ سوالات لکھ کر آپ سے دریافت کئے تھے، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے بذریعہ خط ان کے اشکالات کو رفع کیا ہے۔

آپ نے ان تمام سوالات کے جواب دیئے ہیں اور تفصیل سے اس کے اسرار و حکمت کو بیان کیا ہے۔رسالہ صرف ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے رسالہ میں اور دوسرے مکاتیب بھی ہیں جن میں قرآنیات سے متعلق سوالات ہیں۔(۲)

الحق الصریح

الحق الصریح کے نام سے جو ۱۶ صفحات کا رسالہ ہے، مگر اس میں صرف پہلا خط بیس رکعات تراویح پر ایک مدلل مضمون حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جو کتاب کے ۸ صفحات میں ہے، تراویح کے موضوع پر یہ خط لطائف قاسمیہ میں شائع ہو چکا ہے، یہاں ایک مستقل رسالہ کی شکل میں چھپوا دیا گیا ہے۔(۳)

توثیق الکلام

یہ ۱۶ صفحات کا ایک رسالہ ہے، جس کا پورا نام "توثیق الکلام فی الانصات خلف الامام" ہے، رسالہ میں قرأت خلف الامام کا مشہور اور مختلف فیہ مسئلہ زیر بحث ہے، اس سلسلہ میں آیات قرآنی اور روایات سے استدلال کیا گیا ہے، انداز بحث متکلمانہ ہے ترتیب مقدمات، اصطلاحات علم کلام کا استعمال اور استخراج نتائج کا وہی اسلوب ہے جو متکلمین کے

---

(۱) مولانا محمد قاسم نانوتوی از مولانا اسیر ادروی ص ۳۷۷

(۲) ایضاً ص ۳۷۹ تا ۳۸۰ (۳) ایضاً ص ۳۸۰

یہاں ہوتا ہے، آیتوں اور روایتوں میں تطبیق اور ہر ایک کا محمل دلائل کی روشنی میں متعین کیا ہے۔(۱)

انتصار الاسلام

یہ کتاب ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے جو وفات سے دو سال قبل ۱۲۹۵ھ میں تصنیف کی گئی، رسالہ کا نام آپ کے خصوصی شاگرد مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے "انتصار الاسلام" تجویز کیا، یہ رسالہ ایک نئے مذہب آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی کے ان سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے جو انہوں نے اسلام مسلمانوں پر مجمع عام میں لگائے تھے، یا اپنی تحریروں میں لکھے تھے، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہر امکانی جد و جہد کے باوجود پنڈت جی مجمع عام میں مباحثہ کیلئے نہ روڑکی میں تیار ہوئے اور نہ سال بھر بعد میرٹھ میں سامنے آئے، جب کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی شدید علالت کے باوجود خود چل کر دونوں مقامات پر پہونچے تھے، لیکن پنڈت جی نے ان دونوں مقامات پر جو زہریلے بیانات دیئے وہ عام مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت تھے اس لئے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے عوامی تقریروں میں پنڈت جی کے الزامات کی بھرپور تردید کی، اور مصلحت وقت کا تقاضا سمجھ میں آیا کہ اعتراضات کے تمام جوابات قلم بند کر کے دوسرے اہل علم کی رہنمائی کر دی جائے، کیونکہ سوالات بالکل نئے تھے، اس لئے عام علماء کیلئے ایک دلیل راہ کے طور پر ان مسائل پر دو کتابیں آپ نے لکھیں، ان میں سے ایک یہی "انتصار الاسلام" ہے۔ کتاب کے آغاز میں مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے وہ تمام روداد بیان کر دی ہے جو روڑکی میں پیش آئی، کس طرح پنڈت جی نے خلفشار برپا کیا، کیسے کیسے طوفان اٹھائے، عوام میں کتنی بے چینیاں پھیلیں، چار افراد پر مشتمل علماء دیوبند کا وفد روڑکی پہونچا، مگر پنڈت جی کسی قیمت پر مجمع عام میں مباحثہ کیلئے تیار نہیں ہوئے۔ آریوں اور سناتن دھرمیوں کی طرف سے گیارہ اعتراضات رسالوں، اخباروں میں شائع کئے گئے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے دس اعتراضات کے جوابات اس کتاب میں دیئے ہیں اور گیارہواں اعتراض مسلمانوں کے استقبال قبلہ پر

---

(۱) مولانا محمد قاسم نانوتوی از مولانا اسیر ادروی ص ۳۸۳، توثیق الکلام اور الدلیل المحکم کی اردو شرح حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کے قلم سے نکل کر عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے۔ (محمد عمران قاسمی)

تھا جس کو وہ بت پرستی کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ایک سوال کے جواب میں مستقل ایک دوسری کتاب "قبلہ نما" کے نام سے تصنیف فرمائی۔(۱)

اضافہ: اس کتاب میں جن اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں ان کے موضوعات اس طرح ہیں (۱) قدرت قادر مطلق سے متعلق (۲) شیطان کے بہکانے سے متعلق (۳) احکام میں نسخ سے متعلق (۴) تحقیق روح جس کے تحت تعدادِ ارواح اور تناسخ کی بحث بھی ہے۔ (۵) افطار صوم کے اجر بصورت حوران جنت سے متعلق (۶) توبہ کے سبب گناہوں کی معافی سے متعلق (۷) جانوروں کی حلت و حرمت سے متعلق (۸) حرمت شراب سے متعلق (۹) دفن میت در زمین سے متعلق (۱۰) قیام قیامت و تناسخ سے متعلق سبھی اعتراضات کے شافی اور متکلمانہ انداز میں جوابات دیئے گئے ہیں۔(تلخیص از محمد عمران قاسمی)

جواب ترکی بہ ترکی

یہ کتاب ایک آریہ سماجی لالہ انند لال کے رسالہ "آریہ سماچار" کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کے جواب میں ہے، آریوں کا یہ رسالہ میرٹھ سے نکلتا تھا اس کا واحد مقصد اسلام اور مسلمانوں پر اعتراض کرنا تھا، اور پنڈت دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج کا آرگن اور ترجمان تھا، پنڈت جی نے روڑکی کے بعد میرٹھ کو اپنا مستقر بنایا تھا اور بڑے جارحانہ انداز میں اسلام کو نشانہ بنا رکھا تھا ان کا منہ بند کرنے کیلئے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو میرٹھ جانا پڑا تھا، اب ان کی جگہ لالہ انند لال نے سنبھال رکھی تھی، اور اپنے رسالہ میں زہر میں بجھے ہوئے الفاظ اسلام اور قرآن شریف کے متعلق استعمال کرتے تھے، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کی ہفوات پر روک لگائی جائے، لیکن اس وقت حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحت خطرناک دور سے گزر رہی تھی، بیماری کا سلسلہ طویل ہوتا جارہا تھا اس لئے خود قلم لے کر لکھنا دشوار تھا، اس لئے آپ کے شاگرد رشید مولانا عبدالعلی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ نے ترتیب مضامین کی ذمہ داری لی، سوالات کے جوابات حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ املا کرادیتے تھے، مضمون اور سیاق و سباق کی ترتیب اور الفاظ مولانا میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کے تھے، اس لئے مرتب کی حیثیت مولانا میرٹھی کی ہے، البتہ افادات حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں، اس لئے اس کتاب کو بھی اس فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔(۲)

---

(۱) مولانا محمد قاسم نانوتوی از مولانا اسیر ادروی از ص ۳۸۵ تا ۳۸۷ (۲) ایضاً ص ۳۹۷ تا ۳۹۸

قبلہ نما

یہ کتاب جو ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ درحقیقت حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "انتصار الاسلام" کا دوسرا حصہ ہے آریوں کی طرف سے مسلمانوں پر گیارہ اعتراضات کئے گئے تھے، دس سوالوں کے جوابات انتصار الاسلام میں دیئے گئے۔ گیارہواں اعتراض جو استقبال قبلہ سے متعلق تھا اس ایک سوال کے جواب میں یہ کتاب قبلہ نما لکھی گئی۔(۱)

حجۃ الاسلام

یہ رسالہ ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے لیکن دریا بہ کوزہ ہے، اسلام کی حمایت، دوسرے ادیان وملل کی تردید، اسلام پر عائد کئے جانے والے اعتراضات، دوسرے مذاہب کے مشرکانہ اعتقادات، خلاف عقل ونقل رسوم وعبادت، ہر پہلو پر انتہائی اختصار کے ساتھ نہایت جامع مانع اور مدلل گفتگو کی گئی ہے، یہ رسالہ کسی مرتب تصنیف کے خیال سے وجود میں نہیں آیا، بلکہ اس رسالہ کی حیثیت صرف منتخبات کی ہے۔(۲)

ہدیۃ الشیعہ

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں شیعی جراثیم ہر طرف پھیلے ہوئے تھے، ہر آبادی میں سنی خاندان ہونے کے باوجود کچھ لوگ شیعہ ہو گئے تھے، خود سنی بھی شیعی پروپیگنڈہ سے متاثرہ تھے، اس لئے مختلف جہتوں سے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے شیعوں کی روایتوں کو لے کر سوالات کئے جاتے تھے، جیسا کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خطوط سے اس کا اندازہ آپ کو ہو چکا ہوگا، ان شیعی روایات میں خلفاء راشدین کو غاصب ثابت کرنے کیلئے فدک کا مسئلہ بھی چھڑ جاتا تھا، شیعہ کہتے تھے کہ حضور کی صحیح وارث حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں، اور وارثت کی دعویدار بھی تھیں، اور فدک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص جاگیر تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے جانے کے بعد انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ شرعی وارث حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو باغ فدک دے دینا چاہئے تھا، لیکن خلفاء راشدین نے جیسے تخت خلافت پر قبضہ کر لیا اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو محروم کر دیا۔

---

(۱) مولانا محمد قاسم نانوتوی از مولانا امیر ادروی ۳۹۹　(۲) ایضاً ص ۴۰۵

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قصہ پر مفصل بحث کی ہے اور دلائل دیئے ہیں، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مال کا کوئی وارث ہو ہی نہیں سکتا، مال وراثت تو اس وقت تقسیم ہوتا ہے جب مورث کا انتقال ہو جائے اور وفات پا جائے، اور جب تک وہ زندہ ہے تب تک اس کی وراثت کی تقسیم کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پہلے تو آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پیش کیا ہے۔ لانورث ماترکنا ہ صدقة اور اس سے استدلال کیا ہے، اور پھر آپ نے یہ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبر انور میں حیات ہیں، اور جب آپ حیات ہیں تو ان کی ازواج کو دوسروں سے نکاح کرنا جائز نہیں، اور نہ آپ کے متروکہ سامان کو بہ حصص تقسیم کرنا درست ہے، پھر اس مسئلہ کو عقلی دلائل سے مدلل و مبرہن کیا ہے، چونکہ اس رسالہ میں حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور دلیل آپ نے پیش کیا تھا، اس لئے اسی کتاب "ہدیۃ الشیعہ" کے بعد مستقل ایک دوسری کتاب حیات نبوی کے موضوع پر آب حیات کے نام سے تصنیف فرمائی جو الگ سے شائع ہوئی، جو درحقیقت اسی رسالہ کا دوسرا حصہ کہا جا سکتا ہے۔

تقریر دل پذیر

یہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مستقل تصنیف ہے، نام سے دھوکہ ہوتا ہے کہ شاید کسی تقریر کو ضبط کر کے شائع کر دیا گیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کتاب دعوتِ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے تصنیف کی ہے اور ساری دنیا کو اسلام کی دعوت دلائل کی روشنی میں دی ہے، اس کتاب میں خطاب دوسرے ادیان و ملل کے ماننے والوں ہی سے نہیں بلکہ ملحدوں، دہریوں سے بھی کیا گیا ہے، اور ان کے سامنے حق کی روشنی کو پیش کیا گیا ہے اور ان کو راہ ہدایت دکھائی گئی ہے اور ان کی عقل سلیم سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ پہچانیں کہ حق کیا ہے، باطل کیا ہے، سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے۔(۱)

تحذیر الناس

یہ کتاب درحقیقت ایک استفتاء کے جواب میں ہے اور چالیس صفحات پر مشتمل ہے، کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اہل علم میں اس استفتاء کا ہر طرف تذکرہ تھا اور اس دور کے مشاہیر علماء سے اس مسئلہ میں استصولب کیا گیا تھا، کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا عبد الحئ فرنگی

(۱) مولانا محمد قاسم نانوتوی از مولانا اسیر ادروی ص ۲۱۱ تا ۲۱۲

محلی لکھنوی کا بھی تفصیلی جواب ہے اور ان کے معاصر بعض دوسرے علماء کی بھی تصدیقات وتصویبات شامل ہیں، یہ استفتاء پہلے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آپکی رائے جاننے کیلئے بھیجا گیا تھا اس لئے آپ نے استفتاء میں درج صورت مسئلہ پر مفصل گفتگو کی ہے اور پھر اسی تفصیلی جواب کو دوسرے علماء کی خدمت میں تصدیق وتصویب کیلئے بھیجا گیا ہے۔

استفتاء میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک اثر درمنثور سے نقل کیا گیا تھا، جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ خدا نے زمین کے سات طبقات بنائے ہر ایک میں مخلوقات ہیں اور ان کی ہدایت کیلئے پیغمبر بھی بھیجے گئے، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

" ان اللہ خلق سبع ارضین فی کل ارض ادم کا دمکم ونوحا کنوحکم وابراھیم کا براھیمکم وعیسی کعیسی کم ونبی کنبیکم"

اس اثر کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے کے کیا معنی ہوئے؟ کیا آپ ہر طبقہ کیلئے خاتم ہیں یا صرف ایک طبقہ کیلئے؟ اگر ایک ہی طبقۂ ارض کے خاتم ہیں تو دوسرے طبقات ارض میں بھی خاتم ہوں گے، پھر خاتمیت کے وصف میں کیا فضیلت ہوئی؟ حقیقت واقعہ کیا ہے، صحیح صورت مسئلہ کی وضاحت کی جائے۔

اس استفتاء کی اہمیت اس لئے تھی کہ اس کا تعلق مسئلہ ختم نبوت سے تھا، قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا گیا ہے و لکن رسول اللہ و خاتم النبیین اگر ہر طبقۂ ارض میں پیغمبر ہیں تو ہر طبقہ میں اس کے خاتم بھی ہوں گے، تو پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے کی فضیلت کہاں رہ جاتی ہے؟

اس لئے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے گفتگو یہیں سے فرمائی ہے کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب نبیوں کے بعد آئے ہیں، اور آپکے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، اس لئے آپ آخری نبی ہیں، یعنی ختم نبوت کا تعلق زمانہ کے اعتبار سے ہے، تمام انبیاء پہلے آئے اور سب سے آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اسی معنی میں آپ خاتم الانبیاء ہیں۔ الخ (۱)

آبِ حیات

اس کتاب کے بارے میں، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے اسے مولانا

---

(۱) مولانا محمد قاسم نانوتوی از مولانا اسیر ادروی ص ۲۱۴ تا ۲۱۵

محمد قاسم نانوتویؒ سے سبقاً سبقاً پڑھی، کتاب اردو میں ہے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جیسا بے مثال عالم اس کو سمجھنے کیلئے اس کے مصنف سے سبقاً سبقاً پڑھے، تو اس کتاب کی مغلق، پیچیدہ اور مشکل ترین ہونے کی شہادت ہے، اگر کوئی بڑا عالم جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق استدلال اور انداز تحریر کا اداشناس ہو، فلسفیانہ مباحث اور منطقیانہ طرز استدلال کا شناسا ہو، وہ یہ کتاب سبقاً سبقاً پڑھائے تو شاید یہ اہل علم کو سمجھ میں آجائے۔

کتاب کا موضوع "مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم" ہے، اب تک عالم اسلام میں اس مسئلۂ خاص پر اتنا مفصل کلام اور اتنے دلائل، تجربات و مشاہدات کے شواہد کے ساتھ کسی عالم نے نہیں لکھا ہے، اس موضوع پر لکھنے کا داعیہ اس وقت پیدا ہوا جب آپ نے "ہدیۃ الشیعہ "تصنیف فرمائی، جس میں شیعوں کے مسئلۂ فدک کے سلسلہ میں خلفاء راشدین پر الزامات کی تردید کی گئی تھی، شیعوں نے فدک حضرت فاطمہؓ کو نہ دینے پر حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مطعون کرنا شروع کر دیا تھا تو متعدد علماء نے اس کے جوابات دیئے تھے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ پر ایک بالکل دوسرے نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی اور اس کا جواب دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لانورث ماترکناہ صدقۃ سے پہلے استدلال کیا، اور دلیل کا ماحصل یہ تھا کہ چونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری متروکات اللہ کی راہ میں صدقہ ہیں ان کو بطور وراثت کوئی پانے کا حق دار نہیں، اس لئے بحیثیت وارث کوئی اس کا دعوے دار نہیں ہوسکتا اور نہ اس کا حق دار ہے، اسی ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذہن اس جانب منتقل ہوا کہ وراثت کا مسئلہ اس وقت اٹھتا ہے جب مورث وفات پا جائے، اور مورث جب تک زندہ ہے چاہے حالت نزع ہی کیوں نہ ہو، مال اس کی ملکیت سے نہیں نکلتا، اور جب مالک اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو ورثاء مورث کے مال کے مالک ہوتے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مال کی وراثت اس لئے جاری نہیں ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبر مبارک میں زندہ ہیں، اور زندہ کے مال میں وراثت جاری نہیں ہوسکتی، اور شاید یہی وجہ ہے کہ ازواج مطہرات سے نکاح حرام ہوا کہ دوسرا نکاح شوہر کی وفات کے بعد ہوتا ہے، جب تک شوہر زندہ ہے دوسرا نکاح حرام ہے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم باحیات ہیں اس لئے ازواج مطہرات کا نکاح دوسروں سے حرام رہا۔

جب یہ حقائق حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے آئے تو آپ نے یقین کر لیا کہ ان دونوں مسئلوں میں علت حقیقی یہی "حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم" ہے اس لئے آپ نے اس مسئلہ پر دلائل فراہم کرنا شروع کر دیئے، بہت سی احادیث اور قرآن کی آیتوں سے ایسے اشارات ملے جن سے آپ کے نقطۂ نگاہ کی تائید ہوتی چلی گئی اور بعض آیات قرآنی سے اس کے خلاف، حقیقت معلوم ہوئی تو آپ نے ان پر بھی غور فرمایا اور پھر انکی توجیہ و تاویل فرمائی۔(۱)

مباحثۂ شاہجہانپور

یہ کتاب اس مباحثہ کی روداد ہے جو شاہجہانپور میں ۱۲۹۵ھ ۱۸۷۷ء میں عیسائیوں، آریوں، سناتن دھرمیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا، پورے مباحثہ کی روداد حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک تلمیذ رشید مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب کی ہے، کتاب میں مباحثہ کے ماحول پس منظر اور حالات کے ساتھ ساتھ ہر فریق کے بیانات اور تقریروں کو بھی قلم بند کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی پوری پوری تقریریں آپ نے ضبط کرلی تھیں۔ اور پھر ان کو کتاب میں شامل کر لیا، اس لئے یہ کتاب صرف روداد مباحثہ نہیں بلکہ پوری کتاب میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی جواہر بکھرے ہوئے ہیں، اور آپ کی لمبی لمبی تقریریں تقریباً آپ کے الفاظ میں نقل کی گئی ہیں، اس لئے اس کتاب سے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علم وفن، طرز استدلال، اثبات مدعا کیلئے مقدمات کی ترتیب اور اس سے نتائج کے استخراج کا حیرت ناک مظاہرہ ہوتا ہے، چونکہ یہ تمام تقریریں برجستہ کی گئی ہیں اس لئے زور کلام کے ساتھ زور بیان کا بھی بہترین نمونہ ہیں، یہ آپ کے علوم و معارف کا گنجینہ اور خزانہ ہے۔(۲)

اجوبۂ اربعین دو حصے (اُردو)

شیعہ حضرات کے چالیس سوالوں کے جوابات اس کا پہلا حصہ آپ کی اور مولوی عبداللہ صاحب انبیٹھوی کی مشترک تصنیف ہے۔ دوسرا حصہ تنہاء آپ کی ہے۔

---

(۱) مولانا محمد قاسم نانوتوی از مولانا اسیر ادروی ص ۱۹۹ تا ۲۰۰۔ اس کتاب کے سلسلہ میں مختصر اعلماء کی آراء، شوق تحصیل اور اس سلسلہ کی دشواری کی دلچسپ روداد کیلئے احقر کا ایک مضمون "مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تبحر علمی" مشمولہ در رسالہ "نقوش علماء دیو بند" ملاحظہ فرمائیں (محمد عمران قاسمی بگیانوی) (۲) ایضاً ص ۲۲۲

واقعہ میلہ خداشناسی (گفتگوئے مذہبی) اردو

اصول دین کی حقانیت کا بیان، ۱۲۹۳ھ میں شاہ جہاں پور میں جو پہلا مناظرہ ہوا تھا، اسکی یہ روئداد ہے، منشی محمد ہاشم صاحب مالک مطبع ہاشمی اور مولوی محمد حیات صاحب مالک مطبع ضیائی نے مرتب کر کے شائع کی ہے، اس میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر پیش کی گئی ہے۔

قصائد قاسمی

(اردو، فارسی، عربی) قصیدہ بہاریہ، شجرۂ طریقت اور دیگر مدحیہ قصائد

الاجوبة الكامله فى الاسولة الخامله (اردو)

کسی شیعہ کے پانچ لغو اعتراضوں کے جوابات

حاشیہ بخاری شریف (عربی)

حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کا بخاری شریف کا حاشیہ جو عام طور پر ملتا ہے اس کے آخر کے پانچ چھ پاروں کا تحشیہ آپ نے تحریر فرمایا ہے۔

مصابیح التراویح

موضوع نام سے ظاہر ہے اور ضمناً عجیب و غریب مضامین زیر قلم آئے ہیں، اس کتاب کا حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحب دیو بندی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ فرمایا ہے جو انوار المصابیح کے نام سے شائع ہوا ہے، مگر اس سے کتاب کما حقہ حل نہیں ہوئی اس لئے ابھی مزید کام کی حاجت ہے۔

جوابات محذورات عشر

(مناظرۂ عجیبہ اردو) تحذیر الناس پر اعتراضوں کے جوابات، یہ مولانا عبد العزیز صاحب کے دس اعتراضوں کے جوابات اور طرفین کی مراسلت پر مشتمل ہے۔ مولانا کے اعتراضات برائے جدل نہیں تھے، بلکہ برائے تحقیق حق تھے چنانچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے جوابات سے مولانا قائل ہو گئے تھے۔

انتباہ المؤمنین (فارسی)

ایک حدیث شریف کی شرح، مشکوٰۃ شریف باب مناقب العشرہ فصل ثالث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء کے بارے میں ہے اس کی شرح یہ دو مکتوب کا مجموعہ ہے۔

مکاتیب قاسم العلوم (فارسی)

نمبر اول، دوم، سوم، چہارم، اس کے چار نمبر شائع ہوئے ہیں، جو گیارہ مکاتیب پر مشتمل ہیں جن میں سے دس مکتوب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں (۱) قریہ فدک کی بحث (۲) حدیث عما کی شرح (۳) ما اھل بہ لغیر اللہ کی تحقیق (۴) عصمت انبیاء اور تحقیق کلی طبعی (۵) مکاتب کے سلسلہ میں دو حدیثوں میں تعارض کا حل (۶) یہ مکتوب حضرت کا نہیں ہے بلکہ سائل مولوی محمد حسین بٹالوی (اہل حدیث کا) ہے (۷) انکار نبوت اور انکار معجزہ کا جواب (۸) ہندوستان میں سود کا حکم اور مرہونہ زمینوں کی آمدنی کا حکم (۹) شہادت حضرت حسین کا اثبات (۱۰) مبحث امامت کی تحقیق اور طوسی کے استدلال کا جواب اور دو حدیثوں کی شرح (۱۱) حدیث من لم یعرف امام زمانہ کی شرح۔ یہ سب مکاتیب فارسی میں ہیں۔ ان میں سے مکتوب اول و ہشتم کا ترجمہ استاذ محترم حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ نے فرمایا ہے جو "القاسم" کی بارہویں جلد میں شائع ہوا ہے اور حال میں پروفیسر انوار الحسن صاحب شیرکوٹی ثم پاکستانی نے تمام مکاتیب کے ترجمہ اور تسہیل کی خدمت انجام دی ہے جو "انوار النجوم" کے نام سے شائع ہوئی ہے جس کے مطالعہ کا موقعہ ہمیں اب تک نہیں مل سکا ہے۔

الحظ المقسوم من قاسم العلوم (عربی)

جزء الذی لا یتجزی کا اثبات اور سماع و غناء کی تحقیق مولانا محمد رحیم اللہ صاحب بجنوری تلمیذ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام دو مکتوب جو نہایت فصیح عربی میں ہیں۔

(اخیر کی دس کتابوں کا تعارف کتابچہ "دنیائے اسلام کی عظیم ترین شخصیت" سے ماخوذ ہے)

سوانح علمائے دیوبند

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ

فہرست

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ

پروفیسر مولانا انوار الحسن شیرکوٹیؒ

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کے حالات پروفیسر مولانا انوار الحسن شیرکوٹیؒ کی تصنیف "سیرت یعقوب ومملوک" سے ماخوذ ہیں الفاظ انہیں کے ہیں، انتخاب اور ترتیب ہماری ہے۔
نواز دیوبندی

نام نامی محمد یعقوبؒ

حضرت والا کا نام نامی محمد یعقوب تھا۔ سوانح قاسمی جو آپ کی تحریر کردہ مولانا محمد قاسم صاحب کے حالات زندگی پر مشتمل ہے اس کے اول میں حمد ونعت کے بعد لکھتے ہیں۔

"بندۂ احقر ذرۂ کمتر محمد یعقوب نانوتوی ابن مقدام العلماء جناب مولوی مملوک علی مرحوم نانوتوی عرض رساں خدمت احباب ہے"۔(۱)

اس تحریر سے اپنا اور اپنے والد محترم کا نیز وطن کا نام معلوم ہوا۔

والد محترم مولانا مملوک علی استاذ العلماء

جیسا کہ آپ کی گذشتہ سطور سے معلوم ہوا کہ آپ کے والد محترم کا نام مولانا مملوک علی تھا وہ دہلی کالج کے شعبہ علوم شرقیہ کے صدر تھے۔ اپنے زمانے کے بہت بڑے علامہ اور علوم شرعیہ اور عقلیہ اور ریاضی کے ماہر اور ہندوستان کے بڑے بڑے نامور اہل علم کے استاذ تھے۔ آپ کے تلامیذ میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا ذکر کردینا ہی کافی ہے۔

---

(۱) سوانح قاسمی ص ۲

دادا کا نام نامی اور نانا کا اسم گرامی

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دادا کا اسم گرامی مولوی احمد علی رحمۃ اللہ علیہ تھا اور نانا کا نام حکیم ولی محمد۔ یہ دونوں کے دونوں صحیح النسب صدیقی تھے۔

سلسلۂ نسب تا صدیق اکبرؓ

مولانا موصوف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھے ان کے بزرگ قاضی میراں بڈے (بڑے) ابن قاضی مظہر الدین صاحب کو نسب نامے میں خاص اہمیت ہے۔ مکتوبات یعقوبی جو مولانا موصوف کے خطوط منشی محمد قاسم صاحب نیانگری کے نام ہیں ان کے اول میں حکیم امیر احمد صاحب عشرتی نانوتوی نے ایک مقدمہ لکھا ہے جو مولانا کے بھتیجے تھے ان مکتوبات کے آخر میں مولانا کی یادداشتیں بھی ہیں۔ حکیم صاحب نسب نامے کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:۔

"قاضی میراں بڈے (بڑے) ابن قاضی مظہر الدین صاحب کا سلسلۂ نسب چودہ واسطوں سے خواجہ یوسف سے ملتا ہے اور خواجہ یوسف کا چار واسطوں سے شیخ رکن الدین سمرقندی سے اور وہ پوتے ہیں شیخ اسمٰعیل شہید کے، اور وہ بیٹے ہیں شیخ نور الدین قتال کے اور ان کا سلسلۂ نسب بارہ واسطوں سے شیخ قاسم سے ملتا ہے اور وہ پوتے ہیں حضرت ابو بکر صدیق خلیفۂ اول رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اور وہ گیارہ واسطوں سے اولاد ہیں نضر بن کنانہ ملقب بہ قریش کے اور وہ اٹھارہ واسطوں سے اولاد ہیں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اور وہ بیٹے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اور وہ آٹھ واسطوں سے اولاد ہیں حضرت ہود علیہ السلام کی۔ اور وہ چار واسطوں سے اولاد ہیں حضرت نوح علیہ السلام کی اور وہ پوتے ہیں حضرت ادریس علیہ السلام کے اور وہ سات واسطوں سے اولاد ہیں حضرت شیث علیہ السلام کی اور وہ بیٹے ہیں آدم علیہ السلام کے۔ واللہ اعلم بالصواب.(۱)

---

(۱) مکتوبات یعقوبی ص ۲

شجرۂ نسب

حضرت مولانا محمد یعقوبؒ تا سیدنا حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ

مولانا محمد یعقوب (۱) بن مولانا مملوک علی (۲) بن مولانا احمد علی (۳) بن غلام شرف (۴) بن عبداللہ (۵) بن ابوالفتح (۶) بن محمد معین (۷) بن عبد السمیع (۸) بن مولوی محمد ہاشم (۹) بن شاہ محمد (۱۰) بن قاضی طٰہ (۱۱) بن مفتی مبارک (۱۲) بن شیخ امان اللہ (۱۳) بن شیخ جمال الدین (۱۴) بن قاضی میراں بڑے (۱۵) بن شیخ قاضی مظہر الدین (۱۶) بن نجم الدین الثانی (۱۷) بن نور الدین الرابع (۱۸) بن قیام الدین (۱۹) بن ضیاء الدین (۲۰) بن نور الدین ثالث (۲۱) بن نجم الدین (۲۲) بن نور الدین ثانی (۲۳) بن رکن الدین (۲۴) بن رفیع الدین (۲۵) بن بہاء الدین (۲۶) بن شہاب الدین (۲۷) بن خواجہ یوسف (۲۸) بن خلیل (۲۹) بن صدر الدین (۳۰) بن رکن الدین السمرقندی (۳۱) بن صدر الدین الحاج (۳۲) بن اسمٰعیل الشہید (۳۳) بن نور الدین القتال (۳۴) بن محمود (۳۵) بن بہاء الدین (۳۶) بن عبد اللہ (۳۷) بن زکریا (۳۸) بن نور (۳۹) بن سراج (۴۰) بن شادی الصدیقی (۴۱) بن وحید الدین (۴۲) بن مسعود (۴۳) بن عبد الرزاق (۴۴) بن قاسم (۴۵) بن محمد (۴۶) بن سیدنا ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ

یہ ہے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا شجرۂ نسب جو سیدنا ابو بکر صدیق خلیفۂ اول حضرت پیغمبر اعظم محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وعلٰی آلہ واصحابہ وسلم تسلیماً کثیراً کثیرا تک پہنچتا ہے جو مولانا محمد یعقوب صاحب سے سینتالیسویں پشت میں اوپر ہیں۔ ہم نے یہ شجرہ مفتی محمود احمد صاحب صدیقی نانوتوی مرحوم سابق مفتی مہو چھاؤنی و رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند کے مطبوعہ شجرے سے نوٹ کیا ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانیٔ دار العلوم دیوبند کا شجرہ مولانا محمد یعقوب صاحب سے شیخ ابوالفتح میں جا کر اس طرح مل جاتا ہے۔

شیخ ابوالفتح

شیخ عبداللہ	(۱)	شیخ علاؤالدین
شیخ غلام شرف	(۲)	شیخ محمد بخش
مولانا شیخ احمد علی	(۳)	شیخ غلام شاہ
حضرت مولانا مملوک علی	(۴)	شیخ اسد علی
حضرت مولانا محمد یعقوب	(۵)	حضرت مولانا محمد قاسم
یعنی صدر المدرسین دار العلوم دیو بند		بانی دار العلوم دیو بند

گویا چھٹی پشت میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جد امجد یعنی شیخ ابوالفتح میں جا کر مل جاتے ہیں۔ مکتوبات یعقوبی میں بنام محمد قاسم نیانگری ایک خط میں مولانا اپنی اور مولانا محمد قاسم صاحب کی رشتہ داری اور دوسرے تعلقات کو ان الفاظ میں ظاہر فرماتے ہیں :۔

"جناب مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی میرے ہمزلف اور پیر بھائی (حاجی امداد اللہ صاحب کے ہر دو مرید) اور استاذ اور استاذ بھائی (شاہ عبد الغنی صاحب محدث دہلوی کے شاگرد) اور ہموطن اور قریب کے رشتہ دار ہیں"(۱)

وطن اور جائے پیدائش نانوتہ ضلع سہارنپور

آپ کا وطن مالوف اور مقام پیدائش قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور ہے جو اہل علم کی ایک قدیم بستی یا ایک بڑا قصبہ ہے، جس میں پختہ مکانات ہیں اور اب بہت سے ۱۹۴۷ء کے بعد منہدم ہو چکے ہیں۔ وہاں کے کئی باشندے اپنے جدی مکانات فروخت کر کے پاکستان میں آباد ہو چکے ہیں لیکن مولانا محمد یعقوب صاحب کے زمانے میں یہ حالت نہ تھی۔ مولانا کے زمانے

---

(۱) مکتوبات یعقوبی مکتوب ۱۹

اور ذرا بعد کا حال اس قصبے سے متعلق امیر احمد عشرتی اس طرح لکھتے ہیں:۔

"یہ قصبہ تحصیل دیوبند ضلع سہارنپور میں دہلی سے جانب شمال ۸۰ (اسی) میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ جس کے حدود اربعہ یہ ہیں:۔

مغرب میں گنگوہ (۱۲) میل، شمال میں سہارنپور (۱۸) میل

جنوب میں تھانہ بھون (۹) میل، مشرق میں دیوبند (۱۶) میل

قاضی میراں بڈے (بڑے) کی نانوتے میں ابتداء سکونت

امیر احمد عشرتی صدیقی خاندان کی نانوتے میں آکر بسنے کے متعلق سب سے پہلے قاضی میراں بڑے کی نانوتے میں آمد سے بیان کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:۔

"سلطان سکندر لودھی نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مرحوم کے اجداد میں سے جناب قاضی مظہر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جن کا مزار مبارک جہان آباد (دہلی) میں ہے ۸۷۱ھ میں سمرقند سے طلب فرما کر شرف حضوری بخشا، علاوہ دیگر اعزاز ہائے فراواں کے عہدۂ قضا جہان آباد ارزانی فرمایا۔ چونکہ مقام نانوتہ قریباً وسط کاٹھا میں واقع ہے اور یہاں کی اہل ہنود اقوام راجپوت و گوجر روڑہ وغیرہم کا بہت جتھا تھا اور یہ لوگ نہایت سرکش و سخت متعصب بدخواہ مسلمانوں کے تھے، پس ان لوگوں کی سرکشی مٹانے کے لئے اور اس علاقے کو مطیع و منقاد کرنے کی جہت سے جناب قاضی مظہر الدین کے صاحبزادوں میں سے صاحبزادہ قاضی میراں بڈے (بڑے) صاحب کو واسطے اقامت و سکونت قصبہ نانوتہ کے ارشاد شاہی ہوا اور علاوہ املاک و جاگیرات کے عہدہ قضاء (میجسٹریٹی) وہاں کا مرحمت فرمایا"۔(۱)

اس عبارت سے واضح ہو گیا کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جد امجد قاضی میراں بڑے سکندر لودھی کے زمانے میں قصبہ نانوتہ میں ۸۷۱ھ مطابق ۱۴۷۱ء میں آکر آباد ہوئے اور انہی سے صدیقی خاندان کی ابتداء نانوتے میں پڑی۔

ریلوے اسٹیشن

سہارنپور سے جو چھوٹی لائن شاہدرہ کو جاتی ہے اور اس کے بعد دہلی کا اسٹیشن ہے اسی چھوٹی لائن پر مننانی، رام پور منیہاران کے بعد چوتھا اسٹیشن نانوتے کا ہے۔ نانوتے کے بعد

---

(۱) مکتوبات یعقوبی کا مقدمہ ص ۳

جلال آباد، تھانہ بھون، شاملی، کاندھلہ، لونی، شاہدرہ اور پھر دہلی ہے۔ اس لائن کو سہارنپور شاہدرہ ریلوے لائن کہا جاتا ہے اور ریلوے کی اصطلاح میں ایس، ایس لائٹ ریلوے لائن کے نام سے موسوم ہے۔

تاریخ پیدائش اور تاریخی نام ۱۳ر صفر ۱۲۴۹ھ، ۳۲، ۱۸۳۱ء

اپنی پیدائش کی تاریخ نیز تاریخی نام کے متعلق جس سے آپ کی تاریخ پیدائش نکلتی ہے خود سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"مولانا محمد قاسم صاحب کی پیدائش شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ ہے اور نام تاریخی خورشید حسین اور بندے کی پیدائش صفر کی تیرہویں ۱۲۴۹ھ ہے اور نام تاریخی منظور احمد "(۱۲۴۹)(۱)

منظور احمد تاریخی نام کے علاوہ آپ کے تاریخی نام غلام حسنین، شمس الضحیٰ بھی ہیں۔

ابتدائی تعلیم

آپ کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے مطابق نانوتے کے مکتب میں ہوئی چنانچہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کے ضمن میں اپنی ابتدائی تعلیم کا مختصر الفاظ میں خاکہ مولانا نے اس طرح کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"مولوی صاحب (مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ) کے (علاوہ قرب نسب) بہت سے روابط اتحاد تھے ایک مکتب میں پڑھا۔ ایک وطن، ایک نسب، ہم زلف ہوئے۔ ایک استاد سے ایک وقت میں علم حاصل کیا اور بعضی کتابیں میں نے مولانا سے پڑھیں۔ ایک پیر کے مرید ہوئے، ہم سفر دو سفر حج کے رہے اور ایک زمانہ دراز تک ساتھ رہے"۔(۲)

غرض ابتدائی تعلیم اردو، فارسی، حافظہ و ناظرہ قرآن کریم سب نانوتے کے اس وقت کے مکتب میں ہوئی۔

حفظ قرآن

بچپن کی اس تعلیم میں قرآن کریم حفظ کر کے آپ حافظ بن گئے جو بہت بڑی دولت ہے۔

---

(۱) سوانح قاسمی ص ۳

(۲) سوانح قاسمی مطبع مجتبائی دہلی ص ۳

دہلی کو تعلیم کیلئے روانگی اواخر ذوالحجہ ۱۲۵۹ھ، ۴۳-۱۸۴۲ء

گلستان سے پہلے کی کتابیں فارسی نصاب سے متعلق مثلاً پند نامہ، مصدر فیوض، کریما وغیرہا نانوتے میں پڑھنے کے بعد ذوالحجہ (۴۳-۱۸۴۲ء)(۱۲۵۹ھ) کے اواخر میں نانوتے سے دہلی روانہ ہوئے۔ اس وقت مولانا کی عمر تقریباً گیارہ سال تھی۔ سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں:-

"جب والد مرحوم (مولانا مملوک علی صاحبؒ ۹/ ذوالحجہ ۱۲۵۸ھ کے حج سے فارغ ہو کر ایک سال کے بعد دہلی اور پھر نانوتہ تعطیل میں پہنچے) ذوالحجہ ۱۲۵۹ھ کے آخر میں وطن سے چلے۔"

۲/ محرم ۱۲۶۰ھ کو دہلی میں ورود اور ۴/ محرم ۶۰ء سے تعلیم کا دوسرا دور

دوسری محرم ۱۲۶۰ھ کو دہلی پہنچے چوتھی کو سبق شروع ہوئے۔ مولوی (محمد قاسم) صاحب نے کافیہ شروع کیا اور احقر نے میزان اور گلستان۔ والد مرحوم نے میرے ابواب کا سننا اور تعلیلات کا پوچھنا ان کے سپرد کیا تھا اور ہر جمعہ کی رات کو کہ چھٹی ہوتی تھی صیغوں اور ترکیبوں کا پوچھنا معمول تھا۔(۱)

اس عبارت سے آپ کا دہلی میں ورود ۲/ محرم ۱۲۶۰ھ کو معلوم ہوا اس روز انگریزی تاریخ ۲۳/ جنوری ۱۸۴۴ء اور بدھ کا دن تھا۔(۲)

دہلی کالج میں داخلہ اور والد محترم سے حصول تعلیم

دہلی پہنچ کر عربی نصاب کی تمام کتب معقولات و منقولات اپنے والد محترم مولانا مملوک علی صاحب سے پڑھیں اور سرکاری دہلی کالج میں داخل رہے۔ تا آنکہ آپ کی تعلیم کا سلسلہ ۱۲۶۷ھ تک سات سال رہا، گویا ۱۲۶۰ھ سے ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۴۴ء تا ۱۸۵۰ء مولانا محمد یعقوب صاحب دہلی میں بغرض تعلیم مقیم رہے اور ایک سال مزید دہلی میں قیام کیا۔ سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں:-

"والد مرحوم کا گیارہویں ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ (مطابق ۷/ اکتوبر ۱۸۵۱ء بروز منگل) بمرض یرقان قبل السابع انتقال ہو گیا...... بعد انتقال مولانا والد مرحوم کے احقر اپنے مکان مملوک میں جو چیلوں کے کوچے میں تھا جا رہا"۔(۳)

---

(۱) سوانح ص ۶　(۲) تقویم تاریخی از عبدالقدوس ہاشمی　(۳) سوانح قاسمی مطبوعہ مجتبائی ص ۸

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ کم و بیش تعلیم کا سلسلہ ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۱ء تک رہا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اثنائے تعلیم میں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکان کوچہ چیلاں کے بجائے اپنے والد محترم کے ہمراہ کہیں اور قیام پذیر ہوئے ہیں۔

استاد حدیث حضرت مولانا شاہ عبد الغنی صاحبؒ مجددی

علوم معقولہ اور منقولہ کے آخر میں حدیث کی کتابیں دہلی کے مشہور محدث شاہ عبد الغنی مجددی (متوفی ۶/ محرم ۱۲۹۶ھ بروز بدھ) ابن حافظ ابو سعید نقشبندی سے پڑھیں۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے علمی استفادہ

نیز مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے بھی حدیث کی تعلیم حاصل کی، مولانا خود اپنے ایک مکتوب میں بنام منشی محمد قاسم صاحب نیانگری مرید خاص کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"تم نے حال انتقال جناب مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم کا پوچھا ہے۔ مولوی صاحب سہارنپور (مولانا احمد علی صاحبؒ کی بیماری پر مزاج پرسی کیلئے) تشریف لے گئے تھے...... یہ سہارنپور کے رہنے والے محدث فقیہ مشہور تھے۔ ہمارے استاد تھے"۔(۱)

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے رشتۂ تلمذ

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور خود حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ حج سے واپس تشریف لائے تو اس زمانے میں نانوتے میں قیام کے دوران آپ نے مولانا محمد قاسم صاحب سے قدرے بخاری شریف پڑھی۔ خود سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"غدر میں دہلی کا تو سب کارخانہ درہم و برہم ہوگیا تھا۔ مولوی احمد علی صاحب کا مطبع گیا گذرا تھا اس زمانے میں سوائے وطن اور کوئی جگہ جانے کی نہ تھی۔ کبھی وطن نانوتہ اور کبھی دیوبند رہتے تھے اسی وقت احقر نے حضرت سے بخاری قدرے پڑھی۔(۲)

---

(۱) بیاض یعقوبی ص ۱۰۳۔ ۱۰۴ مکتوب ۴۰ مورخہ ۲۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ (۲) سوانح قاسمی ص ۱۸

مولانا محمد قاسم صاحب سے صحیح مسلم کا پڑھنا

صحیح بخاری پڑھنے کے علاوہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرٹھ کے دوران قیام میں جب کہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ منشی ممتاز علی کے مطبع میں تصحیح کا کام کرتے تھے اور وہ خود بھی یہی خدمت انجام دیتے تھے صحیح مسلم بھی پڑھی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"احقر اس زمانے میں بریلی اور لکھنؤ ہو کر میرٹھ میں اسی چھاپے خانے میں نوکر ہو گیا۔ منشی جی (ممتاز علی) حج کو گئے تھے۔ اس وقت میں ایک جماعت نے مولانا محمد قاسم صاحب سے مسلم پڑھی احقر بھی اس میں شریک رہا۔ وہی زمانہ (یعنی ۶۷۔۱۲۶۱ء کا ہے) کہ مدرسہ دیو بند کی بنیاد پڑی"۔(۱)

اب تک جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان میں شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ، والد محترم مولانا مملوک علی صاحب، مولانا محمد قاسم صاحب ہیں۔ چونکہ دہلی کالج میں بھی مولانا محمد یعقوب صاحب داخل ہو کر تعلیم حاصل کرتے رہے لہٰذا وہاں کے اساتذہ کا صحیح طور پر یقینی علم حاصل نہیں۔ البتہ اس زمانے میں جو اساتذہ دہلی کالج میں تعلیم دے رہے تھے۔ ان میں مولانا سید محمد، مولانا سدید الدین، مولانا سبحان بخش، مولانا جعفر علی، مولانا رشید الدین صاحب یہ حضرات ابتدائی مدرسین ہیں بعد ازاں اور اساتذہ آتے رہے اور بقول مولوی عبدالحق صاحب بابائے اردو بیس پروفیسر ملازم تھے۔ (مرحوم دہلی کالج) انہی میں ماسٹر رام چندر تھے۔ جن کا تقرر ۲۸ر فروری ۱۸۴۴ء کو پچاس روپیہ ماہوار پر سائنس پڑھانے پر ہوا۔ پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں:۔

"مولوی سدید الدین بن مولوی رشید الدین کا ۳۰ر اکتوبر ۱۸۳۰ء کو اور مولوی سبحان بخش شکار پوری کا ۵ر اکتوبر ۱۸۴۲ء کو اس (عربی) شعبے میں تقرر ہوا (بحوالہ رپورٹ جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن ۴۳۔۱۸۴۲ء(۲)

پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں کہ مولانا جعفر علی ۱۸۴۳ء میں دہلی کالج سے علیحدہ ہو گئے (مولانا محمد احسن ص ۱۷۴) اس تحقیق کے بعد مولانا محمد یعقوب صاحب کا مولوی جعفر علی صاحب سے پڑھنا مخدوش سا ہو گیا ہے کیونکہ مولانا محمد یعقوب صاحب ۴۳۔۱۸۴۲ء

---

(۱) سوانح قاسمی ص ۲۱ (۲) مولانا محمد احسن ص ۱۷۳

میں دہلی کالج میں داخل ہوئے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ ماہ تعلیم حاصل کی ہو۔ الغرض دہلی کالج کے اساتذہ کا تحقیقی طور پر علم ہونا دشوار ہے۔

سند حدیث مولانا محمد یعقوب صاحبؒ

علم حدیث و تفسیر پڑھنے والوں کے لئے سند حدیث و تفسیر ایک بہت بڑا اعزاز و اکرام ہے کہ اس سلسلے میں ان کی نسبت اور سند حدیث تبع تابعین، صحابہ سے گذرتی ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچتی ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے بخاری اور ترمذی اور دیگر کتب حدیث شاہ عبد الغنی مجددی دہلوی، مولانا احمد علی سہارنپوری سے پڑھی ہیں۔ لہٰذا ہم صرف شاہ عبد الغنی مجددی کے واسطے سے مولانا محمد یعقوب کی سند حدیث پیش کرتے ہیں جو حسب ذیل ہے۔

مولانا محمد یعقوب نے شاہ عبد الغنی مجددی دہلوی سے (۱) انہوں نے شاہ محمد اسحاق سے، (۲) انہوں نے اپنے نانا شاہ عبد العزیز سے (۳) انہوں نے اپنے والد شاہ ولی اللہ سے (۴) انہوں نے شیخ طاہر سے (۵) انہوں نے شیخ ابراہیم کردی سے، (۶) انہوں نے شیخ احمد قشاشی سے (۷) انہوں نے احمد بن عبد القدوس شناوی سے، (۸) انہوں نے شیخ شمس الدین سے، (۹) انہوں نے شیخ احمد زکریا سے، (۱۰) انہوں نے شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی سے (۱۱) انہوں نے ابراہیم بن احمد شوخی سے، (۱۲) انہوں نے احمد بن ابی طالب الحجاز سے، (۱۳) انہوں نے سراج الحسین بن مبارک زبیدی سے، (۱۴) انہوں نے شیخ ابی الوقت عبد الاول بن عیسیٰ بن شعیب السنجری الہروی سے، (۱۵) انہوں نے شیخ ابو الحسن عبد الرحمن بن مظفر الداودی سے، (۱۶) انہوں نے ابو محمد عبد اللہ بن احمد سرخسی سے، (۱۷) انہوں نے ابو عبد اللہ محمد بن یوسف بن مطر بن صالح بن بشر الفربری سے، (۱۸) انہوں نے امیر المومنین فی الحدیث شیخ ابو عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل البخاری سے، (۱۹) انہوں نے (مثلاً ایک سند حدیث کے اعتبار سے) ابو الیمان سے (۲۰) انہوں نے شعیب سے (۲۱) انہوں نے ابو الزناد سے، (۲۲) انہوں نے اعرج سے (۲۳) انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے (۲۴) انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال والذی نفسی بیدہ لایؤمن احد کم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ او کما قال.

تحقیق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جسکے قبضے میں میری جان ہے تم میں سے کوئی کامل مومن نہیں ہے تا آنکہ میں اسکے نزدیک اس کے باپ اور بیٹے سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔

امام بخاری سے پیغمبر ﷺ تک ایک طریق سے ہم نے سند حدیث پیش کی ہے۔ ورنہ تو امام بخاری نے بقول حاکم عبد اللہ محدث امام بخاری کا یہ قول جعفر بن قطان سے سن کر نقل کیا ہے انہوں نے کہا کہ میں نے امام بخاری سے سنا ہے وہ کہتے تھے کہ "میں نے ایک ہزار علماء و شیوخ سے حدیثیں لکھی ہیں بلکہ زیادہ سے اور میرے پاس کوئی حدیث نہیں ہے کہ میں نے اس کی سند نہ لکھی ہو"۔(۱)

غرض یہ کہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی سند حدیث پچیس واسطوں سے رسول اللہ ﷺ تک پہنچتی ہے اور یہ نسبت ایک سب سے بڑی نسبت ہے جو رسول اللہ ﷺ سے امتی کو حاصل ہو۔ فالحمد للہ.

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جن اساتذہ سے تعلیم پائی ان میں سب سے زیادہ حصہ آپ کے والد محترم مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کیونکہ حدیث کے سواء تمام علوم و فنون صرف و نحو، ادب، منطق و فلسفہ، فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، تفسیر، ہیئت، معانی و بیان وغیرہا سب اپنے والد محترم سے حاصل کیے۔

عائلی زندگی و شادی خانہ آبادی

پہلی شادی مسماۃ عمدۃ النساء سے شعبان ۱۲۶۶ھ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی تین شادیاں ہوئیں ہمارے دوست پروفیسر محمد ایوب صاحب قادری نے اپنی کتاب "مولانا محمد احسن" میں دو شادیوں کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نانوتوی نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بی بی عمدۃ النساء بنت شیخ کرامت حسین دیوبندی سے .... مولانا کی دوسری شادی

(۱) مقدمہ بخاری از مولانا احمد علی محدث سہارنپوری ص ۴

مسماۃ اکرامن ساکن انبیٹھہ سے ہوئی"۔(۱)

اس سلسلے میں ہم آپ کو بیاض یعقوبی کے حسب ذیل حقائق کی طرف لئے چلتے ہیں جو مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک نے یادداشت کے طور پر درج فرمائے ہیں لکھتے ہیں:۔

"واقعہ ۱۲۹۲ ہجری شب چہاردہم رمضان المبارک روز جمعہ بوقت نواخت دہ گھنٹہ شب انتقال زوجہ محمد یعقوب عمدۃ النسا اسم با مسمّٰی بنت شیخ کرامت حسین مرحوم والدہ معین الدین و قطب الدین و علاء الدین و جلال الدین و فاطمہ و خدیجہ گردید برائے یادداشت نوشتہ شد و بروز جمعہ دفن شد۔

چو ذات الصدع گفتم بے سر دل
ازیں تاریخ ایں ماتم ہویدا

۱۲۹۶۔۴=۱۲۹۲ھ

و نکاح او در شعبان ۱۲۶۶ھ شدہ بود بمہر صما ۵۰۰، بست و شش بعد نکاح زندہ ماند وقت نکاح ہفدہ سالہ بود۔ در عمر چہل و سہ انتقال شد۔ (بیاض یعقوبی ص ۱۵۱)

رمضان المبارک ۱۲۹۲ کی چودہ تاریخ کو جمعہ کی رات میں دس بجے مسماۃ عمدۃ النساء اسم با مسمّٰی زوجہ (مولانا) محمد یعقوب بنت شیخ کرامت حسین مرحوم، والدہ معین الدین (۱)، قطب الدین (۲) علاء الدین (۳) جلال الدین (۴) فاطمہ (۵) خدیجہ (۶) کا انتقال ہو گیا۔

یادداشت کے طور پر یہ تحریر لکھی گئی۔ جمعہ کے روز دفن ہوئیں۔ (تاریخ وفات)

اس کا نکاح شعبان ۱۲۶۶ھ میں پانچ سو روپیہ مہر کے عوض ہوا تھا۔ چھبیس سال نکاح کے بعد زندہ رہیں۔ نکاح کے وقت سترہ سال کی عمر تھی تینتالیس سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ (بیاض یعقوبی ص ۱۵۱)

دوسری شادی مسماۃ اکرامن سے یکم محرم ۱۲۹۳ھ میں

آپ کی دوسری شادی مسماۃ اکرامن سے ہوئی ان سے نکاح اور اولاد کے بارے میں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ حسب ذیل یادداشت بیاض یعقوبی میں تحریر فرما گئے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

---

(۱) مقدمہ بخاری از مولانا احمد علی محدث سہارنپوری ص ۱۹۷۔۱۹۸

یکم محرم ۱۲۹۳ھ روز شنبہ بوقت صبح نکاح محمد یعقوب باکرامن ساکنہ انبیٹھہ کہ از زوج سابق منشی عبد الحق پسر مولوی محمد صابر دیوبندی بیوہ شدہ بود۔ بعوض مہر فاطمی (ایک سو پچاس) در انبیٹھہ منعقد گردید

ہاتف نے کہا زروئے بہبود
کیا خوب ہوا نکاح ثانی

۱۲۹۱۔۲=۱۲۹۳ھ

دو دختر و یک پسر از و تولد شدہ۔ دختر اولین برکت نام دو سالہ شدہ انتقال کردہ ویک پسر ہمراہش انتقال کردہ فرید الدین نام و یک دختر ام سلمہ نام باقی گذاشتہ۔

(بیاض یعقوبی ۱۵۱۔۵۲)

یکم محرم ۱۲۹۳ھ ہفتے کے دن صبح کے وقت محمد یعقوب کا نکاح اکرامن کیساتھ جو انبیٹھہ (ضلع سہارنپور) کی رہنے والی منشی عبدالحق پسر مولوی محمد صابر دیوبندی کی بیوہ تھیں، ایک سو پچاس (مہر فاطمی) کے عوض انبیٹھہ میں ہوا۔

ہاتف نے کہا زروئے بہبود
کیا خوب ہوا نکاح ثانی

۱۲۹۳ھ

اس سے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا ہوئے۔ سب سے پہلی لڑکی برکت نام کی دو سال ہوئے انتقال کر گئی اور اسکے ساتھ ایک لڑکا فرید الدین انتقال کر گیا۔ ایک لڑکی مسماۃ ام سلمہ چھوڑ گئی۔

(بیاض یعقوبی ص ۱۵۱۔۱۵۲)

گویا دوسرا نکاح پہلی بیوی کی وفات سے چار ماہ اور کچھ دن بعد ہوا۔

وفات زوجہ ثانیہ بی بی اکرامن ۱۴ر ذوالحجہ ۱۳۰۱ھ میں

بی بی اکرامن مرحومہ زوجۂ ثانیہ کے انتقال پر ملال کے متعلق مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی یادداشت جو انہوں نے اپنے دست مبارک سے تحریر فرمائی ہے حسب ذیل ہے:

چاردہم عید الاضحیٰ ۱۳۰۱ھ زوجۂ ام بی اکرامن بہماں عارضہ اسہال وقے انتقال کردہ و فرزندش فرید الدین نام ہماں شب انتقال نمود بست روز اوّل از علاء الدین حافظ جلال الدین بستم

۱۴ر ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ کو میری بیوی بی بی اکرامن کا اسی مرض ہیضہ میں انتقال ہوگیا اور اس کا لڑکا فرید الدین نام اسی رات میں انتقال کر گیا۔ اور علاء الدین سے بیس دن پہلے حافظ جلال الدین

ذیقعدہ انتقال کردہ بعارضہ اسہال خون پیچش۔ و ایں سال عام الحزن شدہ (بیاض یعقوبی ص ۱۵۲۔ ۱۵۳)

بیس ذیقعدہ (۱۳۰۱ھ) کو پیچش کے خونی دستوں کے مرض میں وفات پاگیا۔ چنانچہ یہ سال حزن (۱) کا سال ثابت ہوا۔

تیسرا نکاح آمنہ بنت مولوی محمد احسن صاحب ۱۳۰۱ھ

بی بی اکرامن صاحبہ مرحومہ کے انتقال کے بعد اسی سال ۱۳۰۱ھ میں مولانا محمد یعقوب صاحب کی تیسری شادی محترمہ آمنہ بنت مولوی محمد احسن صاحب سے ہوئی جن سے ایک لڑکا نظام الدین نامی پیدا ہوا جو چھ ماہ کا ہو کر انتقال کرگیا۔ بیاض یعقوبی میں ایک یادداشت ان الفاظ میں ملتی ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب لکھتے ہیں:۔

ودریں سال ۱۳۰۱ھ نظام الدین نام شش ماہہ فرزندم از بطن دختر مولوی محمد احسن صاحب آمنہ نام انتقال کرد۔ (بیاض ص ۱۵۲)

اور اس سال ۱۳۰۱ھ میں نظام الدین نام کا میرا لڑکا مولوی محمد احسن کی لڑکی آمنہ کے پیٹ سے چھ ماہ کا انتقال کرگیا۔

ان تحریری دستاویزوں سے مولانا کی تین شادیاں ہونا یقین کے درجے میں آگئیں۔ خلاصہ آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ زوجہ اول بی بی عمدۃ النساء کی اولاد

(۱)	(۲)	(۳)	(۴)	(۵)	(۶)	(۷)	(۸)	(۹)
صدیقہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انتقال کرگئی	معین الدین اجمیر کے دوران ملازمت میں پیدا ہوا	حافظ قطب الدین	فرید الدین	حافظ مولوی علاء الدین فاضل دیوبند ۱۰ ذی الحجہ ورشب ۱۳۰۱ھ انتقال کیا	شمس الدین بعمر ایک سال وفات	حافظ جلال الدین	فاطمہ لاولد	خدیجہ متوفیہ ۵ محرم ۱۳۲۸ھ بروز منگل تین بجے شام جلال الدین سے تین سال عمر میں بڑی

(۱) آنحضور ﷺ کے چچا ابو طالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا ایک ہی سال ۱۰ نبوی میں انتقال ہوا تھا۔ اس سال کو آنحضور علیہ الصلوۃ والسلام نے نام عام الحزن (غم کا سال) رکھا تھا اسی مناسبت سے مولانا کا یہ سال بھی عام الحزن تھا۔ یہ حضرت مولانا [illegible] یادداشت کر گئے [illegible]

۲۔ زوجۂ دوم بی بی اکرامن کی اولاد

(۱۰)	(۱۱)	(۱۲)
برکت	فریدالدین	سلمہ (زوجہ منیر احمد انبیٹھوی برادر مولوی انوار احمد و مولوی صدیق احمد انبیٹھوی)

۳۔ زوجۂ سوم بی بی آمنہ کی اولاد

(۱۳)

نظام الدین

(متوفی ۱۳۰۱ھ بعمر چھ ماہ)

دیگر تفصیل اولاد بقلم مولانا

ہم نے جہاں تک تحقیق کی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی اولاد کی شمار یہ ہے کہ ان کے آٹھ لڑکے اور پانچ لڑکیاں کل تیرہ بچے پیدا ہوئے جن کی تفصیل اوپر بیان کی گئی۔

ایک مکتوب مورخہ ۱۸؍ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۸ھ میں مولانا نے اولاد کی تفصیل منشی محمد قاسم نیانگری مرید خاص کو اس طرح لکھی ہے۔

احقر کے چار لڑکے ہیں ایک کا نام معین الدین جو اجمیر میں پیدا ہوا تھا اس کی عمر سولہ برس کی ہے، قرآن کریم حفظ کرلیا ہے، اب جناب مولوی محمد مظہر صاحب (صدر مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور) کی خدمت میں عربی پڑھتا ہے اس سے برس دن چھوٹا قطب الدین نام کا ہے۔ اس نے قرآن شریف ختم کرلیا۔ اب کے سال انشاء اللہ کچھ اور پڑھنا شروع کرے گا۔ اس سے چار برس چھوٹا علاء الدین نام کا ہے وہ قرآن شریف حفظ کرتا ہے سات سیپارے اس نے حفظ کئے ہیں اور ایک چھوٹا لڑکا تیسرے برس میں ہے اس کا نام جلال الدین ہے اور ایک لڑکا علاء الدین سے بڑا قطب الدین سے چھوٹا فرید الدین نام کا دو سال ہوئے کہ تالاب میں ڈوب کر مرگیا اور ایک شمس الدین نام کا جلال الدین سے بڑا قریب برس دن کا مرگیا اور ایک لڑکی صدیقہ نام کی جو معین الدین سے بڑی تھی غدر کے دنوں میں مرگئی تھی۔ اب ایک لڑکی فاطمہ

نام کی جلال الدین سے تین برس بڑی ہے۔ یہ ہے اولاد احقر۔(۱)

واضح رہے کہ یہ مکتوب جس میں اولاد کی یہ تفصیل ہے۔ ۱۸ر جمادی الاولیٰ ۱۲۸۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ سب بچے بی بی عمدۃ النسا سے پیدا ہوئے تھے جن کا انتقال ۱۲۹۲ھ میں ہوا ہے۔ اس تفصیل سے پہلی اولاد کی باہمی چھوٹائی اور بڑائی کی حقیقت معلوم ہوئی۔ حضرت مولانا کو ۱۳۰۱ھ میں جو اولاد اور بیوی کی وفات کے یکے بعد دیگرے اور جانکاہ صدمات پہنچے وہ اولیاء کی آزمائش کی ایک خاص کڑیاں ہیں اور ان کے صبر کا جو مظاہرہ ان صدمات میں ہوا وہ ان کے قرب خداوندی کا زبردست شاہکار ہے۔ ذیقعدہ وذی الحجہ میں زوجہ اکرامن، مولوی علاء الدین حافظ جلال الدین، فرید الدین گھر کے چار افراد سامنے سے اٹھ گئے اور اس سے پہلے کئی بچے آنکھوں کے سامنے وفات پا گئے۔ مختصر یہ ہے کہ دو تین بچوں فاطمہ اور معین الدین وغیرہما کے سوا تمام کے تمام کو اپنے ہاتھوں سے دفنایا۔ ان ہی کا دل و جگر تھا کوئی اور ہوتا تو صدمے سے مر جاتا۔ بالخصوص صاحبزادہ مولوی حافظ محمد علاؤ الدین کی موت کا حال پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ان کی وفات کے متعلق جو یادداشت بیاض یعقوبی میں درج ہے وہ یہ ہے

"شب عید الاضحیٰ ۱۳۰۱ھ بوقت نواخت یازدہ فرزندم مولوی حافظ محمد علاء الدین بعارضہ ہیضہ واسہال و قے بعد شدت مرض تادہ روز انتقال نمود اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ. تولد او در نانوتہ بماہ صفر ۱۲۷۸ھ شدہ۔ دریں عمر بست و چار سال حفظ قرآن نمود و کتب درسیہ تمام کردہ از مدرسہ دیو بند برسم دستار بندی کہ علامت فضل و کمال بود معزز شدہ در ہمیں سال در دیو بند بریاض رضوان و در تکیہ شیخ لطف اللہ بجانب شرق بر چبوترہ زیریں مدفون شد۔ (۲)

بقر عید کی رات کو ۱۳۰۱ھ میں گیارہ بجے میرا لڑکا مولوی حافظ محمد علاء الدین دست اور قے کے مرض ہیضہ میں دس روز کے مرض کی سختی کے بعد انتقال کر گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس کی پیدائش نانوتے میں ماہ صفر ۱۲۷۸ھ کو ہوئی نے اس چوبیس سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کیا اور درسی کتابیں پوری کر کے دیو بند کے مدرسے سے دستار فضیلت کی رسم سے جو کہ فضل و کمال کی علامت ہے معزز ہوا۔ اسی سال دیو بند میں، ریاض رضوان میں شیخ لطف اللہ

(۱) مکتوبات یعقوبی ص ۵۸ مکتوب ۱۹ (۲) بیاض یعقوبی ۱۵۲

کے قبرستان میں نیچے کے چبوترے پر
مشرق کی جانب دفن کیا گیا۔

مولوی حافظ علاء الدین صاحب چوبیس سال کے جواں عمر دیوبند کے فاضل بیٹے کا جنازہ جب مولانا محمد یعقوب صاحب کے ہاتھوں اٹھا ہو گا تو ان کا کیا حال ہوا ہو گا۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، یعقوب کا یہ یوسف ایسا گم ہوا کہ پھر قیامت تک نہ ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی بے نیاز ہے اس کی حکمتوں کو وہی جانے۔ کسی نے ایسے ہی وقت کے لئے کہا تھا ؎

صُبَّتْ عَلَیَّ مصائبٌ لَوْ اَنَّھَا
صُبَّتْ عَلَی الْاَ یَّام صِرْنَ لَیَالِیَا

(ترجمہ) مجھ پر اتنے مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہیں کہ اگر وہ مصائب دنوں پر ٹوٹتے تو دن راتوں سے بدل جاتے۔ اور فارسی کے مشہور شاعر انوری کا یہ شعر بھی مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ترجمانی کے لئے خوب ہے ؎

ہر بلائے کز آسماں آید
خانۂ انوری ہمی جوید

جس کا ترجمہ ایک اردو شاعر نے کیا ہے ؎

چھوٹتی ہیں جو فلک سے تو یہیں آتی ہیں
تاک رکھا ہے بلاؤں نے ہمارے گھر کو

مولانا محمد یعقوب صاحب کا صبر واستقلال

میرے نزدیک حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا صبر و استقلال ان کے مقام ولایت کا نشان کمال ہے۔ قرآن کریم کی حسب ذیل آیت ان پر کس قدر چسپاں نظر آتی ہے۔

یَـآاَیُّھَا الَّـذِیْنَ اٰمَنُوْ ا اسْـتَعِیْنُوْ بِـالصَّبْرِ وَالصَّـلٰوۃِ اِنَّ اللّٰہَ مَـعَ الصَّابِرِیْنَ o	اے ایمان والو صبر اور نماز کے ذریعے مدد حاصل کرو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کیساتھ ہے

اور یہ آیات

وَبَشِّرِ الصَّـابِـرِیْـنَ الَّـذِیْنَ اِذَا	اور ان لوگوں کو خوشخبری پہنچا دیجئے کہ

اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ . اُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ.

جب ان کو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف واپس جانے والے ہیں۔ وہی لوگ ہیں کہ ان پر اللہ کی طرف سے رحمتیں ہیں اور وہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

غرض یہ ہے کہ یعقوب پر بہت سے مصائب گذرے اور وہ صبر کی چٹان بن کر کھڑا رہا۔
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نور اللہ مرقدہ بانیٔ دار العلوم دیوبند کی وفات پر اپنے دل کی حالت بیان کرتے ہوئے یہ سالک و مجذوب اپنے مرید خاص منشی محمد قاسم صاحب کو لکھتے ہیں:

"اور میرا حال کیا پوچھتے ہو یہ صدمہ جانکاہ ایک جہان پر ہے میں تو سخت دل سخت جان آدمی ہوں کسی کے مرنے کا رنج بہت نہیں ہوتا مگر اتنا غم کسی کا نہیں ہوا۔ خلاصہ یہ کہ اب زندگی تلخ ہو گئی"۔(۱)

کسب معاش و ملازمت

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے دہلی کالج میں جو کہ سرکاری کالج تھا تعلیم حاصل کی تھی اور اس میں داخل رہتے ہوئے بھی اپنے والد محترم اور شاہ عبد الغنی صاحب اور مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے خارج میں (۱) تفسیر ،(۲) حدیث ،(۳) فقہ ، (۴) علم کلام، (۵) اصول حدیث ،(۶) اصول تفسیر ،(۷) اصول فقہ ،(۸) صرف و نحو (۹) منطق (۱۰) فلسفہ (۱۱) علم المعانی و البیان (۱۲) ہیئت (۱۳) ادب (۱۴) تاریخ، (۱۵) حساب ،(۱۶) علم الفرائض وغیرہا علوم پڑھتے تھے۔ لیکن سرکاری ملازمت کے حصول کا ذریعہ کسی سرکاری کالج کو سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے دہلی کالج میں مولانا کی تعلیم کا نتیجہ بآسانی کسی سرکاری ملازمت کے حصول کا ذریعہ بن گیا تھا۔

ہم نے دہلی کالج کے مفصل حالات انوار قاسمی میں اور مختصراً اس کتاب میں بھی بیان کئے ہیں جو کبھی کی چھپ کر شائع ہو چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب نے ۱۲۶۱ھ سے ۱۲۶۷ھ تک اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ اسی مذکورہ سال ۱۲۶۷ھ ۱۸۵۱ھ میں آپ کے والد محترم و مرحوم

(۱) مکتوبات یعقوبی ص ۱۰۶ مکتوب ۱۵

مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی وفات کے ایک سال بعد تک مولانا اپنے مکان (جو کوچہ چیلان دہلی میں تھا) میں رہے۔

گورنمنٹ کالج اجمیر کی ملازمت

۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ھ میں منشی امیر احمد عشرتی مکتوبات یعقوبی کے مقدمے میں اجمیر کی ملازمت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اور بعد فارغ التحصیل ہونے کے اولاً آپ اجمیر شریف میں تیس روپیہ کے ملازم ہو کر تشریف لے گئے اس وقت آپ بہت کم سن (اٹھارہ سال) کے تھے۔ پرنسپل اجمیر نے آپ کو دیکھ کر کہا کہ حقیقتاً مولوی تو بہت اچھا ہے مگر نو عمر و کم سن ہے"۔(۱)

الحاصل مولانا محمد یعقوب صاحب اٹھارہ سال کی کم عمری میں اجمیر کے کالج میں تیس روپیہ کے ملازم ہو کر تشریف لے گئے، اس زمانہ کے تیس روپیہ ماہوار کا ملازم نہایت ممتاز اور مؤقر سمجھا جاتا تھا۔ یوں سمجھئے کہ اس زمانے کے تیس آج کے تین سو کے برابر تھے۔

پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں:۔

"مولانا مملوک علی کا انتقال ہو گیا تو تقریباً ایک سال تک مولانا محمد یعقوب صاحب اپنے مکان واقع کوچہ چیلاں (دہلی) میں رہے اس کے بعد چالیس روپیہ ماہوار مشاہرے پر ملازم ہو کر وہ گورنمنٹ کالج اجمیر چلے گئے اور پانچ سال تک وہاں رہے اس کے بعد سہارنپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا، اسی زمانہ میں انقلاب ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہائلہ پیش آیا۔(۲)

امیر احمد صاحب عشرتی اور پروفیسر محمد ایوب صاحب قادری کی تحریروں سے ان کا اجمیر میں ملازمت پر تقرر تو معلوم ہوا مگر تنخواہ میں دونوں کے بیانات میں اختلاف ہے، مولانا کا اجمیر کے مدرسے میں کس عہدے پر تقرر ہوا اس کے متعلق منشی محمد قاسم صاحب نیانگری مکتوبات یعقوبی کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

"بندۂ آثم محمد قاسم .... سکنہ نیانگر ضلع اجمیر شریف التماس کرتا ہے کہ اس عاجز کے زمانۂ طفولیت میں جناب فیض مآب مولانا مرشدی مولوی حاجی حافظ محمد یعقوب صاحب

---

(۱) مکتوبات یعقوبی ص ۵ (۲) مولانا محمد احسن ص ۱۸۹

صدیقی ساکن نانوتہ ضلع سہارن پور دامت بر کاتہم و کرامتہم خلف الرشید حضرت استاذ العلماء مولانا محمد مملوک علی صاحب مرحوم مدرس اعلی مدرسہ دہلی۔ کہ اجمیر شریف کے مدرسے میں مدرس اول تھے اور میرے بہنوئی میاں غلام حسین صاحب مرحوم کے اور جناب مولانا محمد یعقوب صاحب ممدوح کے باہم نہایت درجہ ارتباط تھا۔(۱)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اجمیر کے کالج میں مدرس اول تھے یہ مدرس اول ایسے ہی تھے جیسے دہلی کالج میں علوم عربیہ کے مدرس اول مولانا محمد مملوک علی تھے اور انگریز کالج کا پرنسپل تھا، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مولانا علوم شرقیہ کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھے اس طرح بات صاف اور واضح ہوکر سامنے آجاتی ہے۔

ڈپٹی کلکٹری کے عہدے کی سفارش

مولانا اجمیر کے کالج میں پڑھاتے رہے، اپنے فرائض منصبی نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے تا آنکہ انگریز پرنسپل ان کی لیاقت، فراست اور فضیلت کا تہ دل سے قائل ہو گیا اور اس نے مولانا کے لئے ڈپٹی کلکٹری کے عہدے کی سفارش کی، یوپی میں کلکٹر کمشنر کے تحت ضلع کا انچارج ہوتا ہے۔ پنجاب میں اس کو ڈپٹی کمشنر کہا جاتا ہے لہٰذا ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ وہی ہوا جو پنجاب میں اے ڈی، سی کا ہوتا ہے یعنی اسسٹنٹ ڈپٹی کمشنر کا۔ پرنسپل نے مولانا کو اس سفارش کی اطلاع بالکل نہیں دی۔

عشرتی صاحب دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"آپ کی ذکاوت وذہانت وفہم و فراست کے تجربہ کر لینے کے بعد بلا اطلاع آپ کے پرنسپل اجمیر نے گورنمنٹ میں سفارش کر کے آپ کے لئے ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ منظور کرایا، بعد منظوری جب آپ کو اس عہدے پر مامور ہونے کی اطلاع کی تو آپ نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا"۔(۲)

یہ امر قابل غور ہے کہ اتنے بڑے عہدے کو یوں ٹھکرا دینا کتنا بڑا جوانمردی، قناعت اور استغنا کا کام تھا، دراصل مولانا محکمہ تعلیم سے جدا ہونا پسند نہ فرماتے تھے اور اتنے بڑے ذمہ داری کے کام کو اپنی گردن پر رکھنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ آج کی دنیا میں ترقی کیلئے افسروں کی

---

(۱) دیباچہ مکتوبات یعقوبی ص۱۹ (۲) دیباچہ مکتوبات یعقوبی ص۵

خوشامد، خدمت، رشوت اور کیا کچھ کرنے میں ماتحت کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے لیکن مولانا نے خواہش تو کیا اس عہدہ جلیلہ کے بالا بالا منظور ہو جانے کو بھی پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

انگریز پرنسپل کی مولانا کی متعلق یہ سفارش بتاتی ہے کہ انگریز کی نظر میں معیار ترقی لیاقت و شرافت تھا۔

اجمیر سے بنارس تبادلہ

پروفیسر محمد ایوب صاحب قادری نے اپنی کتاب "مولانا محمد احسن" میں لکھا ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب پانچ سال اجمیر رہے اور پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر اجمیر سے ان کا تبادلہ سہارن پور کو ہو گیا، ۔ بنارس کا ان کی عبارت میں کوئی تذکرہ نہیں، غالباً مولانا محمد یعقوب صاحب نے سوانح قاسمی میں جو یہ لکھا ہے کہ پانچ برس تک پھر ملاقات مولوی محمد قاسم صاحب سے نہیں ہوئی جب احقر اجمیر گیا، مولوی (محمد قاسم) صاحب اسی (کوچہ چیلاں کے) مکان میں رہتے تھے اس پانچ برس کے لفظ نے شبہ میں ڈال دیا ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب پانچ سال اجمیر رہے، لیکن حکیم امیر احمد عشرتی مکتوبات یعقوبی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"جب آپ کو کلکٹری کے عہدے پر مامور ہونے کی اطلاع کی گئی تو آپ نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، اس کے کچھ عرصہ بعد آپ سو روپیہ ماہوار پر بنارس بھیجے گئے۔(۱)

حکیم صاحب کی یہ عبارت بنارس کے تبادلے کی واضح تاریخی دستاویز ہے جس میں شک کی بظاہر کوئی گنجائش نہیں، لیکن یہ پتہ کچھ نہ چل سکا کہ کتنے سال کے بعد اجمیر سے بنارس کو تبادلہ ہوا۔ اجمیر میں بقول قادری پانچ سال قیام کے دوران میں تیس یا چالیس روپیہ سے سالانہ ترقی ہو کر تنخواہ میں یقیناً اضافہ ہوا اور یوں بنارس کے تبادلے پر آپ کی تنخواہ سو روپیہ تک پہنچی۔ بنارس کے تبادلے کی طرف مولانا نے سوانح قاسمی میں بھی اشارہ فرمایا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

"جب احقر بنارس سے وطن کی طرف پہنچا، اتفاق نانوتہ جانے کا نہ ہوا، دیوبند میں اہل و عیال چھوڑ کر روڑکی چلا گیا وہاں کام نوکری کا کرنے لگا"۔(۲)

---

(۱) دیباچہ مکتوبات یعقوبی ص۵ (۲) سوانح قاسمی ص ۷۱

بنارس سے روڑکی کو تبادلہ ۱۸۵۷ء

بنارس میں ملازمت پر تقرر اور اس کے بعد روڑکی کا تبادلہ بھی ساتھ ساتھ معلوم ہوا، یہ دونوں تبادلے خود مولانا کی عبارتی دستاویزیں ہیں، حکیم امیر احمد عشرتی صاحب نے بھی بنارس سے سہارن پور کے تبادلے کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

”کچھ عرصہ بعد (اجمیر سے) آپ سو روپیہ ماہوار پر بنارس بھیجے گئے، وہاں سے پھر ڈیڑھ سو روپیہ کی تنخواہ پر ڈپٹی انسپکٹر پر سہارن پور تشریف لائے پھر کچھ عرصہ بعد غدر ۱۸۵۷ء کا واقعہ پیش آیا۔(۱)

تنقید و تجزیہ

بات وہی اصل ہے جو مولانا نے فرمائی ہے کہ احقر بنارس سے دیوبند پہنچا، سواریوں کو وہاں سسرال میں چھوڑ کر روڑکی پہنچا اور وہاں نوکری کا کام کرنے لگا، عشرتی صاحب روڑکی کو بھول گئے، خلاصہ یہ ہے کہ اجمیر کالج سے بنارس کالج، بنارس کالج سے روڑکی اور روڑکی کالج سے سہارنپور ضلع کے مدارس کی ڈپٹی انسپکٹری کے عہدہ پر مامور ہوکر سہارنپور مقیم رہے کہ ہنگامۂ آزادی برپا ہوا اور سہارنپور سے آپ کو مولانا محمد قاسم صاحب نانوتہ لے آئے۔ مولانا سوانح قاسمی میں جہاد حریت (غدر کے نام سے مشہور) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”اسی عرصہ میں غدر ہو گیا، بعد رمضان (مولانا محمد قاسم صاحب) احقر کو سہارنپور لینے کو تشریف لائے۔ چند آدمی اور وطن دار ساتھ تھے اس وقت راہ چلنا بدون ہتھیار اور سامان کے دشوار تھا، جب احقر وطن (نانوتہ) پہنچا چند ہنگامے مفسدین کے پیش آئے، جس میں مولانا (محمد قاسم) کی کمال جرأت و ہمت ظاہر ہوئی۔(۲)

جہاد حریت ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء کے بعد نانوتہ میں قیام

۱۸۵۷ء مطابق رمضان ۱۲۷۳ھ کے بعد مولانا محمد یعقوب صاحب شوال ۱۲۷۳ھ سے نانوتے میں مقیم ہوگئے ہیں جیسا کہ گزشتہ سطور بالا میں گذرا، صاف ظاہر ہے کہ شوال ۱۲۷۳ھ

---

(۱) دیباچہ مکتوبات یعقوبی ص د (۲) سوانح قاسمی از مولانا محمد یعقوب ص ۱۹

سے ۱۴ر جمادی الاول ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۸ر نومبر ۱۸۶۰ء بدھ تک نانوتے میں رہے کیونکہ ۱۵ر جمادی الاول ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۹ر نومبر ۱۸۶۰ء بروز پنجشنبہ مولانا محمد یعقوب صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب حرمین شریفین کی زیارت کیلئے نانوتے سے روانہ ہو گئے اس اثنا میں اور کہیں ملازمت نہ کی، بیاض یعقوبی میں اپنے پہلے حج کے سلسلے میں مولانا خود تحریر فرماتے ہیں۔

"۱۵ر جمادی الاول ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۹ر نومبر ۱۸۵۰ء بروز پنج شنبہ نانوتہ سے ڈیڑھ پہر دن چڑھے حج کیلئے چلے عصر کے وقت سہارنپور پہنچے (۱)

یہ عبارت واضح کرتی ہے کہ شوال ۱۲۷۳ھ سے ۱۴ر جمادی الاولی ۱۲۷۷ھ تک یعنی انگریزی حساب کے مطابق ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے ۲۸ر نومبر ۱۸۶۰ تک تقریباً ساڑھے تین سال مولانا محمد یعقوب صاحب ایام جہاد آزادی میں نانوتہ مقیم رہے۔

دوران قیام نانوتہ کے مشاغل

اس اثنا میں یعنی دوران قیام نانوتہ میں مولانا کا کیا شغل رہا ایک تو یہی کہ مولانا نے مولانا محمد قاسم صاحب سے بخاری شریف پڑھی، جیسا کہ پہلے مذکورہ ہوا اور نشانہ بازی کی مشق بھی کی۔ سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں:۔

"اسی زمانے (جہاد حریت ۱۸۵۷ء) میں ہمارے بھائی ہم عمر اکثر بندوق اور گولی لگانے میں مشق کرتے رہتے تھے ایک دن آپ (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب) مسجد میں سے آئے (محلے کی مسجد جس میں وقت گزارتے تھے) کہ ہم گولیاں لگا رہے تھے اور نشانہ کی جائے پر ایک نیم کا پتہ رکھا تھا، اور اس کے گرد ایک دائرہ کھینچا تھا۔ قریب سے بندوق لگاتے تھے گولیاں مٹی کی تھیں۔ (۲)

گویا اس دور کی فضا ہی جہاد حریت تھی اور اس کے لئے اہم شغل نشانہ بازی، بندوق چلانے کی مشق اور شمشیر زنی تھا، یہی کچھ شوق مولانا محمد یعقوب صاحب کو بھی تھا مگر اس سے زیادہ کہ نشانہ کی مشق فرماتے رہے اور کچھ ظہور میں نہ آیا۔

جہاد ۱۸۵۷ء سے مولانا محمد یعقوب صاحب کا اتفاق

مولانا محمد یعقوب صاحب کا نہ تو جہاد ۱۸۵۷ء میں شامل ہونا ثابت ہوتا ہے اور نہ اس

(۱) بیاض یعقوبی ص ۱۳۸ (۲) سوانح قاسمی ص ۱۷

سلسلے میں ان کے حالات میں کوئی بات ایسی ملتی ہے کہ انہوں نے کوئی تعاون کیا ہو، لیکن حکومت کی بزرگان دین بالخصوص پیر و مرشد حاجی صاحب اور علماء دین کی پکڑ دھکڑ، دار و گیر، دار و رسن اور قتل و غارت کے باعث مولانا محمد یعقوب صاحب کو حکومت سے یقیناً سخت نفرت ہو گئی تھی، خواہ عملی شکل سے انہوں نے حصہ نہ لیا ہو۔

حکومت سے چھ ماہ کی تنخواہ اور مولانا کا انکار

چونکہ حضرت حاجی صاحب سب کے معتقد فیہ تھے اور ہر شخص اپنی جان تک ان پر قربان کرنے کے لئے تیار تھا اس لئے مولانا محمد یعقوب صاحب پر بھی یہ سخت گراں تھا کہ حکومت حضرت حاجی صاحب کو یا مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب کو گرفتار کرے۔

یعقوبی تقویٰ

۱۸۵۷ء کا جب معاملہ ختم ہوا تو مولانا کے متعلق حکیم عشرتی لکھتے ہیں۔

"اس (ہنگامے) کے فرو ہونے کے بعد آپ کو چھ مہینے کی تنخواہ کے نو سو روپیہ (ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کے حساب سے) بھیجا گیا اور اصلی جگہ پر بلائے گئے (تو) آپ نے نو سو روپیہ واپس فرمایا اور کہا کہ میں نے ان چھ مہینوں میں کچھ کار سرکار انجام نہیں دیا اس لئے میں یہ روپیہ نہیں لے سکتا اور نیز ملازمت سے بھی استغنائی ظاہر کی اور متوکلاً متفرق کار کرتے رہے"۔(۱)

ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھئے کہ اس زمانے کے نو سو روپیہ کا واپس کر دینا بڑے جگر کا کام ہے، لیکن یہاں تقویٰ کا یہ عالم ہے کہ اس روپیہ کو آپ نے پائے استحقار سے ٹھکرا دیا، تقوی کے علاوہ اس پیشکش کو ٹھکرا دینے میں وہ نظریہ بھی کارفرما ہے کہ اسکے قبول کرنے اور سرکاری ملازمت پر دوبارہ واپسی پر اپنے بزرگ اور احباب کیساتھ بے وفائی کا سخت مظاہرہ ہوگا، بہرحال سرکاری ملازمت کے چھوڑ دینے کے بعد دسمبر ۱۸۶۱ء مطابق ۱۲۷۸ھ تک کوئی شغل نہیں کیا، کیونکہ یہ عرصہ زیارت حرمین شریفین میں گزارا۔ جس کا ذکر ہم آئندہ پیش کریں گے۔

ہم مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ملازمت کے بارے میں اپنی معلومات پیش کر رہے تھے کہ آپ سب سے پہلے اجمیر کے کالج کی ملازمت پر متمکن ہوئے پھر بنارس کو تبادلہ

---

(۱) مقدمہ مکتوبات یعقوبی ص ۵

ہوا اور پھر روڑکی میں سرکاری ملازمت کا کام انجام دیا اور سہارنپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے بعد ازاں ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ آزادی میں گھر مقیم رہے۔

لکھنؤ اور بریلی کا سفر

جمادی الاخری ۱۲۷۷ھ مطابق نومبر ۱۸۶۰ء کو روانگی اور زیارت حرمین شریفین سے شرف اندوز ہوکر جمادی الاخری ۱۲۷۸ھ مطابق نومبر ۱۸۶۱ء کو وطن واپسی کے بعد آپ کے لکھنؤ اور بریلی کے سفر کا پتہ چلتا ہے۔ غالباً یہ سفر ملازمت کے سلسلے میں ہوگا۔ لکھنؤ کے سفر کی وجہ تو معلوم نہ ہوسکی لیکن بریلی کا سفر اس لئے کیا ہوگا کہ وہاں آپ کے قریبی خاندانی بھائی مولانا محمد احسن صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بریلی کالج میں پروفیسر تھے اور ان کا مطبع بھی تھا جو صدیقی مطبع کے نام سے مشہور تھا۔ جو تقریباً ستمبر ۱۸۶۲ء سے پہلے جاری ہوا تھا۔ دراصل جہاں میرٹھ، اجمیر وغیرہ میں اسکول اور کالج قائم کئے گئے، ۱۸۴۳ء میں بریلی میں بھی اسکول قائم کیا گیا تھا اور ۱۸۵۰ء میں اسکول کالج بنا دیا گیا تھا، مولانا محمد احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ شعبۂ فارسی کے صدر مقرر کئے گئے۔ اسی وجہ سے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی کئی دفعہ وہاں آئے گئے۔

پروفیسر محمد ایوب صاحب قادری اپنی کتاب "مولانا محمد احسن" میں لکھتے ہیں۔

> "مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بھی بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے، مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کی بیاض سے معلوم ہوتا ہے کہ شعبان ۱۲۷۱ھ ۱۸۵۵ء میں مولانا محمد یعقوب بریلی میں تھے۔"(۱)

مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تذکرۃ الخلیل میں تحریر فرمایا ہے کہ:-

> "مولانا (محمد یعقوب) مرحوم اس وقت اکابر ملت کی تجویز سے دارالعلوم دیوبند میں بیس روپیہ ماہوار کی ملازمت اور بریلی کی انسپکٹری مدارس کو خیر باد کہہ کر اس فقیرانہ مخلصانہ درسگاہ کی خدمت کے لئے اپنے کو وقف کر چکے تھے۔ اس لئے آپ نے بھوپال جانے سے انکار کر دیا"(۲)

لیکن مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور عشرتی صاحب نے بریلی کا ذکر نہیں کیا۔ اجمیر سے بنارس اور بنارس سے روڑکی کی ملازمت کا پتہ چلتا ہے اور پھر سہارنپور سے ۱۸۵۷ء کی جنگ میں مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ نانوتہ جانے کا اور قیام کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

---

(۱) مقدمہ مکتوبات یعقوبی ص ۲۶ (۲) تذکرۃ الخلیل مطبوعہ [illegible] ص ۱۰۳

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ مطبع مجتبائی میرٹھ میں (۱۲۸۲ھ)

مولانا لکھنؤ اور بریلی سے واپس ہو کر جو غالباً تلاش معاش میں نکلے ہوں گے، میرٹھ پہنچے۔ ان دنوں مولانا محمد قاسم صاحب پہلے سے منشی ممتاز علی صاحب کے چھاپہ خانے میں بغرض خدمت تصحیح کتب موجود تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں

"منشی ممتاز علی نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ قائم کیا۔ مولوی محمد قاسم صاحب کو پرانی دوستی کے سبب بلالیا وہی تصحیح کی خدمت تھی یہ کام برائے نام تھا، مقصود ان کا مولوی صاحب کو اپنے پاس رکھنا تھا۔ احقر اس زمانے میں بریلی اور لکھنؤ ہو کر میرٹھ میں اسی چھاپا خانہ میں نوکر ہو گیا۔ منشی ممتاز علی جی حج کو گئے تھے اس وقت ایک جماعت نے مسلم پڑھی احقر بھی اس میں شریک رہا۔ وہی زمانہ تھا کہ مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی۔" (۱)

یہ جو بریلی اور لکھنؤ میں ہو کر میرٹھ پہنچے ہیں اس جملے میں نوکری کی صراحت نہیں اور یہ ۱۸۵۷ء کے کئی سال کے بعد کا ذکر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تلاش معاش کو نکلے ہوں۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ مطبع ہاشمی میں (۱۲۸۳ھ)

مطبع مجتبائی کے بعد مولانا محمد یعقوب صاحب ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء میں مطبع ہاشمی جس کے مالک مولوی محمد ہاشم میں بھی تصحیح کی خدمت پر مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ نظر آتے ہیں۔ کیونکہ مطبع مجتبائی کے مالک منشی ممتاز علی کی حج کو روانگی کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب مطبع ہاشمی میں کام کرنے لگے تھے، منشی محمد قاسم صاحب نیانگیری (مضافات اجمیر) مکتوبات یعقوبی کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"۱۲۸۳ھ میں بعد تحقیق کے پتہ جناب موصوف (مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کا مطبع ہاشمی میرٹھ کا معلوم ہوا" (۲)

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر مدرس دار العلوم دیو بند

۱۲۸۳ھ تا ربیع الاول ۱۳۰۲ھ مطابق ۶۸، ۱۸۶۷ تا ۱۸۷۷ء

---

(۱) سوانح قاسمی، ص ۲۱ (۲) دیباچہ ص ۱۳

جب دیوبند میں عربی مدرسہ قائم ہوا تو مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائی مدرس کے طور پر ملا محمود صاحب دیوبندی کو مقرر فرمایا۔ ان کی تنخواہ پندرہ روپیہ مقرر کی گئی جیسا کہ دار العلوم کی رپورٹ سے ظاہر ہے۔ لیکن پہلے ہی سال میں طلبہ کی تعداد بڑھ گئی اس لئے مولانا قاسم العلوم والخیرات نے پہلے ہی سال ۱۲۸۳ھ مطابق ۶۸۔۱۸۶۷ء میں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دار العلوم دیوبند کا صدر مدرس تجویز کر کے میرٹھ سے بھیجا۔ اس زمانے میں تصحیح کتب پر مطبع ہاشمی میں کام کر رہے تھے جیسا کہ اوپر گزرا۔ آپ کی وہاں تنخواہ کے متعلق حکیم امیر احمد عشرتی لکھتے ہیں۔

> "حسب ارشاد جناب مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم وغیرہ مدرسہ عربیہ دیوبند میں صرف چالیس (۱) روپیہ پر تعلق گزر اوقات کا فرمایا۔ ہر چند کہ چند مقامات سے بڑی بڑی تنخواہ پر ان کو بلایا گیا۔ مگر کچھ التفات نہ فرمایا" (۲)

مولانا کا یہ تقرر طلبہ کی کثرت کے باعث عمل میں لایا گیا۔ القاسم کے دار العلوم نمبر میں ۱۲۸۳ء سال اجرائے دار العلوم کے متعلق یہ عبارت ملتی ہے:۔

> "پہلے ہی سال میں دور دور سے طالب علم آنے لگے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اعلان کے منتظر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن یہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بزرگ رفقاء کا اخلاص تھا جو علم کے طالبوں کو دور دور سے کھینچے لئے چلا آرہا تھا...... وقت اجراء مدرسہ طلبا کی تعداد سولہ سے زائد نہ تھی۔ لیکن آخر ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ تک طلبہ کی تعداد اٹھتر ہوگئی تھی جن میں ۵۸ (اٹھاون) بیرونجات مثلاً پنجاب بنارس وغیرہ کے تھے باقی دیوبند کے تھے" (۳)

القاسم کے دار العلوم نمبر کے مرتب اور اس نمبر میں "تاریخ دار العلوم" کے مضمون نگار مولانا محمد طاہر صاحب، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی ۱۲۸۳ھ دار العلوم کے سال اول کی رپورٹوں سے تاریخی حالات بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دار العلوم میں تقرری

---

(۱) چالیس روپیہ بعد میں تنخواہ ہوئی تھی، لہٰذا عشرتی صاحب نے بعد کی ترقی یافتہ تنخواہ لکھ دی ہے۔ انوار

(۲) دیباچہ مکتوبات یعقوبی ص د (۳) القاسم دار العلوم نمبر ماہ محرم ۱۳۴۷ھ ص ۵۷۔۵۸

اور تنخواہ اور ان کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"محرم ۱۲۸۳ھ میں جب مدرسہ جاری ہوا تو صرف ایک مدرس (ملا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ) تھے اس کے بعد اثنائے سال میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو اسی سال صرف مبلغ پچیس روپیہ ماہوار پر صدر مدرس کر کے بلایا گیا، اور حضرت مرحوم نے بکمال محنت مدرسہ کی خدمت فرمائی۔ حضرت مرحوم کے حالات عجیب وغریب ہیں وہ تو اپنے موقع پر ظاہر کئے جائیں گے۔ لیکن یہاں پر صرف اس قدر عرض کیا جاتا ہے کہ وہ علم اور معلومات میں حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ثانی تھے۔ حق تعالیٰ شانہ نے انہیں نہایت ہی عجیب ذہن رسا عطا فرمایا تھا اور بہت ہی عظیم الشان جامعیت کی شان بخشی تھی۔ سب سے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی مقرر ہوئے تھے" (۱)

مولانا کی ملازمت دار العلوم جمادی الاخری ۱۲۸۳ھ

تحقیق کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ رجب ۱۲۸۳ھ سے پہلے غالباً جمادی الاولی یا جمادی الاخری ۱۲۸۳ھ میں مولانا کا دار العلوم میں تقرر ہوا، کیونکہ رجب ۱۲۸۳ھ میں مولانا دار العلوم میں صدر تھے منشی محمد قاسم نیانگری مکتوبات یعقوبی میں لکھتے ہیں۔

"آخر الامر مجھے حضرت مولانا صاحب مرشدی مولوی محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس اعلیٰ مدرسہ عربی اسلامی دیوبند ضلع سہارنپور کی خدمت فیضِ درجت میں بتوسط ارسال عرائض اور مطالعہ فوائد جوابات ان کے تاریخ یکم رجب المرجب ۱۲۸۳ھ سے نیاز حاصل ہوئی۔ (۲)

اس تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا کا تقرر رجب ۱۲۸۳ھ سے پہلے ہوا ہے۔ چنانچہ خط میں یکم رجب ۱۲۸۳ھ مسجد چھتہ دیوبند کی عبارت درج ہے۔ لہٰذا ہمارا قیاس ہے کہ محرم ۱۲۸۳ھ اور یکم رجب ۱۲۸۳ھ کے درمیان غالباً جمادی الاخری میں تقرر ہوا۔

حکیم امیر احمد مرحوم نے تنخواہ چالیس روپیہ اور مولانا محمد طاہر صاحب نے پچیس روپیہ لکھی

---

(۱) انقاسم محرم دار العلوم نمبر ص ۵۱ (۲) مکتوبات یعقوبی ص ۱۳

ہے اور پروفیسر محمد ایوب صاحب قادری لکھتے ہیں :-

"انہوں نے (مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ) اس اسلامی درسگاہ کی مدرسی صرف تیس روپیہ ماہوار پر قبول کرلی" (۱)

دارالعلوم دیوبند کی عمر کے دوسرے سال یعنی ۱۲۸۴ھ مطابق ۶۹،۱۸۶۸ء کے حالات کے سلسلے میں یہی مولانا محمد طاہر صاحب تنخواہ کے بارے میں مدرسین کی تنخواہوں میں ترقی کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں :-

"اس سال (۱۲۸۴ھ) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے باکمال شیخ کے (۲) بیس روپیہ سے تیس روپیہ اور ملا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس دوم کے بجائے پندرہ کے بیس روپے ہوئے اور دو نائیوں کے تین تین روپیہ کے بجائے چھ چھ روپیہ مقرر ہوئے۔ اور قرار پایا کہ ۱۲۸۵ھ سے تنخواہوں میں بشرط وصولی چندہ اور بھی ترقی کی جائے گی" (۳)

امسال ۱۲۸۴ھ میں بیماری کی کثرت کے باعث مدرسین اور طلبہ گھروں کو چلے گئے اور بیمار رہے، دو ماہ تک یہ صورت حال رہی اور پھر طلبہ اور مدرسین واپس آگئے۔ اس سال کی روئدادوں میں امتحان لینے والوں میں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی ہے۔ دستخطوں میں لکھا ہے، محمد یعقوب مدرس اول۔ ۱۲۸۵ھ میں ۲۶/ ذی الحجہ کو تقسیم انعام کا جو جلسہ ہوا۔ اس کی رپورٹ سے اخذ کر کے قاری محمد طاہر صاحب لکھتے ہیں کہ "حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بشمول مولانا ذوالفقار علی صاحب و مولوی مہتاب علی صاحب و مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ و مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے دست مبارک سے طلبہ کو انعامی کتب عطا فرمائیں۔

۱۲۸۶ھ کے سال کی رپورٹ میں ہے کہ "باوجود قحط عام، شدت بیماری کے اور باوجود مدرسے کے قریب پانچ ماہ تک بند رہنے اور طلبہ سے لے کر مدرسین تک بیمار ہو ہو کر اپنے اپنے وطن تشریف لے جانے کے الحمد للہ کہ بسعی و کوشش حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر مدرس و حضرت مولانا محمد محمود صاحبؒ و مولانا سید احمد صاحب خواندگی پوری ہوئی" (۴)

---

(۱) مولانا محمد احسن ص ۹۳ (۲) مولانا محمد طاہر، امیر احمد عشرتی اور محمد ایوب صاحب پروفیسر کے اقوال میں تطبیق کی شکل یہ ہے کہ بیس روپے سے آغاز ہوا، اور پھر بڑھتے بڑھتے تیس اور چالیس وغیرہ تک پہنچی اور پھر تنخواہ لینی چھوڑ دی۔ انوار
(۳) دارالعلوم نمبر ص ۵۹، محرم ۱۳۲۰ھ (۴) دارالعلوم نمبر ص ۶

مختصر یہ ہے کہ ۱۲۸۳ھ سے لے کر ۱۳۰۲ھ ربیع الاول تک حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مسند صدارت تدریس پر دارالعلوم دیوبند میں متمکن رہے اور ہر سال تعلیم و تدریس، انتظامات امتحان اور فتویٰ نویسی، تہذیب اخلاق طلبہ، تزکیۂ نفس بنی نوع انسان اور ترقیٔ دارالعلوم دیوبند میں مسلسل مصروف رہے۔ اس وقت ہمارے سامنے القاسم کا دارالعلوم نمبر ہے جس میں دارالعلوم کا چونسٹھ سالہ تعلیمی و انتظامی و مالی گوشوارہ ہے، اس گوشوارہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام صدر مدرس کے خانے میں ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۰۲ھ تک لکھا ہے۔

حضرت مولانا نے دارالعلوم دیوبند میں معقولات و منقولات دونوں علوم کی تعلیم دی اور بحیثیت مفتیٔ دارالعلوم بھی کام کیا، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جو استفتاء آیا کرتے تھے وہ مولانا کے پاس ہی جواب کے لئے بھیج دیتے تھے، فیوض قاسمیہ، مکتوبات قاسمی میں کئی جگہ قاسم العلوم نے لکھا ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ آج کل نانوتے میں چھٹیاں گزار رہے ہیں۔ اس لئے ناچار میں جواب دے رہا ہوں۔

بھوپال سے ملازمت پر دعوت نامہ

دارالعلوم دیوبند سے تعلق ملازمت کے دوران کئی جگہ سے بڑی بڑی ملازمتوں پر آپ کو بلایا گیا۔ لیکن آپ نے تھوڑی سی رقم پر قناعت کی اور کبھی دولت کی طرف رخ نہیں کیا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب تذکرۃ الخلیل سوانح مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری میں لکھتے ہیں:۔

"مولانا جمال الدین مدارالمہام شوہر والیۂ ریاست سکندر جہاں بیگم، حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور چاہتے تھے کہ استاذ زادے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تین سو روپیہ ماہوار پر ریاست میں بلا کر حق خادمیت ادا کریں۔ مگر مولانا مرحوم اس وقت اکابر ملت (مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تجویز سے دارالعلوم دیوبند میں تیس روپیہ ماہوار پر مدرس اول ہو چکے، اور اجمیر کی یک صد روپیہ ماہوار کی ملازمت اور بریلی کی انسپکٹری مدارس کو خیرباد کہہ کر اس

فقیرانہ مخلصانہ درگاہ کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر چکے تھے، اس لئے آپ نے بھوپال جانے سے انکار کر دیا اور مولوی جمال الدین کو لکھا "لاحاجة فی نفس یعقوب الا قضاها" "یعقوب کی دلی حاجت جو کچھ تھی وہ پوری ہو چکی" کہ بقدر ضرورت معاش کیساتھ اہل اللہ کا قرب اور علمیہ دینیہ خدمت نصیب ہو گئی۔ لہٰذا اب کہیں آنے جانے کا خیال نہیں" (۱)

اس زمانے کے تین سو روپیہ کی تنخواہ کو جو والد محترم کے ایک معزز شاگرد کی طرف سے پیش کی گئی ٹھکرا دینا یہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کا کام تھا، انکار پر جو عربی کا جملہ آپ نے نقل کیا ہے۔ وہ بڑا دلچسپ اور برجستہ ہے اور تھوڑی سی تبدیلی ہے قرآن کریم کی اس آیت میں جو سورہ یوسف میں حضرت یعقوب کی ترجمانی کرتی ہے، جبکہ آپ کے بیٹے یوسف علیہ السلام کے پاس مصر کے مختلف دروازوں سے داخل ہوئے:۔

ولما دخلوا من حيث امرهم ابوهم ما كان يغني عنهم من الله من شئى الاحاجة فى نفس يعقوب قضها	اور جب جس طرح ان کے باپ نے حکم دیا تھا اندر داخل ہوئے تو آپ کا ارمان پورا ہو گیا ان کے باپ کو ان سے خدا کا حکم ٹالنا مقصود نہ تھا۔

لیکن یعقوب کے جی میں ایک ارمان تھا۔ جس کو انہوں نے ظاہر کر دیا۔ (۲)

(ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب بیان القرآن جلد ۵)

لیکن یعقوب صاحب نے بڑی خوبی سے اس آیت کے آخری حصے کو اپنا کر مولانا جمال الدین کو انکار لکھ بھیجا اور اپنے بھانجے مولانا خلیل احمد صاحب کو بقول مصنف تذکرۃ الخلیل پچاس روپیہ ماہوار پر بھیج دیا۔

درگاہ اجمیر شریف کی ملازمت سے بے رخی

چونکہ آپ کو اجمیر شریف کے لوگوں سے بہت محبت تھی اس لئے وہاں کے لوگوں نے آپ کو درگاہ کے انتظامات کے سلسلے میں ملازمت کی طرف توجہ دلائی لیکن آپ نے اپنے مرید منشی محمد قاسم صاحب کو جواب میں تحریر فرمایا۔

"تمہارا خط آیا در باب علاقہ درگاہ جو کچھ تم نے لکھا ہے عزیز من اس میں

(۱) تذکرۃ الخلیل، ص ۳۰ مطبوعہ مطبع اعوان پرنٹنگ پریس واقبال پرنٹنگ پریس سیالکوٹ (۲) سورہ یوسف رکوع ۹

یوں مصلحت معلوم ہوئی اور بعد استخارہ یہی خیال میں آیا کہ میں بذات خود اپنے لئے اس کی خواستگاری بشرط بھی نہ کروں۔ احتمال ہے شاید شرط وقوع میں آجائے پھر جائے انکار نہ ہو۔ اور غالباً اجمیر رہ کر ساٹھ روپیہ سے کم میں میری گذر نہ ہو، پہلے پچیس روپیہ مہینے کا میرا خرچ تھا اور میں تنہا تھا اور وطن کو پندرہ روپیہ ماہوار بھیجتا تھا اور اب گھر پر بھی مجمع جیسے زیادہ ہے اور بہ نسبت سابق اب ہر چیز کی گرانی ہے"(۱)

سفر حجاز کا ارادہ

دار العلوم دیوبند کی ملازمت کے دوران میں کئی دفعہ حجاز جانے کا ارادہ فرماتے رہے لیکن سامان نہ ہو سکا۔ منشی محمد قاسم نیانگری کو لکھتے ہیں:۔

"اب تلک کچھ سامان سفر کا نہیں دیکھئے بنا مرضیٔ الٰہی کیا ہے۔ اگر کچھ صورت ہوئی تو انشاء اللہ تعالیٰ تم کو اطلاع دوں گا۔ اور حال میرا ایسا ہی پریشان چلا جاتا ہے اور کچھ ٹھور ٹھکانا نظر نہیں آتا۔ دعا کیجیو کہ امداد الٰہی دستگیری فرمائے"(۲)

تنخواہ نہ لینے کا ارادہ

چونکہ جذب وسلوک کی منزلوں میں دل بیتاب رہتا تھا اس لئے دار العلوم سے تنخواہ نہ لینے کا دل میں بے حد جذبہ تھا، ایک خط میں ۷ر ذی الحجہ ۱۲۹۹ھ کو منشی محمد قاسم کو لکھتے ہیں۔

"تم نے احقر کے ادھر آنے کی استدعا کی ہے۔ معلوم ہے کہ فرصت معدوم ہے اور مدرسہ والے چھوڑتے نہیں۔ مگر بہت دنوں سے طبیعت متوحش ہو رہی ہے، جی سفر کو چاہتا ہے، ارادہ ہے کہ اب کے محرم(۳) سے قید تنخواہ کی اٹھا دوں اور گذر توکل بخدا ہے اور محرم میں رخصت مدرسے سے لے کر پندرہ بیس روز کے قصد سے اجمیر شریف کی طرف چلوں اور اسی

---

(۱) مکتوبات یعقوبی ۲۱ ص ۵۹) (۲) مکتوبات ۱۹، مورخہ ۱۸ر جمادی الاولی ۱۲۸۸ھ

(۳) اب کے محرم سے تنخواہ اول یہ ماہ محرم ۱۳۰۰ھ کا ہے گویا نئے سال سے تنخواہ نہ لینے کا خیال پیدا ہو رہا ہے۔ یہ [illegible] دینی خدمت پر مجبوری تنخواہ لیتے تھے اور کوئی ذریعہ نہ تھا اور جن کے پاس کوئی اور ذریعۂ روزگار ہوتا تھا وہ تنخواہ نہ لیتے تھے۔ [illegible]

ذریعہ سے نیا نگر بھی جاؤں، آئندہ دیکھئے مرضی الٰہی کیا ہے اور ارادہ کس طور ظہور پکڑتا ہے"(۱)

توکل علی اللہ اور دارالعلوم سے ترک تنخواہ

اپنے مکتوب مورخہ ۲/ صفر ۱۳۰۱ھ میں منشی محمد قاسم نیانگری کو لکھتے ہیں اور ترک تنخواہ کا حسب ذیل الفاظ میں اظہار فرماتے ہیں:۔

"جناب مولانا رشید احمد صاحب کے تشریف لانے پر معاملہ احقر کا شاید طے ہو دیکھئے۔ حضرت کا کیا ارشاد ہوتا ہے اور مولانا کیا فرماتے ہیں۔ (کیونکہ حضرت گنگوہی سرپرست تھے) محرم اور صفر ایسے ہی گذرا میرے پیچھے گھر والوں نے مدرسے سے لے کر کچھ اٹھایا تھا اور کچھ پہلا قرض میرے ذمے تھا شاید کل پچاس روپیہ ہو گئے ہوں۔ عادت قرض کی اول سے پڑی ہوئی ہے یہ ایک بلا ہے اللہ تعالیٰ اس سے بچائے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ کام توکل پر چلے گا اور مدرسے سے لینے کی احتیاج نہ رہے گی۔ جب سے دیوبند آیا ہوں۔ (یعنی اس سال محرم سے) مدرسے سے کچھ نہیں لیا۔ اور کام چل رہا ہے تم بھی دعا کیجیو کہ اللہ تعالیٰ استقامت نصیب فرمائے اور کسی آزمائش میں نہ ڈالے۔ ہم لوگ کم ہمت اور بے صبر ہیں"۔(۲)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مولانا نے محرم میں پندرہ بیس روز کی مدرسے سے چھٹی لی ہے اور ذی الحجہ کا مہینہ تھا۔ چھٹی لے کر وہ اجمیر اور نیا نگر تشریف لے گئے ہیں۔ اس سفر کے بعد محرم سے مدرسے سے تنخواہ لینی بند کر دی، چنانچہ پہلا خط جو ذی الحجہ کا ہے اس میں تنخواہ چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ دوسرا خط جو یہی ہے اس کے مطابق محرم ۱۳۰۱ھ سے تنخواہ نہ لینے اور توکل پر گزر کرنے کا فیصلہ قائم ہے گویا مولانا نے محرم ۱۳۰۱ھ سے وفات یکم ربیع الاول ۱۳۰۲ھ تک ایک سال دو ماہ کی تنخواہیں نہیں لیں اور توکل کا مقام طے کر لیا اور اس پر ثابت قدم رہے۔

غرض یہ ہے کہ ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۰۲ھ تک مختلف منصوبوں کے باوجود حضرت مولانا دارالعلوم دیوبند میں (۱۹سال تک) صدر مدرس اور شیخ الحدیث رہے اور آپ کا فیض صدقہ جاریہ بن کر آج تک جاری ہے۔

---

(۱) ۷/ ذی الحجہ ص ۱۱۱/ مکتوبات یعقوبی (۲) مکتوبات یعقوبی ص ۱۱۹، ۱۲۰

مولانا کی خدمات جلیلہ اور موثر شخصیت

آپ کی زندگی کا بہترین عمل اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ دار العلوم دیوبند کی خدمات جلیلہ ہیں اور ملازمت میں اگر کوئی بہترین زمانہ ہے تو وہ یہی زمانہ ہے۔ آپ نے دار العلوم کی خدمات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ درس کے علاوہ فتویٰ نویسی، انتظامی امور اور دیوبند کے جلسوں میں تقریریں بھی کیا کرتے تھے۔ ۲۰؍ صفر ۱۳۲۴ھ کے ایک انعامی جلسے کی روئیداد میں جو آپ کی وفات سے بائیس سال بعد ہوا جس میں مدرسے کی روئداد اور حالات قدیم بیان کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نائب مہتمم حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے عہد صدارت تدریس اور ان کی درس گاہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"مدرسے کی صدر درسگاہ میں جناب مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ جلوہ افروز ہوتے تھے اور اکثر جلسوں میں مولانا خود کھڑے ہو کر تقریر فرماتے تھے۔ وہ مقدس اور نورانی صورت جس کی ہیبت اور جلال کا اثر بڑے بڑے آدمیوں پر پڑتا تھا۔ اب کہاں ہے۔ اسی نظم میں مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت لکھا ہے۔"

بیا درس گاہ کلانش نگر — کہ جائے است دلچسپ و فرحت قرین
چوں ایں جا رسی باادب باش و ہوش — کہ یابی دراں اوستاد مہین
ملک سیرتے آسمان و قعتے — بشر صورتے و فرشتہ جبیں

ترجمہ

آیئے اور ان کی درس گاہ کو دیکھئے — کہ وہ ایک دلچسپ اور فرحت بخش جگہ ہے
جب آپ یہاں پہنچیں تو باادب اور باہوش رہئے — کہ یہاں استاذ بزرگ کو آپ پائیں گے
جو سیرت میں فرشتہ ہے اور بلندی میں آسمان جیسا — صورت میں بشر اور پیشانی فرشتے جیسی (۱)

اس عبارت اور ان اشعار سے مولانا کی بحیثیت صدر مدرس اور استاد بزرگ، درسگاہ میں بیٹھنے اور درس دینے کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا ہے۔ نیز آپ کے جلال اور

(۱) روئداد دار العلوم ۱۳۲۴ھ ص ۱۷

بشر صورت مگر فرشتہ سیرت ہونے کا بھی اور یہ بھی کہ آپ دارالعلوم کے اکثر جلسوں میں تقریریں بھی فرمایا کرتے تھے۔

مولانا مدرس بھی اور ممتحن بھی

آپ کو معلوم ہی ہو چکا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا آغاز ۱۵ر محرم ۱۲۸۳ھ کو ہوا اور اسی سال حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو صدر مدرسی پر مقرر کیا۔ وہ جہاں پڑھاتے تھے امتحان بھی دوسرے ممتحنین کے ساتھ لیتے تھے اور دیوبند سے باہر بھی عربی مدارس کا امتحان لینے جاتے تھے۔ روئداد سالانہ بابت امتحان ۱۲۸۴ھ میں ممتحنین کا معائنہ درج ہے۔ جس کی عبارت حسب ذیل ہے۔ اس میں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھی دستخط ہیں:۔

> "ہم نے امتحان مفصل مدرسہ عربی دیوبند کا لیا۔ عموماً مدرسہ لائق تحسین ہے، باوجودیکہ ایک سال میں بسبب کثرت بیماری کے جواب تک چلی جاتی ہے۔ بہت سے حرج پیش آئے۔ تاہم مدرسان کی سعی سے خواندگی میں ترقی ہوئی۔

العبد	العبد	العبد	العبد
محمد قاسم نانوتوی	ذوالفقار علی دیوبندی	محمد یعقوب	مہتاب علی
(سرپرست وبانی دارالعلوم)	(رکن دارالعلوم دیوبند)	(مدرس اول)	(دیوبندی)

دارالعلوم دیوبند کی ۱۲۸۶ھ کی رپورٹ میں ہے۔

الحمدللہ کہ بسعی و کوشش حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس و حضرت مولانا محمد محمود و مولانا سید احمد صاحب خواندگی پوری ہوئی۔ ۱۲۸۷ھ کی رپورٹ میں بھی یہی مضمون ہے کہ "یہ تعلیمی ترقی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد محمود صاحب اور مولانا سید احمد صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ۱۲۸۸ھ کی رپورٹ میں ہے "اس سال بھی حسب معمول حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ملا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ و مولوی سید احمد صاحب و مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے امتحان لیا۔ ۱۲۸۹ھ میں بھی مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام ممتحنین کی فہرست میں ہے۔ اور جلسہ تقسیم انعام بدست حضرت مولانا

محمد قاسم میں مولانا محمد یعقوب صاحب نے سالانہ رپورٹ مدرسہ کی پڑھ کر سنائی۔ ۱۲۹۰ھ کے سالانہ جلسے میں جو جامع مسجد دیو بند میں ۱۹/ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۹/ جنوری ۱۸۷۴ء کو ہوا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سالانہ رپورٹ پڑھ کر سنائی اور سالانہ امتحان بھی اس سال کا لیا۔ ۱۲۹۱ھ کے ممتحنین میں بھی مولانا موجود ہیں۔ ۲/ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ کا جلسہ دار العلوم جامع مسجد دیو بند میں بڑا عظیم الشان جلسہ تھا۔ اس جلسے میں باہر کے علماء، فضلاء، رؤسا، اکابر اور عوام سبھی قسم کے افراد ملت ہزارہا کی تعداد میں جمع ہوئے۔ جمعہ کے بعد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر پڑھ کر سنائی۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر اور جلسے کی کارروائی کے بعد تمام شرکاء جلسہ اس مقام پر پہنچے جہاں دار العلوم کی بنیاد رکھی جانے والی تھی۔ چنانچہ ۲/ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ کو اسی سال طلبہ کی کثرت کے باعث دار العلوم کے بانی مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ کی بنیاد رکھوائی اور شہر کے باہر دار العلوم کا سنگ بنیاد اس جگہ پر رکھا گیا جس جگہ کو مولانا نے مدرسے کے لئے شہر کے مغرب میں خریدا تھا۔ پہلی اینٹ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری محشی بخاری استاذ قاسم نے رکھی، اس کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب اصل بانی نے، بعد ازاں مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اور پھر مولانا مظہر صاحب نانوتوی نے ایک ایک اینٹ رکھی، یہ کچھ ہو چکا تو ان بزرگوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھاتے ہوئے بڑی عاجزی سے رو رو کر دار العلوم کی ترقی کی دعائیں کیں۔ اسی سنگ بنیاد کے موقع پر مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمایا تھا۔

"عالم مثال میں اس مدرسے کی شکل ایک معلق ہانڈی کی سی ہے۔ یعنی جب تک اس کا مدار توکل و اعتماد علی اللہ پر رہے گا یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا۔"(۱)

اس مضمون کو مولانا فضل الرحمٰن صاحب والد محترم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے جو کہ خدمت دار العلوم میں مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شریک و معاون تھے، حسب ذیل اشعار میں ادا کیا ہے لکھتے ہیں۔

اسکے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کیلئے کوئی سرمایہ بھروسے کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ یہ سمجھ لینا کہ بے نور وضیا جائے گا
ہے توکل پر بنا اس کی تو بس اس کا معین ایک گر جائے گا پیدا دوسرا ہو جائے گا

(۱) رپورٹ سالانہ مدرسہ ۱۲۹۲ھ

غرض کہ دارالعلوم کے یہ صدر مدرس یا شیخ الحدیث دارالعلوم کے سالانہ اجتماعات میں تقریریں بھی فرماتے اور جلسے کی تمام کارروائی میں حصہ بھی لیتے۔ نہ صرف دارالعلوم دیوبند کے سالانہ تقریری امتحانات لیتے بلکہ باہر کے عربی مدارس مثلاً مظاہر العلوم سہارنپور، شاہی مدرسہ مرادآباد وغیرہما کے امتحانات بھی لینے جاتے تھے۔ المختصر دارالعلوم دیوبند میں ۱۲۸۳ھ میں ملازمت کے بعد آپ نے تا وفات ۱۳۰۲ھ اور کہیں ملازمت نہیں فرمائی اور آخر عمر تک دارالعلوم سے ہی وابستہ رہے۔

تلامذہ

آپ کے تلامذہ میں اگر غور کیا جائے تو اجمیر، بنارس وغیرہ میں سینکڑوں طلبہ شاگرد بنے ہوں گے اور دارالعلوم دیوبند کی ۱۹ سالہ سروس کے تلامذہ کی بھی کافی تعداد ہوگی، اس لئے ہزاروں تک تعداد پہنچ سکتی ہے۔ تاہم مشہور شاگردوں میں سے حسب ذیل ہیں۔ حکیم امیر احمد عشرتی صدیقی نانوتوی مولانا کے برادرزادہ مکتوبات یعقوبی کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ”آپ کے شاگرد و مرید اچھے اچھے مشاہیر، بنگال، پنجاب، پشاور، پورب وغیرہ میں بے شمار موجود ہیں۔ جن میں صرف قرب وجوار کے چند اسماء یہ ہیں۔ (حکیم الامت) مولانا مولوی اشرف علی تھانوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن (اسیر مالٹا) دیوبندی، استاذی مولانا ابو محمد عبد اللہ صاحب انصاری، استاذی مولوی حکیم حسین شریف صاحب بنگلوری، استاذی مولانا مولوی منفعت علی صاحب دیوبندی، استاذی مولانا مولوی محمد مراد صاحب مقیم مظفر نگر (جامع معقول ومنقول) مولانا مولوی احمد حسن صاحب امروہی، مولوی میر باز خاں صاحب سہارنپور وغیرہم۔ آپ نے باطنی تعلیم کی تحصیل حضرت قبلۂ عالم حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صاحب تھانوی سے فرمائی تھی۔ آپ نے دو مرتبہ حج ادا فرمائے۔
>
> (مقدمہ مکتوبات ص ۶)

ملازمت کے سلسلے میں تمام اقوال کو پیش نظر رکھتے ہوئے مولانا کی ملازمت کا تجزیہ یہ ہے کہ آپ اجمیر، بنارس، روڑکی، بریلی، سہارنپور اور آخر میں تا وفات دیوبند میں ملازم رہے، ہم نے یہاں تک ملازمت کے بارے میں کلام کیا ہے جس میں آپ کے تمام سلسلۂ معاش کا ذکر آچکا ہے۔ لہٰذا اب ہم دوسرے حالات کی طرف عنان قلم موڑتے ہیں۔

زیارت حرمین شریفین

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا پہلا حج

بتاریخ ۹/ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۹/جون ۱۸۶۱ء

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ ۹/ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۹/جون ۱۸۶۱ء کو بروز بدھ پہلا حج ادا فرمایا۔ چونکہ جہاد حریت کے شعلے اگرچہ بجھ چکے تھے لیکن ہنوز کمپنی کی حکومت کی طرف سے پکڑ دھکڑ جاری تھی۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہرگز محفوظ نہ تھے۔ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مکہ معظمہ کو ہجرت فرما چکے تھے اس لئے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حج کا ارادہ فرمایا اور ان کے ہمراہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیوبند کے مشہور بزرگ حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا دوسرا حج

۹/ذی الحجہ ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۶ء

مولانا نے دوسرا حج ۹/ذی الحجہ ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں ادا فرمایا۔ اس حج میں علماء کا ایک قافلہ روانہ ہوا تھا۔ جس میں مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات کے ساتھ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ ۹/شعبان ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۶ء کو وطن سے روانگی ہوئی اور ربیع الاول ۱۲۹۵ء کو وطن واپس ہوئے۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا کشف اور سفرِ حج کا ایک دلچسپ واقعہ

مولانا عاشق الٰہی نے سفر کے حالات جہاں تفصیل سے لکھے ہیں اس میں یہ واقعہ کتنا دلچسپ ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب کے ہمراہ کئی صاحبان حج کے لئے آنا چاہتے تھے، مگر زادِ راہ ساتھ نہ تھا۔ حضرت گنگوہی نے جب ان صاحبان سے زادِ راہ کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے کہ توکل پر جانے کا ارادہ ہے، فرمایا جب جہاز کا کپتان کرایہ مانگے تو توکل کی پوٹ باندھ کر دو گے؟ جاؤ اپنے گھروں کی راہ لو۔ مگر جب مولانا محمد قاسم سہارنپور سے ریل میں

پہنچے تو نہ معلوم کیسے لوگوں میں روانگی کی شہرت ہوگئی اور اہل ثروت لوگ اسٹیشنوں پر ملنے کیلئے حاضر ہوئے اور نذرانہ میں روپیہ پیش کئے۔ بمبئی جاتے جاتے اتنا روپیہ ہوگیا کہ کئی آدمی حج کرسکیں۔ مولانا محمد قاسم صاحب نے ان لوگوں کو فوراً پہنچنے کی اطلاع دی۔ وہ فوراً روانہ ہوگئے، ادھر ان صاحبان کا خیال تھا کہ جہاز جلد روانہ ہو جائیگا مگر جہاز کا کوئی انتظام ہی نہ تھا بائیس دن بمبئی میں رکے رہے اور بہت گھبرا گئے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں۔

"ایک دن مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ آج معلوم ہوا ہے کہ سارے قافلے کو مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ روک رہے ہیں۔ ان کے چند رفقا اور متوسلین ضلع مظفر نگر سے آنے والے ہیں۔ جب تک وہ نہ آجائیں گے اس وقت تک جہاز نہ آئے نہ جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ مظفر نگر کا قافلہ جس دن بمبئی پہنچا اسی دن ایک جرمنی جہاز کا حاجی قاسم نے ٹھیکہ لے کر شام ہی کو ٹکٹ کھول دیا اور فروخت کرنا شروع کر دیا۔ چھتری کا محصول پینتالیس روپیہ اور تتق کا کرایہ پچیس روپیہ۔ اگلے دن کشتیاں کنارے پر آلگیں اور جدے کے جانے والے تمام مسافر جہاز پر سوار بھی ہوگئے۔ دوسرے دن جہاز نے عرب کی جانب رخ پھیرا اور رخصتی سیٹی بجا کر روانہ ہوگیا۔ پانچوں نمازیں جماعت سے ادا ہوئیں۔ نصرانی کپتان اس پیاری عبادت کو سلیم و سلیس انداز کے ساتھ ادا ہوتے دیکھتا تو خوش ہوتا۔ غرض آٹھویں دن عدن کی بندرگاہ پر جہاز نے لنگر کیا۔ ایک دن ٹھہر کر روانہ ہوا اور پھر چوتھے دن جدے کا بندرگاہ نظر آنے لگا، (۱)

بہر حال ۹ر ذی الحجہ ۱۲۹۴ھ کو مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ دوسرا حج تھا اور بس۔

روانگیٔ حج پر جہاز میں مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی علمی صوفیانہ باتیں

مولانا عاشق الٰہی صاحب نے اس سفر حج میں جہاز کے قیام میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ

(۱) تذکرۃ الرشید جلد اول صفحہ ۲۳۶،۲۳۵

اور مولانا محمد یعقوب صاحب ؒ کے مابین علمی مذاکرات کا بھی حسب ذیل الفاظ میں ذکر کیا ہے لکھتے ہیں۔

"حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ؒ پر فقر و درویشی اور حسن خلق کا غلبہ تھا جس کی وجہ سے آپ ہر وقت مجمع کا مرکز بنے رہتے تھے، اور آپ کو مخلوق گھیرے رہتی تھی۔...... حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ؒ اور مولانا محمد قاسم صاحب ؒ میں کشوف کونیہ کے اکثر تذکرے ہوتے۔ مکاشفات بیان کئے جاتے۔ خوابیں ظاہر کی جاتیں، غلبہ ظن پر رائے زنی ہوتی اور درویشانہ صوفیانہ چھیڑ چھاڑ برابر قائم رہتی تھی۔"(۱)

(انوار) کاش میں بھی ان حضرات کے ساتھ سفر میں ہوتا اور ان کے انوار وتجلیات اور فیوض وبرکات سے لطف اندوز ہوتا مگر ؎ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مولانا محمد یعقوب صاحب کے ان دو حج کے سفروں کا جس قدر حال ہمیں مل سکا پیش کر دیا۔ اب ہم ان کے دوسرے حالات کی طرف عنان قلم موڑتے ہیں۔

روحانیت کا طالب آستانۂ امدادیہ پر

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی حاجی امداد اللہ سے بیعت

ظاہری علم کے ساتھ جب تک روحانی اور باطنی تعلیم حاصل نہ کی جائے صحیح معنی میں عالم باعمل نہیں بنتا یہی مضمون مولانا جلال الدین مولائے روم نے حسب ذیل شعر میں بیان فرمایا ہے ؎

مولوی ہر گز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

مولانا محمد یعقوب صاحب ؒ نے جب آنکھ کھولی تو گھر کا ماحول دینی تھا، باپ مولانا مملوک علی نہایت متقی پرہیزگار عالم، وطن کے بزرگ اکثر عالم اور صاحبان تقویٰ وطہارت اور کسی نہ کسی کے مرید تھے، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ؒ، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی ؒ، مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی ؒ، مولانا محمد احسن صاحب نانوتوی ؒ، مولانا ذوالفقار علی

(۱) تذکرۃ الرشید جلد اول صفحہ ۲۳۲، ۲۳۳

صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اور حاجی عابد حسین صاحب دیوبندیؒ، اول و آخر میں سب مرید تھے اور ہوتے چلے گئے، اس ماحول میں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیعت کے بغیر کیسے رہ سکتے تھے، اس سلسلے کی تکمیل کے لئے اس دور میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ میخانۂ معرفت کے جلیل القدر ساقی تھے، اور سارے ہند میں دور دور تک ان کی روحانیت کا سکہ چلتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ معرفت اور سلوک میں ان کا مقام بہت بلند تھا اور صاحب کشف و کرامات اولیاء میں سے تھے، چنانچہ مذکورہ بالا حضرات مولانا محمد احسن صاحب وغیرہ کو چھوڑ کر کہ وہ حضرت شاہ عبد الغنی مجددی دہلوی کے مرید تھے، تمام حضرات ہی حضرت حاجی صاحب سے بیعت تھے، عوام و خواص کے سوا تقریباً پانچ سو علماء حاجی صاحب سے بیعت تھے، مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انہی کے دست حق پرست پر بیعت کی، چنانچہ اپنے مکتوب بنام منشی محمد قاسم صاحب نیانگری میں لکھتے ہیں:۔

> "ہر چند کہ بظاہر ان باتوں سے توبہ کی اور حضرت مرشد العالم حاجی امداد اللہ صاحب مدظلہ' کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا مگر اصلی بات کہاں بدلتی ہے ویسا کا ویسا ہی رہا" (۱)

مکتوب کی اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ سالک و مجذوب حضرت مولانا محمد یعقوب سید الطائفہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے،

بیعت کا زمانہ

مولانا نے کس زمانے میں بیعت کی اس کا مہینہ اور سال متعین کرنا تاریخ کی روشنی میں نظر نہیں آتا، البتہ یہ ضرور واضح ہے کہ آپ نے رجب ۱۲۸۳ھ سے پہلے بیعت کی ہے، مذکورہ عبارت جس میں مرشد عالم حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ذکر ہے اس مکتوب کی ہے جو یکم رجب ۱۲۸۳ھ کا لکھا ہوا ہے، اور ۱۲۸۳ھ سے جو کہ دار العلوم دیوبند کے اجراء کا سال ہے مولانا دار العلوم کے صدر مدرس بن کر دیوبند میں مقیم ہو چکے ہیں، اور یہ بھی یقینی امر ہے کہ دوران ملازمت اجمیر میں بھی جس کا حال مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے وہ دور بھی ۱۸۵۱ھ سے ۱۸۵۵ھ تک بیعت کا نہیں معلوم ہوتا ہے لہٰذا مولانا نے

---

(۱) مکتوبات یعقوبی مکتوب ۱، ص ۸

۱۲۸۳ھ سے ایک دو سال پہلے بیعت کی ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب آپ پہلے حج کو تشریف لے گئے ہیں اور مولانا محمد قاسم صاحب بھی ہمراہ ہیں جس کا ذکر گذشتہ اوراق میں گذرا اس کے متعلق سوانح قاسمی میں یہ عبارت بھی ہے:۔

"حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ عرب کو روانہ ہو گئے، احقر کو بعد ان کے یہی سوجھی کہ تو بھی چل...... جمادی الثانی ۱۲۷۷ھ میں روانہ ہوئے" (۱)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اجمیر کی ملازمت کے بعد ۱۲۷۷ھ مطابق نومبر ۱۸۶۰ء سے پہلے دوران جہاد یا بنارس یا روڑکی کے دوران ملازمت میں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حاجی صاحب سے بیعت کی ہے۔

منازل سلوک

بقول مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فطری طور پر بے غل و غش اور نفس کی کدورتوں سے شروع ہی سے پاک تھے اس لئے منازل سلوک طے کرنے میں ان کو کوئی خاص مجاہدوں کی ضرورت نہیں تھی، کہتے ہیں کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کو زیادہ ذکر و شغل اور عبادت میں نہیں رکھتے تھے بلکہ ناز برداری سے تربیت فرماتے تھے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہدے زیادہ نہیں کئے ہیں، اور باتیں بھی بہت کرتے تھے، مگر سراپا علوم ہوتے تھے، جب حضرت حاجی صاحب تھانہ بھون تشریف رکھتے تھے رات کو سب ذاکر شاغل لوگ اٹھتے تھے یہ بھی اٹھتے مگر حضرت اوروں کو تو منع نہیں فرماتے تھے، ان کو فرماتے کہ سو رہو، ہم وقت پر خود اٹھا دیں گے، اس ناز سے ان کی تربیت فرمائی گئی ہے (۲)

چونکہ شیخ مرشد حاجی صاحب سے ۱۸۵۷ء سے پہلے بیعت تو کرلی تھی لیکن آپ کی صحبت زیادہ نصیب نہ ہوئی اس لئے مولانا سلوک کو ادھورا خیال کرتے تھے، حالانکہ اس وقت بھی مولانا کچھ کم نہ تھے اسی عدم تکمیل سلوک کے متعلق مولانا تھانوی ملفوظات حصہ چہارم کے ایک

(۱) سوانح قاسمی، ص ۱۹ (۲) تکمیل الکلام ص ۳۷

ملفوظ میں مولانا یعقوب صاحب کا قول نقل فرماتے ہوئے کہتے ہیں :۔

"مولوی محمد یاسین صاحب مولوی محمد شفیع صاحب کے والد ہمولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، ایک روز ان سے فرمایا، مولوی محمد یسین میں ادھورا رہ گیا کامل نہیں ہوا، (دیکھئے ایک شیخ کامل لوگوں کے سامنے یہ کہتے ہیں، تھانوی) تمہارے شیخ (مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ) اگر چاہیں تو میری تکمیل کر سکتے ہیں مگر وہ رسید ہی نہیں دیتے، مجھے غصہ آتا ہے، میں کہتا ہوں کہ مجھے پرواہ نہیں میں اپنے شیخ (حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس چلا جاؤں گا تو کہتے ہیں کہ مدرسہ چھوڑ کر جاؤ گے تو گناہ ہوگا، بس جی معلوم ہوتا ہے کہ میں ادھورا ہی مر جاؤں گا نہ تو جانے ہی دیتے ہیں نہ خود ہی تکمیل کرتے ہیں"

حقیقت یہ ہے کہ بقول حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ آپ مکمل شیخ ہو چکے تھے لیکن پھر بھی اپنے آپ کو ادھورا سمجھتے تھے، جب مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ دوسرے حج کیلئے تشریف لے گئے ہیں تو مدینہ منورہ تشریف نہ لے جا سکے تھے، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں قیام فرما کر آپ سے سلوک و تصوف کی تکمیل کر لی، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس وقت رفقاء سے فرمایا تھا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہہ دو کہ جب وہ میرے پاس آئیں، تو خاموش بیٹھ کر یہ خیال کر لیا کریں کہ ان کے سینے سے میرے سینے میں فیض آرہا ہے..... جب رفقاء (مولانا گنگوہی و مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہما) مدینے سے واپس ہوئے تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شکایت فرمائی کہ ان کو ایک سہل سی بات بتائی تھی وہ بھی نہ ہو سکی، جب کوئی آ کے بیٹھتا مجھ سے پہلے یہ بولنے لگتے تھے، مولانا گنگوہی فرماتے تھے کہ :۔

"شیخ (حاجی صاحب) ہی ایسے کامل تھے کہ انہوں نے خود کچھ نہیں کیا مگر انہوں نے ایسا کر دیا تھا کہ یہاں (حج سے واپسی پر مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان میں) سینکڑوں کو مونڈ ڈالا" (۱)

مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ یہ فرمانا چاہتے تھے کہ اگر مرشد کامل ہو تو بعض اوقات کچھ کئے بغیر بھی اپنی نظر کیمیا اثر سے مرید کو اعلیٰ بنا دیتا ہے اور تمام سلوک کی منزلیں جلد طے کرا دیتا ہے۔

(۱) تجمیل الکلام ص ۳۸

چنانچہ مولانا محمد یعقوب صاحب کو اس حج کے موقع پر خصوصیت سے ایسا اونچا مقام مل گیا کہ سینکڑوں کے سر مونڈ ڈالے یعنی ان کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئے اور معتقد ہو کر ان کے مرید ہو گئے۔ ع

طے شود منزل صد سالہ بیک گام اینجا

ایک دفعہ مولانا نے محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جوش میں فرمایا کہ "یہ بہت بخل کرتے ہیں، اگر میں ایسا ہوتا، جیسے کہ یہ تو جنگل کے بلدیوں کو جو مویشی چراتے پھرتے ہیں ایسا بنا دیتا جیسے یہ ہیں،(۱)

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال پیش کرنے کے بعد پھر ارشاد فرماتے ہیں کہ دوسرے حج میں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی منازل سلوک پایۂ تکمیل کو پہنچ گئیں اور آپ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پیر و مرشد کے پاس سے روحانیت کی تکمیل کر کے واپس لوٹے۔ ہم پہلے بھی حالات کی روشنی میں لکھ چکے ہیں کہ بقول مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ابتدا ہی سے بے کھوٹ تھے، چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں:۔

"مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ایک صاحب نے بچپن میں بھی دیکھا تھا انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ یہ ابتداء سے ہی عفیف اور متقی تھے" (۲)

راقم الحروف نے جہاں تک تحقیق کی روشنی میں دیکھا ہے اس کا نتیجہ اور خلاصہ یہ ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب اپنے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دوسرے حج میں (جو انہوں نے ۱۲۹۴ھ میں کیا ہے) مزید فیوض و برکات حاصل کرنے سے پہلے ہی مکمل شیخ بن چکے تھے اب جو وہ اپنے آپ کو ادھورا اور ناقص و نامکمل فرماتے ہیں تو یہ ان کی عاجزی اور انکساری کے مقامات کا نتیجہ ہے، کیونکہ شیخ کامل ہونے کے باوجود کون صاحب کمال بزرگ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو مکمل کہہ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکمل ذات تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اور اللہ کے بندوں میں پھر انبیاء کی مقدسہ شخصیات ہیں جو معصوم ہوتی ہیں جو ذات احدیت و صمدیت کے اشاروں سے ادھر ادھر نہیں ہوتے۔

الغرض مولانا نے دوسرا حج جیسا کہ ہم نے عرض کیا ۱۲۹۴ھ میں کیا ہے اور آپ کو حاجی

---

(۱) ملفوظات تھانوی علیہ ملفوظ ۶ ۷ ۱۰۔ حصہ چہارم (۲) تکمیل الکلام ص ۷۸

صاحب نے ۱۲۸۲ھ میں سند خلافت عطا فرمادی تھی، اس لئے دوسرے حج سے بارہ سال پہلے جس کو مرشد کامل نے خلافت عطا فرما کر دوسروں کو بیعت کرنے کی اجازت دے دی ہو اسکے سلوک کی تکمیل نہ ہو چکی تھی تو خلافت کیوں کر ملی، حقیقت یہ ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ قال سے گذر کر حال کی منزل میں داخل ہو گئے تھے۔ بقول شاعر

قال را بگذار و مرد حال شو
پیش مرد کاملے پامال شو

حصول خلافت

حضرت سید الطائفہ، حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور کتاب ضیاء القلوب کے آخر میں حسب ذیل حضرات کے متعلق خلافت کے بارے میں لکھتے ہیں

ہرکس کہ ازیں فقیر محبت وعقیدت وارادت دارد مولوی رشید احمد صاحب سلمہ و مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ راکہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند بجائے من فقیر راقم اوراق بلکہ بمدارج فوق از من شمارند وہم چنیں، عزیزم مولوی محمد یعقوب صاحب نانوتوی و حافظ محمد یوسف تھانوی و مولوی کرامت علی صاحب ساکن ضلع انبالہ و مولوی محمد ابراہیم ساکن موضع اجراور راداند کہ اوشاں نیز مجاز اند و نیز عزیزم حکیم ضیاء الدین کہ خلیفۂ خاص حضرت قطب الاقطاب مولانا حافظ محمد ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ ہم مجازند ۱۲ منہ

جو شخص کہ اس فقیر سے محبت اور عقیدت اور ارادت رکھتا ہے مولوی رشید احمد سلمہ اور مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ کو کہ علوم ظاہر و باطنی کے تمام کمالات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں مجھ فقیر راقم اوراق کی جگہ بلکہ مدارج سلوک میں مجھ سے ان کو اونچا خیال کریں اور اسی طرح عزیزم مولوی محمد یعقوب نانوتوی، حافظ محمد یوسف صاحب تھانوی، مولوی کرامت علی ساکن ضلع انبالہ، مولوی محمد ابراہیم ساکن موضع اجراور کو سمجھیں کہ وہ بھی خلیفہ مجاز ہیں، اور نیز عزیزم حکیم ضیاء الدین (رامپور منیہاران) جو کہ خاص خلیفہ قطب الاقطاب مولانا حافظ محمد ضامن شہید کے ہیں خلیفہ مجاز ہیں ۱۲ منہ

ضیاء القلوب کے متن کی عبارت جو مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے متعلق ہے اور حاشیئے کی عبارت جو مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات کے

خلیفۂ مجاز ہونے کا اعلان کر رہی ہے صاف بتاتی ہے کہ اس کی رو سے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ حاجی صاحب کے خلفاء میں سے تھے۔

۱۲۸۲ھ میں حاجی صاحب کے خلیفۂ مجاز

لیکن مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کس سال خلافت ملی، ضیاء القلوب کی عبارت کے تیور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے سال تصنیف ۱۲۸۲ھ میں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت عطا فرمائی ہے، کیونکہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تو ہجرت سے بہت پہلے ان دونوں حضرات کے طالب علمی سے فراغت کے بعد بیعت کر لینے کے کچھ عرصہ بعد خلافت مل گئی تھی، لیکن مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ جملہ کہ اوشاں نیز مجاز انداسی سال کا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بنارس یا روڑکی کے دوران ملازمت میں بیعت ہوئے اور ۱۲۸۲ھ میں خلیفۂ مجاز بنے۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اکسٹھ (۶۱) خطوط امداد المشتاق کے آخر میں "المرقومات الامدادیہ" کے نام سے جمع کئے ہیں۔ جن میں چند مکتوبات مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام بھی ہیں۔ ان مکتوبات کے بعض جملے اور عبارتیں قارئین کرام کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں جن سے مرید کا مقام مرشد کی نظروں میں واضح ہو سکے گا۔

از فقیر امداد اللہ عفی عنہ بخدمت بابرکت عالم علوم معقول عزیزم مولوی محمد یعقوب صاحب دام شوقہ وذوقہ وعرفانہ، بعد از سلام سنت الاسلام واشتیاق ملاقات بے غایات واضح رائے انور باد........ دریافت جمع بودن یکجا آں عزیز ومولوی محمد قاسم صاحب بسیار خوشنود گردیدم .... امید قویست کہ طلب ومحنت آں عزیزاں رائیگاں نخواہد شد واحقر مرتبۂ آں عزیزاں را بلند می یابد انشاءاللہ، براں عزیز آں ہم ظاہر خواہد شد (بارہواں مکتوب ص ۲۳۶ مرقومات امدادیہ)

ترجمہ

فقیر امداد اللہ عفی عنہ کی طرف سے بخدمت بابرکت عالم علوم معقول ومنقول عزیزم مولوی

محمد یعقوب صاحب دام شوقہ وذوقہ وعرفانہ، سلام الاسلام اور بے انتہا اشتیاق ملاقات کے بعد واضح رائے انوں...... کہ آپ اور مولوی محمد قاسم دونوں کے یکجا (مطبع منشی ممتاز علی میرٹھ میں) جمع ہونے کا حال معلوم ہوکر میں بہت خوش ہوا، پوری امید ہے کہ آں عزیزاں کی طلب اور محنت رائیگاں نہ جائے گی، اور احقر آں عزیزاں کے مرتبے کو بلند دیکھتا ہے، انشاءاللہ آں عزیزاں پر بھی ظاہر ہو جائے گا۔

اس مکتوب میں حاجی صاحب مرشد کامل اپنے دونوں مریدوں مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا محمد یعقوب صاحب کے مرتبہ سلوک کی بلندی کی اطلاع دے رہے ہیں۔

ایک اور مکتوب میں جو مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا یعقوب صاحب دونوں کے نام مشترک ہے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں۔

"از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ بخدمت بابرکت جامع علوم ظاہری وباطنی مولوی محمد قاسم صاحب ومولوی محمد یعقوب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ، بعد السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ معلوم فرمانید کہ حافظ عبد الرحمٰن صاحب راجو پوری کہ مرد دیندار و طالب حق اند، وسہ روز پیش از روانگی داخل سلسلہ گردیدہ اند، فقط ترکیب پاس انفاس ویک دو وظیفہ تعلیم کردہ شد باقی بخدمت آں صاحبان گاہ گاہ خواہند شد، ترکیب دوازدہ تسبیح وغیرہ حسب استعداد اوشاں تعلیم کردہ باشند و توجہ بر حال اوشاں مرعی دارند و نیز اگر اہل راجو پور کہ بعضے ازاں از فقیر ارادت وعقیدت مثل میاں خواجہ محمد وغیرہ دارند بخدمات شما ملتجی شوند گاہ گاہ بردہ فیض دینی رسانیدہ باشند۔

ترجمہ :۔ فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ کی طرف سے بخدمت بابرکت جامع علوم ظاہری و باطنی مولوی محمد قاسم ومولوی محمد یعقوب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ معلوم کریں کہ حاجی عبد الرحمٰن راجو پوری کہ دیندار آدمی اور طالب حق ہے، دو تین روز روانگی سے پہلے داخل سلسلہ ہوئے، فقط ترکیب پاس انفاس اور ایک دو وظیفے تعلیم کئے گئے، باقی آپ صاحبوں کی خدمت میں کبھی کبھی حاضر ہوا کریں گے، دوازدہ تسبیح وغیرہ کی ترکیب ان کی حسب استعداد تعلیم کی جائے ان کے حال پر توجہ رکھیں نیز اہل راجو پور کہ ان میں سے بعض میاں خواجہ محمد جیسے فقیر سے ارادت وعقیدت رکھتے ہیں تمہاری خدمت میں ملتجی ہوں گے کبھی کبھی تشریف لے جا کر فیض دینی پہنچایا جائے۔(۱)

(۱) مرقومات امدادیہ مکتوب ۱۳ ص ۲۳ ۲۴

اس مشترک مکتوب میں حافظ عبدالرحمٰن راجوپوری اور دوسرے راجوپور کے اصحاب کی تربیت اور روحانی تعلیم کو حاجی صاحب نے ان دو حضرات یعنی مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا محمد یعقوب صاحب کے سپرد فرما کر دونوں کے روحانی مقام کی تکمیل کی طرف راہ دکھائی ہے۔

ایک اور مکتوب میں حاجی صاحب نے جو مولانا محمد قاسم صاحب کو لکھا ہے جبکہ مولانا محمد یعقوب صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب دونوں میرٹھ کے مطبع میں کار تصحیح کتب کا شغل رکھتے ہیں اور حاجی صاحب نے اپنے بھتیجے احمد حسین کو بھی ان کے پاس کار مطبع میں مشغولیت کا مشورہ دیا ہے اور احمد حسین صاحب نے قلت تنخواہ کے باعث انکار کر دیا ہے، حاجی صاحب لکھتے ہیں :۔

وآں عزیزاں را باید کہ نفع رسانی را در امور دین مثل وعظ و پند و ارشاد و تلقین بر ہمہ امور مقدم دارند و اوقات خود را دریں صرف سازند، زیرا کہ دین اسلام بسیار ضعیف گردیدہ و مددگاراںش بہا کمیاب شدہ و اگر طالب صادق باشد یا کاذب اگر پیش آید کسر نفسی را بر طاق نہادہ باو مشغول شوند، خداوند تعالیٰ ہادی مطلق است ہدایت خواہد نمود و نیز بحکم دل بیار و دست بکار مشغولی باطن را از دست نہ ہند۔

ترجمہ :۔ آپ عزیزوں کو چاہئے کہ امور دین میں نفع رسانی مثل وعظ و پند اور ارشاد و تلقین کو تمام امور پر مقدم سمجھیں اور اپنے اوقات کو اس میں صرف کریں، کیونکہ دین اسلام بہت کمزور پڑ گیا ہے اور دین کے مددگار کمیاب ہو گئے ہیں، اور اگر طالب روحانیت صادق ہو یا صادق نہ ہو اگر بیعت کرنا چاہے تو کسر نفسی کو بالائے طاق رکھ کر اس کی طرف مشغول ہو جائیں خداوند تعالیٰ ہی ہادی مطلق ہے۔ ہدایت عطا فرمائے گا اور بحکم دل کو یار کی طرف اور ہاتھ کو کام میں لگائے رکھو، باطنی شغل کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔(۱)

اس مکتوب میں مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ دونوں کو حاجی صاحب نے نصیحت فرمائی ہے کہ اگر کوئی واقعی طور پر مخلص بن کر یا جھوٹ موٹ بھی آپ دونوں کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہے تو کسر نفسی سے کام نہ لیں اور مرید بنالیں۔

اسی اٹھارہویں مکتوب کے صفحہ ۲۵۱ پر حاجی صاحب مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مشترکہ خط میں تحریر فرماتے ہیں

---

(۱) مرقومات امدادیہ مکتوب ۱۸

مولوی عبد الرحمٰن خلف الرشید مولوی احمد علی صاحب (محدث سہارنپوری) را حسب درخواست شاں غائبانہ بیعت گرفت داخل سلسلۂ بزرگان خاندان خود کردہ شد، خدائے تعالیٰ قبول کند و از فیضان بزرگان سلسلہ مشرف سازد، آمین، واو شاں را بعد سلام و دعائے خیر فرمودہ دہند کہ مولوی محمد قاسم صاحب و مولوی محمد یعقوب را بجائے فقیر دانستہ از خدمت فیض یاب بودہ باشند۔

ترجمہ:۔ مولوی عبد الرحمٰن بن مولانا احمد علی (محدث سہارنپوری) کو ان کی درخواست پر غائبانہ بیعت کر کے اپنے بزرگوں کے خاندان کے سلسلے میں داخل کر لیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور اس سلسلے کے بزرگوں کے فیضان سے مشرف کرے آمین، ان کو سلام اور دعائے خیر کے بعد مطلع کر دیں کہ وہ مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد یعقوب کو فقیر کی جگہ سمجھ کر ان کی خدمت سے فیض حاصل کریں۔

حضرت پیر و مرشد حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے مریدین میں جن کو خاص طور پر بہت زیادہ محبت اور عزت کی نظر سے دیکھتے تھے ان میں ایک مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، حاجی صاحب اپنے ایک مکتوب بنام حکیم ضیاء الدین رامپور منیہار ان میں لکھتے ہیں۔

چونکہ دل را بدل رہیست اکثر اوقات بے اختیار طبع احقر میخواہد کہ او سبحانہ تعالیٰ سببے سازد کہ یکبار از ملاقات آں عزیز و مولوی رشید احمد صاحب و مولوی محمد قاسم صاحب و مولوی محمد یعقوب صاحب مسرت اندوزم (۱)

ترجمہ:۔ چونکہ دل کو دل سے تعلق ہوتا ہے اس لئے اکثر اوقات بے اختیار میری طبیعت چاہتی ہے کہ سبحانہ تعالیٰ کوئی ایسا سبب کر دے کہ ایک مرتبہ تم سے اور مولوی رشید احمد اور مولوی محمد قاسم اور مولوی محمد یعقوب کی ملاقات سے مسرور ہوں۔

اس عبارت سے حاجی صاحب کی نظروں میں اوروں کے ساتھ مولانا محمد یعقوب صاحب کی قدر و منزلت اور محبت معلوم ہوتی ہے۔ اس مقام پر ہم حاجی صاحب کی وہ تحریریں ختم کرتے ہیں جن سے مولانا محمد یعقوب صاحب کی روحانی بلندی، ارشاد و تلقین کا منصب عظیم اور حاجی صاحب کے تعلق کی نشاندہی ہوتی ہے۔

(۱) مرقومات امدادیہ، ص ۳۲۱

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی قلبی کیفیت اور عشق و معرفت الٰہی میں جذب و سرور

گزشتہ صفحات میں ہم نے حضرت پیر و مرشد کی زبانی مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روحانیت میں رفعت کا ذکر لکھا تھا، لیکن اگر آپ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ولایت کا خود ان کی حالت سے پتہ چلانا چاہتے ہیں تو آپ ان کی حسب ذیل عبارات سے آپ کے عشق الٰہی کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ حسب ذیل تحریر آپ نے اپنے مرید منشی قاسم کو لکھی ہے اور جو خود آپ پر گزر چکی ہے وہی مرید کو بتا رہے ہیں۔ اس سے مولانا کا مقام ولایت عیاں اور واضح ہو جاتا ہے لکھتے ہیں۔

"بوقت ذکر حرکت قلب کی طرف کچھ التفات مت کرو اور نہ اس کی فکر کرو باطمینان ذکر میں لگے رہو، حرکت چشتیہ خاندان میں مقصود نہیں، گرمی اور ذوق و شوق اگر بے جا ہو اور درد و قلق اور حزن و غم اور بیتابی بے چینی اور زور ہو جانا طلب کا اور اشتیاق کا اور کبھی اضطراب اور خفقان یہ آثار نسبت گرم کے ہیں، اور اکثر ذکر کے وقت یا بعد ذکر ان کا ظہور ہوا کرتا ہے اور رغبت آواز خوش کی طرف لذت اس میں ہوا کرتی ہے، جب یہ علامتیں تمام یا کوئی اس میں سے ہو شکر الٰہی کرنا چاہئے اور اگر کچھ ظاہر نہ ہو یا ظاہر ہو کر ترقی نہ ہو یا گم ہو جائے مایوس نہ ہوں اور کام میں مصروف رہیں، کیونکہ محنت کسی کی اللہ کریم کے ہاں ضائع نہیں جاتی۔

چون نشینی بر سر کوئے کسے — عاقبت بینی تو ہم روئے کسے
گفت پیغمبر کہ چوں کوبی درے — عاقبت زاں در بروں آید سرے
طلبگار باید صبور و حمول — کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

مولانا پر کیفیت خاص کا ظہور

اور یہ وہ کیمیا ہے کہ خاک سے روح پاک تیار ہوتی ہے اور بگولا ہوا کی طاقت سے آسمان کی طرف جاتا ہے یہ آتش عشق اس خاک کو آسمان بلکہ عرش کو لے جاتی ہے اور وہاں پہنچاتی ہے

کہ فرشتہ بھی وہاں پر نہ مار سکے۔

ہم نے گمنام وہاں پاؤں جمائے اپنے
پا فرشتے کا بھی جس جا سے پھسلتے دیکھا

اور جب ذکر غلبہ کرتا ہے ایک قلب کیا تمام جسم متحرک ہو جاتا ہے بلکہ آواز آتی ہے بلکہ ہر طرف سے آواز آتی ہے اور ایسی آواز کا غلبہ اس قدر ہو جاتا ہے کہ نقار خانے کی آواز اس پر غالب نہیں ہوتی اور ثمرہ مشغولی ذکر اللہ کا ہوتا ہے۔

مرید عقیدت کیش کی تربیت سلوک کے سلسلے میں مذکورہ عبارت کی چند حقیقتیں ہمیں مولانا کی کیفیت قلبی کا پتہ دیتی ہیں اور اس شعر میں اپنے اس مقام کا اظہار جذبۂ دروں سے مجبوری میں اچھل کر باہر نکل پڑا ہے۔

ہم نے گمنام وہاں پاؤں جمائے اپنے
پا فرشتے کا بھی جس جا سے پھسلتے دیکھا

گمنام حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تخلص تھا اور خود مولانا کا یہ شعر اپنی کیفیت قلبی کی ترجمانی کر رہا ہے، کہ جہاں فرشتوں کے بھی پاؤں میں لغزش آجائے وہاں ہم (خدا کے فضل سے) ثابت قدم ہو کر جم گئے ہیں اور ایسے مقام قرب میں پہنچے ہیں جہاں فرشتہ بھی نہیں پہنچ سکتا۔

ولی پر کئی دفعہ ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ اس کی زبان سے اس کے مقام قرب کا حال ٹپک پڑتا ہے، اس میں فخر یا ریا کا نام نہیں ہوتا۔ الحاصل مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو

(۱) قرب خداوندی (۲) وصول بارگاہ خداوندی

(۳) قبول بارگاہ خداوندی کے تینوں مراتب حاصل ہو چکے تھے۔

ان مقامات میں اصل قبولیت ہے، وصولیت اور قرب اصل مدعا نہیں، کیا سلاطین کے درباروں میں دربانوں، ملازموں اور خدام کو قرب اور وصول نہیں ہوتا، البتہ قبولیت جسے حاصل ہو، جیسا کہ محمود غزنوی کے دربار میں ایاز کو حاصل تھی۔

خوف خدا، صفائے باطن اور تقویٰ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا باطن آئینے کی مانند تھا، اسی وجہ سے تقویٰ کی

چمک باطن میں صاف نظر آتی تھی، مطلب یہ ہے کہ کسی ناجائز عمل یا ناجائز کھانے سے آپ کی طبیعت فوراً متاثر ہوتی تھی، یہی تقویٰ ہے، اہل دل کے معدے حرام طعام کو ہضم نہیں کرتے یہ اللہ کی طرف سے ان کی حفاظت ہوتی ہے، حرام اور ناجائز خوراک کا خون دل کو خراب کرتا ہے اور اعمال صالحہ سے دل کو دور کر دیتا ہے۔ مولانا اشرف علی صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

ناجائز خوراک کا اثر

"مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک رئیس کے یہاں سے لڈو آئے ایک میں نے کھالیا وہ کھاتے ہی قلب میں سخت ظلمت پیدا ہوئی اور ہر وقت یہ وسوسہ پیدا ہوتا تھا کہ کوئی خوبصورت عورت ملے جس سے زنا کروں اسی حالت میں ایک مہینہ گذر گیا۔ میں روتا تھا اور توبہ کرتا تھا کہ الٰہی یہ کیا ہو گیا۔(۱)

اولیاء کو بھی اس قسم کے وسوسوں سے شیطان خراب کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرماتے ہیں۔ مولانا کے دل سے آخر یہ خیال دور ہوا۔ اس کے برعکس حلال اور ریاض کی کمائی کا فطرت سلیمہ پر اچھا اثر ہوتا ہے، مولانا تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"ایک دفعہ ایک اور شخص نے دعوت کی یہ ایک بزرگ تھے۔ عبد اللہ شاہ نام کہ جنگل سے گھاس کھود کر لایا کرتے تھے اور دو آنے میں بیچ دیا کرتے تھے۔ اس میں سے دو پیسے خیرات کرتے تھے اور چھ پیسے بال بچوں میں خرچ کرتے تھے، انہوں نے ایک دن کہا آپ صاحبوں کی دعوت کرنے کو دل چاہتا ہے مگر کھانا پکا کر کھلانا تو ہمارے بس کا ہے نہیں، دام لے لو اور اپنے گھر میٹھے چاول پکا کر کھالو، اور ہم کئی آدمی تھے، مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے اور آپ کے ساتھ چند اور آدمی بھی تھے، سب نے مل کر مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذمے اس کا پکوانا رکھا، وہ مولانا کے گھر پکا اور مولانا نے اس قدر احتیاط کی کہ کوری ہانڈی منگائی اور پکانے والے کو وضو کرلیا، جب چاول تیار ہو گئے تو سب نے مل کر دو دو لقمے کھالئے، مولانا (محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ)

---

(۱) الہادی ماہ رجب ۱۳۵۷ھ

فرماتے ہیں کہ جیسے ہی وہ چاول حلق سے اترے ایک روحانی لذت اور نور محسوس ہوا اور لطف یہ کہ اس کا اثر مدت تک رہا، تو ہم نے کہا کہ ایک بار کے کھانے کا یہ اثر ہے تو اس شخص کی کیا حالت ہوگی جو ہمیشہ ہی ایسا کھانا کھاتا ہے اور اس کے سوا اور کوئی کھانا اس کے پیٹ میں جاتا ہی نہیں۔(۱)

حسن خاتمہ اور خوف خدا

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خوف خدا کا یہ حال تھا فرماتے ہیں۔

"اور مدار ساری عمر کا خاتمہ پر ہے، دیکھئے اس وقت کیا رنگ ہو، خاتمہ کے ڈر سے جگر آب اور سب حال خوب خراب ہے، ساری عمر کا کیا کرایا ایک آن بھر میں اکارت ہو جاتا ہے، جو اس معرکے سے ایمان سلامت لے گیا اس کو مبارک باد اور سو مبارک باد وہ ہمیشہ ہمیشہ کو نجات پا گیا، اس کا کیا کہنا ہے۔" (۲)

مریدنیوں کو پیرومرشد کے سامنے بے پردہ آنا ناجائز ہے

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے پردے میں بیعت لیتے تھے، پابند سنت اور متقی مرشدین کامل کا بھی یہی دستور رہا ہے، لیکن حسن و شہوت پرست، گندم نما جو فروش نقلی پیروں کے سامنے عورتوں کا بے حجاب آنا تو ان کی مرادیں بر آنا ہے، موروثی سجادگی میں عیش و عشرت کے بازار پیری کے پردے میں خوب گرم ہوتے ہیں۔ پنجاب کے ایک مشہور اور ممتاز پیر کے متعلق یہ شہرت ہے کہ وہ اپنی انگشت مبارک سے حاجتمند عورتوں کے سینے پر تحریر فرماتے ہیں، بہرحال یہ سلسلہ بھی جاری ہے، اس کے برعکس اہل اللہ حضرات کی جماعت ہے کہ وہ ایسی حرکت سے سخت متنفر اور بے زار ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اپنے مرید صفا کیش کے مکان پر نیا نگر فروکش ہوئے ہیں، وہ مدتوں سے متقاضی تھے کہ پیرومرشد اپنے قدوم میمنت لزوم سے میرے گھر کو شرف بخشیں، دوران قیام میں بہت سی عورتوں نے بیعت بھی کی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض عورتیں بغیر اجازت بے خبری میں حضرت مولانا کے سامنے بیعت کے لئے آ گئی ہیں، مولانا

---

(۱) اربعین مصطفائی ص ۱۹ بحوالہ الہادی ص ۲۶ (۲) مکتوب یعقوبی ۳۳ ص ۷۹

عقیدت مند کو لکھتے ہیں۔

"ہر چند رشتہ پیری مریدی کا ایک مستحکم رشتہ ہے مگر حکم شرع مقدم ہے، یہ بے پردگی اس وقت احقر کے مزاج کے نہایت مخالف تھی مگر موقع کہنے کا نہ تھا، اگر کہتا بے شک یہ سلسلہ بند ہوتا اور ان کو ناگوار ہوتا اور خدا جانے کس بات پر محمول ہوتا، خیر جو کچھ ہوا ہوگیا، اب اس امر کا لحاظ رکھنا چاہئے"

کثرت مریدین و مریدات

اس ناکارہ سے اپنے بعض اقرباء اور بعض اجنبی عورتیں بہت بیعت ہوئی ہیں مگر طریقہ پردہ حسب شرع ان سے ہے، آدمی شیطان کو دور نہ سمجھے اس ملعون نے بڑے بڑوں کو دے مارا ہے، ہم جیسے کمزور کس شمار میں ہیں بلکہ

آدمی سے شیطان دور نہیں ہے

ہماری کمزوری ہی کے سبب وہ ملعون ہمارے درپے سے نہیں جاتا ہے کہ ان کی کیا حقیقت ورنہ ہمارا کیا ٹھکانہ تھا اور یہ ایک حفاظت الٰہی کا ظہور ہے اسی کی پناہ سے یہ سارا رنگ جما ہوا ہے(۱)

مولانا کی مذکورہ بالا تحریروں سے مولانا کے دل میں خوف خدا، تقویٰ اور خلاف شریعت و طریقت کسی کام سے پرہیز کا حال معلوم ہوتا ہے اور یہی شانِ ولایت ہے۔ جس کے باعث مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ الا ان اولیاء اللّٰہ لا خوف علیہم و لا ہم یحزنون کے زمرے میں شامل نظر آتے ہیں، مولانا کی ولایت میں ان کے حالات زندگی پڑھ کر کوئی شبہ باقی نہیں رہتا، لیکن بعض اولیاء کو بارگاہ خداوندی میں نازکی سی کیفیت حاصل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی نازبرداری کرتے ہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی یہ مقام حاصل تھا۔ حدیث طیبہ میں ہے کہ بندہ نوافل کے ذریعے ہمارا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، اور یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ جب ولی مقرب بات کرتا ہے تو میں اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے، میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ کام کرتا ہے، میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، یہی وہ مقام خودی ہے جس کا اظہار ڈاکٹر اقبال نے اس شعر میں کیا ہے ؎

(۱) مکتوبات یعقوبی مکتوب نمبر ۳۵ کا تتمہ ص ۸۵

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ایسے مقرب بندے کا پھر خدا چاہنے والا بن جاتا ہے اور بندے کو فرشتوں میں یاد کرتا ہے کسی ہندو شاعر نے پتے کی بات کہی ہے کہتا ہے ؎

نہ ہاتھ سے مالا جپیں نہ منہ سے کہیں رام
رام ہمارا ہمیں جپے ہم کریں بسرام

ولایت کے ساتھ مقام ناز، کشف کے ساتھ مستجاب الدعوات

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی حسب ذیل روایت الہادی ماہ شوال ۱۳۵۷ھ صفحہ ۲۵ پر مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قبولیت دعا اور خواب میں کشف اور ولایت کے سبب بارگاہ خداوندی میں ناز کے مقام کا پتہ دیتی ہے، مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ :۔ایک دفعہ کسی حاجت (دیوبند میں مکان بنانے کے لئے جیسا کہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ملفوظ میں ہے) میں رقم کی ضرورت تھی مولانا محمد یعقوب نے حق تعالیٰ سے دعا کی تو روپے مل گئے، پھر خواب نظر آیا اور ایک محل بھی دیکھا، حاضرین سے پوچھا کہ یہ کس کا محل ہے، انہوں نے مولاناؒ (محمد یعقوب صاحب) کا نام بتلادیا، مگر دیکھتے ہیں کہ اس کا ایک کنگرہ ٹوٹا ہوا ہے، مولانا نے پوچھا کہ یہ کنگرہ ٹوٹا ہوا کیوں ہے، جواب دیا کہ انہوں نے دنیا میں مانگ لیا، جب (مولانا محمد یعقوب صاحبؒ) خواب سے بیدا ہوئے تو آپ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ حضور اگر جنت کے کنگرے ہم کو یہاں ملنے لگیں گے تو ہم تو اپنا سارا محل یہاں ہی کھاجائیں گے، آپ کے کیا کمی ہے یہاں الگ دیجئے اور وہاں الگ دیجئے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب کا یہ واقعہ لکھ کر مولانا تھانوی لکھتے ہیں۔

حضرت مولانا مقام ناز میں تھے اس لئے حق تعالیٰ سے وہ ایسی باتیں کرلیا کرتے تھے، ایک دفعہ غالباً حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ناز کا فقرہ سن لیا تھا تو گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا، کہ :۔انہی کا مقام ہے کہ ایسی باتیں کہہ گئے کوئی دوسرا کہتا تو کان پکڑ لیا جاتا۔

مثنوی مولانا روم میں گڈریئے اور موسیٰ علیہ السلام کا وہ واقعہ یاد کیجئے کہ وہ کہہ رہا تھا کہ

اے خدا تو مجھے مل جائے تو میں تجھے اپنی بکریوں کا دودھ پلاؤں اور تیرے سر میں کنگھا کروں، موسیٰ علیہ السلام سن رہے تھے، انہوں نے چرواہے کو ڈانٹ پلائی اور وہ وہاں سے بھاگ گیا، جس پر موسیٰ علیہ السلام کو وحی ہوئی ؎

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا — بندۂ مارا چرا کردی جدا

تو برائے وصل کردن آمدی — نے برائے فصل کردن آمدی

چرواہا مقام ناز میں یہ باتیں کر رہا تھا، جنون عشق ولی میں جب جوش مارنے لگتا ہے تو وہ مقام ناز میں اتر آتا ہے، بظاہر بعض باتیں کہہ کر گستاخ نظر آتا ہے، مگر حقیقت میں گستاخ نہیں ہوتا۔ بقول مولانا روم ؎

گفتگوئے عاشقاں در کار رب — جوشش عشق است نے ترک ادب

بے ادب تر نیست زو کس در جہاں — با ادب تر نیست زو کس در جہاں

امیر شاہ خاں اکابر دیوبند کے معاصر، معتقدین اور مولانا محمد قاسم صاحب و مولانا گنگوہی اور مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص مصاحبین میں سے تھے۔ راقم الحروف نے ان کو زمانۂ طالب علمی میں دیوبند میں دیکھا اور ان کے پاس بیٹھا بھی ہوں۔ نورانی چہرہ، ظریف الطبع اور بڑے دیندار تھے ان سے اکابر کی بہت سے روایتیں امیر الروایات کے نام سے موسوم ہو کر طبع ہو چکی ہیں اور ان کی یہ روایات مشاہدات پر مبنی ہیں، انہوں نے فرمایا کہ۔

ایک مرتبہ صبح کے وقت جناب مولوی محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرسے میں اپنی درسگاہ میں پریشان اور خاموش بیٹھے ہوئے تھے میں اور چند اشخاص بھی اس وقت پہنچ گئے۔ مولانا نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ افو! رات مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی، میں نے حق تعالیٰ سے کچھ عرض کیا، حضور نے کچھ ارشاد فرمایا، میں نے پھر کچھ عرض کیا (جو کہ ظاہراً گستاخی میں داخل تھا) اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ بس چپ رہو بکومت ایسی گستاخی! یہ سن کر میں خاموش ہو گیا اور بہت کچھ استغفار اور معذرت کی، بالآخر میرا قصور معاف ہو گیا۔ اس کے بعد آسمان سے ایک پیڑھا یا کھٹولا (یہ مجھے یاد نہیں کہ آپ نے کیا فرمایا تھا) اترا، جس کی پٹیاں سیروے پائے سب الگ الگ تھے۔ میں نے عرض کیا کہ حضور میں سمجھ گیا، حضور نے فرمایا ہاں ”خانصاحب نے فرمایا یہ وہ زمانہ تھا جس زمانے میں حضرت مولانا (محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ) نانوتوی مرض الموت میں علیل تھے، مولوی فخر الحسن (گنگوہی تلمیذ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ) نے اس واقعہ کو حضرت

مولانا (محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کی خدمت میں بیان کیا تو آپ گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ افو! مولوی محمد یعقوب صاحب نے ایسا کیا، توبہ توبہ بھائی یہ انہی کا کام تھا کیونکہ وہ مجذوب ہیں، اگر ہم ایسی گستاخی کرتے تو ہماری تو گردن نپ جاتی۔(۱)

مجذوب مولانا محمد یعقوب صاحبؒ

مذکورہ بالا واقعہ یہ تھا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دراصل مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیادتیٔ عمر کے لئے از راہ ناز و نیاز بارگاہ خداوندی میں اصرار کیا تھا، اور بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی عرض کیا کہ میری عمر میں سے ان کو دے دیجئے لیکن یہ بات منظور نہ ہوئی، حتی کہ آسمان سے ایسا پیڑھا اترا جس کے سیروے اور پائے علیحدہ تھے، اور جس کو دیکھ کر مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ حضور میں سمجھ گیا، اس کا مطلب یہ تھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اعضا بھی جلد وفات پا کر علیحدہ علیحدہ ہونے والے ہیں، تو اس بات پر مولانا بارگاہ خداوندی میں ضد کر رہے تھے اور یہ مولانا کی مجذوبیت کا اثر تھا۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر بعض اوقات جذب کی حالت طاری ہوتی تھی اور اس وقت جو دعا یا بد دعا کرتے قبول ہو جاتی تھی۔ مگر یہ دعا منظور نہیں ہوئی، اسی لئے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں ان کے حالات سے واقفیت کی بناء پر مجذوب کہا ہے، مجذوب کوئی ایسا لفظ نہیں کہ اس سے گھبرایا جائے، یہ ولی کا ایک مقام ہے جس میں بندہ عاشق خدا اپنے محبوب کی طرف کھنچ جاتا ہے اور خدا کی ذات میں محو ہو جاتا ہے، مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو مولانا محمد یعقوب صاحب کو مجذوب کہا ہے ان کا مطلب یہی ہے کہ ان پر عشق خداوندی اتنا غالب تھا کہ خدا کی ذات کی طرف کھنچ کر رہ گئے تھے، جیسے آفتاب کی کرنیں پانی کو اپنی طرف کھنچ لیتی ہیں یا شبنم کو فنائیت سے دوچار کر دیتی ہیں بقول غالب ؎

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

مولانا محمد یعقوب صاحب کا حال بھی ایسا ہو جاتا تھا۔

---

(۱) امیر الروایات۔ ارواح ثلاثہ ص ۳۳۰۔۳۳۱

کشفیات

کشف کے لغوی معنی کھل جانے، واضح ہو جانے اور ظاہر ہونے کے ہیں، لیکن تصوف کی اصطلاح میں کسی حقیقت کا دل پر سے پردہ اٹھ جانا اور اولیاء کے قلوب پر کسی چیز کا من جانب اللہ کنایۃً، اشارۃً یا واضح طور پر ظہور ہونا کشف ہے، جیسا کہ صوفیاء میں مشہور ہے، جس طرح آئینے کی گندگی اور کثافت دور ہونے سے آئینہ روشن ہو جاتا ہے یہی حال اولیاء کے دلوں کا ہے، عبادت، ریاضت، مجاہدات اور اذکار و عبادات سے ان کے دل آئینے کے مانند صاف اور شفاف ہو جاتے ہیں اور دلوں سے حجابات اٹھ کر حقائق کا عکس دلوں پر پڑتا ہے اسی کا نام کشف ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دل کا بھی یہی حال تھا اور مجاہدات اور اذکار و عبادات سے آپ کا دل روشن ہو چکا تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ کو کشف کا مقام حاصل تھا اور تمام معاصرین نے آپ کے کشف کو متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے، کشف کی مختلف صورتوں کو مولانا کے حسب ذیل کشوف سے معلوم کیجئے۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور اظہار کشف

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ مولانا نہ اپنا کشف چھپاتے تھے نہ دوسرے بزرگوں کا، اس واسطے اور بزرگ اس مجمع کے مولانا سے اپنے مکاشفات نہیں کہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مولانا رفیع الدین صاحب (سابق مہتمم دار العلوم دیوبند) نے کہہ دیا کہ رمضان شریف میں فلاں تاریخ کو بارش ہوگی، قحط (کا زمانہ) تھا، بس مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے کہہ دیا کہ اطمینان رکھو فلاں تاریخ کو بارش ہوگی۔ (۱)

ہمشیرہ کے متعلق کشف

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "مولانا محمد یعقوب صاحب نے ہمشیرہ کے متعلق ایک کشف بیان کیا، انہیں حج سے آنے میں اور نیز خبر بھیجنے میں دیر ہوئی، مولانا فرماتے تھے میں ان کے انکشاف حال کی طرف متوجہ ہوا، ایک بڑا کاغذ خوشخط دیکھا جس میں جدولیں بنی ہوئی تھیں، ایک خانہ میں لکھا تھا، العامل دوسرے میں العمل، تیسرے میں الجزاء، اس میں میں نے

---

(۱) الہادی ص ۳۲ منقول از قصص الاکابر

اپنی ہمشیرہ کا نام دیکھا، العمل میں لکھا تھا الحج اور الجزاء میں لکھا تھا **فی مقعد صدق عند ملیك مقتدر**(۱)

کشف میں غلط فہمی

صاحب کشف صوفی اور درویش کو بھی بعض اوقات کشف میں غلط فہمی ہو جاتی ہے حالانکہ کشف اپنی جگہ صحیح ہوتا ہے، مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی کشف میں غلط فہمیاں ہوئی ہیں، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ :۔ مولانا (محمد یعقوب صاحب) فرماتے تھے کہ مولانا محمد قاسم صاحب کی عمر کی بابت مجھے کشف سمجھنے میں غلطی ہوئی، وہ یہ کہ جب مولانا کی شدت مرض سے زندگی سے مایوسی ہوئی تو مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ رجوع الی اللہ ہوئے اور براہ ناز اس طرح دعا کی کہ ہماری عمر انہیں عطا فرما دیجئے۔ فرماتے تھے کہ میری تسلی کی گئی کہ ابھی دس برس اور زندہ رہیں گے، مولانا (محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ) نے سب سے کہہ دیا کہ گھبراؤ مت ابھی دس برس مولانا اور زندہ رہیں گے، سب خاموش ہو گئے، مگر بعد میں مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا۔ لوگوں نے پوچھا حضرت آپ تو فرماتے تھے کہ دس برس اور زندہ رہیں گے، فرمایا بھائی میرے سمجھنے میں غلطی ہوئی، میں نے خود یہ مطلب سمجھ لیا، حالانکہ مطلب اور تھا، ایک بات صرف یہ معلوم ہوئی تھی کہ میری دعا کے جواب میں لفظ مہدی کا ارشاد فرمایا گیا، یوں فرماتے تھے کہ میں نے مہدی کے عدد جوڑے تو ۵۹ ہوئے اور اس وقت مولوی (محمد قاسم) صاحب کی عمر ۴۹ سال کی تھی، میں نے سمجھا کہ ابھی دس برس زندگی کے اور ہیں۔ جب انتقال ہو گیا تو اب سمجھ میں آیا کہ مطلب یہ تھا کہ مہدی کی برابر عمر ہوگی۔ حضرت امام مہدی علیہ السلام کا ۴۰ (چالیس) برس کی عمر میں ظہور ہوگا اور ۹ (نو) برس کے بعد انتقال ہوگا پورے (۴۹) انچاس برس کی عمر ہوگی۔(۲)

اہل دیوبند اور اپنے لئے حالت جذب میں کلمات کا صدور

واقعہ لکھا ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اہل دیوبند سے کہا تھا کہ یہاں عنقریب وبا پھیلنے والی ہے ہر چیز میں سے صدقہ نکالا جائے۔ تو بعض اہل شہر نے کہا کہ شاید مدرسہ میں روپیہ کی ضرورت ہے، اس لئے صدقات ادا کرنے کی نصیحت کی جا رہی ہے، یہ بات مولانا کو

---

(۱) الہادی رجب ۱۳۵۷ھ ص ۳۲ (۲) قصص الاکابر الہادی ماہ رجب ۱۳۵۷ھ

معلوم ہوگئی، غیظ میں بھر گئے فرمانے لگے، یعقوب تو، تیری اولاد اور دیوبند والے۔ یعقوب تو، تیری اولاد اور دیوبند والے، کئی دفعہ یہ جملہ دہرایا، حاجی محمد عابد صاحب قریب ہی حجرے میں یہ آواز سن رہے تھے۔ وہ حجرے سے گھبرا کر نکلے اور کہا اجی حضرت آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ فرمایا میں نے کیا کہا، حاجی صاحب نے الفاظ بیان کئے تو مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا اب تو ایسا ہی ہوگا، چنانچہ دیوبند میں ہیضے کی بیماری پھیلی روزانہ بکثرت جنازے نکلتے تھے، ہزاروں دیوبند والے مرگئے، اور آپ کے گھر کے بھی چودہ افراد دنیا سے رخصت ہوئے اور خود بھی ہیضے میں انتقال فرماگئے، اندازہ لگایئے کہ جو الفاظ آپ کی زبان سے نکلے ان کا مولانا کو بھی ہوش نہ رہا اور حاجی عابد صاحب نے بتائے، اسی قسم کا واقعہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا جو انہوں نے خود مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا، مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مجذوب فرمایا اس کی تشریح کرتے ہوئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

بعض مراتب مجذوبیت میں ایسے اقوال (جو مولانا نے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر زیادہ ہونے بارے میں اللہ تعالیٰ سے بضد ہوکر کہے تھے) داخل ادلال (ناز) ہوکر عفو فرما دیئے جاتے ہیں، اور بعض مجاذیب (مجذوب لوگ) ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر جذب کا اثر کسی بھی وقت ہو جاتا ہے، احقر (مولانا تھانوی) نے خود مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ "ایک بار خط لکھ کر میں نے دستخط کرنا چاہا تو اپنا نام بھول گیا" (مولانا تھانوی کہتے ہیں بجز جذب اور اس کا سبب کیا ہوسکتا ہے۔" (۱)

اسی جذب اور درد دل کا نتیجہ تھا کہ مولانا دیوبند کی چھتے کی مسجد میں وضو فرما رہے تھے کہ کسی غمزدہ عورت کے رونے کی آواز ایک طرف سے آئی، وضو کرتے کرتے مولانا کی حالت اس عورت کے رونے سے بدل گئی۔ امیر شاہ نے یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ اجمیر میں مولانا صبح کی نماز کیلئے مسجد میں تشریف لے جارہے تھے کہ کان میں بھڑ بھونجوں کے دھان کوٹنے کی آواز آئی، مولانا کو وہیں وجد آگیا۔ (۲)

یعقوبی کرامات

جس طرح انبیاء سے معجزات ظہور میں آتے ہیں اسی طرح اولیاء سے کرامات کا ظہور کسی

---

(۱) حکایات اولیاء یعنی ارواح ثلاثہ ص ۳۳ (۲) حکایات اولیاء ص ۳۳۶

ثبوت اور دلیل کا محتاج نہیں۔ جس طرح انبیاء کے معجزات برحق اسی طرح اولیاء کی کرامات درست، دو چار نہیں اولیاء کی ہزاروں کرامتیں کتابوں میں اور زبان زد خلق ہیں، ہاں جیسے کہ معجزات کا ظہور معیار نبوت نہیں اسی طرح اولیاء کی ولایت کیلئے کرامات کا ظہور معیار ولایت نہیں، کیونکہ معجزات کے بغیر انبیاء کی نبوت برحق اسی طرح اولیاء کی ولایت کرامات کے بغیر بھی سچ ہے، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کرامتوں میں سے ایک کرامت ہم پیش کرتے ہیں،

"امیر شاہ خاں صاحب نے بتایا کہ مولوی معین الدین صاحب مولانا محمد یعقوب صاحب کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے، وہ مولانا کی ایک کرامت (جو بعد وفات واقع ہوئی) بیان فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ہمارے نانوتے میں جاڑہ بخار کی بہت کثرت ہوئی۔ سو جو شخص مولانا کی قبر سے مٹی لے جاکر باندھ لیتا اسے ہی آرام ہو جاتا تھا۔ بس لوگ اس کثرت سے مٹی لے گئے کہ جب میں قبر پر مٹی ڈلواؤں تب ہی ختم کئی مرتبہ ڈلوا چکا۔ پریشان ہوکر ایک دفعہ میں نے مولانا کی قبر پر جاکر کہا (یہ صاحبزادہ بہت تیز مزاج تھے) کہ آپ کی تو کرامت ہوئی اور ہماری مصیبت ہوگئی، اگر اب کے کوئی اچھا ہوا تو ہم بھی مٹی نہیں ڈالیں گے، ایسے ہی پڑے رہیو، لوگ جوتا پہنے تمہارے اوپر ایسے ہی چلیں گے، بس اسی دن سے پھر کسی کو آرام نہ ہوا، جیسے شہرت آرام کی ہوئی تھی، ویسے ہی یہ شہرت ہوگئی کہ اب کے آرام نہیں ہوتا، پھر لوگوں نے مٹی لے جانا بند کر دیا۔"(۱)

دراصل معجزہ ہو یا کرامت اس کا حکم اور قدرت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے، اور ظہور نبی یا ولی کے ذریعہ ہوتا ہے، مولانا روم فرماتے ہیں ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

یہی مطلب قرآن کریم کی اس آیت کا ہے، وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے جو جنگ احد میں کنکریاں پھینک کر ماریں جن سے کفار کی کمریں ٹوٹ گئیں وہ آپ نے پھینک کر نہیں ماریں بلکہ اللہ نے ماری تھیں، اسی مضمون کو غالب نے

(۱) ارواح ثلاثہ، از امیر الروایات ص ۳۲

یوں ادا کیا ہے ؎

تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق است اما کشود او ز کمان محمد است

اسی طرح مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کی مٹی میں شفاء شافی مطلق کی طرف سے اور اسکے حکم سے ہوئی اور وہ ذریعہ بن گئے، اور بات تو یہ ہے کہ جب بندہ سراپا خدائے تعالیٰ کا مطیع اور فرمانبردار بن جاتا ہے تو خدا کی خدائی بندۂ مومن کی غلام بن جاتی ہے۔ بقول شیخ سعدی

تو گردن ہم از حکم داور مپیچ کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

نوح علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے کشتی تیار کی تو قوم کے کافرین نے اس میں گندگی کرنی شروع کر دی یہاں تک کہ کشتی بھر گئی، قوم نوح کو خارش اور برص کی شکایت عام تھی، اتفاقاً ایک روز ایک کافر کشتی میں گر پڑا اور نجاست میں لت پت ہو گیا، نہایا تو خارش یا برص بالکل دور، پھر تو ساری قوم نے جا جا کر نجاست کو جسم سے ملا حتی کہ پانی سے دھود ھو کر جسم پر مالش کی، کشتی صاف ہو گئی جو قدرت کا منشا تھا۔ قدرت نے اس گندگی میں خارش یا برص سے صحت کا مادہ پیدا کر دیا، فالحکم للّٰہ، والعظمة للّٰہ.

ولایت یعقوبی

ہم نے مولانا کی حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کے سلسلے میں ان کے تقوی، صبر و استقامت، جذب و عشق اور کرامت پر مناسب الفاظ و عبارات میں کچھ بیان کیا ہے اور اسی ضمن میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ مولانا اولیاء اللہ میں سے تھے، اور ولایت کے ساتھ ان کو بارگاہ خداوندی میں ناز بھی تھا، ان کی دعا بھی مقبول ہوتی تھی اس لئے مستجاب الدعوات تھے، جیسا کہ گزرا یہ سب مولانا کی ولایت کی برکتیں اور ثمرات تھے۔

امیر شاہ خاں صاحب نے فرمایا کہ حاجی منیر خاں صاحب خانپوری (یہ صاحب مولوی محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے برادر خورد جناب مولوی محمد اسحاق صاحب سے بیعت تھے) اور فیض محمد خاں صاحب نواب دتاولی اور میانجی محمدی صاحب (یہ میرے استاذ اور سید صاحب (شہید) سے بیعت تھے اور اورنگ آباد کے رہنے والے تھے، اور نواب قطب الدین صاحب اور رحیم داد صاحب خورجوی اور مولوی محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ یہ لوگ میں نے ایسے دیکھے جن کی ولایت کیلئے کسی ثبوت کی ضرورت نہ تھی بلکہ ان کے چہروں ہی سے دیکھنے

والوں کو معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ حضرات اولیاء اللہ ہیں، اس پر میں ایک بات سناتا ہوں۔

"مراد آباد کی شاہی مسجد میں ایک صاحب امام تھے، مجھ کو ان سے بہت محبت تھی اور وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، قرآن بہت اچھا پڑھتے تھے حج بھی بہت کیے تھے، مگر ہمارے بزرگوں کے ساتھ ان کو عقیدت نہ تھی بلکہ کچھ سوئے عقیدت تھی، ایک روز کسی پنجابی صاحب کے یہاں مولوی محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کی دعوت تھی، دعوت میں میں (امیر شاہ خاں) بھی شریک تھا اور وہ امام صاحب بھی۔ اور ہم لوگ دروازے کے قریب بیٹھے تھے جب کھانے سے فراغت ہو چکی تو ہم دونوں باہر آکر کھڑے ہو گئے، تھوڑی دیر میں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی سے باتیں کرتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے نکلے۔ امام صاحب نے جو مولانا کی صورت دیکھی تو آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور کہا کہ مجھے ان حضرات سے ناحق بداعتقادی تھی، ان کی نورانی صورت ان کی ولایت پر خود شاہد ہے، ایسی نورانی صورت خدا کے خاص بندوں کے سوا دوسروں کی نہیں ہو سکتی، اور ان (امام صاحب) پر اس وقت ایک حالت طاری ہوئی جس سے وہ بیتاب ہو گئے اور ہائے ہائے کہتے ہوئے انہوں نے مولانا کے قدم پکڑ لئے اور بہت روئے۔(۱)

ٹھیک فرمایا ہے مولانا روم نے ؎

نور حق ظاہر بود اندر ولی	نیک بیں باشی اگر اہل دلی
مرد حقانی کی پیشانی کا نور	کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

درس مثنوی اور مولانا

ولایت ہی کا نتیجہ تھا اور اس کے ساتھ جذب کا جیسا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خود روایت ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب کے سبق پڑھانے کے وقت آنسو کثرت سے جاری ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ ہم نے چاہا کہ مولانا سے مثنوی شروع کریں تو مہتمم صاحب (مولانا شاہ رفیع الدین صاحب جو کہ خود بھی اولیاء کرام میں سے تھے) نے فرمایا کہ انہیں (مولانا محمد یعقوب

(۱) حکایات اولیاء امیر الروایات ص ۳۳

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو) مدرسے میں بیٹھنے دو گے یا نہیں، اگر مثنوی پڑھانے لگے تو جنگلوں کو نکل جائیں گے آگ بھڑک اٹھے گی۔(۱)

ہم نے علماء اور اخیارؒ کے یہ چند اقوال اور روایات مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق پیش کی ہیں، جن سے قاری کو معلوم ہو گا کہ مولانا کس درجے کے ولی تھے، ایسا ہی ایک اور واقعہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں پڑھا ہے۔ کہ کسی جگہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (غالباً رام پور منیہاران) میں جمع ہوئے، غالباً جمعہ کا دن تھا بستی میں ان کی آمد کی شہرت ہوگئی اور وعظ کہنے کا لوگوں کا پتہ چلا۔ عوام وخواص زیارت اور تقاریر سننے کو آنے لگے، ایک نوجوان لڑکے نے وعظ سننے کا ارادہ کیا، باپ بریلوی مکتبہ فکر کے آدمی تھے انہوں نے بیٹے سے کہا نا بیٹا! ان کا وعظ مت سننا یہ لوگ تو وہابی ہیں، لڑکے نے اصرار کیا تو باپ بھی ہمراہ ہو لئے۔ مبادا کوئی اثر ہو جائے۔ جب اس مسجد میں داخل ہوئے جس میں یہ حضرات ٹھہرے ہوئے تھے تو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ غسل خانہ سے نہا کر باہر نکلے، باپ اور بیٹے دونوں نے دیکھا اور بے ساختہ نورانی چہرہ دیکھ کر کہنے لگے کہ اگر وہابی ایسے ہی ہوتے ہیں تو ہم بھی آج سے وہابی ہیں، غرضیکہ بے ساختہ شیدا ہو گئے یہ ہے ولی کے چہرے کا اثر۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا سلسلہ و شجرۂ مرشدین

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ بیعت اور آپ کے مرشدین کا شجرہ ایسا بابرکت شجرہ ہے جس میں حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شیخ عبد القدوس صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ علاء الدین صابر کلیری، حضرت بابا فرید الدین صاحب گنج شکر، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، شامل ہیں اور جو حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے واسطے سے حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات رحمت صفات پر پہنچ کر ختم ہوتا ہے۔

ایں سلسلۂ طلائے ناب است
ایں خانہ تمام آفتاب است

انہی حضرات کے فیض کا نتیجہ ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مقام ولایت کو

---

(۱) حکایات اولیاء، ص ۳۳۵

پہنچے، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ، مجددیہ، چشتیہ، سہروردیہ اور قادریہ چاروں سلسلوں سے بیعت تھے۔ لیکن چشتیہ صابریہ میں اپنے مریدوں کو بیعت کرتے تھے، اس لئے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی سلسلۂ چشتیہ ہی میں لوگوں کو مرید بناتے تھے۔ سلسلۂ چشتیہ مین سوز و درد، بے قراری اور بے خودی اور فنا زیادہ ہوتی ہے اس لئے مولانا نے بھی اسی سلسلے کو گلے سے لگایا۔

مولانا کے مریدین و مسترشدین

جب حضرت سالک و مجذوب کو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پیر و مرشد کی طرف سے خلافت مل گئی اور اس پر طرہ یہ کہ ولایت کا مقام بھی حاصل ہوا تو آپ کے مریدین اور عقیدت مندوں کا سلسلہ بھی روز افزوں ہوا، ظاہر ہے کہ ؎

ہر کجا چشمہ بود شیریں   ملخ و مرغ و مور گرد آیند
کس نہ بیند کہ تشنگان حجاز   بلب آب شور گرد آیند

آپ کے برادر زادہ امیر احمد عشرتی نانوتوی مقدمہ بیاض یعقوبی کے اول میں لکھتے ہیں۔

"آپ کے شاگرد و مرید اچھے اچھے مشاہیر بنگال، پنجاب، پشاور، پورب وغیرہ میں بے شمار موجود ہیں" (آغاز کتاب)

صاف ظاہر ہے کہ جہاں شاگرد بہت سے تھے مرید بھی بہت سے تھے، خود اپنے ایک مکتوب میں جو پینتیسواں مکتوب ہے اور جو ۱۳ر جمادی الاخری ۱۳۰۰ھ کو اپنے مرید منشی محمد قاسم نیانگری کو لکھا ہے تحریر فرماتے ہیں، اس ناکارہ سے اپنے بعض اقرباء اور بعض اجنبی عورتیں بہت بیعت ہوئی ہیں۔ (۱)

یہ جو مولانا کی عبارت میں بہت کا لفظ ہے امیر احمد صاحب عشرتی کے بے شمار لفظ کے قریب قریب ہے، مقصد یہ ہے کہ آپ کا حلقۂ مریدین بہت وسیع تھا، ان میں بہت سے آپ کے خلفا بھی ہوں گے۔ خود منشی محمد قاسم نیانگری کو انکے تزکیۂ نفس اور مجاہدے اور ریاضت اور عبادت کے بعد اپنی خلافت عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ جسے یہ مرتبہ عطا فرمائے۔ منشی محمد قاسم صاحب کچہری میں منشی

---

(۱) مکتوب ۳۵ ص ۸۵

نظر آتے ہیں اور بعض اوقات روزی کے دوسرے ذرائع بھی اختیار کئے ہیں، لیکن مرشد کامل کی بدولت خلافت سے سرفراز ہوئے، اپنے آپ خلافت دینے کے باوجود اپنے مرشد کامل حضرت حاجی امداد اللہؒ کو بھی تحریر فرمایا ہے کہ آپ اپنی طرف سے بھی اجازت خلافت عطا فرما کر سرفراز فرمائیے۔

وظائف واوراد فرمودہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ

اچھے خواب کے لئے وظیفہ بوقت شب سوتے وقت

"اور سوتے وقت آیۃ الکرسی عظیم تک اور درود شریف اور الم نشرح سترہ بار اور سبحان اللہ ۳۳ بار اور الحمدللہ ۳۳ بار اور اللہ اکبر ۳۴ بار پڑھا کرے، اس کی برکت سے اچھی خوابیں آیا کریں گی...... باقی زیارت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہ وقت اور نصیب پر منحصر ہے" (۱)

کشائش رزق کے لئے وظیفہ

ترقی رزق کے لئے بعد نماز عشاء تنہا بیٹھ کر یاوھاب چودہ سو چودہ بار پڑھے، اور بعد اس کے یہ دعا سو بار پڑھے " یاوھاب ھب لی من نعمة الدنیا والآخرة انك انت الوھاب. اور سورۂ اذاجآء نصر اللہ (پوری سورت) بعد نماز صبح ۲۱ بار، اول و آخر درود ۲۱ بار بعد ظہر ۲۲ بار (اذاجاء نصر اللہ) اور بعد عصر ۲۳ بار اور بعد مغرب ۲۴ بار اور بعد عشا ۲۵ بار اول و آخر درود (۱۱ مرتبہ) برابر پڑھے، یہ دونوں وظیفے بے کسی شرط کے مداومت کرے، انشاء اللہ رزق واسع ملے گا، (۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کا وظیفہ

منشی محمد قاسم صاحب کی خواہش تھی کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھیں، مولانا نے حسب ذیل عمل کی تلقین کی۔

"تم نے جو درباب زیارت (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے لکھا ہے۔ اے برادر

---

(۱) مکتوب سوم   (۲) مکتوبات یعقوبی

یہ دولت عظیم نصیب سے ملتی ہے اور عمل اعمال سب بہانے ہیں۔ یہ درود شریف ورد کرو شاید نصیب جاگ جاوے احقر کو بھی یاد رکھیو، اگر وہ دولت میسر ہو۔ یہ بے نصیب اب تک اس نعمت سے بے نصیب رہا ہے اور اپنے اندر قابلیت ایسی نہیں رکھتا کہ اس کی آرزو کروں، درود شریف یہ ہے **اللھم صل علی سیدنا محمد النبی الامی وعلی والہ واصحابہ وسلم** ایک سوایک بار بعد نماز عشاء کے پڑھ لیا کرو، کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ نعمت نصیب فرمائے۔(۱)

راقم الحروف کو زیارت نبوی ﷺ کا خواب میں شرف

آج ۲۵ دسمبر ۱۹۷۳ء مطابق ۲۹ ذی قعدہ ۱۳۹۳ھ ہے، اب سے دس بارہ سال پہلے راقم الحروف انوار الحسن نے خواب میں دیکھا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے روضۂ اطہر پر کھڑا ہوں، دل میں اس خواہش نے ہیجان برپا کر دیا کہ حضور ﷺ کا چہرۂ انور دیکھوں، ناگاہ کیا ہوا کہ مزار پر سے ملبہ مٹی وغیرہ علیحدہ ہونی شروع ہوگئی اور آپ کا شدید سفید کفن میں چھپا ہوا جسد اطہر نظر آیا۔ پھر خواہش ہوئی کہ کاش چہرۂ انور سے کفن ہٹ جائے، چنانچہ کفن کا حجاب روئے روشن سے ہٹ گیا اور رخ روشن نظر آیا، مگر آپ خواب راحت میں مشغول تھے اور آپ کی آنکھیں بند تھیں، میری خواہش تھی کہ کاش سرکار مدینہ ﷺ آنکھیں کھولیں، اچانک آپ کی آنکھیں کھل گئیں، اور سیدھی مجھ پر پڑیں، میں نے فوراً ہی کہا "السلام علیکم یا رسول اللہ "حضور نے ارشاد فرمایا "وعلیکم السلام "پھر سرکار مدینہ ﷺ اٹھ بیٹھے درانحالیکہ آپ کے کفن کی چادر ناف تک نیچے ہوگئی مگر جسم کپڑے سے چھپا ہوا تھا، سر ننگا تھا اور اس پر پٹھے نظر آرہے تھے، ریش مبارک مقطع تھی، بیٹھ کر ارشاد فرمایا تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ حضور والا میں شیر کوٹ کا رہنے والا ہوں۔ میرے ہمراہ میرا چچازاد بھائی مشیر الحسن بھی پیچھے کھڑا تھا، حضور نے اس کے متعلق بھی پوچھا یہ کون ہیں؟ میں نے اس سوال کا جواب دیا فرمایا کبھی کبھی آیا کرو، (خواب ختم ہوا) اس خواب نے جو سرور بخشا اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے، میں نے حضور ﷺ کو آپ ہی کی شکل میں دیکھا، آپ کا ارشاد مبارک ہے کہ من رانی فقد

---

(۱) مکتوب ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۸ھ ص ۵۸

رانی جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے مجھے ہی دیکھا، ابن سیرین نے جو رویا اور خواب کی تعبیرات کے بڑے ماہر ہیں، حدیث من رانی فقد رانی کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ من رانی کما انا فقد رانی یعنی جس نے مجھے خواب میں جیسا کہ میری شکل وصورت ہے اسی شکل میں دیکھا تو وہ میں ہی ہوں گا اور کوئی نہیں ہو سکے گا کہ شیطان ہو سکے یا اور کوئی۔ بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنا بڑی ہی خوش نصیبی ہے اس موقعہ پر مولانا عبدالرحمن جامی کے وہ اشعار یاد آرہے ہیں جن میں انہوں نے لکھا ہے ۔

زمہجوری بر آمد جان عالم ترحم یا نبی اللہ ترحم
نہ آخر رحمۃ للعالمینی محروماں چرا غافل نشینی
زخواب اے لالہ سیراب برخیز چو نرگس خواب چند زخواب برخیز
بروں آور سر از برد لیمانی کہ روئے تست صبح زندگانی
ادیم طائفین نعلین پاکن شراک از رشتۂ جان ہائے ماکن

دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنے کے وظائف

دفع اعداء کیلئے اللھم انا نجعلك في نحور هم ونعوذبك من شرور هم (اے اللہ ہم تجھے دشمنوں کے مقابلے میں کرتے ہیں اور ان کے شر سے تیری ہم پناہ مانگتے ہیں،) ہر نماز کے بعد تین بار پڑھ لیا کریں، اور سورۂ لایلفِ قُریش ستر بار ہر شب پڑھیں اور اگر آیت کریمہ لا الہ الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین کا ختم چند آدمی مل کر جتنے دن میں ہو سکے سوا لاکھ مرتبہ پڑھ لیں تو بہت نافع ہو۔(۱)

ترقی رزق کا وظیفہ

"میاں غلام حسین کی تنخواہ کم ہونے سے رنج ہوا اللہ تعالیٰ روزی میں فراخ عطا فرماوے، استعفیٰ دینا مناسب نہیں، کیا عجب ہے کہ پھر صورت ترقی کی ہو جاوے، یا مغنی گیارہ سو بار اور سورہ مزمل گیارہ بار چند روز وظیفہ کرلیں۔(۲)

(۱) مکتوب ۲۴ ص ۶۴ (۲) ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ مکتوب ۱۴۱ ص ۹۳

حاکم کے سامنے جانے یا مقدمے میں کامیابی کا وظیفہ

تعویذ کے لئے لکھا ہے، یوں چاہئے کہ مابین سنت وفرض وقت فجر کے سورۂ فاتحہ ۴۱ بار پڑھ لیا کرو یہ وظیفہ دائمی ہے اور بعد مغرب سورۂ واقعہ اور جب حاکم کے سامنے جاؤ، واللّٰہ المستعان علی ما تصفون۔ اس آیت کو گیارہ مرتبہ پڑھ کر اور شہادت کی انگلی پر دم کر کے ماتھے پر الف کھینچ لو۔(۱)

فوائد واثرات سورۂ فاتحہ

"منشی محمد قاسم صاحب کو ان کے استفسار پر سورۂ فاتحہ کے فوائد کے بارے میں مولانا صاحب لکھتے ہیں۔

"تم نے فوائد سورۂ فاتحہ کے پوچھے۔ یہ سورت ہر حاجت دینی ہو یا دنیوی کیلئے مفید ہے اور سلوک میں معین (مددگار) ہوتی ہے اور درود شریف ہر وظیفے کے اول وآخر تین بار یا سات بار یا گیارہ بار پڑھ لینا بہتر اور افضل ہے،(۲)

(نوٹ) غالباً بھورے میاں کو صبح کی دوسنتوں اور فرضوں کے درمیان اکتالیس مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھنے کے وظیفے کے فوائد منشی محمد قاسم صاحب نے پوچھے ہوں گے، لہٰذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس دنیاوی یا دینی مقصد کے لئے صبح کی سنتوں اور فرض کے درمیان اول وآخر گیارہ مرتبہ درود شریف اور درمیان میں اکتالیس مرتبہ فاتحہ پڑھیں تو یہ وظیفہ بہت مؤثر ہے،

مولانا کو تعبیر خواب کا ملکہ

روحانیت کے ضمن میں خواب اور ان کی تعبیرات کا سلسلہ بھی آتا ہے، اس خصوصی حقیقت کا بھی مولانا کی سیرت سے خاص علاقہ ہے، اس لئے اس کو نظر انداز کرنا مشکل ہے تو سنئے، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تعبیر خواب کا فطری ملکہ تھا، مولانا کی بتائی ہوئی کتنے خوابوں کی تعبیریں حرف حقیقت کی طرح صحیح دکھائی دی ہیں اور آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوئی ہیں اور ان کا دل روشن اور دماغ صاف تھا، اس بنا لئے خواب کی تعبیر میں دقت نہیں ہوتی

---

(۱) مکتوب ۴۶ ص ۹۷ (۲) مکتوب ۴۸ ص ۹۹

تھی، علماء نے خواب اور ان کی تعبیرات پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، عالم خواب یا عالم رویا واقعی ایک عجیب دنیا ہے اللہ تعالیٰ اس دنیا کی جسے بھی معرفت نصیب فرمائے۔ بلکہ حدیث میں تو رویائے صادقہ کو نبوت کا چالیسواں حصہ قرار دیا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب کی تعبیر میں جو مہارت اور ملکہ تھا اس پر خود قرآن کریم صادق گواہ ہے۔ انہوں نے خواب میں گیارہ ستاروں اور چاند سورج کو اپنے لئے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا اور اپنے پدر بزرگوار حضرت یعقوب علیہ السلام سے بیان کیا، جنہوں نے بیٹے کو اس خواب کے بیان کرنے سے منع کر دیا مبادا بھائیوں کی طرف سے کوئی گزند پہنچے، آخر یہ خواب اس وقت ظہور میں آیا جبکہ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام مصر میں اقتدار پر آئے اور والدین اور بھائی ان سے ملاقات کے لئے پہنچے اور سب آداب بجا لائے، بعد ازاں حاکم مصر کا وہ خواب کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات پتلی دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات گندم کے سبز اور سات خشک خوشوں کے بارے میں تعبیر کس قدر صاف اور روشن ہو کر سامنے آئی جو یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بتائی تھی، غرض کہ خواب کی دنیا اور تعبیر کی دنیا بھی عجب دنیا ہے۔

تعبیر خواب کے لئے جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا روشن قلب اور روشن ضمیر کی ضرورت ہے جو مولانا محمد یعقوب صاحب کو حاصل تھا، مولانا کے مرید منشی محمد قاسم اپنے اور دوسرے ملنے والوں کے خوابوں کی تعبیریں پوچھتے رہتے تھے رضا شاہ صاحب کوئی صاحب ہیں، ان کے خواب لکھ کر ان کی تعبیرات انہوں نے مولانا سے چاہیں تو مولانا نے لکھا،

> "تعبیر کے لئے مرتبۂ کشف چاہئے تاکہ سمجھے کہ حقائق نے غیب سے کیا صورت پکڑ کر ظہور کیا ہے اور تلوینات (رنگارنگی) ان کی کس طور ہوئی ہے، اور پھر عالم خیال نے اس کی کیا صورت بنا دی ہے، اور اصل غیبی علم کتنا ہے اور ملاوِ خیال کا کتنا ہے" (۱)

اس عبارت میں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خواب اور اس کی تعبیر کی صحت کے بارے میں سب کچھ ہی تو بتا دیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ خواب کی تعبیر کیلئے کشف کی ضرورت ہے اس لئے خواب کی تعبیر مشکل ہے۔ راقم الحروف نے ۲۹/۳۰ر دسمبر ۱۹۷۳ء کی درمیانی رات کہ میں لاہور گیا ہوا تھا خواب دیکھا کہ:۔ ایک مکان ہے اس کے پچھلے حصے میں صحن

---

(۱) مکتوبات یعقوبی مکتوب ۳۲ ص ۸۲

ہے اس میں دو قبریں ہیں ایک قبر بڑی ہے اور دوسری چھوٹی، بڑی قبر کا کچھ حصہ پاؤں کی طرف سے کھلا ہوا ہے کہ مردہ نظر آرہا ہے۔ مردے کا منہ ڈھکا ہوا ہے لیکن گردن سے خون بہ رہا ہے اور کفن رنگین ہوتا نظر آرہا ہے۔ لاش سے بہت ہی آہستہ سے سانس جاری ہے گویا سسک رہی ہے، اس کے داہنے بازو کے پاس ایک کلہاڑی رکھی ہے جیسی قصابوں کے پاس جھوٹے دستے اور چھوڑے پھل کی ہوتی ہے، چھوٹی قبر بالکل بند ہے، میں نے یہ خواب کراچی کے سفر اور دوران قیام فروری ۱۹۷۳ء میں مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی (مدرس ومفتی جامعہ عربیہ واقع، نیوٹاؤن جامع مسجد کراچی) سے بیان کیا تو فوراً بول اٹھے، کہ یہ خواب ملک پاکستان کے دونوں حصوں کی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ یہ سنتے ہی میں سمجھا کہ بڑی قبر کا مردہ مشرقی پاکستان ہے جو بھارت کے ہاتھوں قتل ہوا، مگر ابھی لاش سسک رہی ہے اور کلہاڑی بھارت کی قصابی کا نشان ہے۔ اور چھوٹی قبر پاکستان کا مغربی حصہ ہے جو مشرقی پاکستان کی آبادی سے کم ہے، کیونکہ مشرقی پاکستان کی آبادی چھ سات کروڑ اور مغربی پاکستان کی پانچ چھ کروڑ تھی، بہرحال دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان پر بھارت نے جارحانہ حملہ کیا تھا، اور اس کو جدا کر دیا تھا، خواب کی یہ تعبیر لے کر میرا دل اس کی صحت پر جم گیا، حالانکہ میں نے یہ سمجھا تھا کہ مجھے قبر کا عذاب دکھایا گیا ہے جو یوں بھی ہو سکتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ استاذ محترم ولی اللہ مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندیؒ نے "تعبیر نامہ خواب" ایک رسالہ لکھا ہے۔ جس میں خواب اور تعبیر خواب کے بارے میں ضرورت کی تمام باتیں بتائی ہیں وہ مطالعہ کیجئے، بزرگان دین فرماتے ہیں کہ اپنا خواب ہرکس وناکس سے نہ کہنا چاہئے، مبادا وہ کوئی ایسی تعبیر بتائے، جو مہلک ہو تو ایسا ہو جانا ممکن ہو جاتا ہے۔ بلکہ اپنے خواب کی اپنے دل میں اچھی تعبیر کر کے خاموش ہو رہے، ہاں کسی مشفق اور ہمدرد روحانی بزرگ سے بیان کر کے اس کی تعبیر معلوم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، المختصر مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ چونکہ صاحب کشف تھے اس لئے انکو تعبیر خواب کا بڑا ملکہ تھا، مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں۔

"آج کل خوابوں کا بازار بہت گرم ہے، بیداری کی ایک بات بھی نہیں، خواب کو بڑی مہتم بالشان چیز اور تعبیر دینے کو بزرگی کے لوازم میں سے سمجھتے ہیں۔ حالانکہ نہ ہر معبر (تعبیر بیان کرنے والے) کا بزرگ ہونا ضروری اور نہ بزرگ کا معبر ہونا ضروری۔ اس کو بزرگی سے کوئی تعلق نہیں، یہ ایک مستقل فن

ہے۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ ابو جہل بہت بڑا معبّر تھا، بعض لوگوں کو تعبیر سے فطری مناسبت ہوتی ہے خواہ بزرگ ہو یا نہ ہو، اور بعض کو نہیں ہوتی چنانچہ مجھ کو اس فن سے مناسبت نہیں، ہمارے حضرات میں سے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے ایک شخص نے اپنا خواب بیان کیا کہ میری گود میں ایک چھوٹی سی لڑکی ہے مگر بہت وزنی ہے جس کو میں اٹھا نہیں سکتا، میں اس فکر میں ہوں کہ اس کو کہاں رکھ دوں، میں نے دیکھا کہ ایک کتیا ہے میں نے اس کا پیٹ چاک کر کے اس میں اس لڑکی کو رکھ کر سی دیا اور گھر کو چل دیا۔ مگر چونکہ اس کتیا کے پیٹ میں میری لڑکی رکھی ہوئی تھی اس لئے میں اس کو بار بار مڑ کر دیکھتا تھا کہ ساتھ بھی ہے یا نہیں؟ تھوڑی دیر وہ میرے ساتھ رہی پھر غائب ہوگئی، جس کا مجھ کو قلق ہے۔ یہ خواب تھا حضرت مولانا (محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ) نے بتایا کہ اس وقت تعبیر سمجھ میں نہیں آئی پھر کسی وقت آنا شاید سمجھ میں آجاوے۔ وہ پھر دوسرے وقت آیا۔ فرمایا کہ: بغیر فکر بے ساختہ سمجھ میں آ گئی، لڑکی کا وزنی ہونا مادۂ منویہ کا زور ہے جو نا قابل برداشت تھا۔ اور وہ کتیا بازاری عورت ہے تم نے اس سے منہ کالا کیا اس کو حمل قرار پا گیا جس سے لڑکی پیدا ہوئی، اس عورت نے چند روز تمہارا ساتھ دیا۔ مگر اب وہ تم سے بے زار ہے یہ واقعہ تھا جس کو سن کر وہ شخص سرنگوں ہوگیا۔" (اور شرمندہ ہوگیا)

اس خواب اور اسکی تعبیر میں مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے ذہن رسا اور قلب سلیم نے جو مطابقت پیدا کی ہے وہ کس قدر حیرت انگیز ہے۔ مولانا تھانوی نے اپنے ملفوظات میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی ایک تعبیر اور مولانا محمد منیر صاحب سابق مہتمم دار العلوم دیو بند و برادر حقیقی مولانا احسن نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خواب کے متعلق کتنی حقیقت افروز بات بیان کی ہے لکھتے ہیں۔

"مولوی محمد منیر صاحب نے خواب دیکھا کہ بریلی کی طرف سے کچھ بطخیں ہمارے گھر میں آتی ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ خواب بیان کیا، حضرت نے تعبیر بیان فرمائی کہ بریلی کی ملازمت آئے گی اور تنخواہ کی نسبت فرمایا کہ کہو تو گیارہ روپیہ کی تعبیر دوں اور اگر مٹھائی دو تو بیس روپیہ کی تعبیر دوں۔ انہوں نے کہا کہ مٹھائی لے لیجئے اور بیس روپے دلوا دیجئے۔ چنانچہ بیس روپیہ

کی تنخواہ پر بریلی کے اسکول میں ملازمت مل گئی اور گیارہ اور بیس کی حقیقت یہ فرمائی کہ بط عربی لفظ ہے اور بط مشدد (بطّ) ہے اور فارسی میں بلا تشدید (بَطْ) مستعمل ہے۔ تو اول استعمال پر ط کو مکرر لینے پر اٹھارہ کا عدد حاصل ہوگا اور دو (عدد بحروف ابجد) ب کے سب بیس ہوئے۔ اور ثانی استعمال پر کے (ط) نو اور دو کے (ب) کل گیارہ ہوئے۔ یہ معبّر کے اعتبار پر ہے، ملفوظات حصہ چہارم ملفوظ (۴) مذکورہ خواب کی تعبیر دوں اور کہو تو بیس کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعبیر دینے والے پر خواب کی تعبیر کا بہت کچھ دار و مدار ہوتا ہے اس لئے ہرکس و ناکس سے خواب کی تعبیر معلوم نہیں کرنی چاہئے، مذکورہ خواب اور اس کی تعبیر مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روشنی کا نتیجہ ہے تاہم شرعی حیثیت سے خواب حجت نہیں، اگر کوئی خواب کی تعبیر نہ سمجھے یا نہ پوچھے یا خواب ہی نہ دیکھے تو کیا مضائقہ ہے، بقول مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اصل چیز تو عبدیت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نصیب کرے (انوار) الغرض حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ خواب کی تعبیر بیان کرنے کا بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ حضرت مولانا تھانوی سے منقول ہے انہوں نے فرمایا کہ۔

۱۔ "پہلے مدرسہ دیوبند کے کچے مکان تھے۔ (پھونس کے) چھپر پڑے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نے خواب کے دوران جنت میں کچے مکانات دیکھے جس سے تعجب ہوا کہ جنت میں اور کچے مکان! پھر ان چھپروں پر دفعۃً نظر پڑی، تعبیر سمجھ میں آئی کہ یہ مکانات مقبول ہیں (۱)

۲۔ منشی محمد قاسم نے کوئی ایسا خواب دیکھا ہے جس میں بکری کا راہ میں ملنا، ٹیلا، اس پر گھاس، تالاب، چشمہ جاری وغیرہا خواب میں نظر آئے ہیں، سالک و مجذوب خواب کی یوں تعبیر فرماتے ہیں۔

"بکری کا ملنا راہ میں اشارہ برکت کی طرف ہے سلوک میں برکت ہوگی۔ تالاب اشارہ جماعت علماء کی طرف ہے، چشمہ جاری درویش ہے جاری چشموں سے تالاب کو مدد ہوتی ہے جاری پانی تم کو ہاتھ آیا، انشاء اللہ تعالیٰ فیض

(۱) الامداد رجب ۱۳۵۷ نمبر ۳۰

باطن کا پہنچے گا۔ ٹیلا پہاڑ کا اشارہ ہے، بلند مقامات باطنی کی طرف اور گھاس اس پر یہ احوال ہیں اس ٹیلے پر چڑھنا بمدد لا الٰہ الا اللہ کے ہے۔ جتنا توحید میں قدم راسخ ہوا تنا ہی اس پہاڑ کا چڑھنا آسان ہو، اور آواز قلبی مرشد کی ہدایت ہے کہ وہ مظہر اسم ہادی کا ہے اور فیض اس کا ہر دم طالبوں کو پہنچتا ہے اور ہر حاجت کے وقت امداد کرتا ہے۔ خواب امید ہے کہ موجب برکات کا ہو۔"(۱)

میاں محمد اسماعیل کے خواب اور ان کی تعبیر

میاں محمد اسماعیل کوئی صاحب منشی محمد قاسم نیا نگری کے ہم وطن معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے خواب دیکھے ہیں جن کا اظہار منشی محمد قاسم صاحب نے کیا ہے اور تعبیر چاہی۔ مولانا لکھتے ہیں "میاں محمد اسماعیل کو بعد سلام کے ان کے خوابوں کی تعبیر واضح ہو، یہ جو قبر میں سے چنگاریاں نکلنا اور اپنی پشت پر لگ جانا دیکھا ہے یہ تنبیہ اس بات کی طرف ہے کہ عذاب قبر جیسا تم نے دیکھا ہولناک ہے اور اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہیۓ۔

عذاب قبر سے نجات کی صورت مولانا کے الفاظ میں

سورۂ تبارك الذی بیده الملك کو رات کو ایک بار ہر روز وظیفہ کرنا عذاب قبر سے نجات دینے والا ہے پڑھا کرو، اور دوسرے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ مردے مع ہمارے مسجد میں نماز پڑھ رہے ہیں انشاء اللہ تعالٰی وہ لوگ مغفور ہوئے اور تم بھی ان کیساتھ مغفور (بخشے گئے) ہوئے، اور خوبصورت عورت مع بچے کے دنیا ہے اور اسکا پاؤں آلودہ، قاسم کے کپڑے پر رکھ دینا اور اشارہ قدرے آلودگی دنیا سے ہے اور اس کا پھر چلے جانا بہت مبارک ہے کہ اس ناپاک سے اللہ نے نجات دی۔

قبروں میں آگ جلنے اور دھواں نکلنے کی تعبیر

اوّل تیسرے خواب میں قبروں میں آگ جلتی اور دھواں نکلتے دیکھا وہ اوّل خواب کی مانند (یعنی عذاب قبر کی) اور تعمیر مسجد کے خیال سے اور کنکھجورہ اور سانپ یہ مال دنیا ہے۔ اس کا مار ڈالنا حاصل ہونا (روزی کا) بوجہ حلال ہے کہ کچھ ضرر نہ دے۔(۲)

---

(۱) مکتوب ۳۰۔ ص ۵۷ مکتوب یعقوبی (۲) مکتوب ۱۷، موصولہ ۳، شوال ۱۳۰۱ھ ص ۸۹۔ ۹۰

مکانات اور درخت اور حضرت عمرؓ کی جماعت میں سے دو فریق کا اڑا ہوا دیکھنا

"مکانات اور درخت اڑتے ہوئے دیکھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جماعت میں سے سنا کہ دو فریق اڑ گئے ایک رہ گیا،، بندے کے خیال ناقص میں یہ برکات کا اُٹھ جانا ہے ہر چیز میں بعض اجزا پر برکت منحصر ہوتی ہے جس سے نفع اس کا ظہور کرتا ہے۔ اور برابر گرد باد (بگولہ) کے اڑے چلے جارہے ہیں اور جو کچھ کمی بیشی کی نسبت کہیں کچھ قیام ہے وہ کسی اچھے بندے کی ؛ ولت ہے۔"(۱)

امام مہدی سے مرید کی خواب میں ملاقات اور اس کی تعبیر "اور ملاقات امام مہدی کی (خواب میں) کیا عجب ہے نصیب ہو کیونکہ علامات اس کی بہت ظاہر ہیں اور یہ لازم کہ تمام اہل خدمت اور اولیاء اللہ معلوم ہو یا نہ ہو اس زمانے میں وہاں (امام مہدی کے پاس) پہنچ جاویں گے، اس لشکر میں سائیس تک ولی کامل ہوگا" واللہ اعلم (۲)

آسمان کا اوپر گرنا اور کچھ ضرر نہ ہونا

"دوسرے خواب میں قابل تعبیر یہ بات ہے کہ آسمان اوپر گرا اور کچھ نہ معلوم ہوا یہ اشارہ اسی امر کی طرف ہے کہ نافرمانی خداوندی ایسی ہے کہ جیسے آسمان سر پر گرا اور آدمیوں پر وہ ایسا آسان ہے جیسے گالا۔ حدیث میں آتا ہے کہ لوگ گناہ کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے مکھی آئی اور ناک پر بیٹھی اور اس کو اڑا دیا۔ اور جو آواز غیبی ہوئی وہ توفیق منجانب اللہ ہے اور تائید آسمانی ہے جس نے ایسے تنگ وقت میں دستگیری کی۔ ورنہ ایمان کھویا جانا عجب نہ تھا" (۳)

"ایک خط میں مرید عقیدت مند نے چند خوابوں کی تعبیریں پوچھی تھیں خواب کیا تھے ان کی حقیقت اور صورت مولانا کے جوابات سے ملتی ہے تحریر فرماتے ہیں۔"

ایک لڑکے کی جگہ قید ہونا

"پہلے خط میں چند خوابیں تعبیر طلب تھیں، ان میں ایک قید ہونا بجائے ایک لڑکے کے یہ

(۱) مکتوب ۳۲، ص ۸۳ مکتوبات یعقوبی (۲) مکتوب ۲۴، ص ۸۳ (۳) مکتوب ۲۴ ص ۸۴

لڑکا نفس امارہ ہے اور قید ثابتی (ثبات قدمی) دین پر ہے کہ بجائے اس کے خود اپنے اوپر آدمی یہ بوجھ اٹھاتا ہے"

وضو کرنا خواب میں اور ناپاک پانی معلوم ہونا،

"اور وضو کا کرنا طہارت اور صفائی اور ناپاک پانی معلوم ہونا آلودگی دنیا کی ہے کہ پھر اس سے بھی اللہ نے طہارت نصیب کی بہت عمدہ خواب ہے۔

ستاروں اور چاند کا خواب میں دیکھنا

"ستاروں اور چاند کا خواب میں دیکھنا یہ انوار ذکر (اللہ) کے ہیں مبارک ہے۔"

بلند دروازہ اور چشمۂ جاری خواب میں دیکھنا

"اور دروازہ بلند بنائے دین ہے اور اس کا رخ شرق و غرب کو جانب قبلہ اور چشمۂ جاری علم ہے اور انشاء اللہ اب کام دین کا چل نکلا۔(۱)

اونچی جگہ سے گرنے کا خوف اور کسی بزرگ کی مدد سے نیچے اتر آنا اور آفتاب کا نور خواب میں دیکھنا" اونچے مکان سے جہاں گرنے کا خوف تھا کسی بزرگ کی مدد سے نیچے اُتر آئے انشاء اللہ تعالیٰ بزرگوں کی پناہ میں ہر قسم کے مکروہات سے محفوظ رہو گے، اور آفتاب کا نور، نور مرشد وہادی ہے جو ہر وقت مربی ہے۔

گائے کی بچھیا نے ٹوپی کھالی، آفتاب نور کا اور دودھ کا دیکھنا

"بچھیا نے ٹوپی کھالی، یہ نفس امارہ ہے کہ درپئے خرابی ہے اچھا کیا کہ اس کو کھانے کی طرف لگادیا، نفس کی خواہش کچھ پوری کر دینا اس کے تقاضے سے چھوٹ جاتا ہے، دودھ فیض خداوندی ہے کہ انشاء اللہ بہت کچھ پہنچے گا اور امید ہے کہ چشمۂ ہدایت تم سے جاری ہو اور بہت خلق کو تمہاری ذات سے فیض ملے، اللہ کریم کی بارگاہ میں کیا کمی ہے اور اس کے نزدیک کیا مشکل ہے۔ یہ عاجز درماندہ دور افتادہ امید وار دعا ہے۔"

---

(۱) مکتوب ۵۶، ص ۱۱۴، مکتوبات یعقوبی

پہاڑ پر چڑھنا اور اترنا اور وقت عصر کو خواب میں دیکھنا

"پہاڑ مقام شہادت ہے اور نیچے اترنا مقام عبودیت اور عجز ہے اور وقت عصر یہ آخر زمانے کی طرف اشارہ ہے، انشاء اللہ تعالیٰ ترقی روز افزوں ہو اور آخر نہایت عمدہ ہو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ایسا ہی کرے۔"

بجلی کا گرنا، سر کا تلوار سے کاٹ ڈالنا، نعرہ الا اللہ کا مرتے وقت نکلنا

اور یہ جو دیکھا ہے کہ مجھ پر بجلی گری ہے یہ اثر ذکر کا ظہور ہے **اللّٰھم زد فزد** ۔ اور یہ جو دیکھا کہ سر تلوار سے کاٹ ڈالا یہ اشارہ دفع اوصاف ذمیمہ کی طرف ہے۔ اور نعرہ الا اللہ کا نکلنا (مرتے وقت) ایسے وقت اور گر جانا مبارک ہو، اس سے بہتر آدمی کو اور کیا ہے کہ بوقت مرنے کے یاد خدا زبان پر ہو اور دل سے ہو، **الحمد للہ** کہ اثر ذکر کا شروع ہوگیا۔

دہلی کی جامع مسجد کے اندر سے صاف پانی بہتا ہوا خواب میں دیکھنا اور اس کی تعبیر

مولانا کے مکتوب ۶۴ میں خواب کی تعبیر ہے جو منشی محمد قاسم کے کسی دوست نے دیکھا تھا۔ دوست نے یہ خواب خط میں لکھ کر منشی جی کو دیا اور انہوں نے تعبیر کیلئے مولانا کے پاس بھیج دیا۔

خط مشتملہ خواب

جناب مولانا محمد یعقوب صاحب دام عنایتکم بعد سلام علیک کے واضح ہووے کہ تاریخ ۲۲/ ماہ ذیقعدہ ماہ حال کو بعد پڑھنے نماز ظہر میں سویا ہوا تھا۔ خواب آیا کہ دہلی کی جامع مسجد میں باہر کے دروازے پر میں کھڑا ہوں منہ قطب رخ تھا پشت طرف جنوب تھی، میں نے وہاں دیکھا کہ مسجد کے اندر سے پانی صاف اور نفیس بہتا ہے اور طرف مغرب سے بہہ کر طرف مشرق کو جاتا ہے۔ پانی ہر دم ہر طرف سے جاتا ہے اور جو حوض ہیں ان کے اوپر ہو کر پانی برابر بہتا ہے، دیوار شمال و جنوب کی چھوڑ کر در کے اندر سے پانی نکلتا ہے اور برابر بہتا ہے۔ فقط

جواب از حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ

حضرت مولانا جواب میں خواب کی تعبیر اس طرح بیان فرماتے ہیں "جامع مسجد دہلی اس کی یہ تعبیر ہے کہ دہلی ہندوستان کی دار السلطنت اور اصل ہے۔ اور مسجد جگہ دین کی اور جامع مسجد جو سب مسلمانوں کو عام ہو پانی بہنا صاف شفاف ترقی باطنی اور ظاہری ہے کہ حالات ہندوستان کے مسلمانوں کے مبدل ہوں ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی فقط۔ اور یہ فیض مغرب کی طرف سے آوے گا(۱)

یہاں پہنچ کر مکتوبات یعقوبی ختم ہو جاتے ہیں اور یہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا چونسٹھواں مکتوب ہے جو ان کے مرید منشی محمد قاسم کے نام تعبیر خواب سے متعلق ہے، لہٰذا اس مکتوب پر پہنچ کر ہمارا تعبیر ہائے خواب کا ماخذ ختم ہو جاتا ہے۔

علمی مقام

گزشتہ اوراق میں ہم نے آپ کی زندگی کے حالات پر جو معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے اس مرحلے سے گزر کر آپ کے علمی مقامات کے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں، ہمارے نزدیک صحیح معنی میں کسی کی زندگی اور شخصی سیرت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ سیرت ہے۔ اس لئے ہم آپ کی علمی سیرت کی طرف متوجہ ہو کر آپ کو استفادے کا موقع دیتے ہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا علمی مقام اس امر سے واضح ہونا آسان ہے کہ آپ کو مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دار العلوم دیوبند کا صدر مدرس منتخب کیا تھا، صدارت کے عہدے پر رہنا کسی معمولی اہل علم کا کام نہیں ہے، بخاری شریف اور حدیث کی اعلیٰ کتابیں پڑھانا صدر مدرس کے فرائض کی کڑیاں ہوتی ہیں اور اس حالت میں جبکہ آپکے شاگرد بھی شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا احمد حسن صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے ذکی اور ذہین ہوں تو صدارت تدریس کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے، عشرتی صاحب لکھتے ہیں۔

"آپ کے صدہا مرید اور شاگرد اور آپ کے شاگردوں کے شاگرد، ہندوستان، کابل، بخارا وغیرہ میں موجود ہیں، آپ جمیع علوم معقول اور منقول میں فاضل اجل اور عالم متبحر ہونے کے علاوہ سالک و مجذوب بھی تھے،

---

(۱) مکتوب یعقوبی ۶۴، ص ۱۲۴

باطنی طبیب ہونے کے علاوہ ظاہری امراض کا بھی علاج فرماتے تھے“ (۱)

مولانا کے علم وفضل سلوک وجذب کے متعلق اگرچہ ہم اس کتاب میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں، لیکن حقیقت حقیقت بن کر سامنے آتی ہے اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا اپنے دور کے بلند پایہ مفسر، محدث، فقیہ اور عالم علوم عقلیہ ونقلیہ اور مرشد کامل تھے، آپ کے حالات پڑھنے سے قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ امور دنیا میں بھی ان کے مشورے نہایت ہی قیمتی تھے، مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات جو معلومات کا ایک بیش بہا اور لازوال خزانہ ہیں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکمل سوانح زندگی ہیں۔ ان میں جا بجا مولانا کے علم وفضل، تصوف وسلوک، تدبر، دانش مندی کی شمعیں فروزاں نظر آتی ہیں، وہاں مطالعہ سے ان کے علوم وفنون کے مقامات کا آپ کو اندازہ ہو سکے گا، لیکن یہاں مختصر طور پر ہم ان کے خطوط سے جو مکتوبات یعقوبی جیسے نام سے معنون ہیں کچھ علمی مسائل پیش کرتے ہیں، لیکن ان مسائل سے پہلے مولانا کی تصنیفات کا مسئلہ طے کر لیں۔

تصنیفات

سالک ومجذوب کی تصنیفات میں جہاں تک ہماری تحقیق کی رسائی ہے کوئی خاص تصنیف موجود نہیں ہے۔ لے دے کر صرف تین کتابیں ملتی ہیں، یعنی سوانح قاسمی (۲) جو مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر حالات پر تیس چالیس صفحات کا رسالہ ہے اور دوسری کو تصنیف تو نہیں کہا جا سکتا البتہ خطوط کا مجموعہ جو بیاض یعقوبی“ اور مکتوبات یعقوبی“ کے نام سے موسوم ہے اور تیسری کتاب حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فارسی کتاب ضیاء القلوب کا عربی زبان میں ترجمہ ہے۔

سوانح قاسمی

مولانا کی یہ تصنیف مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دار العلوم دیوبند کے حالات زندگی کا مختصر مگر جامع خاکہ ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سالک ومجذوب کو بڑے بڑے طویل مضامین کو مختصر عبارتوں میں بیان کرنے کا بڑا ملکہ تھا، انہوں نے اپنی اس

---

(۱) دیباچہ بیاض یعقوبی

(۲) ”ہر ایک خط بجائے خود دفتر معرفت کا ہے، ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف قند مکرر کا حکم رکھتا ہے (تمہید، ص ۷)

تصنیف میں بانیٔ دارالعلوم کی زندگی کو کوزے میں بند کر دیا ہے، اور ان کی زندگی کے ہر پہلو کی طرف اشارے کیے ہیں، یہی وہ کامیاب اشارے ہیں جن کو سمجھ کر مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنی نوشتہ سوانح قاسمی کو ڈھائی جلدوں میں پھیلا دیا ہے اور اگر یہ مختصر سی معلومات ہمارے پاس نہ ہوتی تو بانیٔ دارالعلوم دیو بند کی زندگی کے حالات حاصل کرنے میں ٹھوکریں حاصل کرنی پڑتیں اور خود اس راقم الحروف کو بھی جس نے انوار قاسمی لکھی بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تاہم مولانا کی سوانح قاسمی اور مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی "سوانح قاسمی" سے ناچیز کی انوار قاسمی میں بہت سے ایسے تاریخی واقعات ہیں جن کو دونوں میں سے کسی نے نہیں لکھا۔

مکتوبات یعقوبی

ان مکتوبات کے اوّل میں آپ کے بھتیجے امیر احمد عشرتی نانوتوی کا مقدمہ ہے جس میں انہوں نے اوّل مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رشتہ داروں اور خاندان والوں کا شجرہ لکھا ہے۔ مکتوبات کا تعارف ہے جو سات صفحات پر مشتمل ہے۔ بعد ازاں مکتوب الیہ منشی محمد قاسم کا مقدمہ ہے جس میں انہوں نے اپنا شجرہ نسب اور آباؤ اجداد اور اپنے جد امجد کے نیانگر ضلع اجمیر میں آباد ہونے کے حالات لکھے ہیں۔

منشی محمد قاسم نے اپنے بہنوئی غلام حسین سے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف سنی تو داعیانہ محبت ہوگئی اور بیعت ہونے کو دل چاہا، چنانچہ ۱۲۸۳ھ سے انہوں نے مولانا سے خط وکتابت کرنی شروع کی۔ اس وقت مولانا مطبع ہاشمی میرٹھ میں ملازم تھے، بعد ازاں مولانا دیو بند تشریف لے آئے اور جب ۱۲۸۳ھ سے مولانا کے مکتوبات بنام منشی صاحب شروع ہو کر ۱۳۰۱ھ تک جاری رہے تو منشی محمد قاسم نے بھی ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۰۱ھ تک خطوط لکھے، حکیم امیر احمد عشرتی لکھتے ہیں۔

خط وکتابت کے عرصے میں منشی محمد قاسم نیانگر سے نصف ماہ شوال ۱۲۹۵ھ کو براہ دہلی اور میرٹھ ایک سو پچھتر کوس پیدل سفر کر کے ۲۰ شوال ۱۲۹۵ھ کو جمعہ کے روز شب شنبہ مغرب اور عشاء کے درمیان دیو بند چھتے کی مسجد میں پہنچے اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہوئے۔ چھ روز قیام کر کے اور تعلیم حاصل کر کے ۲۷ر شوال ۱۲۹۵ھ کو بعد اجازت رخصت ہو کر بذریعہ ریل نیانگر واپس ہوئے۔

۱۰ ربیع الاول ۱۲۹۷ھ تک جو مکتوبات پہنچے ان کو منشی صاحب نے مرتب کیا اور اس مجموعے کا نام مکتوبات یعقوبی رکھا۔ خود منشی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ ملفوظات ابھی نامکمل ہیں پورے نہیں۔ ملا عبداللہ ساکن نیا نگر نے قطعہ تاریخ لکھا ہے۔

شکرانہ واہب العطیات جس سے ہے کتاب کو مباہات

ترتیب کتاب کا سن وسال ڈھونڈا تو عیاں ہوا فیوضات (۱۲۹۷)

منشی صاحب کا یہ تعارفی مقدمہ چھ صفحات کا ہے ہر چند خطوط علم کا بیش بہا ذخیرہ ہیں جن کا طبع ہونا نہایت ضروری تھا، خود مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مکتوب میں منشی محمد قاسم کو لکھتے ہیں:۔

"ورائے تمہاری درباب جمع کرنے ان مکتوبات کے مبنی بر محبت ہے ورنہ یہ عاجز کیا اور اس کی تحریر لائق رکھنے کے اور جمع کرنے کے عمدہ کلام اور اچھی تحریر ہوتی ہے (مکتوب ۲۲۔ ربیع الاوّل ۱۲۹۷ھ) کسی اور شخص کو انہی مکتوبات کے متعلق انکساری کو بالائے طاق رکھ کر لکھتے ہیں، "جو تحریرات میاں قاسم نے نیا نگر میں جمع کی ہیں واقعی وہ مجموعہ عجیب ہے مگر میاں چھپنا تو اک امر بہت بعید ہے اور نقل دشوار ہے، میرا خود اس کی نقل کو جی چاہتا ہے شاید اوروں کو نفع پہنچے اور اس ناکارہ کو بھی ثواب مل جاوے اگر تمہیں فرصت ہو تو نقل اس کی کرلو بہت مفید ہوگا والسلام (۱)

ظاہر ہے کہ یہ مکتوبات اپنی اہمیت کے باعث قابل طبع تھے اس لئے آپ کے بھتیجے امیر احمد صاحب نے منشی محمد قاسم صاحب سے لے کر قسطوں میں چھاپنا چاہا ہے کیونکہ تمام کے طبع کرنے کی مالی قوت نہ تھی جیسا کہ انہوں نے دیباچے میں لکھا ہے، اس لئے اکیس خطوط چھاپے چنانچہ بقیہ تمام مکتوبات مکتوب نمبر ۲۲ سے ۶۴ تک دوسرے حصے کے عنوان سے مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے چھپوائے اپنی تمہید میں مولانا تھانوی لکھتے ہیں۔

"اس کے قبل ایک حصہ استاذی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کا مطبع احمدی علی گڑھ میں باہتمام وترتیب حکیم امیر احمد عشرتی طبع ہو چکا ہے جو مشتمل ہے اکیس خط پر اور اسی حصے کی تمہید میں ناقل (حکیم

---

(۱) تمہید ص ۷

امیر احمد عشرتی) نے بقیہ مکتوبات کے موجود ہونے کی اطلاع کے ساتھ ان کے نہ چھاپ سکنے کا عذر کیا ہے، جس کو دیکھ کر طبیعت کو اس بقیہ کے حاصل کرنے کے لئے بے چینی ہوتی تھی، حسن اتفاق سے وہ بقیہ بھی معہ اصل مطبوعات کے دستیاب ہو گئے، یہ سب مکتوبات خاص حضرت کے دست مبارک کے لکھے ہوئے ہیں جن کو احقر خوب شناخت کرتا ہے اور مکتوب الیہ منشی محمد قاسم اجمیری مرحوم کے صاحبزادہ قاضی عبدالحق سلمہ کے پاس محفوظ تھے، قاضی صاحب نے بعض بذریعہ ڈاک اور بعض بذریعہ ایک عزیز مہمان کے عطا فرمائے،،(۱)

المختصر یہ کل ۶۴ مکتوبات ہیں مگر حکیم امیر احمد عشرتی نے اکہتر اے تحریر کئے ہیں۔ مولانا تھانوی نے طبع دوم کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ان مکتوبات زائدہ میں سے بعض تو دستیاب نہیں ہوئے اور دو مکتوب بوجہ اشتمال حالات خانگی قصداً درج نہیں کئے۔ بہرحال مکتوبات یعقوبی صفحہ ۷ اسے ۱۲۴ صفحات تک پھیلے ہوئے ہیں، بعد ازاں بیاض یعقوبی کے نام سے مختلف یادداشتیں، مثلاً سفرنامہ حج اوّل وحج دوم اور مختلف اشخاص کی پیدائش و وفات کا ذکر ہے۔ صفحہ ۴ سے کتب حدیث کی اسناد درج ہیں جو بخط غیر ہیں جو ۱۶۲ صفحات تک چلی گئی ہیں۔ ۱۶۳ پر مولانا محمد قاسم صاحب کی سند فراغت وحدیث ہے جو شاہ عبدالغنی مجددی کی دی ہوئی ہے، صفحہ ۱۶۵ اسے آپ کی اردو شاعری کا آغاز ہوتا ہے جس میں قصیدے اور نعتیہ اشعار اور مثنوی نیز بعض غزلیں ہیں جو ایک سو نو صفحات تک چلی گئی ہیں یہ تیسرا حصہ ہے۔ بیاض کے چوتھے حصہ میں عملیات ہیں جو ۲۰۸ صفحات تک ہیں۔ پھر بیاض یعقوبی کا حصہ پنجم ہے جس میں مجرب اور عمدہ نسخے ہیں، جو دو سو پچپن صفحات تک مندرج ہیں اور آخر کے تین صفحات میں فہرست مکتوبات وبیاض درج ہیں یوں کل کتاب ۲۵۸ صفحات پر ہے۔

ترجمہ ضیاء القلوب بزبان عربی

مولانا کی تیسری تصنیف ضیاء القلوب کا عربی زبان میں ترجمہ ہے۔ حاجی صاحب کی یہ کتاب تصوف کی معرکتہ آراء کتاب ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا عربی ترجمہ کیا تھا مگر طبع نہ ہو سکا، مولانا تھانوی فرماتے ہیں۔

---

(۱) تمہید حصہ دوم مکتوبات یعقوبی ص ۱۵

"ہمارے حضرت (حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کے علوم نہایت عالی ہوتے تھے مگر الفاظ بہت سلیس اور فارسی تو اہل زبان کی سی تھی، ضیاء القلوب کی کیسی اچھی فارسی ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا تھا مولوی جمیل الدین صاحب کہتے تھے کہ وہ ان کے پاس ہے اور کہتے تھے کہ مولانا نے اس پر حاشیہ بھی لکھا ہے میں بھی اس کتاب کی زیارت کا متمنی تھا مگر اتفاق نہیں ہوا اور اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔(۱)

مولانا سے غالباً یہ ترجمہ حاجی صاحب نے کرایا ہوگا تاکہ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور دوسرے عرب علاقوں کے لوگ بھی مطالعہ کر کے سمجھ سکیں۔ کیونکہ حاجی صاحب کا مستقل قیام مکہ معظمہ میں تھا اور وہاں سے عرب اشخاص بھی بیعت ہوتے تھے اس لئے یہ عربی ترجمہ ضروری سمجھا گیا، الغرض مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہی تین تحریری یادگاریں ہیں، یعنی سوانح مولانا محمد قاسم صاحب، مکتوبات و بیاض یعقوبی اور ترجمہ عربی ضیاء القلوب، مگر ان حضرات کی ان یادگاروں کو ایک خاص اور محدود حلقے کے سوا کس نے جانا اور کس نے پہچانا، کچھ بھی سہی مولانا اپنے زمانے کے عالم ربانی تھے اور مولانا ولی کامل تھے۔ قصص الاکابر، ص ۲۹ میں مولانا تھانوی نے نقل کیا ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ۔ میں نے ایک ہزار کتابیں پڑھی ہیں اس دور میں جبکہ کتابوں کی اشاعت زیادہ عام نہ تھی ایک ہزار کتابوں کا پڑھنا حیرت اور تعجب سے خالی نہیں۔ بہرحال وہ ایک جید عالم اور بلند پایہ مرشد تھے، اب ہم آپ کو مولانا کے علمی عجائب خانے کی سیر کراتے ہیں اور مکتوبات سے ایسے علمی مباحث پیش کرتے ہیں جو عوام کیلئے عموماً اور علماء کیلئے خصوصاً سرمایۂ حیات ہیں ملاحظہ فرمایئے۔

اعتقادی، علمی اور فقہی مسائل

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو مسائل فقہیہ میں بہت عبور حاصل تھا، تقریباً بیس

(۱) جمیل الکلام ملفوظ ۹۷ ۔ ص ۲۹

سال تک دوران ملازمت دار العلوم ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۰۲ھ آپ نے مدرسے کی طرف سے فتویٰ نویسی کا کام انجام دیا ہے۔ اطراف وجوانب سے جو استفتاء آتے ان کا جواب مولانا تحریر فرماتے۔ منشی محمد قاسم نے ایصال ثواب کے متعلق مولانا سے دریافت کیا ہے جواب میں مولانا لکھتے ہیں۔

ایصال ثواب

کسی دوسرے کو اپنے مال کو خیرات کر کے یا تلاوت قرآن یا نوافل کے ذریعہ ثواب پہنچانے کے متعلق تحریر فرماتے ہیں یہ بات کسی جگہ حدیث میں مفصل مصرح موجود نہیں، مگر شرع کا اقتضا یہ ہے کہ ثواب پہنچانا حقیقت میں اپنا استحقاق اوروں کو دے دینا ہے تو اس لئے جتنا ثواب اس عمل کا اس کرنے والے کو ہوتا وہی جتنوں کو یہ چاہے پہنچ جائے گا اور یہ اس کی خوبی کا اثر ہے کہ اس کو بھی ثواب پہنچانے کا ثواب ہوگا، جیسے کسی چیز کے دینے کا ہوتا رہا، (مکتوب) اس عبارت میں ایصال ثواب کا ایک پہلو پیش کیا گیا ہے لیکن قرآن وحدیث کے وہ دلائل جو علماء نے پیش کئے ہیں ان کا ذکر نہیں کیا گیا، شاید مرید کو زیادہ تفصیل سے لکھنے کی ضرورت نہ سمجھی ہو مگر مولانا کا یہ جملہ نہایت قابل غور ہے۔ ثواب پہنچانا حقیقت میں اپنا استحقاق اوروں کو دینا ہے لیکن جب قوانین دنیا اپنے بعض حقوق دوسروں کے حوالے کر دینے کی تائید کرتے ہیں تو پھر دوسری دنیا کے لئے اپنے مالی صدقات اور بدنی عبادات کے فوائد مردوں کیلئے کیوں نہ مرتب ہوں جبکہ وہ ان کے حوالے کر دیئے جائیں۔

والدین اور استاد کی نافرمانی اور عاق کر دینے کا مسئلہ

جو مسئلہ تم نے پوچھا ہے اس کا جواب اس حدیث سے نکلتا ہے لا یشکر اللہ من لا یشکر الناس یعنی اللہ کا شکر نہیں کیا جس نے آدمیوں کا شکر نہیں کیا، اور اطاعت والدیا استاد کی شکر ہے اور شکر موجب برکت دارین ہوتا ہے اور جب کوئی اولاد یا شاگرد استاد سے پھر جاتا ہے تو ناشکر ہوتا ہے اور یہ ناشکری آدمیوں کی، ناشکری اللہ جل شانہ، کی ہے۔ اور اللہ جل شانہ، کی طرف سے فیض علم کا اور رزق بند ہو جاتا ہے، اور عقوق (نافرمانی) والدین کو گناہ کبیرہ علمانے سمجھا ہے اور یہ جو مشہور ہے کہ باپ بیٹے کو محروم الارث کر دیتا ہے اور اسے عاق کرنا

کہتے ہیں شرعاً اس کی کوئی اصل نہیں (مکتوب ۳۱۔ ص ۴۳۔ ۴۴ مکتوبات یعقوبی) کبیرہ گناہ کے مرتکب امام کی امامت کا حکم۔ اور مرتکب کبیرہ گناہ کا امام مقرر کرنا بہتر نہیں اور اگر امام ہو تو نماز اس کے پیچھے جائز نہیں۔ (۱)

دو بہنوں میں سے ایک سے باپ کا اور دوسری سے بیٹے کا نکاح

اگر ایک شخص کی دو لڑکیاں ہو اور ایک شخص ایک لڑکی سے نکاح کرے اور اس کا بیٹا دوسری سے نکاح کرے تو یہ صورت شرعاً جائز ہے جو رشتے حرام ہیں ان میں سے یہ رشتہ نہیں اور سوتیلی خالہ یعنی مائدر (سوتیلی ماں) کی بہن یہ کوئی رشتہ نہیں۔ (۲)

تمباکو کی تجارت اور نیچا حقہ کا بنانا مکروہ ہے

تمباکو کی تجارت اور حقے کا نیچا بنانے کے متعلق مولانا تحریر فرماتے ہیں۔ اور بنانا نیچے اور ڈبہ اور تجارت تمباکو کی مکروہ ہے اگر کچھ اور کام ہو سکے تو افضل ہے اور بدرجۂ ناچاری اس کو اختیار کرے اور بہتر اپنے واسطے نہ سمجھے۔ (۳)

حصول معاش میں ہاتھ کی مزدوری افضل ہے

کسب معاش کے چار طریقے ہیں، تجارت، زراعت، محنت اور ملازمت۔ مولانا اس میں افضل کو تحریر فرماتے ہیں ”آدمی کو تلاش (روزی) حلال چاہئے۔ عمدہ سب سے مزدوری اور ہاتھ کا کام ہے اور نوکری اگر اچھی ہو بعد اس کے ہے۔ سردست تم جو کچھ کرتے ہو کئے جاؤ اور اس علاقے کو برا سمجھو اور جل شانہ سے دعا کرو کہ وہ تم کو اس سے نجات دے اور رزق حلال سے وسعت دے۔ اگر کوئی صورت تجارت کی بن سکے تو وہ کرلو۔ ہر چند فکر سود وزیاں ایک بڑا مشغلہ ہے مگر پھر صورت حلال ہے اور یاد رہے کہ نصیب سے زیادہ کسی کو کسی صورت سے نہیں ملتا مگر آدمی طلب حلال میں کیوں کوتاہی کرے (مکتوب سوم ص ۷۲) منشی محمد قاسم نے اپنی عرضی نویسی کے بارے میں حضرت سے معلوم کیا تھا کہ کچہری کی عرض نویسی چھوڑ کر حقے کے نیچے بنانا کیا حکم رکھتے ہیں، اس کے متعلق مولانا نے بڑی پرمغز فقہی اور روحانی باتیں بیان فرمائیں وہ اہل علم کے لئے بے حد مفید ہیں۔

---

(۱) مکتوب ۳۱ ص ۴۳ (۲) مکتوب ... ص ... مکتوبات یعقوبی (۳) مکتوبات یعقوبی ص ۴۳ [illegible]

اگر کوئی مسلمان کوئی ناجائز نوکری کرتا ہے مثلاً بینک کی جس میں سودی لین دین ہوتا ہے کہیں اور نوکری کی امید نہیں تو یہاں پر دو اُمور درپیش ہیں۔

نوکری چھوڑ دینے میں فقر وفاقہ اور بیکاری اور بھوک میں کفر تک نوبت پہنچنے کا اندیشہ۔

ناجائز نوکری کے باعث اکل حرام اور ناجائز روزی جو معصیت ہے، ان دونوں میں ایک طرف کفر ہے اور دوسری طرف حرام اور اکل حرام، دونوں میں سے زیادہ اہون کفر کے مقابلہ میں حرمت ہے، لہٰذا جب تک متبادل اور حلال روزی کا ذریعہ نہ ہو جس کی تلاش ضروری ہے تو کفر کے مقابلہ میں اسی نوکری پر رہنا چاہئے چھوڑنا نہیں چاہئے، مولانا یعقوب صاحبؒ کی عبارت کا ماحصل یہی ہے سبحان اللہ کیا عالمانہ شان ہے اور کیا تفقہ ہے۔

دست غیب کا شرعی حکم اور کیمیا کا فقدان

"دست غیب وغیرہ کے عمل اول تو بہت دشوار ہوتے ہیں اور اگر بن بھی پڑے تو شرعاً اس کے جائز ہونے میں کلام ہے اور کیمیا مفقود، اور جو اس طلب میں بنام مہوس مشہور ہیں بوالہوس ہیں نہ دنیا کے نہ دین کے"(۱)

حالات کے مطابق شریعت کے احکام میں اختلاف

منشی محمد قاسم مرید صفا کیش نے مولانا سے بعض مسائل میں فیصلوں کے اختلاف کے بارے میں بھی دریافت کیا ہے، کہ ایک ہی چیز کبھی جائز کبھی ناجائز کیوں ہوتی ہے؟ مولانا نے کیا خوبصورت انداز میں فقہ کے اصول پر روشنی ڈال کر ایک مستقل فقہ کا باب کھول دیا ہے، جواب میں فرماتے ہیں۔

زیارت قبور کی ممانعت اور اس کی علت

کبھی یوں ہوتا ہے کہ جب کوئی بات شروع ہوئی تھی جب اس میں خرابی نہ تھی بعد چند زمانے کے خرابی آگئی، لہٰذا دونوں صورتوں میں حکم بھی جدا ہوگا، نظیر اس کی زیارت قبور کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اوّل منع فرمایا تھا، تو وجہ اسکی یہ تھی کہ اکثر لوگ قبروں پر جاکر نوحہ ماتم اور رونا پیٹنا کرتے تھے، آپ ﷺ نے اس وجہ سے (قبروں پر جانے سے) روک دیا (اور جب لوگوں نے)

(۱) ؟؟؟؟ [illegible]

قبور کی زیارت کی اجازت اور اس کی علت اور موجودہ دور کا حکم

ان امور کو چھوڑ دیا تو آپ ﷺ نے اجازت فرمائی اور یوں فرمایا کہ قبر کی زیارت سے دل نرم ہوتا ہے اور موت یاد آتی ہے (آج کل بھی کس غرض سے جاتے ہیں تو) پھر سمجھو کہ رسول اللہ ﷺ کی اجازت میں یہ جانا داخل ہے یا نہیں؟ اور جب وہاں ماتھا رگڑنا اور حاجت طلب کرنا اس پر علاوہ ہو تو پھر دیکھ لو اس اجازت سے اب اس کو کیا علاقہ رہا۔(۱)

حقیقت کی تبدیلی سے احکام کی تبدیلی

مذکورہ بالا فقہی حقائق کے بعد مولانا آگے چل کر فرماتے ہیں "شرع کے احکام جن چیزوں کی نسبت ہیں وہ احکام ان کی حقیقت سے متعلق ہیں، جب وہ حقیقت نہیں رہتی تو وہ تو حکم بھی نہیں رہتا، مثلاً شراب حرام ہے تو اس کی حقیقت نشہ ہے۔ جب شراب سرکہ ہو جائے یا نمک ڈال دیں اور نشہ دور ہو جائے تو وہ حلال ہو جاتی ہے۔ تو اس سبب پر نظر کرنے سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجائے گی کہ بہت سی چیزوں کے اختلاف زمانہ سے حقیقت مختلف ہو جاتی ہے تو بے شک اس کا حکم بھی مختلف ہو جائے گا۔

عرس کا جواز اور عدم جواز

"مثلاً ملفوظات میں اکثر بزرگوں کی تاکید ہے کہ عرسوں کو قائم رکھنا چاہئے، تو اب یہ دیکھنا چاہئے کہ اس زمانے میں عرسوں کیا صورت ہوتی تھی، یہی صورت تھی جواب ہوتی ہے یا کچھ اور۔ یہ خرابیاں جواب بروئے کار ہیں، ان کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہوتا تھا، یہ مجمع تماشا والوں کا اور ناچ و رنگ کو وہ لوگ جانتے بھی نہ تھے"(۲)

عورتوں کے مساجد میں نماز کیلئے جانے اور نہ جانے کا جواز اور عدم جواز

اسی ضمن میں کہ حقیقت کے بدلنے سے مسئلہ کا حکم بدل جاتا ہے، ایک اور مثال سے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحقیق و توضیح فرماتے ہیں، لکھتے ہیں۔

"فقہ کی روایت لکھ دینی سہل ہے مگر اس روایت کے مطابق اس زمانے

---

(۱) مکتوبات ص ۵۴ انیسواں مکتوب ۸ جمادی الاول ۱۲۸۸ھ (۲) انیسواں مکتوب ص ۵۴-۵۵

کے حال کو (مطابق) کر دینا ذرا مشکل ہے، مثال اسکی یہ ہے کہ رسول ﷺ کے زمانے میں عورتیں مسجدوں میں نماز کے واسطے حاضر ہوتی تھیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ممانعت کر دی اور جب عورتوں نے حضرت عائشہ سے شکایت کی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یوں فرمایا کہ اب عورتوں نے جو وضع اختیار کی ہے اور جو باتیں ایجاد کی ہیں اگر حضرت ﷺ کے وقت میں یہ باتیں ہوتیں تو آپ بھی منع فرمادیتے" اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت اس امر کی بدل گئی جس کے سبب حضرت کے وقت میں اجازت تھی"(۱)

مسائل اختلافیہ میں کس کا قول اختیار کرے

جب کسی مسئلے میں بعض علماء اختلاف کریں تو ان میں سے کس قول کو قبول کیا جائے، مولانا محمد یعقوب صاحب لکھتے ہیں:۔

"بعضے مسائل اختلافیہ ایسے ہیں کہ علما کے ان میں قول ہمیشہ سے مختلف ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر کوئی احتیاط اور تقوے کو کام فرمائے تو جو امر دشوار ہو اس کو اختیار کرے نہیں تو سہل جانب کو لے، یا کسی عالم دیندار سے پوچھ لے، جو وہ بتلائے اس پر عمل کرے"(۲)

تبصرۂ اوّل

حضرت مولانا نے اختلافی مسائل میں کیا خوب فیصلہ کیا ہے، اسی کو تفقہ کہتے ہیں، یہاں پہنچ کر ایک بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ اختلافی مسائل میں جبکہ دونوں علماء کی جانب دیندار اور نیک نیت ہوں دونوں اقوال پر عمل کرنے کی گنجائش نکل آتی ہے۔ جیسے مجتہدین کے اختلافی مسائل ہیں "حقیقت کے بدلنے سے حکم کا بدلنے کا مسئلہ مولانا کی فقہ میں اعلیٰ بصیرت کی غمازی کرتا ہے"

تبصرۂ دوم

جیسا کہ مولانا نے قبروں کی زیارت اور عدم زیارت، شراب کی حرمت اور اس کی حقیقت کی تبدیلی میں جواز کی صورت بیان فرمائی۔

---

(۱) مکتوب انیسواں ص ۵۵ (۲) مکتوب ۱۹۔ ص ۵۶

انگریزی دواؤں میں الکحل کا مسئلہ

"اسی سلسلے میں الکحل کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ مجھ سے استاذ محترم مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے الکحل کے بارے میں استفسار پر بحوالہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کہ:۔ جب الکحل دوسری دواؤں کے ساتھ مل کر مغلوب ہو جائے اور دوسری دواؤں میں مل کر اپنی حقیقت کو گم کر بیٹھے تو اس صورت میں الکحل پڑی ہوئی دوا کا پینا جائز ہے، اور اگر الکحل دواؤں میں غالب رہے اور اپنی حقیقت کو کھو نہ بیٹھے تو اس دوا کا پینا جائز نہیں، البتہ تقوے کا مقام کچھ اور ہے اور فقہ کا مقام کچھ اور، اہل تقویٰ نے انگریزی یا مشکوک دواؤں کو کبھی منہ نہیں لگایا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی مطلوب الرحمٰن نے مرتے دم تک انگریزی دوا نہیں پی۔

مولانا محمد یعقوب صاحب کا فقہ میں اجتہادی پہلو

ہم نے پہلے بھی اپنی اس کتاب میں اشارے کئے ہیں اور اب پھر کہتے ہیں کہ عالم ہونا اور بات ہے لیکن فقیہ ہونا اور بات ہے۔ فقیہ مسائل کا بغور مطالعہ کر کے فیصلہ کرتا ہے اور اپنی فقاہت اور سمجھ کو بھی کام میں لاتا ہے۔ لکیر کا فقیر نہیں بنتا۔ حسب ذیل تعزیہ کے بارے میں کفار اور مسلمانوں میں نزاع کی صورت میں علماء اور مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فقہ کا موازنہ کیجئے۔ آپ کو صاف معلوم ہو گا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقام دوسرے علماء سے تفقہ میں کتنا بلند ہے اور پھر مولانا کی پیروی میں مولانا تھانوی کا عمل بھی اسی تفقہ یعقوبی کی تقلید ہے۔ اب مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا حسب ذیل طویل اور مکمل ملفوظ ملاحظہ کیجئے۔

"ایک صاحب کے سوال کے جواب میں (مولانا تھانوی) نے فرمایا کہ جو نوکریاں ہیں (مثلاً بینک کی یا شراب کے کارخانے وغیرہما کی) ان کے کرنے میں مفسدہ ضرور ہے مگر جس کو حلال نوکری نہ ملے ان کے نہ کرنے میں اس سے زیادہ اندیشہ ہے۔ اس لئے کہ افلاس سے بعض اوقات کفر تک کی نوبت آجاتی ہے تو یہ معصیت وقایہ ہو جاتی ہے اس وقایہ (بچاؤ اور حفاظت) کی ایک جزئی یاد آگئی۔ کانپور کے علاقے میں ایک گاؤں ہے جُنیر وہاں پر ایک رئیس

تھا۔ اس کا نام تھاو بارسنگھ میں نے سنا تھا کہ اس گاؤں کے لوگ آریہ ہونے والے ہیں میں ایک مجمع کے ساتھ ان کی تبلیغ کے لئے وہاں گیا تھا، او بارسنگھ سے بھی اس کا ذکر آیا تو اس نے جواب میں کہا کہ ہم آریہ کس طرح ہو سکتے ہیں۔ ہمارے یہاں تو تعزیہ بنتا ہے۔ میں نے کہا تعزیہ بنانا مت چھوڑنا۔ بعض لوگوں نے مجھ پر اعتراض کیا میں نے کہا تم نے غور نہیں کیا، یہ شخص جب تک تعزیہ نہیں بنائے گا کافر نہ ہوگا، تعزیہ بے شک معصیت اور بدعت ہے مگر اس کے لئے تو یہ معصیت اور بدعت وقایۂ کفر ہے (کفر سے بچاؤ کا سامان ہے)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ﷫ ایک زمانے میں اجمیر تشریف رکھتے تھے۔ اتفاق سے عشرۂ محرم میں ایک مقام پر تعزیہ داروں میں اور ہندوؤں میں جھگڑا ہوگیا، کوئی درخت تھا وہاں کے سنی عقائد کے علماء سے استفتا (فتویٰ طلب) کیا کہ ہندوؤں اور تعزیہ داروں کا جھگڑا ہے ہم کو کیا کرنا چاہئے۔ جواب دیا کفر اور بدعت کی لڑائی ہے تم کو الگ رہنا چاہئے۔ پھر وہ لوگ مولانا (محمد یعقوب صاحب ﷫) کے پاس دریافت کرنے آئے، مولانا یعقوب ﷫ نے فرمایا یہ بدعت اور کفر کی لڑائی نہیں ہے بلکہ اسلام اور کفر کی لڑائی ہے، کفار بدعت سمجھ کر تھوڑا ہی لڑائی کر رہے ہیں۔ وہ تو اسلامی شعار سمجھ کر مقابلہ کر رہے ہیں جاؤ ان کا مقابلہ کرو۔ غرضیکہ تمام مسلمان متحد ہوکر لڑے فتح ہوئی۔ (یہ لکھ کر مولانا تھانوی ﷫ فرماتے ہیں) تو ان چیزوں کو سمجھنے کے لئے فہم اور عقل کی ضرورت ہے صرف ایک ہی پہلو پر نظر نہیں کرنا چاہئے۔ شعار اسلامی سمجھنے پر ایک واقعہ یاد آیا۔ کیرانہ (ضلع مظفر نگر یوپی) میں زمانۂ تحریک خلافت میں میری ایک مولوی صاحب سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ اور بات تو پھر ہوگی پہلے ترکوں کی سلطنت کو اسلامی سلطنت تو ثابت کر دیجئے تب دوسروں کو نصرت کی ترغیب دیجئے گا، اور میں نے ان سے پوچھا کہ یہ بتلائیے کہ مجموعہ کفر اور اسلام کا کیا ہوگا (انہوں نے کہا کہ کفر) میں نے کہا کہ اب یہ بتلاؤ کہ ترکوں کی حکومت جو اس وقت ہے وہ شخصی ہے یا جمہوری۔ کہا کہ جمہوری۔ میں نے کہا کہ اس (ترکی حکومت میں جو پارلیمنٹ ہے) وہ کفار اور مسلمانوں سے مرکب ہے یا خالص مسلمانوں کی جماعت ہے؟ کہا کہ مسلم اور کافر میں مشترک ہے۔ میں نے کہا کہ مجموعہ کیا ہوا؟ پھر نصرت کیسی۔ کیا غیر اسلامی سلطنت کی نصرت کراتے ہو؟ حیرت زدہ رہ گئے۔ کہنے لگے کہ یہ تو کچھ اور ہی نکلا سارا بنا بنایا قصر ہی منہدم ہوگیا۔ میں نے کہا اگر آپ جواب نہ دے

سکیں تو اپنے علماء اور لیڈروں سے پوچھ کر جواب دو خاموش تھے بیچارے۔

میں نے کہا کہ جاؤ جن کو مخالف سمجھتے ہو اور خشک ملا کہتے ہو اس کا جواب بھی انہی کے پاس ہے۔ہم کہتے ہیں کہ پھر بھی ان کی نصرت واجب ہے اس لئے کہ کفار تو اس کو اسلامی سلطنت ہی سمجھ کر مقابلہ کر رہے ہیں، اس لئے اس وقت ترکوں کی نصرت اسلام اور مسلمانوں کی نصرت ہے۔ اس پر بیحد خوش ہو گئے اور دعائیں دیں، مجھ کو خوشی میں کچھ نقد نذرانہ بھی دیا۔(۱)

اب مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بصیرت ملاحظہ فرمائیں کہ اجمیر کے واقعے میں علماء نے جو بدعت اور کفر کا مقابلہ بتایا تھا، مولانا نے ان کو کتنی بڑی لغزش سے بچایا اور صحیح معنی میں تفقہ کا ثبوت دے کر مسلمانوں کو شکست سے بچالیا۔ اس مسئلے کی تقلید میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اوبار سنگھ کو تعزیہ داری جاری رکھنے اور مولوی صاحب کو ترکوں کی نصرت کرنے کا فتویٰ دیا تو یہ ہے یعقوبی تفقہ۔

سماع موتیٰ

قبروں میں مردوں کا دنیا والوں کی آوازیں سننے کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ بعض کا اعتقاد یہ ہے کہ مردے کسی کی آواز نہیں سنتے اور بعض کی تحقیق اس کے برعکس ہے۔ اب مولانا نے اپنے مرید جانثار کو اس مسئلہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے، تحریر فرماتے ہیں۔

”تم نے اے میاں محمد قاسم درباب سماع اموات کے پوچھا ہے۔ برادرم عزیز یہ مسئلہ زمان صحابہ سے اب تک مختلف فیہ ہے اور ہر ایک گروہ اپنے دلائل قرآن وحدیث سے پیش کرتا ہے، اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایات کتب فقہ میں جو مذکور ہیں ان سے بھی کچھ ایسا ہی سمجھ میں آتا ہے کہ مردے سنتے نہیں۔ احقر کے نزدیک تحقیق یہ ہے کہ مردے سنتے ہیں اور خاص کر اولیاء و انبیاء کی اس باب میں ایک شان جدا ہے کہ تفصیل اس کی طویل ہے اور یہ خلاف جو اوائل سے اواخر تک رہا۔ تو اوائل کا خلاف تو کچھ نزاع لفظی معلوم ہوتا ہے اور متاخرین نے انکے اقوال کی پرورش کی ہے ان اقوال کا میری رائے ناقص میں یہ مضمون ہے کہ عرف عام میں بات کرنا اور کہنا اور سننا اس کا نام ہے کہ زندگی میں جو لوگ آپس میں کرتے ہیں اور مردوں کا سننا علاوہ ہے۔ ایسے اگر کوئی کہے کہ اگر میں زید سے بولوں تو میرا غلام آزاد ہے اور بعد مرنے کے اس کے

---

(۱) ملفوظات حصہ چہارم ملفوظ ۳، ص ۶۰۵

جنازے پر یا اس کی قبر پر جاکر سلام علیک کرے یا کچھ خطاب کرے تو غلام آزاد نہ ہوگا کیونکہ یہ کلام کرنا نہیں۔ اسلئے کہ مُردے سنتے نہیں اور جن صاحبوں نے یہ کہا کہ بدن نہیں سنتا اور روح سنتی ہے اسکے معنی بھی کچھ ایسے ہیں جس سے اختلاف دونوں فریق کا لفظی معلوم ہوتا ہے۔

مولانا کی اس عبارت سے مردوں بالخصوص انبیاء اور اولیا کے سننے پر روشنی پڑتی ہے۔ مولانا کو یہ کمال حاصل تھا کہ بظاہر متعارض اقوال اور نظریات میں خوب مطابقت فرماتے تھے، چنانچہ سماع موتیٰ کے بارے میں امام اعظم کے اس قول کی کہ مردے نہیں سنتے، کیا اچھی مطابقت کی فقہ کے اس مسئلے سے (جس میں کسی قسم کھانیوالے نے کسی سے کہا کہ اگر میں تم سے بولوں تو میرا غلام آزاد ہے) کتنی اچھی وضاحت کی ہے کہ ہر چیز چسپاں نظر آتی ہے۔ مولانا نے اس خط میں آگے چل کر جو دلائل دیئے ہیں ان میں قبروں پر پیشاب پاخانہ کرنے سے مردوں کو ایذا، قبروں پر جاکر سلام کرنا اور وہ حدیث عائشہؓ ہے جس میں انہوں نے فرمایا۔ جب تک (آنحضور ﷺ) میرے خاوند اور (حضرت ابو بکر میرے باپ اس حجرے میں دفن تھے میں بلا جھجک چلی جاتی تھی لیکن اب (ایک غیر محرم یعنی) حضرت عمرؓ کے دفن کی وجہ سے مجھے شرم آتی ہے۔

مسئلہ تقلید

کسی امام کی پیروی کرنا تقلید کہلاتا ہے، ایسے ائمہ جن کی پیروی یا تقلید کی جاتی ہے چار ہیں۔ اماا عظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، لیکن پنجاب کے ایک صوبے میں ایک خاص فرقہ جن کو اہل حدیث کہا جاتا ہے اس جامد تقلید کے منکر اور مخالف ہیں۔ مقلدین اور غیر مقلدین میں شدت اور انتہا پسند پارٹیاں ہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرید کو مسئلہ تقلید کے متعلق لکھتے ہیں۔

"طریق دین کے اتباع کا دو طرز میں منحصر ہے، ایک اجتہاد یعنی مسائل جزئیہ کو قرآن و حدیث سے سمجھ کر نکالنا اور ان کا حکم حلال و حرام، جواز و ناجواز، فرض، سنت، مستحب، حرام، مکروہ کہنا۔ اس طریق کیلئے علم کامل اور عقل سلیم اور تقویٰ منجملہ شرائط ہے اور زبان عرب سے باصولہ و فروعہ آگاہ ہونا اور محاورات عرب پر عبور ہونا اس کی اصل ہے۔ دوسری تقلید ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ

جب آپ قرآن وحدیث سے بسبب قصور ان شرائط کے یا بسبب اس کے کہ علمائے قدیم جو کچھ کر گئے اس سے زیادہ گنجائش نہیں تو ان علماء کے قول کو لینا اور اس پر عمل کرنا اور زمانۂ صحابہ میں راہ اجتہاد علماء کا کام تھا اور عوام کسی نہ کسی کی تقلید کرتے تھے اور زمان تابعین اور تبع تابعین میں بہت سے مذاہب ہوئے اور کتنے ہی علماء نے اجتہاد کیا اور استنباط کئے، مگر راہ عوام کی تقلید ہی تھی۔ جب دورہ علم کا تمام ہوا اور شیوع جہل اور اتباع کا ہوا تو علمائے وقت کے اجماع سے چار مذاہب جو مقبول ہوئے اور اجتہاد کو بے حاجت سمجھ کر اور کچھ بے سامانی کی وجہ سے چھوڑا اور عوام کو انہی مذاہب کی تقلید کی طرف ہدایت کی، اب ان سے بڑھ کر کوئی کچھ نہیں کرسکتا......... اگر کوئی شخص کہیں کسی کا تابع ہو اور کہیں کسی کا، اس کو تلفیق کہتے ہیں اور یہ راہ علمائے حقانی کے نزدیک مقبول نہیں، کیونکہ اس میں ہوائے نفسانی کی راہ کشادہ ہوتی ہے کہ آدمی دین سمجھا کرے اور خواہش کا متبع رہے............ احقر کی ناقص رائے کے بموجب کوئی مرتبہ اجتہاد کا نہیں رکھتا یہی راہ تقلید کی ہے، اس میں ایک رائے کی پابندی ہم جیسوں کو لازم ہے۔ کیونکہ اگر مختلف لوگوں کا اتباع کریں تو ہر جگہ پھر پرکھنے کی ضرورت ہے اور ہماری سمجھ معلوم اور ہوائے نفس کو دخل ممکن۔ باوجودیکہ اس کے کہ اگر کوئی مرتبہ اجتہاد کا نہ رکھتا ہو تو جو کچھ پائے اور سنے اس پر عمل کرے، احقر اس کو مسلمان اور دین کا طالب جانتا ہے اگر تھوڑا سا بے سمجھ اور غلطی پر ہو تو اللہ اس کی غلطی کو معاف کرے اور جب تک کوئی ایسا امر اس کی نسبت یقیناً معلوم نہ ہو کہ بقول اپنے مجتہد کے وہ مفسد نماز یا ناقض وضو ہو یا نجس ہو تو نماز اس کے پیچھے جائز ہے۔ اور اگر احتمال ان امور کا ہو یا شک تو بھی جائز اور تفتیش کی حاجت نہیں، اور اگر یقیناً ان امور سے کوئی امر معلوم ہو تو البتہ اس کے پیچھے نماز نہ پڑھے یا پڑھی ہو تو پھیر لے۔ بلکہ میری رائے یہ ہے کہ نماز پڑھ لے اور احتیاط کے واسطے پھیرے، یہ اجمالی جواب تمہارے سوالوں کا ہو گیا زیادہ فرصت نہیں احقر کو معاف کرنا۔ (۱)

---

(۱) مکتوبات ص ۲۹، ۳۰، ۳۲، مکتوب چہارم

تصورِ شیخ

آپ کے خطوط بنام منشی محمد قاسم میں تصوف اور معرفت کی بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں ان میں مثلاً تصور شیخ کے متعلق انہوں نے پوچھا ہے آپ جواب میں لکھتے ہیں۔

''تم نے تصور شیخ کو پوچھا تھا اے برادر تصور شیخ کے بارے میں متقدمین صوفیاء نے جو لکھا ہے اس میں یہ قید لگائی ہے کہ محبت و تعظیم سے ہو، اور اس سے زیادہ جو کچھ امور ہوئے بعض متاخرین نے بفرط محبت یا بطرز غلط فہمی (زیادہ) کئے (ہیں) وہ سب امور اصل تصور شیخ سے باہر ہیں اور جن لوگوں نے کہ (تصور شیخ کو) منع کیا اسی آخر (مبالغہ یا فرط عقیدت مندی) کو منع کیا ہے نہ اوّل طریق کو، اور (تصور شیخ کی حقیقت کی) اصل یہ ہے جیسے تصور کسی آشنا کا بلکہ اپنے کسی معشوق کا ممنوع نہیں (اسی طرح) تصور شیخ کا (ہے) کہ اس (میں) محبت دینی ہے ممنوع نہیں۔ ہاں اس کو حاضر و ناظر سمجھنا یا مددگار و معاون جاننا یا فرط تعظیم کہ عبادت کے مرتبہ کو پہنچائے یہ سب امور شرکیہ ممنوع ہیں۔ (قاعدہ) یہ ہے کہ جس چیز سے آدمی کو لگاؤ ہو جاتا ہے اس سے محبت اور عقیدت کا مضبوط ہو جانا اور طبیعت کا ایک جانب لگ جانا اس راہ میں نہایت مطلوب ہے۔ اسلئے ان بزرگواروں نے اس کو تجویز کیا ورنہ طالب خدا کو اس کے سوائے کسی اور سے کیا کام پڑا ہے، بلکہ اتنی توجہ ہر چند شرعاً ممنوع نہیں، مگر طریق صوفیا کہ توحید پر اس کی بناء ہے اس کے خلاف ہے کہ اتنا بھی غیر کا خیال رہے، اسی امر کی طرف مولانا روم اس شعر میں اشارہ کرتے ہیں۔

چو خلیل آمد خیال یار من صورتش بت معنی او بت شکن

اے برادر بندگی اور خدمت مطلوب ہے اور یہ سب حیلے اور وسیلے باتیں ہیں۔ ہوں یا نہ ہوں ہر زمانے میں طرز تصوف کا بدلا اور ہر شیخ نے ایک جدا طریق برتا ہے۔ اس زمانے میں اتباع سنت اور استقامت شریعت اصل ہے اور بہتیرے امور پہلے جب ان سے کچھ خرابی نہیں نکلتی تھی جائز تھے اب وہ مکروہ ہیں کہ منشا کسی خرابی کے ہیں۔ اوّل تو تصور کوئی چنداں امر ضروری نہیں

اعتقاد اور محبت اور توحید مطلوب کافی ہے اور اگر ہو تو محبت اور تعظیم سے ہو اور اس سے زیادہ سراسر خرابی ہے۔(۱)

حضرت سالک و مجذوب کے اس مکتوب کو پڑھئے جس میں تصور شیخ کو صرف اس درجے میں لکھا ہے کہ اس کے تصور یا خیال سے کوئی شرکیہ پہلو پیدا نہ ہو جائے۔ جس طرح کسی محبوب کا تصور دل کے لئے وجہ سکون ہوتا ہے۔ اسی طرح شیخ یعنی پیر و مرشد کا تصور بھی تسکین قلب کا سامان ہے، تصور شیخ کو صرف اتنے درجے میں رکھتے ہوئے پھر حضرت سالک نے فرمایا کہ :۔لوگوں نے اپنے پیروں کو اس قدر بلند مقام عطا کیا ہے کہ ان کو امور خدا میں بھی قابو یافتہ اور مشکلوں کا حل کنندہ تصور کرلیا، اس لئے اس دور کے مناسب حضرت سالک صرف یہ فرماتے ہیں کہ اتباع شریعت بہرحال ضروری ہے اور اگر کوئی چیز شریعت سے ٹکرا گئی تو پھر وہ قابل رد ہے خواہ وہ تصور شیخ ہو یا کوئی اور چیز ،ایک اور خط میں موصوف نے تصور شیخ کی مثال دے کر اس مسئلہ کی حقیقت سے نقاب اٹھائی ہے لکھتے ہیں۔

"تصور شیخ کی مثال یہ ہے جیسے کوئی شخص کو توال یا کسی شہر کے حاکم کا حکم مانتا ہے تو وہ حقیقت میں بادشاہ کا حکم مانتا ہے اور حاکم کا تابعدار اور بادشاہ کا تابعدار کہلاتا ہے۔"

اس مثال سے واضح ہوا کہ تصور شیخ کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کے تصور میں خدا کا تصور پیدا ہوتا ہے کہ وہ خدائی معرفت کا سامان اور ذریعہ ہے۔

حساب صاع پیمانۂ عربی

بیاض یعقوبی میں ہمیں ایک نوٹ عرب کے پیمانے اور ناپ کے برتن صاع کے بارے میں مولانا کا لکھوایا ہوا املا ہے۔ معلوم ہوا کہ صاع مدینہ منورہ کا ناپ کا ایک برتن ہوتا ہے جس سے زکوٰۃ وغیرہ کا حساب ہوتا ہے۔ مولانا کی تحقیق جو انہوں نے ۱۲۸۹ھ کے رمضان میں کی ہے حسب ذیل ہے۔

"درمختار میں ہے کہ صاع وہ برتن ہے جس میں ایک ہزار چالیس درہم وزن کا ماش یا مسور سماوے اور وزن درہم کا نواب قطب الدین خاں دہلوی مرحوم

(۱) مکتوبات یعقوبی مکتوب نہم مورخہ ۱۵ ار شوال ۱۲۸۵ھ بروز جمعہ

نے تین ماشے ایک رتی اور ایک پانچواں حصہ رتی کا مظاہر حق ربع ثانی میں نصاب زکوٰۃ کے بیان میں لکھا ہے۔ جب اس طرح پر حساب کیا تو ایک ہزار ۴۰ درہم کے تین ہزار دو سو چھہتر ماشے ہوئے اور اس کے دو سو تہتر تولے ہوتے ہیں اور چالیس تولے کا سیر خام (آٹھ چھٹانک کا سیر خام اور ۱۶ چھٹانک کا ایک سیر پختہ کہلاتا ہے انوار) نانوتے میں تحقیق ہوا تو اس حساب سے چھ سیر اور ایک چھٹانک خام ہوا۔ فقط(۱)

"اس حساب پر حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاع کے متعلق اپنا محققانہ حساب حاشیے میں بیاض یعقوبی پر درج فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"چالیس تولے کا سیر خام الخ اور احقر نے تحقیق کیا تو اٹھاسی روپیہ کا سیر پختہ ضلع سہارن پور اور مظفر نگر میں ہوتا ہے اور نصف صاع اس سیر سے ڈیڑھ سیر ڈیڑھ چھٹانک یعنی دو سو اسی ۲۸۰ روپیہ بھر ہوتا ہے، بحذف کر ایک چونی کے اور نمبری یعنی اسی کے سیر سے پورا پونے دو سیر ہوا یہ تو گندم کا حساب ہے اور جو وغیرہ جو ایک صاع واجب ہوتا ہے وزن میں اس کا مضاعف دوگنا نہیں ہے، جیسا کہ عام طور سے اس غلطی میں ابتلاء ہے بلکہ جس برتن میں اتنا گیہوں سما جاوے اس برتن کو دوبار بھر کر دیا جاوے، خوب سمجھ لو اور یہ یاد رکھو(۲)

ہم مولانا کے مختلف علمی مسائل کی تلاش میں مصروف تھے کہ ناگاہ ہمارے سامنے خودکشی کا ایک ایسا پہلو سامنے آیا جس میں خودکشی حرام نہیں بلکہ شہادت نکلی ملاحظہ کیجئے۔

عشق الٰہی اور جذبۂ بے اختیار

ملاقات ربانی میں خودکشی شہادت ہے حرام نہیں

بعض مقامات عشق خداوندی میں عاشق پر ایسا زبردست قبض ہوتا ہے کہ وہ خودکشی کر لیتا ہے۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک وعظ میں جس کا تذکرہ الہادی ص ۷ ۲ ماہ شوال ۱۳۵۷ھ میں کیا گیا ہے فرمایا کہ بعض دفعہ قبض میں سالک یوں سمجھتا ہے کہ فرعون مجھ سے افضل ہے کہ وہ

---

(۱) بیاض یعقوبی ص ۱۶۴ (۲) حاشیہ بیاض یعقوبی ص ۱۶۴

کافر تھا مگر اس کو تو ایک دفعہ لا الہ الا اللہ کہنے سے نجات ہو جاتی اور مجھے ہزار دفعہ بھی لا الہ الا اللہ کہنے سے بھی نجات نہیں ہوئی، چنانچہ بعض نے اس حالت میں خودکشی بھی کر لی ہے، ان کو مستہلکین کہا جاتا ہے، مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا ان کو عذاب ہوگا۔ فرمایا

"جا ظالم وہ تو خدا کی محبت میں شمشیر عشق سے جان دے رہا ہے اور تجھے فتوے کی سوجھی ہے"

اس شعر میں اسی کا فیصلہ ہے

اگر خطا گوید او را خاطی مگو ور شود پُر شہید، او را مشو

خون شہیداں راز آب اولیٰ ترست ایں خطا از صد صواب اولیٰ تراست

(انوار) عاشق خدا پر ملاقات ربانی کا بعض اوقات ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ اس کا دل خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے تاکہ لقائے ربانی میسر ہو ایسی خودکشی ایسے شخص سے معاف ہے، حافظ محمد ضامن عاشق شہید کا بھی یہی حال تھا۔ انہوں نے گھر والوں کو کہہ دیا تھا کہ میرے اردگرد کوئی چاقو یا چھری نہ ہو، مبادا خودکشی کرلوں۔ بالآخر ۱۸۵۷ء میں شاملی ضلع مظفرنگر میں انگریزوں سے جہاد کے وقت شہید ہوئے اور یوں تمنا پوری ہوئی۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ علم کا کتب خانہ تھے

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:۔

"مولانا محمد یعقوب صاحب کی تقریر میں علمی لغات بہت ہوتے تھے، مگر بے ساختہ، اور ان کے یہاں اتنے علوم تھے کہ سبحان اللہ ان کی تقریریں کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک کتب خانہ کھول دیا۔ مگر پھر بھی جہاں شبہ ہوتا تھا، ماتحت مدرسوں سے پوچھ لیتے تھے اور باوجود اس تبحر اور کمال کے مولانا رشید احمد صاحب کو بجائے مرشد کے سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے تو اپنی اصلاح کرانا چاہتے تھے، مگر جب غصہ آتا تھا، تو ناز میں ان کو بھی بہت کچھ کہہ ڈالتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ دو آدمیوں نے ۲۸؍ شعبان کو چاند کی گواہی دیدی اور کہا کہ پہلے چاند میں غلطی ہو رہی ہے ہم نے وہ چاند بھی ۲۹؍ کو دیکھا ہے اس حساب سے آج ۲۹؍ ہے، مولانا نے (حسن ظن کے باعث) (گواہی) قبول فرمالی حسن ظن بہت تھا۔ اور شرح صدر ہو گیا، حکم دیدیا کہ کل روزہ رکھا

جائے۔ لوگوں نے اعتراضات بھی کئے۔ مولانا (رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ) کو خبر ملی تو فرمایا کہ وہ گواہ ثقہ نہ تھے، تو مولانا محمد یعقوب صاحب کو غصہ آ گیا اور فرمایا جی ہاں ثقہ کون ہے بجز مولانا کے اچھی بات ہے، قیامت کا دن آنے والا ہے، ہم ہوں گے مولانا ہوں گے، اللہ میاں ہوں گے اس وقت معلوم ہوگا کون ہے ثقہ، مولانا گنگوہی نے سنا تو ہنسنے لگے، اتفاق سے اس حساب سے تیس روزے ہونے کے بعد چاند ندارد، میں نے اس گھر میں جس میں اب میاں اظہر رہتے ہیں اور اس وقت والد صاحب بھی تھے تیسری منزل پر جا کر دیکھا مگر نظر نہ آیا گو بہت جی چاہتا تھا کہ چاند نظر آ جائے تا کہ لوگ مولانا پر اعتراضات نہ کریں، جب چاند نہ ہوا تو مخالفوں نے مولانا سے عرض کیا کہ رویت نہیں ہوئی فرمایا رویت کا حکم ۲۹ کو ہے ۳۰ (تیس) کو نہیں ہے، رویت کی ضرورت نہیں بس کل عید کرو، تو دیوبند میں دو عیدیں ہوئیں، مکہ معظمہ خبر پہنچی تو حضرت (حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ) نے خط لکھا کہ سنا ہے کہ آں عزیز کی لوگوں نے بہت مخالفت کی ہے، آں عزیز حق پر ہیں، یہاں بھی رمضان اور عید آں عزیز کے حساب کے موافق ہوئے سبحان اللہ کیسا ناز کا معاملہ ہے۔ (۱)

راقم الحروف کے نزدیک یہ مسئلہ پیچیدہ سا ہو گیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دو شخصوں کی گواہی کے باعث مولانا کو حسن ظن نے مشکلات سے دوچار کر دیا۔ حاجی صاحبؒ نے بھی تائید فرمائی ہے، غالباً مکہ معظمہ میں چاند کی رویت کو یہاں دیوبند کے لئے کافی سمجھا کیونکہ فقہا کے نزدیک اگر کسی جگہ چاند دیکھ لیا جائے تو رویت ثابت ہو جاتی ہے مگر مکہ معظمہ اور یہاں کے مطالع میں تو بہت فرق ہے اس کا فیصلہ علما ہی کر سکتے ہیں ہم نے تو سوانح نگار کی حیثیت سے یہ واقعہ پیش کیا ہے۔

عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پر شبہ اور مولانا یعقوبؒ کا جواب

"ایک بار حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا ہی عجیب و غریب مضمون ایک حدیث کے شبہے میں فرمایا تھا، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن ابی بن کعب منافق کے جنازے کی نماز پڑھانے کیلئے تیار ہو گئے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اس کے ایسے ایسے اقوال وافعال ہیں، آپ نے التفات نہیں فرمایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آیت تلاوت کی

(۱) تکمیل الکلام ص ۳۹ ملفوظ ۲۵

استغفرلهم اولا تستغفرلهم ان تستغفرلهم سبعين مرة فلن يغفرالله لهم (ان منافقین کیلئے آپ استغفار کریں یا نہ کریں اگر آپ ستر مرتبہ بھی ان کیلئے دعائے مغفرت کریں گے، تو پھر بھی اللہ ہرگز ان کو نہیں بخشیں گے) تو حضور نے فرمایا کہ مجھے اختیار دیا گیا ہے تو میں نے استغفار کو اختیار کرلیا۔ اور میں ستر بار سے زیادہ (اس کے لئے استغفار) کرلوں گا، اب یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ عربی کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ یہ اَوْ تخییر کے لئے نہیں ہے بلکہ تسویہ کیلئے ہے جیسے، سوآء عليهم ء انذرتهم ام لم تنذرهم لايومنون (ان کے لئے برابر ہے آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں کافر ایمان نہیں لائیں گے) اس میں بھی تخییر نہیں ہے تسویہ ہے اور محاورے کے مطابق یہاں ستر کے عدد سے تحدید مقصود نہیں بلکہ تکثیر مقصود ہے تو پھر حضور ﷺ نے یہ کیسے ارشاد فرمایا، تو حضرت مولانا (محمد یعقوب صاحب) نے یہ جواب دیا تھا کہ شدت رافت اور رحمت کی وجہ سے آپ نے الفاظ (خداوندی) سے تمسک (حجت پکڑنا) فرمایا، معنی کی طرف التفات نہیں فرمایا، مگر اس طرح کے استدلال کے واسطے دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ ضرورت ہو، دوسرے یہ کہ معنوں کا انکار نہ ہو، اور یہ شرطیں میں نے قواعد کلیہ سے سمجھی ہیں خودکشی کے واقعہ میں ضرورت کا ہونا ظاہری ہے اور دوسرے واقعہ، حدیث میں ضرورت تھی، جس کا ظہور بعد میں ہوا کہ بہت سے لوگ اس رافت ورحمت کو دیکھ کر مسلمان ہوگئے۔ (۱)

طبیات

سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

العلم علمان علم الاديان وعلم الابدان.	علم دو ہیں، مذاہب کا علم اور انسانی بدنوں کا علم۔

اور یہ دل کو اپیل کرنے والی حقیقت ہے، کیونکہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے، ایک روح دوسرا جسم، بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے۔ اس اشرف المخلوقات کی روح اور جسم دونوں کو عوارض پیش آتے رہتے ہیں، روح کو بھی متعدد بیماریاں مثلاً چوری، شراب خوری، غیبت، چغل خوری، بدگوئی، غصہ، بخل بے دینی لاحق ہوجاتی ہیں اسی طرح جسم کو بھی بخار، کھانسی، زکام، نزلہ، نمونیہ، ہیضہ وغیرہ، لہٰذا قدرت نے انسان کی روحانی اور

(۱) [illegible]

جسمانی بیماریوں کا علاج اور درستی کا بھی سامان فراہم کیا ہے، روحانی بیماریوں کے علاج کیلئے روحانی معالجین بھیجے، جن کو انبیاء کہا جاتا ہے اور جسمانی علاج کے لئے اطباء پیدا کئے اور حکماء کو فہم و فراست دی کہ وہ نباتات، جمادات اور حیوانات کی مختلف اشیاء کے حقائق و فوائد اور خواص معلوم کریں۔ چنانچہ ان دونوں کیلئے خالق کائنات نے علاج کا سامان فراہم کیا۔ اور یہ فطرت کا صحیح تقاضا تھا کہ روح اور جسم کی شفا اور علاج کی تدبیریں مہیا کی جائیں۔ چنانچہ ہمارے پیغمبر ﷺ جہاں روحانی طبیب تھے وہاں جسمانی امراض کے بھی بے پناہ معالج تھے۔ اس لئے روح کے معالج کے بعد جسم کے معالج کا بڑا اونچا مقام ہے۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ایک حاذق طبیب

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو علوم و فنون کے سیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ فن طب کے بارے میں کوئی تحریر ایسی نہیں دیکھی جس سے معلوم ہو کہ آپ نے طب کو کسی سے پڑھا ہے، چونکہ عالم بے بدل تھے اس لئے علم طب بدیہی ہے اور اس کا تجربہ نظری اس لئے اس علم کو اپنے مطالعہ اور شوق سے حاصل کیا۔ اور تجربات علاج سے مہارت حاصل کی، چنانچہ آپ کے نسخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے زمانے کے ماہر طبیب تھے۔ یہی حال طب میں مولانا گنگوہی کا تھا کہ ذاتی مطالعہ اور علاج کے تجربوں سے حضرت گنگوہی کو طب میں ماہرانہ حذاقت حاصل ہو چکی تھی، جب آپ کے صاحبزادہ حکیم مسعود احمد دہلی سے باقاعدہ طبابت پڑھ کر واپس آئے تو مولانا گنگوہی نے پھر طبابت کا کام اپنے فرزند ارجمند کے سپرد کر دیا تھا۔ الغرض ان حضرات کو طب کا علم دشوار نہ تھا، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے، بہت سے مریضوں کے کامیاب علاج کئے ہیں، خود حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرض موت میں بھی مولانا نے علاج کی خدمات انجام دی ہیں، انہیں جہاں مطالعۂ طب اور تجربات کا ذوق تھا۔ وہاں دوسرے حاذق اطباء کے مفید اور مجرب نسخے حاصل کرنے کا بھی شوق تھا، اپنے مرید سعادت مند کو مولوی ارشاد حسین سے نسخے حاصل کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"جب بندہ اجمیر میں تھا، ان دنوں مولوی ارشاد صاحب نے چار نسخے مختلف امراض کے نہایت مجرب بتلائے تھے، ایک نسخہ تو خوب یاد ہے اور

میرا معمول ہے۔ تین نسخے بھول گیا اور دو نا تمام یاد ہیں، ایک نسخہ جو یاد ہے دانتوں کا منجن ہے اور دو نا تمام۔ ایک طلاء ہے اور ایک آتشک کا ہے، اور جو کاغذ مولوی صاحب نے عنایت فرمایا تھا وہ کھویا گیا، عرض یہ ہے کہ اگر کبھی مولوی صاحب سے ملاقات ہو تو یہ چاروں نسخے تحقیق کر کے مولوی صاحب سے لکھوا کر بھیج دیجیو" (۱)

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے ملازمت سے ہی علم طب کے حصول کا رجحان ہو گیا تھا کیونکہ مولانا کی ملازمت کی ابتدا اجمیر سے ہوئی ہے۔ بہرحال جس طرح مولانا نے مرشد کامل کی سعادت حاصل کر کے سینکڑوں کو روحانی شفا کا سامان فراہم کیا۔ اسی طرح جناب موصوف نے مخلوق خدا کے جسمانی علاج کا فیض جاری فرمایا۔ بہت سے مریضوں کے علاج کئے، درحقیقت پہلے زمانے کے شرفاء اور رؤسا اپنے بچوں کو دینی اور طبی تعلیم دلا کر فیض کا سامان بہم پہنچاتے تھے، مفت علاج کر کے خلق خدا کو فائدہ پہنچاتے تھے یہ لوگ گھر کے زمیندار اور صاحب جاہ و مال ہوتے تھے کسی مریض سے فیس لینا اس دور میں معیوب سمجھا جاتا تھا مگر آج کے دور میں ڈاکٹروں اور اطباء کا مقصد کسب زر کے سوا کچھ نہیں، بس اللہ تعالیٰ بیماری سے بچائے کہ ڈاکٹروں کی ضرورت نہ ہو۔

ادبیات

حضرت مولانا حافظ، عالم، طبیب اور مرشد کامل ہونے کے علاوہ اردو، فارسی اور عربی زبان کے شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری کا معمولی سا ذخیرہ بیاض یعقوبی میں موجود ہے، اردو، فارسی اور عربی نثر پر بھی مولانا کو قدرت حاصل تھی،

اُردو نثر

آپ کی اردو نثر کے متعلق ایک ناقدانہ نظر کے تحت یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں کوئی تکلف اور تصنع نام کو نہیں جو کچھ قلم کی زبان پر آتا چلا جاتا ہے لکھتے چلے جاتے ہیں، دوبارہ جملے کو دیکھنا اور فعل، فاعل، مفعول، مضاف، مضاف الیہ اور صفت و موصوف کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنا ان کے خیال میں وقت کا ضائع کرنا اور ثقاہت کے خلاف ہے۔ یہ انیسویں صدی کا دور ہے،

---

(۱) مکتوبات یعقوبی

جس میں اردو نہ صرف کافی صاف اور ہموار ہو چکی تھی، بلکہ غالب نے اس کو مانجھ کر اور صاف کر کے صیقل کر دیا تھا، تاہم مولانا کی اردو نثر میں کتنے ایک خطوط میں بالکل سادگی اور صفائی ہے، ہم مولانا کے مکتوبات میں سے ایک مکتوب بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ایک خط میں منشی محمد قاسم نے، مولانا محمد قاسم صاحب بانیٔ دار العلوم دیوبند کے انتقال کا حال پوچھا ہے۔ مولانا ان کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"تم نے حال انتقال جناب مولانا محمد قاسم مرحوم کا پوچھا ہے۔ مولوی صاحب سہارنپور تشریف لے گئے تھے، کسی قدر طاقت آ گئی تھی، وہاں معمولی صفرا کا دورہ ہوا اور اس میں درد ذات الجنب بھی، جب یہاں خبر ہوئی اسی وقت جا کر لے آئے، حرکت راہ سے درد نے شدت کی، یہاں تک کہ سانس بند ہو گیا ناچار فصد لی۔ درد کو تخفیف ہوئی۔ رات کو پھر درد نے عود کیا۔ کچھ تدبیر کارگر نہ ہوئی اگلے روز کچھ طبیعت اصلاح پر آئی، ایک طبیب دہلی سے آئے تھے، انہوں نے کوئی مفرح اور کوئی کشتہ دیا اس سے کچھ قوت کو نفع ہوا مگر بخار کو شدت آ گئی، پہلے ایک مسہل ہوا تھا اور اس کا نفع معلوم ہوا اس پر پھر مسہل کی رائے ہوئی مسہل دیا کچھ دن چڑھے تلک ہوش رہا دو دست آئے۔ دوپہر کے قریب بے ہوشی نے غلبہ کیا اور دست بند ہو گئے، حرارت کی شدت تھی اس وقت شربت وغیرہ دیا نفع نہ کیا بلکہ نفخ ہو گیا اور بے ہوشی ایسی ہوئی کہ نماز ظہر ادا نہ ہو سکی یہ منگل کا دن تھا، شام کو حالت نزع کی سی ہو گئی، مگر پھر سانس درست ہو گیا یہ دورہ مرض کا تھا۔ رات بھر وہی کیفیت رہی اور بدھ کے تمام دن یہی حالت رہی، زبان بند، ہوش مطلقاً مفقود، البتہ سانس کیساتھ پاس انفاس جاری، جمعرات کی صبح کو پھر فصد لی، سینگیاں لگائیں، اقسام علاج کئے مگر کچھ نفع نہ تھا، بدھ کے روز تشنج ہوا۔ آج (جمعرات کو) اس کی صورت لرزے کی سی ہو گئی، آخر بعد ظہر قریب تین بجے بروز جمعرات (بتاریخ ۴ر جمادی الاول ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵ر اپریل ۱۸۸۰ء) رخصت ہوئے، ہم سب لوگ نماز کو آئے تھے اندر اول زنانہ تھا، پھر کچھ آدمی پہنچ گئے تھے کہ یکایک بلغم بول کر بلغم کی قے آئی اور سانس لمبا ہو کر منقطع ہو گیا

جب ہی سے تجہیز و تکفین کا فکر کیا، بعد عصر نماز جنازہ ہوئی، بعد مغرب دفن کیا اور میرا حال کیا پوچھتے ہو۔ یہ صدمہ جانکاہ ایک جہان کو ہے میں تو سخت دل سخت جان آدمی ہوں کسی کے مرنے کا رنج بہت نہیں ہوتا، مگر اتنا غم کسی کا نہیں ہوا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اب زندگی تلخ ہوگئی، دو دن بعد (۶/ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ کو) جناب مولوی احمد علی صاحب کا انتقال ہوگیا، کئی ماہ سے بیمار تھے یہ سہارنپور کے رہنے والے محدث اور فقیہ مشہور تھے ہمارے استاد تھے، بخاری و مسلم کتابیں حدیث کی دہلی میں میرٹھ میں انہوں نے چھاپی ہیں۔ نہایت مشہور بڑے عالم تھے اور مولوی عبدالحئی لکھنوی کے مشہور عالم ہیں مگر انکی خبر انتقال غلط معلوم ہوئی، مولوی لطف اللہ صاحب لکھنوی کا انتقال ہوا یہ دھوکہ ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جہان گزران جائے ہے مقام نہیں آدمی کمر بستہ رہے، جب کام درست ہو اللہ تعالیٰ استقامت نصیب کرے۔ (۱)

مولانا کا مکتوب آپ کے سامنے ہے آپ ہی سوچئے کہ اس خط کی نثر کتنی سادہ بے تکلف اور بے تصنع ہے، زبان میں گھلاوٹ، الفاظ ہلکے پھلکے، عبارت رواں، فصیح و بلیغ اور قلم برداشتہ ہے۔ اظہار مطالب پر پوری قدرت، واقعۂ وفات اور حالت مرض کی کیا اچھی محاکات ہے۔ نثر کے لئے بیاض یعقوبی اور سوانح قاسمی (مرتبہ مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ) کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

اُردو شاعری

مولانا نے اردو شعر و سخن میں جہاں تک ہماری تحقیق کی رسائی ہے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا اور اس فن کو اپنے لئے کبھی کوئی خصوصی صفت سمجھ کر حاصل کرنے کی طرف توجہ نہیں دی، اس لئے سلسلۂ شعر و سخن میں ان کے لئے کسی کو استاذ بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اب صرف یقین کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ نے جو کچھ نظم و غزل کا شوق فرمایا شاعری کے خداداد فطری ذوق کے ماتحت تھا، اور یوں تو آپ کے ہم عصروں میں الا ماشاء اللہ سب ہی شاعر تھے، اگرچہ شاعری ان کا بھی مقصد زندگی نہ تھا بس اتنا ہی شغل تھا کہ کبھی جب

(۱) ۲۳/ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ (مکتوبات یعقوبی)

دل میں کسی اثر نے ولولہ پیدا کیا تو اس نے شعر کی شکل میں اختیار کرلی۔ مولانا کے والد محترم جناب مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود بھی بہترین شاعر تھے، اسلئے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ماحول نے ان کو شعر وسخن کی طرف مائل کیا۔

تخلص

یہ امر قابل غور ہے کہ آپ نے اپنا تخلص گمنام کیوں رکھا، ورنہ اس جماعت کے پہلے دور میں کے شاعر علماء یا تو اپنا نام استعمال کرتے تھے اور یا پھر تخلص ہی نہ رکھتے تھے، حاجی امداد اللہ صاحب امداد اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ قاسم ہی تخلص کرتے تھے، لیکن مولانا یعقوب صاحبؒ نے تخلص کیلئے شاعرانہ شان کے برعکس کوئی اسم استعمال کیا تو وہ گمنام اختیار کیا لکھتے ہیں۔

ہم نے گمنام وہاں پاؤں جمائے اپنے
پا فرشتے کا بھی جس جا پہ پھسلتا دیکھا

شاعری کا رنگ

آپ کی شاعری خالص اسلامی شاعری ہے، کیونکہ آپ کا جس قدر کلام ہے اس میں حمد ونعت، مدح مرشد، شوق دیدار الٰہی، شوق زیارت حرمین یا معرفت کے سوا اور کچھ نہیں، غزل میں بھی معرفت کا ہی جلوہ نظر آتا ہے اور بات تو وہی ہے جس کا تذکرہ میں ابھی کرچکا ہوں، کہ ان صاحبان کا معاملہ فن شعر کے ساتھ ایک زائد اور دور از کار کا سا معاملہ تھا، کبھی کوئی محرک سامنے آیا اور بے ساختہ پن میں، فن شعر کا لحاظ رکھے اور کانٹ چھانٹ کئے بغیر جو کچھ قلم کی زبان پر آتا چلا گیا لکھ دیا، لیکن ان تمام خیالات کے باوجود ان کے کلام سے فن شاعری کا پتہ چلتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مختلف عربی، فارسی اور اُردو شعرا کے دیوان دیکھے ہیں، اپنے ایک خط بنام منشی محمد قاسم میں لکھتے ہیں۔

"درمیان اشعار دیوان حافظ اور مثنوی وغیرہ اور شعرا میں سے خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ، سودا، ذوق کا دیوان لے کر کچھ اشعار متفرق لے لو۔(۱)

مولانا کا مقصد مذکورہ اشعار میں تصوف اور معرفت کا کلام ہے، چنانچہ حافظ، مثنوی اور خواجہ

(۱) مکتوب یعقوبی ص ۱۱۲

میر درد کا اکثر کلام اسی معنی میں ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کو مذکورہ شعراء کے کلام سے دلچسپی تھی اور مثنوی مولانا روم تو آپ کی جان تھی۔

ذوق شعری

آپ کے مکتوبات کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بہت سے اُردو اور فارسی کے منتخب اشعار یاد تھے، یہ ان کے ذوق کی دلیل ہے۔

ذخیرۂ شعری

آپ کی شاعری کا مجموعہ جو ہمارے سامنے ہے وہ حسب ذیل تفصیل کے ساتھ بیاض یعقوبی سے معلوم ہوا ہے اس بیاض میں۔

(۱) ایک قصیدہ میمیہ ہے جو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ والہانہ محبت اور عشق کا نتیجہ ہے اس قصیدے کے (۲۴۵) اشعار ہیں۔

(۲) ایک اور قصیدہ نعتیہ ہے جس کے (۲۲) اشعار ہیں۔

(۳) ایک اور مدحیہ قصیدہ ہے جو اپنے مرشد حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں ہے جس کے دو سو تین اشعار ہیں۔

(۴) ایک غزل عشق حقیقی میں ہے جس کے چھیاسی (۸۶) اشعار ہیں۔

(۵) ایک اور غزل توحید میں ہے جس کے دس اشعار ہیں۔

(۶) ایک اور غزل توحید پر ہے جس کے پندرہ اشعار ہیں، اس کے علاوہ اور چار اشعار توحید میں ہیں۔

(۷) ایک شجرۂ بیعت ہے جس کے پچیس (۲۵) اشعار ہیں یہ اردو شاعری کا مجموعہ ہے جو بیاض یعقوبی میں درج ہے لیکن فارسی اشعار کی تعداد یہ ہے۔

فارسی کلام

(۱) حج بیت اللہ کے زمانہ میں سفر مدینہ کے دوران میں نعتیہ اور عشقیہ اشعار تیرہ (۱۳) ہیں جو فارسی زبان میں ہیں۔

(۲) اسی طرح ایک فارسی نعت کے اشعار کی تعداد نو (۹) ہے۔

(۳) فارسی میں منظوم شجرہ قادریہ پچاس (۵۰) اشعار پر مشتمل ہے۔

(۴) فارسی کے چند قطعات ہیں۔

(۵) چند فرد اشعار فارسی میں ہیں۔

(۶) دو تین فارسی رباعیات ہیں۔

ہمارے خیال میں یہ قطعات، فرد اور رباعیاں بابا طاہر عریاں کی ہیں، ان کے اوّل میں از بابا رحمۃ اللہ علیہ لکھا ہے۔

عربی کلام

مولانا نہ صرف اردو اور فارسی کے ہی شاعر ہیں بلکہ عربی زبان میں بھی بے تکلف لکھتے ہیں۔ چنانچہ بیاض یعقوبی میں آپ کے اپنے لکھے ہوئے عربی کے نعتیہ اشعار موجود ہیں، اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے روضہ اُقدس پر پڑھے ہیں یہ کل چھ شعر ہیں۔ البتہ قصائد قاسمیہ میں سلطان عبد الحمید خاں خلیفہ ترکی کی شان میں طویل قصیدہ عربی زبان میں ہے اس کے سوا آپ کا کلام ناپید ہے۔

اصناف سخن

ان اشعار میں صنف شعر کے لحاظ سے اگر نظر ڈالی جائے تو قصیدہ، نعت، حمد، غزل، رباعی، قطعہ، فرد وغیرہ مختلف اصناف ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ہر صنف پر قدرت اور بصیرت حاصل تھی پھر نہ صرف اصناف بالا میں ذوق تھا، بلکہ تاریخ نکالنے میں بھی آپ کو خوب مہارت حاصل تھی۔

قطعات وغیرہ میں سے منتخب اشعار قاری کی ضیافت طبع کے لئے لکھتے ہیں۔

نظم

دیدہ جویائے دید ہے ہر دم — آہ حسرت مزید ہے ہر دم

چشم سر راہ گوش بر آواز — بے سبب انتظار کے انداز

کس کی حسرت کروں رہا کیا ہے — غم کروں کا ہے کا گیا کیا ہے

آہ باقی ہے کا ہے کی امید — چشم یعقوب ہو گئی ہے سفید

بوئے یوسف کہیں سے آجائے جس سے چشم سفید کھل جائے
نہیں آتے بہت ہوئی دوری کب تلک یہ رہے گی مہجوری
کام بنتا نہیں کوئی ہم سے ربط رہتا ہے درد اور غم سے
کوئی صورت نہیں یہاں ظاہر جس سے ہو کچھ تسلیٔ خاطر
کوئی مشفق کہ چارہ ساز رہے کوئی محبوب جاں نواز رہے
جب یہ سب کچھ نہیں تو اے گمنام کیا عجب ہے کہ تو رہے ناکام

شاعر عشق حقیقی میں مبتلا ہے، محبوب کی حریم ناز تک رسائی چاہتا ہے، اس کو اس کی تلاش ہے اور اس کی جدائی شاق ہے، جذبۂ بے اختیار شوق میں بیتاب ہے لیکن ایک دم مایوسی سے دو چار ہوتا ہے اور اپنی ناکامی کا اعلان کر دیتا ہے۔ اشعار میں درد، مایوسی، اور شوق طلب کے علاوہ روانی، سادگی اور سلاست ہے۔ مذکورہ بالا نظم کے بعد کے اشعار بھی ملاحظہ کیجئے بقیہ نظم۔

کہتے ہیں یاس کو کہ راحت ہے کیا ہے راحت کہ اک جراحت ہے
پھر بہار آئی جنوں خوش ہو موسم گل ہے جوش خوں خوش ہو
اے جنوں عقل سے رہائی دے دستگیری کر اور ثواب تو لے
عقل کی قید سے ہو آزادی کب تلک عقل کا ہوں فریادی
فکر سے ہر گھڑی کے ہو آرام خواہ ہوں کامیاب یا ناکام
یہ تردد تو ہر گھڑی کا نہ ہو یہ تماشا تو ہر کسی کا نہ ہو
ہاں خبر لے شتاب سن فریاد حد سے گزری ہے عقل کی بیداد
کر گریباں کو تار تار تمام سر سے اترے یہ بار ننگ و نام
خاک پر لوٹ، خاک منہ پر مل خاک پر خاک سے مل دل
سینہ کر دے خراش ناخن سے دل کو پاش پاش ناخن سے
چشم جاری جو کر دے چشمۂ خوں مصرع عشق خوب ہو موزوں
باندھ دے تار اشکباری کا گرم بازار بے قراری کا
آہ کرنے سے ربط مردم ہو ضبط کا کام دمبدم کم ہو
آ وَ گمنام بیٹھے تم کیا ہو
چل بھی دو کس کا راز افشا ہو

زندگی اپنی ہے کہ خواب وخیال | کہ ہر اک آن نیا ہے حال
دل پژمردہ کیا شگفتہ ہو | تن کا ہیدہ خود مثل خلال
کوئی سامان دین کا نہ بنا | پایا دنیا میں بھی جاہ نہ مال
شکر ہے سینکڑوں سے بہتر ہوں | اب بھی جیسا بھلا برا ہے حال
آفریں تجھ پہ ہمت کوتاہ | طالب جاہ ہوں نہ طالب مال
درد دل کی ہوس رہے دائم | نہ کرامت طلب، مقام، نہ حال
دل سوزاں میں شعلۂ غم ہو | چشم گریاں کا شمع کا سا حال
تو نے دامن پکڑ لیا ان کا | ایک عالم پہ جن کے ہیں افضال
ظاہر و باطن اتباع نبی | راہ سنت پہ ہے قیام، کمال
اللہ اللہ مرتبہ ان کا | اللہ اللہ ان کا جاہ و جلال
کچھ تو ہو جائے بہر حق امداد (۱) | میرا خالی پھرے نہ دست سوال
آستانے پہ کھینچ لو اپنے | پاشکستہ ہوں اور بے پر وبال
ایک قطرہ نصیب ہو مجھ کو | موجزن ہر کہیں ہے بحر نوال

مدح میں ان کے وہ پڑھوں مطلع
واہ واہ، سن کے کہہ دیں اہل کمال

مظہر اللطف ملجأ الآمال | منبع الجود مطلع الافضال
اگر امداد ہو وے یا اللہ | ہو قوی جو ضعیف ہے فی الحال
عذر معذور کا یہ ہو مقبول | ہو وے گمنام کا قبول سوال

اگرچہ یہ قصیدہ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں ہے لیکن اس میں، دنیا اور دنیا والوں کی مذمت اور اپنی حالت زار پر افسوس اور پیر و مرشد سے اپنے درد دل کا اظہار ہے اس قصیدے کے دو سو تین اشعار ہیں اس کو آپ قصیدہ لامیہ کہہ لیجئے۔

(۲) دوسرا قصیدہ سرور کائنات رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہے یہ قصیدہ میمیہ عشق رسالت مآب کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جو ۲۴۵ر اشعار پر مشتمل ہے اس کا آغاز اور عنوان ہے

---

(۱) حاجی امداد اللہ صاحب مرشد کی طرف اشارہ

قصیدہ میمیہ در نعت سیّد الابرار صلی اللہ علیہ وسلم

کہاں کہاں تو پھر آئے گی گردش لیّام — کبھی تو پائے کہیں خاطر حزیں آرام

یہ اس طرح سے گزرتی ہے زندگی اپنی — کہ ایسے جینے کو ہے دونوں ہاتھ ہی سے سلام

اٹھا کے لاش دل مردہ کی وہاں پہنچوں — صدور مسند عزت سے تا ہوں کچھ احکام

نبی کریمؐ رؤف ورحیم، معدن جود — شفیق عام، شہ انبیاء ورسل کے امام

پڑھوں میں نعت میں برجستہ مطلع زیبا
کہ جس کو دیکھ کے چکرائے گردش لیّام

ازل، ابد، کا ہوا ذات پاک پر ہے قیام — کہ دائرے کا ہے آغاز، پھر وہی انجام

یہ قرب ہے کہ ہوا ہی نہیں کسی کو نصیب — زباں آپ کی اور اس پہ ہے خدا کا کلام

شرف ہے حضرت عیسیٰ کو امتی ہونا — ہے ان کی ذات پہ امت کے اولیا کا ختام

بشارت آپ کے آنے کی پہلے دے دی تھی — اس ابتدا کی کریں گے وہ آن کر اتمام

بشارت آپ کی سب انبیا نہ کیوں دیتے — کہ بوئے مشک کو لازم ہے یہ، ہو نمّام

رسائی وصف معلیٰ تلک نصیب نہ ہو — تمام خلق سے ہوش وخرد اگر لوں دام

جہاں میں جو کوئی اعلیٰ ہو اس سے تم اعلیٰ — مقام جو ہو بلند اس سے تم بلند مقام

خدا کے بندۂ مقبول ابن عبداللہ — مگر وہ عبد کہ ہو سید عبد تمام

ممانعت ہے کہ کوئی تمہیں خدا نہ کہے — اور اس کے بعد زبان وقلم کو اذن، ہے عام

وہ کیا ہی آنکھیں تھیں جن کو تھا دیدار — ہماری آنکھوں پہ حائل ہیں پردہائے خیام

تمہارے حق میں زمیں مسجد وطہور ہوئی — ہوا ہے رعب سے مفتوح روم سے تا شام

قدوم پاک سے کانپے محل سلاطین کے — کہ خوف کھانے لگے جس سے مصر کے اہرام

جو نام پاک سنا تھا تو منہ کے بل گر کر — لیا تھا اپنے کلیجوں کو سب بتوں نے تھام

اطاعت آپکی بالکل اطاعت حق ہے — ومن یطع میں کسی نوع کا نہیں ابہام

وہ کون ہے جو نہیں ذات پاک کا خادم — مقام غار میں حاجب ہیں عنکبوت وحمام

ہجوم فتنہ سے ہے تنگ نوبت اسلام — خدا کے واسطے اٹھئے بہت ہوا یہ منام

دھیان کیجئے کتنا زمانہ گذرا ہے — ذلیل ہوتے ہیں جو کوئی دین کے ہیں کرام

کوئی نہیں کہ بنے کوئی دستگیر آکر خدا کے واسطے آکر کے لیجئے دین کو تھام
خدانے کی تھی جو کچھ سعی آپ کی مشکور رہاہے اس میں سے باقی نہ اب کہیں جز نام
نہیں ہے نام کو ایمان کا وجود کہیں جو رہ گئی ہے وہ باقی ہے صورت اسلام
ہمارا ہاتھ ہے اور آپ کا سدا دامن جبین ہم سے غلاموں کی، آپ کے اقدام
معاملات میں کچھ دین کا علاقہ نہیں برائے نام جو کچھ ہیں تو ہیں صلوٰۃ وسلام
ابھی یہ کچھ ہے خدا جانے اور آگے کو دکھائے گی ہمیں کیا کیا یہ گردش ایّام
یہ سچ ہے ہم نہیں لائق نگاہ عالی کے مگر بجز در دولت کدھر کو جائیں غلام
ظہور سنت عالی ہو، دفع ہوں بدعات جہاں کے جتنے ہیں سرکش وہ دین کے ہوں رام
وہ پھر ہو ملت اسلام کی جو عزت تھی یہ خار دفع ہوں تازہ ہو گلشن اسلام
مبالغہ ہے نہ اغراق وصف عالی میں ہے پست رتبۂ اعلیٰ سے ہر بلند کلام
یہی سبب ہے کہ مشہور جو سخن ور تھے جریر، جیسے فرزدق ہے اور ابو تمام
گئے ہیں جان بچا اپنی ایسے کوچے سے کہ اپنی فکر کو پاتے تھے اس جگہ ناکام
بنائے شعر ہے تخیل اور مبالغے پر کہ کہیے جود وسخاوت میں بحر اور ضرغام
تو ایسے وصف نہ لائق ہیں شان عالی کے بیاں سے بھی وہ باہر ہیں جو ہیں خلق عظام
خدا سے کم ہو خدائی سے تم زیادہ ہو بڑا ہو چھوٹا ہو، اچھا برا ہو، خاص ہو عام
صفائے ظاہر و باطن کہاں نصیب مجھے کہ جس خدمت عالی کا باندھ لوں احرام
امید لطف وعنایات سے قبول کی ہے برا بھلا یہ جو کچھ نعت میں ہوا ارقام

الٰہی بندۂ ناکارہ بے حقیقت ہوں
سدا خراب رہا اب بخیر ہو انجام،

مولانا کے طویل قصیدۂ شان رسالت ﷺ میں سے ہم نے جو کچھ اشعار منتخب کئے ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں ان کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کا ایک دریا ہے جو موجزن ہے اور اس زمانے میں قصیدہ نویسی کا جو انداز تھا وہ اس میں موجود ہے۔ مولانا کا نعتیہ قصیدہ اس قدر حقائق پر مبنی ہے کہ کیا مجال اس میں کسی قسم کی ناجائز اور حدود سے باہر کوئی صفت بیان کی گئی ہو۔

غزلیات

کاش پیدا نہ میں ہوا ہوتا / کاش شیدا نہ میں ہوا ہوتا
کاش ہوتا جو تھا وہ سب ہوتا / ایک رسوا نہ میں ہوا ہوتا
مرض عشق ہے نصیب اگر / کاش اچھا نہ میں ہوا ہوتا
دیکھتا شمع روئے یار کو اور / اس پہ پروانہ میں ہوا ہوتا
اور سب کچھ تو ہوتا اے گمنام
کاش پیدا نہ میں ہوا ہوتا

ہو رہا ہے ذرّہ ذرّہ آئینہ / عکس کے اس سے ہے ہر جا آئینہ
آئینہ میں اس کا رخ دیکھا کہ جب / نور رخ سے اس کے دیکھا آئینہ
دل شکستوں کو میسّر دید ہے / ٹوٹ کر بنتا ہے دل آئینہ
آئینہ پر ہم کو کیوں آئے نہ رشک
حسن کا ہے اس کے شیدا آئینہ

آئینے کے مضمون میں شاعر نے جو تنوع پیدا کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ اور اس غزل کا چوتھا شعر تو بیت الغزل ہے اور حق یہ ہے کہ یہ شعر مولانا نے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے۔

غزل دیگر بتبدیل قافیہ

حسن سے ہوتا ہے باہم آئینہ / لطف اٹھاتا ہے ہر دم آئینہ
حسن پر اپنے نہیں شیدا ہوئے / دیکھتے ہو جان من کم آئینہ
ہر گھڑی اس کا ہو امد نظر / اس لئے رہتا ہے بے غم آئینہ
کیا ہوا ہے حال اس کی یاد میں
دیکھ لے اے چشم پُر نم آئینہ

ان دونوں غزلوں کو ملاحظہ فرمایئے ان کے پڑھنے اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو غزل کہنے پر بڑی قدرت حاصل تھی، اور معنی میں تخیل کی پرواز بھی تھی، آپ کے غزلیہ اشعار میں میر درد کی معرفت کا سا رنگ پایا جاتا ہے۔

فارسی شعرو سخن

اردو شاعری جس شخص کی فطرت میں قدرت نے ودیعت رکھی ہو اور فارسی کی کماحقہ' اس کو تعلیم حاصل ہو تو بسا اوقات فارسی شاعری میں بھی اس کو ذوق نصیب ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانا فارسی شاعری کا بھی شوق فرماتے تھے، آپ کا فارسی کلام دیکھنے سے آپ کی فارسی شاعری پر قدرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

فارسی اشعار کا انتخاب اشعار گفتہ در راہ مدینہ

کن بر من خستہ جگر یار حمتہ للعالمین — ہم از سر لطفے نظر یار حمتہ للعالمین
پا بستہ عصیاں حقیر در دست شیطانم اسیر — پر خجلتم افگندہ سر یار حمتہ للعالمین
اشکے نہ در چشم بود نہ گرامی در دل مرا — ہم آہ و نالہ بے اثر یار حمتہ للعالمین
ہمچوں من سگ را اگر شد بر سر کویت گزر — ایں ہست ز امدادت اثر یار حمتہ للعالمین
من بد ترین دو جہاں من کہترین کن فکاں — سرگشتہ حیراں در بدر یار حمتہ للعالمین
بگذشتہ در عصیاں ہمہ نا کردہ اند عمر خیر — از حال خود بس بے خبر یار حمتہ للعالمین
اے کاش بودے چشم تر از عشق ہم داغ جگر — بادود آہ پر شرر یار حمتہ للعالمین
بادر دو غم آسودے در رنج و راحت بودے — عشقت اگر کردے اثر یار حمتہ للعالمین
اے کاش در دست صبا در کوئے تو بودے مدام — خاک من بے پا و سر یار حمتہ للعالمین
ہر کس ازیں در فیضیاب اے کاش ایں ہم رد باب — یا بد براں در رہ گزر یار حمتہ للعالمین
گمنام را اندر جہاں بس کیست فرما ملجائے — رفت از درت محروم اگر یار حمتہ للعالمین

بادا صلوۃ و صد سلام بر آل و اصحابت تمام
تا روز محشر مستمر یار حمتہ للعالمین

راہ مدینہ عشق رسالت مآب ﷺ میں اور بے سروسامانی کے احساس میں مولانا نے جو اشعار لکھے ہیں ان میں کوٹ کوٹ کر درد بھرا ہوا ہے اور جذبات دل کا یہ اشعار سراسر پیکر ہیں۔ کلام مربوط اور چست ہے، مذکورہ اشعار اظہار خیالات پر قدرت کا نمونہ پیش کر رہے ہیں۔

نعت صلی اللہ علیہ وسلم

حسب ذیل فارسی نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ملاحظہ کیجئے

بر سرم کوہ گنا ہے یا رسول اللہ — پیش لطف برگ کا ہے یار سولؐ
بر من خستہ جگر ہم کن نظر — از سر لطف نگا ہے یا رسولؐ
گر سلام ما چو یابد یک جواب — پس بود ایں عز و جا ہے یار سولؐ
نیست در کونین ہمچو من گدا — در دو عالم چوں تو شا ہے یار سولؐ
بر در فیضت رسیدم کن گناہ — بر چنیں حال تبا ہے یار سولؐ
با چنیں نالا نقہا بر درت — یا فتم ناگاہ را ہے یا رسولؐ
ہیچ کس را نیست درد در زماں — جز بامدادت پنا ہے یار سولؐ

کاش ازیں یک ہفتہ عشرہ ماندمے
بر درت سالے وما ہے یار سولؐ

پانچویں، چھٹے، ساتویں اور نویں شعر سے تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار روضۂ رسول اللہ تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑھے گئے ہیں اور مدینہ منورہ میں لکھے گئے ہیں، اشعار کا رنگ بتا رہا ہے کہ ایک عاشق، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں دردمند دل لے کر آیا ہے، سخت نادم ہے کہ سر پر گناہوں کا بار ہے اور اس سے کمر خمیدہ اور دوہری ہوئی جا رہی ہے، اسکے باوجود اس کی خوش قسمتی ہے کہ دربار میں آنے کی اجازت مل گئی ہے، مدینہ منورہ میں دس روز قیام کا موقع ملتا ہے چالیس نمازیں مسجد نبوی میں پڑھنے کا موقع دیا جاتا ہے، عاشق کا دل اتنے تھوڑے عرصہ کے قیام سے مطمئن نہیں ہے اس کا دل بے تاب متمنی ہے کہ سال بھر کا تو موقع ملے اور اگر یہ نہ سہی تو ایک ماہ ہی ٹھہرنے کی کوئی صورت نکل آئے، مگر تمنا اپنے بس میں نہ پا کر تڑپ اٹھتا ہے۔

یہ تو تھے عاشق کے جذبات، ان اشعار میں سادہ اور سلیس، بے تصنع اور بے تکلف فارسی زبان میں شاعر نے اپنے دلی جذبات کو پیش کیا ہے۔ اشعار میں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

عربی شاعری

اردو اور فارسی ادب کے بعد مولانا کے عربی ادب کا تذکرہ کرنا باقی رہ جاتا ہے۔ ہم نے

گزشتہ اوراق میں ہی کہا ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات جامع الصفات تھی وہ نہ صرف اُردو اور فارسی کے شاعر تھے بلکہ عربی شاعری میں بھی ان کا قلم کہیں نہیں رکتا تھا، فی البدیہ لکھتے چلے جاتے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک قادر الکلام جس کی مادری زبان عربی ہے اپنے قلم کو جب جنبش میں لاتا ہے تو عربی زبان اس پر فخر و ناز سے مرحبا بول اٹھتی ہے، ہم نے یہ اندازہ آپ کی شاعری سے لگایا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ہمیں آپ کی عربی نثر تلاش کے باوجود نہ مل سکی، لہٰذا شاعری سے ہی ہمیں بحث کرنا ہوگی، آپ کا عربی کلام جو اس وقت ہماری تحقیق میں آسکا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ آپ کا ایک عربی قصیدہ سلطان عبد الحمید خلیفہ عثمانیہ کی شان میں ہے جو قصائد قاسمی میں ہے، یہ قصیدہ ایک کم ساٹھ (انسٹھ) اشعار پر مشتمل ہے، یا سات نعتیہ اشعار ہیں یا ایک عربی قطعہ ہے جو دو اشعار کا ہے، یہ سات نعتیہ اشعار اور ایک قطعہ بیاض یعقوبی میں درج ہے۔

قطعہ عربی

هجرتُ الخلق طرا فی هواك و ایتمت العیال لکی اراك
ولو قطعتنی فی الحب اربا لما حنّ الفواد الی سواك

نعت صلی اللہ علیہ وسلم

یَاربِّ صَلِّ علیٰ النَّبیِّ محمد یٰسِیْن وَطٰهٰ ذِی الْمکارم اَحمَد
بابی واُمّی ذَا الرَّسُول الاکرم نَفسی الفِدَاء له وَ مَامَلَکت یَدِی
اَلیَوْمَ یا اَمْلِی رَیَا کُلَّ المُنی وَشفا عتی ونَجاح نفسیِ فی الغد
اَنت الکریم رؤفناَ و رَحِیمُنَا یاسیدی یا سیدی یاسیدی
فَبحُبِّه ارجوا النعیم بجَنَّةٍ وحظیت فی الدُنْیَا بعَیْش ارغد
فی فَرْحَةٍ من حُبِّه وَمَسَرَّةٍ لاَزلْتَ مَذارعی باِسْم مُحمَّدٍ

(بیاض یعقوبی ص ۸۶)

اخلاق وعادات

تمام عبادتوں، ریاضتوں مجاہدوں، تحصیل علوم وفنون کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے اخلاق وخصائل اور اطوار وعادات شریعت اور طریقت کے سانچے میں ڈھل کر بے ساختہ انسان کے ظہور میں آئیں تاکہ ایسی شخصیت سے بنی نوع انسان کو مثالی طور پر نفع پہنچے اور وہ اور دوسرے بنی نوع انسان اچھے افراد بن کر شہریت کے بہترین انسان بن سکیں، ایسے افراد پر مشتمل معاشرہ ایک بہترین معاشرہ کہلانے کا مستحق ہوگا اور اجتماعی زندگی میں امن وسکون، مسرت وخوش وقتی اور ایک دوسرے سے تعاون کا مظاہرہ ہوگا، اس قسم کے افراد جو ایمان اور عمل صالح کا پیکر بن کر امت کے سامنے آئیں گے وہ فرشتوں سے بھی افضل کہلانے کے حقدار ہوں گے۔ اخلاق اور آداب انسانیت کے جواہر ہیں، جن سے انسان انسان بنتے ہیں۔ بقول شاعر۔

ادب بہتر از گنج قارون بود فزوں تر زملک فریدوں بود
بزرگاں نہ کردند پروائے مال کہ اموال راہست رود رزوال

مسلمان کے لئے ادب اور اخلاق، اخلاق کے سب سے بڑے پیکر پیغمبر اعظم ﷺ سے ملیں گے جن کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ **انك لعلی خلق عظیم** اور بقول شاعر۔

ادب آموز ازاں ادیب کہ او
ادب از لوح کبریا آموخت

اسی خلق کا نتیجہ تھا کہ نامساعد حالات میں سرورکائنات ﷺ کے اعلیٰ اور ارفع اخلاق اور بزرگان دین کی مثالی مسلمانی سے دنیا میں اسلام پھیلا۔ علماء ربانی جو نائبین رسول ہوتے ہیں، ان کے لئے پیغمبر کے اخلاق کی نیابت بھی لازمی ہے، اس معیار کے مطابق عابد وزاہد وعالم مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاق وعادات کو ان کی زندگی میں تلاش کیجئے جو حسب ذیل ہیں۔ جس سے ان کی قطعیت اور درویشی کا ثبوت ملتا ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت اور اخلاق وعادات پر حسب ذیل روایات سے روشنی پڑتی ہے۔ جس سے ان کی سیرت کا ایک ایک پہلو نمایاں ہو جاتا ہے اور جن سے سلوک کی منزلیں طے کرنے میں مثالی طور پر مدد ملتی ہے، حسب ذیل تمام حوالے رسالہ الہادی رجب ۱۳۵۷ھ سے لئے گئے ہیں۔

صبر یعقوب و تسلیم و رضا

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جب انتقال ہوا تو ان کے چودہ آدمی گھر کے ان سے پیشتر چند ہفتوں کے اندر اندر مر چکے تھے، بڑے صابر تھے کبھی نہ روئے نہ کوئی بے صبری کی بات منہ سے نکالی۔ ہاں ایک مرتبہ تنہائی میں بیٹھے ہوئے میں نے سنا کہ یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

جز بہ تسلیم و رضا کو چارہ در کف شیر نر خونخوارہ

سادگی و بے تکلفی

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ گنگوہ تشریف لائے مولانا کے پاجامے میں بجائے کمر بند کے بان پڑا ہوا تھا، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ بان کیوں ڈالا ہے؟ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ کمر بند تلاش کیا مگر اس وقت ملا نہیں اس لئے بان ڈال لیا۔ مولانا گنگوہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اچھا میرا کمر بند جو الگنی پر پڑا ہے ڈال لو۔ چنانچہ کمر بند باندھنے کا ارادہ کیا تو دیکھا کہ اس میں روپیہ بھی بندھا ہوا ہے، حضرت سے کہا کہ اس میں تو روپیہ بھی بندھا ہوا ہے، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مع روپیہ کے کمر بند آپ کی نذر ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے روپیہ لے لیا اور کمر بند پاجامے میں بلا تکلف ڈال لیا۔

گدھے پر سواری

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ قول نقل فرمایا کہ ہر شخص میں کچھ نہ کچھ باطنی روگ اور مرض ہوتا ہے جو مجاہدے سے رفع ہو جاتا ہے، مگر مولانا محمد یعقوب صاحبؒ میں کوئی باطنی روگ نہیں (۱)

بے نفسی، عاجزی اور اخلاص

ایک مرتبہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کھانا کھا رہے تھے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب تشریف

(۱) الہادی رجب ۵۷ ۱۳ھ ص ۴۹

لے آئے، مولانا گنگوہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے ہاتھ میں سے روٹی کا ٹکڑا دے کر گھر میں اور کھانا لینے کے واسطے چلے گئے مولانا نے وہ ٹکڑا کھانا شروع کر دیا۔

غلطی کا اعتراف

اپنی غلطی کا اعتراف بمشکل ہی کوئی کرتا ہے، بلکہ غلطی کی تائید اور اس پر اصرار عام ہے۔ اور یہ پستی کی علامت ہے، بہادر اور وسیع قلب شخص وہ ہے جو اپنی غلطی کا اقرار کرے، اور جو بات نہ آتی ہو اس کے بارے میں صاف کہہ دے کہ مجھے نہیں آتی، ڈاکٹر کی سمجھ میں اگر مرض نہیں آتا تو وہ اس کا اقرار نہیں کرتا بلکہ وہ اٹکل پچو علاج شروع کر دیتا ہے۔ یہی حال اساتذہ کا ہے کلاس میں غلطی ہو جائے تو کیا مجال مان لیں، ایک پروفیسر نے کالج کی کلاس میں تاب ناک کو تان ہاک پڑھا دیا اور اس پر مسلسل اصرار کرتا رہا۔ اب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اعتراف غلطی کے متعلق مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سنئے فرماتے ہیں:۔ شہر والوں میں یہ عادت نہیں کہ اپنی غلطی کا اقرار کریں گاؤں والے بیچارے اپنی غلطی کا اقرار کر لیتے ہیں۔ شہر والے تو اس غلطی کو بناتے ہیں، مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں یہ بات دیکھی کہ ادنیٰ سے طالب علم نے اگر کوئی غلطی بتلا دی تو فوراً اقرار کر لیا کہ ہاں بھائی میری غلطی تھی، مولانا اپنے ماتحت مدرسین کے پاس کتاب لے کر جا بیٹھتے تھے اور جو بات سمجھ میں نہ آتی تھی اس کو پوچھ لیتے تھے۔

رعب و دبدبہ

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔ ”ایک مرتبہ مدرسہ دیو بند میں کسی نے آم بھیجے، سب طالب علم وہیں آم کھا رہے تھے اور مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی وہیں کھا رہے تھے مگر مولانا نے طالب علموں کی طرف سے پشت کر لی تھی، طالب علموں میں جو ثقہ (متین) تھے، انہوں نے مولانا کی پناہ لے لی تھی کیونکہ طالب علم آپس میں چپکے چپکے رس وغیرہ ایک دوسرے پر نچوڑ دیتے تھے پھر مولانا اٹھ کر حجرے میں چلے گئے اور مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ طالب علموں کے ساتھ یہ تماشہ دیکھتے رہے، طالب علموں میں خوب گٹھلی بکل چلا، پھر جب خوب چل پڑی، تو مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ باہر نکل آئے، مولانا کو دیکھ کر سب بھاگے، مولانا کی بڑی ہیبت تھی۔

رعب وخندہ

ایک اور ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا رعب تھا، لوگوں کی جان نکلتی تھی، حالانکہ ہر وقت ہنستے رہتے تھے۔(۱)

حسین وخوش پوشاک

مولانا تھانوی نے فرمایا کہ :۔

مولانا محمد یعقوب صاحب اپنے تمام مجمع میں خوش پوشاک، نازک مزاج اور نازک بدن تھے۔ اور حسین بھی ایسے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ شہزادہ ہیں۔(۲)

سر پر آموں کی گٹھری میں تواضع کا رنگ

مولانا تھانوی حکایت بیان کرتے ہیں کہ :۔

موضع املیا کے ایک شخص نے مولانا کی معہ طالب علموں کے آموں کی دعوت کی۔ وہ گاؤں دیو بند سے تین کوس ہے، سواری بھی نہیں لایا، مولانا معہ رفقا کے پیدل گئے اور وہاں آم کھائے، جب چلنے لگے تو اس نے بہت سے آم گھر لے جانے کے لئے دیئے اور بدتمیزی یہ کی کہ انکے پہنچانے کے لئے بھی مزدور تک نہ دیا، سامنے لاکر رکھ دیئے کہ ان کو لیتے جایئے، مولانا کا حصہ بھی اوروں سے زیادہ ہی دیا گیا، سب اپنے اپنے آم کپڑے میں باندھ کر چلے، مولانا بھی بغل میں لے کر چلے ایک طرف کی بغل تھک گئی تو دوسری طرف لے لیا، جگہ دور تھی بار بار کروٹیں بدلتے تھے یہاں تک کہ دیو بند پہنچے تو ہاتھ زیادہ تھک گئے۔ مولانا نے اس گٹھری کو سر پر رکھ لیا اور فرماتے تھے کہ بھائی یہ ترکیب پہلے سمجھ میں نہ آئی، اس وقت حالت یہ تھی کہ مولانا کو دونوں طرف سے سلام ہو رہے تھے اور مولانا جواب دیتے جاتے تھے اور اس حالت سے مولانا کو ذرا بھی تغیر نہ تھا، سبحان اللہ کیا تواضع ہے۔ نفس ان حضرات میں تھا ہی نہیں۔ یہ قصہ میں نے مولوی ظفر احمد مرحوم تھانوی سے سنا ہے جو اس زمانے میں وہاں طالب علمی کرتے تھے۔(۳)

---

(۱) الہادی ص ۳۲ (۲) الہادی ص ۷ ۲ شعبان ۱۳۵۷ھ
(۳) حسن العزیز جلد چہارم ص ۱۶۳

قیام تعظیم سے شاگردوں اور طلباء کو ممانعت

مولانا تھانوی صاحب نے فرمایا کہ :۔

مجھے اپنی طالب علمی کا قصہ یاد ہے کہ جب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرسے میں تشریف لائے تو ہم سب لوگ ادب سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک روز مولانا نے فرمایا کہ مجھے اس سے تکلیف ہوتی ہے۔(۱)

خطوط کے جوابات میں مولانا کی عادت

مولانا دارالعلوم دیو بند کے مشاغل میں بے حد مصروف رہتے تھے۔ اس لئے جوابات میں تاخیر ہو جاتی تھی اور بعض وقت سستی ہوتی تھی، کتنے کتنے عرصہ تک خط جیب میں پڑا رہتا کہ جواب لکھیں لیکن نہ لکھ پاتے اور پھر وہ خط گم بھی ہو جاتا اور سوچتے کہ خط میں کیا کیا اُمور تھے، پھر اپنی قوت حافظہ کو عمل میں لا کر اس کا جواب تحریر فرماتے۔ ان سب عادات پر حسب ذیل عبارت سے آپ کو مولانا کی عادت کا پتہ چل سکتا ہے۔ یکم محرم ۱۲۹۸ھ کے مکتوب میں منشی محمد قاسم کو لکھتے ہیں۔

> ”تمہارا خط پہنچا۔ پہلا خط جو آیا تھا اسکے جواب نہ لکھنے کے عجیب اسباب پیش آئے۔ جب خط آیا تھا، ان دنوں ایک ضرورت سے دہلی جانا ہوا پھر بہت دنوں کے بعد میرٹھ وغیرہ ہو کر یکم رمضان کو گھر پہنچا۔ رمضان بھر چاند کے جھگڑے میں مختلف تحریرات کرنی پڑیں، غرض کہ بعد رمضان وہ خط جو اکثر اوقات جیب میں رہتا تھا خدا جانے کہاں رکھ کر بھولا، پھر خیال رہا کہ جواب لکھوں گا جو بات یاد آوے مگر اتفاق نہ ہوا۔ فرصت بہت کم ہوتی ہے دن چھوٹے ہونے کے سبب اکثر لکھنا رہ جاتا ہے۔

رات کو لکھنا بند

رات کو لکھنا چھوڑ دیا ہے، اور لکھنا کسی قدر دشوار بھی ہوگیا ہے دن کو بالکل فرصت نہیں۔ اب تمہارا یہ خط آیا جواب لکھنے کے لئے کئی روز سے تہیہ کرتا تھا آج جمعہ ہے صبح سے کئی اور

---

(۱) امثال عبرت ص ۵۷ جلد دوم

جواب لکھے، اب تمہارے خط کا جواب لکھتا ہوں۔(۱)

(انوار) کیا صاف صاف باتیں ہیں اور بلا کم و کاست کاغذ پر ظاہر کر دی ہیں۔ تکلف کا خط میں نام و نشان نہیں لفظ لفظ سے محبت ٹپک رہی ہے شفقت کا دریا بہہ رہا ہے اللہ اللہ سبحان اللہ۔

احباب واقارب

مولانا کے یہ اخلاق حسنہ جو گزشتہ صفحات میں ہم نے پیش کئے ہیں، ایک نائب رسول کے ہی ہو سکتے ہیں اور یقینی طور پر مولانا ایک عالم اکمل اور فاضل اجل ہونے کے باعث نائب رسول تھے، ہمارے نزدیک انسان کی انسانیت اور عالم کی علمیت کا نقطۂ عروج اخلاق حسنہ میں مضمر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے والد محترم مولانا مملوک علی جن اخلاق حسنہ سے آراستہ تھے۔ ان میں بیٹے نے بھی باپ کی صحیح جانشینی کی، دونوں باپ اور بیٹا پوری تیرہویں صدی ہجری پر اپنے علم اور اخلاق، فضل اور کمال، تقویٰ اور طہارت کے باعث فضائے ہند پر چھائے رہے۔ باپ اور بیٹے کے ہزاروں شاگرد ہند اور بیرون ہند میں پھیل گئے۔ اور ان دونوں آفتاب ہائے علم سے ہزاروں نے فیض حاصل کیا، اگر آپ ان دونوں باپ اور بیٹے کے خاندان والوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے ان میں سے کتنے ہی علم و فضل کے سمندر رہتے اور ان شمعوں سے جو شمعیں روشن ہوئیں ان کے انوار و برکات بلا مبالغہ ساری دنیا میں چمکے اور ظہور میں آئے۔ اگر آپ مجھ سے پوچھتے ہیں تو میں کہوں گا کہ مولانا مملوک علی صاحبؒ نانوتے کے علمی باوا آدم تھے، چنانچہ ان کی بدولت آپ کے صدیقی خاندان کے افراد کا جائزہ لیجئے جن میں مولانا محمد مظہر صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور، ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد احسن صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد منیر صاحب تینوں کے تینوں علم و فضل کے روشن چراغ تھے، ذرا اسی خاندان کے ایک اور فرد پر نظر ڈالئے کہ اس کے سر پر بہت روشن اور علم کے یواقیت و جواہر سے مرصع تاج تھا۔ ان کا نام نامی مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ تھا جو اسی خاندان کے ایک جید عالم اور بانی دار العلوم دیو بند تھے۔ اور انہی میں سے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، پھر مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہمشیرہ کے فرزند بالفاظ دیگر بھانجے مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ ساکن انبیٹھہ فخر روزگار علماء میں سے تھے۔

---

(۱) مکتوب نمبر ۵۳ ص ۱۰۸

مولانا عاشق الٰہی (مصنف تذکرۃ الخلیل و تذکرۃ الرشید) تذکرہ الخلیل میں لکھتے ہیں،

حضرت (مولانا خلیل احمد صاحب) قدس سرہ اواخر صفر ۱۲۶۵ھ مطابق اوائل دسمبر ۱۸۵۲ء میں اپنی نانہال قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے کہ آپ کی والدہ ماجدہ بھی مبارک النساء مولانا محمد یعقوب صاحب ؒ مدرس مدرسہ عالیہ دیوبند کی حقیقی بہن اور حضرت استاذ الکل مولانا مملوک علی صاحب قدس سرہ کی بیٹی تھیں، جوکہ شوہر (شاہ مجید علی) کے کسی ریاست میں ملازم ہونے کے سبب اپنے میکے میں مقیم تھیں .... آپ (مولانا مملوک علی) کی دوسری صاحب زادی مسماۃ نجیب النساء حضرت (مولانا خلیل احمد صاحب) کے چچا مولوی انصار علی کے عقد نکاح میں آئیں کہ مولوی عبداللہ صاحب ناظم دینیات علی گڑھ مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ کے پچیرے بھائی تھے اور خلیرے بھی، اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی دونوں کے حقیقی ماموں تھے۔(۱)

غرضیکہ یہ خاندان اہل علم وفضل کا خاندان تھا۔ حکیم امیر احمد عشرتی نے مکتوبات یعقوبی کے مقدمے میں ایک شجرہ پیش کیا ہے جس سے مولانا محمد یعقوب صاحب اور دیگر علماء خاندان کا تعلق واضح ہوتا ہے، شجرۂ یہ ہے۔

(۱) تذکرۃ الخلیل ص ۲۰
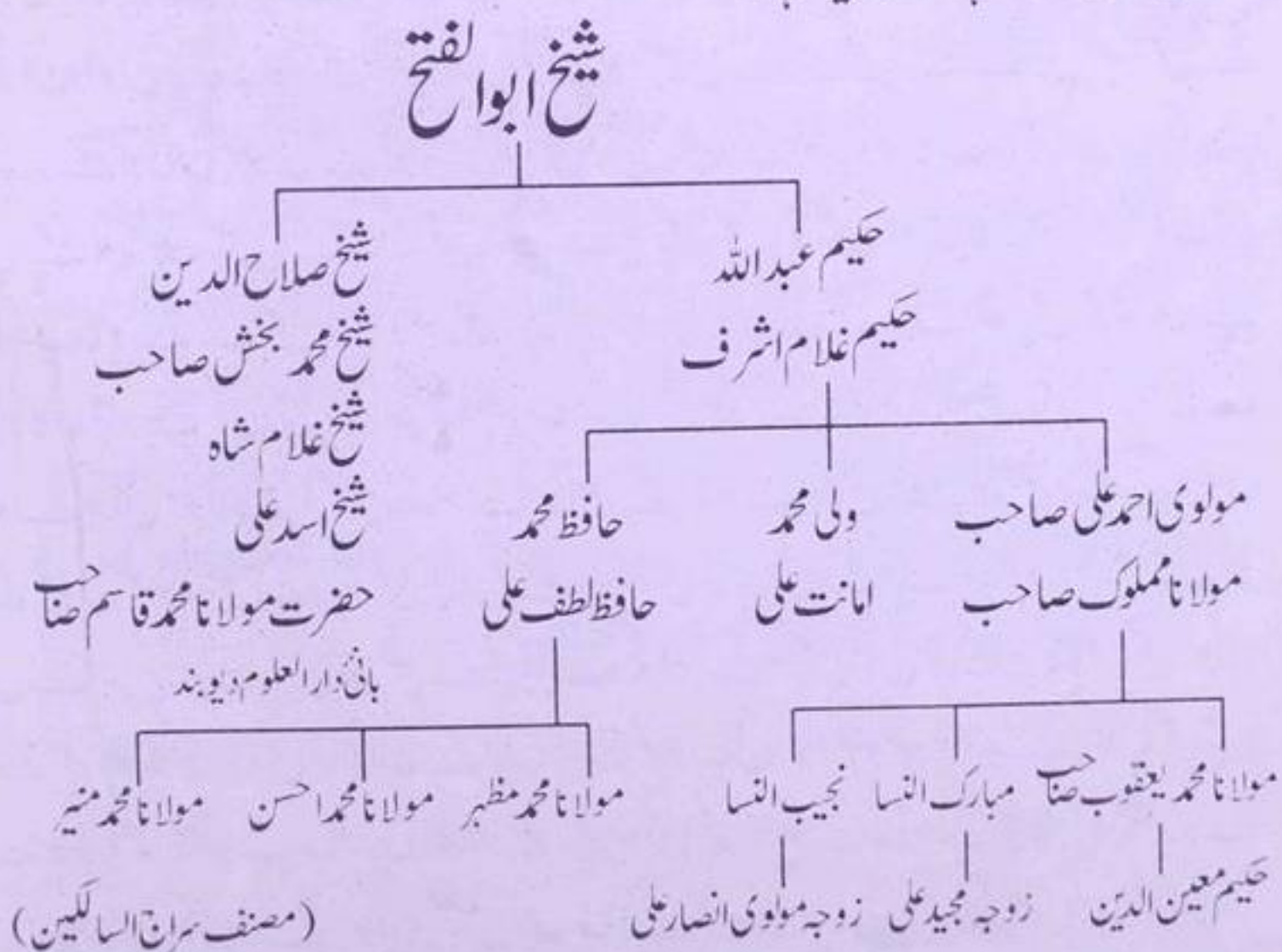
یہ سب حضرت شیخ ابو الفتح صدیقی میں جا کر مل جاتے ہیں جو ان سب کے پانچویں پشت میں جدامجد ہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند حکیم معین الدین ماہر اطبا میں سے تھے۔ بقول قادری صاحب مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پر پوتوں میں ایک شخص محمد شعیب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے راقم الحروف کی ملاقات ہوئی جو کراچی میں رہتے ہیں۔ (مولا محمد احسن ص ۱۹۸) ان رشتہ داروں کے سوا مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے احباب اور دوستوں اور معاصرین پر نظر ڈالی جائے تو ہندوپاک کے قطعۂ زمین میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی کہ آپ کے والد مولانا مملوک علی کے شاگرد نہ ہوں۔ شاگردوں میں سے سب ہی آپ کے احباب تھے، بالخصوص مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۳۲۳ھ، شیخ الہند کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء، مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد مولانا فضل الرحمٰن متوفی ۱۳۰۸ھ ۱۸۹۱ء، حکیم ضیاء الدین رامپور منیہاران، حاجی محمد عابد صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۲۷؍ ذوالحجہ ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء، مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند متوفی ۱۳۰۸ھ ۱۸۹۱ء، مولانا فیض الحسن سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۳۰۴ھ ۱۸۷۸ء، مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۲۹۶ھ ۱۸۷۹ء، مولانا نور الحسن کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۲۸۵ھ مولانا مظفر حسین کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ۔ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شاہ عبدالغنی مجددی تو آپ کے اساتذہ میں سے ہی تھے اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو آپ کے پیر و مرشد تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا احمد حسن امروہوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ تو آپ کے شاگرد تھے۔

وفات مولانا محمد یعقوب صاحبؒ

دنیا کا کوئی بھی انسان جو دنیا میں آیا آخر اس کو ایک روز موت کا ذائقہ ضرور چکھنا ہے، البتہ کوئی ایسی موت ہوتی ہے جس کے مرنے پر ہزاروں آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں اور آسمان وزمین بھی اس پر روتے ہیں اور کوئی ایسی موت مرتا ہے جس کے مرنے پر لوگ شکر کا سانس لیتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی آپ کے سامنے ہے جو سراپا پاک صاف، تقویٰ، علم اور فضل کی زندگی تھی۔ جو ہمیشہ مرنے کے بعد زندہ رہیں گے، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے۔

یاد داری کہ وقت زادن تو　　　همہ خنداں بودند وتو گریاں
آنچناں زی کہ بعد مردن تو　　　همہ گریاں شوند وتو خنداں

مولانا کی زندگی بھی ایسی ہی زندگی تھی کہ آپ اللہ تعالیٰ کے یہاں خوش وخرم تشریف لے گئے اور آپ کے احباب، اقارب، متعارفین، تلامذہ ومریدین سب آپ کی وفات پر اشکبار ہوئے۔

تاریخ ویوم وفات ۳/ ربیع الاوّل ۱۳۰۲ھ
مطابق دسمبر ۱۸۸۴ء در شب دوشنبہ

مولانا دارالعلوم دیوبند سے واپسی کی نیت سے اپنے وطن نانوتہ تشریف لے گئے وہیں بعد نماز عشاء ۳/ ربیع الاوّل ۱۳۰۲ء کو پیر کی شب میں بمرض ہیضہ ایک بجے آپ کا انتقال ہوا۔ اور اپنے وطن نانوتے میں شمال کی جانب براہ سہارنپور باغ نو میں جس کو معین الدین صاحب نے پرورش کیا تھا دفن کر دیئے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بیاض یعقوبی میں کسی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یادداشت یہ ہے۔

شب شنبہ۔ یکم ربیع الاوّل ۱۳۰۲ھ۔ جناب مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اچانک بعد فراغت نماز عشاء در ہیضہ مبتلاء شدہ بے ہوش شدند۔ شب در شنبہ قریب ایک بجے وفات از جہاں فانی یافت، قبر شریف اوشاں در مقام نانوتہ جانب شمال لب سڑک سہارنپور واقع باغ نو کہ او را معین الدین پرورش کردہ است واقع شد۔ ایں واقعۂ جانکاہ است واقعی ایں سال بہمہ وجوہ عام الحزن شد، چونکہ زوجہ معین الدین عائشہ نام بنت مولوی محمد منیر صاحب ۳۰/ صفر ۱۳۰۲ھ وپسر محمد یامین نام بعمر سہ سال ومحمد زبیر بعمر ۱۰/ ماہ انتقال کردہ شد، یک اولاد محمد الیاس نام گزشت۔

ترجمہ:۔ ہفتے کی رات یکم ربیع الاوّل ۱۳۰۲ھ کو مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ عشاء کی نماز سے فراغت کے بعد اچانک ہیضہ میں مبتلاء ہو کر بے ہوش ہو گئے۔ پیر کی رات کو ایک بجے کے قریب وفات پائی، ان کی قبر نانوتے میں شمال کی جانب برسر راہ سہارنپور باغ نو میں جس کو معین الدین نے لگایا ہے واقع ہے، یہ جانکاہ حادثہ ہے، یہ سال حقیقت میں حزن کا سال ہوا، کیونکہ معین الدین کی بیوی عائشہ بنت مولانا محمد منیر ۳/ صفر ۱۳۰۲ھ کو اور لڑکا محمد یامین

۳ر سال کا اور محمد زبیر دس ماہ کا انتقال کر گئے، صرف ایک لڑکا محمد الیاس نامی چھوڑا۔ (بیاض یعقوبی ص ۱۵۳) آپ کی وفات سے دو ماہ بیس دن پہلے آپ کا لائق فرزند مولوی حافظ علاء الدین فاضل دیو بند بمرض ہیضہ انتقال کر چکا تھا، حیف صد حیف جو ہستی ۱۲۴۹ھ کو پیدا ہوئی تھی وہ ۳ر ربیع الاوّل کو ۴۹ر سال کی عمر میں وفات پا گئی۔ کل من علیھما فان ویبقی وجہ ربك ذوالجلال والاکرام۔

خاتمۂ کتاب

الحمد للہ علی احسانہ کہ کتاب "سیرت یعقوب" تمام مراحل تالیف سے گزر کر اختتام کو پہنچ رہی ہے۔ اسی اثنا میں کتاب پر نظر ثانی میں مختلف اضافے کرنے کی نوبت آئی۔ اگرچہ یہ کتاب تقریباً ۱۹۶۰ھ میں لکھ چکا تھا لیکن ستمبر ۱۹۷۴ء تک مختلف اوقات میں کتاب ترمیم و تنسیخ کی منازل سے گزرتی رہی۔ آج چاند کی ۱۷ شعبان ۱۳۹۴ھ مطابق ۵ر ستمبر ۱۹۷۴ء بروز پنج شنبہ بوقت سوا نو بجے صبح اس خاتمہ کے لکھنے میں مشغول ہوں، جو پایۂ تکمیل تک پہنچ رہا ہے، مجھے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ دار العلوم دیو بند کے سب سے پہلے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین کے سوانح زندگی لکھ کر میں فارغ ہو رہا ہوں اور کتابت کی تکمیل کرانے اور اصلاح کرنے سے بھی تقریباً فراغت حاصل کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایسے حافظ، عالم، فاضل درویش، متقی، صالح اور مرشد کامل وولی شخصیت کی اس خدمت کے صلے میں میری تقصیرات پر قلم عفو کھینچ دیں، اور خدائے بزرگ وبرتر کی ذات کریمی سے کیا عجب ہے کہ وہ میری مغفرت فرمادیں۔

شنیدم کہ در روز امید و بیم
بداں را بہ نیکاں بجشند کریم

سخت فکرمند ہوں کہ آخرت میں کیا ہوگا، انجام بخیر ہونے کیلئے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، اپنی تمام عمر غفلت اور اتباع خواہش نفس میں گزر گئی۔ جب مولانا محمد یعقوب صاحبؒ جیسے بزرگوں کے حالات پڑھتا ہوں اور اپنے ماضی پر غور کرتا ہوں تو پہروں سوچتا رہتا ہوں کہ یہ حضرات کیسے تھے اور میں راقم الحروف کیا ہوں۔ ایک روز اسی فکر میں غرق تھا کہ حسب ذیل اشعار جو میری زندگی کی روئداد ہیں بے ساختگی میں قلم سے ٹپک پڑے

اشکہائے ندامت

خزاں نے لوٹ لیا وہ گلِ بہار ہوں میں
کہ حسرتوں کا اک اجڑا ہوا دیار ہوں میں

کہاں نصیب میں حسن عمل کی راہ مجھے
کہ نفس سرکش و بیباک کا شکار ہوں میں

کیا بھی یاد کبھی بھول کر، تو بھول گیا
کہ تجھ کو بھولنے والوں کی یادگار ہوں میں

نہ لے حساب کہ میں لائق حساب نہیں
کرم کی مجھ پہ نظر ہو کہ شرمسار ہوں میں

بغیر پرسشِ اعمال بخشدے مجھ کو
کہ سر سے پاؤں تلک سخت داغدار ہوں میں

خدا ہی خیر کرے روز حشر اے انوار
جہاں میں سب سے زیادہ گنہگار ہوں میں ـ

آخر میں جناب مولانا محمد یوسف صاحب بنوری اور مولانا محمد تقی عثمانی صاحب و مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی اور بالخصوص حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ العالی کا شکر گزار ہوں کہ ان کی توجہات اور احساسات سے یہ کتاب طبع ہوکر قارئین کے سامنے آرہی ہے۔ اور برخوردار ڈاکٹر محمد انصار الحسن اور برخورداری عزیزہ صالحہ ایم۔ اے فائنل کا بھی شکر گزار ہوں کہ میرے لڑکے اور لڑکی نے کتاب کی تصحیح اور بعض کتابوں سے مختلف عبارتیں نوٹ کر کے دینے میں میری بڑی مدد کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ناچیز کی سعی کو قبول فرمائے اور ذخیرۂ آخرت بنائے آمین۔ الحمد للہ، الحمد للہ، الحمد للہ۔

سبحان ربك رب العزت عما يصفون وسلام على المرسلين والحمد لله رب العلمين وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه محمد واله واصحابه اجمعين برحمتك يا ارحم الراحمين.

۱۷/ شعبان المعظم ۱۳۹۴ھ

محمد انوار الحسن شیرکوٹی پروفیسر
۵/ ستمبر ۱۹۷۴ء بروز پنجشنبہ دس بجے صبح بربالاخانہ
مہبط انوار ۱۲۹/ ڈی پیپلز کالونی لائل پور (پاکستان)

حضرت حاجی سید محمد عابد حسینؒ

حضرت حاجی سید محمد عابد حسینؒ

فہرست

شیخ طریقت حضرت حاجی سید محمد عابد حسینؒ

مولانا اشتیاق احمد دربھنگوی

ولادت سے وفات تک (۱۲۵۰ھ تا ۱۳۳۱ھ)

خلوص وللّٰہیت وہ عظیم سرمایہ ہے جس کی وجہ سے انسان مردہ ہونے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے، مژدۂ جانفزا: مَنْ كَانَ مَعَ اللّٰهِ كَانَ اللّٰهُ مَعَه(۱) کا مصداق بن جاتا ہے۔ اور اخلاص للہ وفنائیت فی اللہ سے معمور زندگی ہر دور کے انسان کے لئے اُسوہ بن جاتی ہے۔

حضرت حاجی محمد عابد حسین صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ بھی انہیں پاکیزہ نفوس میں سے ہیں، جن کے خلوص سے یہ عظیم الشان "دار العلوم دیوبند" وجود میں آیا، جن کی فنائیت اور للّٰہیت سے ہزاروں قلوب کو روشنی ملی اور جن کے فیوض وبرکات سے آج پورا عالم مستفیض ہو رہا ہے۔

ولادت باسعادت

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت ۱۲۵۰ھ بموافق ۱۸۳۴ء میں "دیوبند" کی مردم خیز زمین پر ہوئی۔(۲)

تعلیم وتربیت

قصبہ دیوبند ہی میں سات سال کی عمر میں قرآن شریف پڑھا، اور پھر فارسی پڑھنی شروع کی، آپ کی عمر اس وقت بارہ برس کی تھی، مولوی ولایت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبند میں تشریف رکھتے تھے، آپ کو بارہ برس کی اس چھوٹی عمر میں تزکیہ، احسان اور تصوف کا شوق ہوا اور یہ

---

(۱) | ۲۶۲۳ | کشف الخفاء ومزیل الالباس ج ۲ ص ۳۹۹ (۲) تذکرۃ العابدین ص ۲۳، تاریخ دار العلوم دیوبند ج ۲ ص ۲۲۱

اشتیاق اتنا بڑھا کہ آپ مولوی ولایت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو گئے، آپ کو اسی عمر میں نماز پنج گانہ اور تہجد کا شوق بھی دامن گیر ہوا؛ چناں چہ کبھی قضا نہ ہونے پائیں۔

جب آپ کے شیخ مولوی ولایت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سہارنپور تشریف لے گئے تو آپ بھی ان کے ہمراہ گئے، مگر آپ کے بڑے بھائی اگلے ہی دن وہاں سے لوٹا لائے، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا کافی غم ہوا۔

پھر مزید تعلیم اور علوم دینیہ کی طرف توجہ فرمائی اور بغرض تعلیم دہلی تشریف لے گئے، وہاں ایک مسجد میں قیام فرمایا، اور پوری توجہ کے ساتھ تعلیم میں مشغول رہے، دریں اثنا اچانک آپ کے والد ماجد علیل ہو گئے، آپ ان کی علالت کی خبر سن کر اپنے وطن دیوبند واپس تشریف لائے، اور کافی دنوں تک ان کے علاج معالجے میں مشغول رہے، بالآخر باپ کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا ــــ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ــــ اور تعلیم کا سلسلہ یہیں موقوف کرنا پڑا۔

آپ کو تصوف کا شوق زمانۂ تعلیم سے ہی تھا، کچھ عرصہ بعد آپ نے اس کی مزید تشنگی محسوس کی ــــ ان دنوں حضرت میاں جی کریم بخش رامپوری رحمۃ اللہ علیہ دیوبند تشریف لائے ہوئے تھے ــــ سیرابی کے لئے آستانۂ کریم بخش پر پہونچے، تربیت کا انتظام بھی کیا خوب ہو رہا ہے کہ مرشد و مربی میاں جی رحمۃ اللہ علیہ کو پہلے ہی خواب میں اختر ضوفشاں کی شکل میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دکھایا جاتا ہے کہ: آسمان پر ایک بہت بڑا ستارہ ہے، اور اس کے گرد بہت سے ستارے ہیں اور بڑا ستارہ میری گود میں آ گیا۔

حضرت میاں جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے صبح کو فرمایا کہ:۔

"(۱) مجھ سے کوئی سید بیعت ہوگا؛

(۲) اور لوگوں کو اس سے فیض پہونچے گا؛

(۳) وہ متبع سنت ہوگا۔

(۴) اس سے دین کے بہت سے کام انجام پذیر ہوں گے؛

(۵) دنیوی جھگڑوں سے بچے گا؛

(۶) خاندان کا روشن کرنے والا ہوگا؛؛

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت کی درخواست کی، حضرت میاں جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: "استخارہ کر لو! اور جو کچھ اس میں معلوم ہو مجھ سے کہو! پھر بیعت کروں گا۔"

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حکم کی تعمیل کی اور استخارہ کیا خواب میں یہ دیکھا کہ: میاں جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پہلے مرید روٹی لئے ہوئے ہیں اور چڑیا کی طرح چن چن کر کھا رہے ہیں، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے (خواب میں) ان سے کہا کہ "میاں یہ کیا کھانا ہے، اور ساری روٹی لے کر آپ نے دو لقمے کر لئے اور کہا کہ یوں کھایا کرتے ہیں"

یہ خواب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے صبح کو میاں جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیان فرمایا، انہوں نے بیعت فرمایا اور کہا کہ: "میرے پاس جو کچھ ہے وہ تمہاری قسمت کا ہے" پھر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ میاں جی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہنے لگے اور ذکر واشغال شروع کئے، میاں جی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آپ پر خاص توجہ فرمائی۔

اس طرح آپ کی تربیت بھی خوب ہوئی، زہد وورع اور توکل کی دولت سے مالا مال ہو گئے اور قدرت نے اس پیکرِ خلوص ووفا سے علم وعرفان کا ایسا فیضان جاری فرمایا جو امت اسلامیہ پر ایک عظیم احسان ہے (۱)

مجاہدانہ زندگی

مجاہدہ شخصیت سازی میں اہم رول ادا کرتا ہے، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی بھی سراپا جہد ومجاہدہ سے عبارت ہے، مجاہدۂ نفس کا یہ عالم کہ مسلسل ساٹھ برس تک "چھتہ مسجد" میں نماز پڑھتے رہے، کبھی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی، اور التزام ایسا کہ کبھی "چھتہ مسجد" کے علاوہ دوسری جگہ نماز ادا نہیں کرتے اِلّا یہ کہ طبیعت سخت علیل ہو جاتی تھی، تیس سال تک تکبیر اولی فوت نہیں ہوئی، دیکھنے والی آنکھوں نے شہادت دی ہے کہ اس لمبے عرصے میں آپ کی کوئی نماز حتی کہ تہجد بھی قضا نہیں ہوئی۔ (۲)

پیرانہ سالی کے باوجود مجاہدہ کا یہ عالم کہ رات میں ایک بجے بیدار ہو کر تہجد ادا فرماتے، پھر اللہ رب العزت کی بارگاہ بے نیاز میں نیازمندی کے ساتھ اوراد و وظائف میں مصروف رہتے، پھر اول وقت فجر کی نماز پڑھ کر ۸ ؍ بجے تک حجرہ میں اپنے معمولات میں مشغول رہتے، آٹھ بجے باہر تشریف لا کر اپنے فیوض عام فرماتے، اذکار واشغال کی تعلیم فرماتے، کوئی بیعت کا خواہاں ہوتا تو بیعت فرماتے، ضرورت مندوں کو تعویذ عطا فرماتے اس وقت آپ کے پاس

---

(۱) ملخص از تذکرۃ العابدین ص ۶۳، ۶۴ (۲) تاریخ دار العلوم دیوبند ج ۲، ص ۲۲۲

ایک کثیر مجمع رہتا تھا۔ ہر ادنیٰ واعلیٰ کی ضرورت اسی وقت پوری کرتے تھے، اخلاق ایسے عمدہ تھے کہ فقر و غربت کے باوجود اکثر جن لوگوں کے کام زیادہ رہتے تھے انہیں روک لیتے اور بہترین خاطر و تواضع فرماتے۔

ظہر کی نماز کے بعد پھر درِ فیض واہوتا اور عوام و خواص اپنے اپنے مطالب میں کامیاب ہوتے تھے، بعد نماز مغرب نوافل اور ختم خواجگان کے بعد مریدوں اور مہمانوں سے بات چیت کرتے، جمعرات اور پیر کو ہمیشہ مسجد چھتہ میں حلقہ فرماتے تھے، مگر کچھ دنوں بعد ضعف اور دیگر اعذار کی وجہ سے یہ معمول جاری نہیں رہ سکا تھا عشاء کے بعد مکان میں تشریف لے جاتے جو مستورات مکان میں جمع ہوتی تھیں ان کا کام انجام دیتے اور تقریباً ۱۱ بجے شب کو استراحت فرماتے تھے، آسیب زدہ مریض کا معائنہ اور علاج بعد نماز عشاء فرمایا کرتے تھے ـــــ چوں کہ ایک مرتبہ آپ ایک جن سے گفتگو کرنے لگے تھے کہ نمازِ عشاء میں کچھ دیر ہوگئی اور جماعت کے لئے لوگوں کو انتظار کرنا پڑ گیا تھا ـــــ اس طرح سے آپ نے پوری زندگی مربوط، منظم اور صحیح اصولوں کے مطابق گذاری۔ (۱)

آپ کے یہاں ضبط اوقات کا بڑا اہتمام تھا چناں چہ ضبطِ اوقات کے سلسلے میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جاننے والا ہر وقت یہ بتا سکتا ہے کہ اس وقت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فلاں کام میں مشغول ہوں گے، اگر کوئی جاکر دیکھے تو اسی کام میں مشغول پائے گا۔ (۲)

چلہ کشی

نفس کشی اور مجاہدۂ نفس ایک سالک کو تصوف واحسان کی معراج عطا کر دیتا ہے، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے ایک بڑے صوفی اور راہِ سلوک کے ایک عظیم سالک تھے، آپ نے اس راہ کی معراج حاصل کرنے کے لئے چلہ کشی بھی کی ہے۔

حضرت راج خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سے واپسی کے بعد آپ نے چلہ کشی کی، پھر تو آپ کی کیفیت قابل رشک ہوگئی، تمام مخلوق خدا آپ کی طرف متوجہ ہوگئی اور آپ سے پے در پے کرامتیں ظاہر ہونے لگیں۔

(۱) تذکرۃ العابدین ص ۷۶، ۷۷ و تاریخ دار العلوم دیوبند، ج ۲، ص ۲۲۲ (۲) اشرف السوانح، ج ۱، ص ۱۳۹

پھر ایک سال بعد دوسرا چلہ "چودھری صابر بخش کی مسجد" میں لگایا اس دوسرے چلے سے آپ جس روز باہر تشریف لائے، تمام باشندگان قصبہ آپ کے استقبال کو آئے، آپ اس قدر نحیف ہو گئے تھے کہ لوگ آپ کو ڈولی میں سوار کرا کر لائے، اور آپ نے اپنا فیض عام کرنے کے لئے اور دوسروں کو ذکر الٰہی سے آشنا کرانے کے لئے "مسجد چھتہ" میں ایک توجہ خانہ بنوایا، اس میں حلقہ کرنا شروع کر دیا، ہزارہا مخلوق خدا آپ سے فیض یاب ہوئی۔ (۱)

ایک اور مجاہدہ

منجملہ دیگر مجاہدوں کے آپ نے ایک اور مجاہدہ کیا وہ یہ کہ بہت دنوں تک آپ نے یہ معمول بنا لیا کہ ہر جمعرات کو فجر کی نماز پڑھ کر اپنے مخصوص وظائف کی کتاب "دعائے سیفی" اور "دلائل الخیرات" پڑھتے ہوئے کلیر جاتے اور عشاء کی نماز دیو بند میں پڑھتے آپ کا یہ معمول اور مجاہدہ برسوں رہا۔ (۲)

تجرد ویکسوئی

جب آپکے شیخ حضرت میاں جی کریم بخش رامپوری رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو گیا، تو آپنے سب سے ملنا جلنا ترک کر دیا اور گھر کا سب سامان کپڑے وغیرہ فقرا کو تقسیم کر کے ایک کمبل اور ایک تہبند پہن کر مسجد چھتہ میں گوشہ نشینی اختیار کر لی، یہی لباس آپ کا اخیر عمر تک رہا، سوائے مسجد چھتہ کے کہیں آتے جاتے نہ تھے۔

ابتدائی زمانے میں آپ کو دشوار گذار مصائب کا سامنا کرنا پڑا مگر آپ ہر حال میں شکر خداوندی ادا کرتے رہے اور کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ کیا حالت ہے اور ہمیشہ اس پر ثابت قدم رہے۔ (۳)

الغرض! حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی نہایت سادہ اور ریا و نمود سے پاک تھی، آپ کی پوری زندگی کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ زندگی کے کسی بھی شعبے میں آپ نے خواہش نفس کی غلامی نہیں کی، ہمیشہ مجاہدہ کرتے رہے۔

---

(۱) تذکرۃ العابدین: ص ۶۷، ۶۸ (۲) تذکرۃ العابدین: ص ۶۵ (۳) تذکرۃ العابدین: ص ۶۷

مجاہدہ میں اتباع سنت

نام نہاد صوفیا کی طرح آپ کے یہاں غلو اور ریاکاری نام کی کوئی چیز نہیں تھی، ہر حال میں آپ کے پیش نظر سنت رہی اور اسی کا اتباع آپ کا مقصد زندگی رہا، چناں چہ جب پیر جی محمد انور صاحبؒ ــــ خلیفۂ اجل حضرت حاجی صاحبؒ ــــ پر مقام نور (تصوف کا ایک مقام) آیا تو انہوں نے کھانا پینا ترک کر دیا، حضرت حاجی صاحبؒ کو معلوم ہوا تو آپ نے تحریر فرمایا کہ: ''شریعت کے خلاف مت کرو خدا کا معاملہ بشر کے ساتھ جب تک رہتا ہے جب تک بشریت ہے ورنہ عبادت کے لئے فرشتے بہت ہیں۔ یہ امر سنت کے خلاف ہے بطریق مسنون کھانا پینا ضرور چاہئے خواہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔''(۱)

آپ کا غصہ

جب آپ کو کوئی یہ کہہ دیتا کہ فلاں نے جائز کو ناجائز، حلال کو حرام، حق کو ناحق کیا ہے تو آپ بہت خفا ہو جاتے، آپ کے سامنے جو بھی آجاتا بگڑ جاتے تھے۔ البتہ یہ حالت زیادہ دیر تک نہ رہتی تھی کچھ دیر بعد غصہ ختم ہو جاتا تھا۔(۲)

شریعت کے احکام کی پابندی کا یہ حال تھا کہ بقول مولانا سید محمد میاں صاحبؒ علماء کے مشہور سربرآوردہ عالم و مناظر مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ یہ کیفیت بیان فرماتے تھے کہ ''ایک روز آپ کو (یعنی حاجی محمد عابد صاحبؒ کو) بہت رنجیدہ دیکھا گیا، کبیدگی اور افسردگی کی یہ حالت تھی جیسے کسی جواں مرگ پر ہو جب سبب دریافت کیا گیا تو بہت اصرار کے بعد معلوم ہوا کہ اٹھائیس سال بعد آج جماعتِ صبح کی تکبیر تحریمہ فوت ہو گئی ہے۔''(۳)

فی سبیل اللہ پانی پلانے کی خدمت اور مجاہدۂ نفس

حضرت حاجی صاحبؒ نے شادی سے پہلے عطاری کی دوکان کر رکھی تھی، شادی کے بعد آپ نے اس کو چھوڑ دیا اور مجاہدۂ نفس کے لئے فی سبیل اللہ لوگوں کو پانی پلانا شروع کیا، یہ ایک طرح سے خدمت خلق بھی تھی، پورے دن پانی پلانے اور رات کو بیدار رہ کر اپنے آقائے

---

(۱) تذکرۃ العابدین: ص، ۶۷ و تاریخ دارالعلوم دیوبند: ج۲، ص ۲۲۳ (۲) تذکرۃ العابدین: ص، ۸۴
(۳) علماء ہند کا شاندار ماضی: ج۵، ص ۵۷، سوانح قاسمی، ج۲، ص ۲۴۱

حقیقی کی بارگاہ میں تسبیح و تحلیل اور قیام و قعود میں مصروف رہتے۔

اس پر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اعزہ واقارب غیرت کھاتے اور کٹ کٹ مرتے اور اس میں اپنی بے عزتی اور سبکی محسوس کرتے کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سید خاندان کی ناک کٹا رہے ہیں، اس میں خاندان کی بدنامی ہے، چناں چہ سب نے مل کر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ "یہ کام مت کرو!" مگر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کسی کو کچھ جواب نہ دیا اور علی حالہ پانی پلانے کی خدمت اور نفس کے خلاف مجاہدہ میں مشغول رہے۔ عرصۂ دراز کے بعد جب مرشد و مربی کا حکم ہوا کہ "اس کام کو چھوڑ دیں!"..... تو چھوڑ دیا۔(۱)

خدمت خلق

ارشاد و تبلیغ، تذکیر و تزکیۂ قلوب کے علاوہ آپ کو فن عملیات میں زبردست ملکہ حاصل تھا، آپ نے اس خداداد صفت کے ذریعہ خلق خدا کی بہت زیادہ خدمت کی لوگ دُور دُور سے تعویذوں کے لئے حاضر ہوتے اور دامن امید گوہر مراد سے بھر کر لوٹتے تھے۔(۲)

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح مخطوطہ میں ہے کہ "دیوبند کے مسلمانوں میں شاید کوئی ایسا بچہ ہوگا جس کے گلے میں آپ کا تعویذ نہ ہو"(۳)

آپ کے تعویذوں کا روحانی فیض بیماروں پر تریاق کا کام کرتا تھا(۴) غیر مذہب والے بھی آپ کے تعویذوں کے معتقد تھے

نقش تعویذش مثال نقش قدر
فیض او بر خاص و عامی مثل بدر (۵)

آپکا مطب (تعویذی) بڑے بڑے (دوائی) طبیبوں سے زیادہ گرم رہتا تھا، خصوصاً وبائی اور موسمی امراض میں غرباء علاج کم کرتے تھے، آپ ہی کے تعویذوں پر قناعت کرتے تھے(۶)

حسن خلق اور تحمل

آپ کی خدمت میں واردین و صادرین اور مہمانوں کی کمی نہیں رہتی، ہمہ وقت ہجوم رہتا تھا

---

(۱) تذکرۃ العابدین: ص، ۶۴ (۲) تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج۲، ص ۲۲۲ (۳) بحوالہ سوانح قاسمی، ج۲، ص ۲۳۹
(۴) تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج۲، ص ۲۲۳ (۵) مثنوی زیر و بم بحوالہ "القاسم" دارالعلوم نمبر ماہ محرم الحرام ۱۳۴۷ھ ص ۹
(۶) سوانح مخطوطہ بحوالہ سوانح قاسمی، ج۲، ص ۲۴۰

آپ ہر ایک سے خندہ دہن، خندہ جبیں اور نرم خوئی سے پیش آتے اور ہر ایک کو خلق حسن پیش کرتے تھے۔

"بعض آدمی تو آپ کو اس قدر تنگ کرتے کہ پچاس پچاس تعویذ لے کر بھی یہ کہتے رہتے کہ حضرت فلاں کا ایک تعویذ اور باقی رہ گیا، مگر آپ کبھی غصہ نہ ہوتے"۔(۱)

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح نگار، اور ان کے خلیفہ حاجی محمد نذیر احمد صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ "تذکرہ العابدین" میں لکھتے ہیں:

"ہم نے اس وقت میں دیکھا ہے کہ بعض حضرات نے حضرت کو ضعیفی کے وقت طرح طرح کی تکلیفیں پہونچائیں ـــــ اور کیوں پہونچائی گئیں، حق بات کہنے سے، سچی بات کہنے سے، نیک کام کرنے سے، بقول شاعر:

اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی ـــــ

مگر آپ نے ان کے واسطے بھی کبھی زبان نہیں ہلائی، بلکہ اکثر یہ فرمادیتے کہ، جو مجھ کو صبح سے شام تک برا کہتا ہے، میں اس کو رات میں معاف کر دیتا ہوں۔"

"فقیر وہ ہے جو برا کہنے والے کو بھی برا نہ کہے اور کوئی بدنی یا قلبی یا عملی تکلیف نہ پہونچائے، اس کی رضا پر راضی رہے۔"(۲)

خلافت اور بیعت کی اجازت

شیخ کامل نے آپ کی کامل و مکمل تربیت کی، پھر آپ کو اپنا خلیفہ بنایا اور بیعت وارشاد کی اجازت دے دی۔

حقیقی تواضع

لیکن حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہنوز اپنے کو کمال تعبد کی وجہ سے بے حیثیت اور نا قابل سمجھتے رہے اور خلافت کا بار اتنا گراں محسوس کیا کہ بیعت کرنے کے خوف سے مسجد کی صف

---

(۱) تذکرۃ العابدین: ص، ۸۳ (۲) تذکرۃ العابدین: ص، ۸۴

میں جا کر دبک رہے۔

چناں چہ سب سے پہلے شخص کی بیعت کرنے کیلئے جب پیر جی میاں صاحبؒ نے حاجی صاحبؒ کو بلایا تو حاجی صاحبؒ چھپ گئے، میاں جی صاحبؒ نے فرمایا کہ: "ڈھونڈھ کر لاؤ"! مریدوں نے تلاشنا شروع کیا تو مسجد کی صف میں دبکے ہوئے ملے۔

میاں جیؒ کی خدمت میں روتے ہوئے پکڑ کر لائے گئے، اور روتے ہوئے عرض کیا کہ "میں اس قابل نہیں، یہ بار بہت بڑا ہے اس کے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا ہوں۔"

میاں جیؒ نے بہت سمجھایا اور فرمایا کہ: "بیعت کرو! خداوند تعالیٰ تمہارا مددگار ہے۔ میں کچھ اپنی طرف سے نہیں کہتا ہوں، بلکہ مجھ کو ایسا ہی حکم ہوا ہے۔" اس وقت آپ نے حکم کی وجہ سے روتے ہوئے بیعت کیا۔

اس کے بعد میاں جی کریم بخشؒ کا حال یہ ہو گیا کہ آپ سے جو بھی بیعت کا خواہاں ہوتا، آپ فرماتے کہ: "محمد عابد سے بیعت کرو!" (۱)

جب میاں جی کریم بخش صاحبؒ اپنے وطن رامپور تشریف لے گئے تو وہاں بھی لوگوں کو حضرت حاجی صاحبؒ سے ہی بیعت کرایا۔ انہی بیعت ہونے والوں میں سے حضرت میانجی صاحبؒ کے صاحبزادے میاں علی بخش اور آپ کے پیر کے صاحبزادے میاں محمد صدیقؒ بھی ہیں۔

اگر کوئی اذکار و وظائف بھی دریافت کرتا تو فرما دیتے کہ: "محمد عابد سے دریافت کر لو!"

الغرض! مرشد و مربی حضرت میاں جیؒ نے منامی بشارت کے مطابق اپنی زندگی میں جملہ اُمور کو حضرت حاجی صاحبؒ سے متعلق فرما دیا تھا۔ (۲)

تعویذ و عملیات

حتی کہ تعویذ بھی حضرت حاجی صاحبؒ سے لکھواتے تھے، اگر آپ کبھی ادباً تساہل کرتے تو فرماتے کہ: عزیز! گھبراتے ہو، جب کیا کرو گے کہ ایک زمانہ میں مخلوق خدا تمہاری طرف متوجہ ہو گی اور تم کو فرصت بھی نہ لینے دے گی؟

اور اکثر یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ:۔

(۱) تذکرۃ العابدین: ص،۶۵ (۲) تذکرۃ العابدین: ص،۶۶

"درویشی جدا ہے، اور عمل کرنا جدا ہے، بے عمل درویش ایسا ہے جیسا سپاہی بے ہتھیار، درویش کو اس میں پناہ بھی ہے کہ اپنے کو پوشیدہ کر کے عامل ظاہر کر دے"۔(۱)

آسیب زدہ کا واقعہ

آپ کی عملیات میں یہ تاثیر تھی کہ جب چاہتے بڑے سے بڑے جن اور جنوں کے بادشاہوں کو حاضر کر لیتے، تاہم تواضع اتنی کہ جنوں سے بھی متواضعانہ لہجہ اختیار فرماتے تھے، اور جناتوں میں بھی آپ کا بڑا مقام تھا وہ بھی بڑا احترام کرتے تھے، ایک آسیب زدہ عورت کا واقعہ بڑا پر لطف ہے اس کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

ایک صاحب اپنی اہلیہ کو لے کر خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: میری بیوی بارہ سال سے بیمار ہے، بہت علاج کرایا طرح طرح کے ڈاکٹروں، حکیموں سے ملاقاتیں کیں، لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔

کوئی آسیب بتاتا ہے اور کوئی دوسری بیماری اور حمل کی صورت بھی اس طرح نمایاں ہے جیسے چار ماہ کا حمل ہو، دائی بھی کہتی ہے کہ: حمل ضرور ہے۔ آپ اس کا علاج کر دیجئے!

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: "ٹھہرو! مغرب بعد اس کا بندوبست کرتا ہوں"۔

مغرب بعد آپ نے جنات کے حاضر ہونے کا ایک نقش روشن کیا، اور عورت کے سامنے رکھوا دیا۔ فوراً اتنی تیز آندھی آئی۔ جیسے معلوم ہوتا تھا کہ مکان گر جائے گا اور چھپر ٹوٹ جائے گا، مگر نقش روشن ہی رہا، تھوڑی دیر بعد اس عورت نے کرختی ہوئی آواز میں کہا کہ: "مجھ کو کیوں طلب کیا ہے؟ کیا تم مجھ کو نہیں جانتے کہ میں جنوں کا امیر ہوں؟ اور میرے ساتھ بہت بڑا لشکر ہے میں ابھی جو چاہوں کر ڈالوں"؟

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بالکل متانت سے فرمایا کہ: یہ سب درست ہے۔ آپ کو اس لئے بلایا ہے کہ آپ اس عورت کو کیوں ستاتے ہیں؟ جو کچھ اس سے ہوا ہو اس کو معاف کر دو!

جنوں کے امیر نے جواب دیا کہ: "ہرگز نہیں آپ انصاف نہیں کرتے، اس عورت نے میرے اوپر کس قدر ظلم کیا ہے، اس نے میرے بارہ برس کے بچے کو مار ڈالا ہے"۔

---

(۱) تذکرۃ العابدین: ص، ۶۵۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: کس طرح؟

جن نے کہا کہ: میرا لڑکا اکثر بلی کی شکل میں گھومتا پھرتا اور سیر کرتا تھا، ایک روز اس عورت کے گھر چلا گیا، اس کا "توتا" اسکو دیکھ کر بھڑک گیا، اس پر اس نے میرے لڑکے کو مار ڈالا۔ اسی دن سے اس پر مجھ کو غصہ ہے، مگر مسلمان ہونے کی وجہ سے اس کو زیادہ تکلیف نہیں دی ہے۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: "آپ اس کا قصور معاف کردیں!"

جن نے کہا کہ: ہرگز نہیں! اور پھر غصہ ہو کر کہا کہ: حاجی صاحب مجھ کو رخصت کردیجئے! میں نماز کی جماعت سے محروم رہ جاؤں گا۔

اس پر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: میں بھی نماز کو جاؤں گا۔ آپ مسلمان ہیں اور یہ بھی مسلمان ہے، آپ اس کی غلطی معاف کردیں، بشر سے غلطی ہو جاتی ہے۔

حضرت حاجی صاحب کے اس جملے کے بعد جن نے کہا کہ: آپ کے فرمانے کی وجہ سے معاف کرتا ہوں۔

اس کے بعد حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نقش گل کردیا، اور نماز کیلئے تشریف لے گئے نماز کے بعد جب یہ قصہ اس عورت سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ واقعی یہی بات ہے۔

القصہ! صبح سویرے وہ عورت تندرست ہو کر چلی گئی۔ چھ مہینے بعد اس کو ایک لڑکا پیدا ہوا، وہ شیرینی لے کر "دیوبند" آئی۔ اور دونوں میاں بیوی حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو گئے۔(۱)

آپؒ مستجاب الدعوات تھے

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعا سے اولاد کا ہونا، بچوں کا زندہ رہنا، روزگار ملنا، پریشانیوں سے نجات پانا، مقدمات سے بری ہونا وغیرہ بکثرت مذکور ہیں، جن سے آپ کا واضح طور پر مستجاب الدعا ہونا معلوم ہوتا ہے۔

ذریعۂ معاش

آج ایک نہیں ہزاروں تعویذ گنڈوں کا ڈھونگ رچانے والے گھر بیٹھے دنیا کی دولت بٹور

(۱) تذکرۃ العابدین: ص ۸۰، ۸۱

رہے ہیں، لوگوں کے ایمان، ایقان اور اعتقاد کا سودا کر رہے ہیں، ان کے یقین کو متزلزل کر رہے ہیں، ان کے عقیدے کو بگاڑ رہے ہیں، انہیں کسی کی کوئی فکر نہیں، فکر ہے تو اپنی دکان کی، اپنے پیٹ کی اور پیسے کی ـــــ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تعویذات وعملیات میں اتنی زیادہ دست رَس اور مہارت حاصل تھی کہ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، اگر حاجی صاحبؒ اس کو ذریعۂ معاش بناتے تو کافی دولت بٹور لیتے، لیکن آپ نے کبھی کسی تعویذ اور جھاڑ پھونک کے بدلے پیسہ نہیں لیا اور نہ ہی اس کو کبھی ذریعۂ معاش بنایا، بلکہ اس کے ذریعہ صرف خلق اللہ کی خدمت کی اور عوام الناس کی پریشانیوں میں ہاتھ بٹاتے رہے۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ذریعۂ معاش کے طور پر عطاری کی دکان کرلی، اس وقت یہی ذریعہ سعاش تھا، اسی سے پورے گھر کے افراد کی پرورش ہوتی تھی، آپ دوکانداری کی حالت میں بھی اکثر اوقات تلاوتِ قرآن میں مصروف رہتے تھے (۱) لیکن اس زہد وقناعت کے پیکر اور عبادت وریاضت کے خوگر درویش اور دنیا سے بے نیاز بندے کی نگاہیں تو وَمَن يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَل لَّه مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (۲) ــــ اور جو کوئی ڈرتا ہے اللہ سے وہ کر دے اس کا گذارہ اور روزی دے اس کو جہاں سے اس کو خیال بھی نہ ہو (ترجمہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ص ۷۴۰) ــــ کے عظیم الشان مژدہ پر تھیں، خدائے بے نیاز کی ذات پر توکل تھا، چنانچہ شادی کے بعد عطاری کی دوکان بھی چھوڑ دی اور عالی شان مکان، زمین وباغات سب کو اِبْتِغَاءً لِمَرْضَاتِ اللّٰهِ صدقہ کر دیا۔ (۳) آپ کے سوانح نگاروں نے مستقلاً آپ کے کسی ذریعۂ معاش کا تذکرہ نہیں کیا ہے اور بھلا اس بے نیاز بندے کو دنیاوی ذرائع معاش کی ضرورت ہی کیا ہو جس کے توکل کا یہ عالم ہو کہ ایک قلیل رقم سے ایک عظیم الشان دار العلوم دیوبند وجود میں آجائے۔

خلافت ملنے کے بعد ایک یادگار سفر حج

جب حضرت میاں جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا خلیفہ بنادیا تو آپ نے اپنے جملہ متعلقین اور اس وقت کے مایۂ ناز اکابر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مظفر حسین

---

(۱) تذکرۃ العابدین ص ۲۲ (۲) سورۃ الطلاق آیت نمبر (۲، ۳) (۳) سوانح مخطوطہ حضرت نانوتوی بحوالہ سوانح قاسمی، ج ۲، ۲۶۱

صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا نور الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حج کا ارادہ فرمایا اور مکہ معظمہ کے لئے رختِ سفر باندھ لیا۔

ممبئی میں ایک بزرگ سے ملاقات اور خلافت

جب ممبئی پہونچے تو وہاں آپ کی ملاقات ایک بہت بڑے ولی کامل شاہ محمد امام صاحب قادری مدراسی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی، انہوں نے آپ پر خصوصی توجہ فرمائی آپ نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا، انہوں نے آپ کو خلافت بھی عطا فرمادی۔

پھر عشاق کا یہ قافلہ ممبئی سے جہاز میں سوار ہو کر مکہ مکرمہ پہونچا، حج بیت اللہ کیا اور مدینہ منورہ میں حاضری دی پھر وہاں سے فارغ ہو کر وطن مالوف واپس ہونے کا عزم کیا، اہل وطن اعزہ واقرباء کو ان کی تشریف آوری سے بے حد خوشی ہوئی۔ آپ کی تشریف آوری جس طرح دیو بند والوں کے لئے باعث شادمانی تھی، اس سے کہیں زیادہ مرشد و مربی حضرت میاں جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لئے باعثِ فرحت تھی، کیوں کہ موصوف کو آپ کا بڑی شدت سے انتظار اور ملنے کا اشتیاق تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ: ”محمد عابد کب آویں گے؟ میری زندگی میں آجاویں تو اچھا ہے، ان کی دیر میں تو میری عمر بڑھ گئی“۔

مرشد کی خدمت میں

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشد و مربی کے دیدار فرحت آثار سے محظوظ ہوئے اور ان سے شاہ محمد امام صاحب قادری مدراسی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات اور ان کی خلافت بخشی کا تذکرہ کیا۔ حضرت میاں جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت خوش ہوئے اور بڑی فرحت سے فرمایا کہ: ”محنت وصول ہوگئی، اس ابدال اللہ نے بھی میرے خلافت دینے پر صاد کر دیا“۔

اسی اثنا میں مزید فرمایا کہ: ”بھائی! اگر کوئی کچھ دے، ضرور لے لو! اور اپنے گھر کو روز بروز رونق دو! جو کوئی دیتا ہے یا امانت رکھتا ہے سو وہ لائق ہی کے پاس رکھتا ہے، نالائق کے پاس کوئی نہیں رکھتا“ الخ

مرشد کی وفات

ابھی حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حج سے تشریف لائے چند ہی دن ہوئے تھے کہ

مرشد و مربی حضرت میاں جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی ـــــ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مرشد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رامپور تشریف لے گئے ـــــ رامپور ہی میں میاں جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن!

حضرت حاجی صاحب کو اس کا کافی رنج و افسوس ہوا(۱) لیکن کوئی کیا کرے؟ خدائی قانون: کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ(۲) بالکل اٹل ہے۔

حضرت راج خاں صاحبؒ کی خدمت میں حاضری اور خلافت

حضرت میاں جی کریم بخش رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے چند دنوں بعد حضرت حاجی کرنال، پانی پت اور دہلی تشریف لے گئے، وہاں سے حضرت راج خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے بھی اکتسابِ فیض کیا، انہوں نے بھی آپ کو اپنی خلافت عطا فرمائی(۳)

بے نیازی و استغناء

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا، ان تمام خوبیوں میں زہد اور دنیا سے بے رغبتی بڑی نمایاں تھیں۔ آپ کی بے نیازی کے متعدد واقعات میں سے صرف دو واقعے رقم کئے جاتے ہیں:

ایک بہت بڑے رئیس جو چھتاری کے رہنے والے تھے، حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں دعا کے لئے تشریف لائے، وہ ایک سخت پریشانی میں مبتلا تھے حضرت حاجی صاحبؒ نے دعا فرمادی اور اطمینان دلایا چناں چہ اللہ تعالیٰ نے ویسا ہی کردیا۔

ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس رئیس کے گھر اس کی خواہش کے مطابق دو روز قیام فرمایا، رئیس صاحب نے ایک سینی میں روپیہ اور دوسری سینی میں کچھ کپڑے اور جوڑے رکھ کر پیش کئے۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت استغنا سے فرمایا کہ: فقیر اس واسطے نہیں آیا، تمہاری خواہش کے مطابق آگیا ہے، اگر فقیر اس طرح پھر کرلیتا تو بہت کچھ جمع کرلیتا، ہاں مسجد چھتہ میں جو محبت سے ایک پیسہ بھی دے دیتا ہے تو لے لیتا ہوں"۔

چنانچہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سب کے سب سامان واپس کردیے۔(۴)

---

(۱) تذکرۃ العابدین: ص،۶۶ (۲) سورۂ آل عمران آیت نمبر ۱۸۵ (۳) تذکرۃ العابدین: ص،۶۷ (۴) ایضاً ص ۸۳

ایک نواب کے یہاں مہمانی اور استغناء

"جونا گڑھ" کے نواب رسول بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش ہوئی کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے یہاں تشریف لائیں، چناں چہ حکیم محمد محسن اور مولوی امیرالدین صاحب (نواب جونا گڑھ) حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ:

نواب صاحب آپ کے مشتاق ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ "آپ جونا گڑھ تشریف لے چلیں!"

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انکار فرمادیا، لیکن زیادہ عرض و معروض کے بعد چند شرطوں کے ساتھ اجازت دی کہ میں اس طرح پر چلتا ہوں کہ (الف) جہاں میری طبیعت چاہے وہاں ٹھہروں (ب) اور جب چاہوں چلا آؤں (ج) اور تعظیم و تکریم کچھ نہ ہو!

دونوں صاحب نے یہ شرطیں منظور کرلیں اور نواب رسول بخش صاحب کو تار سے رابطہ کر کے بتایا کہ حضرت ان شرطوں کے ساتھ آنا چاہتے ہیں، نواب صاحب نے بھی اس کا وعدہ کرلیا۔

چناں چہ آپ جونا گڑھ تشریف لے گئے اور ایک مسجد میں قیام فرمایا۔ جب نواب صاحب کو خبر ہوئی تو انہوں نے عرض کیا کہ آپ کے قیام کے لئے مسجد کے سامنے ایک مکان پہلے سے تجویز کیا جاچکا ہے، اس میں ہر طرح کی سہولت موجود ہے۔

آپ نے فرمایا کہ: فقیر تو مسجد ہی میں ٹھہرا کرتا ہے۔ مگر جب سب نے بیک زبان یہی عرض کیا تو آپ نے سب کی درخواست منظور فرمائی اور مکان میں تشریف لے گئے۔

نواب صاحب ملاقات کے لئے آئے اور یہ درخواست کی کہ میں روزانہ تین سو روپے خدمت میں بھیجا کروں گا تاکہ آپ اسے فقراء پر تقسیم فرمادیا کریں۔

آپ نے پہلے انکار فرمایا اور کہا کہ: اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس پر نواب صاحب نے عرض کیا کہ: اس میں میری انسیلٹ (Incelte) اور بدنامی ہے لوگ کہیں گے کہ: "نواب کا پیر آیا اور اس نے کچھ تقسیم نہ کیا۔" الغرض! نواب صاحب روزانہ تین سو روپے بھیجتے تھے اور وہ فقراء کو تقسیم کردیے جاتے تھے۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے نواب صاحب کے یہاں لوگوں کا کافی جم گھٹا لگا

رہتا تھا نواب صاحب بھی ہمیشہ خدمت میں سلام کے لئے حاضر ہوتے تھے۔

اس طرح آٹھ دن تک حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نواب صاحب کے یہاں "جونا گڑھ" میں مہمان رہے، پھر وہاں سے واپسی کا ارادہ کرلیا اور فرمایا کہ: "فقیر اب جاوے گا"۔

نواب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً بیس ہزار روپے کا سامان تیار کرلیا تاکہ اسے حضرت کے ساتھ کردیا جائے۔

جب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو ناراض ہوگئے اور فرمایا کہ "فقیر اس واسطے نہیں آیا تھا ــــ تم صاحبان کی خوشی کردی ــــ ایسا ہرگز نہ کیا جاوے گا!"

نواب صاحب کو جب یہ معلوم ہوا تو خموش ہوگئے، اس لئے کہ انہوں نے تار سے حضرت کے شرائط منظور کرلئے تھے ان شرطوں میں ایک شرط یہ تھی کہ "تعظیم و تکریم کچھ نہ ہو"

الغرض! حضرت حاجی صاحب نواب صاحب کے یہاں سے بڑے استغناء کے ساتھ واپس ہوئے۔(۱)

دعوت وتبلیغ

دعوت وتبلیغ کا یہ طریقہ جو آج کل ہمارے ذہنوں میں متبادر ہوتا ہے، اس کی یہ شکل حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے نہیں تھی، کیوں کہ ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ حالات کے اعتبار سے اپنے مخصوص بندوں کے قلوب میں طریقے القاء فرماتے رہے ہیں۔ وقت کا جیسا تقاضا رہا علماء، صلحاء اور صوفیائے کرام اسی کے مطابق "بلغوا عنی ولو آیۃ" (۲) کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کے احکام اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو بندوں تک پہونچاتے رہے، البتہ طریقۂ کار مختلف رہے ہیں۔

تزکیہ واحسان ــــ جسے عرف میں تصوف وسلوک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ــــ سے بھی مشائخ نے دعوت وتبلیغ کے عظیم کارنامے انجام دیے ہیں (۳) حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی تبلیغ کا یہی طریقہ پسند آیا، آپ نے اسی کو اختیار فرمایا اور توجہ باطن کے ذریعہ بہت سوں کی کایا پلٹ دی۔

---

(۱) تذکرۃ العابدین: ص۷۹،۸۰ (۲) متفق علیہ، الجامع الصغیر للسیوطیؒ، ج۱، ص۱۲۵

(۳) فتاویٰ محمودیہ، ج۱، ص۴۳۰

برسوں اپنے معمول کے مطابق صبح آٹھ بجے سے ظہر کی نماز سے پہلے پہلے تک پابندی سے اذکار واشغال کی تعلیم کی شکل میں دعوت وتبلیغ کرتے رہے، اگریوں کہا جائے تو بھی بجا ہوگا کہ: آپ اپنی زندگی کے قیمتی اوقات کے اکثر حصے کو اصلاح باطن اور علم اخلاق کی تعلیم میں صرف کرتے تھے، بلکہ آپ نے سرچشمۂ دعوت اور منبع تبلیغ دین "دارالعلوم دیوبند" کو جاری کیا اور سب سے پہلے اس تعلیم وتبلیغ کے مرکز کو چلانے کے لئے سفید رومال کی جھولی بنا کر اس میں تین روپے رکھ کر چندہ کی ابتداء فرمائی، جس کا علمی ودعوتی فیضان عام ہے، اس خم خانۂ توحید سے ہزاروں میخواروں نے اپنی علمی تشنگی بجھا کر ملت اسلامیہ کو دعوت اور اسلوبِ دعوت کا وہ عظیم سرمایہ فراہم کردیا، جس کی نظیر ملنا مشکل، بلکہ ناممکن ہے اور حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلوص وللّٰہیت اور جذبۂ تبلیغ کا اثر یوں ہوا کہ اسلام ہندوستان میں نہ صرف مٹنے سے بچ گیا بلکہ ایک نئی توانائی سے اُبھرا۔

آئندہ سطروں میں سرچشمۂ دعوت وتبلیغ کی ابتدائی تصویر پیش کی جارہی ہے، اور چوں کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ چل رہا ہے اس لئے یہ تفصیل سے پیش کیا جائے گا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا دارالعلوم سے کس طرح کا ربط تھا؟ اور آپ دارالعلوم کے کس قدر خیر خواہ تھے؟ اور آپ کو کتنی مرتبہ دارالعلوم کا عہدۂ اہتمام سپرد کیا گیا؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور قیام مدرسہ کی فکر وتدبیر

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اکابر رحمہم اللہ کو ہند میں علم دین کی بقا کی فکر دامن گیر تھی، اس وقت دہلی کے رائج مدارس بند ہوگئے تھے، اسلام اور دین مبین کی حفاظت کا مسئلہ بڑا ہی سنگین تھا۔

"دارالعلوم" کی ابتداء کیسے ہوئی؟ اس کی ابتدائی تصویر کیا ہے؟ اس کو آپ خود حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اجل حاجی محمد نذیر احمد صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سنئے! موصوف اپنی مشہور ومعروف کتاب "تذکرۃ العابدین" میں رقم طراز ہیں:

> "جب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دوبارہ چلہ کرلیا تو ایک روز آپ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ صبح کو مولوی فضل الرحمن صاحب وغیرہ کو بلایا، اور فرمایا کہ: "علم دین اٹھا جاتا ہے، کوئی تدبیر کرو! جب پرانے

عالم نہ رہیں گے تو کوئی مسئلہ بتانے والا بھی نہیں رہے گا۔ جب سے دہلی کا مدرسہ گم ہو گیا ہے کوئی علم دین نہیں پڑھتا۔"

اس وقت سب صاحبوں نے عرض کیا کہ: جو آپ تدبیر فرمائیں وہ ہم کو منظور ہے۔

آپ نے فرمایا کہ: چندہ کر کے مدرسہ قائم کرو اور کاغذ لے کر اپنا چندہ لکھ دیا اور روپے بھی آگے دھر دیے اور فرمایا کہ: ان شاء اللہ ہر سال یہ چندہ دیتا رہوں گا۔

چناں چہ اسی وقت سب صاحبان نے چندہ لکھ دیا۔ پھر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مسجد سے باہر نکلے چوں کہ حاجی صاحب کبھی کہیں نہیں جاتے تھے، جس کے گھر پر گئے اسی نے اپنا فخر سمجھا اور چندہ لکھ دیا، اسی طرح شام تک قریب چار سو روپے کے چندہ ہو گیا۔

اگلے روز حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولوی محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو میرٹھ خط لکھا کہ: "آپ پڑھانے کے واسطے دیوبند آیئے فقیر نے یہ صورت اختیار کی ہے (یہ واضح رہے کہ: حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے مشورہ ہو چکا تھا اور دونوں حضرات مدرسہ کے قیام پر متفق ہو چکے تھے۔ (نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۸۴۔ اشتیاق)

مولوی محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب لکھا کہ: "میں بہت خوش ہوا، خدا بہتر کرے مولوی ملا محمود صاحب کو پندرہ روپے ماہوار تنخواہ پر بھیجتا ہوں، وہ پڑھاویں گے، اور میں مدرسہ مذکور میں ساعی رہوں گا۔"

پڑھائی شروع ہو گئی

چناں چہ ملا محمود دیوبند آئے اور مسجد چھتہ میں عربی پڑھانا شروع کیا۔ جب یہ خبر عام ہوئی کہ عربی پڑھانے کو مدرسہ قائم ہو گیا ہے، اور تعلیم شروع ہو گئی، تو طالب علم جوق در جوق آنے لگے، یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصہ میں بباعثِ کثرتِ طلبا مسجد میں گنجائش نہ رہی تب ایک مکان

کرایہ پر لیا گیا، مگر اس قدر کثرت طلبا ہوئی کہ تنہا ملا محمود صاحب تعلیم نہ دے سکے، چناں چہ اسی عرصہ میں چندہ بھی زیادہ آنے لگا۔

اسی وقت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولوی محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ و مولوی فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ و مولوی ذوالفقار صاحب رحمۃ اللہ علیہ، و مولوی مہتاب علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، و منشی فضل حق رحمۃ اللہ علیہ و غیرہ کو اہل شوریٰ قرار دیا کہ کاروبار مدرسہ حسبِ رائے اہل شوریٰ ہوا کرے اور خود بھی اہل شوریٰ و سرپرست و مہتمم مدرسہ بلا تنخواہ رہے۔

مدرس کا اضافہ

جب چندہ کی زیادہ آمد ہونے لگی تو اہل شوریٰ سے مشورہ کیا گیا کہ دو مدرس چھوٹی کتابیں پڑھانے والے اور مقرر کئے جاویں۔ اور مولوی محمد یعقوب صاحب کو بریلی سے بلا کر مدرس اول کیا جائے اور ایک مدرس فارسی اور ایک مدرس قرآن شریف کا مقرر کیا۔

چوں کہ یہ کام متعلق دین محمدی کے تھا، اس لئے یہ سب مدرس اہل فقر رکھے گئے، تاکہ کاروبار مدرسہ ہذا میں یہ لوگ دل سے توجہ کریں (۱)

مدرسہ جامع مسجد میں رہے یا علیحدہ

ابتداءً یہ رائے قرار پائی تھی کہ مدرسہ (دارالعلوم ۱۲،۱ش) جامع مسجد کی سہ دریوں میں رہے گا علیحدہ نہیں رہے گا، مگر چند سال گذرنے کے بعد دور اندیش اکابر اہل شوریٰ کی یہ رائے بدل گئی اور یہ طے ہوا کہ مدرسہ علیحدہ ہونا چاہئے۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس رائے سے اتفاق نہیں ہوا، فرمانے لگے کہ: ”جب آپ حضرات کو مدرسہ علیحدہ بنوانا تھا تو مسجد کے کام میں اضافہ کیوں کر دیا؟ جب کہ مسجد کو سہ دریوں کی ضرورت نہ تھی۔“ ــــــ اہل شوریٰ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا احترام کرتے تھے وہ خموش رہے۔

---

(۱) [illegible]

کچھ دنوں بعد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خود خیال ہوا کہ مدرسہ علیحدہ ہونا چاہئے اور مدرسہ کے لئے جگہ خریدنی چاہئے۔

اہل شوریٰ کو حاجی صاحب کی اس رائے پر اتفاق کر لینے سے بڑی خوشی ہوئی اور سب نے بخوشی کہا کہ :اگر آپ کی رائے ہے تو بہتر ہے آپ ہی جگہ تجویز کر کے خرید فرمائیے۔

چند دنوں بعد حاجی صاحب نے جگہ تجویز فرمائی اور خرید بھی لی، زمین کا بیعنامہ بھی حاجی صاحب کے نام ہے۔

اس وقت "دار العلوم" کے مہتمم، حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، مدرسہ کی تعمیر کی ذمہ داری انہی کے سر ہوئی، چناں چہ ایک پُر شکوہ، دیدہ زیب اور عالی شان عمارت تیار ہوگئی، اس وقت کے لحاظ سے تخمیناً ایک لاکھ روپے کا مدرسہ تیار ہوگیا (۱)

مولانا رفیع الدین صاحبؒ کو اہتمام کی سپردگی

ابھی "دار العلوم دیوبند" کو قیام کے دو ہی سال ہوئے تھے کہ حضرت حاجی صاحبؒ ۱۲۸۴ھ میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے، اور اہتمام کی ساری ذمہ داری حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو سونپ دی۔ تب سے حضرت مولانا موصوف مہتمم رہے مدرسہ دار العلوم دیوبند کی اولین عمارت حضرت مولانا موصوف ہی کی نگرانی میں پایہ تکمیل تک پہونچی۔ جس کا تذکرہ ابھی اوپر گذرا ہے۔

حضرت حاجی صاحبؒ دوبارہ مہتمم بنائے گئے

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہجرت کر کے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہاں جا کر انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

حضرت مولانا موصوف رحمۃ اللہ علیہ کی ہجرت کے بعد ایک اہم سوال کھڑا ہوگیا کہ مدرسہ کی ذمہ داری کون سنبھالے؟ اس کی دیکھ ریکھ کون کرے؟ اہتمام کی ذمہ داری ایک خاص اہمیت کی حامل تھی، طلبہ واساتذہ اور دیگر تمام شعبہ جات کی نگرانی کا منصب تھا، اسباق کا انتظام والنصرام، مقدارِ خواندگی کی دیکھ بھال، تعلیم کے معیار کی نگرانی، طلبہ کی خوراک و پوشاک کی خبر

---

(۱) تذکرۃ العابدین: ص، ۳۰-۳۷

گیری، جملہ حسابات کی درستگی، ہر ایک کی خبر گیری اہتمام ہی سے متعلق تھی۔

غرض یہ کہ آج کی طرح دار العلوم کے الگ الگ شعبے نہیں تھے، ہر چیز کا تعلق بلاواسطہ اہتمام اور مہتمم مدرسہ سے تھا۔

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہجرت کے بعد اہتمام کی ذمہ داری سنبھالنے والی شخصیت اس وقت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ کوئی نہیں تھی، مزید یہ کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عرصۂ دراز تک مہتمم رہ بھی چکے تھے۔ اور بقول اہل شوریٰ: "ابتدائے اجرائے مدرسہ سے اس وقت تک جس قدر امور مدرسہ کی واقفیت حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تھی اور کسی کو نہیں تھی۔

بالآخر اہتمام کی ساری ذمہ داری حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کر دی گئی، اس وقت ایک اشتہار شائع ہوا تھا، اس میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دوبارہ اہتمام کی ذمہ داری کی وضاحت کی گئی تھی اور حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مہتمم بنائے جانے کی لیاقت واہلیت کو واضح کیا گیا تھا۔ اس اشتہار کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

نَحْمَدُ اللّٰهَ الَّذِي بِاسْمِهٖ تُتِمُّ الصَّالِحَاتُ، وَتَنْزِلُ الْبَرَكَاتُ وَنُصَلِّي وَنُسَلِّمُ عَلٰى سَيِّدِ الْكَائِنَاتِ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَفْضَلُ الصَّلَوَاتِ، وَأَكْمَلُ التَّحِيَّاتِ، اما بعد:

گذارش یہ ہے کہ: جناب مولوی رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ عربی اسلامی (دار العلوم ۱۲، اش) دیو بند بعزم حج راہی مکہ معظمہ ـــــ زاد اللہ شرفاً و تعظیماً ـــــ ہو گئے چوں کہ اہتمام مدرسہ کا عظیم الشان ہے اور بسبب انتظام ایک مجمع کثیر کے مختلف جزئیات پر مشتمل ہے، مثل انتظامِ اسباق و نگرانی ترقیِ خواندگی و خبر گیری خوراک و پوشاک طلبہ مسافر و درستی حسابِ آمد و صرفِ مدرسہ، وغیرہ امور متعلقہ چند صد طلبہ و مدرسین جن کی تفصیل متعذر ہے،

لہٰذا جملہ خیر خواہانِ مدرسہ کو بسبب روانگی مولوی صاحب موصوف نہایت تشویش پیش آئی، ناچار بجز اس تجویز کے کوئی چارہ بن نہ پڑا کہ: مجتمع ہو کر بخدمت بابرکت حضرت سید محمد عابد صاحب دامت برکاتہ ـــــ جو بانی و مجوزِ اول مدرسہ ہذا و حامی و سرپرست و سرآمد اربابِ مشورہ ہیں، اور اول

ایک عرصہ دراز تک مہتمم مدرسہ رہے ہیں اور جب جناب موصوف الصدر حج کو تشریف لے گئے تھے، اس وقت مولوی رفیع الدین صاحب بجائے ان کے کار اہتمام (سے) منسوب ہوئے تھے اور تمام زمانۂ اہتمام میں مولوی صاحب جملہ اُمور مثل جانچ و پڑتال حساب و کتاب ماہواری مدرسہ بلکہ کارہائے روز مرہ حسب ہدایت و مشورہ و شرکت جناب حاجی صاحب انجام دیتے تھے۔

الغرض! ابتدائے اجرائے مدرسہ سے اس وقت تک جس قدر امور مدرسہ سے واقفیت حضرت جناب حاجی صاحب کو ہے اس قدر اور کسی کو نہیں یہاں تک کہ مولوی رفیع الدین صاحب کو بھی نہ تھی ــــ حاضر ہو کر ملتجی ہوئے کہ جناب والا پھر اس کام کو انجام دیں، کیوں کہ یہ مدرسہ تو آپ ہی کا ہے، ع

ع اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردہ تست

بحمد اللہ کہ سید صاحب ممدوح نے ــــ بنظر حمایتِ دینِ متین و خوشنودی رب العالمین و خرسندی روح پرفتوح حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم و آلہ اجمعین ــــ اس عرض کو قبول فرمایا۔ جزاہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء و شکر مساعیہ"

اس کے بعد اشتہار میں ارباب چندہ اور خیر خواہان دار العلوم سے یہ اپیل کی گئی ہے کہ: وہ حضرات اب سے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام ہی مراسلت فرمائیں۔ اشتہار کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"لہٰذا جملہ اربابِ چندہ و اہلِ ہمت جو باعطائے زر وغیرہ مدرسہ کی اعانت فرماتے ہیں، نیز ان بزرگوں کی جناب میں جو مدرسہ سے مراسلت فرماویں، عرض ہے کہ: آئندہ جملہ مکاتیب بنام نامی حضرت سید صاحب موصوف فرماتے رہیں!"

اشتہار کے اخیر میں یہ گزارش کی گئی ہے کہ: دار العلوم کا بجٹ کم ہو رہا ہے اس لئے جن حضرات کے پاس گذشتہ سالوں کے چندے باقی ہیں وہ جلد ارسال فرمائیں، تاکہ دار العلوم دیوبند کے انتظام و انصرام میں پریشانی نہ ہونے پائے۔ اشتہار کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

"اور دوسرا امر واجب العرض یہ ہے کہ: بملاحظہ رجسٹر چندہ واضح ہوا کہ بہت سے ارباب چندہ کی طرف بقایا سال گذشتہ و سنین ماضیہ برابر چلی آتی

ہے، لہٰذا ان کی خدمت عالیات میں گذارش ہے کہ ــــــ بنظر تائید دین متین، وبقاو ترقیٔ مدرسہ ــــــ براہِ کرم جلد بقایا ادا فرمادیں، تاکہ انتظام مدرسہ میں خلل نہ پڑے، کیوں کہ اس کارخانۂ خیر کا مدار صرف اعانت وامدادِ اہل خیر پر ہے۔ اِنَّ اللّٰہِ لَایُضِیعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ.

المرقوم: ۲۳؍جمادی الاولیٰ ۱۳۰۶ھ مطبوعہ مجتبائی دہلی

العبد	العبد	العبد
رشید احمد گنگوہی	محمد ضیاء الدین رامپوری	مشتاق احمد دیوبندی
العبد	العبد	العبد
ذوالفقار علی دیوبندی	محمد فضل الرحمٰن دیوبندی	محمد فضل حق دیوبندی

اہتمام سے استعفاء

حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ نے تمام اربابِ شوریٰ کے مشورے کے مطابق اہتمام کی ذمہ داری سنبھالی، اور خلوص وللّٰہیت کے ساتھ اس کے جملہ امور انجام دیتے رہے، مگر چند دنوں بعد کسی وجہ سے آپ نے اہتمام سے استعفاء دے دیا۔

پھر اربابِ شوریٰ خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: ”آپ اہتمام جس کو چاہیں سپرد کردیں، مگر مدرسہ کے سرپرست رہیں!“ آپ نے اس درخواست کی پذیرائی کی اور تمام اربابِ شوریٰ کے مشورے سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ کے مرید اور مجلس شوریٰ کے رکنِ خاص: حضرت منشی فضل حق صاحب دیوبندی رحمہ اللہ کو مہتمم بنایا اور خود اہل شوریٰ میں شامل رہے۔

پھر چند دنوں بعد جب حج بیت اللہ سے واپس ہوئے تو مدرسہ سے بالکل بے تعلق اور علیحدہ ہوگئے۔ (۱)

دیوبند کی ”جامع مسجد“ بھی حاجی صاحبؒ کی کوشش کا ثمرہ ہے

دیوبند میں جامع مسجد نہیں تھی، منتخب، سر برآوردہ اور اہل الرائے حضرات جمع ہوئے اور

(۱) تذکرۃ العابدین: ص، ۴۷،۷۶۔

مشورہ ہوا کہ جمعہ کی نماز کے لئے ایک وسیع وعریض "جامع مسجد" ہونی چاہئے، چنانچہ تمام لوگوں کے مشورے سے "جامع مسجد" بنانا طے پا گیا، تاہم یہ بات زیرِ غور تھی کہ کہاں بنے؟ بالآخر بازار کے قریب ایک اونچی جگہ پسند کی گئی، اس جگہ کھڑے ہو کر دعا بھی مانگی گئی کہ:

"اے اللہ اس جگہ جامع مسجد بن جائے!"

دعا تو قدسی صفات اولیاء کی تھی، مستجاب الدعوات کی تھی، قبول ہو کر رہی۔

لیکن اس جگہ لوگوں کے مکانات تھے، کافی تدبیریں کی گئیں، لیکن سب تدبیریں ناکام رہیں مکان والے جگہ دینے کو تیار نہ تھے، ان سے اگر کوئی کہتا کہ: مسجد کے لئے جگہ دے دو! تو وہ برجستہ جواب دے دیا کرتے تھے کہ: اپنے مکان ہمیں دے دو ہم اس جگہ کو مسجد کے لئے دے دیتے ہیں یہ جواب سن کر ہر ایک خاموش ہو جاتا ہمتیں پست ہو جاتی تھیں۔

اتفاق سے ایک دن حاجی صاحب ﷫ نے بھی مکان والے سے درخواست کی کہ: یہ جگہ مسجد کے لئے دے دو ـــــ اس نے وہی جواب دیا جو سب کو دیا کرتا تھا کہ اپنے مکان ہمیں دے دو ہم یہ جگہ مسجد کو دے دیتے ہیں۔

یہ بات اگرچہ دوسروں کے لئے مشکل تھی لیکن ـــــ اس ذات کو کیا کہئے؟ جس کے ضمیر میں استغنا داخل ہو، دنیا اور ثروتِ دنیا سے اس کو کوئی مطلب نہ ہو جو بقدرِ سدِ رمق ہی دنیا سے ضرورت رکھتا ہو ـــــ حاجی صاحب ﷫ نے فوراً فرمادیا کہ: میں اپنا مکان اور نشست گاہ بھی تم کو دیتا ہوں، تم یہ جگہ مسجد کو دے دو! اس شخص نے فوراً اپنا مکان مسجد کو دے دیا اور حاجی صاحب ﷫ نے بھی اپنا مکان اور بیٹھک اس کے حوالے کر دیا اور حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ یہ سن ۱۲۸۴ عیسوی کا واقعہ ہے (۱) وہاں حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی ﷫ سے ملاقات ہوئی، انہوں نے فرمایا کہ: ہندوستان خالی مت کرو! اور مسجد بھی بغیر تمہاری مدد کے نہیں بن سکتی۔

چناں چہ حاجی صاحب ﷫ واپس ہندوستان تشریف لائے...... اور جامع مسجد کے سلسلے میں بھی دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ: ابھی کوئی آمدنی مسجد کے نام کی نہیں ہے اور نہ وہ جگہ پورے طور سے خالی ہوئی ہے۔

حاجی صاحب ﷫ کچھ روز تک کسی مصلحت کی بنا پر خاموش رہے، پھر مسجد کی بنیاد بھی

---

(۱) تذکرۃ العابدین: ص ۷۱

کھدوائی شروع فرمادی ــــــ چوں کہ اس وقت روپے نہیں تھے اس لئے بعض لوگ طنز کے طور پر یہ کہنے لگے کہ : حاجی صاحبؒ گڑھے کھدواکر اس میں لوگوں کو ڈال دیں گے ــــــ مسجد کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے جناب عبد الخالق صاحبؒ کو ان کی مرضی کے مطابق رکھا گیا، وہ چندہ جمع کرتے رہے اور ادھر مسجد کا کام بھی جاری رہا۔

بالآخر اس پرانے زمانے (آج سے سو، سوا سو سال پہلے) کے تخمینے کے اعتبار سے ڈیڑھ لاکھ کی مسجد تیار ہوگئی (۱)

سفرِ حج اور جامع مسجد کا انتظام

حضرت حاجی صاحبؒ نے چند دنوں بعد (یعنی جب مسجد بالکل تیار ہوگئی تو) حج بیت اللہ کا ارادہ کیا، بہت بڑا قافلہ تھا جس میں قابل ذکر شخصیت پیر جی محمد انور صاحبؒ کی ہے جو حضرت حاجی صاحبؒ کے خلیفہ بھی تھے۔

جب آپ سفر پر روانہ ہوگئے تو مسلمانانِ دیوبند "جامع مسجد" میں جمع ہوئے کہ "جامع مسجد" کا انتظام و انصرام اب تک تو حاجی صاحبؒ کیا کرتے تھے، اور ہر طرح کی ذمہ داری سنبھالتے تھے، اب جب حاجی صاحبؒ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے ہیں تو کیا ہونا چاہئے؟

اس مجلس میں یہ طے پایا کہ جب تک حاجی صاحب موصوف حج بیت اللہ سے واپس تشریف نہیں لاتے ہیں، اس وقت تک کے لئے ایک شوریٰ تشکیل دی جائے، اور حضرت منشی فضل حق صاحب اس کے مہتمم بنائے جائیں۔ جب حاجی صاحبؒ تشریف لے آئیں گے تو جیسا مناسب سمجھیں گے، کریں گے۔

اس کیلئے باضابطہ ایک تحریر لکھی گئی، اس پر جملہ مسلمانوں کے دستخط بھی ثبت ہوئے (۲)

۱۲۸۴ھ کا حج

۱۲۸۴ھ میں آپ نے خفیہ طور پر حج کا ارادہ کیا تھا، کسی کو خبر نہ تھی، آپ جس وقت روانہ ہوئے اس وقت ہر طرف مایوسی چھائی ہوئی تھی، ہر ایک غم زدہ تھا اور فرقت کی وجہ سے سارے

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible]

شہر والوں کی حالت دگرگوں تھی، لوگوں کی کافی تعداد دور تک "الوداع" کہنے گئی۔

آپ مکہ مکرمہ پہونچے اور حج ادا کرلیا، پھر مدینہ منورہ تشریف لے گئے، وہاں تقریباً ایک سال رہے۔

ایک مبارک خواب

ایک دن خواب دیکھا، بشارت ہوئی کہ: "اپنا سلسلۂ احسان وسلوک حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاؤ اور ہندوستان جاؤ!"

حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت

اب تک حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو متعدد بزرگوں مثلاً: میاں جی کریم بخش رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ محمد امام قادری مداری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت راج خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت مل چکی تھی۔ اس منامی بشارت کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بھی کسبِ فیض کیا، اور خاطر خواہ استفادہ کیا۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آپ کو خلافت عطا فرمائی اور یہ فرمایا کہ: تمہارا ہندوستان جانا مناسب ہے، کیوں کہ تم سے وہاں لوگوں کو بہت نفع ہوگا ہندوستان خالی مت کرو اور جامع مسجد بھی بغیر تمہاری نہیں بن سکتی۔

اور چوں کہ اسی سفر میں حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ کا ــــ جو بڑی عابدہ زاہدہ تھیں، جن کو درود شریف پڑھتے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہو جاتی تھی (۱) مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ آتے ہوئے راستے میں ــــ انتقال ہوگیا تھا اس لئے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: "شادی ضرور کرلینا"

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشد کے حکم اور منامی بشارت کے مطابق ہندوستان تشریف لے آئے "جامع مسجد" بھی تعمیر کروائی اور شادی بھی کرلی (۲)

ساتواں حج

پہلے زمانے میں سفر میں سہولت نام کی کوئی چیز نہ تھی دور دراز کا سفر کرنا یقیناً ایک عذاب

(۱) تذکرۃ العابدین [illegible] ص ۲۳ (۲) تذکرۃ العابدین [illegible]

تھا جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔ اَلسَّفَرُ قِطْعَةٌ مِّنَ الْعَذَابِ(۱) سفر عذاب کا ایک حصہ ہے۔ حج کا سفر کرنا تو بڑے حوصلے اور دل گردے کی بات تھی۔ زاد و راحلہ کے باوجود حج کے تصور سے پیشانی عرق عرق ہو جاتی تھی، اگر کوئی ایک حج کر لیتا تو پھر دوسرے کی ہمت نہیں کرتا، لیکن حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی عجیب و غریب تھی، انہوں نے اس زمانے میں ایک دو نہیں سات سات حج کئے، ساتواں حج ۱۳۳۰ھ میں کیا(۲) یہ آخری حج تھا اس کے بعد ایک سال ہی باحیات رہے اور ہمیشہ کے لئے رب العالمین کے در پر حاضری کے بجائے خود رب العالمین کے پاس پہونچ گئے، حقیقی حج تو ہے بھی یہی!

وفات سے پہلے ایک طالبِ علم کا خواب

جس روز حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی اسی روز ایک نیک طالب علم نے جو "بخارا" کے رہنے والے تھے، خواب میں دیکھا کہ آسمان سے ایک چاندی جیسا سفید گھوڑا اترا ہے اس کے ساتھ دو فرشتے بھی ہیں، اس نے اس گھوڑے پر سوار ہونا چاہا، مگر فرشتوں نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ: "یہ ایک بہت بڑے شیخ کی سواری کے لئے ہے" اور آگے نکل گئے.... تھوڑی دیر بعد اس نُقرئی گھوڑے پر ایک وجیہہ بزرگ کو سوار دیکھا، اس لڑکے نے آگے بڑھ کر مصافحہ کرنا چاہا مگر فرشتوں نے اسے ہٹا دیا اور کہا کہ: "تم مصافحہ کے قابل نہیں ہو!" یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے، اس طالب علم نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی، مگر وہ ایسا تیز رفتار تھا کہ اس سے پکڑا نہ گیا، اور پھر آسمان کی طرف چلا گیا۔

جب اس طالب علم کی آنکھ کھلی تو اس نے اس خواب کی یہ تعبیر لی کہ: "کسی بڑے بزرگ کا انتقال ہوگا اور مجھ کو ان کے جنازے کی نماز نہیں مل سکے گی۔"

چناں چہ ایسا ہی ہوا جب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جنازے کی نماز ہونے لگی تو اس طالب علم کو کافی کوشش کے باوجود نماز جنازہ نہ مل سکی۔(۳)

وفات

۱۹ر ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ بموافق ۱۹۱۳ء کو حضرت حاجی صاحب کو بخار ہوا، سینے میں درد

(۱) متفق علیہ، المقاصد الحسنہ للسخاوی ص ۱۱۴   (۲) تذکرۃ العابدین ص ۸۴   (۳) ایضاً ص ۸۸، ۸۹

ہوا، غفلت طاری ہوگئی، اسے لوگ معمولی بات سمجھ رہے تھے، اس لئے کہ اکثر ایسا ہو جاتا تھا اور نماز کے وقت ہوش میں آجاتے تھے، لوگوں کا اس مرتبہ بھی یہی خیال تھا مگر مرض بڑھتا رہا۔

۲۷/ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ بموافق ۱۹۱۳م بروز جمعرات مرض نے شدت اختیار کی، شوق لقاء رب میں زندگی کا ہر لمحہ گذارنے والا یہ عابد و زاہد نمازِ عصر کی تکبیر تحریمہ کے ساتھ ساتھ نماز عشق ادا کرنے خود درِ محبوب پر پہونچ جاتا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اللہ اللہ اس وقت پذیرائی کا کیا عالم رہا ہوگا یقیناً ملائکہ نے رشک کیا ہوگا۔

۲۸/ ذی الحجہ کو جمعہ کے دن جمعہ کی نماز سے پہلے ہی گیارہ بجے شاہ شیداؒ کے مزار کے قریب "مزارِ قاسمی" سے کچھ فاصلے پر سپرد خاک کر دیئے گئے۔ بوقتِ وفات آپ کی عمر ۸۱ برس کی تھی(۱)

قطعات تاریخ وفات

حضرت حاجی صاحبؒ کی وفات حسرت آیات پر بہت سے شعراء نے مرثیے کہے اور تاریخی قطعات لکھے ہیں، جن میں سے تین شعراء کے لکھے گئے، قطعاتِ ذکر کئے جاتے ہیں (۱) مولوی احمد حسن صاحب دیوبندیؒ، (۲) محمد خان صاحب غریب سہارنپوریؒ، (۳) مولوی ممتاز علی ممتاز مراد آبادیؒ۔

ان قطعات میں سے کسی کا مکمل آخری مصرعہ مادۂ تاریخ وفات ہے، اور کسی کا آخری مصرعہ چند حروف کی کمی کے ساتھ۔

از:۔ مولوی احمد حسن صاحب دیوبندیؒ

گذشت عارفے کاملے سیدے — کہ دیدارِ حق بود دیدار او
بگفتند لیش حاجی عابد حسین — خدا را نذکر بدی روئے او
بدہ اول عصر یوم الخمیس — کہ عابد بدرگاہ حق کرگار او
ہم آن بست و ہفتم ز ذی الحجہ بود — بوصل خدا گشت بشاش رو
بآدینہ قبل از نمازِ جمعہ — شدہ دفن در شاہ شیدائے ہو
دریغا! چنیں چشمۂ فیض رفت — کہ مقطوع از خلق شد فیض او

(۱) تذکرۃ العابدین ص:۱۹

بکش احمد "آہ" ازچنیں رحلتش	لَقَدْفَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا بگو
۱۳۳۷ھ
آہ ۶ـ
۱۳۳۱ھ (سن رحلت)

ترجمہ :۔

ایک عارف کامل سید گذر گئے | جن کا دیدار دیدارِ حق تھا
جنہیں لوگ حاجی عابد حسین کہتے ہیں | جن کا چہرہ خدا کو یاد دلاتا تھا
پنجشنبہ کے دن عصر کا ابتدائی وقت تھا | "عابد" اپنے رب کے دربار میں پہونچ گئے
نیز وہ ذی الحجہ کی ستائیسویں تاریخ تھی | خوش وخرم خدا سے واصل ہوگئے
جمعہ کے دن جمعہ کی نماز سے پہلے | "شاہ شیدا" کے قبرستان میں دفن ہوئے
افسوس! اس طرح کا چشمۂ فیض چلا گیا | کہ لوگوں سے ان کا فیض منقطع ہوگیا

اے احمد! ان کے اس مادۂ رحلت (لَقَدْفَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا) سے "آہ" (کا عدد ۶) کم کردو اور "لَقَدْفَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا" کہہ دو، یعنی انہوں نے بہت بڑی کامیابی حاصل کرلی۔

از :۔ محمد خان صاحب غریب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ

بحرِ ہستی کی بھری ہے کیا ترے سر میں ہو | ہے حُباب آسا ترا اے بے خبر نقش حیات
آٹھ آٹھ آنسو رُلائے گا شکر خندہ تجھے | ایک دن چکھنا ہے غافل تلخی زہر ممات
جب مزا ہے بیٹھے بیٹھے یار لائے نخل عمر | خشک لب کیوں ہے میاں چشمۂ آبِ حیات
کر نظارہ حادثوں کا چشم عبرت کھول کر | جا رہے ہیں وہ کہ تھی فخر زمانہ جن کی ذات
موت نے ایکدم اٹھادیے فیض کے دریا سے گرد | ہوگئے دنیا سے رخصت عابدِ عالی صفات
خلد میں ہو عابد والا گہر کا گھر! غریبؔ | یہ دعا وہ ہے کہ ہے جس سے عیاں سال وفات

(سن رحلت) ۱۳۳۱ھ

ہست ایں رسم کہن در روزگار | چوں اجل آید ہمی گوید کہ: خیز!
روزاں داری کہ بر شیرے زنی | با قضا کے میتواں کردن ستیز؟
چوں عروس مرگ می خواہی شدن | رو بدست آور ہمہ ساز جہیز
خون چہ می ریزی بمرگ دیگراں | بر مال خویشتن خونے بریز!

گر خصالت چوں "محمد عابد" است
کن بروں از سر خیال رست خیز

زاں کہ رضواں گفت بر مرگش غریب!
عابد آمد در بہشت عطر بیز

۳۱ ۱۳ ھ (سن رحلت)

یہ زمانے کی پرانی ریت ہے
کہ جب موت آتی ہے تو کہتی ہے کہ اٹھ چل

روزانہ تو یہ طاقت رکھتا ہے کہ ایک شیر کو مار دے
لیکن موت سے کس طرح لڑائی کی جا سکتی ہے؟

جب موت دلہن ہونا چاہے گی
تو سارا سامان جہیز زبردستی لے چلی جائے گی

دوسروں کی موت پر خون کیوں بہاتے ہو؟
اپنے مال پر خون بہاؤ!

اگر تیری سیرت "محمد عابد" جیسی ہے
تو قیامت کا خیال ذہن سے نکال دے!

جسکی موت پر جنت کے فرشتے نے کہا اے غریب!
"عابد" خوشبودار جنت میں ہیں

حاجی عابد کہ دیوبند میں تھا
نیک رو نیک خو خجستہ صفات

محو رہتا تھا زاہدوں کی طرح
ذکر و شغل و نماز میں دن رات

تھی زمانے کی خوبیاں ان میں
ذات عالی تھی مجمع الحسنات

تھا فرشتہ بشکل انسانی
جیسے ظلمات میں ہے آب حیات

اس لئے اے غریبؔ! غور سے دیکھ
افضل الفاضلین ہے سال وفات

۱۳ ۱۹ ء

از: مولوی محمد ممتاز علی صاحب ممتازؔ مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ:

محبّ خدا حاجی عابد حسین
کہ بودند شیخ زمان و زمیں

سروش از وصالش بہ ممتازؔ گفت
مدار المہام بہشت بریں(۱)

۳۱ ۱۳ ھ

حاجی عابد حسین صاحب خدا سے محبت کرنیوالے
شیخ عصر اور شیخ جہاں تھے

ہاتف غیبی نے انکی وفات پر ممتازؔ سے کہا کہ
عالی مرتبت سب سے اعلیٰ درجہ کی جنت میں ہیں

(۱) تذکرۃ العابدین: ص ۹۰

سوانح علمائے دیوبند

حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ

حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ

فہرست

حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ

سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ از مولانا سید محمد الحسنیؒ

تلخیص مولانا عبد الرشید ارشد

حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء

مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ مختلف النوع کی صلاحیتیں رکھنے والے ایک عہد آفریں شخصیت تھے کہ جنہوں نے دین کی خدمت کے مختلف محاذوں، سلوک وارشاد، قادیانیت اور عیسائیت کے رد واستیصال میں برصغیر میں گذشتہ صدی کے صف اول کے چند ممتاز حضرات میں جگہ پائی ہے۔ گو آپ کا نسب بھی عالی تھا کہ آپ سیدنا حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہیں اور آپ کے نسب نامہ میں حضرت شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک بہت اہم شخصیات کا نام ملتا ہے، لیکن جب انسان کی اپنی ذات میں صلاحیت واستعداد نہ ہو تو نسب صرف ایک نسبت کا کام دیتا ہے اور خالی خولی نسبت کچھ کام نہیں دیتی۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

پسر نوح بابداں بہ نشست خاندان نبوتش گم شد
سگ اصحاب کہف روزے چند بامردماں بنشست مردم شد

مولانا کے آباء کرام میں حضرت شاہ ابوبکر چرم پوش بن حضرت مخدوم شاہ بہاء الحق، حبیب اللہ ملتانی جیسے کبار اولیاء کرام نظر آتے ہیں۔ تفصیل کیلئے سوانح مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ مولفہ سید مولانا محمد الحسنی ملاحظہ فرمائی جائے۔

ابتدائی تعلیم اور اساتذہ

۳ شعبان المعظم ۱۲۶۲ھ، ۲۸ جولائی ۱۸۴۶ء کو کانپور میں ولادت ہوئی۔ دوڈھائی سال کی عمر میں والد ماجد سید عبد العلی فوت ہوگئے۔ قرآن مجید اپنے چچا ظہور علی سے اور فارسی کی ابتدائی

کتب مولانا سید عبد الواحد بلگرامی سے پڑھیں۔ قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا، لیکن اکثر بیمار رہنے کے باعث حفظ نہ کر سکے، درسیات کی تکمیل اساتذ الاساتذہ مولانا لطف اللہ علی گڑھی اور مفتی عنایت احمد کاکوروی سے کی۔ دس بارہ سال کی عمر میں چچا سید ظہور علی اور دادا سید شاہ غوث علی فوت ہو گئے اور گھر کے ۵۔۶، افراد کی ذمہ داری مولانا پر آپڑی۔ لیکن ایک بزرگ دوست حافظ امام علی سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا:........ کہ رزق کا ذمہ تو اللہ تعالیٰ نے لیا ہے اور قرآن پاک میں قسم کھا کر کہا ہے کہ ہم ذمہ دار ہیں، اور "سراج السالکین" کتاب دی کہ پڑھ کر دیکھو۔ اس میں آیات و احادیث سے یہ بات ثابت کی گئی تھی، اگر تمہاری کوئی دعوت کرے تو اس قدر اعتماد و اطمینان ہو جاتا ہے کہ گھر میں کھانا کھانے کے متعلق انکار کر دیتے ہو لیکن رب العالمین اور احکم الحاکمین کے وعدہ پر جو قسم کھا کر کیا گیا ہے۔ اعتبار نہیں۔ یہ اس کا خلاصہ تھا مولانا فرماتے ہیں!

> "جس وقت یہ بیان دیکھا اسی وقت دل مطمئن ہو گیا اور پریشانی جاتی رہی اور بدستور تحصیل عربی میں مشغول ہو گئے اور کسی قسم کی پریشانی قلب میں نہ رہی (۱)

"ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"۔ اسی عمر میں یقین کامل ہو گیا کہ رازق تو اللہ تعالیٰ ہے۔ ظاہر ہے اسباب بھی میسر آگئے ہوں گے........... اور اسی عمر میں کہ طالب علموں کو سوائے سبق اور تفریح کے کوئی اور شوق کم ہی ہوتا ہے۔ مگر مولانا میں یہ شوق پیدا ہو گیا کہ اگر کہیں کسی بزرگ کا پتہ ملتا تو ان کو ملنے کی کوشش کرتے........... اور انہی دنوں مدینہ طیبہ کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور مولانا تنہائی میں اس عمر میں رویا کرتے بلکہ ایک دفعہ ارادہ کیا کہ مکان وغیرہ فروخت کر کے سب کو لے کر عرب جاؤں، لیکن ایک درویش صفت بزرگ نے روکا۔ مولانا نے فرمایا کہ دل قابو میں نہیں ہے انہوں نے جواب دیا کہ قابو میں آجائے گا، اور یہ سنتے ہی دل قابو میں آگیا۔ (۲)

مدرسہ فیض عام میں

کانپور میں مدرسہ فیض عام قائم ہوا، تو مولانا پہلے طالب علموں میں تھے۔ (یہی وہ مدرسہ ہے کہ جہاں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ۱۳۰۱ھ میں پڑھانا شروع کیا) اس مدرسہ میں ان

---

(۱) کمالات محمدیہ (۲) ایضاً

دنوں عربی صرف کی مشہور کتاب "علم الصیغہ" خود اس کے مصنف مفتی عنایت احمدؒ سے پڑھی۔ مولانا کس محنت سے سبق یاد کرتے تھے اس کا نمونہ یہ ہے کہ استاد نے کہا کہ کل کا سبق مشکل ہے خوب مطالعہ کر کے آنا، مولانا نے غور وخوض سے مطالعہ کیا اور مطلب حل کر لیا، لیکن جب سبق پڑھنے لگے تو مفتی صاحبؒ نے خود مطلب بیان کرنا شروع کر دیا۔ اس پر مولانا نے رونا شروع کر دیا، استاد نے پوچھا کیا بات ہے تو عرض کیا کہ یہ مطلب تو میں نے آپ کے کہنے پر مطالعہ سے خود سمجھ لیا تھا۔ مفتی صاحب نے سنا اور تسلی دے کر بہت ہمت افزا الفاظ فرمائے۔

دو سال کے بعد مفتی صاحب حج کیلئے چلے گئے، لہٰذا مفتی صاحبؒ کے جلیل القدر شاگرد سید حسین شاہ اور مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے پڑھا اور پڑھنے کے ساتھ نچلے درجے کی کتب پڑھانا بھی شروع کر دیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی (نواب صدر یار جنگ مولانا ابوالکلام آزاد کے غبار خاطر میں مکتوب الیہ) اور مفتی عبداللطیف صاحبؒ نے بھی ان سے متعدد کتب پڑھیں۔

اسی زمانہ میں ان کی والدہ کو خیال ہوا کہ ان کا نکاح کر دیا جائے اس وقت عمر ۲۲ سال تھی۔ مظفر نگر سے روانہ ہو کر محی الدین پور میں شادی کی اور ۲ سال قیام کیا۔ اس عرصے میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی کانپور سے علی گڑھ منتقل ہو کر جامع مسجد کے مدرسہ میں پڑھانے لگے۔ مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ، مظفر نگر سے سیدھے علی گڑھ گئے اور بقیہ کتب کی تکمیل کی۔

سلامت فکر اور طلب حق

گو آپ نے دستور کے مطابق فلسفہ و منطق کی مروجہ کتب بھی پڑھیں لیکن ذہن ہمیشہ متوحش رہا۔ علمی استعداد تو تھی لیکن ان معقولی علوم کی طرف طبیعت چلتی نہ تھی، لہٰذا معقول کی بڑی کتب نہ پڑھیں مگر مولانا لطف اللہ علی گڑھی رحمۃ اللہ علیہ برابر ترغیب دیتے رہتے تھے۔ لہٰذا "ہدیہ سعیدیہ" پڑھا اور قاضی مبارک پڑھتے تھے کہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کانپور تشریف لائے اور فلسفہ و منطق کے متعلق ایسی تقریر کی کہ دل سرد ہو گیا۔ لیکن صحاح ستہ کی کتب بڑے ذوق شوق سے مولانا لطف اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہی سے پڑھیں۔ اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کو لکھا کہ حدیث ہدایہ کی طرح ایک ایک دو دو ورق کر کے پڑھی۔ درمیان سے ابھی فراغت نہ ہوئی کہ معیشت کی پھر فکر لاحق ہوئی، لیکن الحمدللہ پھر پہلے کی طرح اطمینان ہو گیا، حالانکہ نواب لوہارو کے وہاں لڑکوں کو پڑھانے پر تمیں روپے ماہوار پر بات ہو گئی تھی لیکن اچانک

خیال آیا کہ کتب تو مکمل نہیں ہوئیں اور رونے لگے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی اور دل پھر پہلے کی طرح مطمئن ہوگیا۔

اہل حق کی تلاش

جیسا کہ گذرا اہل حق کی تلاش رہتی تھی۔ حالانکہ عمر اتنی نہ تھی۔ آغاز جوانی ہی میں ایک صاحب حال سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اسم ذات کی تعلیم دی۔ مولانا میں استغراق اور ایک کیفیت پیدا ہوگئی۔ لیکن چند دوستوں کے کہنے پر یہ شغل ترک کردیا لیکن کچھ دنوں بعد مولانا کرامت علیؒ سے تعلق پیدا ہوا جو شاہ اسماعیل شہیدؒ کے ساتھی اور شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد تھے۔ ان سے بڑا فیض ہوا۔ لیکن ان کا دس ماہ بعد انتقال ہوگیا۔ مولانا کو ان دنوں نبی اکرم ﷺ کی زیارت بھی ہوئی۔

مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کی خدمت میں

مولانا کرامت علی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد کسی اور شیخ کی تلاش ہوئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل نے مولانا فضل الرحمٰن کی خدمت میں پہنچا دیا، اور ان سے تعلق پیدا ہوگیا اور چند دنوں میں ان کی تعلیم و تربیت نے اثر دکھایا۔ اس کی تفصیل مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''ارشاد رحمانی'' میں ملتی ہے۔ .... مولانا، مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے اکثر تنہائی میں ملتے۔ ان ملاقاتوں نے اثر دکھایا اور طبیعت پھر دینی کتب کی طرف راجع ہوئی۔

چنانچہ حدیث پڑھنے کیلئے اپنے وقت کے نامور محدث حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوکر صحاح ستہ اور موطا امام مالک اور موطا امام محمد پڑھا۔ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے جوہر قابل کو پہچان لیا اور بڑی محبت اور توجہ سے پڑھایا۔ وہ اپنے شاگرد کی بہت قدر کرتے تھے۔

انہی دنوں مولانا فتوح کی خاطر دو وظیفے پڑھا کرتے۔ ایک عمل چہار شنبہ اور دوسرا عمل ''یا منعم''، لیکن پھر چھوڑ دیتے کہ ذہن میں خیال آیا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں ذکر الٰہی کر رہا ہوں لیکن میں یہ وظیفے فتوح کیلئے کرتا ہوں لہٰذا چھوڑ دیئے۔ اور اسکے بعد ایسا غنائے قلب حاصل ہوا کہ کسی بادشاہ کو بھی کیا حاصل ہوگا۔ محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ سے واپسی پر گنج مرادآباد حاضر ہوئے تو مولانا نے ''صحاح ستہ''، ''موطا امام مالک'' اور ''حصن حصین'' کی اجازت مرحمت فرمائی۔

اجازت وخلافت

اسی زمانہ میں مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت کی اجازت بھی دی، اور وہ بھی عجیب اور سادے طریقہ سے "ارشاد رحمانی" میں مولانا لکھتے ہیں:۔

"جب میں رخصت ہونے کی غرض سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ مسجد کے اندر سے صحن مسجد میں آیا تو حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ میرا ہاتھ پکڑ کر مسجد کے اندر داہنے گوشہ میں لے گئے، اور اکڑو بیٹھ کر ارشاد فرمایا کہ، جو کوئی تمہارے پاس آکر بیعت کی درخواست کرے تو خاندان نقشبندیہ اور قادریہ میں مرید کرلیا کرو۔ میں نے عرض کیا کہ! حضرت میں اس قابل نہیں ہوں۔ ارشاد ہوا کہ! تمہیں اس سے کیا بحث ہے، جو ہم کہتے ہیں وہ کرو۔ پھر میں نے عرض کیا کہ اس بوجھ کو حضور ہی سنبھالیں اور خیال رکھیں؟ فرمایا "ہاں۔"

تدریسی خدمات

محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ اور اپنے شیخ سے خلافت ملنے کے بعد "کانپور" کی دلاری مسجد میں درس دینا شروع کیا۔ دونوں کی تعلیم وصحبت کا اثر یہ ہوا کہ سارا وقت (فجر سے عشاء تک) درس دینے میں گذرتا اور طلبہ کا بہت رجوع ہوا۔

اس زمانہ میں مولانا نے لوگوں سے نذر لینا چھوڑ دیا۔ اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ نذر کیوں نہیں لیتے۔ عرض کیا دل قبول نہیں کرتا۔ فرمایا کہ ایسا کرنا شہرت کا موجب ہے۔ ایسا نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ "لاردولاکد" پر عمل کرنا بہتر ہے کہ کسی کی دی ہوئی شے کو رد نہ کرے لیکن دل میں طمع نہ ہو۔ درس کی شہرت ہوئی تو "مدرسہ فیض عام" کے مہتمم صاحب نے اصرار کیا کہ ہمارے مدرسہ میں آؤ، انکار واصرار کے بعد شیخ سے رجوع ہوا، تو انہوں نے فرمایا کہ!

"در امور شما اختیار شما است صلاح ماہمہ آنست کہ کآں صلاح شما است"

اس کے بعد مولانا نے مدرسہ کو ترجیح دی لیکن چند ماہ کے بعد بیمار ہوگئے۔ سوءِ تنفس کی شکایت ہوگئی اور یہ اتنی بڑھی کہ بات کرنا بھی مشکل ہوگیا۔ لہٰذا!........ ترک کردیا۔ اسی مدرسہ میں سہارنپور جانے سے قبل ڈھائی تین سال پڑھا چکے تھے۔

انجمن تہذیب کا قیام

انہی دنوں مولانا نے ایک تہذیبی ثقافتی انجمن "انجمن تہذیب" کے نام سے قائم کی جبکہ علماء تو کیا، جدید تعلیم یافتہ حضرات میں بھی ایسی انجمنوں کے قیام کا زیادہ رواج نہ تھا۔ مولانا کا مقصد علماء اور جدید تعلیم یافتہ حضرات میں باہمی ربطہ پیدا کرنا اور اسلامی افکار کی اشاعت و ترجمانی اور لوگوں کے درمیان اتحاد اور اخوت پیدا کرنا تھا۔ لوگوں نے روکا کہ کانپور میں ایسی انجمن نہیں چل سکتی مگر آپ نے انجمن قائم کر کے عوام، علماء، رؤساء اور وکلاء میں کام کیا، اور مولانا کی مساعی سے یہ کام بارآور ہوا اور ہر قسم کے لوگ اس میں شریک ہوئے۔ خود اس کا کوئی عہدہ نہیں لیا بلکہ دوسرے حضرات کو اس میں عہدیدار بناتے رہے۔ ذکر و شغل اور تصوف کے اہتمام کے ساتھ ساتھ تعمیر سیرت اور اصلاح معاشرہ کیلئے انجمن کے قیام سے مولانا ژرف نگاہی، زمانہ کی نبض شناسی اور وقت شناسی کی دلیل ہے۔ جس کا مکمل مظاہرہ ندوۃ العلماء کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوا اور مولانا کے قلب و نظر کی جامعیت کھل کر سامنے آگئی۔

علمی ذوق اور جذبۂ تحقیق

مولانا کے علمی ذوق اور جذبۂ تحقیق کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ تعلیم میں بعض دفعہ اپنے استاد سید حسین شاہ سے بعض موضوعات پر تین تین دن تک علمی بحثیں چلتی تھیں، اور جو کتب کانپور میں موجود نہ تھیں۔ لکھنؤ مولانا عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانہ میں جاکر دیکھتے اور یہی شوق آپ کو بعض کتب کو دیکھنے کیلئے پٹنہ لے جاتا تھا، جہاں کی مشہور عالم لائبریری "خدا بخش اورینٹل لائبریری" میں کئی دفعہ جاکر کتب کا مطالعہ کیا۔

فقہ پر گہری نظر

مولانا کی فقہ پر بہت گہری نظر تھی۔ اس کیلئے آپ کے اسفار لکھنؤ اور پٹنہ کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس دلچسپی کی وجہ سے ان کی نظر بہت گہری ہوگئی۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے خط و کتابت کیا کرتے۔ ایک خط میں حاجی صاحب لکھتے ہیں۔

مکرر یہ کہ مولوی رشید احمد محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو آپ سے رنج ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ اختلاف بعض مسائل کی وجہ سے آپس میں حجاب ہو گیا ہے۔ حسب سابق

خط وکتابت اور آمد و شد جاری ہو جائے گی تو بالکل صفائی ہو جائے گی۔ مسائل میں صحابہ کرامؓ اور مجتہدین و علماء محققین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اختلاف تھا۔ لیکن اس کی وجہ سے کسی کو ذرہ برابر بھی کدورت نہ ہوئی۔(۱)

مولانا کی فقہی آراء کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ تیار ہوگیا جو ''کتاب المسئلہ'' کے نام سے ''خانقاہ رحمانی'' میں مشہور ہے۔

مولانا کا کتب خانہ

تعلیم کے دوران اور بعد آپ نے کتب کا بہت اچھا ذخیرہ جمع کر لیا جن باکمال علماء نے اس کتب خانہ کو دیکھا ہے ان کا خیال ہے کہ اتنا بڑا ذخیرۂ کتب موجود ہے کہ شاید اتنا بڑا ذخیرہ خدابخش لائبریری پٹنہ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے علاوہ مشرقی ہندوستان میں اور کہیں کم ہی ہو۔ آخری عمر میں خصوصاً اس کا بہت اہتمام ہوگیا تھا۔ مولانا محمد ادریس نگرامی نے مولانا ہی کے ایماء سے ''تذکرہ علمائے حال'' مرتب کیا تھا۔ مولانا محمد علی ان کو برابر مشورے دیتے رہے کہ فلاں فلاں علماء کا حال اور فلاح جگہ کے علماء کے تراجم (حالات) جمع کرتے رہو۔

ردِ عیسائیت

عیسائی پادریوں نے پرتگالی، فرانسیسی اور برطانوی تجار کیسا تھ ہی ہندوستان پر یلغار کر دی تھی جس کا حال قارئین تفصیلی طور پر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمہ اللہ کے حالات میں پڑھ آئے ہیں۔ یہاں تکرار اور اعادہ کی ضرورت نہیں البتہ بعض ضروری کوائف مولانا کے سوانح سے درج کی جاتی ہیں۔

(ارشد)

ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کا آغاز

ہندوستان میں پادری اور عیسائی مغل بادشاہ اکبر کے زمانے سے آنا شروع ہو گئے تھے۔ لیکن عیسائیت کی تبلیغ کا منظم انداز میں کام کا آغاز ۱۳۲۷ر ۱۸۱۳ میں شروع ہوا جب کہ دلبر فورس ممبر پارلیمنٹ کی کوشش سے ہاؤس آف کامنس میں اس مضمون کا ایک بل پاس ہوا کہ

(۱) مقالہ متعلقہ سوانح محمد الیاس ص ۲۳

ہندوستان کو عیسائی بنانے کے لئے اگر پادری جانا چاہیں تو انہیں اجازت ہے۔ گویا اب انہیں سرکاری طور پر اجازت مل گئی.......... اس بل کا پاس ہونا تھا کہ یورپ و امریکہ سے عیسائی انجمنوں اور اداروں کی طرف سے خاصی تعداد میں پادری اور تبلیغی وفود ہندوستان روانہ ہونا شروع ہوئے اور اس میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ ان اداروں کے بدلہ مشن (جن میں ہر مشن ایک وسیع ادارہ تھا) ہندوستان میں قائم ہو گئے۔ اگر چہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی ؒ، ڈاکٹر وزیرخان، مولانا آل حسن اور مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہم اللہ نے ان سے مناظرے، مباحثے کر کے ان کو چت کر دیا اور کچھ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی سے ان کی کوششیں کم ہو گئیں، لیکن پادریوں کی باہمی مسابقت اور مختلف یورپی ملکوں کی مشنریوں کی آمد سے ان کی تعداد بڑھ گئی لیکن انہوں نے تقسیم کار کر لیا۔ تا کہ اختلاف اور تصادم نہ ہو۔

ندوۃ العلماء کے اجلاس بریلی منعقدہ شوال ۱۳۱۳ھ میں ایک تجزیہ پیش کیا گیا۔ سوانح سیرت محمد علی ؒ میں اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

> "ان سب فرقوں نے آپس کی رضامندی سے اپنے اپنے مقدور و استطاعت کے موافق کل ہندوستان اور برما کو اپنے دین کی اشاعت کے لئے تقسیم کر لیا ہے، اور اپنے اپنے گروہ کے حدود اور وسعت کارروائی پہلے سے تجویز کر لی ہے۔ مثلاً پنجاب میں اسکاٹ لینڈ کا بریزی ٹرین چرچ اور راجپوتانہ اور ہندو ریاستوں میں آئرلینڈ کا رومن کیتھولک، اور ممالک مغربی و شمالی میں زیادہ تر امریکہ کا میتھوڈیسٹ چرچ وغیرہ" (۱)

انہوں نے صرف مذکورہ بالا شاخ کے اعداد و شمار فراہم کر کے بتایا ہے کہ اس کے ۲۵۰ مشن ہندوستان کے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں اور پھر ان شہروں کی تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ کس شہر میں کتنے مشن سرگرم عمل ہیں۔ غریبوں اور یتیموں کی امداد کر کے ان کو رغبت دی جاتی تھی۔ سرسید احمد خاں نے رسالہ "بغاوت ہند" میں ۱۸۳۷ء کے قحط کا ذکر کرتے ہوئے اس پر روشنی ڈالی ہے۔

> "۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کئے گئے وہ تمام اضلاع مغربی و شمالی میں ارادہ گورنمنٹ کے ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان

---

(۱) اجلاس بریلی مقالہ مولانا شفقت علی بدایونی ص ۹۳

کو بھی اس طرح پر مفلس اور محتاج کر کر کے اپنے مذہب میں لے آئیں گے "

حکومت کی پشت پناہی اور حوصلہ افزائی کی نوعیت یہ تھی کہ بعض قوانین ایسے بنائے گئے، جن سے عیسائیت کی تبلیغ میں مدد ملے، مثلاً ۱۸۵۸ء کے ACT XXI کے مطابق مذہب تبدیل کر دینے کے بعد بھی ایک شخص موروثی جائیداد میں حقدار رہتا تھا۔ ان حالات میں جب پادری ای اینڈ منڈ نے وہ خط جاری کیا، جس میں لکھا گیا تھا کہ !اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی، تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی، ریلوے سڑک سے سب کی جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی، مذہب بھی ایک چاہئے۔ اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔ غرضیکہ لڑکیوں کیلئے مدارس، بچوں کیلئے تعلیم و تربیت گاہیں، مالی اعانت، اخبارات و رسائل، تبلیغی وفود ہر طرح سے اس بات کی کوشش تھی کہ پورا ملک عیسائی ہو جائے۔ سر چارلس ٹریویلین آئی، ایس نے جو کونسل کے ممبر تھے، اور بعد میں گورنر بھی ہو گئے تھے، ایک موقع پر ان خیالات کا اظہار کیا:۔

"میرا یقین ہے کہ جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے، یہ بھی اسی طرح عیسائی ہو جائیں گے، ملک میں مذہب عیسوی کی تعلیم بلاواسطہ پادریوں کے ذریعہ سے اور بالواسطہ کتابوں، اخباروں اور یورپیوں سے بات چیت وغیرہ کے ذریعہ سے نفوذ کرے گی حتی کہ عیسوی علوم تمام سوسائٹی میں اثر کر جائیں گے، تب ہزاروں کی تعداد میں عیسائی ہوا کریں گے"۔

پیغام محمدی میں اخبار نور الانوار مطبوعہ ۲۳، اگست ۱۸۹۰ء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:۔

"دیسی پادریوں کے علاوہ جن کا کوئی شمار ہی نہیں، صرف نو سو لائق پادری تھے جو بہت تندہی کے ساتھ تبلیغ میں مصروف تھے، اس کے علاوہ ایک ملتی فوج تھی جس کے ۸۰ دستے ان کی پشت پناہی اور امداد کرتے تھے اور ان کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے"۔

اس زمانہ میں عیسائیوں نے جو طریقہ کار اختیار کیا تھا اور جتنی ہوشمندی اور باخبری کا ثبوت دیا تھا اور اس کے مقابلہ میں مسلمان علماء نے باستثناء چند (۱) کے جس غفلت اور بے تعلقی کا

(۱) جن میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مظاہرہ کیا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر کوئی موثر شخصیت سامنے نہ آئی اور مشنریوں کی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں تو نئی نسل کے دین و ایمان کو زیادہ عرصہ تک محفوظ رکھنا ناممکن ہو گا۔ مشنری سوسائٹیوں نے جو ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھیں اس بات کا عہد کیا تھا کہ ان کو تمام مسلمانوں اور ہندوؤں کو عیسائی بنا کر دم لینا ہے۔ انہوں نے ہندوؤں کے لئے الگ پادری مقرر کئے تھے اور مسلمانوں کے لئے علیحدہ۔ ان پادریوں کے اسٹاف میں مقامی عیسائی بھی ضرور شامل کئے جاتے تھے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ جس حلقہ اور جس فرقہ میں وہ کام کریں اس کے سب کمزور پہلو ان کی نظر میں ہوں، اور اس کے مسائل اور ذہنی ساخت سے بھی وہ اچھی طرح واقف ہوں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس طرز پر تاریخیں مرتب کروائیں کہ ہندوؤں کے دلوں پر مسلم بادشاہوں کے تعصب اور ظلم و سفاکی کا ایسا نقش قائم ہو کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ان سے بددل اور بدظن ہو جائیں۔ خود مسلمانوں کو اپنے آباء و اجداد کے اس مذہبی تعصب و نفرت کے مقابلہ میں انگریزوں کی نام نہاد جمہوریت زیادہ پرکشش اور دلآویز معلوم ہو اور ان کو اپنی تاریخ کے مطالعہ اور اپنی زندگی کی آزادانہ تشکیل سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہ جائے (۱)

اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ! ہنری ایلیٹ نے جس کی تاریخ ہند کی آٹھ جلدیں گذشتہ ۷۵ سال سے ہماری ساری چھوٹی بڑی تاریخوں کا ماخذ رہی ہیں، حکومت کو لکھا کہ اگر اس کی مرتب کی ہوئی تاریخ ہند شائع کر دی گئی تو ہندوستان میں ساری قومی تحریکیں خود بخود سرد پڑ جائیں گی۔ (۲)

اپنے اشاعتی پروگرام میں انہوں نے دو چیزوں کی طرف خصوصی توجہ دی، ایک یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نوجوانوں کے دلوں میں مختلف شبہات پیدا کئے جائیں اور آپ کی نبوت کو (نعوذ باللہ) مشکوک اور باطل ثابت کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ سلاطین اسلام پر ظلم و سفاکی، تنگ نظری، تعصب اور نفس پرستی اور عیاشی کے الزامات لگا کر اسلامی تاریخ کو جہاں تک ممکن ہو داغدار بنایا جائے، اورنگ زیب اور دوسرے مسلمان بادشاہوں کے خلاف جو مہم چلائی گئی اور تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا یہ دراصل اس سوچی سمجھی اسکیم کا ایک جزو تھی جو اس زمانہ

---

(۱) مولانا شفقت اللہ بدایونی نے ۱۹۰۱ء میں مولانا سید عبدالحئی کو ایک خط لکھا تھا، اس خط سے عیسائیت کی تبلیغ اور طریقہ کار پر روشنی پڑتی ہے یہ خط مجموعہ خطوط قلمی میں محفوظ ہے، یہ معلومات اسی سے حاصل ہوئیں۔ ۱۲

(۲) پروفیسر خلیق احمد نظامی، رسالہ "العلم" کراچی (جلد ؟۔ شمارہ ۳)

ہیں پوری قوت سے چلائی جارہی تھی۔ ان خیالات کی اشاعت اتنے زور وشور سے ہوئی تھی کہ مسلمانوں کا ذہین طبقہ بھی جو کالجوں اور اسکولوں میں پڑھتا تھا، سخت ذہنی انتشار اور شکست خوردگی سے دوچار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "اورنگ زیب" شائع ہوئی تو مسلمانوں کے چہرے فرطِ مسرت سے کھل اٹھے اور ایسا معلوم ہوا کہ ان کو مدافعت کے لئے ایک کارگر ہتھیار مل گیا ہے۔

کتب خانہ اسکندریہ کے متعلق مستشرقین اور پادریوں کا اعتراض تھا کہ مسلمانوں نے اپنی علم دشمنی اور مذہبی جنون کی وجہ سے اتنے بڑے علمی ذخیرہ کو تباہ کردیا۔ جب مولانا شبلیؒ نے "کتب خانہ اسکندریہ" لکھی اور اس دعوے کی مدلل طور پر تردید کی، تو مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں، اور ان کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ان کے چہرے کا ایک بدنما داغ دھل گیا ہے۔ جزیہ کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ یہ ایک ظالمانہ ٹیکس ہے جو اقلیت کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لگایا جاتا ہے۔ مولانا شبلیؒ نے "الجزیۃ فی الاسلام" لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ یہ ٹیکس دراصل معاوضہ ہے ان حقوق کا جو اسلامی حکومت ان غیر مسلموں کو عطا کرتی ہے .... مشن کی کامیابی اور پروپیگنڈے کی یہ صرف ایک مثال ہے اور صرف ایک شعبہ سے متعلق ہے۔

منشی صفدر علی اور عماد الدین

اس زمانہ میں منشی صفدر علی اور پادری عماد الدین (۱) کی کتابیں اور رسائل خاص طور سے بڑے مقبول ہورہے تھے، اخبارات میں بھی ان کے مضامین کی اشاعت خوب ہورہی تھی۔ کلیسا کا یہ قدیم نعرہ تھا کہ جب تک قرآن مجید موجود ہے مسلمانوں پر فتح یاب ہونا مشکل ہے۔ چنانچہ ان دونوں نے نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کو خاص طور پر اپنا ہدف بنایا۔ ۱۲۸۹ھ اور اسکے بعد کے سالوں میں ان دونوں پادریوں کو بہت کامیابی حاصل ہوئی اور بکثرت مسلمان اس کا شکار ہونے لگے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۰۹ھ) کے بعد ایسا کوئی شخص نظر نہ آتا تھا جو اس فتنہ کو ختم کرنے کیلئے میدان میں آئے، اور اپنی قوت ایمانی، وسعت علم، اور زور

---

(۱) صفدر علی کا زمانۂ ارتداد ۱۸۶۵ء ہے (مقام جبل پور) اور عماد الدین کا ۱۸۶۶ء ہے (مقام امرتسر) صفدر علی نے "نیاز نامہ" لکھ کر مسلمانوں میں تبلیغ مسیحیت کی، اور عماد الدین نے کتابوں پر کتابیں (اور وہ بھی بدزبانی کے ساتھ) اسلام کے خلاف لکھ کر مسیحیوں میں خوب نام پیدا کیا۔ کلکتہ اور لاہور میں پادری کے عہدہ پر فائز رہے۔ کنٹربری کے لاٹ پادری نے ڈاکٹر آف ڈیوی نٹی (علامۂ الٰہیات) کی ڈگری دے کر ان کا اعزاز بڑھایا۔ ۱۹۰۰ء تک زندہ رہے۔

استدلال کے ذریعہ ان مشنریوں کی علمی بے وقعتی اور بے بضاعتی ثابت کرے، اور ان کی غلط بیانیوں اور افترا پردازیوں کا پردہ چاک کرے، یہ سعادت بھی مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے حصے میں آئی، اور حق یہ ہے کہ مولانا نے بہت کامیابی اور خوبی کے ساتھ ان پادریوں کے اعتراضات کے جواب دیئے، اور ضعیف العقیدہ مسلمانوں کے شکوک و شبہات کو رفع کیا۔

ردِ عیسائیت کے سلسلے میں مولانا کی جد و جہد کا آغاز

اس خطرہ کی طرف توجہ مولانا کو ایک خاص واقعہ سے ہوئی، جس وقت وہ علی گڑھ میں مولانا لطف اللہ صاحب سے تحصیل علم حدیث میں مشغول تھے، اور بعض طلبہ کو پڑھاتے بھی تھے۔ اس وقت انہوں نے ایک خواب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ! "جاؤ یہ وقت بیٹھنے کا نہیں، جہاد کرو"۔

"اس خواب کے بعد ہی یہ واقعہ پیش آیا کہ اسی مدرسہ علی گڑھ میں ایک طالب علم نے جو آپ سے مختصر المعانی وغیرہ پڑھتا تھا اس نے پادری عماد الدین اور کرسٹان کی کتابیں دیکھ لیں اور کچھ شبہات مقدس مذہب اسلام کی طرف سے اسکے قلب میں آگئے، اور وہ طلبہ سے کہنے لگا۔ یہاں تک اس سے لغزش ہوئی کہ ایک روز وہ جامع مسجد میں بیٹھ گیا اور طلبہ سے کہا کہ میرے سوالات کا تشفی بخش جواب دو۔ اس وقت دو طالب علم جو اس مدرسہ میں بہت ممتاز تھے اس سے گفتگو کرنے لگے۔ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت میں گفتگو تھی۔ عماد الدین نے جو شبہات کئے تھے وہی وہ کرتا تھا یعنی اس نے لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بڑے فصیح تھے، ان کا دیوان نعوذ باللہ قرآن کے مثل ہے۔ مقامات حریری کی عبارت (نعوذ باللہ) اس سے اچھی ہے۔ مسیلمہ نے بھی ایک کتاب قرآن شریف کے مقابل لکھی تھی، اسے لاکھوں اہل عرب نے مان لیا تھا۔ طلبہ بحث کر رہے تھے مگر کوئی شافی اور مسکت جواب نہیں دے رہے تھے، گفتگو ہو رہی تھی کہ ہمارے حضرت قبلہ تشریف لائے اور ان طلبہ سے فرمایا کہ ذرا آپ ٹھہر جائیں، مجھے کچھ کہنے دیں۔ وہ دونوں صاحب خاموش ہو گئے۔ آپ نے اس طالب علم سے فرمایا کہ! قرآن مجید عربی زبان میں ہے،

ہم اور تم اور نہ عماد الدین عربی کے ایسے ادیب ہیں ...... اس لئے اس پر ایسے شخص کی شہادت ہونا چاہئے جو عربی کا بڑا ادیب ہو اور جس کی فصاحت وبلاغت کو طرفین نے مان لیا ہو۔ اب قرآن مجید کا بے مثل ہونا اور مقامات حریری وغیرہ کا قرآن مجید کے مثل نہ ہونا تو ہم ایسے حضرات کی شہادت سے ثابت کرتے ہیں جن کا کامل ادیب ہونا تم اور عماد الدین مان چکے ہو، اور تم مسیلمہ کی کتاب کا بے مثل ہونا کسی ایسے ادیب کی شہادت سے پیش کرو۔ حضرت قبلہ نے فرمایا کہ عماد الدین حضرت علی رضی اللہ عنہ اور صاحب مقامات کو بہت بڑا فصیح و بلیغ کہتا ہے اور ان کے دیوان اور ان کی کتاب کو قرآن مجید سے زیادہ فصیح کہتا ہے، یہ سب فصحاء جن کی فصاحت تمہیں مسلم ہے قرآن مجید کے بے مثل ہونے پر ایمان لائے ہوئے ہیں اور اپنی کتابوں کو اس کے نزدیک ہیچ سمجھتے ہیں، پھر اب تمہیں ماننے میں کیا عذر ہے؟ وہ طالب علم خاموش ہو گیا۔ تھوڑے تامل کے بعد اس نے کہا کہ اب میرے شبہات کا جواب ہو گیا اب میری تسلی ہو گئی، اب اگر تثلیث کے بطلان پر کچھ عقلی دلائل قائم کر کے مجھے دکھا دیجئے تو میرا دل بالکل صاف ہو جائے گا؟ آپ نے فرمایا کہ استفسار (۱) دیکھو۔ اس نے کہا، میں نے دیکھی ہے اس سے تسلی نہیں ہوئی۔ حضرت قبلہ نے تعطیل کے روز بیٹھ کر ۹ یا ۱۰ دلیلیں لکھ کر اسے دیں وہ بہت خوش ہوا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی بدولت اس کے ایمان کو قائم کر دیا" (۲)۔

منشور محمدی

رد عیسائیت کا آغاز مولانا کی اس گفتگو سے ہوا، اور اسکے بعد پے در پے کامیابی نصیب ہوئی۔ ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۳ء میں انہوں نے اس مقصد کیلئے کانپور سے ایک اخبار "منشور محمدی" جاری کرایا، اور اس میں عیسائیت کی تردید اور ان کے عقائد کے ابطال میں مضامین شائع کرنا شروع کئے، لیکن پادریوں نے ان میں سے کسی ایک مضمون کا جواب دینے کی جرأت نہیں کی

---

(۱) یہ کتاب مولانا آل حسن صاحب نے میزان الحق اور تحقیق دین حق کے جواب میں لکھی ہے۔ عیسائیت کے رد میں جو بہترین کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں یہ بھی شامل ہے۔ ۱۲۔ (۲) کمالات محمدیہ ص ۱۳۳، ۱۳۵۔

.... مولانا اس اخبار کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ایک کتاب "آئینۂ اسلام" میں لکھتے ہیں:۔

"اخبار منشور محمدی میں اکثر مضامین چھپے ہیں جن کو مشتہر ہوئے نودس برس کا عرصہ ہوتا ہے، مگر آج تک نہ تو منشی صفدر علی صاحب نے ان کے جواب الجواب میں قلم اٹھایا، اور نہ کسی اور پادری نے"۔(۱)

یہ اخبار ۴، ۵ سال تک گرانقدر خدمات انجام دینے کے بعد بند ہوگیا، یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ، محدث زمانہ مولانا احمد علی سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تکمیل حدیث کے لئے گئے ہوئے تھے اور مناسب طریقہ پر اس کی نگرانی اور انتظام دشوار تھا۔ اس اخبار سے جہاں یہ فائدہ ہوا کہ مسلمان، مشنریوں کے دعوؤں کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوگئے وہاں ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء اور اہل دین میں اس خطرہ کا احساس پیدا ہوگیا، اور متعدد اصحاب علمی طور پر اس مہم میں شریک ہوگئے۔

اس اخبار کے ذریعہ ان دونوں (منشی صفدر علی و عماد الدین) کو مناظرہ کی بھی دعوت دی گئی لیکن ان کی طرف سے اس کے جواب میں خاموشی تھی، بار بار دعوت کے بعد بھی انہوں نے سامنے آنے کی جرأت نہ کی، اس کا اثر نفسیاتی طور پر مسلمانوں پر بہت اچھا پڑا، اور وہ مسلمان جو مذبذب ہوگئے تھے ان کے قدم پھر جم گئے۔ مولانا محمد علی نے اس اہم کام کیلئے اور بہت سے لوگوں کو تیار کیا اور ان کی رہنمائی کی، ان میں سے بعض حضرات نے اس سلسلہ میں امتیاز بھی حاصل کیا اور بہت کامیابی کے ساتھ عیسائیت کی تردید کا فرض انجام دیا۔

عجیب بات ہے کہ جس طرح مولانا رحمت اللہ کی تائید کیلئے اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر وزیر خاں کو پیدا کر دیا اور انہوں نے پادری فنڈر کو خود ان ہی کے بیانات اور تحریروں سے ملزم ثابت کیا، اسی طرح مولانا محمد علیؒ کیلئے اللہ تعالیٰ نے شیخ مولا بخش کو کھڑا کر دیا اور انہوں نے پادری آئزک فیلڈ بریو کا زبردست مقابلہ کیا۔ شیخ مولا بخش کے تبحر علمی اور وسعت معلومات کا اندازہ "مراسلات مذہبی" کی ان دو جلدوں سے ہوسکتا ہے جو پادری مذکور سے مناظرہ پر مشتمل ہیں۔(۲)

---

(۱) آئینۂ اسلام ص ا حاشیہ۔

(۱) اس کتاب میں انجیل کی تحریف پر ۱۶، ایسی دلیلیں دی گئی ہیں جن کا جواب عیسائی نہیں دے سکے، پھر قرآن مجید کی صحت، اثبات نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابطال تثلیث وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸۸، ایسی کتابوں کی فہرست بھی شامل ہے جو مختلف زبانوں میں لکھی گئیں اور جن کا جواب عیسائیوں نے ابھی تک نہیں دیا، یہ کتاب سب سے پہلے ۱۳۰۵ھ میں شائع ہوئی۔ میرے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ ۱۳۴۱ھ کا چھپا ہوا ہے۔ ۱۲۔

"مراسلات مذہبی" میں شیخ مولا بخش نے اس بات کا صاف اعتراف کیا ہے کہ جو کچھ ہے سب مولانا کا فیض اور برکت ہے۔ اسکے آگے لکھتے ہیں کہ : مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے بعد علماء میں سے بجز مولانا ممدوح کے کسی کو کامل توجہ اس طرف نہیں ہوئی۔ مولانا ممدوح کی تحریر میں بڑی خوبی یہ ہے کہ جواب تحقیقی ایسی عمدگی اور مہذبانہ طور سے ہوتا ہے کہ ہر ایک صاحبِ حق کو اس سے کامل تسلی ہو جاتی ہے۔ اس پر آشوب زمانہ میں مولانا کی ذات بابرکات مغتنمات سے ہے(۱)

کانپور میں یتیم خانہ کا قیام

عیسائیوں کا دوسرا میدان، جہاں ان کو سو فیصد کامیابی کی امید تھی، وہ یتیم، لاوارث اور غریب بچے تھے، جنکے قیام و طعام اور تعلیم کا بندوبست کر کے بہت آسانی کیساتھ عیسائی بنایا جا سکتا تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ ایسے یتیم خانے اور مکاتب قائم کیے جائیں جہاں ان بچوں کو داخل کر کے ارتداد سے بچایا جا سکے۔ اس مقصد سے مولانا نے کانپور میں جہاں اس زمانہ میں متعدد عیسائی مشن کام کر رہے تھے(۲) یتیم خانہ اسلامیہ کی سنگ بنیاد رکھی، جس میں مسلمان بچوں کو تعلیم کیساتھ صنعت و حرفت سکھانے کا بھی انتظام تھا۔ مولانا کو اس کا جس قدر اہتمام تھا اسکا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو اس زمانہ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھے گئے۔

مولانا کی تصنیفات ردِ عیسائیت میں

عیسائیت کے رد میں غالباً مولانا کی سب سے پہلی تصنیف "مرآۃ الیقین" ہے۔ پادری عماد الدین نے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی کتاب "اعجاز عیسوی" کے رد میں "ہدایت المسلمین" لکھی، اور آدھی یا تہائی کتاب کے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی۔ "اعجاز عیسوی" جس وقت لکھی گئی اس وقت مشہور پادری فنڈر موجود تھے لیکن وہ اس کا جواب نہ دے سکے، اور اسکے بعد ۱۴ برس تک کسی پادری نے اس پر قلم اٹھانے کی ہمت نہیں کی۔ ۱۸۶۸ء میں عماد الدین نے اسکا جواب لکھا اور اسکے بعد مختلف لوگوں نے وقتاً فوقتاً اس کی تردید میں رسائل لکھے لیکن

(۱) مراسلات مذہبی۔ ص ۳۰۔

(۲) مولانا شفقت اللہ بدایونی نے اجلاس بریلی میں جو اعداد و شمار پیش کئے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عیسائیوں کے نو مختلف مشن کانپور میں کام کر رہے تھے۔ ۱۲

ابھی تک کسی نے اسکا مکمل جواب نہیں دیا تھا، بیشتر علماء کو اس خطرہ کا زیادہ احساس بھی نہ تھا، مولانا نے اپنی کتاب میں سنین طباعت اور صفحات کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ عیسائی علماء اناجیل کی تحریف کا خود اقرار کرتے ہیں، اور مولانا رحمت اللہ نے جو کچھ لکھا ہے سو فی صدی صحیح لکھا ہے۔

عیسائی تاریخ کا مطالعہ

مسیحیت پر مولانا کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور اس کے مخفی گوشے جو بعض اوقات پادریوں اور مورخین کی نظروں سے اوجھل رہ جاتے ہیں، ان کی نظر میں رہتے تھے۔ اکثر مواقع پر ان کا تاریخی مطالعہ اور مذہب مسیحی سے واقفیت پادریوں سے زیادہ نکلی۔ عماد الدین نے کتاب میں ایک جگہ یہ لکھا تھا کہ گروٹیس کوئی مشہور عالم نہیں ہے بلکہ کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کون تھا۔

مولانا اس کے جواب میں اور دلائل دینے کے بعد لکھتے ہیں کہ :۔

> "گروٹیس تو وہ شخص ہے جس کے حالات زندگی کئی مورخین نے قلم بند کئے ہیں...... سنئے چارلس ہول بیاگریفیکل ڈکشنری میں لکھتا ہے کہ گروٹیس کے حال میں گٹن برگ نے ۱۶۵۲ء میں ایک کتاب لکھی، اور برگنی نے ۱۷۵۴ء میں اس کے حال میں ایک کتاب لکھی اور چارلس ٹیلر نے ۱۸۲۶ء میں ایک کتاب لکھی، یہ شخص پیدا ہوا تھا، ۱۵۸۲ء میں اور مر گیا ۱۶۴۵ء میں۔ خیال کرنے کا مقام یہ ہے کہ گروٹیس کتنا مشہور و معتبر شخص ہے کہ متعدد لوگوں نے خاص اس کے حالات میں کتابیں لکھی ہیں، اب پادری صاحب کی جہالت کا ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ اتنے بڑے مشہور عالم سے مطلقاً آگاہ نہیں ہیں"(۱)۔

یہ ایک مثال ہے، مولانا کی ساری تصنیفات کا یہی حال ہے اور اس میں ہر جگہ یہ تحقیقی اور تاریخی رنگ نمایاں ہے۔

آئینۂ اسلام

مولانا کی دوسری تصنیف "آئینۂ اسلام" ہے۔ یہ کتاب مولانا نے حیدرآباد کے دوران قیام میں ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء میں تصنیف فرمائی اور اس میں منشی صفدر علی کی کتاب "نیاز نامہ" کا

---

(۱) مرآۃ الیقین [illegible]

جواب لکھا۔ منشی صفدر علی نے اور باتوں کے علاوہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ شریعت دو قسم کی ہے اخلاقی اور رسمی، اور اخلاقی شریعت رسمی شریعت سے افضل ہے، جو اعمال بذاتہ نیک یا بد ہیں وہ شریعت اخلاقی کہلاتے ہیں، اور جو اعمال بذاتہ نیک یا بد نہیں بلکہ حکم خداوندی نے ان کو نیک و بد اور حلال و حرام ٹھہرایا ہے وہ شریعت رسمی کے دائرہ میں آتے ہیں۔ پھر اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رسمی شریعت دی گئی تھی، اس لئے کہ اس وقت لوگ شریعت اخلاقی کے متحمل نہیں تھے، جب انسان اس درجہ کو پہنچ گئے اور اس کے اہل ہو گئے تو حضرت مسیح نے شریعت اخلاقی بیان فرمائی، اب کیا وجہ ہے کہ قرآن و حدیث پھر اسی رسمی شریعت کی دعوت دیتے ہیں جس کا زمانہ ختم ہو چکا۔ مولانا نے اس مفروضہ کی مدلل تردید کی ہے........ اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "یہ اعتراض چند امور پر مبنی ہے جب تک ان کا ثبوت نہ ہو اس اعتراض کو پیش کرنا محض نادانی ہے۔ پہلا امر یہ ہے کہ مسیح نے شریعت موسوی کو منسوخ کر دیا، ورنہ کیونکر ثابت ہو گا کہ جب شریعت اخلاقی کی حاجت نہ رہی آپ کے قول سے یا آپ کے کسی مقتدا کے کلام سے اگرچہ وہ حواری کیوں نہ ہو حکم شریعت منسوخ نہیں ہو سکتا۔ دوسرا امر یہ کہ جو شریعتِ اخلاقی حضرت مسیح کو عنایت ہوئی وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یا دیگر انبیاء کو نہیں ہوئی تھی ورنہ اس کے کیا معنی ہوں گے کہ اس وقت کے لوگ متحمل نہ تھے، اور مسیح نے شریعت اخلاقی بیان فرمائی، تیسرا امر یہ کہ شریعت اخلاقی قرآن و حدیث میں نہیں۔ چوتھے یہ ثابت کرنا چاہئے کہ ہزاروں برس تک تمام دنیا کے لوگ ناقابل رہے اور شریعت اخلاقی کے لائق نہ ہوئے اور یکبارگی مسیح کے وقت میں لوگ اس کے لائق ہو گئے" (۱)

مولانا کا طرز تصنیف

مولانا کی تصنیفات میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ عیسائیوں کے مآخذ اور ان کے مستند مورخین و مصنفین کے حوالہ سے ان کا رد کرتے ہیں، ان کا تاریخی مطالعہ اس موضوع پر بڑا

(۱) [illegible]

وسیع معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف انکی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ردعیسائیت ہی پر اکتفا نہ ہو بلکہ اسلام کو انکے سامنے دلنشین اور علمی طریقہ پر پیش کیا جائے اور مثبت پہلو بھی انکے سامنے اچھی طرح واضح ہو کر آجائے۔ قرآن و حدیث پر عیسائیوں کا ایک قدیم اعتراض یہ ہے کہ اسکی تعلیمات عیسائی مذہب سے ماخوذ ہیں، مولانا نے اس سلسلہ میں ایک عیسائی عالم مریدت کا نام پیش کیا اور کہا کہ وہ ۲۰ برس تک عیسائی مذہب کا زبردست مبلغ اور داعی رہا، اسکے بعد اس نے یہ مذہب چھوڑ دیا، اور ۱۸۶۴ء میں ایک کتاب لکھی جس میں اس نے بت پرستوں کی کتابوں سے مقابلہ کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انجیل کے احکام یہاں سے لئے گئے۔ یہ لکھنے کے بعد مولانا کہتے ہیں کہ اگر ملحدین کا نظریہ غلط ہے (اور یقیناً غلط ہے) تو رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ بات کیسے مانی جاسکتی ہے کہ انہوں نے توریت وانجیل سے استفادہ کیا ہے، اس لئے کہ حضور ﷺ امی تھے اور حضرت مسیح تعلیم یافتہ تھے، اور ان کتابوں کا مطالعہ کر سکتے تھے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسلام کی تشریح بھی ساتھ ساتھ کرتے جاتے ہیں ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اگر ذرا بھی مناسبت ہو اور موقع ہو تو اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور اسلامی نظام کی مصلحت اور افادیت واضح کی جائے۔ چنانچہ اس کتاب میں ایک موقع پر منشی صفدر علی کے اس اعتراض کی تردید کی ہے کہ شریعت مسیحی میں عبادت دعا کے مرادف تھی اور اسلام نے رسمی شکلوں کو اختیار کیا ہے، اس لئے مسیحی شریعت اخلاقی ہوئی اور اسلامی شریعت رسمی۔ اس بات کا جواب مولانا اوپر دے چکے ہیں، لیکن ان اعمال ظاہری اور افعال جسمانی کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا نے ان کی حقیقت اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے، ان کی حکمت و مصلحت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

> "اعمال ظاہری اور افعالِ جسمانی کی مشق سے روح پر بھی اثر ہوتا ہے اور جس طرح کا فعل ہاتھ، پیر، زبان سے انسان کرتا ہے اس طرح کی تاثیر بھی اس کے قلب میں پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کو تقسیم مال یا اور کوئی راحت رسانی کی خدمت سپرد کی جائے اور وہ بے روک ٹوک اپنی خدمت کو کثرت سے انجام دیتا رہے تو ضرور ہے کہ اس کے قلب میں فیاضی اور راحت رسانی کی صفت کچھ نہ کچھ پیدا ہو جائے گی اور اگر پہلے سے اس کے قلب میں یہ صفت ہوگی تو اس کی وجہ سے اس میں ترقی ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی

شخص کو کسی وجہ سے مارنے دھاڑنے یا ایذا رسانی کا اتفاق زائد ہوتا ہو تو اس کے قلب میں سختی ضرور آجائے گی"۔

اس کی تفصیل بیان کرنے کے بعد آگے لکھتے ہیں:

"غرض کہ کوئی شخص مشق ظاہری کے اثر سے انکار نہیں کرسکتا پھر کیا وجہ ہے کہ عبادت اور ریاضت جسمانی کو بیکار بتایا جاتا ہے، حالانکہ اس سے مقصود یہی ہے کہ اس کی وجہ سے روح میں اثر پیدا ہو، اور اگر روح میں بالکل غفلت ہے تو اس تحریک سے متنبہ ہو، اور اگر تنبہ ہے تو کمال پیدا کرے"۔

ترانۂ حجازی اور دفع التلبیسات

مولانا کی ایک اور کتاب جو عماد الدین کے جواب میں ہے "ترانۂ حجازی" ہے۔ یہ ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء میں شائع ہوئی۔ پادری عماد الدین اور مجتہد صاحب لکھنوی کے درمیان ۱۸۷۱ء میں ایک تحریری مناظرہ ہوا تھا، اس کو ایک عیسائی نے "نغمۂ طنبوری" کے نام سے شائع کیا تھا اور ساتھ ہی کچھ سوالات کا اضافہ بھی کردیا تھا۔ "ترانۂ حجازی" اس کتاب کے رد میں ہے۔

پیغامِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم

لیکن مولانا کی سب سے مشہور اور معرکتہ الآراء تصنیف جس کو مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی "اظہار الحق" یا "اعجاز عیسوی" سے تشبیہ دی جاسکتی ہے "پیغام محمدی صلی اللہ علیہ وسلم" ہے۔ یہ کتاب مولانا نے صفدر علی کے "نیاز نامہ" اور پادری ٹھاکر داس کی کتاب "عدم ضرورتِ قرآن" کے جواب میں لکھی ہے۔ ہندوستان کے عیسائیوں کو اول الذکر کتاب پر بہت ناز اور اعتماد تھا۔ متعدد علماء نے اس کا جواب دینے کا ارادہ کیا لیکن ان کا یہ ارادہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا۔ مسلمانوں میں اسکی وجہ سے یک گونہ انتشار پیدا ہو رہا تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ مسلمانوں نے باقاعدہ جاکر بعض علماء سے درخواست کی لیکن چونکہ اس خطرہ کا ان کو پورا احساس نہ تھا اسلئے آمادگی ظاہر کرنے کے باوجود وہ کوئی عملی قدم نہ اٹھا سکے۔

یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد ۳۲۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک مفصل مقدمہ ہے جس میں اجمالی طور پر سارے نیاز نامہ کا جواب موجود ہے اور کتاب کا

نچوڑ آگیا ہے۔

"پیغامِ محمدی ﷺ" کے ایک حصہ کا انگریزی ترجمہ بھی مولانا کے ایک متوسل کی کوشش سے شائع ہوا اور ہند و بیرونِ ہند کے مشنریوں کو بھیجا گیا۔ کتاب کا بنگلہ ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے اس کتاب کا اثر منشی صفدر علی اور دوسرے پادریوں پر ایسا پڑا کہ مناظرہ کے لئے تو کیا آمادہ ہوتے، مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے آنے سے بھی ڈرنے لگے۔

مذکورہ بالا کتابوں میں اکثر کتابیں بار بار طبع ہوئیں لیکن کسی ایک کتاب کا جواب کسی ایک پادری کی طرف سے نہیں دیا گیا، ان کتابوں کے اثر سے مشنریوں کے حوصلے بہت پست ہو گئے ان کی سرگرمیوں کی رفتار کمزور پڑ گئی، اور بعض بعض جگہ اس قسم کی کوششوں کا سلسلہ بالکل بند ہو گیا۔

تحریک ندوۃ العلماء اور اس کا پس منظر

مولانا کا عہد

مولانا محمد علی مونگیریؒ نے جس وقت ہوش سنبھالا وہ انیسویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ تھا، یہ وہ عہد ہے جس میں تازہ دم مغرب اور ضعیف و ناتوان مشرق کی باہمی کشمکش اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی، اس عقلی و فکری کشمکش کے نتیجہ میں قدرتی طور پر بہت سی شخصیتیں پیدا ہوئیں جو مسلمانوں کے مختلف مکاتبِ خیال کی نمائندہ تھیں، متعدد تعلیمی اور اصلاحی تحریکیں اٹھیں اور انہوں نے اپنے اپنے دائرہ میں اسلام اور مسلمانوں کی قابل قدر اور ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔

قدیم عربی مدارس

مولانا مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے عہد پر نظر ڈالئے تو ایک طرف قدیم عربی مدارس اپنی تمام خصوصیات اور امتیازات کے ساتھ نظر آئیں گے، کتاب و سنت پر استقامت اور اسلاف کے طریقۂ فکر اور طریقۂ تعلیم پر اصرار ان کا شعار تھا، اور نو وارد مغربی تہذیب اور ہندوستانی سماج کے تصادم سے پیدا ہونے والے نئے مسائل اور سوالات کی طرف ان کی توجہ بہت کم تھی، ان کے ذمہ دار اور اربابِ حل وعقد (جن کا اخلاص شبہ سے بالاتر ہے) شاید یہ سوچتے تھے کہ آگے بڑھ کر دشمن پر حملہ کرنے کے بجائے قلعہ بند ہو کر اپنی حفاظت زیادہ مفید ہے اور صرف اسی طریقہ سے دین و ایمان کی حفاظت ممکن ہے۔

اس طرز فکر کا اظہار نصابِ تعلیم میں اس طرح ہوا کہ درس نظامی (جس کے قبل کے نصاب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہیں، حالانکہ اس عہد میں بہت کم تغیرات ہوئے تھے) بغیر کسی بنیادی تغیر کے اپنی قدیم شکل پر برقرار رکھا گیا اور اس عہد انقلاب میں جو غالباً جدید تاریخ انسانی کا سب سے زیادہ تیز رفتار اور تغیر پذیر عہد ہے اس میں سب سے کم تغیر قبول کیا گیا۔ اس زمانہ میں (قیام ندوۃ العلماء کے وقت) جو نصابِ تعلیم بعض قدیم مرکزی مدارس میں رائج تھا اس پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ طلبہ کے قیمتی اوقات کا کتنا بڑا حصہ معقولات پر بلا ضرورت صرف ہو رہا تھا۔ دینیات اور ''علم نافع'' کی طرف توجہ کتنی کم تھی۔ مثلاً شرح ملا جامی جو ۴۰۰ صفحے کی کتاب ہے آٹھ مہینے میں ختم کرائی جاتی تھی، مختصر المعانی ۴۳۰ صفحے کی کتاب ہے اور اس کی مدت سات ماہ تھی، لیکن صحیح البخاری کیلئے جو ۱۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے پونے سات مہینہ کی مدت رکھی گئی۔ (۱)

مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند کیلئے جو نصابِ تعلیم تجویز کیا تھا اس میں میبذی کے سوا فلسفہ کی کتابیں خارج کر دی گئی تھیں، مدت تعلیم بھی ۶ سال رکھی گئی تھی۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی فلسفہ و منطق اور فلاسفۂ یونان کے علوم کے مخالف تھے، اور اس کو قلب کی ظلمت کا باعث سمجھتے تھے۔ خود مولانا محمد علی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> ''ان کو (مولانا احمد حسن کانپوری رحمۃ اللہ علیہ) مشغولی اور توغل معقولات کی طرف بہت ہے، مناسب یہ تھا کہ الٰہیات کو معقولات پر غالب رکھتے، معقولات کی شاخ فلسفہ و نیچریت ہے، جس طرح کہ علوم دین کی مزاولت سے انبیاء و اولیاء کے قلوب کے انوار و برکات جو اس میں ہیں قلب پر اثر کرتے ہیں۔ اسی طرح جو علوم کہ بے دینوں کے ہیں، ان کی ظلمت و تشویش ان میں ہے وہ مزاولت سے قلب میں سرایت کرتی ہے''۔ (۲)

اسی طرح مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی رائے یہ تھی کہ ان کتابوں کا پڑھانا دین اور وقت دونوں کا ضیاع ہے۔ ایک خط میں اپنی اس رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''فلسفہ محض بے کار امر ہے، اس سے کوئی نفع معتد بہ حاصل نہیں سوائے اس کے کہ دو چار سال ضائع ہوں اور آدمی خر دماغ، غبی دینیات سے ہو جائے،

---

(۱) روئداد ندوۃ العلماء سال اول (حصہ اول)۔ (۲) کمالات محمدیہ ص ۳۴، و ص ۳۵۔

فہم کج اور کور فہم شرعیات سے ہو جائے اور کلماتِ کفریہ زبان سے نکال کر ظلماتِ فلاسفہ میں قلب کو کدورت ہو جائے اور کوئی فائدہ نہیں"۔(۱)

لیکن ہندوستان کی عام تدریسی فضا کے اثر، نیز دارالعلوم کے دوسرے اساتذہ کی خواہش اور دباؤ سے مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد تدریجی طور پر فلسفہ و منطق کی ساری کتابیں داخل کر لی گئیں، اور اس کے ساتھ مدت تعلیم میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ خود مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فلسفہ کے بالکلیہ مخالف نہیں تھے، اور جیسا کہ ان کے بعض جملوں سے معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں دین پر بقاو استقامت کیلئے معقول کو ضروری سمجھتے تھے (دیکھئے سوانح قاسمی، ص ۱۹۸و۱۹۹) البتہ اس فن کے اس قدر غلبہ اور بالادستی کو وہ بھی پسند نہ کرتے تھے۔ جتنی بالادستی اس کو مدارس عربیہ کے نظام درس بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ درسِ نظامی پر حاصل تھی۔

مولانا کی رائے اور مسلک کی تو بڑی حد تک توجیہ اور تاویل بھی کی جا سکتی ہے اس لئے کہ بدلتی ہوئی دنیا کے مسائل اس وقت اتنی وضاحت کے ساتھ اور کھل کر ان کے سامنے نہیں آسکے تھے جتنی وضاحت، سرعت اور جارحیت کے ساتھ وہ اس کے بعد سامنے آئے ہیں، اور اسلام کی صلاحیت و برتری کے لئے چیلنج بن گئے ہیں۔

لیکن ان سب باتوں کے ساتھ اس حقیقت سے کوئی ہوشمند اور منصف انسان انکار نہیں کر سکتا کہ دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے اور اس کو بدعت، تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے، اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام اور بقاو استحکام میں بیش قیمت مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقائد، دینی علوم، اہل دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلا شبہ ان کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے۔

سرسید کا مکتب فکر

دوسری طرف سرسید اور ان کے مکتب خیال کے حامی تھے۔ سرسید کیا چاہتے تھے؟ اس کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ اپنے عقیدہ کو عزیز رکھو، لیکن مغربی تہذیب کے رنگ میں پوری طرح رنگ جاؤ اور اس اقبال مند اور فاتح قوم کی ساری خصوصیات اور

---

(۱) سوانح قاسمی ص ۲۹۲۔ جلد دوم

صفات پیدا کرو خواہ اس کا تعلق معاشرت سے ہو یا سیاست سے، نظام تعلیم و تربیت سے ہو یا قومی کردار سے، انفرادی زندگی سے ہو یا مجلسی اور قومی زندگی سے، یعنی اس کا مطلب یہ تھا کہ عقیدہ تم حجاز سے لو اور عمل مغرب سے، ایمان کتاب الٰہی اور سنت نبوی ﷺ سے لو، اور طرز فکر اور نظام زندگی فلسفۂ یورپ سے، لیکن سرسید کو شاید اندازہ نہ تھا کہ اس پالیسی کے ساتھ عقیدہ بھی زیادہ عرصہ تک اپنی صحیح حالت پر قائم نہیں رہ سکتا، چنانچہ اس کا پہلا اثر خود ان کے افکار و خیالات پر پڑا، جس کا اندازہ ان کی تفسیر، رسالہ تہذیب الاخلاق کے پرچوں اور ان کی تفسیری و فقہی تاویلات سے بخوبی ہوتا ہے۔(۱)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ایک طرف قدیم مدارس کا نظریہ یہ تھا کہ قلعہ بند ہو کر اپنے کو نئے فتنوں اور نئے مسائل سے محفوظ کر لو، تو دوسری طرف سرسید کی رائے یہ تھی کہ تہذیب و تمدن، معاشرت و اخلاق اور خیالات و افکار میں مغرب کی تقلید کرو اور اس کے سانچہ میں اپنے کو ڈھال دو...... لیکن کیا ان دو راستوں کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں تھا؟

روحانی مراکز اور خانقاہیں

ان مکاتب خیال اور تعلیمی مراکز و تحریکات کے پہلو بہ پہلو ایک قوت اور بھی تھی جس کے اثر سے اسلامی ہند کا کوئی حصہ آزاد نہیں تھا، یہ روحانی خانقاہیں اور تصوف کے سلسلے تھے جن کے احسان کے بار گراں سے ملت اسلامیہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ یہ مراکز ایمان و یقین، اخلاقی و روحانی تربیت اور اصلاح باطن کا وہ سرچشمہ تھے جہاں سب اہل ایمان اور اہل طلب سیراب ہوتے اور اپنی روحانی تشنگی دور کرتے۔ جس شخص کو صحیح اسلامی صفات، ایمانی کیفیات، اور روحانی ترقیات کی فکر و جستجو ہوتی وہ ان مراکز میں آ کر اپنی متاع گم شدہ پاتا، زندگی کا مقصد سمجھتا، اور خدا کی معرفت و محبت کی لذت سے آشنا ہوتا۔

جو چند نام خاص طور پر اس سلسلہ میں لئے جا سکتے ہیں ان میں خواجہ محمد سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۸۴۱ء) مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۸۹۵ء) حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء) مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کے نام

---

(۱) مولانا حالی نے جو ان کے ازحد عقیدت مند اور مداح ہیں بہت صاف الفاظ میں سرسید کی اس بات پر نکتہ چینی کی ہے اور لکھا ہے کہ: بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیسے ان تاویلات باردہ پر اطمینان ہو گیا اور کیونکر ایسی فاش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئیں۔ (حیات شبلی ص ۱۵۲ حاشیہ)

سرفہرست ہیں۔ ان بزرگوں کے حلقے ہندوستان میں مضطرب اور تغیر پذیر ماحول میں رشد و ہدایت کے وہ جزیرے تھے جہاں آکر انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے دل کا مرہم اور قلب کا سکون پایا، دینی وروحانی تربیت اور ترقی سے بہرہ مند ہوئے، اور پھر یہ پیغام ودعوت لے کر مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ ان حضرات کے علاوہ اور مشائخ بھی تھے جن کی تربیت واصلاح سے ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا فیض یاب ہوئے، اور پھر خود دور دراز علاقوں کو سیراب کیا۔ اس ملک میں دینی فضا قائم رکھنے میں ان ہستیوں نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کے ذکر کے بغیر اسلامی ہند کی دینی، اجتماعی، اور علمی تاریخ نامکمل رہے گی۔ (۱)

اس جائزہ سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ان صدیوں میں کوئی ایسی بلند قامت شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو اپنے زمانہ کی سطح سے بلند اور مجتہدانہ فکر وبصیرت کی حامل ہو۔ خانوادہ ولی اللہی اس بات میں ایک روشن مثال ہے اور اس نے اسلام اور مسلمانوں کی جو عظیم خدمت انجام دی ہے اس سے کون ناواقف ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ ملا نظام الدین کے معاصر تھے اور حجاز سے واپسی پر انہوں نے نصابِ تعلیم میں کچھ اہم تبدیلیوں کا ارادہ کیا تھا، لیکن اس مسئلہ میں ان کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا سید عبدالحئیؒ لکھتے ہیں:۔

> "شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے طرز کا ایک جدید نصاب بنایا تھا مگر چونکہ اس زمانہ میں علم کا مرکز ثقل دہلی سے لکھنؤ کو منتقل ہو چکا تھا اور تمام درسگاہوں میں منطق وحکمت کی چاشنی سے لوگوں کے کام وزبان آشنا ہو رہے تھے، اس نصاب کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی، اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے نامور بیٹوں نے زمانہ کی روش سے مجبور ہو کر اس کو رواج دینے کی کوشش بھی نہیں کی" (۲)(۳)

ان سے پہلے شیخ محمد بن طاہر پٹنی رحمۃ اللہ علیہ (م ۹۸۶ھ / ۱۵۸۸ء) شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (م ۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۳ء) مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۵ء) جیسے حضرات زمانہ کی عام سطح سے بہت بلند اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان میں سے اگر صرف مجدد

---

(۱) ادھر پنجاب میں گولڑہ شرق پور، سیال اور علی پور وغیرہ خانقاہیں تھیں جو ان دنوں واقعی روحانی مرکز تھیں اور گنگوہ، تھانہ بھون اور گنج مراد آباد سے ان کے مراسم تھے۔ (ارشد) (۲) "الندوہ" نمبر ۱ جلد نمبر ۱۲۔

(۳) دیوبند، سہارنپور اور مراد آباد سے جو لوگ پیدا ہوئے ان کا اقرار تو مولانا سید عبدالحئیؒ کو بھی ہے۔ اصل مراکز علمی یہی تھے۔ ان مراکز سے فیض یافتہ حضرات کے لئے یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے۔ (ارشد)

صاحب ﷺ کے تجدیدی کارناموں اور مجتہدانہ فکر و نظر کو ظاہر کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کے لئے مستقل کتاب کی نہیں، پورے کتب خانہ کی ضرورت ہوگی۔

اسلامی کے اولین سرچشمہ سے زیادہ سے زیادہ قربت و اتصال، جہاد و اجتہاد کے احیاء، اور اسلامی نظام زندگی کے قیام و استحکام کے شعبہ میں سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء) اور مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء) نے اسلامی ہند کی تاریخ کے وقار کو بلند اور اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ لیکن ان خوشگوار اور عطر بیز وقفوں کے باوجود ہندوستان کے حلقۂ درس و تدریس کی عام فضا بے کیف اور پرسکون تھی اور اس میں کوئی تغیر و انقلاب اور کوئی خلش و اضطراب نظر نہ آتا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید سیاسی انقلابات اور سماجی تغیرات کی لہریں اس سے کترا کترا کر گزر رہی ہیں، وہ جدید سیاسی و اجتماعی افکار و نظریات جو مسلم معاشرہ کیلئے سخت ذہنی کشمکش اور اضطراب کا باعث تھے۔ "مدرسہ" پر بالکل اثرانداز نہ تھے، یا اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے خود کو محفوظ سمجھ لیا تھا۔

جو راز میکدہ میں ہے اک اک زبان پر
افسوس مدرسہ میں ہے بالکل نہاں ہنوز

فتنۂ تکفیر اور نزاع باہمی

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں وقت کے اہم ترین مسائل پر (جن کا تعلق براہ راست اسلام کے بقاء و احیاء اور مسلمانوں کے مستقبل سے تھا) غور کرنے کی فرصت باقی نہیں رہی، اس عہد میں جس قسم کی کتابیں شائع ہو رہی تھیں، اور ان میں جو ذہنیت اور منافرت کی روح کام کر رہی تھی، اس کا اندازہ ان کے ناموں ہی سے ہو جاتا ہے:۔

فیوس الکملة علیٰ رؤس الجهلة (۱)
مولانا حکیم الٰہی بخش صاحب (مطبوعہ) ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء
ظفر مبین علیٰ جمع الشیاطین

---

(۱) اس کتاب میں فرید کوٹ کے ایک افسوس ناک مناظرہ کا ذکر ہے جو احناف اور غیر مقلدین میں ہوا تھا، رفع یدین اور آمین بالجہر کا مسئلہ تھا۔ راجہ بکرم سنگھ والی فرید کوٹ کے یہاں محفل مناظرہ گرم ہوئی، اور خاصی رد و قدح اور سب و شتم کے بعد احناف کو فتح ہوئی۔ محضر پر علماء کے ساتھ راجہ صاحب اور ٹھاکروں نے بھی دستخط کیے۔ یہ واقعہ ۱۸۸۳ء میں پیش آیا۔ ۱۲

مولانا محمد علی بچھرانوی (مطبوعہ) ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۴ء

سوط الرحمٰن علیٰ حاسد النعمان

مولانا حکیم الٰہی بخش خان صاحب (مطبوعہ) ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء

سبحن السبوح عن عیب کذب مقبوح

مولانا احمد رضا خان بریلوی

یہ نام رسائل و مولفات کی اس طویل فہرست سے لئے گئے ہیں جو اس دور میں بڑی تعداد میں شائع ہوتی تھیں اور بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں۔ دوسرا بڑا محاذ جہاں یہ "سرد جنگ" جاری تھی۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی صاحب کا تھا ان کے ہاں بھی جو سب سے اہم مسائل در پیش تھے ان میں امکانِ کذب، یا مولود وغیرہ کے مسائل اولین اہمیت رکھتے تھے اور ان پر قلمی جنگ برابر جاری رہتی تھی۔

فوج داری اور مقدمہ بازیاں

ڈریپر نے اپنی کتاب "مذہب و سائنس" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ

"اسلام کی بڑھتی ہوئی فتوحات کو چارلس مارشل کی تلوار نے نہیں روکا، بلکہ ان کے باہمی اندرونی فساد سے یورپ کو ان کے ہاتھ سے نجات ملی۔"

اور حق یہ ہے کہ ملت اسلامی کی شیرازہ بندی کو منتشر کرنے، اس کی قوت کو کمزور کرنے، اور دشمن کو اندر گھسنے کا موقع جتنا ان داخلی اختلافات نے دیا ہے اتنا خارجی حملوں نے نہیں۔ مذہبی تفریق اور تعصب اس درجہ پہنچ گیا تھا کہ اس کی نظیر شاید ہندوستان کی تاریخ میں نہ اس سے پہلے صدیوں میں ملے گی اور نہ اس کے بعد کے زمانہ میں۔ مناظروں، تکفیر و تفسیق، دشنام طرازی و افترا پردازی سے آگے بڑھ کر بات مقدمہ بازی اور فوجداری تک جا پہنچی تھی، اور ایک دو نہیں خاصی تعداد میں ایسے مقدمے غیر مسلم حکام کے سامنے پیش ہونے لگے جن پر غیر مسلموں کو ہنسنے کا موقع ملتا تھا۔

مولانا کی شخصیت کے تین اہم عوامل

مولانا کی سیرت اور شخصیت کی تعمیر میں جو عوامل و اسباب (Factors) کارفرما تھے، ان میں

تین چیزیں بہت نمایاں ہیں جن سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ مولانا کی زندگی اور انکے دینی و علمی و اصلاحی کارناموں کے مطالعہ سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ درس نظامی اور نزاع باہمی کے اس ماحول میں جو ملک کے طول و عرض پر محیط تھا اور مجادلہ و مناظرہ کی اس فضا میں جس سے کم و بیش کوئی علمی و دینی طبقہ محفوظ نہ تھا، مولانا نے اپنے کو ان مسموم اثرات سے کس طرح محفوظ رکھا اور نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ ۱۳۱۰ھ ۱۸۹۳ء میں اس عہد آفریں تحریک "ندوۃ العلماء" کی بنیاد ڈالی، جو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پورے عالم اسلام میں ایک منفرد اور جرأت مندانہ تجربہ تھا، اور جسکی بنیاد ہی قدیم و جدید کی جامعیت اور رفعِ نزاعِ باہمی پر تھی۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جدید رجحانات اور جدید تقاضوں سے جو واقفیت مولانا کو حاصل تھی اور زمانہ کی تغیر پذیری اور انقلاب آفرینی کا جو احساس مولانا کے اندر موجود تھا وہ کس طرح پیدا ہوا، اور اس کے اسباب کیا تھے؟

تیسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ مولانا کو ارشاد و سلوک اور تزکیہ و تربیت کے شعبہ میں جو قبولِ عام اور رتبۂ بلند حاصل تھا اس کا یہ ذوق و رجحان کس طرح پروان چڑھا(۱) اور ان سب شعبوں میں یہ حسین و خوشگوار امتزاج کس طرح پیدا ہوا جس نے ان کو مسلمانِ ہند کے لئے عام طور پر اور ندوۃ العلماء کے فرزندوں اور خادموں کے لئے خاص طور پر ایک مثالی پیکر، ندوۃ العلماء کے تخیل کا زادہ عنوان، اور قابل تقلید مثال بنا دیا ہے۔

پہلا سبب

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس سلسلہ میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مولانا کے ذہن و نظر کی صفائی، سچائی اور سادگی اور جماعتی کشمکش سے ان کی علیحدگی میں ان کے خاندانی ماحول اور سوسائٹی کو بڑا دخل تھا۔ وہ خوش قسمتی سے کسی ایسے گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے جو اس "سرد جنگ" کا شکار ہو، ان کے آباء کرام، ان کے اساتذہ، ان کے ہم درس رفقاء بیشتر وہ لوگ تھے جن کو ان چیزوں میں غلو پسند نہ تھا، اور نہ وہ ان اختلافی مسائل سے کچھ زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔

ان کے بچپن کے ساتھی اور دوست مولوی امام علی ایک متقی اور صالح نوجوان تھے جن کو ان

---

(۱) راقم سطور کو اس میں کوئی اشکال نہیں ہے لیکن عام طور پر لوگوں کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے خاص طور پر وہ لوگ جو تصوف کو اسلام سے علیحدہ کوئی چیز سمجھتے ہیں۔ ۱۲

جھگڑوں سے کچھ سروکار نہ تھا، مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مولانا لطف اللہ علی گڑھی کو درس و تدریس زندگی کی شبانہ روز مشغولیت سے اس کی فرصت نہ تھی کہ وہ ان چیزوں میں وقت ضائع کریں۔ مولانا لطف اللہ صاحب اپنے مرتبۂ علمی، افادۂ عام، اور شہرت کے باوجود بہت متواضع اور کریم النفس انسان تھے، اور بہت معتدل جامع و صلح پسند طبیعت رکھتے تھے، انہوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی کی تکفیر نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ندوۃ العلماء کے قیام کے بعد وہ اس میں برابر شریک رہے اور اس کے متعدد سالانہ جلسوں کی صدارت کی۔ دوسری طرف ابتداء میں مولانا شاہ کرامت علی رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے بعد مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کی ارادت و بیعت نے ان کی توجہ ان مسائل کی طرف کم کردی۔

اس سوسائٹی اور ماحول کی وجہ سے وہ نہ صرف اس فضا کے مضر اثرات سے محفوظ رہ سکے، بلکہ باہر رہ کر انہوں نے اس کشمکش اور مسلم معاشرے پر اسکے غلط اثرات کا جائزہ لیا۔ اس ماحول نے انکو محفوظ تو ضرور کر دیا تھا لیکن محدود نہیں کیا تھا۔ دوسرے علماء سے ان کا رابطہ برابر قائم تھا، اسکا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف وہ جادۂ اعتدال پر مضبوطی سے قائم رہ سکے، دوسری طرف علماء کے ذہنی پس منظر اور انکے اختلافات کی حقیقت اچھی طرح ان پر ظاہر ہوگئی۔ حدیث و فقہ سے شغف آغاز عمر ہی سے تھا اور فلسفہ و منطق سے طبیعت بیزار اور متنفر تھی، اس لئے ان لاطائل مباحث پر انسانی ذہانت اور صلاحیت کا صرف بیجا ان کو کسی طرح درست نہ معلوم ہوا۔

اگر مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کسی ایسی جماعت سے تعلق رکھتے جو اس کشمکش کا شکار ہوتی، تو باوجود خواہش اور کوشش کے وہ اپنے دل و دماغ، افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کو اس کے اثر سے مطلقاً آزاد نہیں کر سکتے تھے، اس کا عکس پڑنا ان پر لازمی تھا، لیکن قدرت نے ان کے لئے جو سامان کیا تھا اس کی وجہ سے ان کو ان حالات کو سمجھنے، ان کا غیر جانبداری سے مطالعہ کرنے، ان پر سنجیدگی اور دلسوزی سے غور کرنے اور ان کا حل تلاش کرنے میں بڑمدد ملی، اور اس موقع سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔

دوسرا سبب

جہاں تک جدید تقاضوں اور جدید رجحانات سے مولانا کی واقفیت کا تعلق ہے اس میں بنیادی حصہ مولانا کے اس کارنامہ کا ہے جو انہوں نے عیسائیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو

روکنے میں انجام دیا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خان کے بعد اس فتنہ کے سدباب کے لئے جو شخصیت سب سے زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئی وہ مولانا ہی کی شخصیت تھی۔ انہوں نے اپنے قلم اور زبان سے عیسائی مشنریوں کا پوری طرح مقابلہ کیا، اور اس طرح قدرتی طور پر مشنریوں کا طریقۂ کار اور جدید ذرائع و وسائل کا استعمال، ان کی تکنیک عملی طور پر ان کے سامنے آئی اور انہوں نے دیکھا کہ یہ لوگ کن کن میدانوں میں کام کرتے ہیں، اور کیا کیا ذرائع و وسائل استعمال کرتے ہیں۔ کانپور میں یتیم خانہ کا قیام، جہاں یتیم ولاوارث بچے تعلیم حاصل کر سکیں اور عیسائیوں کے جال میں گرفتار نہ ہوں، اسی تجربہ اور مقابلہ کا نتیجہ تھا۔ حلقۂ درس سے نکل کر ان مشنریوں کا مقابلہ کرنے سے جدید طریقہ کار اور جدید ذہن و مزاج کی ایک نئی دنیا مولانا کے سامنے آئی۔ ان کو نئے نئے تجربات حاصل ہوئے، بدلتی ہوئی دنیا کے مسائل سے واقفیت پیدا ہوئی، جن کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا مشنریوں کا خاص حربہ تھا ان کا علم ہوا، اور ان کمزوریوں کو دور کرنے کی طرف توجہ ہوئی۔ مشنریوں کے باہمی اتفاق، نرم رویہ، جذبہ اتحاد اور دلآویز طرزِ عمل کا اندازہ ہوا، اس کے مقابلہ میں علماء کی علیحدگی پسندی، قدیم پرستی اور بے خبری ظاہر ہوئی، اور اس بات سے مولانا کو یہ اندازہ ہوا کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں ایک انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے اور جب تک یہ تبدیلی عمل میں نہیں آئے گی مدارس کی موجودہ فضا اور حالات کے رخ میں بھی کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

تیسرا سبب

تصوف و ارشاد اور سلوک و تربیت کے ساتھ اس ذوق و رجحان کی پرورش میں مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت و تربیت کا بڑا حصہ ہے، خوش قسمتی اور نعمتِ خداوندی تھی کہ مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کو شیخ بھی ایسا ملا جس کا دامن منطق و فلسفہ کی آلودگیوں سے بالکل پاک تھا اور جس کے ذہن کی وسعت اور قلب کی فراخی کا یہ عالم تھا کہ اس نے سر سید احمد خاں کیلئے بھی جو اس زمانہ میں علماء و مشائخ میں مطعون تھے تعریفی کلمات کہے، اور حاجی وارث علی صاحب دیوی (جو اپنے خاص احوال و کیفیات اور بعض غیر شرعی اشغال کی وجہ سے طبقۂ علماء میں مطعون تھے) کی مذمت بھی اپنی مجلس میں گوارا نہ کی۔ مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے اس ذہن و مزاج کا اندازہ ذیل کے ایک واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے جس میں انہوں نے اہل

تشیع کے ساتھ غیر معمولی برتاؤ اور حسن سلوک کا عجیب وغریب ثبوت دیا۔

مولانا شاہ تجمل حسین بہاری جو مولاناؒ کے خلیفہ ہیں، اپنی کتاب "کمالاتِ رحمانی" میں لکھتے ہیں

"اہل تشیع کے شہر پورنیہ کے رئیس حکیم صاحب مشہور تھے، حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تشریف لائے، وہاں کے بعض خوانین نے شور مچایا کہ ایک رافضی مسجد میں گھسا آتا ہے۔ حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کہا کہ تم ہمارے حجرہ میں ٹھہرو، اور فرمایا کہ یہ حضرت مرتضٰی علی رضی اللہ عنہ کے مہمان ہیں۔ بعد بہت گفتگو کے ان اہل تشیع صاحب نے فرمایا کہ آپ سے اعتقاد تو ہوا، مگر ہم مرید نہیں ہوں گے اور مذہب اپنا نہیں چھوڑیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ مذہب چھوڑنے کا کیا کام ہے، حضرت مرتضٰی علی رضی اللہ عنہ سے محبت رکھو اور بی بی فاطمہؓ اور امام حسین رضی اللہ عنہ سے محبت رکھو، مگر ایک شعر پر عمل رکھو، اور وہ شعر یہ ہے۔

نہ تھی عیب کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر

پڑی اپنی خطاؤں پر جب نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

جب وہ اپنے وطن گئے تو شب و روز چلتے پھرتے یہی شعر پڑھتے تھے، اور کوئی شغل دوسرا نہ تھا(۱)

غیر مقلدین کے ساتھ ان کا کیا رویہ تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو مؤلف موصوف نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے لکھتے ہیں:۔

"ایک غیر مقلد صاحب مولوی محمد ابراہیم آرہ کہ آخر میں انہوں نے تصوف کا رنگ پکڑا تھا مراد آباد کی مسجد میں آکر اکہری تکبیر کہی، لوگوں نے غل مچایا کہ ایک فتنہ باز غیر مقلد کدھر سے آگیا حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے سب کو روکا اور کہا کہ حدیث کیساتھ بے ادبی نہ کرو، ابوداؤد میں ایسی بھی ایک روایت آئی ہے" (۲)

یہی وجہ ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے تعلق سے ان کے اس ذہن و مزاج اور طرز فکر کو اور جلا ہوئی۔ اس صحبت نے ان کے حق میں دو آتشہ کا کام کیا، اور ان کو ان

---

(۱) آخر میں یہ صاحب باقاعدہ اہل سنت والجماعت میں داخل ہو گئے نقل از کمالات رحمانی ص ۲۶۔

(۲) کمالات رحمانی ص ۲۷۔

دونوں پہلوؤں کے جمع کرنے اور ان دونوں کے حدود سمجھنے میں بڑی مدد دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف انہوں نے ایک نئے نصابِ درس اور طریقۂ تعلیم کا مکمل خاکہ پیش کیا جو اس عہد کے لئے سب سے زیادہ موزوں اور ملت اسلامی کے نئے مسائل اور دشواریوں پر قابو پانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے، دوسری طرف وہ ایک مرشد روحانی اور مصلح و مربی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے جن کے ذریعہ ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا کی اصلاح ہوئی اور جن کے فیض و تاثیر سے انسانوں کی کثیر تعداد فیض یاب ہوئی، عقل اور قلب کا یہ متوازن اور صحت مند اجتماع، باطنی کیفیات و حالات اور فکر و نظر کی وسعت و بلندی کا یہ کامیاب نمونہ اس دور آخر کی ایک نادر مثال ہے، اور یہ مولانا محمد علی کا وہ امتیاز ہے جس نے ان کو ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں ایک منفرد جگہ عطا کی ہے اور ان کی شان کو دوبالا کر دیا ہے۔

ندوۃ العلماء کا قیام
اور
مولانا کا دور نظامت و ترقی

پہلا بنیادی جلسہ

علماء کی باہمی کشمکش، فقہی اختلافات کی شدت، حقیقی مسائل سے پہلوتہی، اور وقتی یا مصنوعی مسائل پر زور آزمائی، مناظروں کی گرم بازاری اور تکفیر کا رواج، نئے فتنوں کی طرف سے غفلت، اور غیر ضروری چیزوں پر اصرار، یہ وہ حوصلہ شکن حالات تھے جن میں مولانا محمد علیؒ نے ندوۃ العلماء کا تخیل اسلامی ہند کے سامنے پیش کیا۔

۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسہ دستار بندی کے موقع پر علماء کی ایک مجلس مشاورت نے اتفاق رائے سے یہ بات طے کی کہ علماء کی ایک مستقل انجمن قائم کی جائے اور آئندہ سال دستار بندی کے موقع پر اس کا پہلا عام جلسہ منعقد کیا جائے، اور ہندوستان کے تمام ممتاز علماء کو اس میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ اس مجلس میں شریک ہونے والے بعض ممتاز اور نامور علماء کے نام نامی حسب ذیل ہیں، ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی اس وقت کچھ زیادہ شہرت نہ تھی، لیکن بعد میں وہ اسلامی ہند کے مطلع پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور اس کی فضاؤں کو علم اور روحانیت سے معطر کر دیا۔

۱۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ (مدرس اول مدرسہ دار العلوم دیوبند)
۲۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (مدرس مدرسہ جامع العلوم کانپور)
۳۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ (مدرس دوم دار العلوم دیوبند)
۴۔ مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ
۵۔ مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ
۶۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی رحمۃ اللہ علیہ
۷۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ
۸۔ مولانا نور محمد پنجابی رحمۃ اللہ علیہ (صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ فتح پور)

۹۔ مولانا احمد حسن کانپوری رحمۃ اللہ علیہ

۱۰۔ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی رحمۃ اللہ علیہ

۱۱۔ مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوری رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۔ مولانا عبد الغنی خاں مرشد آبادی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۔ مولانا حکیم فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

۱۴۔ مولانا شاہ تجمل حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ

روئداد ندوۃ العلماء ۱۳۱۱ھ بابت سال اول حصہ اول میں مولانا محمد علی اس ابتدائی اور بنیادی جلسہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"۱۳۱۰ھ میں جب بہت سے نامور علماء مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی میں رونق افروز ہوئے، اس وقت بعض دور اندیش علماء نے تحریک کی کہ ایک انجمن علماء کی قائم کی جائے تاکہ جو خرابیاں مسلمانوں خصوصاً ان کی تعلیم میں واقع ہوگئی ہیں ان پر غور کرے اور علماء میں اتحاد پیدا ہو، اس تحریک کو تمام علماء موجودین نے پسند فرمایا اور اس وقت آئندہ کارروائی کرنے کی غرض سے عہدہ دار بھی منتخب ہوئے"۔ اس مجلس میں انجمن کا نام "ندوۃ العلماء" تجویز ہوا، اور مولانا سید محمد علی مونگیریؒ اس کے ناظم اول مقرر ہوئے، اور ان سب حضرات نے جو شریک جلسہ تھے اس اسکیم پر تائیدی دستخط کئے۔ ندوۃ العلماء کا تخیل سب سے پہلے کس کے ذہن میں آیا، اس کے متعلق سب سے مستند قول مولانا حبیب الرحمن شروانی کا ہے، وہ مولانا سید محمد علیؒ کے صاحبزادہ مولانا لطف اللہ مرحوم کو ایک خط میں صاف صاف لکھتے ہیں۔"

"...... ندوۃ العلماء کے قیام کا اولاً موصوف ہی کے دماغ میں خیال پیدا ہوا تھا، جس پر سارے ملک نے لبیک کہا، آج اس کے آثار ملک و ملت کے سامنے ہیں"۔

ندوۃ العلماء کے تعارف کے لئے پہلا وفد

مولانا سید محمد علی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ذمہ داری قبول کرنے کے بعد محسوس کیا کہ ان مقاصد کے

تعارف کیلئے بڑے پیمانے پر وسیع جدوجہد کی ضرورت ہے۔ انہوں نے خاص طور پر اخبارات سے فائدہ اٹھانا چاہا اور ان میں مضامین بھیجے، دوسری طرف جلسہ عام کیلئے زمین ہموار کرنے اور علماء سے رابطہ پیدا کرنے کی پوری کوشش کی۔ مولانا مشتاق علی صاحب (۱) کو (جو اس وقت مدرسہ اسلامیہ فیض آباد میں مدرس تھے اور بنیادی جلسہ میں بھی شریک تھے) اس پر مامور کیا گیا کہ وہ ندوہ کے تعارف کیلئے ہندوستان کے کچھ اہم علاقوں کا ایک دورہ کریں، ندوہ کا یہ گویا پہلا وفد تھا جس نے اس سلسلہ کا آغاز کیا۔ مولانا مشتاق علی صاحب نے بہت خوبی اور دلچسپی کے ساتھ یہ اہم کام انجام دیا۔ انہوں نے جن علاقوں کا دورہ کیا ان میں دیوبند، رام پور، پٹنہ، نگینہ، نجیب آباد، اٹاوہ، علی گڑھ، جھانسی، بھوپال، ملکہ پور، برار اور بمبئی شامل ہیں۔ بمبئی سے وہ کامران ہوتے ہوئے جدہ گئے، اور مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ ان کے ساتھ ارکان کی طرف سے مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی لکھی ہوئی ایک تحریر تھی، جس میں ندوۃ العلماء کے مقاصد کو دو حصوں میں بیان کیا گیا ہے۔ شاید یہ پہلا رسمی بیان تھا جو اس بنیادی جلسہ کے بعد عام اشاعت کیلئے دیا گیا، اس میں ندوۃ العلماء کے قیام کی دو غرضیں بتائی گئی ہیں، اور قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اس میں غیر معمولی طور پر صراحت سے کام لیا گیا ہے۔

غرضِ اوّل

چونکہ اس زمانہ میں دیکھا جاتا ہے کہ جو طلبہ علومِ عربیہ سے فارغ ہوتے ہیں وہ امور انتظامی دُنیا اور معیشت سے محض ناواقف رہتے ہیں اور بوجہ زیادہ عمر صرف ہو جانے کے کچھ اور کر بھی نہیں سکتے، اس لئے وہ بے موقع طور سے اہل دنیا کے محتاج ہوتے ہیں اور عوام کی نظروں میں بے وقعت اور بیکار ٹھہرتے ہیں، اور علومِ دینیہ سے بھی جیسی واقفیت ہونی چاہئے نہیں رکھتے، بلکہ جو علوم دینی اس وقت کے مناسب اور دین کے معین ہیں ان سے بھی وہ ناواقف رہتے ہیں۔ یہ انجمن ان سب باتوں پر غور کر کے اولاً سلسلہ تعلیم کو درست کرنے اور بالاتفاق تمام مدارس اسلامیہ میں جاری ہو جانے کی کوشش کرے، اور جو امور ان طلبہ کی تہذیب و اخلاق اور ترقیٔ علم میں مفید سمجھے حتی الوسع ان کے اجرا میں سعی کرے۔

(۱) مولانا مشتاق علی صاحب نگینہ (بجنور) کے رہنے والے تھے۔ مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ مولانا سید احمد مدرس دوم دارالعلوم دیوبند، اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے درسیات وحدیث کی تکمیل کی۔ اور مدرسہ اسلامیہ فیض آباد میں مدرس ہوئے۔ ندوہ کے ابتدائی دور میں ان کی قیمتی کوششوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ۱۲

غرض دوم

اس وقت ہمارے علماء کی باہمی نزاعیں سخت نقصان پہونچارہی ہیں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے امروں میں بڑا فساد برپا ہوتا ہے، جس سے علماء اسلام اور خود ہمارے پاک مذہب اسلام کی مخالفین کی نظروں میں اہانت ہوتی ہے، یہ انجمن کوشش کرے کہ یہ باہمی نزاع نہ ہونے پائے، اور جب کوئی اختلاف کسی گروہ میں واقع ہوا کرے تو وہ اس انجمن کے ذریعہ طے ہو جایا کرے (۱)

مولانا شبلیؒ سے ملاقات اور ندوہ کا تعارف

علی گڑھ میں مولانا مشتاق علی صاحب نے مولانا شبلی سے ملاقات کی اور ندوۃ العلماء کے تخیل ونصب العین، اصلاح نصاب اور رفع نزاع باہمی پر ان سے گفتگو کی، مولانا شبلی رحمہ اللہ اس وقت مدرستہ العلوم یعنی محمڈن کالج علی گڑھ میں استاد تھے، مولانا نے ان اغراض و مقاصد سے اتفاق کا اظہار کیا، علی گڑھ میں اور حضرات سے بھی اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی اور تقریباً سب نے اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔

حاجی امداد اللہؒ کی تائید

حجاز میں یہ انجمن کا پہلا تعارف تھا جب مولانا مشتاق علی صاحب نے مدینہ منورہ کے علماء کے سامنے ندوہ کا تخیل اور اغراض ومقاصد پیش کئے تو انہوں نے اس کی ضرورت واہمیت تسلیم کی، مکہ معظمہ میں حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ سے انہوں نے خاص طور پر ملاقات کی، اور سب حالات اور کاروائی لکھی ہوئی ان کے سامنے پیش کی، مولانا اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اس کاغذ کو اپنے دستخط سے مزین فرمایا۔ (۲)

ندوۃ العلماء کا مقصد مولانا کے قلم سے

ندوۃ العلماء کے قیام اور جلسہ عام کے انعقاد کے اسباب ومحرکات کیا تھے، بہتر ہوگا اگر اس کو مولانا ہی کی زبان سے براہ راست سنا جائے، روئداد سال اول حصہ اول میں مولانا نے

---

(۱) روئداد ندوۃ العلماء سال اول حصہ اول، ص ۱۴ (۲) بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

دلسوزی کے ساتھ لکھتے ہیں:۔

"افسوس صد افسوس! کوئی گروہ طلبہ کا ایسا نہیں نکلتا ہے جو ملحدوں اور جدید فلسفیوں کے اعتراضات کو اسلام سے دفع کرے جس کا زہریلا اثر بسبب شیوع بے دینی و آزادی کے عالمگیر ہو جاتا ہے اس کا مٹانا ہمارے علماء کا فرض ہے جس طرح ہو سکے، غرض کہ نہ تو حالت تحصیل میں انہوں نے کسی علم دین اور بالخصوص ان علوم مذکورہ میں مہارت و مشق پیدا کی نہ اس کے بعد انہیں نوبت آئی، اب فرمایئے کہ دین کا کام کون کرے؟ زیادہ افسوس یہ ہے کہ زمانہ کی ضرورتوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے نہ تو کسی دینی امر کا انتظام کر سکتے ہیں، نہ اس میں رائے دے سکتے ہیں (شاذ و نادر کا اعتبار نہیں) حالانکہ اس وقت ایسے گروہ کی زیادہ ضرورت ہے"

"اب خیال کیجئے مقلدین و غیر مقلدین میں کیسی کیسی شرمناک لڑائیاں ہوتی ہیں، ایک بھائی دوسرے بھائی کی جان کا، مال کا، آبرو کا کس طرح خواہاں ہوتا ہے۔ خلاف مذہب کے اجلاس میں مقدمات جاتے ہیں۔ ہمارے محترم علماء مجرموں کی طرح سامنے کھڑے ہوتے ہیں، صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث ان کے جوتوں کے پاس ان کے نیچے ڈھیر ہوتی ہیں، اور آمین ورفع یدین کی تحقیق جناب چوبے گھن شیام داس صاحب بہادر اور کرمول صاحب بہادر کے روبرو پیش ہوتی ہیں اور اس کو دین خیال کیا جاتا ہے۔ افسوس صد افسوس! ایسے فہم و خیال پر ہمارے علماء کا اس طرح اجلاس میں کھڑا ہونا کیا شان علماء کے خلاف نہیں؟ کیا ہمارے دین کی کتابوں اور ہمارے ہادی برحق کے ارشادوں کا یوں بے حرمتی سے رکھا جانا دین کی ہتک نہیں ہے؟ مذہبی اختلافات کا جھگڑا مخالفین مذہب کے روبرو پیش کرنا سخت بے دینی نہیں ہے" (۱)

---

(۱) روئداد سال اول حصہ ۱۲ تا ۱۶۔ باختصار

ندوۃ العلماء کا پہلا عام اجلاس

۱۵، ۱۶، ۱۷، شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲، ۲۳، ۲۴، اپریل ۱۸۹۴ء کو مدرسہ فیض عام کی دستار بندی کے موقع پر کانپور میں ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس بہت شان وشوکت کے ساتھ ہوا اور اس نے ملک کے طول وعرض میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا جس سے قوم آشنا ہو رہی تھی۔ اس جلسہ میں مختلف دینی جماعتوں اور مکاتب خیال کے نمائندے جس اتحاد اور جذبۂ اسلامی کے ساتھ جمع ہوئے اور باہم شیر وشکر ہو گئے وہ بجائے خود ایک حیرت انگیز کارنامہ تھا مصنف "کمالات محمدیہ" نے صحیح لکھا ہے کہ:۔

"علماء مقلدین وغیر مقلدین میں آپ نے (مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ) عجب طور پر ملاپ کرا دیا جو بجز کرامت کے اور کیا کہا جا سکتا ہے"

بڑے بڑے معمر لوگوں نے اس تعجب خیز نظارے کو دیکھ کر بیان کیا کہ "ایسا جلسہ جس میں اس قدر کثیر آدمی اس قرینہ اور سلیقہ کے ساتھ بیٹھے ہوں، اور اس قدر علماء کی پاک صورتیں جن کے منور چہروں سے تمام ہال روشن اور ایک جگہ رونق افروز ہونے سے اسلامی شوکت اور اسلامی دبدبہ ظاہر ہو ہندوستان میں پہلی مثال ہے (۱)

۲۲ اپریل کی صبح کو ۷ بجے جلسہ دستار بندی شروع ہوا، اس جلسہ میں مولانا شاہ سلیمان پھلواروی رحمۃ اللہ علیہ (۲) نے ایسی مؤثر تقریر کی کہ سامعین پر وجد کی کیفیت طاری تھی، صدر جلسہ مولانا لطف اللہ صاحب نے ۱۴ فارغ التحصیل طلبہ کے سروں پر اپنے ہاتھ سے دستار باندھی جس پر "ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ" بہت خوبصورت طریقہ پر لکھا ہوا تھا، شیخ احمد مکی رحمۃ اللہ علیہ نے عربی لہجہ میں سند پڑھ کر سنائی، اور اسی پر جلسہ دستار بندی کا اختتام ہوا۔

---

(۱) جلسہ دستار بندی فیض عام کانپوری ص ۱۳

(۲) مولانا شاہ سلیمان پھلواروی رحمۃ اللہ علیہ ایک سحر بیان مقرر اور متبحر عالم تھے، ابتدائی درسیات کی تکمیل مولانا عبد الحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ سے کی، اس کے بعد دہلی گئے اور مولانا نذیر حسین محدث رحمۃ اللہ علیہ سے علم حدیث کی تحصیل کی، اور مولانا احمد علی سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی سند حاصل کی .... خوش بیانی میں کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکتے تھے، جس وقت چاہتے مجمع کو ہنساتے اور جب چاہتے رلاتے۔ تقریر کے درمیان مثنوی کے اشعار اتنے درد و سوز اور مؤثر لہجہ میں پڑھتے کہ لوگوں کے دل بیقرار اور آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ ندوہ کا تقریباً کوئی جلسہ ان کی تقریر سے خالی نہ جاتا۔ ۱۲

پہلی نشست

سہ پہر کو ۳ر بجے اس ہال میں ندوۃ العلماء کے اس تاریخی اجلاس کا آغاز ہوا۔جس کے لئے پورا ملک گوش برآواز تھا۔مولانا شبلی بھی اس جلسہ میں شریک تھے،اور نہ صرف شریک تھے بلکہ پوری دلچسپی کے ساتھ کاروائی میں حصہ لے رہے تھے،ان ہی کی تحریک اور مولانا محمد حسین الہ آبادی کی تائید سے مولانا لطف اللہ صاحب اجلاس کے صدر قرار پائے یہ جلسہ جس شان سے ہوا اور اس میں جس اتحاد و یگانگت کا منظر دیکھنے میں آیا وہ اپنی نظیر آپ تھا،مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جو شریک جلسہ تھے اس قابل دید منظر کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

> ”شوال ۱۳۱۱ھ ر ۱۸۹۴ء میں پہلا اجلاس ہوا، یہ اجلاس اپنی شان اور اجتماع میں خود بے نظیر تھا ایک شان یہ تھی کہ ہر فرقہ کے صنادید شریک جلسہ تھے علماء حنفی کے علاوہ اہل حدیث میں سے مولوی ابراہیم آروی، مولوی محمد حسین بٹالوی، شیعہ مجتہدین میں مولوی غلام الحسین کنتوری شریک جلسہ تھے (۱)

اس کے بعد مولانا محمد حسین الہ آبادی (۲) نے ندوۃ العلماء کے مقاصد اور موجودہ طریقۂ تعلیم کی خرابیوں نیز انگریزی تعلیم کے نقصانات اور اس کے سدباب کے موضوع پر ایک پر زور تقریر کی دستور العمل پیش کرنے کا کام مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا عبد الحق حقانی کے سپرد کیا تھا، لیکن وہ وقت مقررہ پر تشریف نہ لا سکے، چنانچہ مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے صدر جلسہ کی اجازت سے دستور العمل پیش کیا اور طے پایا کہ پہلے ایک مخصوص جلسہ کیا جائے جس میں اس کی ایک ایک دفعہ کو غور و فکر کے بعد منظور کیا جائے، اس کے بعد جلسۂ عام کی منظوری کے لئے پیش کیا جائے۔

---

(۱) استاذ العلماء ص ۴۲۔ (۲) مولانا محمد حسین الہ آبادی اپنے زمانہ کے نامور علماء میں ہیں، مولانا سید عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں ”ذہانت اور جودت طبع اور حسن تحریر و لذت تقریر میں نادرۂ روزگار تھے“ تکمیل درسیات کے بعد حج کے لئے تشریف لے گئے اور شیخ احمد بن زید دحلال الشافعی المکی سے سند حدیث حاصل کی اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا چار مرتبہ حج کے لئے گئے،اور ہر مرتبہ حالت و کیفیت میں اضافہ ہی معلوم ہوتا تھا، یہاں تک کہ مغلوب الحال سے ہوگئے، آخر عمر میں سماع وغیرہ کی طرف بہت توجہ ہوگئی تھی،اور خوش آوازی سے وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی،وفات بھی اسی حال میں ہوئی ایک محفل سماع میں مغنی سے فرمائش کی کہ یہ شعر پڑھو!

خشک تار و خشک چنگ و خشک پوست

از کجا می آید این آواز دوست

(باقی اگلے صفحہ پر)

دوسری نشست

دوسری نشست ۱۶، شوال ۶ بجے صبح کو ہوئی ہال وقت سے بہت پہلے ہی بھر گیا تھا، سید محمد شاہ محدث رامپوری رحمۃ اللہ علیہ نے جلسہ کی صدارت کی سب سے پہلے مولانا عبد الحق حقانی (۱) نے ندوۃ العلماء کے فوائد اور مقاصد پر بڑی گرم جوشی کے ساتھ تقریر کی اس کے بعد مولانا محمد ابراہیم آروی (مہتمم مدرسہ، احمدیہ آرہ) نے تقریر کی مولوی غلام حسین نے بھی تقریر کی، لیکن ان کی تقریر کچھ زیادہ پسند نہیں کی گئی، بعض اشخاص نے درمیان میں کچھ بولنا بھی چاہا لیکن یہ بات قرار پاچکی تھی کہ مجلس میں کسی قسم کی ردو قدح نہ ہو اس لئے خاموشی اختیار کر لی گئی۔

اس جلسہ میں دستور العمل (۲) بھی منظور ہوا، اور چار تجویزیں پاس ہوئیں:۔

(۱) پہلی تجویز یہ تھی کہ موجودہ طریقہ تعلیم قابل اصلاح ہے۔

(۲) دوسری یہ کہ مدارس عربیہ کے مہتمم ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسوں میں شریک ہوا کریں۔

(۳) تیسری یہ کہ مدارس اسلامیہ ایک کڑی میں مربوط کر دیئے جائیں۔

(۴) چوتھی تجویز مدرسہ فیض عام سے متعلق تھی۔

اصلاح نصاب کی تجویز سوائے ایک اختلاف کے کثرت رائے سے منظور ہوئی اور تمام علماء نے اس بات کو تسلیم کیا کہ موجودہ طرز تعلیم قابل اصلاح ہے۔

اسی وقت بارہ اشخاص پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کر دی گئی جس کا کام نصاب تعلیم پر غور کر کے جلد از جلد اپنی سفارشات پیش کرنا تھا۔ اس کمیٹی میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ مولانا لطف اللہ

---

(۱) مولانا عبد الحق حقانی انبالہ (پنجاب) کے رہنے والے تھے لیکن زیادہ تر تعلیم کانپور میں مولانا لطف اللہ صاحب علیگڑھی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی۔ دہلی جا کر مولانا نذیر حسین محدث رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا اور وہیں اقامت اختیار کی، عرصہ تک مدرسہ فتح پوری میں درس بھی دیا، تعلیم سلوک حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مرادابادی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی قیام ندوہ کے بعد اس میں دلچسپی لینا شروع کی اور اس کے ساتھ کسی قسم کے تعاون میں دریغ نہیں کیا اردو میں ان کی تفسیر "تفسیر حقانی" کے نام سے بہت مشہور ہے ۱۲۔ (۲) دستور العمل کے لئے دیکھئے روئداد سال اول، ص، ۷۰، ۷۳

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) شعر سن کر بیخود ہو گئے، اور تھوڑی دیر کے بعد فرمائش کی کہ شیخ عبد القدوس گنگوہی کا یہ شعر پڑھو!

گفت قدوسی فقیرے در فنا و در بقاء — خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی

شعر سننا تھا کہ کیفیت بہت بڑھ گئی، اسی حالت میں سر بسجود ہوئے، اور تھوڑی دیر بعد روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی (نزہۃ الخواطر جلد ۸)

علیگڑھی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبدالحق حقانی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد حسین الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا شاہ سلیمان پھلواری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا محمد حسین بٹالوی، اور مولانا ظہورالاسلام فتح پوری (۱) شامل تھے۔ ان حضرات سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ دوسرے علماء خصوصاً مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے اس مسئلہ میں رابطہ قائم کریں اور مشورہ کر کے نیا نصاب تعلیم تجویز کریں، دوسری تجاویز بھی کثرت آراء سے منظور ہو گئیں۔

اس جلسہ میں تمام علماء کی اتفاق رائے سے مولانا سید محمد علی کو باضابطہ طور پر ندوۃ العلماء کا ناظم منتخب کیا گیا، اور گویا اس فیصلہ کی توثیق کی گئی جو بنیادی جلسہ میں کیا گیا تھا۔ پہلی تجویز کی منظوری کے بعد مولانا شروانی نے جن کا اس وقت عنفوان شباب تھا نصاب تعلیم کے متعلق ایک بہت اچھا مقالہ پڑھ کر سنایا۔ اس جلسہ میں ۶۰، ۷۰ ممتاز علماء شریک تھے شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ کی مصروفیات کے پیش نظر جلسہ میں شریک نہ ہو سکے، اور معذرت کا خط لکھا۔

مولانا حالی کی مرسلہ تقریر

مولانا حالی اس جلسہ میں شریک نہ ہو سکے لیکن انہوں نے اپنی تقریر لکھ کر بھیج دی جو دوسرے وقت ارکان کے سامنے پڑھی گئی، اس میں انہوں نے تاریخ و جغرافیہ اور تبدیلیٔ نصاب کی اہمیت و ضرورت کے ساتھ عربی ادب کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی، اس جلسہ میں مولانا احمد رضا خاں (جو بعد میں ندوہ کے شدید مخالف ہو گئے) کا مقالہ بھی تھا، لیکن وہ وقت کی تنگی کے باعث پڑھا نہ جا سکا، اور فیض عام کی روئداد میں شائع ہوا۔

---

(۱) مولانا ظہورالاسلام فتح پوری ایک فرشتہ خصلت اور صاحب کمال بزرگ تھے، دلمو (رائے بریلی) میں پیدا ہوئے، لیکن تلاش علم نے علی گڑھ تک رسائی کی جہاں اس وقت مولانا لطف اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مسند درس آراستہ تھی، درسیات کی تکمیل کے بعد لکھنؤ تشریف لائے اور علم حدیث مولانا عبدالحیٔ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا، مولانا فضل رحمٰن گنج مرادابادی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، اور ان سے غیر معمولی تعلق تھا، راہ سلوک ان ہی کی تربیت و رہنمائی میں طے کی مدرسہ اسلامیہ (فتح پور) ان کی زندہ یادگار ہے...... مولانا کا سب سے بڑا وصف خدمت خلق و ایثار" تھا اس میں ان کے ہاں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تفریق نہ تھی بار بار ایسا ہوا کہ مولانا سے کسی نے کچھ سوال کیا اور سخت سردی اور احتیاج کے باوجود مولانا نے اپنی صدری یا اس طرح کی کوئی اور چیز اس کو دے دی، فتح پور کے ہندوؤں کا ایک بڑا خاندان آج بھی ان کا معتقد ہے، ان میں سے بعض افراد کو مولانا سے حد درجہ عقیدت اور محبت تھی ۱۳۴۹ھ میں فتح پور ہی میں انتقال ہوا جنازہ میں زبردست ہجوم تھا اور بکثرت ہندو جنازہ کے ساتھ زار و قطار رو رہے تھے، مولانا کے ایک غیر مسلم معتقد نے جو جنازہ میں شریک تھے مجھے اس کی حیرت انگیز تفصیلات اپنی ڈائری سے پڑھ کر سنائیں، جن سے ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی اور لوگوں کے تعلق و شیفتگی کا اندازہ ہوا۔ ۱۲

مولانا محمد علیؒ کی فکری و عملی رہنمائی

اس جلسہ کے بعد مولانا نے ایک نقشۂ مضامین تیار کیا، اس کا مقصد یہ تھا کہ آئندہ جلسوں کیلئے لوگ عنوانات پر مقالات تیار کریں ندوۃ العلماء نے جو تخیل پیش کیا تھا اور جن بنیادوں پر ذہن و فکر کی تعمیر اس کے پیش نظر تھی اس لحاظ سے اس بات کی بڑی ضرورت تھی، کہ لوگ اس خاص نہج پر سوچیں اور ان موضوعات پر غور کریں جن سے ان کے اندر صحیح شعور و احساس بیدار ہو، اور عالی دماغی اور بلند نظری کے اوصاف پیدا ہوں...... مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی مشہور کتاب علماء سلف اس رہنمائی کا نتیجہ ہے، یہ کتاب ندوہ کے اجلاس ہی کیلئے لکھی گئی مولانا اس تاریخی جلسہ کا ذکر اور کتاب کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

۱۳۱۱ھ کا ذکر ہے کہ ندوۃ العلماء کا اوّل اجلاس شہر کانپور میں ہوا تھا۔ جس میں دیار ہند کے اکثر مشاہیر علماء رونق افروز تھے۔ بزم ان کے جمال کمال سے روشن تھی اور نگاہ ان کے کمال جمال سے منور، اور ایک ایسا پاکیزہ منظر پیش نظر تھا جو تاریخ ہندوستان میں اپنی آپ ہی نظیر تھا میری آنکھیں جب ان نورانی شکلوں کے دیدار سے فیض یاب ہوئیں تو چشم بصیرت میں ایک نور پیدا ہوا، جس کی روشنی میں وہ زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا جو فضائے عالم میں صدہا برس کی راہ طے کر چکا ہے، یعنی متاخرین کا مجمع دیکھ کر متقدمین کا تصور بندھا اور ان کے حالات کے مطالعہ کا شوق دل میں پیدا فرمایا جس میں چند عنوان اس غرض سے درج تھے کہ آئندہ جلسہ ندوہ کیلئے ان پر مضامین لکھے جائیں اتفاقاً ان میں ایک عنوان "علماء سلف" بھی تھا"(۱)

(اضافہ) ندوۃ العلماء

مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ اور دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ لازم ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، اس ادارے کی بناء حضرت کے ہاتھوں ہوئی، اور اس کی ترقی و شہرت کے لئے انہوں نے جتنی محنت کی وہ تاریخ کے صفحات میں درج ہے، ہم نے یہاں اس ادارے کی ابتدائی کارروائی اور اسکے وجود میں آنے کے مختصر تذکرہ پر اکتفاء کیا ہے، کیونکہ یہ مجموعہ اسکے تفصیلی احوال کا متحمل نہیں ہے اس سلسلہ میں تفصیل کے خواہاں حضرات سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ

---

(۱) علماء سلف ص ۲

(از مولانا سید محمد الحسنیؒ) اور تاریخ ندوۃ العلماء جلد اول ودوم کا مطالعہ فرما سکتے ہیں، جہاں معلوم ہو سکے گا کہ اس انجمن وادارہ کیلئے مولانا نے کتنی صعوبتیں اٹھائیں اور کس قدر جانفشانی سے کام لیا ہے، جزاھم اللّٰہ تعالیٰ احسن الجزاء ورفع درجاتہ. (محمد عمران قاسمی)

مولانا کا پہلا سفر حج

بچپن ہی سے مولانا کو حج وزیارت کی تمنا تھی، اوائل عمر ہی میں ایک مرتبہ گھر بار فروخت کر کے متعلقین کے ساتھ حج کا ارادہ کر لیا تھا، لیکن :

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب

کے اصول پر یہ تمنا اس وقت پوری نہ ہو سکی، اور شاید اسی میں خدا تعالیٰ کی کوئی مصلحت پوشیدہ تھی ۱۵ شعبان ۱۳۱۸ھ ۱۹۰۱ء کو کانپور سے روانہ ہو کر مونگیر پہنچے، تقریباً ایک ماہ وہاں قیام رہا، رفقاء سفر میں ایک خادم عبدالسمیع، مولانا بشارت حسین در بھنگوی، مولانا نور محمد پنجابی اور مولوی غلام حسین تھے۔

سامان توکل

۱۱ر رمضان ۱۳۱۸ھ ۱۹۰۱ء کو مونگیر سے روانگی ہوئی اور وہ بھی اس بے سروسامانی کے ساتھ کہ پانچ آدمی ہمراہ ہیں اور زاد سفر صرف چالیس روپیہ ہے، اور کسی کو سفر کی اطلاع بھی نہیں، طرفہ تماشا یہ کہ بعض روسائے مونگیر نے یہ اطلاع دی کہ کلکٹر کی طرف سے اس سال حج کی ممانعت ہو گئی ہے، لیکن ان سب دشواریوں اور موانع کی پرواہ کئے بغیر انہوں نے روانگی کا فیصلہ کر لیا۔

صاحب کمالات لکھتے ہیں کہ :-

"ایک شخص چاٹگام سے آیا ہوا تھا، اس نے حال دریافت کر کے کہا کہ میرا بھی قصد حج بیت اللہ شریف کا تھا، اور اسی ارادہ سے چاٹگام گیا تھا مگر قرنطینہ میں نہیں لیا گیا اور واپس کر دیا گیا، صرف ایک جہاز جائے گا، اور اس قدر آدمی کثرت سے ہو گئے ہیں کہ اب جو جاتا ہے واپس کر دیا جاتا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ :-

"جب وہاں سے واپس کردیئے جائیں گے تو چلے آئیں گے" کانپور میں چونکہ طاعون کازور تھااس لئے وہ راستہ اختیار نہ کیابلکہ "گوالندوہ" ہوتے ہوئے چاٹگام پہنچے، ریل سے اترتے ہی لوگوں نے بیان کیاکہ :۔

"اب حج کے جانے والے نہیں لئے جاتے، آپ کا آنابے موقع ہوا"

آپ نے شب کووہاں قیام کیا اور دوسرے دن قرنطینہ کے مقام پر پہنچے، خداتعالیٰ کی قدرت کا یہ نمونہ ہواکہ دوہزار آدمی واپس کردیئے گئے تھے، مگر جس روز آپ تشریف لے گئے اس روزحجاج کو لینے کا سرکاری حکم ہوا(۱) ۲۲/ شعبان کو عصر کے وقت قرنطینہ میں داخل ہوئے، جو جگہ مولانا کو ملی، وہ انتہائی تنگ اور تکلیف دہ تھی، پھوس کا ایک سائبان تھا جس میں ۵۰، ۶۰ آدمیوں کی گنجائش تھی اور ان میں بیشتر بنگالی تھے، لیکن ایک رات اور ایک دن قیام رہاکہ اس سے بہتر جگہ مل گئی۔

استغراق اور بے ہوشی

سائبان میں مستقل شور ہنگامہ اور جگہ کی تنگی کے باعث مولانا کو سخت اضطراب اور قلبی اذیت تھی،لیکن قدرت کی طرف سے کچھ ایساانتظام ہواکہ اس رات اور دن کا بڑا حصہ بھی خلوت ہی میں گزرا........... "صاحب کمالات "لکھتے ہیں کہ :۔

"عشاء کی نماز میں کسی قاری نے بلند آواز سے اور خوش الحانی کے ساتھ تلاوت کی، آپ اس کو سنتے ہی ازخود رفتہ ہوگئے، پہلے گریہ شروع ہوااسکے بعد کامل بے ہوشی ہوگئی،اس کامل بے ہوشی میں عجیب وغریب بات یہ ہوئی کہ عشاء کی نماز پورے طور پر پڑھی آپکے ہمراہی حضرات بیان کرتے ہیں کہ آپ نے عشاء کی نمازنہیں پڑھی تھی کہ بے ہوشی طاری ہوئی، اس بے ہوشی میں کسی وقت گریہ ہوتا تھاکسی وقت سکوت،کسی وقت کچھ کلام کی نوبت آتی، جب گریہ میں کچھ کمی ہوئی تو آپ نے دریافت فرمایاکہ ہم نے عشاء کی نمازپڑھی یانہیں ؟لوگوں نے کہاکہ نہیں پڑھی۔ آپ نے وضوکیا اور جماعت کے ساتھ فرض پڑھے،اور سنت ووترسب بخوبی پڑھے، ہمراہی دیکھتے رہے۔ بعد نماز پھر

(۱) کمالات محمدیہ ص ۲۸۷

وہی گریہ اور کبھی سکوت رہا، آدھی رات تک اسی حالت میں آپ بیٹھے رہے پھر لیٹ گئے، دوسرے روز دوپہر تک یہ حالت رہی، مگر ارشاد فرماتے ہیں کہ صبح کو اٹھنے کے بعد ایسی بے ہوشی نہیں تھی، جیسی شب کو رہی تھی، سہ پہر کو وہاں کا داروغہ غالباً اس کا نام ولی اللہ تھا آیا، اور اس نے کہا کہ یہاں آپ کو تکلیف ہوگی دوسرے مقام پر آپ تشریف لے چلیں، وہ ایسے مقام پر لے گیا جہاں شور وغل کا نشان نہ تھا، سائبان نہایت وسیع تھا اور اس کے سامنے کشادہ صحن"

چاٹگام میں رجوع

اب لوگوں کی آمد ورفت شروع ہوئی۔ افسر قرنطینہ ایک بنگالی ڈاکٹر تھا، لوگ اس کی خوشامدیں کرتے تھے کہ ہمیں اندر جانے کی اجازت دیجئے (۱) بہرحال کسی نہ کسی طرح کوشش کرکے لوگ حاضر ہوتے اور بیعت سے مشرف ہوتے، خاص طور پر طالب علم احاطہ کے باہر اجازت کے انتظار میں دو دو تین تین گھنٹے منڈلایا کرتے۔ لوگوں کے ہجوم سے ڈاکٹر عاجز آ گیا اور کہنے لگا کہ ہم نے کیوں ایسے شخص کو اندر لے لیا جس نے ہم کو پریشان کر دیا۔ اس نے کہا کہ خلاف قانون ہم اجازت نہیں دے سکتے البتہ اگر کوئی تم کو پکڑ لائے گا تو ہم چھوڑ دیں گے۔ غرضیکہ جو لوگ کیمپ کے کسی ملازم سے رابطہ رکھتے تھے یا کسی کی سفارش لاتے تھے وہ اندر جاکر ملاقات کرتے تھے، اور اکثر بیعت سے مشرف ہوتے تھے یہاں تک کہ اطراف چاٹگام سے بھی اکثر لوگ آئے اور بیعت سے سرفراز ہوئے۔ (۲)

لوگ بیعت کی درخواست کرتے تھے اور آپ ٹالنے کی کوشش کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بھائی اس کیمپ میں اور بھی کئی عالم ہیں، میں بھی ایک ملا ہوں، مجھ میں کون سی بات تم لوگوں نے دیکھی کہ اتنی دور سے آتے ہو اور مرید ہونا چاہتے ہو؟ اس کے جواب میں وہ کہتے تھے کہ ہم زیادہ نہیں جانتے، تمام اطراف میں یہ غل ہے کہ ہندوستان کے ایک بڑے بزرگ مولانا تشریف لائے ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ تین عالم تھے، جب کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو حضرت ان کی طرف سے اشارہ کرکے فرماتے کہ یہ بڑے عالم ہیں ان سے دریافت کرو۔ یہ سب کچھ ہوتا مگر لوگ آپ ہی پر نثار ہوتے تھے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اگر آپ ۱۰، ۱۵ روز

---

(۱) کمالات، ص، ۲۸۷ (۲) کمالات، ص، ۲۸۷

شہر میں قیام فرمائیں تو اس وقت دو تہائی اہل شہر دست مبارک پر بیعت کریں(۱)

مولانا کا جہاز ۴؍ شوال کو عدن پہنچا آپ ایک مسترشد میاں خدا بخش کو ان کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"تمہارا خط قرنطینہ چاٹگام میں پہنچا تھا۔ وصیت کے خواہاں ہو، جو کچھ پہلے بتایا گیا ہے اس پر عمل کرو، وہی نجات کیلئے کافی ہے، اس وقت یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے کسی وقت غافل نہ رہو، ہاتھ سے کام کرو، آنکھ سے سب کچھ دیکھو، مگر دل اسی کی طرف رہے، اور اس پر عمل ہو۔

جان جائے تو بلا سے پر ترا دھیان نہ جائے

اللہ تعالیٰ بس باقی ہوس، اس وقت جہاز عدن پہنچا، الحمد للہ ہم یہاں نہایت لطف سے پہنچے (۲) خدا کی شان دیکھئے کہ ۴۰ روپیہ اور پانچ افراد کو ساتھ لے کر حج کو چلے، اور اس بے سروسامانی کے باوجود پورا سفر آرام سے طے ہوا بلکہ وہ اطمینان قلب اور سکون حاصل تھا جو دولت مندوں کو گھر پر بھی نہ ملتا ہوگا۔ ۱۱؍ شوال کو مکہ معظّمہ پہنچے .... ایک خط میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"۱۱؍ رمضان شریف کو جہاز پر سوار ہوا، اور نہایت احترام سے ۱۱؍ شوال کو مکہ معظّمہ پہنچا، خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے عجیب وغریب واقعات راہ میں پیش آتے رہے، یہاں بیت اللہ کے قریب مکان کرایہ پر لیا ہے، ستر روپیہ کرایہ، نہایت آرام سے بسر ہورہی ہے، جب تک سرکار کہیں نہیں آنا ہوگا" (۳)

ندوہ کی یاد

مولانا کو حجاز کے دوران قیام میں ندوہ کی جتنی فکر تھی اس کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو مولانا سید عبدالحئی کے نام انہوں نے مکہ معظّمہ سے لکھے ہیں وہ اس کی جزئیات کا جس اہتمام سے ذکر کرتے ہیں، اور اس کی ترقی کی جو عملی صورتیں تجویز کرتے ہیں اس سے ان کے اس تعلق خاطر پر روشنی پڑتی ہے۔

حجاز پہنچ کر قدرتی طور پر مولانا کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر یہاں کوئی عالم ندوہ میں درس و تدریس

(۱) کمالات، ص، ۲۸۷ (۲) کمالات محمدیہ، ص، ۲۴۱

(۳) مجموعہ مکاتیب قلمی بنام مولانا سید عبدالحئی۔ ۱۳۲

کیلئے مل سکے تو اس سے طلبہ میں ادبی ذوق پیدا کرنے میں بڑی سہولت اور مدد حاصل ہوگی، مولانا نے اس بات کا بہت ہی اہتمام کے ساتھ اپنے خط میں ذکر کیا ہے، ندوہ کی مخالفت میں جن فتوؤں اور اشتہارات ورسائل کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا، اس کے سد باب کیلئے مولانا یہ چاہتے تھے کہ حرمین کا کوئی فتویٰ حاصل کیا جائے، اور ہندوستان میں اس کی اشاعت ہو۔

شریف مکہ کو ندوہ کا سرپرست بنانے کا خیال بھی مولانا کے دل میں آیا تھا، اس کے متعلق بھی مولانا عبدالحئی سے استصواب رائے کیا ہے۔ ۱۲/ ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ سے مولانا عبدالحئی کو جو پہلا خط لکھا گیا ہے اس میں مولانا نے ان سب امور پر روشنی ڈالی ہے مولانا کو اس خط کے جواب کا انتظار بھی دشوار معلوم ہوا چنانچہ تین ہی روز کے بعد ایک اور خط لکھتے ہیں جو زیادہ تر انہیں مضامین پر مشتمل ہے، مولانا سید عبدالحئی کا ایک خط ان کو ملا تھا، لیکن وہ ان کے خط کے جواب میں نہ تھا اس لئے لکھنے کا تقاضہ اور شدید ہوگیا، لکھتے ہیں:۔

"حج تو ہوگیا، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین۔ آپ کے کہنے کی تعمیل بھی ہوئی یعنی عرفات پر جبل رحمت کے قریب بالتخصیص آپ کیلئے دعا کی، اور بظاہر وہ اچھی حالت تھی مگر مجھ سے سیاہ کار کی دعا کیا، مگر۔ ع

شاہاں چہ عجیب گر بنوازند گدارا

ابھی نہ آنے کو دل چاہتا ہے اور نہ سامان ہے، بہرحال سرکار ﷺ جب رخصت کردیں، انہیں کے مہمان ہیں اگرچہ نالائق ہیں سیاہ کار ہیں۔ جب میں بیت اللہ کے قریب اوّل روز پہنچا تو یہ شعر زبان سے بے اختیار نکلا!

نہ لائق در پہ آنے کے نہ قابل منہ دکھانے کے — امید مغفرت لے کر ترے دربار میں آئے

اس کے بعد عربی عالم کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔ "ان کو ندوہ بلائیے، غالباً سو روپیہ ماہوار پر آسکیں............... آخر میں لکھتے ہیں کہ:۔

کلکتہ میں جلسہ ہو تو چاٹگام وغیرہ واعظ بھیجیں، چاٹگام میں بہت لوگ جان گئے ہیں (۱)

(اضافہ) ندوۃ العلماء سے استعفیٰ

مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ اور ارباب ندوۃ العلماء کے درمیان بعض اختلافات کے

(۱) مجموعۂ مکاتیب قلمی بنام مولانا سید عبدالحئی۔ ۱۲۲

سبب مولانا نے ندوہ سے علیحدگی کو ہی اپنے اور ادارے کے حق میں مفید سمجھا اور استعفیٰ دیدیا، اولاً تو ذمہ دار حضرات اسکے قبول کرنے پر تیار نہ ہوئے تاہم بعد میں مولانا کے اصرار اور حالات کی پیچیدگی کے سبب بادل ناخواستہ اسے گوارا کیا۔ مجھے تو یہ لگتا ہے کہ یہ اختلاف وہی اختلاف ثابت ہوا جس کے بارے میں "رحمت" کہا گیا ہے، وہ یوں کہ ندوہ سے علیحدگی کے بعد مولانا کو مونگیر میں مستقل قیام کا موقع ملا اور وہاں قیام سے پورے بہار کی خصوصاً اور دیگر صوبہ جات کے لوگوں کی عموماً اصلاح وتربیت کا جو کام اللہ رب العزت نے آپ سے لیا، وہ ایک عظیم کارنامہ ہے اور ممکن تھا کہ ندوہ میں رہتے ہوئے اس قدر خلق کثیر آپ سے فیضاب نہ ہو پاتی، نیز بہار کے ایک بڑے علاقے پر قادیانیوں نے جو اپنے اثر اور گمراہیت کا جال بچھا دیا تھا مولانا کے وجود نے ہزار ہوں افراد کو اس گمراہیت وتباہی سے محفوظ رکھا اور اس میدان میں بھی مولانا زیادہ یکسوئی اور محنت سے خدمات انجام دے سکے۔ بہرحال خدا کی حکمتوں کو بجز اس کے کون جا سکتا ہے؟ ان اللہ یفعل مایرید وماذلك علی اللہ بعزیز۔ (محمد عمران قاسمی بگیانوی)

قادیانیت کا مقابلہ

مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اہم کارنامہ جس کے ذکر کے بغیر ان کی تاریخ نامکمل رہے گی، قادیانیت کا مقابلہ اور سرکوبی ہے۔ انہوں نے اس کیلئے اپنی پوری قوت صرف کر دی، اور جب تک اس مہم میں کامیاب نہ ہوئے اطمینان کی سانس نہ لی۔ انہوں نے قادیانیت کی تردید میں سو سے زائد کتابیں اور رسائل تصنیف کئے ہیں جن میں سے صرف ۴۰ کتابیں ان کے نام سے طبع ہوئیں اور بقیہ دوسرے نام سے۔

انہوں نے اسے اس وقت کا افضل ترین جہاد قرار دیا، اور اس کیلئے لوگوں کو ہر قسم کی کوشش اور قربانی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، اور بڑی دلسوزی کے ساتھ اس کی اہمیت سمجھائی۔ ان کوششوں سے بہار (جس پر قادیانیوں نے اس زمانہ میں بھرپور حملہ کیا تھا، اور بڑی تعداد میں مسلمان اس کا شکار ہو رہے تھے) اس خطرہ سے محفوظ ہو گیا، اور ہندوستان کے اور دوسرے علاقوں میں بھی جہاں کہیں مولانا کی تصنیفات پہنچیں، یا مولانا کے مبلغین پہنچے قادیانیت کے قدم اکھڑ گئے۔ مسلمانوں پر اس نئے دین کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی، اور ہزاروں لاکھوں مسلمان اس فتنہ سے محفوظ ہو گئے۔ مولانا کی اس دلسوزی، بیقراری، اور اس مسئلہ میں

غیر معمولی ذکی الحسی کا سبب سمجھنے کیلئے ، اور ان کی کوششوں اور قربانیوں کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ قادیانیت پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے، اور یہ دیکھا جائے کہ قادیانیت سے اسلام اور عالم اسلام کو وہ کیا بڑا خطرہ در پیش تھا جس نے مولانا کو اس قدر بے چین کر رکھا تھا، اور ان کی راتوں کی نیند اور دن کا آرام ختم کر دیا تھا۔

قادیانیت کے متعلق ایک بڑا مغالطہ جس میں عام مسلمانوں کے علاوہ اچھے خاصے ممتاز اور ذہین افراد بھی بعض وقت گرفتار نظر آتے ہیں یہ ہے کہ وہ قادیانیت پر ایک گمراہ فرقہ (فرقہ ضالہ) کی حیثیت سے غور کرتے ہیں اور پھر قدرتی طور پر اسی لحاظ سے اس کے نتائج و مضمرات کا اندازہ لگاتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ قادیانیت بھی مسلمانوں کا ایک گمراہ فرقہ ہے جو بہ نسبت دوسرے گمراہ فرقوں کے اسلام کی صراط مستقیم سے ذرا زیادہ دور ہو گیا ہے۔ لیکن یہ طرز فکر ہمیں قادیانیت کی صحیح تصویر تک پہنچنے میں رہنمائی نہیں کرتا، اس سے ہمیں قادیانیت کی اس خطرناکی اور ان تباہ کن عناصر کا پورا اندازہ نہیں ہوتا جو نبوت محمدی ﷺ اور بالآخر پورے اسلامی نظام کو نہ صرف نقصان پہنچانا چاہتا ہے، بلکہ خاکم بدہن ان کے کھنڈر پر ایک نئی عمارت قائم کرنا چاہتے ہیں

ایک متوازی نبوت اور متوازی امت

اگر نبوت محمدی ﷺ کے کسی جز کا انکار پورے اسلامی نظام کا انکار ہے، اور بلاشبہ ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قادیانیت (جس نے نبوت محمدی ﷺ کے کسی جز سے انکار نہیں کیا، بلکہ وہ اس کے مقابل ایک نئی نبوت کی دعویدار ہے) اسلام، عالم اسلام، اور سارے اسلامی نظام کو متزلزل کر دینا چاہتی ہے، اور اس کی جگہ ایک نیا نظام اور نیا مذہب قائم کرنا چاہتی ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب "قادیانیت کا مطالعہ و جائزہ" میں اس پہلو پر بہت اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔ .... لکھتے ہیں :۔

"قادیانیت کا تحقیقی مطالعہ کرنے سے یہ غلط اور خوش گمانی دور ہو جاتی ہے اور ایک منصف مزاج انسان اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ قادیانیت ایک مستقل مذہب اور قادیانی ایک مستقل امت ہیں، جو دین اسلام اور امت اسلامیہ کے بالکل متوازی چلتے ہیں، اور اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مرزا بشیر الدین محمود صاحب کے اس بیان میں کوئی مبالغہ اور غلط بیانی نہیں کہ "حضرت مسیح

موعود کے منھ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے ہیں" آپ نے فرمایا! یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفات مسیح اور چند مسائل میں ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات، رسول کریم ﷺ، قرآن، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، غرضیکہ آپ نے تفصیل سے بتایا کہ ہر ایک جزو میں ہمیں ان سے اختلاف ہے"(۱)

مسلمانوں کی غیرت اور وفاداری کا امتحان

اگر محمد رسول اللہ ﷺ عالم اسلام کی روح ہیں، اور بلا ادنیٰ شائبہ شک کے ایسا ہی ہے، تو آپ ﷺ کے بعد ایک نئے نبی کے آنے کا امکان مسلمانوں کے لئے خطرہ کا سب سے بڑا سگنل، مسلم معاشرہ اور عالم اسلام میں عظیم انتشار کا باعث ہے، اور ایسی تحریک کا وجود رسول اللہ ﷺ کی نبوت و شریعت پر کلی اعتماد و اطمینان کیلئے کھلا ہوا چیلنج ہے، اور اس کا نشو ونما اور ترقی ہر غیرت مند مسلمان کے لئے سخت ذہنی تشویش اور قلبی اذیت کا موجب ہے۔(۲)

قادیانیت کی تبلیغ واشاعت

یہ زمانہ قادیانیت کے عین عروج کا تھا، ۱۹۰۱ء میں مرزا صاحب نے کھل کر اپنے اس عزم وارادہ کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ ان کے رسائل کا وہ مجموعہ جس کا نام "اربعین" ہے منصب جدید کے اعلانات اور تصریحات سے بھرا ہوا ہے۔

۱۹۰۲ء میں ایک رسالہ "تحفۃ الندوہ" لکھا، اس کے مخاطب بالخصوص ندوہ کے علماء و ارکان اور بالعموم وہ تمام علماء تھے جو ندوہ کے اجلاس امرتسر (منعقدہ ۱۹۰۲ء) میں شریک تھے، اس میں مرزا صاحب نے بہت کھل کر اور وضاحت کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کئے، قادیانی بہت منظم طریقے پر کام کر رہے تھے۔ اخبارات ورسائل اور کتابوں کے علاوہ ان کے مبلغین جن کو ایک طرف قادیان میں باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی تھی، اور دوسری طرف مالی امداد کے ذریعہ ان کو ایسا تابع بنا لیا جاتا تھا کہ وہ اس کے جال سے کسی حال میں آزاد نہ ہوسکیں۔

---

(۱) قادیانیت۔ ص ۱۶۸، ۱۶۹

(۲) الحمد للہ پاکستان اور عالم اسلام کے اکثر ملکوں کی حد تک یہ خطرہ تقریباً ختم ہو گیا ہے۔(ارشد)

بہار پر یورش

بہار میں قادیانیوں نے چار ضلعوں میں بہت کامیابی حاصل کی تھی، خاص طور پر مونگیر اور بھاگلپور کے متعلق یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ یہ دونوں ضلع قادیانی ہوجائیں گے۔ انہوں نے یہ تکنیک اختیار کی تھی کہ کچھ لوگ کھل کر قادیانی مبلغ کی حیثیت سے سامنے آتے تھے اور کچھ لوگ جو حقیقت میں قادیانی تھے لیکن اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے تھے وہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرتے اور ان کو ان کی تحریروں اور تقریروں کی طرف متوجہ کرتے۔ ایک قادیانی مبلغ سعید مختار جس کا مولانا نے اپنے خط میں ذکر کیا ہے:۔

> "بہت سرگرمی کے ساتھ مشغول تھا اور بہار کے علاوہ بنگال میں بھی اس نے مہم شروع کردی تھی، ہزاری باغ (بہار) میں بہت سے مسلمان قادیانی ہوگئے تھے" (۱)

قادیانی لٹریچر علانیہ تقسیم کیا جاتا اور ناواقف مسلمان عام طور پر اس سے متاثر ہوتے۔ اس وقت جو رسائل واخبارات قادیانیوں کی طرف سے شائع ہورہے تھے ان کی تعداد اشاعت ۲۶ ہزار تھی۔ ہر قادیانی کے لئے یہ لازمی تھا کہ وہ اپنی آمدنی کا کچھ حصہ مذہب کی اشاعت کے لئے دے۔ محض اسی ذریعہ سے ان کا بجٹ لاکھوں تک پہنچ گیا تھا اور اس کی وجہ سے ان کو تبلیغ واشاعت کے کام میں (جس میں وہ مالی امداد کی ترغیب دے کر ناواقف اور ضرورت مند لوگوں کو آسانی کے ساتھ شکار کرلیتے تھے) بڑی سہولت تھی۔ مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک معتمد خاص حاجی لیاقت حسین بھاگلپوری کو ایک خط میں بڑی دردمندی کے ساتھ ان حالات کی طرف متوجہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "ان کی سعی اور کوشش اس قدر انتھک اور منظم ہے جس کو دیکھ کر ایک مسلمان کا دل لرز جاتا ہے کہ الٰہی یہ کیا طوفان کفر اور سیلاب ارتداد ہے، اس کو روکنے کی کیا صورت ہو، ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں جہاں ان کے لوگ تبلیغ نہ کرتے ہوں، اور ہندوستان کے علاوہ یورپ، انگلستان، جرمنی، امریکہ اور جاپان میں بڑے زوروں اور نہایت نظم سے اپنے مذہب کی اشاعت کر

(۱) صحیفۂ رحمانیہ

رہے ہیں........ ان کے پاس بنک نہیں، کوئی ریاست نہیں، صرف ایک بات ہے کہ مرزا نے کہہ دیا ہے کہ ہر مرید حسب استطاعت ماہانہ مذہب کی اشاعت کے لئے کچھ دے، اور جو ۳ ماہ تک کچھ نہ دے گا وہ بیعت سے خارج ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بیت المال میں لاکھوں روپیہ جمع ہوگیا، اور ان کا ہر مرید اپنی آمدنی کا کم ازکم دسواں حصہ دیتا ہے، اور بعض تو تہائی اور چوتھائی قادیان بھیجتے رہتے ہیں، جس سے وہ خاطر خواہ اپنے مذہب کی اشاعت کر رہے ہیں (۱)

یہی وہ موڑ تھا جہاں مولانا اپنی ساری صلاحیتوں کے ساتھ میدان میں اتر آئے، اور اپنا سارا وقت اور ساری قوت اس کے لئے وقف کر دی، اور اپنے تمام مریدین و مسترشدین، رفقاء اور اہل تعلق کو اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی تلقین کی، اور صاف صاف کہا کہ جو اس معاملہ میں میرا ساتھ نہ دے گا، میں اس سے ناخوش ہوں (۲)

اس اثناء میں یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ مراقبہ میں مولانا کو یہ القا ہوا کہ یہ گمراہی تیرے سامنے پھیل رہی ہے اور تو ساکت ہے، اگر قیامت کے دن بازپرس ہو تو کیا جواب ہو گا (۳)

ایک اہم تاریخی مناظرہ

اس جدوجہد کا آغاز ایک اہم تاریخی مناظرہ سے ہوا جس میں قادیانیوں کی ایسی شکست فاش ہوئی کہ انہوں نے دوبارہ میدان میں آنے کی جرأت نہ کی۔ مناظرہ کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ادھر مناظرہ شروع ہوا اور ادھر مولانا سجدہ میں گر پڑے، اور جب تک فتح کی خبر نہ آئی سر نہ اٹھایا۔ اس مناظرہ کی مختصر روداد مولانا کے صاحبزادہ مولانا منت اللہ رحمانی نے قلمبند کی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"مرزا صاحب کے نمائندے حکیم نور اللہ صاحب، سرور شاہ صاحب، اور روشن علی صاحب مرزا صاحب کی تحریر لے کر آئے کہ ان کی شکست میری شکست ہے اور ان کی فتح میری فتح۔ اس طرف سے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبد الوہاب

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۲۷۵ (۲) کمالات محمدیہ، ص ۲۷۵ (۳) کمالات محمدیہ، ص ۴۲

بہاری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ (تقریباً چالیس علماء) بلائے گئے تھے، لوگوں کا بیان ہے کہ عجیب منظر تھا۔ صوبہ بہار کے اضلاع کے لوگ تماشائی بن کر آئے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ خانقاہ(۱) میں علماء کی ایک بڑی بارات ٹھہری ہوئی ہے، کتابیں الٹی جارہی ہیں، حوالے تلاش کئے جارہے ہیں اور بحثیں چل رہی ہیں، سوال یہ پیدا ہوا کہ مولانا محمد علی کی طرف سے مناظرہ کا وکیل اور نمائندہ کون ہو؟ قرعۂ فال مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کے نام پڑا، آپ نے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو تحریراً نمائندہ بنایا۔ علماء کی یہ جماعت میدان مناظرہ میں گئی وقت مقرر تھا۔ اس طرف مولانا مرتضیٰ حسن صاحب اسٹیج پر تقریر کیلئے آئے اور اس طرف آپ سجدہ میں گئے اور اس وقت تک سر نہ اٹھایا جب تک فتح کی خبر نہ آگئی۔ بوڑھوں کا کہنا ہے کہ میدان مناظرہ کا منظر عجیب تھا۔ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کی ایک ہی تقریر کے بعد جب قادیانیوں سے جواب کا مطالبہ کیا گیا تو مرزا صاحب کے نمائندے جواب دینے کے بجائے انتہائی بدحواسی اور گھبراہٹ میں کرسیاں اپنے سروں پر لئے یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ "ہم جواب نہیں دے سکتے" (۲)

قادیانیت کے خلاف زبردست مہم

اس مناظرہ کے بعد مولانا نے قادیانیت کے خلاف باقاعدہ اور منظم طریقہ پر زبردست مہم شروع کی، اس کے لئے دورے کئے، خطوط لکھے، رسائل اور کتابیں تصنیف کیں، دہلی اور کانپور سے کتابیں طبع کرواکے مونگیر لانے اور اشاعت کرنے میں خاصا وقت صرف ہوتا تھا اور حالات کا تقاضا یہ تھا کہ اس میں ذرا بھی سستی اور تاخیر نہ ہو، اس لئے مولانا نے خانقاہ میں ایک مستقل پریس قائم کیا، اس پریس سے (اور کتابوں کے علاوہ) سو سے زائد چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہوئیں جو سب مولانا کے قلم سے ہیں۔ ایک صاحب (مولوی نظیر احسن صاحب بہاری) جن کا خط پاکیزہ تھا صرف اس کام پر مامور تھے کہ وہ مسودات صاف کریں، وہ دونوں پیروں سے مفلوج تھے، اگر کبھی مسودات صاف کرنے میں تاخیر ہو جاتی تو مولانا ان سے فرماتے کہ:۔

---

(۱) خانقاہ رحمانی (۲) مقالہ متعلقہ سوانح ص ۲۶

"محنت سے کام کرو، تمہیں جہاد کا ثواب ملے گا" ایک مرتبہ مولوی صاحب نے پوچھا کہ "کیا مجھ کو جہاد بالسیف کا ثواب ہوگا" فرمایا: بیشک! اس فتنۂ قادیانیت کا استیصال جہاد بالسیف سے کم نہیں" (۱)

تہجد کے وقت تصنیف

مولانا کا معمول تھا کہ تین بجے تہجد کے لئے اٹھ جاتے تھے اب یہ تہجد کا وقت بھی مولانا نے رد قادیانیت کے لئے وقف کر دیا، اکثر یہ وقت تصنیف میں گزرتا۔ بعض دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ مولانا تہجد چھوڑ کر رد قادیانیت پر کتابیں لکھا کرتے تھے۔ مریدین واہل تعلق میں جو اہل علم حضرات تھے ان کو بھی اس بات پر آمادہ کرتے رہتے کہ وہ قادیانیت کے رد میں رسائل اور کتابیں لکھیں۔ غرض اس سلسلہ کی جو بھی کوشش ان کے لئے ممکن تھی اس میں انہوں نے کوئی کسر باقی نہ چھوڑی، اور ان ساری صلاحیتوں وقوتوں اور ذرائع ووسائل کو پوری طرح سے استعمال کیا جو ان کے دسترس میں تھے، حاجی لیاقت حسین بھاگلپوری کو ایک مفصل خط کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

"تم کو چاہئے کہ اپنے تمام گاؤں کے بھائیوں اور جو لوگ تمہارے زیر اثر ہیں ان کو اس کام میں نظام کے ساتھ متوجہ کرو، یہ میری تحریر معمولی نہیں ہے، یہ کام تو خدا چاہے ہوگا اور ضرور ہوگا، دیکھئے کہ کون اس خدائی کام کو انجام دیتا ہے اور کون اس سے محروم رہتا ہے" (۲)

مولانا نے اپنے مریدین سے کبھی چندہ نہیں لیا اور نہ اس کو پسند کرتے تھے، بلکہ جب بھی موقع ملتا خود ان کی امداد میں پیش قدمی کرتے، یہاں تک کہ اپنے خاص معتمدین اور خدام سے بھی فرمائش کرنے کے روادار نہ ہوئے، لیکن اس موقع پر انہوں نے اپنے مزاج کے خلاف بہت صفائی کے ساتھ اپنے مریدین کو مالی تعاون پر بھی آمادہ کیا۔ حاجی صاحب موصوف کو اپنے ضعف وعلالت کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:۔

"الحمد للہ! میں بالکل سفر آخرت کے لئے تیار ہوں، اور یہ کام نہایت ضروری ہے۔ میں نے کبھی تم سے کسی قسم کا چندہ نہ لیا، نہ کسی چیز کی فرمائش کی،

---

(۱) مقالہ متعلقہ سوانح، ص، ۲۷۰ (۲) کمالات، ص، ۲۷۷

مگر اب یہ کام اس قدر ضروری ہے کہ بے کہے بات نہیں بنتی"

اس خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"جب لوگ کفر اور ارتداد اپنا جان ومال قربان کر کے خریدتے ہیں تو تعجب ہے کہ سچے مسلمان دین کی خدمت کے لئے تھوڑا سا اپنے "ہاتھ کا میل" بھی نہ دے سکیں"(۱)

ایک عقیدت مند کو جنہوں نے حاجی لیاقت حسین کو اس کام کے لئے کچھ رقم پیش کی تھی شکریہ کا خط لکھتے ہیں:۔

"تم نے جو کچھ عزیزی لیاقت حسین کو نہایت ضروری دینی کام کے لئے دیا وہ اس فقیر کو پہنچا، اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا کافی بدلہ دونوں جہاں میں عنایت کرے، تم جانتے ہو کہ میں نے یا میرے خاص آدمی نے کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا........اس وقت میاں لیاقت حسین تین سو سے کچھ زائد روپیہ لائے، جنہوں نے نہایت خوشی سے روپیہ دیا، اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے خوش ہوئے، اور یہ فقیر بھی ان سے بہت خوش ہوا، میں تمہیں اس سے بھی آگاہ کرتا ہوں کہ اس وقت جھوٹ بہت شائع ہے اور دینی حمیت جاتی رہی ہے، اس لیے اکثر دینی کام میں صرف کرنا نہیں چاہتے، اور دینی کام کرنے والوں کو الزام لگا کر دوسروں کو بھی روکتے ہیں"(۲)

مولانا عبدالرحیم صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"تم سے جہاں تک ہو سکے اس گمراہ(۳) کا پیچھا کرو، جہاں جہاں وہ جائے تم بھی جاؤ، اور دو باتیں کرو اوّل یہ کہ جو غرباء ومعذورین یہاں نہ آسکیں ان کو ہماری طرف سے بیعت کرو اور "سلسلۂ رحمانیہ" میں داخل کر کے انہیں ایسی ہدایت کرو کہ وہ اس سلسلہ کے عاشق ہو جائیں اور کسی گمراہ کی باتوں کا ان پر اثر نہ ہو۔ دوئم یہ کہ میں تم سے زبانی بھی کہہ چکا ہوں اور اس وقت خاص کر تم کو لکھ رہا ہوں تاکہ خوب مستعدی سے کام کرو، اور دیکھو محض اللہ تعالیٰ کے

---

(۱) کمالات ص۲۷۶ (۲) کمالات ص۲۷۹ (۳) کچھ قادیانی مبلغ گوگری ضلع مونگیر اور اس کے آس پاس رسائل وغیرہ تقسیم کر رہے تھے ان میں غالباً سعید مختار بھی تھا جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ ۱۲

واسطے کرو، جب انسان اللہ تعالیٰ کا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سب کاموں کا کفیل ہو جاتا ہے" (۱)

چونکہ مولانا نے اس سے پہلے کبھی اس قسم کے مالی تعاون کی اپیل نہیں کی تھی، اس لئے اس کا بھی بہت اثر پڑ رہا تھا، اور ہر شخص اس مہم میں مالی طور پر حصہ لینے کے لئے کوشاں تھا۔

فیصلۂ آسمانی

مولانا کی سب سے پہلی اور سب سے اچھی تصنیف "فیصلۂ آسمانی" ہے جو قادیانیوں کے حق میں واقعی "فیصلۂ آسمانی" ثابت ہوئی، یہ کتاب تین جلدوں میں ہے، اس کے تین ایڈیشن مولانا کی زندگی ہی میں شائع ہو گئے، لیکن کسی قادیانی کو اس کا جواب دینے کی ہمت نہ ہوئی مولانا کی وفات کے بعد بھی کسی قادیانی نے اس کا جواب دینے کی جرأت نہ کی۔ اس راہ کے نشیب و فراز کو دیکھے ہوئے اور اس کے ایک بڑے مبصر (۲) کی رائے یہ ہے کہ قادیانیت کے رد میں لکھی ہوئی اکثر کتابوں میں بعض جگہ احتمال کی گنجائش نکل آتی ہے لیکن اس کتاب میں کسی جگہ احتمال کی گنجائش، یا استدلال میں کوئی خامی اور کمزوری نظر نہیں آتی۔ مولانا اس مسئلہ پر فیصلۂ آسمانی حصہ اوّل میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"حضرت مسیح اور حضرت مہدی کے آنے کی خبر حدیثوں میں اس قدر آئی ہیں، اور مشہور ہیں کہ ہر خاص و عام جانتا ہے، مگر شاذ و نادر بہت سے سچے مسلمان اس کے منتظر ہیں، خصوصاً اس نازک وقت میں کہ مسلمانوں کی دینی و دنیاوی ہر طرح کی حالت نہایت خراب بلکہ معرض زوال میں ہو رہی ہے۔ ایسے وقت میں حضرت مسیح کے آنے کا ثمرہ نہایت ہی مسرت بخش (۳) ہو سکتا ہے"

کتاب کی تمہید میں مولانا لکھتے ہیں:۔

"ایک مختصر بات عام فہم کہنا چاہتا ہوں اسے ملاحظہ کیا جائے۔ حضرت مسیح کے آنیکی خبر جناب سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دی، اور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین اور تمام علماء دین نے اس پر یقین کیا، اس سے ظاہر ہے کہ بڑی

---

(۱) خطوط بنام مولانا عبد الرحیم صاحب ص ۳ (۲) حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری۔ ۱۲
(۳) فیصلہ آسمانی ص۔

مہتم بالشان خبر ہے، اور نہایت ظاہر ہے کہ یہ اہتمام اور شان صرف اس وجہ سے ہے کہ ان کی ذات مقدس سے دینی فائدہ بہت کچھ ہو گا، مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی حالت ان کی برکت سے درست ہو جائے گی۔ صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں بغض وعداوت نہ رہے گا، روپے پیسے کی وہ کثرت ہوگی کہ کسی مسلمان کو ہدیہ اور تحفہ لینے کی طرف توجہ نہ ہوگی، دنیا بھر میں دین اسلام کو غلبہ ہو گا، ان میں سے کسی بات کا شائبہ بھی مرزا صاحب کے وجود سے نہیں پایا گیا، بلکہ سب باتیں برعکس ہیں۔ غور سے دیکھا جائے کہ مسلمانوں میں کس قدر بغض وعداوت ہے، کس قدر افلاس ہے، اور دنیا میں کس قدر تفریق ادیان ہے، اور پھر یہ کہ اسلام کس قدر ضعیف ہو گیا ہے(۱)

آگے ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

”اگر مرزا صاحب اپنے دعوے میں سچے ہوتے تو ان کے صحبت یافتہ زمانہ کے لوگوں سے نرالا ڈھنگ رکھتے کہ ہر طرف قبولیت کی نگاہ ان پر پڑتی، مگر حالت برعکس ہے“(۲)

مولانا لکھتے ہیں کہ دوسرا طریقہ علماء کے لئے ضرور مفید ہے لیکن عام مسلمانوں کی اصلاح کے لئے زیادہ کارگر نہیں ہوسکتا ہے۔ چنانچہ مولانا نے کتاب کے پہلے حصے میں یہی آخری طریقہ اختیار کیا ہے، اور ان کے نجی حالات اور اقوال و پیشگوئیوں کو ان کے برسرِ حق یا برسرِ باطل ہونے کا معیار بنایا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

”سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ سچائی میں سب سے اول درجہ رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر ذرا بھی سچائی میں گرا ہوا پائیں تو اس سے اجتناب کریں۔ میں نے اس رسالہ میں اسی طریقے کو اختیار کیا ہے کہ خاص وعام اس سے مستفید ہوں اور بذات خود فیصلہ کرسکیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارے صدق یا کذب کو جانچنے کے لئے ہماری پیش گوئی سے بڑھ کر اور کوئی امتحان نہیں ہوسکتا (آئینہ کمالات اسلام ص ۲۸۸) اس لئے میں نے ان کی پیش گوئیوں پر نظر کرنا مناسب سمجھا، اور پیش گوئیوں میں اس پیش گوئی کو اختیار کیا جو ان کے

(۱) فیصلہ آسمانی ص ۴۔ (۲) فیصلہ آسمانی ص ۵

(مرزا صاحب کے) نزدیک نہایت عظیم الشان ہے اور جس کی شرح سے ان کے ذاتی تقدس کا حال طالب حق روشن دلیل سے معلوم کر سکیں" (۱)

کتاب کا پہلا حصہ مرزا صاحب کی "منکوحہ آسمانی" سے متعلق ہے، اور اس میں تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ان کے سارے الہامات اور پیش گوئیوں کو حقیقت اور واقعہ کے لحاظ سے اس طرح غلط اور جھوٹا ثابت کیا گیا ہے کہ کوئی انصاف پسند اور غیر جانبدار انسان مطمئن ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دوسرے اور تیسرے حصوں میں ان کی مزید غلط بیانیوں اور دعووں کا پردہ فاش کیا ہے، اور آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ ﷺ، دلائل عقلیہ، حالات موجودہ اور واقعات گذشتہ ہر پہلو سے ان کے کذب وافترا، غلط بیانی اور فریب دہی کے ایک ایک جزء کی تشریح کی ہے اور ان کے سارے دلائل کا مکمل پوسٹ مارٹم کیا ہے۔

دوسرے حصہ میں خود مرزا صاحب کی زبان سے ایسے اقوال پیش کئے ہیں جو ان کے خلاف پڑتے ہیں اور وہ ان کے کاذب یا صادق ہونے کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی ہیں، نیز ان باتوں کی تردید کرنے میں جو مرزا صاحب نے قرآن وحدیث کی طرف منسوب کی ہیں، اور قرآن وحدیث ان سے بری ہے اس کتاب کے مطالعہ سے مولانا کے وسعت علم ومطالعہ، معاملہ فہمی اور دقیقہ رسی، حقیقت پسندی اور دلنشین وموثر اور سادہ طرز تحریر کا پورا اندازہ ہوتا ہے جو کتاب کی ایک ایک سطر سے نمایاں ہے، کسی گنجلک اور پیچیدہ طرز تحریر، کمزور استدلال یا کسی الجھانے والے مسئلہ سے کتاب بالکل پاک ہے، اور یہی کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت اور قیمت ہے۔ مرزا صاحب نے اپنے کمال واعجاز کے ثبوت کے لئے "اعجاز احمدی" لکھی یا لکھوائی تھی اور اس کا دعویٰ کیا تھا کہ اس رسالہ اور قصیدہ اعجازیہ کی ادبی بلاغت اور فنی کمال کی نظیر کوئی دوسرا پیش نہیں کر سکتا۔ مولانا نے اس قصیدہ کا بہت پُرلطف قصہ بیان کیا ہے اور اس سارے جال کا تار و پود بکھیر دیا ہے جو مرزا صاحب نے علماء اور عام مسلمین دونوں کو بیک وقت فریب دینے کے لئے پھیلایا تھا، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ اس جال میں خود ہی گرفتار ہوگئے، اور یہ تدبیر ان کے لئے الٹی پڑ گئی۔

مرزا صاحب نے ۵؍ نومبر ۱۸۹۹ء میں یہ علان کیا تھا کہ:۔

"اے میرے مولا! اگر میں تیرے حضور میں سچا ہوں تو ان تین سالوں

(۱) فیصلہ آسمانی، ص ۶،

کے اندر جو جنوری ۱۹۰۰ء سے آخر دسمبر ۱۹۰۲ء تک ہو جائیں گے کوئی ایسا نشان دکھلا جو انسانی ہاتھوں سے بالاتر ہو، اگر تین برس کے اندر میری تائید اور تصدیق میں کوئی نشان نہ دکھلادے، تو میں نے اپنے لئے یہ قطعی کر لیا ہے کہ اگر میری یہ دعا قبول نہ ہو تو میں ایسا مردود اور ملعون اور کافر اور بے دین اور خائن ہوں جیسا کہ مجھے سمجھا گیا"

مولانا لکھتے ہیں:۔

"اس دعا کے بعد (مرزا صاحب) تین برس تک اسی فکر و تجویز میں رہے کہ کوئی نشان تراش کر مسلمانوں کو دکھایا جائے تا کہ میں اپنے اقرار سے ملعون و کافر قرار نہ پاؤں، میرے خیال میں انہوں نے یہ تدبیر سوچی کہ ہندوستان میں عربی ادب کا مذاق نہیں ہے اس لئے ایک عربی قصیدہ لکھوا کر اور اس کی تمہید اردو میں لکھ کر رسالہ شائع کر کے اعجاز کا دعویٰ کیا جائے۔ اس زمانہ میں ایک عرب طرابلس کے رہنے والے ہندوستان میں آئے ہوئے تھے، جا بجا وہ پھرتے رہے اور حیدر آباد میں ان کا قیام زیادہ رہا ہے، یہ عربی کے شاعر تھے اور مزاج میں آزادی بھی شاعروں کی سی رکھتے تھے۔ اس شہر میں مرزائی زیادہ ہیں، انہوں نے مرزا صاحب سے ربط کرا دیا اور خط و کتابت ہونے لگی۔ انہوں نے قصیدہ کی فرمائش کی، عرب صاحب نے روپیہ لے کر قصیدہ لکھ دیا۔۔۔

۔۔۔۔۔ مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوری کہتے ہیں کہ حیدر آباد میں میں نے اس سے ادب کی بعض کتابیں پڑھی ہیں، بڑا ادیب تھا کہتا تھا کہ مجھے روپیہ کی ضرورت پیش آئی تھی، میں نے مرزا کو لکھا، اس نے قصیدہ لکھوایا میں نے لکھ دیا، اس نے روپے مجھے دیئے"(۱)

اس شخص نے جان بوجھ کر کچھ ایسی غلطیاں بھی قصیدہ میں شامل کر دی تھیں، جو اہل زبان سے مستبعد ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:۔

"سعید (شاعر کا نام) مرزا کو جھوٹا جانتا تھا، اور یہ بھی جانتا تھا کہ عربی ادب سے مرزا کو مس نہیں ہے اس لئے اس نے قصداً یہ غلطیاں رکھیں تا کہ اہل

---

(۱) فیصلہ آسمانی، ص ۵۹

علم اس سے واقف ہو کر اس کی تکذیب کریں۔ چونکہ عرصہ تک ہند میں رہا ہے اور بعض علوم عقلیہ اس نے یہاں پڑھے ہیں۔ اس لئے وہ ہندی محاورات سے بھی واقف تھا۔ اس لئے مرزا صاحب کو فریب دیا، اور بعض ہندی الفاظ بھی قصیدہ میں داخل کر دیئے الحاصل یہ قصیدہ مرزا صاحب کا اعجاز نہیں ہے اگر اسے اعجاز کہا جائے تو سعید شامی کا اعجاز ہوگا"(۱)

غرضیکہ کتاب کے تینوں حصوں میں مرزا صاحب کی ایک ایک دلیل، ایک ایک اعجاز اور الہام و پیش گوئی کو لے کر عقل و نقل ہر پہلو سے اس پر کلام کیا ہے، اور بغیر کسی جارحیت اور جذباتیت کے اس پر علمی طور پر ایسی تنقید کی ہے جو ہر طبع سلیم کے لئے قابل قبول ہو۔ فیصلۂ آسمانی کا تیسرا حصہ پہلی مرتبہ ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء میں چھپا تھا اور اس میں مرزائیوں کو چیلنج کیا گیا تھا کہ وہ اس کا جواب دیں۔ ۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا، اور اس میں اعلان کیا گیا کہ جو شخص اس کتاب کا جواب دے گا اس کو تین ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا لیکن کسی ایک قادیانی نے بھی اس کا جواب دینے کی ہمت نہ کی۔ فیصلۂ آسمانی کا خلاصہ انگریزی میں بھی کیا گیا، لیکن شاید اس کے شائع ہونے کی نوبت نہ آسکی۔

شہادت آسمانی

مولانا کی دوسری اہم تصنیف "شہادت آسمانی" ہے۔ یہ دو حصوں میں ہے "پہلی شہادت آسمانی" اور "دوسری شہادت آسمانی" ۱۳۱۲ھ کے رمضان میں چاند اور سورج میں ایک ساتھ گہن ہوا۔ مرزا صاحب نے اس واقعہ کو بڑے فخر سے اپنے حق میں ایک آسمانی شہادت کے طور پر اپنی مہدویت کے ثبوت میں پیش کیا، اور یہ اعلان کیا کہ:۔

"حدیث میں آیا ہے کہ ان دونوں گہنوں کا اجتماع امام مہدی کی علامت ہے۔ اس لئے مرزا صاحب کی مہدویت ثابت ہوگئی"

ساتھ میں انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ:۔

"رمضان میں ان دو گہنوں کا اجتماع کسی مدعی مسیحیت کے زمانہ میں نہیں ہوا، صرف ان ہی کے عہد میں ہوا ہے" قادیانیوں میں اس بات کا بڑا ذکر تھا،

---

(۱) فیصلہ آسمانی، ص ۶۰

اور وہ اس کو ہر جگہ مرزا صاحب کی صداقت کے ثبوت میں پیش کیا کرتے تھے۔ مولانا نے یہ کتاب "شہادت آسمانی" دراصل اسی خیال کی تردید میں لکھی ہے، اور بہت مدلل طریقے پر ان کے دعویٰ کو غلط ثابت کیا ہے۔ سب سے پہلے مولانا نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس دعوے کی بنیاد مرزا صاحب نے جس حدیث پر رکھی ہے وہ حدیث اس لائق ہرگز نہیں ہے کہ اس سے یہ عقیدہ ثابت کیا جائے کہ مہدی موعود کے وقت میں ایسے گہنوں کا ہونا ضروری ہے، اور وہ گہن امام مہدی کی علامت ہیں۔

دوسری بات انہوں نے یہ ثابت کی ہے کہ ۱۳۱۲ھ کا گہن ایک معمولی گہن تھا، جو اپنے وقت پر ہوا، اور اس طرح کے گہن پہلے بھی ہو چکے ہیں۔ چنانچہ پہلے اپنے قول کی تائید میں ایک ماہر ہیئت مسٹر کیستھ کی کتاب (USE OF GLOBE) جو لندن میں ۱۸۶۹ء میں چھپی، اور ایک ضخیم فارسی کتاب "حدائق النجوم" جو ہیئت فیثاغورثی کے بیان میں ہے، اور ۱۱۵۸ر صفحات پر مشتمل ہے پیش کی............ انہوں نے لکھا ہے کہ:۔

"مسٹر کیستھ نے سو برس (یعنی ۱۸۰۱ء سے ۱۹۰۰ء تک) کی فہرست دی ہے اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سو برس کے عرصہ میں سورج اور چاند کا مشترکہ گہن رمضان المبارک میں پانچ مرتبہ ہوا ہے.... حدائق النجوم کی فہرست میں تریسٹھ سال کے اندر رمضان المبارک میں تین گہنوں کا اجتماع لکھا ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے کتاب سے ۴۶ برس کی فہرست نقل کی ہے، اور لکھا ہے کہ:۔

"یہ کتاب عرصہ دراز ہوا طبع ہوئیں لیکن اب تک کسی نے ان پر غلطی کا الزام نہیں لگایا" پھر انہوں نے یہ دکھایا ہے کہ:۔

"۱۲۶۸ھ میں گہنوں کا پہلا اجتماع ہوا، اور ان گہنوں کی تاریخ وہی ۱۳، اور ۲۸، رمضان ہے، جن تاریخوں کو مرزا صاحب مہدی کا نشان کہتے ہیں، اس گہن کے دیکھنے والے اب بھی موجود ہیں، اس وقت مرزا صاحب کی عمر گیارہ برس کی ہوگی۔ ۱۳۱۱ھ کے رمضان میں اس گہن کا ظہور امریکہ میں ہوا اس وقت مسٹر ڈوی مدعی مسیحیت وہاں موجود تھا۔"

مولانا لکھتے ہیں کہ :۔

"مرزا صاحب نے اس گہن کو بھی اپنی تائید میں پیش کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ مہدی کے وقت میں دو گہن ہوں گے۔ حالانکہ کسی حدیث میں یہ مضمون نہیں ہے اس صریح جھوٹ کے علاوہ اس گہن کا وجود ہندوستان میں نہیں ہوا جہاں مرزا صاحب کا وجود ہے، بلکہ اس ملک میں ہوا جہاں ان کی طرح ایک دوسرا مدعی رسالت موجود ہے" (۱)

۱۳۱۲ھ میں تیسرا گہن ہوا اور یہی وہ گہن ہے جسے مرزا صاحب نے اپنی مہدویت کے ثبت میں پیش کیا ہے......... مولانا آگے لکھتے ہیں :۔

"یہ گہن اس حدیث کا مصداق کس طرح ہوسکتا ہے جس کی نسبت حدیث (دار قطنی) میں نہایت صاف طور سے ارشاد ہے :۔

لم یکونا منذ خلق اللّٰہ السموات و الارض ....اس جملہ کے معنی یہ ہیں کہ جب سے آسمان وزمین اللّٰہ تعالیٰ نے پیدا کئے اس وقت سے (لے کر اس مہدی کے وقت تک) ایسا چاند گہن اور سورج گہن کبھی نہ ہوا ہوگا، یعنی وہ دونوں گہن ایسے بے مثل اور بے نظیر ہوں گے کہ اس سے پہلے کسی وقت ان کی نظیر نہیں مل سکتی" (۲)

اس کے بعد انہوں نے بہت تفصیل سے یہ ثابت کیا ہے کہ امام مہدی کی جو خصوصیات و صفات احادیث میں بیان کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی مرزا صاحب پر منطبق نہیں ہوتی۔ مولانا کی اس تصنیف "شہادت آسمانی" کا طرز استدلال اور اسلوب بیان فیصلہ آسمانی سے بہت ملتا جلتا ہے۔ دلائل کی مضبوطی، مستند تاریخی حوالوں اور واقعات سے استدلال، اور حدیث و قرآن سے اس طرح استنباط کہ کسی شک و شبہ، احتمال آفرینی، اور بے یقینی کی گنجائش باقی نہ رہے اور دوبارہ استفسار و سوال کی ضرورت ہی پیش نہ آئے اور مخالفین اس سے کوئی غلط فائدہ نہ اٹھا سکیں، مولانا کے اسلوب کی خصوصیت ہے۔ لیکن رد قادیانیت کے سلسلہ میں یہ اسلوب اور طرز تصنیف بہت نمایاں ہوکر اور نکھر کر سامنے آیا ہے۔

مولانا کی دوسری تصنیفات پر ایک نظر

اس کے علاوہ مولانا کی جو تصنیفات رد قادیانیت میں ہیں ان میں "چشمہ ہدایت" "چیلنج

(۱) دوسری شہادت آسمانی، ص ۲۶، ۲۷   (۲) دوسری شہادت آسمانی ص ۲۷

محمد یہ" "معیار صداقت" "معیار المسیح" "تنزیہ ربانی" "آئینہ کمالات مرزا" "نامہ حقانی" زیادہ مشہور اور ممتاز ہیں۔ کل کتابوں کی تعداد ۵۰ کے قریب ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے رسائل بھی ہیں جو پہلے چھپے تھے اس کے بعد ختم ہوگئے، اور پھر چھپنے کی نوبت نہ آسکی، اور اب ان کا سراغ لگانا بھی آسان نہیں۔

دراصل مولانا نے تنہا وہ کام کیا جو ایک اکیڈمی بھی اتنے بہتر اور کامیاب طریقہ پر نہیں کرسکتی۔ قادیانیت کے خلاف یہ سارا لٹریچر مولانا ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہے، اور انہوں نے اس کے خلاف مکمل مواد فراہم کردیا ہے، اور اس کے ہر ہر پہلو کا پورا تجزیہ کیا ہے۔ رسالہ "چیلنج محمد یہ" عربی، فارسی اور اردو تین زبانوں میں ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا، اور اس کی خوب اشاعت ہوئی۔ ایڈیٹر "الفضل" اور خلیفہ قادیان کو کئی مرتبہ بھیجا گیا لیکن مسلسل سکوت کے سوا اور کوئی جواب نہ ملا۔ اس میں مرزا صاحب کو خود ان کی زبان سے جھوٹا ثابت کیا گیا ہے۔

"چشمہ ہدایت" کے آخر میں اعلان کیا گیا کہ جو اس کا جواب دے گا اس کو دس ہزار روپیہ پیش کیا جائے گا۔ اس رسالہ میں مرزا صاحب کے ۱۸ اقوال نقل کئے ہیں اور اس سے ان کو مفتری اور کاذب ثابت کیا ہے، بار بار چیلنج کے بعد بھی کسی نے اس کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی۔ ایک عام فہم اور واضح دلیل جس کا مولانا نے تقریباً اپنی ہر کتاب اور ہر رسالہ میں ذکر کیا ہے، اور قادیانیوں کو سوچنے کی دعوت دی ہے۔ وہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ مہدی علیہ السلام کے نزول کی علامت یہ ہے کہ تمام کافر اسلام لے آئیں گے، اور دنیا سے فسق وفجور اٹھ جائے گا۔ وہ انصاف پسند اور سنجیدہ ذہن لوگوں سے اپیل کرتے ہوئے بار بار کہتے ہیں کہ غور کرو مرزا صاحب کے آنے سے کیا یہ بات حاصل ہوئی؟ جو انہوں نے بیان کی ہے۔

"معیار صداقت" میں لکھتے ہیں:۔

> "ایک فتوی مرزا صاحب اور ان کے خلیفہ اور صاحبزادہ کا یہ ہے کہ جو کوئی مرزا صاحب پر ایمان نہیں لایا وہ کافر ہے، اس کے پیچھے نماز ہرگز جائز نہیں ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں جو تقریباً ۲۴ کروڑ مسلمان تھے وہ مرزا صاحب کے وجود سے سب کافر ہوگئے بجز قلیل گروہ کے، اور کوئی

کافر مسلمان نہیں ہوا۔"(۱)

قادیانیوں نے آخر میں قرآن مجید کی آیت سے استدلال کرنے کی کوشش کی، اور توڑ موڑ کر اس کے معنی بیان کرنے شروع کئے مولانا نے اس کے رد میں "معیار المسیح" کے نام سے ایک رسالہ لکھا اور ایک ایک دلیل کو لے کر اس کی غلطی ظاہر کی۔ مولانا کے ان رسائل کے جواب میں سب قادیانیوں نے مل کر ایک رسالہ "اسرار نہانی" لکھا، اور اپنی ناکامی کو چھپانے کیلئے مولانا کو خاص طور پر ہدف بنایا اور کوشش کی کہ عام مسلمان مولانا سے بدظن ہو جائیں، اس کے بعد ان کو مرزا صاحب کی طرف متوجہ کرنا آسان ہو گا۔ اس کیلئے انہوں نے دو تنخواہ دار مبلغین رکھے، اور ان کے ذمہ یہ کام کیا کہ وہ گاؤں گاؤں پھر کر سیدھے سادے مسلمانوں کے دلوں میں مولانا سے نفرت پیدا کریں، اور ان کی زندگی کو ان کے سامنے گھناؤنا بنا کر پیش کریں تاکہ ان کی وقعت اور محبت لوگوں کے دلوں سے نکل جائے جو قادیانت کے راستہ میں ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے، مولانا نے مولانا عبدالرحیم مونگیری کے نام ایک طویل مکتوب میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے نیز "صحیفہ رحمانیہ" میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے:۔

"چونکہ اس جماعت کو خدا سے واسطہ نہیں ہے اس لئے جواب سے عاجز ہو کر فحش کلامی اور بے ہودہ گوئی کرنے حضرت مخدوم بہاری حضرت مجدد الف ثانی علیہما الرحمتہ وغیرہ بزرگوں کو در پردہ اور حضرت مولف فیصلہ آسمانی کو علانیہ گالیاں دینا اور عوام کو بہکانا شروع کیا ہے۔"(۲)

"مرزائی نبوت کا خاتمہ" نامی ایک رسالہ مولانا نے اور لکھا اور ختم نبوت کو ثابت کیا، یہ رسالہ ۱۹۱۴ء میں دہلی میں شائع ہوا۔ ۱۹۲۵ء میں اس کا دوسرا اڈیشن شائع ہوا، لیکن کوئی قادیانی اس کا جواب نہ دے سکا۔ قادیانیوں کی طرف سے ایک دلیل یہ بھی دی جانے لگی تھی کہ:۔

"مدعی کاذب اور مفتری نہ باقی رہ سکتا ہے نہ پھل پھول سکتا ہے، لیکن مرزا صاحب کو برابر کامیابی ہو رہی ہے، اور لوگ ان کے دائرہ میں داخل ہو رہے ہیں، اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مرزا صاحب حق پر ہیں"۔

---

(۱) معیار صداقت، ص ۱۶۔ مطلب یہ ہے کہ مہدی علیہ السلام کے آنے پر تو ان کی موجودگی میں ساری دنیا مسلمان ہو جائے گی لیکن مرزا آنجہانی نے اپنے وقت کے ۲۳ کروڑ مسلمانوں کو کافر بنا دیا یہ کیسے مہدی موعود اور مسیح موعود ہوئے (ارشد) (۲) "صحیفہ رحمانیہ" نمبر ۱۱، ۱۲

اس کے رد میں مولانا نے ایک رسالہ "عبرت خیز" لکھا، اور اس غلط خیال کی تردید کی، اور قرآن مجید، اور تاریخ و واقعات کے حوالہ سے اس دعویٰ کی کمزوری واضح کی۔

مکتوب بنام استاد فرمانروائے دکن

خواجہ کمال الدین نے حیدر آباد میں زور و شور سے قادیانیت کی تبلیغ شروع کی تھی، اور اس کے لئے ایسا اسلوب اختیار کیا تھا کہ لوگوں کے جذبات بھی زیادہ مجروح نہ ہوں اور وہ تدریجی طور پر قادیانیت کو قبول کرنے کیلئے تیار بھی ہوسکیں۔ انہوں نے "صحیفۂ آصفیہ" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا اور اس میں بڑی چابک دستی کے ساتھ مولانا ہی کے الفاظ میں زہر کی تخم پاشی کی۔ بدقسمتی سے ان کے دربار میں تقرب حاصل ہو گیا، اور دوسری طرف انہوں نے یہ اعلان شروع کیا، کہ ہمارا مقصد صرف اشاعت اسلام ہے۔ اس کا جو اثر مسلمانوں پر پڑا وہ ظاہر ہے بالخصوص انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان اس اعلان سے بہت متاثر ہوئے جو ایک انگریزی تعلیم یافتہ کی طرف سے برابر کیا جا رہا تھا۔

مولانا اس صورت حال سے بہت بے چین اور پریشان تھے۔ اس کے لئے انہوں نے نظام حیدر آباد کے استاد فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان صاحب (۱) کو ایک مفصل مکتوب میں اس کی طرف توجہ دلائی اور اپنے درد دل کا اظہار کیا۔ ...... خط اس شعر سے شروع کیا ہے۔

اگر بینی کہ نابینا وچاہ است　　اگر خاموش بہ نشینی گناہ است

خط میں مولانا لکھتے ہیں:۔

"کچھ عرصہ سے سن رہا ہوں کہ خواجہ کمال الدین صاحب وکیل لاہوری مرید خاص مرزا غلام احمد قادیانی وہاں پہنچے ہوئے ہیں، اور تمام مسلمانوں میں بہت غل مچا دیا ہے، اور سنا جاتا ہے کہ ہمارے شہریار دکن کی نظروں میں بھی

---

(۱) فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان صاحب حیدر آبادی معقول و منقول دونوں میں یکتائے روزگار تھے۔ حیدر آباد میں عرصہ تک مولانا عبد الحئی فرنگی محلیؒ کے ساتھ رہے، اور مختلف علوم و فنون میں کمال حاصل کیا۔ ۱۲۹۵ھ میں نظام حیدر آباد کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۳۳۰ھ میں ریاست کا شعبۂ احتساب سنبھالا۔ ۱۳۳۲ھ میں فضیلت جنگ کا لقب ملا، اور قلمدان وزارت و قاف سپرد ہوا۔ اس تبحر علمی، فضل و کمال، اور درس و مذاکرہ تصنیف و تالیف کے ساتھ عبادات و اذکار وغیرہ کا بھی بڑا اہتمام تھا۔ مولانا انوار اللہ خان صاحب حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صاحب کے مجازین میں تھے۔ متعدد تصنیفات یادگار چھوڑیں۔ جن میں "افادۃ الافہام" جیسی ضخیم تصنیف بھی شامل ہے جو رد قادیانیت میں ہے۔ ۱۳۳۵ھ میں حیدر آباد میں انتقال کیا۔
(نزہۃ الخواطر) جلد ۸ (باختصار)

مقبول ہوگئے ہیں، یہاں تک کہ ہر ایک کو ان سے بات کرنے کی جرأت نہیں ہوسکتی مجھے سخت حیرت ہے۔ باوجودیکہ وہاں کے فرمانروا آپ کو بہت مانتے ہیں، اور یہ بھی جانتے ہوں گے کہ کتاب ”افادۃ الافہام“ آپ ہی نے لکھی ہے، اور بہت عمدہ کتاب لکھی ہے، پھر اس کے مقابلہ میں ”صحیفہ آصفیہ“ خواجہ صاحب کا تقسیم ہو رہا ہے، یعنی تریاق کے بعد زہر کی تخم پاشی ہو رہی ہے اور آپ خاموش ہیں“۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

”خواجہ صاحب ایک گروہ کے لیڈر اور خوش بیان شخص ہیں، چونکہ اس وقت قدرتی طور پر انگریزی تعلیم یافتہ حضرات میں اسلامی جوش پایا جاتا ہے (اگرچہ اسلامی احکام سے انہیں واسطہ نہ ہو) اس لئے خواجہ صاحب کی اس خوش آئند آواز سے کہ ہم اشاعت اسلام کریں گے اکثر ان کے معاون اور مددگار ہوگئے ہیں، اگرچہ ان کی نیت اچھی ہے مگر حقیقت حال سے واقف نہیں ہیں، انہیں اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس پردہ میں کیا راز ہے.... مولانا!........... آپ سے یہ غفلت ہوئی کہ آپ نے پہلے سے وہاں کے معززین کو پورے طور سے آگاہ نہیں کیا“

قادیانیوں کی حکمت عملی اور مصلحت پرستی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

”خواجہ صاحب نے ان اطراف میں بھی دورہ کیا اور ان کے بیان ہوئے اس سے معلوم ہوا کہ وہ نہایت ذاتی مصلحت اور گہری پالیسی سے کام لے رہے ہیں جہاں کسی واقف کار ذی علم نے کوئی سوال کیا تو اس کے جواب میں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس وقت میں جواب کے لئے تیار نہیں ہوں، اور عوام میں بیان کے بعد اکثر یہ کہہ دیا کہ میں نے حضرت مسیح موعود مہدی موعود سے یہ کہہ لیا تھا کہ میں صرف اسلام پر لیکچر دیا کروں گا اور کچھ نہ کہوں گا۔ اب اس پر غور کیجئے کہ مرزائی محبت کا تخم مسلمانوں کے دلوں میں بونے کا کیسا عمدہ طریقہ وہ برتتے ہیں“(۱)

---

(۱) مکتوب بنام استاد فرمانروا دکن (قلمی)

اس خط میں مولانا نے خواجہ کمال الدین کے طریقہ کار اور ان کے تمام دعووں اور اعلانات پر روشنی ڈالی ہے، اور ان خطرات کی نشان دہی کی ہے جو اس نئے فتنہ کی وجہ سے مسلمانوں کو درپیش ہیں۔

مولانا کی تصنیفات کا اثر

مولانا کی ان تصنیفات ورسائل اور خطوط ومکاتیب نے اتنا کام کیا کہ بعض اوقات قادیانی مبلغ یہ علم ہوتے ہی کہ مولانا کے رسائل کی فلاں جگہ لوگوں میں عام اشاعت ہو رہی ہے وہ جگہ چھوڑ کر چلے گئے، اور جب وہاں بھی ان رسائل نے ان کا تعاقب کیا تو ان کو کسی تیسری جگہ پناہ لینی پڑی، یہاں تک نوبت آئی کہ مولانا کا نام ہی قادیانیوں کی شکست کا رمز بن گیا۔ ان تصنیفات بالخصوص "فیصلہ آسمانی" اور "شہادت آسمانی" کے مطالعہ سے غیر جانبدار شخص اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ قادیانیت کے رد میں جو لٹریچر اب تک تیار کیا گیا ہے اس میں یہ کتابیں بہت ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ انہوں نے تردید قادیانیت میں جو اہم پارٹ ادا کیا ہے اور مسلمانوں کو جتنا فائدہ پہنچایا ہے اسے کوئی مؤرخ نظر انداز نہیں کرسکتا۔ مولانا کے اس "قلمی جہاد" سے ہزاروں نہیں لاکھوں انسانوں کو فائدہ پہنچا، مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس جال میں پھنس چکی تھی، اور اندیشہ تھا کہ ایک کثیر تعداد اس فتنہ میں مبتلا ہو جائے گی۔ مولانا کی کوششوں سے یہ سب اس تحریک کا شکار ہونے سے بچ گئے، ان کتابوں اور رسائل کا اثر صرف بہار تک محدود نہ تھا۔ پنجاب، بنگال، مدراس، بمبئی، گجرات، حیدرآباد، سلہٹ، ڈھاکہ، نواکھالی، میمن سنگھ۔ جس جگہ قادیانیوں کے قدم پہنچے وہاں مولانا کی تصنیفات بھی ان کے تعاقب میں پہنچیں، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یا تو قادیانی بھاگنے پر مجبور ہوئے، یا خاموشی اختیار کرلی۔

برما اور افریقہ میں بھی مولانا کی تصنیفات اور رسائل بڑی تعداد میں پہنچے اور اس کی وجہ سے قادیانیت کے جمتے ہوئے قدم متزلزل ہوگئے اور بہت سے مسلمان جو اس سے متاثر ہوئے تھے اس سے واقف ہو کر بیزار ہوگئے۔ صوبہ سرحد میں بھی ان رسائل کی اچھی اشاعت ہوئی۔ متعدد رسائل کا انگریزی، گجراتی اور بنگلہ زبان میں ترجمہ بھی ہوا کٹک اور اس کے اطراف میں قادیانیت نے خاصا زور پکڑ لیا تھا اور ان کی ایک مضبوط جماعت بن گئی تھی، جس کا دائرہ روز بروز وسیع ہو رہا تھا لیکن وہاں کے مدرسہ سلطانیہ کے صدر مدرس مولانا سید

محمد قاسم بہاری نے جلد ہی اس کے تریاق کی فکر کی اور مولانا کے رسائل منگوا کر ان کی اشاعت کی کوشش کی، اور اس کے نتیجہ میں ان اطراف میں یہ فتنہ بالکل ختم ہوگیا........ کٹک سے مولانا کے ایک عقیدت مند مولانا کو ان حالات سے مطلع کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"حضور کے رسالوں اور کتابوں کا اس ملک میں اچھا اثر پڑا مسلمانوں کے عقائد بہت درست ہوگئے، ایک جم غفیر اور بڑی جماعت جو قادیانی ہونے والی تھی انہیں کتابوں کی بدولت قادیانی ہونے سے بچ گئی، اور اب یہ حالت ہے کہ کسی قادیانی کو اپنے مذہب سے دلچسپی نہیں رہی "(۱)

بہار میں بہت سی مساجد پر قادیانیوں نے قبضہ کر رکھا تھا اور مسلمانوں نے صبر کر لیا تھا، لیکن مولانا کی ہمت افزائی اور پشت پناہی سے تین چار اہم مساجد کے سلسلہ میں مسلمانوں نے ہائی کورٹ تک مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کیا اور کامیاب ہوئے، پنجاب میں اس سے قبل کئی مقدمے ہوئے تھے لیکن اس میں قادیانی کامیاب ہوگئے تھے۔ بہار کی اس کامیابی کا اثر کچھ ایسا پڑا کہ اس کے بعد پنجاب میں مسلمانوں کو متعدد مقدموں میں کامیابی حاصل ہوئی، اور قادیانی ان کی مسجدوں سے بے دخل کئے گئے۔ اگر کبھی برسوں کے بعد مرزا صاحب یا ان کے حامیوں کی طرف سے مولانا کی کسی کتاب کا جواب دیا گیا تو مولانا نے فوراً اس کی تردید میں رسالہ لکھا، اس کا اثر یہ پڑا کہ پھر دوبارہ ان کو ہمت نہ ہوئی، اور اس میدان میں ان کو اپنی کامیابی بہت دشوار نظر آنے لگی۔

چونکہ مولانا پیچیدہ مسائل اور علمی مباحث کو بھی سلجھا کر اور سادہ و دلنشین انداز میں پیش کرنے کے عادی تھے اس لئے عام مسلمانوں کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا بہت آسان تھا، اور یہی مولانا کا مقصد بھی تھا.............. مولانا اکثر فرماتے کہ :۔

"اتنا لکھو اور اس قدر طبع کراؤ، اور اس طرح تقسیم کرو کہ ہر مسلمان جب صبح سو کر اٹھے تو اپنے سرہانے ردِ قادیانیت کی کتاب پائے"۔

اور حق یہ ہے کہ مولانا نے اس پر عمل کر کے دکھادیا، اور ان کا یہ سوز و اضطراب، سیماب وشی و بے قراری اور جہاد مسلسل اس بات کی تصدیق کے لئے بالکل کافی ہے۔

---

(۱) صحیفۂ رحمانیہ نمبر ۱۷

سلوک وارشاد اور اصلاح عام

تعلق باللہ اور اس کی اہمیت

مولانا کی کتاب زندگی کا ایک روشن اور آخری باب وہ ہے جو سلوک وارشاد اور تربیت واصلاح سے متعلق ہے اور ان کی اصلاحی خدمات، روحانی کمالات، اور باطنی اذواق وکیفیات کا ترجمان ہے۔

یہ باب مولانا کی زندگی کے آخری دور ہی پر محدود نہیں اس لئے کہ اوائل عمر ہی سے ان کو انسانی زندگی کے اس اہم ترین پہلو کی طرف پوری توجہ تھی، وہ اس کو زندگی کا حاصل اور اس کی اصل قیمت سمجھتے تھے، اور یہ "متاع دل" ان کو ہر شے سے زیادہ عزیز اور محبوب تھی۔

مونگیر کے قیام کا انتظام

مولانا کے بعض اہل تعلق اور مریدین نے مولانا کو بہت التجا اور اصرار سے مونگیر میں قیام کرنے کی دعوت دی، ان اہل تعلق میں دلاورپور کے معزز شاہ صاحبان کا خاندان اور حکیم احمد اللہ خاں اور حاجی تراب علی کے خاندان زیادہ نمایاں اور پیش پیش تھے۔ حاجی تراب علی صاحب نے ایک مرتبہ مولانا شاہ تجمل حسین بہاری (خلیفہ مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ) سے اپنی اس خواہش اور آرزو کا اظہار کیا، انہوں نے جواب دیا کہ اگر تم کو ایسی ہی عقیدت ہے تو ان کے لئے مکان بنواؤ۔ حضرت کانپور سے برداشتہ خاطر ہیں ہم کوشش کریں گے کہ یہاں چلے آئیں۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور فوراً بولے کہ میرا باغ حاضر ہے قبول کرا دیجئے، میں اس میں مکان بنادوں گا۔ پھر یہ خود کانپور گئے اور درخواست کی، لیکن مولانا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حاجی احمد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جو اس زمانہ میں علیل تھے حضرت کی آمد کی خبر ملی تو انہوں نے اس کار خیر میں سبقت لے جانے کی کوشش کی اور مولانا شاہ تجمل حسین کے ذریعہ سفارش کروائی بہرحال یہ سعادت ان ہی کے لئے مقدر تھی چنانچہ یہ باغ مولانا نے قبول کیا(۱)

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۱۶۹ بہ تغیر اضافہ

حکیم احمد اللہ خاں کو مولانا سے کمال درجہ عقیدت اور محبت تھی۔خود مولانا نے بعض مواقع پر ان کے خلوص و جذبات کی تعریف کی ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا نے باوجود اس کے کہ ان کا باغ نسبتاً چھوٹا تھا اس کو قبول کرنا پسند کیا۔اس باغ میں کچھ درخت آم کے تھے اور باقی زمین زیر کاشت تھی۔درختوں کے پاس حکیم صاحب نے ایک مختصر مکان بنوادیا، اس کے بعد بعض اہل تعلق کی کوششوں سے زنانہ مکان بھی بہت جلد تیار ہو گیا۔حکیم صاحب کے انتقال کے بعد مولانا کے قیام کے دو تین سال کے اندر ان کی بیوی نے مسجد کے پاس ذاکرین و شاغلین کے لئے حجرے بنوا دیے، اور رفتہ رفتہ یہ ایک جزیرہ سا بن گیا جہاں نفس کے کچلے ہوئے اور مادیت کے مارے ہوئے نہ جانے کتنے انسانوں کو پناہ ملی، اور ان کو اس شفقت و دلسوزی و غمخواری بلکہ دلداری اور ناز برداری کا اندازہ ہوا جو اللہ کے مخلص اور محبوب بندوں کا خاصہ ہے، اسی شفقت و محبت کے سایہ میں ان کی اصلاح ہوئی اور وہ ایمان و یقین کی روشنی اور محبت و تعلق کی اس دولت سے بہرہ مند ہوئے جو اگر جان دے کر بھی ملتی تو ارزاں تھی۔ع

"گر ایں سودا بجاں بودے چہ بودے"

صاحب کمالات محمدیہ نے اس سفر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۳ء کا سفر ہمارے پیش نظر ہے اللہ اکبر۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ بعض معززان مونگیر آپ کو کانپور لینے گئے۔آپ تشریف نہیں لائے، اس کے بعد آپ کے ایک ذی علم دوست نے خط لکھا اس میں یہ شعر تھا۔

ہمہ دلہا گرفتارت ہمہ جانہا خریدارت
ہمہ مشتاق دیدارت کہ روزے جلوہ فرمائی

مرشد سے تعلق

مولانا فرماتے ہیں کہ، اس شعر نے عجب اثر کیا، معلوم ہوا کہ لسان الغیب سے یہ شعر نکلا ہے، اسی وقت مونگیر کا قصد کیا۔

غالباً آپ کانپور سے پٹنہ پہلے تشریف لائے پھر مونگیر۔اس وقت مخلوق کی گرویدگی اور عقیدت دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔جہاں آپ ایک دن کے لئے اترتے وہاں دس دس کوس

کے لوگ جمع ہو جاتے، تعجب یہ ہوتا تھا کہ جس مقام پر پہلے سے آپ کے اترنے کی خبر نہیں ہے اور اتفاق سے اترنا ہو گیا کچھ دیر کے بعد لوگوں کا ہجوم ہو گیا، دوسرے روز دس دس کوس تک کے لوگ حاضر ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ ریل گاڑی اسٹیشن پر ٹھہری ہے اور ہندو اس گاڑی کی طرف ڈنڈوت کر رہے ہیں، کسی نے دریافت کیا کہ کون ہیں؟ وہ جواب دیتے کہ گرو جی جاتے ہیں.......... بیعت کے وقت پانچ پانچ سو کے مجمع کو ایک ایک مرتبہ مرید ہوتے ہوئے تو میں نے دیکھا ہے اور دس بیس بلکہ سو پچاس کامل کر مرید ہونا تو تمام دن رہتا تھا۔ یہ بھی میرے پاس لکھا ہوا موجود ہے کہ ایک ایک مرتبہ کے دورہ میں دو دو سو گاؤں کے لوگ ایک ایک ضلع میں مرید ہوئے(۱)

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

اس ایک سفر سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ۱۳۱۰ھ میں جب ایک طرف ان کے ذہن میں "ندوۃ العلماء" کی تصویر ابھر رہی تھی، اور اب اس خاکہ میں صرف رنگ بھرنا باقی تھا۔ عین اسی زمانہ میں سلوک وارشاد، روحانی تربیت واصلاح اور تزکیہ واحسان کے شعبہ میں انسانوں کی ایک بڑی تعداد ان سے فیض یاب ہو رہی تھی، اور ان کو وہ ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل ہونا شروع ہو گئی تھی جو اس راہ کے کاملین اور اس شعبہ کے مجتہدین کا حصہ ہے۔

عجب بات ہے کہ ندوۃ العلماء کی بنیاد کے ساتھ ساتھ تصوف واحسان کی بنیاد بھی پڑی اور دونوں کا سفر تقریباً ایک ساتھ شروع ہوا، اور جب تک مولانا محمد علی ندوہ کے ناظم رہے یہ دونوں شعبے پورے اہتمام اور نگہداشت کے ساتھ برابر پرورش پاتے رہے، اور قلب ودماغ کا یہ حسین توازن قائم رہا۔ جس پر صحیح صحت مند اسلامی معاشرہ کے بقاو ترقی اور انسانی زندگی کے متوازن اور متناسب نشوونما کا انحصار ہے، اور جو ہر زمانے کا نازک ترین اور مشکل ترین فریضہ رہا ہے۔

ندوۃ العلماء کے گیارہ سالہ دور نظامت میں متعدد ایسے دوروں کا اتفاق ہوا، جس کے آغاز کی کہانی اوپر گزری ہے، جب تک مولانا گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ حیات تھے وہ آنے والوں سے خاص طور پر یہ پوچھتے تھے کہ ہمارے مولانا محمد علی سے بھی ملے یا نہیں؟ اگر جواب

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۹۳، ۹۴

نفی میں ہوتا تو ملاقات کی تاکید کرتے، اور بعض وقت سکوت اختیار کرتے۔ مولانا کے انتقال کے بعد قدرتی طور پر یہ سارا حلقہ مولانا محمد علی سے وابستہ ہو گیا۔ دوروں اور بیعت و توبہ کی مجلسوں کی تعداد بڑھ گئی، اور ندوہ کی زبردست سرگرمیوں اور مشغولیتوں کے ساتھ مسلمانوں کی روحانی اصلاح و تربیت اور تعمیر سیرت کا کام بھی برابر جاری رہا، اور ندوہ سے علیحدگی کے بعد اس کا دائرہ اور وسیع ہو گیا۔ ایک مرتبہ مولانا مراد آباد تشریف لے گئے۔ اور مولانا فضل الرحمٰنؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھتے ہی فرمایا کہ :۔

"ہمارے پاس ایک رئیس آئے تھے وہ ہم سے ایک عالم چاہتے ہیں، دو سو روپیہ ماہوار دیں گے اور کچھ پڑھانا ہو گا، تم چلے جاؤ" مولانا نے کہا کہ :۔

"مولوی احمد حسن صاحب کانپوری یا مولوی عبد الکریم صاحب کو بھیج دیجئے"

ارشاد ہوا کہ : "ہم تم سے کہتے ہیں" مولانا نے عرض کیا کہ "۔

"اگر حکم ہوتا ہے تو مجھے کوئی عذر نہیں"

ارشاد ہوا: "حکم نہیں ہے، تمہارا جی چاہے چلے جاؤ"

مولانا نے فرمایا:۔

"حضرت! جی تو نہیں چاہتا ہے" .... آپ خاموش ہو گئے (۱)

اسی طرح ایک مرتبہ حافظ عبد الکریم صاحب نے (جو اب حیدر آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے، اور مولانا سے بہت محبت رکھتے تھے) اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ مولانا ہائی کورٹ میں درجۂ اوّل کی منصفی قبول کر لیں، کام سے مناسبت ہو جانے کے بعد ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے تقرر جلد ہو جائے گا، لیکن مولانا نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حافظ صاحب نے اس خیال سے کہ اس میں سود کی ڈگری لینا پڑتی ہے منصب قضا کی پیشکش کی، لیکن مولانا نے اس سے بھی معذرت کر دی اور کہا کہ :۔

"حافظ صاحب میں قاضی اور مفتی کچھ نہیں ہوتا، آپ معاف کریں" (۲)

ایک بار حیدر آباد سے پھر کسی ملازمت کی پیشکش ہوئی، اور مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ۔

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۵۲، ۵۳ (۲) کمالات محمدیہ، ص ۵۳

"حیدر آباد میں تمہیں لوگ بلاتے ہیں؟"

مولانا نے عرض کیا: "جی ہاں!............ مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ :۔

"پھر جاتے کیوں نہیں، چلے جاؤ" .... ایک بار ایک رئیس کی ملازمت سے مولانا کے کہنے کے باوجود انکار کر چکے تھے اس لئے دوبارہ انکار سے شرم آئی اور حیدر آباد روانہ ہوگئے لیکن دل نہ لگا اور چھوڑ کر چلے آئے (۱)

خدا کی قدرت یہ ہوئی کہ حیدر آباد سے واپسی کے بعد مالی دشواریاں جو کبھی کبھی پہلے پیش آتی تھیں وہ جاتی رہیں ....

مصنف "کمالات" مولانا کی زبان سے اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :۔

"جب سے حیدر آباد سے لوٹا ہوا اس وقت سے کبھی خرچ کی طرف سے دقت نہیں ہوئی اور باوجود یکہ خرچ چوگنا ہوگیا مگر ہمیشہ فراخ دستی سے زندگی بسر ہوتی رہی۔"

فرماتے ہیں کہ :۔

کبھی یہ خطرہ ہوا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ جب سے حیدر آباد آیا ہوں فراخ دستی سے گزر ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ اس کی وجہ یہ خیال میں آئی کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے واسطے چار سو روپیہ ماہوار کی نوکری چھوڑی، اللہ تعالیٰ بڑا غیور ہے اس نے اپنے فضل سے یہ ثمرہ دیا کہ نہایت عمدگی سے وہ بات حاصل ہوگئی جو حیدر آباد کی منصفی بلکہ ججی سے حاصل ہوتی، اور اس میں جو آفتیں اور ذمہ داریاں اور معصیت ہوتی اس سے بالکل نجات بخشی" الحمدللہ علیٰ احسانہ سچ ہے ومن یتق اللّٰہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب (۲) ایک مرتبہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ :۔

"ہمارے مولوی محمد علی بہت غنی ہیں" ایک صاحب نے عرض کیا کہ :۔

"حضرت بہت روپیہ والے ہیں" ارشاد ہوا :۔

"بڑے احمق ہو، روپیہ سے کہیں کوئی غنی ہوتا ہے الغنی عن النفس (اصل غنا دل کا غنا ہے) (۳)

---

(۱) از کمالات محمدیہ، ص ۳۴ بہ تغیر اضافہ (۲) جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کیلئے اللہ تعالیٰ کوئی سبیل پیدا کر دیتا ہے۔ اور ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے گمان بھی نہیں ہوتا۔ ۱۲ (۳) کمالات، ص ۵۵

حیدر آباد کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کے علمی مشاغل بھی جاری تھے۔ مکتوبات امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد نسخے مولانا کو حیدر آباد میں ملے مولانا کے پاس نسخہ مرتضوی تھا، اور وہ غلط تھا چنانچہ دوسرے نسخوں کو سامنے رکھ کر مولانا نے اس کا مقابلہ کیا اور تصحیح کی، اس حالت میں عجیب و غریب واردات و کیفیات طاری ہوئیں، اور روحانی ترقی معلوم ہوئی۔

مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ کے بلند کلمات

مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت کے بعد جس کا ذکر کتاب کے شروع میں گزرا ہے خود بخود اور اچانک یہ بات مشہور ہوگئی کہ مولانا کو خلافت بھی حاصل ہوئی۔ خود مولانا فرماتے ہیں کہ:۔

"جا بجا سے خطوط میں خلیفہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ لکھا ہوا آنے لگا، اور لوگ آکر دریافت کرنے لگے، کانپور کے ایک تاجر نے (جو مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں سے تھے) یہ شہرہ سنا تو مولانا سے حقیقت حال دریافت کی، مولانا نے کہا کہ حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ موجود ہیں ان سے جا کر دریافت کرو، وہ اسی روز یا اس کے دوسرے روز مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا، مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہاں! ہم نے اللہ کا نام بتانے کی اجازت دی ہے، اور کون سی بڑی بات ہے، ان کی روح ارواح متقدمین میں سے ہے، ایسے لوگ ہر زمانہ میں کم ہوتے ہیں (۱)

مونگیر میں خلقت کے ہجوم اور لوگوں کی وارفتگی اور شیفتگی کو دیکھ کر مولانا نے حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک خط بھیجا جو "کمالات محمدیہ" میں محفوظ ہے، اس خط سے اس مقبولیت و مرجعیت، محبوبیت اور جمعیت خاطر کی تصدیق ہوتی ہے جس کی تفصیل اوپر گزری ہے لکھتے ہیں:۔

"کمینہ خادم دور افتادہ باصرار بعض احباب از کانپور بمونگیر رسیدم از توجہات عالیات دریں، جا بہر نوع جمعیت ظاہری و باطنی یافتم، الحمد للہ علیٰ ذلک مردمان برائے دخول سلسلہ آں قبلہ ہجوم کردند و بعض را حسب ارشاد

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۲۲ باختصار

سابق داخل سلسلہ نمودم و بعض را بر اجازت جدیدہ موقوف داشتہ ام، چہ ارشاد می شود" (۱)

اس زمانہ میں لوگوں نے عادت اور معمول کے مطابق چہ میگوئیاں بھی شروع کر دیں، اور مولانا کی خلافت ایک مختلف فیہ مسئلہ بن گئی، بعض لوگوں نے اپنی غلط فہمی یا حسد کی وجہ سے مولانا کے ساتھ نامناسب انداز میں گفتگو کی۔ اس طرح کی باتیں جب زیادہ پھیلیں تو مولانا قدرتی طور پر اس سے کسی قدر متاثر اور ملول ہوئے، اور مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کو ایک خط لکھا، اور ان حالات سے مطلع کیا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں ان کو لکھا کہ ان باتوں کا کچھ زیادہ اثر نہ لیں، اور ان کے لئے بلند کلمات ارشاد فرمائے لکھتے ہیں۔

"خیر اللہ شاہ تم سے تکرار کرتا ہے، تمہارے مرتبہ کو نہیں جانتا ہے، اس بات کا خیال نہ کرو، ایک زمانہ ہوگا کہ کثیر خلق تمہارے پاس آکر مرید ہوگی اور تم سے فیض ہوگا، اور تعلیم پاویں گے" (۲)

مولانا شاہ تجمل حسین بہاری "مصنف کمالات رحمانی" جو مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے خواص میں ہیں، انہوں نے ایک مرتبہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ :۔ "مولانا محمد علی آپ کے خلیفہ ہیں؟......... فرمایا کہ "ہم اس قابل نہیں ہیں کہ ہم ان کو خلیفہ کہیں، وہ بڑے شخص ہیں" (۳)

فراغت و تکمیل کے بعد لوگوں نے جب تقریر کا اصرار کیا تو مولانا کی طرف سے انکار ہوا، اصرار زیادہ بڑھا تو انہوں نے کہا کہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسا فرمائیں گے میں ویسا کروں گا۔ چنانچہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ۔

"بس جب دو چار آدمی پاس آکر بیٹھیں خدا تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم انہیں سنا دیا یہی وعظ ہے، اور ایسے طریقے سے وعظ کہنا کہ خواہ مخواہ مشیخت پائی جائے اور نفس موٹا ہو، نہیں چاہئے" (۴)

رجوع عام

۱۳۲۰ / ۱۹۰۲ء کے آخر میں مولانا مونگیر میں قیام پذیر ہوئے۔ اسی وقت سے لوگوں کا

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۲۷ (۲) کمالات رحمانی، ص ۴۵ (۳) ایضاً ص ۴۶ (۴) کمالات محمدیہ، ص ۴۵

ایسا رجوع ہوا کہ جیسے وہ اس کے منتظر ہی بیٹھے تھے، پھر یہ حال ہوا کہ جس گاؤں یا جس ضلع میں مولانا کے قدم پہنچے وہاں فسق وفجور اور بد دینی اور بد دیانتی کا خاتمہ ہو گیا، جو لوگ نماز سے دور بھاگتے تھے اور شراب وغیرہ کے عادی تھے وہ نہ صرف خود نمازی ہو گئے بلکہ نماز کے داعی اور مبلغ بن گئے، اور ان کو خدا سے ایسا تعلق اور رابطہ پیدا ہو گیا، جو اتقیا اور صلحاء کے یہاں نظر آتا ہے، مرجھائی ہوئی کلیاں اور خشک پتے اگر موسم بہار میں کسی وقت تر وتازہ اور شاداب ہو جائیں تو زیادہ تعجب نہ ہونا چاہئے لیکن ایمان اور ہدایت کی اس "باد بہاری" نے جس طرح مرجھائے ہوئے دلوں بلکہ مردہ دلوں کو نئی زندگی بخشی وہ کم از کم ان اطراف کی تاریخ کا ایک ایسا واقعہ ہے جس کو کوئی مؤرخ فراموش نہیں کر سکتا۔ بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ پورے پورے موضع میں ایک یا دو شخص باقی بچے اور باقی سب تائب ہو گئے، اور پھر کسی موقع پر یہ دونوں شخص بھی اس جماعت سے آملے۔ محمد علی حسن رحمۃ اللہ علیہ مصنف "کمالات محمدیہ" نے جو بعض دوروں میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ رہے اس قسم کا ایک چشم دید واقعہ قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

۱۳۲۰ھ میں موضع ہرسنگھ پور (ضلع دربھنگہ) کے بعض لوگ آپ کو لے گئے، یہاں اس کے اطراف میں اکثر بے نمازی، تاڑی باز، تعزیہ پرست تھے، یہ خادم بھی ہمراہ تھا، سات یا آٹھ روز اس موضع میں قیام رہا، وہاں کے کل سکنا بجز دو شخصوں کے مرید ہوئے، اور تعزیہ پرستی سے توبہ کر کے پکے نمازی ہو گئے۔ اس کے اطراف کے لوگ ۱۰، ۱۰ کوس تک کے آ آکر تائب ہوئے۔ لوگ متحیر تھے کہ وہ تاڑی باز جن کی تمام عمر نشہ میں گزری اور کبھی خیال نہیں آسکتا تھا کہ یہ نشہ چھوڑیں گے، جن کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی واعظ یا منع کرنے والا ان کے موضع میں پہنچا انہوں نے یا تو واعظ کو وہاں سے نکالا یا خود وہاں سے چلے گئے، وہ لوگ خود بخود آ کر توبہ کرتے تھے، اور نماز کے پابند ہو جاتے تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ یہاں نہ وعظ کا کوئی جلسہ ہے کہ لوگ چلے آتے ہیں، نہ خوش الحانی سے بیان ہوتا ہے کہ لوگ اس سے متاثر ہوتے ہیں، نہ کوئی تاکید کر رہا ہے اور ڈنڈا لئے پھرتا ہے کہ نشہ چھوڑو نماز پڑھو (جیسا کہ بعض واعظین کو سنا گیا) غرض کہ ظاہری اسباب میں سے کچھ نہیں ہے مگر لوگ جوق در جوق چلے آرہے ہیں اور تائب ہوتے جاتے ہیں، پھر یہ نہیں کہ چند روز اثر ہوا، آج کئی برس ہوئے ہم ان حضرات کو دیکھ رہے ہیں اور سن رہے ہیں کہ وہی نماز کی پابندی ہے اور نشہ وغیرہ کا ذکر نہیں ہے۔ نقصان اٹھاتے ہیں مگر سود نہیں لیتے دوسرے سال پھر اسی موضع میں

گئے، وہاں تو سب لوگ فیض یاب ہو چکے، بجز دو شخصوں کے، مگر اطراف وجوانب کے لوگ بہت فیض یاب ہوئے، اور وہاں کے ان دو صاحبوں میں سے ایک تو موجود نہ تھے وہ نشہ وغیرہ اور فسق وفجور میں مبتلا تھے، اور وہاں کے معززین میں تھے۔ ایک روز حضرت قبلہ ﷺ نے انہیں بلوایا اس وقت مجمع تھا، اتفاق سے ہمارے برادر طریقت جناب شاہ حافظ رحمت اللہ صاحب مظفر پوری (۱) بھی حضرت قبلہ ﷺ کی زیارت کے لئے آئے تھے اور اس مجمع میں موجود تھے۔ حضرت قبلہ ﷺ نے کچھ کلمات نصیحت فرمانا شروع کئے، معمولی الفاظ تھے، مگر جلسہ میں گریہ وزاری کا غل ہوگیا اور ہر ایک پر عجب حالت طاری ہو گئی جو صاحب مذکور بلائے گئے وہ بے اختیار بولے۔

"لیجئے ہاتھ، توبہ کرتا ہوں" جس وقت ہمارے حضرت قبلہ ﷺ نے ہاتھ پکڑ کے کسی قدر جوش میں فرمایا۔ کہو اللہ تعالیٰ ایک ہے" اسم ذات کو آپ نے ذرا بلند آواز سے فرمایا، اس لفظ کے فرماتے ہی تمام حاضرین جلسہ پر کیفیت طاری ہوگئی اور سبھی نے بے اختیار اسم ذات کا نعرہ بلند کیا، بعض بیہوش ہو گئے، اور اکثر کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے کثرت گریہ سے شور مچ گیا (۲).......... اس کے بعد اس موضع سے بعض لوگ حضرت قبلہؒ کو موضع جمال پور اور بلیا لے گئے، جو وہاں سے قریب ہے، اندازاً آٹھ کوس ہے، وہاں کے لوگ بھی بے نمازی اور نشہ خوری میں مبتلا تھے، وہاں بھی یہی ہوا کہ دو روز کے قیام میں سب تائب ہو کر نماز کے پابند ہو گئے" (۳)

سب سے بڑی کرامت

مولانا فرماتے تھے کہ۔

"سب سے بڑی کرامت اتباع سنت ہے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انسان میں سنت کی پیروی اور شریعت کی اتباع کس درجہ ہے اور اس سے مخلوق کو کتنا فائدہ پہنچ رہا ہے، کشف وکرامت وغیرہ اصل نہیں۔

ایک مرتبہ مولانا نے بہت تفصیل کے ساتھ اس بات پر روشنی ڈالی کہ۔

---

(۱) خلیفہ مولانا سید احمد مونگیری۔ ۱۲   (۲) کمالات محمدیہ، ص ۱۳۹، ۱۴۰   (۳) کمالات محمدیہ، ص، ۱۴۰

"لوگ کشف وکرامت دیکھتے ہیں اور جو بات دیکھنے کی ہے وہ نہیں دیکھتے وہ دو امر ہیں، اوّل تو شریعت پر استقامت یعنی شریعت محمدیہ ﷺ کی کامل پابندی ہو کہ کوئی سنت اور مستحب ترک نہ ہوتا ہو، اور محرمات کیا مکروہات سے بھی کامل اجتناب ہو، اگر یہ نہیں ہے تو عجوبہ باتیں مثلاً کسی پر اثر ڈالنا، کسی کو بے ہوش کر دینا، چھو چھا کرنا، کسی کے مرض کو سلب کر لینا وغیرہ تو ہنود کے ہاں گوشائیں بھی کرتے ہیں، اور اب سنتے ہیں کہ عیسائیوں میں بھی بعض لوگوں نے ایسی باتیں نکالی ہیں، تو پھر کیا کوئی مسلمان انہیں ولی اللہ اور درویش کامل کہے گا؟ کبھی نہیں کہے گا، پھر اللہ والوں میں ایسی باتیں تلاش کرنا نادانی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر کرامت دیکھنے کی ہے تو یہ ہے کہ اس کی ذات سے، اس کے فیض صحبت سے کتنے مردہ دل زندہ ہوتے ہیں، یہ کرامت مردہ کو زندہ کرنے سے زیادہ لائق قدر ہے، اور اس کے کامل ہونے کی دلیل ہے(۱)

بھاگل پور کے مسلمانوں میں ایک بات پر کچھ اختلاف ہو گیا تھا، اگرچہ اس کا آغاز دیہات کی پنچایت سے ہوا تھا لیکن آخر میں وہ اتنا بڑھا کہ دیہات اور شہر ہر جگہ مسلمان دو فریقوں میں بٹ گئے اور جنگ وجدال کا بازار گرم ہو گیا، یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک ایک دن میں دیوانی اور فوجداری کے بیس بیس پچیس پچیس مقدمات داخل ہونے لگے مسلمانوں کے سربرآوردہ لوگوں کے علاوہ ضلع حکام نے بھی مصالحت کی بہت کوشش کی، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، مولانا بھاگل پور تشریف لے گئے تو لوگوں نے اس موقع کو غنیمت جانا، فریقین کے کچھ نمائندے اور وکلاء مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صلح کے لئے درخواست کی، مولانا نے یہ درخواست منظور کی اور پندرہ دن کے بعد ہزاروں آدمیوں کا اجتماع ہوا، مولانا نے چند ہی کلمات کہے ہوں گے کہ جلسہ کا رنگ بدل گیا اور وہ لوگ جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، وہ بھائیوں کی طرح گلے مل گئے کہ گویا عید ہو گئی، اور یہ سب اس طرح چشم زدن میں ہوا کہ دیکھنے والے محو حیرت تھے۔ اس عجیب واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مصنف "کمالات" لکھتے ہیں۔

"شاہ جنگی کے تالاب عید گاہ کے میدان میں ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہوا۔ پہلے جناب

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۱۳۸

مولانا حافظ تجمل حسین صاحب نے قرآن شریف ہاتھ میں لے کر وعظ فرمایا، چونکہ ان میں ظرافت بہت ہے، دو چار کلمے ایسے فرمائے جو سب حاضرین کو ناگوار معلوم ہوئے، مارے رعب داب کے کچھ بول نہ سکے، چپ چاپ رہے، جب مولانا موصوف نے دیکھا کہ کچھ اثر نہ ہوا تو ناامید و خفا ہو کر گاڑی میں سوار ہو گئے۔ وقت مغرب قریب تھا، آپ وضو کرنے کو اٹھے، نماز مغرب پڑھ کر کچھ دیر تک اوراد و وظائف میں مصروف ہوئے اور سب انتظار میں کھڑے رہے، فریقین کے کارپرداز کاغذات و دستاویزات بغل میں دابے تھے، اور اپنے اپنے ثبوت لئے تھے، اتنے میں ہمارے حضرت قبلہ ﷺ مسجد کے اندر سے برآمد ہوئے اور مسند پر عصا ٹیک کر کھڑے ہو کر دو چار کلمے زبان فیض ترجمان سے فرمانے پائے تھے کہ حاضرین جلسہ پر عجب اثر پیدا ہوا، سب پر گریہ طاری ہوا اور چیخ پکار ادھر اُدھر ہونا شروع ہوئی، سب کا دل امنڈ آیا، اور لوگ دوڑ دوڑ کر پائے مبارک پر گرنے لگے، جب اور رش بڑھا تو دھکے کی نوبت پہنچی، مگر پروانہ وار سب جان دیتے تھے۔ وہ نظارہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے، اب تک وہ نظارہ سامنے آنکھوں کے گھومتا ہے اور کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ الغرض ہمارے حضرت قبلہؒ نے ہاتھ کے اشارہ سے ارشاد فرمایا کہ آپس میں گلے مل جاؤ، بس پھر کیا تھا ہر شخص جوش میں نہایت ذوق و شوق سے آپس میں گلے ملنے لگا، اور ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگا، عید ہو گئی(۱)

اسی بھاگل پور میں مقلدین و غیر مقلدین کے درمیان ایک طویل نزاع تھا جو کسی طرح ختم نہیں ہو رہا تھا، متعدد ممتاز علماء اور مقررین صلح کرانے آئے، لیکن ناکام واپس ہوئے، آخر میں وہاں کے چند لوگوں نے مولانا کو دعوت دی اور انہوں نے ایک دن ایک رات وہاں قیام کیا، اور رات کے وقت چند مرتبہ لوگوں کے سامنے کچھ کلمات کہے اس کا اس قدر اثر ہوا کہ صبح کو یہ سب گروہ جو کل تک برسرِ پیکار تھے، نہ صرف اس جھگڑے سے تائب ہوئے بلکہ مولانا کے ہاتھ پر بیعت بھی کی، بہت سے وہ لوگ جو اہل دل اور مشائخ سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ رکھتے تھے اور اپنی محدود دنیا سے باہر سوچنے کے عادی نہ تھے، وہ بھی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کی مجلسوں میں بیٹھے، اور بیعت ہو کر واپس ہوئے۔

مخدومی مولوی سید عزیز الرحمٰن صاحب(۲) نے عم مخدوم و معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص، ۱۶۲، ۱۶۳	(۲) مولوی سید عزیز الرحمٰن حسنی ﷫ مولانا حکیم سید عبد الحئی ﷫ ناظم ندوۃ العلماء کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ دار العلوم ندوۃ العلماء کے دور اول میں تعلیم پائی۔ مولانا سید حسین احمد مدنی ﷫ سے بیعت تھے۔ بہت خصوصیات کے مالک اور ذاکر شاغل بزرگ تھے۔ ۱۲

مدظلہ سے اپنے ایک واقعہ کا ذکر کیا، جس سے مولانا کی اس اثر آفرینی پر روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک دور میں ان کے دل میں کچھ شکوک اور وسوسے ایسے پیدا ہوئے جس سے سخت الجھن اور گھبراہٹ پیدا ئی اور یہ سمجھ میں نہ آیا کہ کس سے رجوع کیا جائے انہوں نے اپنے بھائی مولانا سید عبد الحئیؒ سے اپنی اس پریشانی اور فکر کا اظہار کیا، مولانا نے اس کو مشورہ دیا کہ مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ایسے شکوک و شبہات مولانا سے کیسے رفع ہو جائیں گے، لیکن ان کی خدمت میں مونگیر حاضر ہوئے، کہتے ہیں کہ مولانا چارپائی پر تشریف رکھتے تھے، اپنے پاس بٹھالیا، چند منٹ خدمت میں حاضر رہنے کی سعادت حاصل ہوئی، درود شریف پڑھنے کی ہدایت کی، اسی وقت گاڑی جاتی تھی، جوانی کا زمانہ تھا، بعض قدیم رفیق درس جن کا قیام مونگیر میں تھا اتفاق سے موجود نہ تھے، اس لئے دلبستگی کا کوئی سامان نظر نہ آیا ہمروزہ واپسی ہوگئی، لیکن سارے وسوسے اور شکوک یک لخت زائل ہو گئے، پھر ان کا کبھی حملہ نہیں ہوا۔

پولیس کے ایک داروغہ جو اپنی بے رحمی، بدعنوانی اور رشوت ستانی میں مشہور تھے ایک مرتبہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے مولانا کو دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ بیعت کی اور ساری برائیوں سے توبہ کی، اور اس کے بعد ان کی یہ حالت ہوئی کہ وہ آنکھ جو آنسوؤں سے ناآشنا تھی بات بات پر اشکبار ہونے لگی۔ حج کا اس قدر شوق پیدا ہو گیا کہ اس کا ذکر سنتے ہی بے قرار ہو جاتے اور رونے لگتے۔ ایک بار حج کر چکے تھے، لیکن سیری نہ ہوئی، پھر ارادہ تھا کہ طبیعت خراب ہو گئی۔ اس عالم شوق و وارفتگی میں مولانا کو ایک خط لکھتے ہیں اور اپنی حالت بیان کرتے ہیں۔

"حرمین شریفین کا ذکر آتے ہی چیخ مار کر رونے کو جی چاہتا ہے مگر الحمد للہ حتی الوسع ضبط سے کام لیتا ہوں، آنکھوں سے مجبور ہوں، بے اختیاری ہے ورنہ اس سے بھی ضبط کرتا۔ حضرت درد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر اس وقت یاد آ گیا، اس کے فضل سے اور حضور کی ہمت سے اگر ایسا ہو جاؤں تو زہے نصیب۔

زردیٔ رخ رونا ہر دم کا دو ہیں شاہد خوب ہمارے
چاہت کا اقرار کیا ہے کیونکر اب انکار کریں (۱)

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۱۴۲، ۱۴۳

بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ بعض خوش قسمت حضرات نے کسی خاص کیفیت اور حال کے وقت دعا کی درخواست کی اور کسی تمنا کا اظہار کیا اور خدا تعالیٰ کے حکم سے اسی وقت ان کی حالت بدل گئی اور یہ حالت برابر قائم رہی۔ محمد فضل الدین مستری جو لاہور کے رہنے والے تھے اور جمال پور میں (جو مونگیر سے پانچ میل کے فاصلہ پر ہے) ایک بڑے ٹھیکہ دار تھے اور مولانا کے ہاں ان کی آمد و رفت بھی تھی، ۱۹۰۱ء میں مولانا نے زنانہ مکان تعمیر کروایا اس وقت ان صاحب نے بڑی مدد کی اور جب مولانا نے تعمیر مکان کا معاوضہ لینے کو کہا تو صاف معذرت کردی اور ایک خاص تمنا کا اظہار کیا........ کمالات محمدیہ (اضافات) میں اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

> "فضل دین مستری کا بیان ہے کہ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ مکان میں نے اس واسطے نہیں بنوایا کہ آپ سے اس کی قیمت لوں میں ایک بڑا ٹھیکیدار ہوں، اس مکان کے بنوانے سے مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑا، مولانا نے فرمایا کہ پھر کس لئے بنوایا ہے؟ مستری صاحب نے کہا کہ اگر دعاء کیجئے تو عرض کروں۔ فرمایا کہ مجھ پر تمہارا احسان ہے، اگر میرے بس میں ہے تو وعدہ کرتا ہوں، کہو کیا بات ہے۔ فضل دین مستری نے عرض کیا کہ میں بہت سے بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، ممالک اسلامیہ کی بھی سیاحت کی ہے، جوانی سے صرف ایک میری تمنا ہے کہ میرا قلب جاری ہو جائے اور میں نے اسی مقصد سے یہ مکان بنوایا ہے، مستری صاحب نے خود مجھ سے کہا کہ حضرت علیہ الرحمہ کو جوش آیا اور وہ کھڑے ہو گئے اور میرے پاس آکر یہ کہا قمیص اٹھاؤ، میں نے قمیص اٹھائی اور اپنا سینہ کھول دیا۔ آپ نے شہادت کی انگلی سے میرے قلب کو ٹھوکر ماری اور فرمایا کہ : "میاں قلب یوں جاری ہوتا ہے" (۱)

مریدین کا تعلق و شیفتگی

دوسری بات جو نمایاں طور پر نظر آتی ہے اور جس سے کوئی تذکرہ نگار صرف نظر نہیں

---

(۱) یہ واقعہ مولانا منت اللہ رحمانی نے اضافات کمالات محمدیہ میں لکھا ہے۔ فضل دین مستری مرحوم نے مولانا سے یہ واقعہ اس وقت بیان کیا جب وہ ۱۹۳۴ء میں مونگیر آئے۔ یہ بھی کہا کہ وہ دن ہے اور آج کی گھڑی الحمد للہ کبھی قلب غافل نہیں ہوا۔ ۱۲

کرسکتا وہ گرویدگی و شیفتگی ہے جو مولانا کے اہل تعلق کو مولانا سے تھی، مولانا میں اس قدر محبوبیت تھی کہ اپنے کیا بیگانے بھی ان کی طرف میلان اور کشش محسوس کرتے تھے اور متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔ اس عام رجوع، خلقت کے ہجوم اور عقیدت و محبت میں اس بات کو بڑا دخل تھا، اور اس کی وجہ سے ان کے رشد و ارشاد کا سلسلہ بے حد وسیع ہو گیا تھا۔

پٹنہ کے مشہور حکیم اور عالم مولانا عبد الباری مرحوم نے مولانا سے بیعت کی درخواست کی، مولانا نے ٹالنا چاہا، دس بارہ روز تک وہ برابر درخواست کرتے رہے، اور آپ مختلف طریقوں سے ان کو جواب دیتے رہے، آخر میں حکیم صاحب نے کہا کہ حضرت! میں سب کچھ یہاں پاتا ہوں اور کہیں میری تسلی نہیں ہوتی، آپ مرید کر لیجئے۔ اس وقت مولانا نے ان سے بیعت لی۔ پھر ان کا یہ حال ہوا کہ علالت کے دوران بار بار اس تمنا کا اظہار کرتے تھے کہ کاش میری جان مولانا کے سامنے نکلے۔ پھر انہوں نے آدمی بھیج کر اس خواہش کا اظہار کیا، دس روز کے اندر اندر ان کے سترہ تار اس مضمون کے آئے۔ مولانا یہ حالت دیکھ کر قاری نور محمد صاحب کے ساتھ تشریف لے گئے اور ان کو تسکین ہوئی۔

حکیم صاحب کی شیفتگی کی یہ حالت تھی کہ سوتے سوتے جب آنکھ کھلتی تو فرماتے دیکھو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے ہیں۔ خدام کہتے کہ اس وقت رات ہے، کہاں تشریف لاسکتے ہیں۔ یہ سن کر خاموش ہو جاتے، پھر اسی طرح فرماتے (۱)

کونند کے پاس ایک موضع "مہونی" تھا بعض محبین کے اصرار پر دو چار گھنٹہ کے لئے وہاں بھی تشریف لے گئے، اس سے پہلے مولانا کبھی یہاں نہ آئے تھے۔ بعض عشاق فرط شوق میں پالکی کے ساتھ دوڑ رہے تھے۔ مولانا نے خلاف معمول ایک جگہ پالکی رکھنے کا حکم دیا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں پر کسی بزرگ کا مزار ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہاں سے چند ہی قدم کے فاصلہ پر شاہ شہاب الدین گجراتی (۲) کا مزار ہے، جنہیں عوام "شہابا شہیدؒ" کہتے ہیں۔ آپ نے کچھ دیر فاتحہ پڑھ کر کہاروں کو چلنے کے لئے اشارہ فرمایا۔

مصنف کمالات لکھتے ہیں۔

"بہت سے لوگوں کو اس گاؤں کے بیعت سے مشرف فرمایا۔ غلاموں کی

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۱۱۵

(۲) شہاب الدین گجراتی خواجہ شہاب الدین سہروردی کے مجاز تھے۔ اس جگہ (جو اس زمانہ میں جنگل تھی) آکر ڈیرا ڈالا اور پوری زندگی عبادت و ریاضت میں گذار دی ایک روز گاؤں نے شہید کر دیا (کرامات محمدیہ، ص ۲۰)

خوشی کا عجب عالم اور جوش و خروش کی نرالی کیفیت تھی، اور ہر شخص زبان حال سے گویا یہ کہہ رہا تھا"

کلاہ گوشہ ٔ دہقاں بآفتاب رسید
کہ سایہ بر سرش انداخت چوں تو سلطانے (۱)

ایک قصبہ میں چند نوجوان جن کا گانے بجانے کے سوا اور کوئی مشغلہ نہ تھا اور شراب وغیرہ کے عادی تھے۔ وہاں جب مولانا تشریف لے گئے اور طالبین کا ہجوم ہوا تو وہ بھی بیعت کے طالب ہوئے۔ مولانا ٹالتے رہے۔ انہوں نے دوسروں کے ذریعہ کہلوایا، کئی روز تک یہی ہوتا رہا۔ مؤلف "مقامات محمدیہ" لکھتے ہیں۔

"ایک روز وہ آئے اور آپ نے ناصحانہ کلمات فرمانا شروع کئے، اور انہیں گریہ شروع ہوا، دیر تک روتے رہے، اس کے بعد حضرت ﷫ نے فرمایا کہ آؤ اب مضائقہ نہیں، اسی وقت انہیں مرید کیا، سب جانتے ہیں کہ اسی وقت سے پھر وہ ان نامشروع امور کے گرد تک نہ گئے، اور نہایت پابند صوم و صلوٰۃ اور درود وظائف کے ہوگئے۔ لوگ ان کی حالت دیکھ کر متحیر ہوتے ہیں، مگر ان کی صحبت کے فیضان سے مردہ دلوں کا زندہ ہو جانا بڑی کرامت ہے"

اس سفر میں بیعت کرنے والوں کا بہت ہجوم رہا۔ بیس اور پچیس میل تک کے لوگ آکر بیعت ہوئے۔ ان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے۔ مونگیر کے ایک رئیس کریم بخش مرحوم جو تعیش کے دلدادہ اور کھلے ہوئے فسق و فجور میں مبتلا تھے اور شراب کے اس قدر عادی تھے کہ سب چھوڑنا ان کے لئے آسان تھا لیکن اس کو چھوڑنا ناممکن تھا، ان کی زندگی بھی مولانا کے فیض صحبت سے ایسی تبدیل ہوئی کہ رنگ ہی دوسرا نظر آنے لگا اور یہ تبدیلی بھی ایک خاص واقعہ سے ہوئی۔

"ایک مرتبہ معمول کے مطابق شراب کا دور چل رہا تھا۔ کریم بخش نے جام ہاتھ میں لیا تو دیکھا کہ مولانا چلے آرہے ہیں، گلاس ہاتھ سے چھوٹ گیا اور محفل چھوڑ کر گھر چلے گئے گھنٹہ کے بعد کھانے سے فارغ ہو کر جب ان

(۱) کرامات، ص ۷

کی بیوی نے جام آگے بڑھایا تو پھر نیت بدل گئی۔ گلاس ہاتھ میں ٹھیک سے آیا بھی نہ تھا کہ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے مولانا سامنے صحن میں کھڑے ہیں، کانپ گئے، اور بے ہوش ہوکر گر پڑے، جب ہوش آیا تو بات سمجھ میں آئی، رات اگرچہ کافی ڈھل چکی تھی لیکن اسی وقت غسل کیا، کپڑے بدلے اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، بقیہ شب مسجد میں گذاری اور صبح مولانا کی زیارت سے مشرف ہوئے، اور تجدید بیعت کی (۱)

مولانا کا دوسرا سفر حج

مولانا کا دوسرا حج اسی بے سر و سامانی کی حالت میں ہوا جس حالت میں پہلا سفر ہوا تھا۔ مولانا نے حسب عادت لوگوں کو اس کی اطلاع دی۔ بظاہر تنگی اور دشواری تھی لیکن سارے کام بہت آسانی اور خوشی کے ساتھ انجام پا رہے تھے اور پورا اطمینان اور فراغت حاصل تھی۔ اپنے ایک عقیدت مند میاں ابراہیم خاں کو مکہ معظّمہ سے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"اب مدینہ طیبہ کا ارادہ ہو رہا ہے مگر اختیار سرکار میں ہے، جب تک چاہیں یہاں رکھیں اور جب چاہیں وہاں لے جائیں، یہ بھی اسی کی قدرت ہے کہ ہم سے ضعیف و ناتواں کو یہاں آرام سے لایا اور آرام سے رکھا، جس طرح کے مصارف ہوئے اور ہو رہے ہیں، امیروں کا کام ہے" (۲)

اس مدت میں مولانا نے جو خطوط اپنے مریدین اور خلفاء کو بھیجے ان میں ہر خط فنائیت اور خود شکنی اور شکر و عبودیت کا مظہر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی عظمت و کبریائی اور اپنی پستی، بے مائیگی اور بے بسی کا استحضار مولانا کو ہر وقت رہتا تھا اور کسی وقت یہ حقیقت ان کو نظروں سے اوجھل نہ ہوتی تھی، یہ سفر ۲۸، رمضان ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۹ء میں ہوا، اور ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۱ء میں واپسی ہوئی، لیکن اس دو سال کے قیام کے حالات بہت مختصر ملتے ہیں، اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ مولانا کا فیض وہاں بھی جاری رہا، اور بہت سے علماء اور اہل طلب بیعت سے سرفراز ہوئے۔ ان میں شیخ محمد جعفر مطوف رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ ابو بکر حماد مکی رحمۃ اللہ علیہ مدرس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس موقع پر ممباسہ کے ایک عالم شیخ حاجی ابراہیم بھی مرید ہوئے

---

(۱) کمالات محمدیہ، (اضافات) باختصار، ص ۳۱۲ (۲) کمالات محمدیہ، ص ۲۵۷

اور خلافت سے بھی سرفراز ہوئے۔ افریقہ جاکر اسلام کی تبلیغ شروع کی، اور سیکڑوں غیر مسلموں کو مشرف باسلام کیا۔ یہ بزرگ مولانا کی آمد سے پہلے مدینہ منورہ میں مقیم تھے، اور روزانہ مسجد نبوی ﷺ میں درود و سلام کے بعد دعا کرتے کہ مرشد کی طرف رہنمائی ہو۔ ایک روز خواب میں حضور ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اور ارشاد فرمایا کہ میرا لڑکا اس سال حج بیت اللہ کو آرہا ہے اس سے مرید ہو جانا۔ ۱۳۰۵ھ میں ان کو مولانا کی تشریف آوری کی اطلاع ہوئی، بیساختہ دل کو ان کی طرف کشش ہوئی اور حاضر ہو کر بیعت کی۔ پھر عقیدت و محبت کا یہ حال ہوا کہ ایک روز مولانا کے پر تکلف دعوت کی، اور اپنے تمام ملبوسات راہ میں بچھادئے تاکہ مولانا اس پر قدم رکھ کر اندر تشریف لائیں۔ مولانا اپنے زمانۂ قیام میں برابر ان کی تربیت کرتے رہے اور آخر میں خلافت بھی عطا فرمائی۔ ان کے پاس ایک رجسٹر تھا جس میں تقریباً ۷۰۰ نو مسلموں کے نام درج تھے (۱)

شیخ ابو بکر حماد مکی ؒ نے جو مولانا کے مرید تھے، مولانا کو اپنے خط کے ساتھ چائے اور فنجان کا ایک سیٹ تحفۃً بھیجا تھا۔ اس کے جواب میں مولانا نے ان کو عربی میں خط لکھتے ہوئے اپنے سلسلہ کی اجازت و خلافت دیتے ہیں (۲)

"فعليكم أن تجتهدوا في احياء سنن من شرفتم بجواره، وافتخرتم بفخاره فيالهامن فخار وعليكم بغاية السعي في احياء شريعته الغراء وطريقته الفيحاء باخلاص النية وحسن الطوية، وعليكم اخذالبيعة عن خلافةلمن يريدأن يدخل في سلك احبائي وطريقة مشائخي الكرام الخ"

حج سے واپسی پر مخلوق سے دل گرفتگی اور خلوت پسندی کا رجحان بڑھ گیا، اس کے ساتھ کتابوں سے رغبت زیادہ پیدا ہوگئی لیکن ارشاد و اصلاح اور تزکیہ و تربیت کا کام پوری طرح جاری رہا، اور اس فیاض اور شفاف چشمہ سے نہ معلوم کتنے تشنہ کاموں نے اپنی تشنگی اور خستگی دور کی اور کتنے گم گشتگان راہ کو منزل کا سراغ ملا۔

---

(۱) حاجی ابراہیم کے صاحبزادہ حاجی محمد صاحب نے مولانا منت اللہ رحمانی کے نام ایک مکتوب میں یہ سب باتیں درج کی ہیں۔ حاجی محمد صاحب اس حج میں اپنے والد کے ساتھ تھے۔ ۱۲

(۲) اس خط میں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کا عربی اسلوب کتنا سلیس، شگفتہ اور تصنع و تکلف سے پاک تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں جس اسلوب کا رواج تھا یہ اسلوب اس سے بہت مختلف ہے اور اس میں خاصی روانی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ ۱۲

مولانا کے اثرات اور فیض و تربیت وارشاد صرف بہار اور غیر منقسم ہندوستان تک ہی محدود نہ تھے، ہندوستان کے باہر بھی ان کے خلفاء اور مسترشدین کے ذریعہ اور حجاز میں خود ان کے زمانۂ قیام میں جس کی مدت دونوں حج ملا کر تین سال ہوتی ہے، یہ شمع سرد دلوں کو گرماتی رہی اور طالبان حق اس سے ایمان کی حرارت اور یقین کی طاقت حاصل کرتے رہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس کا مرکز بہار ہی رہا، اور بہار میں بھی مونگیر، بھاگلپور، دربھنگہ اور عظیم آباد میں خاص طور پر مولانا کے مریدین کی بہت بڑی تعداد تھی، لیکن اس کے علاوہ بنگال کے لوگ بھی برابر آتے رہتے تھے اور بیعت کر کے واپس ہوتے تھے۔

مولانا کے پہلے سفر حج کے بعد جس کی تفصیل گزر چکی ہے اس کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا تھا، ان آنے والوں میں اہل علم حضرات کی بھی خاصی تعداد ہوتی تھی۔ حیدرآباد، بھوپال، بمبئی، دہلی کے لوگ بھی خاصی تعداد میں بیعت ہوئے ہندوستان کے باہر حجاز کے علاوہ زنجبار، ممباسہ، کابل، غزنی، خراسان اور روس و چین تک کے اہل طلب اور علماء خدمت میں حاضر ہو کر مستفید ہوئے اور یہ دولت بیدار لے کر واپس ہوئے، ان میں سے بعض نے اپنی پوری زندگی ہندوستان میں گزار دی اور یہیں آسودۂ خاک ہو گئے۔

ایک ممتاز چینی عالم کی بیعت اور واردات

ان غیر ملکی مسلمانوں میں ممتاز چینی عالم مولانا نور الحق رحمۃ اللہ علیہ کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، جو اپنے ملک کے ایک ممتاز اور مشہور عالم ہونے کے باوجود اہل حق کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے، حج کے ارادہ سے چلے تھے لیکن کوئی جذب اندروں کشاں کشاں ہندوستان لے آیا، اور بالآخر مولانا کے یہاں حاضر ہو کر اپنی ساری زندگی یہیں گزار دی۔ ان کی ملاقات مولانا سے کانپور میں ہوئی تھی۔ مولانا کے متعلق فرماتے ہیں کہ۔

"کبھی دو منٹ بھی ان کو ضائع کرتے نہیں دیکھا گیا، ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے اسلاف کی روش اور طریقہ یہی ہوتا ہوگا مصنف "کمالات محمدیہ" نے ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ملک چین کے رہنے والے اور وہاں کے مشہور اور مستند علماء میں سے تھے، ان کی ذات سے اس ملک (چین) میں بہت فیض ہوا، تقریباً دو ہزار طلبہ نے آپ سے علوم عربیہ پڑھا،

بہت معزز خاندانی عالم تھے، کسی وقت آپ کے اجداد فغفور چین کے وزیر تھے۔ مکان سے حج کے ادارہ سے چلے، صاحب تصانیف تھے، بعض تصانیف چھپوانا بھی چاہتے تھے، سلوک باطنی کا بھی شوق تھا، اس وقت حضرت اقدس کانپور میں رونق افروز تھے، آپ وہاں تشریف لائے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس مسجد دلاری میں قیام فرمایا۔ خاندان نقشبندیہ میں آپ مرید ہوئے اور تعلیم سے سرفراز ہوئے اور ایک سال تک ایسی محنت کی کہ لوگ متحیر ہوگئے۔ حضرت اقدس فرماتے تھے کہ کبھی نہ دیکھا کہ دو منٹ بھی کسی سے فضول بات کی ہو یا کسی طور اپنا کوئی وقت ضائع کیا ہو۔ شب کو بعد عشاء لیٹ رہتے تھے اور ٹھیک ۱۲ بجے اٹھ کر تہجد و وظائف میں مشغول ہو جاتے تھے، اشراق کی نماز تک یاد خدا میں مشغول رہتے تھے۔ چاشت کی نماز کے بعد فوراً پڑھانے بیٹھ جاتے، دو طالب علم چینی ہمراہ تھے انہیں پڑھاتے، پھر شرح وقایہ کا حاشیہ لکھتے تھے اور اسے چھپوانا چاہتے تھے، کیونکہ چین کے علماء میں یہ کتاب نہایت مستند داخل درس ہے۔ علم حقائق و تصوف میں آپ کی کتاب "شرح الطائف" میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانہ میں دیکھی ہے حضرت رحمۃ اللہ علیہ ان کی نسبت فرماتے تھے کہ یادگار سلف تھے ان کی حالت دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے بزرگوں کا یہ طریقہ اور یہ روش ہوگی، انہوں نے اپنی عمر میں اس قدر کام کئے کہ سمجھ میں نہیں آتا، آپ کا انتقال کانپور ہی میں ہوا"

درویشی و سلطانی

طالبین کے ہجوم اور کثرت کا یہ عالم تھا کہ اکثر کھانے کے وقت سو سو آدمی دسترخوان پر کھانا کھاتے۔ ذاکرین و شاغلین کیلئے کافی تعداد میں حجرے تھے۔ زائرین کیلئے مہمان خانے تھے، جہاں لوگ آکر کئی دن ٹھہرتے اور فیض صحبت و تربیت حاصل کر کے واپس ہوتے ...... مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے چشم دید مشاہدات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"خاکسار نے براہ راست حضرت مولانا محمد علی مونگیری نور اللہ مرقدہ سے سنا تھا کہ ان کے پیر و مرشد مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ رخصت کرتے ہوئے ایک مٹھی چنے آپ کی گود میں ڈال دیئے اور فرمایا کہ، لو یہ دنیا دیتا ہوں۔ گو دینے کو تو صرف ایک مٹھی چنے ہی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دیئے تھے، لیکن حق سبحانہ و تعالیٰ نے مولانا محمد علی صاحب قدس سرہ کو دین

کے سواد نیا میں بھی رفاہیت وکشادگی وفراخی عطا فرمائی تھی۔ شاید بڑے بڑے نوابوں اور امیروں کیلئے آپ کی زندگی کا یہ رخ قابل رشک بنا ہوا تھا۔ خاکسار نے خود دیکھا تھا کہ صرف چائے جو خانقاہ رحمانیہ میں خرچ ہوتی تھی، پندرہ سیر یا آدھ من روزانہ سے کم شکر کے صرفہ کا تخمینہ اس کیلئے نہیں کیا جاسکتا ایک باغ میں کوٹھی، مسجد، خانقاہ سب کا انتظام غیب سے کیا گیا تھا" (۱)

مولانا کے بعض دوروں اور لوگوں کے ہجوم شوق کی کچھ تفصیلات گذشتہ اوراق پیش کی گئی ہیں لیکن یہ کوئی اتفاقی واقعات نہ تھے، مولانا کے اکثر وبیشتر سفروں کا یہی حال تھا کہ ہر اسٹیشن پر بڑی تعداد میں لوگ ملاقات واستفادہ کیلئے حاضر ہوتے حالانکہ بعض اوقات کوئی اطلاع بھی نہ ہوتی، بعض وقت ایسا ہوا کہ صاحب خانہ کو ایک ایک ہزار آدمیوں کی ضیافت کرنی پڑی ضعف بڑھ جاتا تو پالکی پر آمدورفت ہوتی، اس وقت معمولی فاصلوں میں کہاروں کی نوبت کم آنے پاتی علماء اور اشراف اپنے کاندھوں پر پالکی اٹھانے کو سعادت سمجھتے، اور بلا جھجک یہ خدمت انجام دیتے۔ مستقل قیام کی صورت میں اضافہ بھی ہو جاتا، تہجد کے لئے تین بجے بیدار ہوتے تھے اور اس وقت تقریباً ایک گھنٹہ کیلئے خصوصی نشست ہوتی تھی (۲)

مصنف "کمالات رحمانی" نے درویشی وسلطانی کے اس عجیب وغریب اجتماع کے متعلق لکھا ہے۔

"مولوی صاحب موصوف باوجود اہل وعیال وخانقاہ جس میں کثیر خلقت آکر ٹھہرتی ہے بس متوکل علی اللہ ہیں، کھانا امیرانہ ہے، ایک رئیس آتے اور شام کو کثرت سے لالٹین میں تیل بھرتے، جو دیکھا تو کہا کہ خدا جانے کتنے کمرے ہیں، ایک بڑے نواب کی شان سے آپ کی زندگی ہے اور عمارت وباغ اور اس کے ملازم کثیر دیکھ کر لوگوں کو حسد ہوتا ہے، اور سب کی عقل حیران ہے کہ عمارت کا کارخانہ اتنا بڑا ہے کہ کسی امیر کا نہیں ہے، مسافر غیر متناہی آتے ہیں کھاتے ہیں اور بعضے ایک ہفتہ اور بعضے ایک مہینہ ٹھہرتے ہیں" (۳)

---

(۱) سوانح قاسمی جلد سوم، ص، ۹۴ (۲) مقالہ متعلقہ سوانح از مولانا منت اللہ رحمانی، ص ۷۴ ودیگر مصادر
(۳) کمالات رحمانی، ص ۵۲

چار لاکھ مریدین

مولانا شاہ تجمل حسین بہاری خلیفہ مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ ومصنف "کمالات رحمانی" نے اپنی کتاب میں مولانا کا ذکر کرتے ہوئے ان کے مریدین کی تعداد چار لاکھ بتائی ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"مولانا فضل الرحمٰن قدس سرہ کی فقیری اور مولویت کو بجز مولوی مولانا محمد علی صاحبؒ خلیفہ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے کسی نے نہیں پھیلایا، چار لاکھ کے قریب مریدین آپ کے ہیں، ہند میں، عرب میں، افریقہ میں، زنجبار وغیرہ میں ہیں" (۱)

اگر اس اندازہ کو مبالغہ یا حسن عقیدت پر محمول کیا جائے تب بھی اس میں شک نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے مریدین کا حلقہ بہت وسیع تھا اور ہزاروں سے یقیناً متجاوز ہو چکا تھا۔ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مولانا کو چاروں سلسلوں کی اجازت عطا کی تھی، ایک تسبیح، ایک چادر اور ایک ٹوپی بطور خرقہ کے بھیجی تھی۔ اجازت نامہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ضیاء القلوب پر اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے (۲)

تربیت واصول تربیت

مولانا کے اندر تربیت میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں اور بنیادی معلوم ہوتی ہے، وہ "محبت" اور "اطاعت" ہے۔ یعنی ایک طرف مسلمان کا دل سوز وگداز اور عشق ومحبت سے لبریز ہو، دوسری طرف وہ طریق سنت اور جادۂ شریعت سے ایک قدم منحرف نہ ہو اور دونوں کے حدود کا ہر وقت خیال رکھے، وہ

ضبط محبت، شرط محبت

کے قائل تھے، اور خود ان کی زندگی بھی اسی کا نمونہ تھی۔

دوسری طرف وہ ہر مسترشد سے اصلاح وتربیت کا قریبی اور عملی تعلق قائم رکھتے تھے۔ یہ تعلق اس نوعیت کا تھا کہ ہر شخص یہ سمجھتا کہ میرے حال پر مولانا کی شفقت وعنایت سب سے زیادہ ہے۔ مولانا کے مسترشدین اور خلفاء کی تحریروں، خطوط اور تصانیف میں اس کا بکثرت اظہار ملتا ہے۔ فراخ دلی اور وسیع النظری مولانا کے خمیر اور افتاد طبع میں داخل تھی۔ اس لئے

---

(۱) کمالات رحمانی، ص ۴۵۰ (۲) مقالہ از مولانا رحمانی وکمالات محمدیہ

سختی اور تشدد کی نوبت ہی نہ آتی تھی، وہ ان کے حالات کی خبر رکھتے تھے اور بعض اوقات تربیت کے ساتھ اگر ضرورت ہوتی تو خود ان کی مالی اعانت کرتے، اپنی ذات کے لئے ان سے خدمت لینے اور ان کی اعانت قبول کرنے کی نوبت شاید آتی ہی نہ تھی۔

زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ میں جو چیز ملتی ہے وہ قرض ہے، جو بہت شدید ضرورت کے وقت مولانا کسی اہل تعلق سے لیتے تھے، پہلے حج میں مولانا کے پاس واپسی کے لئے روپیہ نہ تھا، اس وقت ایک صاحب نے کچھ رقم پیش کرنی چاہی، مولانا نے اس کو قرض کی حیثیت سے قبول کیا، اور جلد ادائیگی کی۔ کسی کو تنبیہ اور رہنمائی اس انداز میں نہ کرتے تھے کہ اس کی دل شکنی ہو، اور لوگوں بلا ضرورت اس کا علم ہو .... مولانا عبدالعزیز بہاری مصنف "کرامات محمدیہ" بیان کرتے ہیں کہ۔

"مظفر پور کے قیام کے زمانہ میں ایک بار حضرت اقدس کے آستانہ پر بسواری ریل مونگیر آرہا تھا، صاحب پور کمال میں جس خانہ میں بیٹھا تھا کہ ایک بازاری عورت میرے منع کرنے کے باوجود اسی خانہ میں آکر بیٹھ گئی، اور کچھ اس طرح بے حجابانہ طور سے سامنے آکر بیٹھی کہ احتیاط کرنے پر بھی اس پر نگاہ پڑ جاتی تھی، بشریت کے تقاضے سے خوامخواہ دل میں برے خیالات پیدا ہوئے۔ جب حاضر دربار فیض آثار ہوا اور حضرت اقدسؒ کی ملازمت سے شرف یاب ہوا تو مجلس عام تھی۔ کچھ دیر کے بعد آپ نے فرمایا کہ جناب امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی مجلس میں ایک ایسا شخص وارد ہوا جو راستہ میں کسی نامحرم پر نظر بد کئے ہوئے تھا، اور آپ کی مجلس میں بیٹھ گیا، آپ کی طبیعت اسے دیکھ کر منقبض ہوئی اور فرمایا کہ میرے پاس ایسے لوگ آتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے، جس کی نسبت آپ نے یہ الفاظ فرمائے تھے وہ سن کر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا کہ یا امیر المومنین خدا تعالیٰ کی طرف سے اس وقت آپ کو الہام ہوا جو آپ نے ایسا ارشاد فرمایا؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ مجھ کو الہام نہیں ہوا بلکہ مومن کی فراست ہے، اسکے بعد یہ حدیث پڑھی، "اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله" اس تذکرہ کے بعد حضرت اقدس نے فرمایا کہ نامحرم پر نظر کرنے سے گناہ بے لذت

کے سوا کیا فائدہ ہے، جامع اوراق نے غور کیا کہ یہاں پر سوا میرے کوئی ایسا شخص نہیں معلوم ہوتا جو اس جملہ کا مخاطب ہو" (۱)

رسول اللہ ﷺ کا یہ طریقہ اور دستور تھا کہ اپنی مجالس میں عمومی بات کہتے تھے، اور سمجھنے والا سمجھ جاتا تھا۔ مولانا نے اصلاح و تربیت میں اسی اصول کو ہمیشہ مدنظر رکھا، اور ایسے مواقع پر ہمیشہ عمومی بات کہنے پر اکتفا کیا، یا اشارہ اور کنایہ سے کام لیا، بے تکلف خادموں اور قریبی تعلق رکھنے والوں سے بھی مولانا اسی انداز میں بات کرنا پسند کرتے تھے اور دل شکنی سے بہت بچنا چاہتے تھے۔ یہ نبوی طریقہ تربیت ان طالبان حق کے لئے بہت مفید اور مؤثر تھا، جن میں ہر طبقہ اور ہر استعداد کے لوگ تھے۔ اس میں انسانی فطرت اور نفسیات کی پوری رعایت تھی، اور انسان کے معاندانہ اور "جوابی جذبہ" کو ابھرنے اور قبول اصلاح میں رکاوٹ بننے کا موقع بھی بالکل نہ ملتا تھا۔ اس انتظام و پیش بندی کے بعد انہوں نے محبت کی اس دعوت عام کا اعلان کیا، جس میں کسی کی کوئی تفریق اور امتیاز و تخصیص نہ تھی، انہوں نے اپنے مخلصین اور اہل تعلق سے بارہا فرمایا کہ۔

"شروع میں کچھ محنت ضرور ہے، جب دل محبت سے بھر جائے گا تو پھر برسوں کا کام گھنٹوں اور منٹوں میں ہونے لگے گا" (۲)

ان کے نزدیک سارا تصوف اور سارا مجاہدہ اور روحانی کمال یہ ہے کہ آدمی سب کچھ کرے لیکن اس کا دل ہر وقت خدا کی یاد میں لگا رہے۔ وہ کہتے تھے کہ۔

"اصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے رابطہ اور واسطہ پیدا ہو"

مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے انہوں نے ایک قول نقل کیا ہے کہ

"بہت سے لوگ میرے پاس آئے جن کا ہر بن مو ذاکر تھا مگر انہیں خدا سے کوئی واسطہ نہ تھا" (۳)

ایک مرتبہ فرمایا۔

"آنکھ سے دیکھو، کان سے سنو، ہاتھ سے کام کرو، اور دل کو اس کے ساتھ مشغول

---

(۱) کرامات محمدیہ، ص ۱۴ (۲) نصائح بنام مولوی شرافت حسین صاحب، ۱۲

(۳) نصائح بنام مولوی شرافت حسین صاحب، حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت کے روز بہت سے علماء، قراء اور زہاد ایسے ہوں گے جن کو عذاب دیا جائے گا اور کہا جائے گا جس مقصد کیلئے تم نے یہ سب کچھ کیا تھا وہ تمہیں حاصل ہو گیا اب یہاں تم کو کیا چاہئے۔

رکھو"(۱) مولانا فرماتے تھے کہ۔

"مرشد کی تلاش میں عجلت سے کام نہ لینا چاہئے، جسے دیکھے کہ شریعت کا پورا پابند ہے، عبادت اور معاملات میں ٹھیک ہے، اس کی صحبت میں خدا یاد آتا ہے، دنیا کی محبت میں کمی ہوتی ہے، اس سے بیعت کر لے"

بالخصوص علماء اور تعلیم یافتہ حضرات بیعت کی درخواست کرتے تو ان کو اکثر یہ فہمائش کرتے عوام اور ناخواندہ لوگوں سے یہ بات نہ کہتے تھے کہ ان کے لئے یہ جستجو اور تلاش بھی مشکل ہے۔ طالبین و مسترشدین کے لئے ایک قانون نہ تھا بلکہ ہر شخص کو اس کی استعداد اور صلاحیت اور حالات کے مطابق ہدایات اور مشورے دیتے تھے۔ عام طور پر قرآن مجید کی زیادہ سے زیادہ تلاوت پر زور دیتے تھے، اس کے بعد درود و استغفار و ذکر وغیرہ۔ استغفار کے متعلق یہ فرماتے تھے کہ۔

"پچھلی شب آنکھ کھل جائے تو اس وقت نہایت توجہ اور حضور قلب سے اپنے گناہوں کا خیال کرو اور استغفار پڑھا کرو، اللہ تعالیٰ نے اچھے لوگوں کی جو خوبیاں بیان کی ہیں اس میں یہی فرمایا ہے کہ "بالاسحارھم یستغفرون"(۲)

ذکر و شغل کی حکمت اور فائدہ بیان کرتے ہوئے مولانا ایک بہت اہم حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

"صوفیائے کرام نے جو ذکر و شغل بیان فرمائے ہیں ان کا اصلی مقصود یہ ہے کہ احکام شرعی جیسا ہونا چاہئے اسی طرح پر ادا ہونے لگیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔" ان تعبدربك كانك تراه وان لم تكن تراه فانه یراك "یعنی کمال ایمان اس مرتبہ کو پہنچ جائے کہ عبادت کے وقت غلبۂ محبت سے اس قدر اسے حضوری ہو کہ گویا خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے وہ اس کے ساتھ موجود ہے، اور ادنیٰ مرتبہ حضوری کا یہ ارشاد ہوا کہ یہ خیال بندھ جائے کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے"(۳)

مولانا فرماتے ہیں۔

---

(۱) نصائح بنام مولوی شرافت حسین صاحب (۲) کمالات محمدیہ، ص ۱۴۰ (۳) کمالات محمدیہ، ص ۱۱۷

"طالب اس زمانہ میں گویا مفقود ہیں، اوّل تو کسی کو یاد خدا کا خیال نہیں ہوتا، بلکہ ان باتوں کو کوئی بدعت کہہ کر لوگوں کو ہٹاتا ہے، کوئی کہتا ہے ترقی سے مانع ہیں، اب اگر کسی کو توجہ ہوئی تو طلب نہیں ہوتی، ہوس ہوتی ہے، جس طرح کوئی شخص کسی چیز کو عمدہ سمجھ کر خواہش کرتا ہے اسی طرح اسکی بھی خواہش بعض کرتے ہیں، طلب میں اور ہوس میں بڑا فرق ہے، طالب کسی وقت محنت سے نہیں تھکتا اور وہ محنت اسے گراں نہیں معلوم ہوتی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ وہ حصول طلب سے کبھی مایوس نہیں ہوتا، اسوقت کے طالبوں میں یہ بات نہیں پائی جاتی تھوڑے دنوں میں تھوڑی سی محنت کر کے تھک جاتے ہیں اور مایوس ہوکر چھوڑ دیتے ہیں اس لئے وہ محروم رہ جاتے ہیں" (۱)

مولانا ان اوراد و وظائف پر اصرار مفید نہ سمجھتے تھے جو اکثر صوفیہ و مشائخ کے یہاں رائج ہیں، اور عمومی اصلاح و تربیت کے لئے ان کا یہ ارشاد تھا کہ۔

"شریعت پر عمل کرو، جو وظائف حدیثوں میں آئے ہیں وہ انہیں کے لئے زیبا ہیں جو خاص اسی کام کے ہو جاتے ہیں، اگر تم نے کچھ کیا، اور وہ پورے طور پر نہ ہوا، تو کوئی فائدہ نہیں گا" (۲)

مولانا فرماتے ہیں۔

"طالب خدا تعالیٰ کو اور شریعت مصطفیٰ ﷺ کے چلنے والے کو بہت ضروری ہے کہ جو حکم جس مرتبہ کا ہے اسی پر رکھے، کمی بیشی نہ کرے، اور اپنے اعتقاد میں وہی مرتبہ اس کا سمجھتا رہے، مستحب کو واجب و فرض نہ خیال کرے، یعنی مستحب کے تارک کو ایسا برا اور لائق ملامت نہ سمجھے، جیسا کہ تارک فرض و واجب کو سمجھنا چاہئے، کیونکہ مستحب کا ترک جائز ہے، اس وجہ سے اگر کسی نے ترک کر دیا تو وہ ملامت کا مستحق نہیں ہو سکتا، خصوصاً اس وقت میں کہ شریعت پر چلنا دشوار ہو گیا ہے۔ یہاں زیادہ غور طلب اور ضروری یہ کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص مستحب کو بدعت کہہ دے اور اس سے انکار کرے تو اس کا کیا حکم ہے، اس وقت اسی بنیاد پر بہت جھگڑے رہتے ہیں اور اکثر طرفین

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۱۲۱ (۲) کمالات محمدیہ، ص ۱۲۲

سے افراط و تفریط ہو جاتی ہے، ایسے کم حضرات دیکھے جاتے ہیں جو افراط و تفریط کو چھوڑ کر میانہ روی اختیار کریں، اور عوام کو امر حق اس طرح سمجھائیں کہ وہ سمجھ جائیں کہ اس قدر زیادتی و کمی ہے، اس قدر غلط ہے اور اس قدر صحیح امر ہے، جس پر ہمیں عامل ہونا چاہئے .... مستحب کی دو قسمیں ہیں، وہ مستحب جن کا ثبوت جناب رسول اللہ ﷺ کے فعل سے یا خلفائے راشدین کے قول و فعل سے ثابت ہے، اس کو کوئی بدعت نہیں کہہ سکتا، اور جو کہے وہ غلطی کرتا ہے۔ باقی رہا وہ مستحب جس کا ثبوت صرف اگلے بزرگوں کے اقوال وافعال سے ہوتا ہے، اسے کوئی بدعت کہے اور اس پر عمل نہ کرے تو اس کی مختلف حالتیں ہیں، عمل نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کا خیال رہے کہ اس فعل کو اگر سب کرنے لگیں گے تو عوام کا اعتقاد خراب ہو سکتا ہے۔ اور عوام کو اس غلط اعتقاد سے بچانا ضروری ہے، یا کوئی بڑے پایہ کا شخص ہے، وہ جانتا ہے کہ اگلے بزرگوں نے یہ فعل جس مصلحت سے کیا ہے وہ مصلحت اس وقت نہیں ہے، اور جناب رسول اللہ ﷺ نے یا خلفائے راشدین نے اسے کیا نہیں، اس لئے نہیں کرتا، ایسا شخص ملامت کے لائق نہیں ہو سکتا بلکہ تعریف کے لائق ہے .... مسلمانوں کا اور خصوصاً اہل علم کا ایسے فعل کو بدعت کہہ کر اس قدر شور کرنا کہ باہم فتنہ و فساد قائم ہو جائے نہایت برا ہے"(۱)

مولانا عصمت اللہ (۲) کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"بزرگوں کی دو حالتیں ہوتی ہیں، ایک اتباع شریعت کی اور دوسری عشق و محبت کی۔ بعضوں پر اتباع شریعت غالب ہو جاتا ہے اور نسبت عشقیہ مغلوب ہو جاتی ہے، اور بعضوں پر عشق و محبت کا غلبہ ہوتا ہے اور بوجہ غلبۂ

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۱۲۹، ۱۳۰

(۲) مولانا عصمت اللہ صاحب بختاور گنج مئو (اعظم گڑھ) کے رہنے والے تھے، جید عالم اور قادیانیت کے زبردست حریفوں میں ان کا شمار تھا۔ رد قادیانیت میں انہوں نے بڑی خدمت انجام دی۔ ایک مرتبہ تقریباً ۱۰ ہزار مسلمان (جن کے متعلق یہ اندیشہ تھا کہ عنقریب قادیانی ہونے والے ہیں) مولانا کی سعی اور تقریر کے اثر سے اس فتنہ سے محفوظ رہے۔ مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت و محبت کا خاص تعلق تھا۔ مولانا احمد حسن کانپوری رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ مدرسہ احمدیہ (آرہ) میں عرصہ تک درس دیا۔ نزہۃ الخواطر (جلد ہشتم) میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔ ۱۲

حالت کے بعض احکام شریعت کا لحاظ نہیں رہتا، مگر جن بزرگوں کو خدا نے عالی فطرت اور بلند حوصلہ پیدا کیا ہے ان پر دونوں حالتیں طاری ہوتی ہیں اور وہ دونوں کو اپنے موقع اور محل پر رکھتے ہیں "مرج البحرین یلتقیان بینهما برزخ لایبغیان" (۱)

شاہ رحمت اللہ مظفر پوری رحمۃ اللہ علیہ نے جو مولانا کے خلفاء میں ہیں تعلیم و تلقین کی اجازت چاہی تھی اور کچھ تعویذ وغیرہ کے متعلق دریافت کیا تھا۔ مولانا ان کو جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ کا نام جو پوچھے بتانا چاہئے، مگر اپنی اصلاح کا خیال مقدم رہے اگر تمام دنیا نجات پا جائے اور ہم رہ جائیں تو ہمیں کیا، ہم سا بدنصیب کون؟ ہمارے مقدس مذہب اسلام کا اصل اصول توحید ہے، مگر یہ زبانی توحید نہیں جو اس وقت کے نا آشنا حضرات کی زبان زد ہے، بلکہ وہ حالت ہے جس سے مسلمان کے دل میں اسی ایک کی محبت کا جوش ہو اس کی زبان پر اسی واحد کا نام ہو، اور اس کی آنکھوں میں وہی ایک سما جائے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

اس قدر رہتا ہے مجھ کو آپ کی باتوں کا دھیان
جب کوئی بولا صدا کانوں میں آئی آپ کی

"جب تک یہ حالت پیدا نہ ہو، نہ عبادت میں خلوص ہوتا ہے، نہ اس میں لطف آتا ہے، صرف ایک رسم ادا ہوتی ہے"

آگے لکھتے ہیں۔

زبان سے وظیفہ پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا، دل ادھر لگانا چاہئے تاکہ وہ دل میں بس جائے، ماسوا اللہ تعالیٰ دل سے نکل جائے، تعویذ وغیرہ تو پیر و مرشد علیہ الرحمہ نے تعلیم ہی نہیں کیا تھا بلکہ جو معلوم تھا وہ بھی بھلا دیا۔ ہاں یہ فرمایا کہ زبان میں وہ بات پیدا کرو کہ وہ تعویذ ہو جائے" خط کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں۔

"مجھے شاہ اور ناظم (۲) نہ لکھا کیجئے، گدا کو شاہ کہنا شاہوں کے ساتھ بے ادبی اور اس گدا کی ہنسی ہے" (۳)

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۲۳۲ (۲) یہ ۱۳۲۱ھ کی بات ہے مولانا حال ہی میں ندوہ سے مستعفی ہوئے تھے، اور مونگیر میں قیام تھا اس لئے بعض لوگ اس وقت تک خطوط میں مولانا کو ناظم لکھتے تھے۔ ۱۲ (۳) کمالات محمدیہ، ص ۲۶۷

ارشاد رحمانی

مولانا کی مختصر لیکن ایک اہم تصنیف "ارشاد رحمانی" ہے جو سلوک و آداب طریقت کے موضوع پر ہے، اور اس میں آج بھی وہ تاثیر باقی ہے کہ پڑھنے والے کا دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور اس کے قلب پر مصنف کے اخلاص وللّٰہیت کا عکس پڑتا نظر آتا ہے، یہ کتاب کا سب سے بڑا اور بنیادی وصف ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ کے حوالہ سے ایک جگہ چند اشعار لکھے ہیں اور لکھا ہے کہ مولانا فرماتے تھے کہ۔

"ان اشعار کو درد و سوز کے ساتھ پڑھنے سے روحانی بالیدگی، صفائی باطن اور سرور و کیف حاصل ہوتا ہے"

تقریباً یہی بات مولانا کی اس تصنیف کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے، اس کے مطالعہ سے بھی قلب میں ایک قسم کا سوز و گداز روحانی سرور اور باطنی اطمینان حاصل ہوتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم تھوڑی دیر کے لئے نئی فضا اور نئے عالم میں پہنچ گئے ہیں اور ہمارے قلب کی حالت خاصی بدل گئی ہے، اس میں گناہ سے نفرت اور نیکی کی رغبت پیدا ہوگئی ہے اور اللہ تعالیٰ سے ایک قسم کی نسبت کا احساس ہونے لگا ہے، یہ فائدہ اور تاثر خواہ کتنا ہی عارضی اور محدود کیوں نہ ہو، بہت خوش قسمتی ہے، اور اگر یہ حالت چند لمحات کے لئے بھی پیدا ہو جاتی ہے تو ہماری زندگی کا سب سے بیش قیمت اور کارآمد حصہ ہے، اور بہت قدر اور حفاظت کے قابل ہے۔ یہ کتاب مولانا نے مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے کئی سال قبل لکھی تھی۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو پورا ملاحظہ فرمایا، اور اس پر یہ عبارت لکھی: "الٰہی ازیں رسالہ مومناں را نفع شود" حررہ: فضل الرحمن غفرله الله تعالىٰ ولآبائه وابنائه ومريديه.

یہ کتاب دراصل مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات وارشادات پر مشتمل ہے، لیکن اس میں خود مصنف کے ابتدائی حالات اور کیفیات کا بھی ذکر ہے اور دوسرے متعدد فوائد ہیں کتاب کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کے ۱۷یا۱۸، ایڈیشن شائع ہوئے، اور بکثرت لوگوں کو اس سے روحانی فائدہ ہوا، اور یہ کتاب ان کے ایمان و یقین میں ترقی کا باعث ہوئی۔ مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے حجرے کے طاق میں یہ کتاب برابر رہتی تھی، کتاب میں لطائف

واذکار کا بھی بیان ہے لیکن اس انداز میں کہ ایک مبتدی اور عام آدمی کی طبیعت بھی اس سے متوحش نہیں ہوتی اور نہ کسی موقع پر بلا ضرورت اصرار اور بیجا تشدد کا احساس ہوتا ہے، مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بھی تسہیل اور طالب کی قوت واستعداد کا بڑا خیال واہتمام تھا۔ مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کو سوء تنفس کی وجہ سے ذکر نفی واثبات میں کچھ دشواری ہوتی تھی۔ مولانا سے حال عرض کیا، تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "

"زیادہ نہیں تو تین ہی بار کر لیا کرو، اگر بیٹھا نہ جائے تو لیٹے لیٹے سہی"

مولانا یہ لکھ کر فرماتے ہیں۔

"سبحان اللہ کیا تسہیل ہے یہ بھی اتباع سنت ہے کیونکہ الدین یسر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے، حضرات نقشبندیہ نے لکھا ہے کہ ذکر نفی واثبات تین سو مرتبہ سے کم نہ ہونا چاہئے مگر حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے نہ مجھ سے کسی مقدار کی تعیین فرمائی اور نہ کسی اور طالب کو دیکھا گیا، اس کی وجہ بھی تسہیل ہے" (۱)

ذکر کے ایک بڑے فائدہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مولانا اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

"اگر ماسوائے خدا کے کسی سے دل کو تعلق ہو جائے، یا کوئی بری عادت دل میں جگہ پکڑ جائے تو ذکر نفی واثبات میں اسی شئے کی نفی کرے، مثلاً کسی کو مال کی محبت ہے تو اس کے دور ہونے کے لئے لا الہ کہتے وقت یہ خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میرے قلب میں ہے۔ اسی طرح جو مانع پیش آوے اس کو اسی طرح رفع کرے اور جب تک وہ رفع نہ ہو اسی طریقہ کو کئے جائے، بفضلہ تعالیٰ وہ مانع دور ہو جائے گا، خوب تجربہ ہوا ہے" (۲)

حضرت مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ بھی تصور شیخ کی تعلیم دیتے تھے، لیکن کہتے تھے کہ۔

"بے اختیار تصور میں آجائے تو اور بات ہے، اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے، خود صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایسا ہوتا تھا چنانچہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا مقولہ ہے، کانی انظر الی وبیض ساقیہ" (۳) مولانا نے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ۔

"حضرت! تصور شیخ کو رابطہ کہتے ہیں؟

ارشاد ہوا کہ۔

---

(۱) ارشاد رحمانی، ص ۱۲　　(۲) ارشاد رحمانی، ص ۱۲، ۱۳　　(۳) ارشاد رحمانی، ص ۱۴

"تصور یا بے تصور شیخ کی محبت ہونی چاہئے ہم نے کبھی نہیں کیا۔ ہم تو وہی باتیں کرتے تھے جو حدیث میں آئی ہیں۔ اسی سے کلمہ لاالہ الا اللہ جاری رہتا تھا، یاد رکھو کہ جو بات شریعت کے اتباع اور ان اعمال سے حاصل ہوتی ہے جو حدیث میں آئے ہیں وہ کسی سے نہیں ہوتی" (۱)

ایک مرتبہ مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ نے دریافت کیا کہ۔

"کوئی خاص درود شریف ارشاد ہو جس کے پڑھنے سے زیارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوا کرے؟"

ارشاد ہوا کہ :۔

"کوئی خاص درود شریف نہیں ہے، خلوص پیدا کرنا چاہئے" تھوڑے تامل کے بعد ارشاد ہوا کہ۔ البتہ حضرت سید حسن رحمۃ اللہ علیہ رسول نما کو اس درود کا عمل تھا" اللّٰھم صلی علی محمد و عترتہ بعدد کل معلوم لک "اس سے خود انہیں بھی زیارت ہوتی تھی، اور جسے وہ بتا دیتے تھے اسے بھی ہو جاتی تھی" (۲)

ایک مرتبہ مولانا کو خیال ہوا کہ انہیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میسر نہیں، دوسرے لوگ اس سعادت کو حاصل کر رہے ہیں اور ہر وقت خدمت میں حاضر رہتے ہیں۔ یہ خیال دل میں آیا ہی تھا کہ مولانا نے ارشاد فرمایا :۔

"رہنے سے کیا ہوتا ہے، جو بات ہونے والی ہوتی ہے وہ ایک گھڑی میں ہو جاتی ہے (۳)

ایک مرتبہ فرمایا کہ :۔

"نیک بختی اور شے ہے اور ولایت اور چیز ہے ، ولایت محض عنایت خداوندی سے ہوتی ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بیس بیس برس لوگ رہے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ہم بہت چاہتے ہیں مگر کچھ نہیں ہوتا، اور جس کو وہ چاہتا ہے ایک توجہ سے ہو جاتا ہے، یہ ارشاد فرمایا کہ آپ کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ :۔ "پڑھنے پڑھانے سے کیا ہوتا ہے دیکھو میں کچھ قرآن شریف پڑھ لیتا ہوں اور تھوڑا سا کچھ اور "پھر لطف میں آکر فرمایا کہ۔ اللہ تعالیٰ و رسول

(۱) ارشاد رحمانی ص ۱۷ (۲) ارشاد رحمانی ص ۳ (۳) ارشاد رحمانی ص ۳۰

اللہ ﷺ پر جان قربان کرنا چاہئے، اس سے سب کچھ ہوتا ہے، اور چند شعر پڑھے جن میں سے دو شعر یہ ہیں۔

سحر میں سامری کے کیا قدرت — تیری آنکھوں میں جو اثر دیکھا
ہجوم داغ نے میرے یہ گلفشانی کی — کہ اس نے آپ تماشے مہربانی کی

مولانا فرماتے ہیں۔

"یہ باتیں میری طرف خطاب کر کے فرمائیں، اگرچہ اور صاحب بھی بیٹھے تھے۔ اس سے میری اندرونی حالت میں عجیب لطف کا تغیر ہوا، "سبحان من نور قلوب العارفین بنور العرفان" مولانا کے ارشاد و ملفوظات کے بعد مولانا نے چند صفحات میں بہت اختصار، جامعیت اور وضاحت کے ساتھ سلوک و تزکیہ کے آداب اور اس راہ کی اولین شرائط اور مطالبات بیان کئے ہیں جن کا مطالعہ ہر طالب خدا تعالیٰ کے لئے بے حد مفید ہے۔

اذواق و کیفیات

انسان کی عظمت و بلندی کا سب سے بڑا معیار خدا اور خلق خدا کے نزدیک یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن ایک ہو، اور اس کی خلوت اس کی جلوت سے مختلف نہ ہو، اور مومن کامل اور ولی کی عظمت و کمال کا معیار یہ ہے کہ سکر و وجد کی حالت میں بھی کوئی ناروا کلمہ اس کی زبان سے نہ نکلے، اور پیمانۂ محبت چھلکنے نہ پائے، اگر کسی کو جذب و کیفیت، شوق و سرمستی، اور درد و سوز کا حصہ بہت کم ملا ہو تو اس کی ہوشمندی اتنی قابل قدر اور لائق تعریف نہیں، جتنی اس شخص کی کہ جس کے اندر عشق و محبت اور ذوق و شوق کا طوفان برپا ہو لیکن بیرونی سطح میں کوئی اضطراب نظر نہ آتا ہو۔ یہ اذواق و کیفیات (جیسا کہ بعض اولیاء اللہ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے) بعض اوقات اس درجہ کو پہنچ جاتی ہیں کہ انسان کو خود اپنا وجود گراں معلوم ہونے لگتا ہے، اور اس سے بھی غیرت آنے لگتی ہے۔

بردائے عقل نامحرم کہ امشت باخیال او
چناں خوش خلوتے بودم کہ من ہم نیستم محرم

یہ مکمل فنائیت کی منزل ہے، اس وقت اپنے چشم و گوش سے بھی حجاب آنے لگتا ہے اور "رخ محبوب" کے علاوہ ہر چیز قلب پر بار اور روح کیلئے ناگوار ہوتی ہے اور یہ حال ہو جاتا ہے کہ

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم
گوش رانیز حدیث تو شنیدن نہ دہم
گر بیاید ملک الموت کہ جانم بہ برد
تانہ بینم رخ تو روح رمیدن نہ دہم

عشق رسول ﷺ

مولانا کی زندگی اسی ذوق وشوق اور حضور وسرور کا نمونہ تھی۔ ان کی سب سے بڑی آرزو اور تمنا حضور ﷺ کی زیارت تھی، جیسا کہ انہوں نے اپنے ایک خط میں اظہار کیا ہے۔ وہ بچپن میں گھڑیوں اس آرزو اور تمنا میں ڈوبے رہتے تھے اور رویا کرتے تھے۔ مولانا اپنے مریدین کو چند خاص اشعار پڑھنے کی بھی تلقین کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ جمعہ کی شب کو پڑھنا چاہئے، ماسٹر خدا بخش مونگیری رحمۃ اللہ علیہ (جو مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور مولانا مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ تھے) بیان کرتے ہیں کہ۔

"ایک دفعہ میں حسب معمول بھاگلپور(۱) سے واپس ہوا، اور حضرت مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری دی، بھاگلپور والوں کا سلام وپیغام پہنچایا۔ آخر میں فرمانے لگے کہ کوئی اور بات، عرض کیا کہ نہیں! پھر فرمایا: کوئی اور خاص بات تو پیش نہیں آئی؟ میرے ذہن میں کوئی بات نہ تھی، لیکن بار بار کے سوال پر خیال آیا کہ واپسی میں سلطان گنج اسٹیشن پر ایک بات پیش آئی تھی۔ عرض کیا کہ جی ہاں جب گاڑی سلطان گنج اسٹیشن پر پہنچی، ایک فقیر بڑے مست طریقہ پر چند اشعار پڑھ رہا تھا جو مجھے بہت پسند آئے اور یاد ہو گئے فرمایا پڑھو؟ میں نے حسب ذیل اشعار پڑھے۔

نسیما جانب کویش گزر کن　　بگو آں نازنیں شمشاد مارا
بہ تشریف قدوم خود زمانے　　مشرف کن خراب آباد مارا
کہ بے دیدار تو اسباب شادی　　نمی شاید دلِ ناشاد مارا

جوش میں آکر فرمایا کہ میاں! اس سے تو حضور ﷺ کی زیارت ہوتی ہے(۲)

---

(۱) بھاگل پور میں ماسٹر صاحب کی دو لڑکیاں رہتی تھیں، ہر سنیچر کو ماسٹر صاحب مولانا سے مل کر بھاگلپور جاتے تھے اور واپسی پر سب سے پہلے مولانا ہی کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ۱۲

(۲) کمالات محمدیہ، (اضافات) ماسٹر صاحب کہتے ہیں کہ ان اشعار کی بدولت مجھے کئی مرتبہ دیدار نصیب ہوا۔ ۱۲

اسی نسبت سے مولانا عربوں کا بہت خیال کرتے تھے، اور اگر معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ کوئی عرب آئے ہیں اور ان کو کوئی ضرورت ہے تو مدد کی پوری کوشش کرتے تھے، اور اپنی ضرورت پس پشت ڈال دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک قیمتی عبا ایک عرب کو دے دی۔ مضطر مظفر پوری نے اسی قسم کے ایک چشم دید واقعہ سے متاثر ہو کر بالکل صحیح کہا ہے۔

کوئی آجاتا مدینہ کا جہاں   مال کیا اس پر فدا کرتے تھے جاں(۱)

قدرتی سماع

کسی وقت مولانا کو سماع کی طرف بھی رغبت ہوتی تھی اور تنہائی میں کسی خوش الحان آدمی سے کچھ اشعار سنتے تھے بعض مرتبہ کسی خاص کیفیت اور جذبہ کے ماتحت کچھ سننے کا اشتیاق ہوا اور رغبت زیادہ ہوئی اور کوئی ایسا آدمی نہ ملا جو کچھ سنا سکے تو قدرت کی طرف سے اس کا انتظام ہو گیا۔ اور رات کو خواب میں عجیب و غریب گانا سنا جو دنیا میں حالت بیداری میں کسی طرح میسر نہیں ہو سکتا۔

بعض دفعہ یہ حالت پیش آئی کہ خواب سے بیدار ہو گئے اور آواز آنا بند ہو گئی، پھر جب آنکھ بند کی تو پھر آواز آنے لگی، یہ عجیب واقعہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے پیارے ہیں وہ رحیم و کریم یوں ہی ان کی خواہش پوری کر دیتا ہے، اور اس خوبی سے کہ اس میں کسی کو ذرا بھی اختلاف نہیں (۲) بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ مولانا عبد العزیز بہاری رحمۃ اللہ علیہ یا حافظ رحمت اللہ مظفر پوری رحمۃ اللہ علیہ تنہائی میں عشقیہ اشعار سناتے اور مولانا کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، بعض وقت مکمل استغراق کی کیفیت ہو جاتی (۳) لیکن مولانا کو استغراقی کیفیت کا غلبہ ہوا، اور درمیان میں کئی نمازوں کا وقت آیا، لیکن ہر مرتبہ نماز ادا کی اور اس کے بعد وہی حالت عود کر آئی۔

نماز سے عشق

نماز سے مولانا کو اس درجہ عشق تھا اور جماعت اور پابندئ وقت کا اس قدر اہتمام تھا کہ اس کو دیکھ کر قرۃ عینی فی الصلوٰۃ کے معنی سمجھ میں آتے ہیں اور اس دور آخر میں اس کا ایک عملی اور زندہ نمونہ نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے، ایک مرتبہ مولانا کا لکھنؤ میں قیام تھا اور جمعہ کا دن تھا، مولانا کو وقت کا صحیح اندازہ

---

(۱) الجامعہ   (۲) کمالات محمدیہ، ص ۳۹، ۴۰   (۳) کمالات محمدیہ، ص ۳۹، ۴۰

نہ ہو سکا اور نماز کے لئے چلے ماموں بھانجہ کی قبر والی مسجد میں پہنچے، تو معلوم ہوا نماز ہو گئی ہے، یہ سنتے ہی مولانا پر اتنا اثر پڑا کہ اسی وقت فرش پر گر پڑے(۱)

وفات سے کچھ روز پیشتر ضعف وعلالت میں اس قدر اشتداد ہو چکا تھا کہ نشست و برخاست کی بھی طاقت نہ رہ گئی تھی، نماز مغرب کے وقت تکبیر کی آواز کانوں میں آئی، بے ساختہ اٹھ پڑے اور مسجد میں پہنچ کر فرش پر گر گئے اور اس کے بعد گھسٹ کر جماعت میں شریک ہوئے(۲)

مولانا کی علالت اور ناسازیٔ طبع کے دوران اس بات کا اہتمام رکھا جاتا تھا کہ اذان کی آواز مولانا کے کان میں نہ پڑے ورنہ بے چین ہو کر اپنے ضعف وعلالت کی پرواہ کئے بغیر نماز کے لئے باہر آجائیں گے۔ لیکن اس احتیاط وپیش بندی کے باوجود یہ واقعہ پیش آیا۔

ذوق ونفاست

مولانا کے مزاج میں ابتدا ہی سے نفاست تھی، اور وہ خوش پوشاکی اور خوش وضعی کو پسند کرتے تھے، لیکن طبیعت سادگی اور بے تکلفی کی طرف مائل تھی، فرماتے تھے کہ۔

دلی رغبت کمبل اوڑھنے اور موٹا کپڑا پہننے کی طرف ہے، مگر بغیر خواہش جو لباس اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کا عطیہ خیال کر کے اس کے رد کرنے کو دل نہیں چاہتا، مگر خاص لباس کا التزام اچھا نہیں معلوم ہوتا خواہ وہ عمدہ ہو یا غیر عمدہ، جس طرح عمدہ لباس میں نفس کا شائبہ ہو سکتا ہے اس طرح موٹے لباس میں خصوصا درویش کو ریا کا خوف زیادہ ہو سکتا ہے، مکرر فرمایا۔ بے تکلف اور سادہ وضع کے لوگ بہت ہی اچھے معلوم ہوتے ہیں، مگر اس کریم واہب العطایا کی عجب بندہ نوازی ہے کہ بغیر خواہش وہ ہر طرح کا سامان پہنچاتا ہے، اور آرام سے رکھتا ہے۔ سچ ہے اور بلا شک ہے۔

جان وتن پرور دہ احسان تست　　　بے عوض بندہ نوازی شان تست(۳)

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ بہت شان وشوکت کے ساتھ رہتے تھے اور ان کے یہاں دولت کی وہ فراوانی تھی کہ بڑے بڑے امراء ورؤساء کے ہاں بھی نہ ہوگی، لیکن اس کا ان کے زہد وفقر، اور ارشاد وسلوک پر مطلق اثر نہ تھا، مصنف کمالات نے ان کا ذکر کرتے

---

(۱) یہ واقعہ عم مخدوم ومعظم مولانا سید ابو الحسن ندوی مدظلہ نے مولوی حکیم مظہر قدیم ندوی مرحوم کے حوالے سے بیان کیا۔ ۱۲

(۲) کمالات محمدیہ (باختصار) ص ۲۶　　(۳) کمالات، ص، ۵۶

ہوئے یہ دلچسپ واقعہ قلمبند کیا ہے کہ: جب مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ بیعت کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان مظاہر ثروت اور جاہ وحشم کو دیکھ کر یہ مصرعہ کہہ کر واپس ہوئے۔

نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد

واپس ہو کر ایک مسجد میں جاکر سو رہے، اسی حالت میں الہام ہوا، اپنی اس غلط اندیشی پر توبہ واستغفار کر کے پھر حاضر ہوئے، حضرت خواجہ عبید اللہ احرار نے دیکھتے ہی پوچھا جامی کل کیا مصرعہ کہا تھا، بہت اصرار کے بعد انہوں نے کہ ''نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد'' اس کے جواب میں خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرا مصرعہ ارشاد فرمایا۔ ع

بدارد گز برائے دوست دارد

آخری ایام زندگی، وفات، اخلاف

ندوہ کی یاد

ارشاد واصلاح اور تزکیہ وتربیت کی اس فضا میں مولانا نے ندوہ کو کسی وقت فراموش نہیں کیا اور رفقاء ندوہ سے خط وکتابت کا تعلق بھی برابر قائم رہا، مولانا سید عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ سے وہ اپنے دوسرے احباب کی خیریت اور حالات دریافت کرتے رہتے تھے۔ ندوہ ان کے نزدیک روحانی تزکیہ وتربیت سے علیحدہ کوئی چیز نہ تھی اس لئے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لینے اور بالکل بے تعلق ہو جانے کا سوال ہی نہ تھا، اس زمانہ میں مولانا ''الندوہ'' بھی پابندی سے پڑھتے تھے، اور اپنے دوستوں اور رفیقوں سے بھی ندوہ کے حالات معلوم کرتے رہتے تھے۔ ایک خط میں مولانا سید عبد الحیؒ کو لکھتے ہیں ''جلسہ کی مختصر کیفیت'' ''الندوہ'' سے معلوم ہوئی آپ کے ذریعہ سے معلوم کرنے خواہش ہے۔ مولانا نے اپنے دو صاحبزادوں(۱) کو بھی ندوہ میں تعلیم کی غرض سے بھیجا اور سارے اختلاف کے باوجود اسی درسگاہ کو ترجیح دی۔

آخری ایام

ضعف اور علالت کا سلسلہ جو عرصہ سے جاری تھا اب اس میں بہت تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگا، حج سے دو ایک برس قبل ہی سے اس میں شدت پیدا ہو چلی تھی، اس زمانہ

---

(۱) مولانا منت اللہ رحمانی (امیر شریعت بہار) ومولانا نور اللہ صاحب۔ ۱۲

میں مولانا نے اہل تعلق کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں علالت کا ذکر موجود ہے اور اس انداز میں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علالت نے تشویشناک صورت اختیار کرلی تھی......

...ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"اب میں اکثر علیل رہا کرتا ہوں ضعف اور ناتوانی روز بر ترقی پر ہے،

اللہ تعالیٰ خاتمہ بالخیر کرے (۱)

دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:۔

اب میں نہایت ضعیف ہو گیا ہوں اور اکثر علیل رہا کرتا ہوں اور ہمیشہ پیغام سرکاری کا منتظر رہتا ہوں۔ منشی احتشام علی صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"کبھی ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ یقین ہو جاتا ہے کہ آج ہی خاتمہ ہے (۲)

مولانا کو کبھی کبھی درد گردہ کی شکایت بھی ہو جاتی تھی، مرض وفات میں بھی ایک مرتبہ سخت درد اٹھا لیکن ان کا اصل مرض ضعف ہی تھا جو بخار وغیرہ کی صورت میں بہت زیادہ بڑھ جاتا تھا اور تشویش پیدا ہو جاتی تھی۔

عمر کے آخری سالوں میں استغراق بہت رہنے لگا تھا، اپنے صاحبزادوں کو بھی نہ پہچانتے تھے، لیکن عجیب بات ہے کہ فرائض وسنن کے لئے صحو ہو جاتا تھا اور اطمینان سے نماز ادا کرتے تھے۔ بعض دفعہ استغراقی کیفیت پر کئی روز گزر گئے غذا بھی متروک ہوگئی، لیکن جب بھی اذان کی آواز کانوں میں پڑی فوراً آنکھیں کھول دیں۔ وضو فرمایا نماز سے فارغ ہوئے اور پھر وہی حالت طاری ہوگئی (۳)

اسی زمانہ میں ایک مرتبہ کریم بخش صاحب مرحوم، مولانا کے پیر دبا رہے تھے۔ گفتگو میں مولانا نے کوئی ایسا اشارہ کیا جس سے محسوس ہوا کہ اب زمانہ اخیر ہو رہا ہے، کریم بخش مرحوم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور کہا کہ حضرت آپ کے بعد ہم لوگ کیا کریں گے۔ کریم بخش صاحب کا بیان ہے کہ یہ سن کر حضرت اٹھ کر بیٹھ گئے اور جوش میں آکر فرمایا کہ "میاں" تین ہاتھ مٹی میں جانے سے کیا ہوتا ہے، اولیاء اللہ جب تک زندہ رہتے ہیں تو سمجھو تلوار میان میں ہے اور جب انتقال کر جاتے ہیں تو تلوار میان سے نکل آتی ہے (۴)

---

(۱) خطوط بنام منشی سید محمد حسن صاحب گیاوی (کمالات ص ۲۵۹) (۲) مقالہ متعلقہ سوانح از مولانا رحمانی، ص ۴۹ باختصار (۳) از مقالہ متعلقہ سوانح ودیگر مصادر (۴) کمالات محمدیہ (اضافات) ص ۳۳

عمر کا چراغ کچھ اس طرح جلنے لگا تھا اور اس کی روشنی بار بار تیز ہو رہی تھی کہ دیکھنے والوں کو صاف معلوم ہوتا تھا کہ اب سفر آخرت کی تیاری ہے، اور علم و عرفان کا یہ آفتاب غروب ہونے والا ہے۔ محفل میں وہی گرمی اور حرارت باقی تھی لیکن اس کی فضائیں کسی سانحہ کی خبر دینے لگی تھیں لیکن اس حالت میں بھی بادہ خواروں کے لئے کوئی امتیاز اور تخصیص روا نہ تھی اور ہر طبقہ اور ہر حلقہ کے اکابر اس بھڑکتی شمع سے روشنی اور حرارت حاصل کر رہے تھے۔

یہاں درد و محبت کی گرمی و چاشنی کے ساتھ علم و عرفان کی روشنی اور وسیع النظری اور مجتہدانہ بصیرت کی جلوہ افروزی اس طرح باہم وابستہ اور پیوست تھی کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس محفل میں مولانا مرتضیٰ حسن دیوبندی، مولانا نثار احمد کانپوری، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی (اہل حدیث) مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی، مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہم اللہ تعالیٰ عنہم جیسے مشاہیر علماء اور اکابر ایک ہی وقت میں نظر آتے تھے، بعض علماء بالخصوص مولانا عبدالشکور صاحب، مولانا ظہور الاسلام فتح پوری اور مولانا گیلانی وغیرہ مولانا کے یہاں بعض مرتبہ ہفتوں اور مہینوں قیام کرتے (۱)

وقت آخر

مولانا کے مرض وفات کی ابتداء سنیچر کو ہوئی اور گیارہ روز یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کا پہلا سبب یہ ہوا کہ دن کو غسل کیا اور رات کو گرمی کی وجہ سے سائباں میں آرام فرمایا، دو بجے رات کو یکایک بخار ہوا اور دیکھتے دیکھتے اتنا تیز ہوا کہ تشویش پیدا ہو گئی۔ حالات میں مزید ابتری کے آثار دیکھ کر مخصوص اہل تعلق کو خطوط اور تار کے ذریعہ اطلاع دی گئی اور مخلصین اور عقیدت مندوں کا ہجوم ہونا شروع ہوا لیکن اس کے بعد ہی حالت بہتر ہونا شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ بخار اتر گیا۔

تیسرے یا چوتھے روز پھر بخار آیا اور صاحب فراش ہو گئے، کراہنے اور اظہار تکلیف کی مولانا کو عادت نہ تھی، استفسار پر "الحمد للہ" کے علاوہ اور کوئی جواب نہ ہوتا۔ اس سے قبل ایک مرتبہ عصر کی نماز کے وقت مولانا کو درد گردہ کا اتنا شدید دورہ پڑا کہ جماعت میں تشریف نہ

(۱) مقالہ متعلقہ سوانح از مولانا منت اللہ رحمانی۔ ۱۲

لا سکے۔ مولانا عبدالصمد رحمانی نماز کے بعد دوسرے لوگوں کے ساتھ عیادت کیلئے حاضر ہوئے تو فرمایا کہ آج درد گردہ میں اتنا مزہ آیا کہ اس سے پہلے کبھی نہ آیا تھا اس کے بعد یہ شعر پڑھا۔

عاشقاں را درد و غم حلوا بود گرچہ با دیگر کساں بلوا بود

ان دنوں ملّاواں سے صاحبزادہ صاحب تشریف لائے ہوئے تھے اور حاضر خدمت تھے، عرض کیا کہ حضرت اسی مضمون کا ایک شعر داغ نے بھی خوب کہا ہے۔

وہ مزہ دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب مرے دونوں پہلوؤں میں دل بے قرار ہوتا

یہ سن کر مولانا پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی گئی، بار اس شعر کو دہراتے رہے اور مکرر پڑھنے کی خواہش کی، گیارہ روز علالت کا سلسلہ قائم رہا، طہارت کا بہت زیادہ اہتمام تھا اور جب تک ہوش رہا اس کی برابر تاکید کرتے رہے، ان ہی ایام میں ایک مرتبہ فیرینی پیش کی گئی تو ذرا سی منہ میں لے کر منع فرمایا اور کہا کہ اب ہم کو یہ چیزیں اچھی نہیں معلوم ہوتی ہیں، آخر میں غذا بالکل ترک ہو گئی تھی اور دوا بمشکل حلق سے اتار دی جاتی تھی، آخر کے پانچ روز مکمل استغراق میں گزرے، یہ وہ دن تھے جن میں مولانا جماعت میں شریک نہ ہو سکے، اس سے پہلے انتہائی کمزوری کی حالت میں بھی اگر کسی وقت ذرا سی بھی قوت محسوس کرتے تو مسجد میں آنے کیلئے بے قرار ہو جاتے اور بڑے اصرار کے بعد حجرہ میں نماز ادا کرنے پر آمادہ ہوتے۔

وفات

وصال کے ایک روز پہلے مولانا کے ایک خاص خادم اور مزاج داں حاجی حسین صاحب نے متحرک لبوں میں کان لگایا تو اللہ اللہ کی آواز آرہی تھی ۹، ربیع الاوّل سہ شنبہ ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۳ ستمبر ۱۹۲۷ء کو زوال آفتاب کے قریب ایسا محسوس ہوا کہ یہ آفتاب رشد وہدایت بھی عنقریب غروب ہونے والا ہے اب وقت پورا ہو چکا تھا، ظہر کی نماز کے بعد ۲/ بجے دن میں اللہ اللہ کرتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کی۔

وفات کی خبر بجلی کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی، اور ہر طرف سے عقیدت مندوں نے ہجوم کیا، بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اسی کمرہ میں غسل دیا گیا جو مولانا کی مستقل قیام گاہ تھی، لوگوں کے ہجوم اور وارفتگی کی وجہ سے نماز جنازہ مغرب کے بعد ہوئی، چاندنی رات میں جنازہ چبوترہ پر لایا گیا اور نماز کے بعد وصیت کے مطابق حجرہ کے سامنے صحن کے آخری مشرقی حصہ

میں لیچی کے درخت کے نیچے تدفین عمل میں آئی (۱) اور نصف صدی سے زائد عرصہ تک اسلامی ہند کی فضاؤں کو اپنی ضیاپاشیوں سے منور کرنے کے بعد یہ آفتاب نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

در دست نہ تیر است نہ در دست کمان است
ایں سادگی اوست کہ بسمل دو جہان است

در مدرسہ راز جنبش لعل تو حکایت
در میکدہ از مستیِ چشم تو نشان است

اولاد

مولانا نے تین شادیاں کیں۔ پہلی شادی محی الدین پور (مظفر نگر) کے میر امان علی مرحوم کی صاحبزادی سے ہوئی، اس وقت مولانا کی عمر ۲۲ سال تھی، ان سے، دو لڑکیاں اور تین لڑکے تولد ہوئے۔ سید احمد علی، سید محبوب علی، اور سید معصوم علی مؤخر الذکر دونوں لڑکے کمسنی ہی میں انتقال کر گئے۔

مولانا سید احمد علی ایک عالم باعمل تھے اور بہت عابد و زاہد، مولانا نور محمد پنجابی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا احمد حسن کانپوری اور مولانا محمد فاروق چریاکوٹی سے درسیات کی تکمیل کی۔ مولانا محمد علی کبر سنی کی وجہ سے خود ان کو تعلیم نہ دے سکے۔ ان کی شادی بھی قصبہ پھلت (مظفر نگر) میں ہوئی ۱۳۲۸ھ میں رمضان کے مہینہ میں جمعہ کے روز نماز پڑھتے ہوئے انتقال فرمایا (۲)

ان کے انتقال کے چند مہینے بعد دوسری صاحبزادی ام سلمہ کا درود شریف پڑھتے ہوئے انتقال ہوا، بڑی صاحبزادی ام کلثوم ۱۳۲۷ھ میں طاعون میں مبتلا ہوئیں، اور اسی مرض میں انتقال ہوا۔ دوسری شادی کانپور میں ایک بیوہ سے مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے اشارہ سے ہوئی، یہ خاتون مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھیں اور تعلیم یافتہ بھی تھیں، ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی، شادی کے دس سال بعد ۱۳۱۷ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ تیسری شادی سیکری (مظفر نگر) میں ہوئی، ان سے پانچ لڑکے ایک لڑکی ہوئی سب سے پہلے

---

(۱) مولانا عبد الصمد رحمانی الجامعہ (جلد) شمارہ ۲ و مقالہ متعلقہ سوانح از مولانا منت اللہ رحمانی۔ ۱۲

(۲) مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے مولانا فضل اللہ حیدرآبادی، عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ دینیات و مذہب و ثقافت کے عرصہ تک صدر رہے، عالم باعمل اور بہت کریم النفس اور متواضع انسان ہیں روزانہ نماز فجر کے بعد محلہ کی مسجد میں درس قرآن کا معمول ہے۔ "فضل اللہ الصمد شرح الادب المفرد" جو مصر میں طبع ہوئی ہے، مولانا ہی تصنیف ہے۔ ۱۲

صاحبزادہ کا نام عتیق اللہ تھا۔ ان کا انتقال بارہ سال کی عمر میں ہوا۔

دوسرے صاحبزادے مولانا لطف اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں یہ بھی صلاح وتقویٰ اور فہم وفراست دونوں میں بہت ممتاز تھے۔ مولانا نے خلافت عطا فرمائی ۱۳۴۲ھ میں وفات ہوئی، تیسرے صاحبزادے مطیع اللہ آٹھ ماہ کی عمر میں انتقال کر گئے، چوتھے صاحبزادے مولانا نور اللہ ہیں۔ پانچویں صاحبزادے مولانا منت اللہ صاحب رحمانی اس وقت (امیر شریعت بہار) تھے، اور بہار میں ان کی ذات اور دینی کوششوں سے مسلمانوں کو بہت نفع پہنچا۔ مولانا لطف اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مسند ارشاد مولانا ہی کے سپرد ہوئی۔ بہار کی مشہور دینی تنظیم "امارت شرعیہ" مولانا ہی کی نگرانی میں چلتی رہی۔ مولانا نے چار سال ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی بیعت اپنے والد ہی سے تھے، لیکن مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مولانا محمد عارف صاحبؒ سے استفادہ کیا، ایک عرصہ تک حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہے۔ اس کے بعد مولانا حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ) کی خدمت میں پانچ سال گذارے۔ مولانا نے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا اور جیل کی سختیاں بھی برداشت کیں۔ جامعہ رحمانیہ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد کتب خانہ رحمانیہ کی توسیع وترقی مولانا ہی کی رہین منت ہے ایک صاحبزادی بی بی سعیدہ ہیں۔

مریدین وخلفاء

مولانا کے مریدین اور خلفاء میں سب سے ممتاز نام مولانا محمد عارف کا ہے۔ یہ موضع ہرسنگ پور ضلع دربھنگہ (بہار) کے رہنے والے تھے۔ بیعت تو مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ سے تھے، لیکن سلوک وتربیت مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے حصہ میں آئی، اور خلافت سے سرفراز ہوئے۔ مولانا کی ان پر خاص توجہ اور نظر عنایت تھی۔ تقریباً تیس سال تک مولانا ہی کے فیض صحبت وتربیت سے استفادہ کیا، اس کے بعد کچھ عرصہ تک تدریسی خدمت انجام دی مدرسہ رحمانیہ سوپول (بھاگلپور) ان ہی کی یادگار ہے، بہت سادہ مزاج اور متواضع انسان تھے۔ بار بار دیکھا گیا کہ سخت گرمیوں کا موسم ہے، مولانا مونگیر تشریف لا رہے ہیں اور ٹھیک دوپہر کے وقت اپنا سامان اپنے کاندھے پر لادے ہوئے اسٹیشن سے خانقاہ پہنچے، خانقاہ میں بھی کسی کمرے میں فروکش نہ ہوتے، بلکہ مسجد میں قیام فرماتے، اور ہر خاص وعام سے ہر وقت ملتے

بلکہ ان ہی میں بیٹھے رہتے۔(۱)

بہار کے بعض علاقوں میں تعزیہ کا نام لینے والا بھی نہیں ہے، علاقہ "ترہت" میں نکاح بیوگان بہت معیوب خیال کیا جاتا تھا، مولانا کی کوشش سے اس کی بھی اصلاح ہوئی، ایک گاؤں "شکری" میں مولانا نے بہت کوشش کے بعد ایک بیوہ کو نکاح پر آمادہ کیا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ کے اندر بہت سی بیوائیں اس ظالمانہ اور جاہلانہ رسم ورواج کی قید سے آزاد ہوئیں، اور اب عام طور سے وہاں بیواؤں کے نکاح ہوتے ہیں۔

امر بالمعروف ونهي عن المنكر کا مولانا کو بڑا اہتمام تھا، قوت ہوتی تو زبردستی روک دیتے، ورنہ زبان سے کہتے، یا پھر وہاں سے ہٹ جاتے مرض وفات میں عرض کیا گیا کہ .... دعا فرمایئے! اللہ تعالیٰ محتاجی سے بچائے۔ فرمایا: تم کیا، میری کوئی اولاد بھی محتاج نہ ہوگی اگر تم لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی "ومن يتق الله يجعل له مخرجا ويرزقه من حيث لا يحتسب" مرض نے شدت اختیار کرلی اور تکلیف زیادہ بڑھی تو لوگوں نے محسوس کر کے حال دریافت کیا....... فرمایا کہ

تکلیف کچھ بھی نہیں ہے، بے چینی ہے، اور صاحبزادے (تشریف لائے اور بلند آواز سے "من احب لقاء الله احب الله لقائه" پڑھی، اس حدیث شریف نے مولانا کو بے خود کردیا، اور بہ آواز بلند فرمایا بیشک! اس کے بعد کوئی گفتگو نہ کی ۹، صفر ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء جمعہ کی نماز کے وقت انتقال فرمایا (۲)

مولانا کے ایک اور خلیفہ مولانا عبدالرحیم صاحب گوگری ہیں۔ ضلع مونگیر اور ضلع بھاگلپور کے دور دراز علاقوں میں مولانا کی ذات سے بڑا فائدہ پہنچا، ہزاروں اشخاص تائب ہوئے رد قادیانیت میں بھی انہوں نے بڑی خدمت انجام دی۔

دوسرے خلفاء حسب ذیل ہیں

مولانا حافظ شاہ رحمت اللہ مظفر پوری (۳)

مولانا حافظ شاہ حبیب اللہ

مولانا حافظ عبدالمجید مظفر پوری

---

(۱) کلید معارف۔ ص ۱۷ (۲) میں نے اللہ سے ملنا پسند کیا، اللہ تعالیٰ نے بھی اس سے ملنا پسند کیا۔ ۱۲

(۳) مولانا رحمت اللہ مظفر پوری کے والد سید احمد شہید و مولانا اسمٰعیل شہید کے خلیفہ تھے اور دربھنگہ میں انکے بہت مریدین تھے

مولانا محبوب حسن رحمانی

مولانا عبد الرشید صاحب رانی ساگر (ضلع آرہ)

مولانا محمد اسحاق صاحب

مولانا سید محمد لطف اللہ صاحب (صاحبزادہ سجادہ نشین اوّل)

شیخ ابو بکر حماد (مکی)

مولانا محمد ابراہیم صاحب (ممباسہ)

مولانا محمد ابراہیم صاحب کا ذکر کتاب میں گزر چکا ہے، افریقہ میں سینکڑوں غیر مسلموں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ افسوس ہے کہ دو کے علاوہ اب کوئی ہمارے درمیان موجود نہیں مولانا محبوب حسن رحمانی بہت ضعیف ہو چکے ہیں اور اکثر استغراقی کیفیت رہتی ہے۔ مولانا عبد الرشید باوجود کبرسنی کے تبلیغ وارشاد میں مشغول ہیں۔ یہاں مولانا کے چند مریدین کا ذکر کرنا بھی مناسب ہے۔ مصنف "کمالات محمدیہ" نے ان علماء کی ایک مختصر فہرست دی ہے جو بیعت واستفادہ کا تعلق رکھتے تھے۔ ان میں مولانا نور الحق چشتی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا ظہیر حسن شوق نیموی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مفتی عبد اللطیف رحمۃ اللہ علیہ، مولانا حکیم عبد الباری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبد الوہاب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مہتمم مدرسہ دربھنگہ)، مولانا محمد علی حسن رحمۃ اللہ علیہ (مصنف "کمالات محمدیہ") مولانا شاہ سمیع احمد رحمۃ اللہ علیہ قابل ذکر ہیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو مولانا کی عمر کے آخری ایک سال میں خدمت واستفادہ کا موقع ملا۔

اور مخلصین میں حاجی لیاقت حسین صاحب مولانا کے مزاج داں اور بے تکلف خادم تھے۔ منشی شرافت حسین صاحب، میر علی حسن صاحب وغیرہ سے مولانا کو خاص تعلق تھا۔ مولانا محمد علی حسن صاحب نے مولانا کی سیرت پر ۳۰۷ صفحات کی ایک کتاب "کمالات محمدیہ" لکھی ہے، جو مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا ماخذ ہے۔ زیر نظر مقالہ میں اس سے بہت فائدہ اٹھایا گیا ہے اور بہت سی قیمتی معلومات اور اہم حالات اس سے معلوم ہوئیں۔ مولانا محمد علی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ موضع ٹھریہ ضلع مونگیر کے رہنے والے تھے، اور "مدرسہ امدادیہ" دربھنگہ میں فارسی کے استاذ تھے۔ ان کو مولانا کے ساتھ وقت گذارنے کا موقع اپنے معاصروں کی بہ نسبت زیادہ اور بعض اہم سفروں میں مولانا کی ہمرکابی کا شرف بھی حاصل ہوا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے بے حد تعلق تھا، اور مولانا بھی بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔

حضرت مولانا سید احمد حسن امروہیؒ

حضرت مولانا سید احمد حسن امروہیؒ

فہرست

حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہویؒ

مولانا نسیم احمد فریدیؒ

حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ قاسم العلوم والمعارف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کے ممتاز اور محبوب شاگرد تھے، خدا کے فضل وانعام سے باکمال استاذ کی شفقت وتوجہ اور پیدائشی وفطری صلاحیت کی مدد سے وہ مجسم تصویر قاسم بن گئے تھے۔

یوں حضرت قاسم العلوم والمعارف رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کی تعداد بہت کچھ ہوگی۔ لیکن یہ تین شاگرد بہت ہی مشہور ہوئے، اتنے مشہور کہ جہاں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی آتا ہے ان تینوں کا نام بھی آجاتا ہے۔

(۱) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب محدث دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

(۲) سید العلماء حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ

(۳) فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "سوانح قاسمی" میں، مولوی رحمٰن علی رحمۃ اللہ علیہ نے "تذکرہ علماء ہند" میں، مولوی عبد الرحمٰن صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ (مولف کتاب الصرف وکتاب النحو) نے اپنے "سفر نامہ بلاد ہند" میں، نیز بعض دیگر تذکرہ نویسوں نے حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی ان تینوں شاگردوں کا ذکر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ کے ضمن میں کیا ہے۔

اُن میں سے اوّل الذکر دو حضرات نے دیوبند اور امروہہ میں اپنے اُستاذ معظم کے معارف، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی حکمت اور حضرت شاہ امداد اللہ چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے سلوک کی اشاعت کی۔ حدیث، تفسیر، فقہ اور جملہ علوم وفنون کے درس دیئے اور تشنگان علوم کی ایک بڑی جماعت کو سیراب کیا۔ بلا مبالغہ بغیر خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں ہستیوں نے

اپنے رفقاء و متوسلین کی نصرت سے ہند اور بیرون ہند میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلیمی نظام اور تبلیغی پروگرام زندہ و برقرار رکھا، اور ان کی جدو جہد کے اثرات آج تک باقی ہیں۔

ان دونوں نے اپنی تمام عمر درسی مشاغل میں صرف کی، تادم آخر تعلیمات اسلامیہ کے رائج کرنے میں منہمک رہے۔ اور نازک اوقات میں ملت بیضاء کی پوری پوری حمایت و حفاظت کی۔

مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے کارناموں کا احقر کو پورا علم نہیں ہے۔ اتنا معلوم ہے کہ وہ مدرسہ عبد الرب دہلی میں کچھ عرصے مدرس رہے، ابوداؤد شریف پر حاشیہ لکھا تھا۔ اپنے استاذ کی بعض تصانیف کو مرتب کر کے شائع کرایا اور ان کی ایک مضبوط و مکمل سوانح عمری لکھی تھی، جس کا آج پتہ نہیں کہ کیا ہوئی۔

کیا اچھا ہو کہ کوئی صاحب جو مولانا فخر الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح سے واقفیت رکھتے ہوں اُن کے سوانح پر بھی ایک مقالہ سپرد قلم کر دیں۔ میرے خیال میں ان تینوں حضرات کی زندگیاں حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات طیبہ کا تتمہ ہیں۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حالات شیخ الاسلام مرشدنا حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے "سفر نامہ اسیر مالٹا" میں، حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے "حیات شیخ الہند" میں اور حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "ذکر محمود" میں جمع کر دیئے ہیں، لیکن حضرت مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کتابی صورت میں آج تک مرتب نہ ہو سکے اگرچہ حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ کی قائم کردہ عظیم الشان درس گاہ موجود ہے اُن کے بہت سے تلامذہ آج بھی امروہہ، ہند اور بیرون ہند میں بقید حیات ہیں، اُن کے اکلوتے صاحبزادے مولانا قاری سید محمد صاحب مدظلہ موجود ہیں لیکن زمانہ جتنا گذرتا جا رہا ہے حالات کے مرتب ہونے میں دشواری ہوتی جا رہی ہے حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن صدیقی امروہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا عبد الغنی صاحب پھلاودی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اکابر جو زیادہ حالات سے واقف تھے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے، مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان اور شہر امروہہ کے معمر اشخاص آج موجود نہیں۔ اگر چالیس سال پیشتر مولانا رحمتہ اللہ علیہ کی سوانح عمری کو مرتب کر لیا جاتا تو پوری زندگی کے حالات تفصیلاً معلوم ہو جاتے، اور اُن کے تمام علمی و مذہبی کارنامے پوری صحت

وتحقیق کے ساتھ من وعن سامنے آجاتے۔

مولوی محمود احمد صاحب عباسی نے "تذکرۃ الکرام" کے اندر مشاہیر امروہہ کے سلسلہ میں حضرت محدث امروہی کا بھی تذکرہ لکھا ہے لیکن مفصل حالات لکھنے کی نہ تو اس کتاب میں گنجائش تھی اور نہ تفصیلی حالات ان کو معلوم ہو سکے ہوں گے۔

آج مولانا کی وفات کو تقریباً تینتالیس سال کا عرصہ گذر چکا ہے، میں نے حضرت رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھا بھی نہیں شاید میں ان کے وصال کے وقت ایک سال کا ہوں گا۔ اس صورت میں احتیاط کیساتھ ایک مقالہ لکھنے میں بھی مجھے کافی تلاش وجستجو کرنی پڑی۔

میں عقیدت مندی کے تحت مبالغہ آرائی کیساتھ سنی سنائی باتوں کے لکھنے کا عادی نہیں ہوں جو کچھ لکھا ہے حتی الامکان تحقیق کر کے لکھا ہے۔

اس وقت میری معلومات کے ذرائع وہ چند ہستیاں ہیں جنہوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اخذ فیض کیا ہے، اُن کی تقریریں سنی ہیں یا اپنے ہوش کے زمانے میں ان کو دیکھا ہے۔

شاہ سلیمان احمد صاحب حسنی، مولانا اسمٰعیل صاحب انصاری، مولانا قمرالدین صاحب سہنسپوری، حکیم محمد رفیع خاں صاحب لودھی، قاری عزیزالحق صاحب عباسی اور حکیم سید حسن مثنیٰ صاحب رضوی وغیرہ سے مجھے اس سلسلے میں کافی مدد ملی۔

ان بزرگوں سے سنی ہوئی محقق باتوں کے علاوہ بعض یادداشتیں، رسالہ جات "القاسم" کے چند اقتباسات، "تذکرۃ الکرام" کے چند جملے، حضرت مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ کی دستی سندیں اور اُن کے غیر مطبوعہ چند فتاویٰ، تقریر ترمذی کے کچھ اوراق، افادات احمدیہ، اور کتب خانہ پھلاؤدہ سے حاصل شدہ معلومات اور بعض دیگر تحریرات اس مقالہ کے اجزاء ترکیبی ہیں۔

طالب علمی کے زمانے میں جو واقعات اپنے استاذ حضرت مولانا سید رضا حسن صاحب مرحوم وداماد و برادرزادہ حضرت امروہی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اُستاذ حضرت مولانا انوارالحق صاحب عباسی مرحوم سے سنے ہوئے یاد ہیں وہ بھی اس مقالے میں حسب موقع کہیں کہیں شامل کروں گا، یوں تو کثرت سے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی حکایات وواقعات اہل امروہہ کی زبانوں پر ہیں لیکن اُن کا بغیر تنقید درج کرنا مناسب نہ جانا۔

حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے مولانا قاری سید محمد صاحب عرف بنے میاں کے پاس رکھا ہوا قلمی ذخیرہ بھی دیکھنے کو ملجاتا تو شاید اس سے زائد لکھ سکتا مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے

صاحبزادے حیدرآباد دکن ہیں اسلئے اُس ذخیرہ سے مستفیض نہ ہو سکا۔

عرصے سے میری تمنا ہے کہ کسی نہ کسی طرح مولانا کے مکمل حالات کتابی صورت میں آجائیں اور اُن کی تحریرات و قلمی مسودات، اُن کی تقاریر و فتاویٰ شائع ہو جائیں مگر ابھی تک میری یہ تمنا پوری نہ ہوسکی۔

ان کے استاذ مرحوم و مغفور کی سوانح عمری مولانا گیلانی کے قلم سے پچھتر سال کے بعد مرتب ہوئی ہے اگر اُن کے مکمل سوانح حیات کچھ عرصے معرض تاخیر میں رہ کر مرتب ہوں تو کیا تعجب ہے۔ خیر یہ مقالہ پیش کر رہا ہوں، خدا کرے کسی قابل ہو جائے اور ایک کامل و مکمل شخصیت کی زندگی کا کچھ اندازہ اس کے ذریعہ ناظرین لگا سکیں۔

خاندان اور ابتدائی حالات

نسباً آپ کا تعلق سادات حسینیہ سے تھا، امروہہ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ ابن (۱) صاحب قدس سرہ کی اولاد میں تھے۔

سید اکبر صاحب آپ کے والد ماجد کا اسم مبارک تھا، ۱۲۶۷ھ میں پیدا ہوئے۔

صاحب تذکرۃ الکرام نے آپ کے تذکرہ کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے:۔

”علامہ زمان، افتخار زمانیان، استاذ الاساتذہ، افضل الفضلاء، امام المحدثین، فطین، خوشرو، خوش خو، خوش تقریر، صاحب وجاہت و بزرگ عہد تھے، شاہ ابوالقاسم بن حضرت شاہ ابن بدر چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے پیر اکبر حسین کے بیٹے ۱۲۶۷ھ میں ولادت ہوئی۔“

وطن میں کس کس سے تعلیم پائی

آپ نے ابتدائی و متوسط عربی اور فارسی تعلیم امروہہ کے بلند پایہ علماء مولانا سید رافت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۲)، مولانا کریم بخش صاحب بخشی رحمۃ اللہ علیہ (۳) اور مولانا محمد حسین صاحب جعفریؒ

---

(۱) یہ بزرگ اکبری دور کے مشائخ میں سے تھے، ۹۸۷ھ میں ان کا وصال ہوا علامہ عبدالقادر بدایونی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، سید کمال سنبھلی مؤلف اسراریہ، علامہ آزاد بلگرامی اور دیگر مؤرخین نے مفصلاً و مجملاً مستقلاً و ضمناً ان کا ذکر اپنی کتابوں میں کیا ہے۔

(۲) شیعوں سے مناظرہ میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا، رد شیعہ میں کئی معرکۃ الآرا کتاب لکھیں جن میں سے اکثر شائع ہوگئی ہیں۔

(۳) مولانا قاری امام الدین بخشی امروہی رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ شاہ غلام علی استاذ قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ (باقی اگلے صفحہ پر)

سے حاصل کی، طب کی تعلیم امروہہ کے مشہور طبیب حکیم امجد علی خاں اثنا عشری سے پائی۔

حضرت قاسم العلومؒ سے اخذ فیض

نانوتہ میرٹھ اور دیوبند میں رہ کر حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے تمام علوم وفنون کی تکمیل کر کے فارغ التحصیل ہوئے اور اپنے اُستاذ کے کمالات علمیہ کا مکمل آئینہ بن کر مسند درس پر جلوہ آرائی فرمائی۔

شفیق استاذ نے اپنے اس ہونہار شاگرد کو جس طرح شفقت، عزت اور توجہ کے ساتھ سفر وحضر میں پڑھایا، اولاد سے زیادہ عزیز رکھا، اس کی نظیر اس زمانے کی تاریخ میں بہت کم ملے گی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے باکمال تلمیذ کو فارغ ہوتے ہی تعلیمی تحریک کا رکن بنادیا اور ملت بیضاء کی سرسبزی وشادابی کے لئے خود جو جد وجہد کررہے تھے اُسی جد وجہد میں ان کو بھی مشغول ومنہمک کردیا۔ شاگرد کو ہمیشہ میر صاحب، میر صاحب کہہ کر پکارتے، اہم علمی اشکالات کو اُن کی خاطر حل کرتے۔ اپنے عزیز شاگرد کی خاطر کئی مرتبہ امروہہ تشریف لائے اور اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس تاریخی بستی کو مشرف فرمایا۔ ایک مرتبہ مدرسہ اسلامیہ کے قیام کا اہل امروہہ کو مشورہ دیا حضرت قاسم العلوم کی چشم کرم کا صدقہ ہے کہ امروہہ کی سرزمین پر دینی ومذہبی درس گاہ کا وجود عمل میں آیا۔

مولانا نانوتوی کے علاوہ دیگر اساتذہ

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ آپ کے اساتذہ میں (جن سے صرف اجازت حدیث ہے) مولانا احمد علی سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ، قاری عبد الرحمٰن پانی پتی اور مولانا عبد القیوم نزیل بھوپال بھی شامل ہیں، حج بیت اللہ کے لئے حجاز تشریف لے گئے تو وہاں استاذ الاساتذہ حضرت مولانا شاہ عبد الغنی صاحب مجددی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کی سند حاصل کی۔

بیعت

شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی اور ان کے خلیفہ تھے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کے صاحبزادے تھے قاری صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تجوید کا مشہور رسالہ "تیسین الضاد" اپنے اُستاذ زادے مولانا کریم بخش کی فرمائش پر لکھا ہے جیسا کہ اس کے دیباچہ سے ظاہر ہے ۱۲

کہاں کہاں درس دیا

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اولاً خورجہ میں درس علوم دیا اس وقت آپ نوجوان تھے سبزہ کا آغاز تھا میں نے مولانا عبدالرحمٰن صاحب(۱) خورجوی مرحوم سے براہ راست یہ واقعہ سنا ہے، ان کی دادی نے مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ کی آمد سے پہلے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ ہمارا یہ لڑکا تمہارے یہاں آئے گا اس کا خیال رکھنا" ان نیک نہاد خاتون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہیں یا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی؟" فرمایا کہ یہ حسین کی اولاد سے ہیں، اس کے بعد جب حضرت امروہی رحمۃ اللہ علیہ خورجہ تشریف لائے مولانا خورجوی رحمۃ اللہ علیہ کی دادی نے مولانا کی دعوت کی، مولانا ان کے مکان پر تشریف لے گئے ان خوش بخت مسماۃ نے پردہ میں سے کسی ضرورت کے لئے باہر نظر ڈالی، تو وہی شکل مبارک آنکھوں کے سامنے تھی جو خواب میں دکھلائی گئی تھی۔

خورجہ میں اس مدرسہ میں صدر مدرس رہے جس کو حضرت مولانا قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ نے قائم فرمایا تھا کس سن میں خورجہ گئے اور کب تک وہاں رہے یہ نہ معلوم ہو سکا۔

خورجہ کے بعد سنبھل و دہلی کے مدارس میں مختلف اوقات میں بعہدۂ صدر مدرسی فائز ہوئے، یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ان دونوں مقامات میں سے پہلے کہاں درس دیا اور ہر مقام پر کتنے کتنے عرصے اور کس کس سن میں رہے، مدرسہ دہلی (امیر الروایات سے معلوم ہوا کہ یہ مدرسہ عبد الرب تھا) میں مولانا خلیل الرحمٰن امروہی رحمۃ اللہ علیہ کو جو قلم خاص سے لکھی ہوئی سند عطا فرمائی ہے (جو احقر کے پاس محفوظ ہے) اس میں اپنے دستخط اس عبارت کے ساتھ ثبت کئے ہیں:۔

"کتبہٗ وحررہٗ احقر الزمن احمد حسن حسینی عفی عنہ

فی المدرسة العربية الواقعة فی الدهلی"

اس سند میں تاریخ و سن درج نہیں، جس سے پتہ چلتا کہ کس زمانے میں دہلی میں بسلسلۂ مدرسی قیام رہا۔ البتہ "امیر الروایات" سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ بھی منشی ممتاز علی مرحوم کے مطبع میں کام کرنے کے سلسلہ میں دہلی میں مقیم تھے، خود مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سند کے آخر میں فارسی میں حسب ذیل الفاظ

(۱) پہلے یہ واقعہ حضرت مولانا سید رضا حسن امروہی سے سنا تھا بعد کو خورجہ جانا ہوا تو براہ راست مولانا خورجوی کی زبانی سنا۔

لکھ کر دستخط فرمائے ہیں، اور اجازت مرحمت فرمائی ہے:۔

"بندہ کمترین محمد قاسم ہم می گزید کہ مولوی خلیل الرحمٰن از من چند سبق صحیح مسلم شریف خواندہ اند، از سیماو حال اوشاں صلاح عیاں است، بشرط مرقوم بالا کہ جناب مولوی احمد حسن مدظلہ رقم فرمودہ اند من ہم اجازت درس حدیث و تفسیر مید ہم، خداوند کریم مبارک فرماید و در علم شان برکت دہد آمین۔ ثم آمین! یارب العالمین۔"

محمد قاسم عفی عنہ

ملاحظ فرمائیے کہ کس محبت واکرام کے ساتھ حضرت قاسم العلوم والمعارف اپنے عزیز شاگرد کے نام کے شروع میں جناب، اور آخر میں مدظلہ ارقام فرمارہے ہیں۔

مدرسہ شاہی مراد آباد سے تعلق

مدرستہ الغرباء مراد آباد جس کو مدرسہ شاہی کے نام سے شہرت حاصل ہے، حضرت قاسم العلوم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے ایک سال پیشتر ماہ صفر ۱۲۹۶ھ میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مشورے سے قائم ہوا، اس کے پہلے صدر مدرس حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ مقرر کئے گئے، رمضان ۱۳۰۳ھ تک حضرت امروہی رحمۃ اللہ علیہ کا اس مدرسہ سے تعلق رہا، اس سات سال کے عرصے میں بہت سے طلبائے علوم نبویہ کامیاب اور فارغ التحصیل ہوئے جن میں سے چند اکابر مشاہیر اور صاحبان درس حضرات کے اسماء یہ ہیں:۔

سراج المفسرین حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن صاحب صدیقی امروہی رحمۃ اللہ علیہ محشی بیضاوی۔

قطب الوقت مولانا حافظ عبد الغنی صاحب پھلاوُدی رحمۃ اللہ علیہ۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب شاہجہاں پوری رحمۃ اللہ علیہ (مرتب افادات احمدیہ قلمی)

مولانا محمود حسن صاحب سہوانی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا عبد الحق صاحب پیلی بھیتی رحمۃ اللہ علیہ

قاضی عبد الباری گدہ ملکیسری رحمۃ اللہ علیہ

مولانا خادم حسین صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ

ان حضرات میں سے مولانا حافظ عبد الرحمٰن صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ کی سند کو جو ۱۳۰۱ھ میں

انہیں ملی تھی، احقر نے خود مطالعہ کیا ہے، حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۰۳ھ میں مدرسہ شاہی مراد آباد سے مستعفی ہوگئے تھے۔ اُن کے بعد مختلف اوقات میں علاوہ حضرت مولانا عبد العلی صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد صدر مدرس ہوئے جن میں سے حضرت مولانا حافظ عبد الرحمن صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمود حسن صاحب سہوانی رحمۃ اللہ علیہ براہ راست حضرت امروہی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں تھے۔(۱)

خورجہ، دہلی اور مراد آباد سے متعلق امیر الروایات کی حکایات

(۱) مولوی امیر شاہ خاں صاحب مرحوم ایک طویل واقعہ کی حکایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"اب پھر قصہ سنو۔ مولوی احمد حسن صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ اس زمانے میں خورجہ میں مدرسہ تھے، مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بھی خورجہ میں تشریف لے آئے مولوی عبد الرحمن صاحب مورچہ والوں کے مکان پر قیام فرمایا۔"(۲)

(۲) "ایک مرتبہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ خورجہ تشریف لائے اور مولوی عبد الرحمن خاں خورجوی کے مکان پر ٹھہرے۔

سردی کا موسم تھا اور چھت کے اوپر چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور مولانا دھوپ میں ٹوپی اُتارے ہوئے ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے اور مولوی احمد حسن صاحب مولانا کی پائینتی بیٹھے ہوئے تھے۔ الخ"(۳)

(۳) خانصاحب نے فرمایا کہ "مدرسہ عبد الرب، پہلے امام کی گلی کی طرف تھا اور اس میں مولوی احمد حسن صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ و مولوی فخر الحسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ مدرس تھے، مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُس زمانہ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں کام کرتے تھے مولوی احمد حسن اور مولوی فخر الحسن صاحبان کی وجہ سے اکثر مدرسہ میں سویا کرتے تھے۔"(۴)

(۴) جناب خانصاحب نے فرمایا کہ مولوی احمد حسن صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ مراد آباد کے مدرسہ شاہی میں مدرس تھے، مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد مولوی محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہر سال جا کر امتحان لیا کرتے تھے۔ الخ(۵)

---

(۱) ماخوذ از روئداد قدیم مدرسہ شاہی (۲) امیر الروایات ص ۳۴ مطبوعہ محبوب المطابع دہلی
(۳) امیر الروایات ص ۹۶ (۴) امیر الروایات ص ۲۵ (۵) امیر الروایات ص ۷

مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ کا قیام اور تشکیل

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کہ ماہ رمضان ۱۳۰۳ھ میں حضرت محدث امروہی مدرسہ شاہی مراد آباد سے مستعفی ہو چکے تھے اب وہ اپنے وطن عزیز میں تشریف لے آئے اور یہاں پر مدرسہ اسلامیہ عربیہ کی تشکیل جدید کی، یہ مدرسہ بنیادی حیثیت سے حضرت قاسم العلوم کا قائم کردہ ہے انہیں کے ایماء پر اس مدرسہ کی داغ بیل پڑی تھی، شمالی ہند کے جہاں اور بہت سے مدارس اسلامیہ حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار ہیں وہاں یہ مدرسہ بھی انہیں کی یادگار اور ان کے دریائے فیض کی ایک نہر ہے، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں اور ان کی وفات کے کچھ سال بعد تک یہ مدرسہ متعدد محلوں میں، مختلف ناموں سے ابتدائی و متوسط حالت میں چل رہا تھا، حضرت امروہی نے مراد آباد سے آکر جامع مسجد امروہہ میں اس کو باقاعدہ اور باضابطہ طریقہ پر قائم کیا، از سر نو اس کی بنیادوں کو مضبوط کر کے اس میں تمام علوم وفنون کی تعلیم جاری کی، پہلے ہی سال اس مدرسہ کی شہرت حضرت محدث امروہی کی شخصیت کی بناء پر دور ونزدیک ہوگئی، کچھ طلباء ذی استعداد تو مراد آباد سے آپ کے ہمراہ آئے تھے اس کے بعد مستقبل قریب ہی میں تشنگان علوم نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم شدّ رحال کر کے دور دور سے سرزمین امروہہ کے اس چشمۂ فیض پر وارد ہو گئے، مدرسہ کی معنوی تشکیل جدید کیساتھ ساتھ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ضروری عمارتوں کی طرف بھی توجہ مبذول فرمائی اپنی اور اپنے رفقاء کی کوششوں سے جامع مسجد امروہہ کی تعمیر میں اضافہ کیا اور اس کو پر رونق وشاندار کر دیا، جامع مسجد کے جنوبی وشمالی گوشوں میں پانباڑی تالاب کے کنارے خوبصورت اور ہوا دار عمارتیں تعمیر کرائیں اس کے مشرق میں دارالحدیث بنوائی، دارالحدیث کے آس پاس کئی درسگاہیں رکھیں، مدرسین وطلباء کے قیام کے لئے کچھ حجرے بالائی حصے میں تعمیر کرائے غرضیکہ مدرسہ کو گلزار کر دیا۔

مولانا ظہور علی صاحب بچھرایونی مرحوم جو کہ اس مدرسہ کے فرزندان قدیم میں سے تھے فرمایا کرتے تھے کہ جب ہم لوگ حضرت مولانا کے ہمراہ مراد آباد سے امروہہ آئے تو جس جگہ دارالحدیث ہے وہاں افتادہ زمین تھی، اس زمین میں ہم ترکاری بو دیا کرتے تھے، حضرت مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ کی ظاہری وباطنی تعمیر میں اپنی تمام تدابیر اور صلاحیتیں صرف فرمائیں، کئی سال تک تعمیر کا سلسلہ جاری رکھا اور اس کے ساتھ ہی مدرسہ کی مالی حالت

مضبوط کرنے کے لئے مسلسل جدّ و جہد فرمائی۔

آپ کی علمی وجاہت، روحانی تاثیر اور اخلاص وللّہیت کی برکت تھی کہ مختلف طبقات کے ذی اثر اشخاص آپ کی اس علمی و تبلیغی تحریک میں دل و جان سے شریک ہوگئے تھے۔

شاہ بہاؤ الدین صاحب نقشبندیؒ، نواب وقار الملک مرحوم، منصف امتیاز علی مرحوم، محلّہ ملانہ کے بااثر حضرات اور ہر ہر محلے اور برادری کے ممتاز و دیندار غریب و امیر اشخاص نے اس کارِ خیر میں خوب خوب حصہ لیا اور مدرسہ کی ترقی و استحکام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے دار العلوم دیوبند کو جس طرح عمومی چندہ کے اصول پر قائم فرمایا تھا اور جن طریقوں پر ان کے قائم کردہ مدارس چل رہے تھے بعینہٖ اسی طرز پر حضرت مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مدرسہ امروہہ کو چلایا، احقر نے وہ رسیدیں دیکھی ہیں جن پر خود حضرت والا کے دستخط وصولیابی کے خانے میں ثبت ہیں اور جن کو خود شہر میں اپنے رفقاء کے ساتھ چل پھر کر پُر کیا ہے۔

ابتداء میں خود ہی حضرت مولانا صدر مدرس اور شیخ الحدیث ہیں، خود ہی مہتمم و منتظم ہیں، خود ہی چندہ وصول کر رہے ہیں اور خود ہی کتب خانہ کی فراہمی، مدرسین کے تقرر، اور طلباء کے داخلہ کا انتظام فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں اشاعتِ دین کی جو تڑپ رکھی تھی اسی تڑپ کا یہ نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے استاذِ معظم حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک تعلیم دین و تبلیغ احکام شرع متین کو چلانے کے لئے اتنی انتھک کوششیں کیں جن کا آج پورا پورا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

امروہہ ایک قدیم تاریخی بستی ہے اس میں بڑے بڑے مشائخ، علماء اور ہر ہر فن کے ماہرین پیدا ہوئے، یہاں پر ہر زمانہ میں نامور شخصیتیں پیدا ہوئیں، یہاں معزّ الدین کیقباد کے عہد میں سب سے پہلا عربی مدرسہ معزّیہ کے نام سے قائم ہوا تھا، جو مدتوں قائم رہا۔ یہاں کی خانقاہوں میں علم و عرفان کی بارشیں ہوتی تھیں، اکبری دور کے مشہور میر عدل مولانا سید محمد رحمۃ اللہ علیہ اسی سرزمین کے باشندے تھے۔ ملا عبد القادر بدایونی رحمۃ اللہ علیہ صاحب منتخب التواریخ، انہیں مولانا سید محمد میر عدل رحمۃ اللہ علیہ سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے امروہہ آئے تھے، ہندوستان کے آخری دور کے مشہور محدث حضرت قاری عبد الرحمن پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی سرزمین کے ایک اہل دل محدث و قاری حضرت مولانا قاری امام الدین مجششی رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ حضرت شاہ غلام

علی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ) سے تجوید کی سند حاصل کی تھی اور بخاری شریف کے اٹھارہ پارے پڑھے تھے بعدہٗ وہ حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث دہلوی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے تھے۔(۱)

اسی مردم خیز سرزمین پر جس کی تاریخی حیثیت کی تفصیل کا موقعہ نہیں ۱۸۵۷ھ سے پہلے مسجدوں، گھر کی بیٹھکوں اور محلّہ کی سہ دریوں میں، بہت سے انفرادی مکاتب موجود تھے جن میں بہترین ماہرین فن ہر علم وفن کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد اس علمی شہر کی درسی محفلیں خاموش ہو گئی تھیں، حدیث وتفسیر اور فقہ کے وہ چرچے نہیں رہے تھے، معقولات اور جملہ فنون کی تحصیل کا کسی کسی کے اندر ذوق باقی تھا غرض کہ عربی تعلیم خصوصاً علم دین کا خاتمہ نظر آتا تھا۔

یہ حضرت قاسم العلوم والمعارف اور ان کے ممتاز شاگرد کا صدقہ ہے کہ امروہہ کی روایات قدیمہ دوبارہ زندہ ہوگئیں اور ہند و بیرون ہند میں اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔

مدرسہ کے اساتذہ

علاوہ حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ کے جو مدرسہ کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث تھے اور جن کی علمی شہرت کی وجہ سے مدرسہ بام عروج پر گامزن ہوا تھا، دیگر باکمال اور متبحر اساتذہ اس مدرسہ میں وقتاً فوقتاً درس دیتے رہے چند کے اسماء پیش کرتا ہوں:۔

(۱) مفسر جلیل حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن صاحب صدیقی رحمۃ اللہ علیہ جو بعد میں آپ کے جانشیں ہوئے۔

(۲) حضرت مولانا حافظ شاہ عبد الغنی صاحب پھلاؤدی رحمۃ اللہ علیہ جو علوم ظاہریہ وباطنیہ کے جامع تھے اور ہر علم وفن خصوصاً علم ادب میں ید طولیٰ رکھتے تھے، تقریباً پندرہ مقامے مقامات حریری کے ان کو ازبر تھے جیسا کہ سننے میں آیا ہے۔

(۳) حضرت مولانا نور الزماں صاحب پنجابی یہ صرف ونحو کے بہترین ماہر تھے بعد میں ان پر درویشی کا غلبہ ہو گیا تھا، کالا باغ کے علاقے کے مشہور صاحب سلسلہ بزرگ گذرے ہیں۔

(۴) حضرت مولانا سید رضا حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ برادر زادہ و داماد حضرت امروہی رحمۃ اللہ علیہ تمام

(۱) ملاحظہ ہو تذکرۂ ورحمانیہ

علوم خصوصاً صرف ونحو میں خاص قابلیت رکھتے تھے۔

(۵) حضرت مولانا محمد امین الدین خاں شاہ آبادی ثم امروہی رحمۃ اللہ علیہ معقولات میں خاص طور پر اپنے استاذ حضرت امروہی رحمۃ اللہ علیہ کا نمونہ تھے، بعد میں طبیہ کالج دہلی میں پروفیسر مقرر ہوئے اور آخر میں وائس پرنسپل ہو گئے تھے۔

(۶) حضرت مولانا خادم حسین صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ عربی فارسی کے بہترین ادیب تھے بعد میں مدرسہ عباسیہ بچھرایون کے صدر مدرس ہو گئے تھے۔

فارسی درجات میں مولانا ظفر خاں صاحب بجنوری مرحوم انتہائی فارسی ادبیات پڑھاتے تھے، کثیر التعداد طلباء نے فارسی لٹریچر میں آپ کے فیض درس سے کمال حاصل کیا۔

شہر کے مشہور ریاضی داں منشی چاند خاں صاحب مرحوم ریاضی پڑھاتے تھے۔

استاذ القرّاء قاری ضیاء الدین صاحب الہ آبادیؒ

مدرسہ کے قیام کے کچھ سال بعد ملک کے مشہور قاری و مجود حضرت مولانا قاری ضیاء الدین صاحب الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ علم تجوید کی تکمیل کے بعد امروہہ تشریف لے آئے یہاں وہ حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور علم حدیث وتفسیر حاصل کیا، مولانا قاری سید محمد صادق مدظلہ صاحبزادہ حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ کو انہوں نے تجوید کے ساتھ قرآن شریف حفظ کرایا۔ اور دیگر طلبا کو بھی فیض پہونچایا، میں نے بعض وہ خط پھلاؤدہ میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام دیکھے ہیں جن میں حضرت محدث امروہیؒ نے قاری ضیاء الدین صاحب کے تقرر کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے، قاری صاحب مرحوم ومغفور کے ذریعے یہاں پر علم تجوید کا بڑا چرچا ہوا، اور بہت سے شہری وبیرونی طلاب نے ان سے اپنا قرآن درست کرلیا۔

طب کی تعلیم

حضرت مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ علم الادیان کے ساتھ ساتھ علم الابدان کے اسباق بھی پڑھاتے تھے بہت سوں نے آپ سے طب کی تعلیم حاصل کی، آپ نے طب کا پورا نصاب کتب خانہ میں جمع کرلیا تھا اور ایک ایک کتاب کے کئی کئی نسخے تعلیم

کی غرض سے مہیا کئے تھے۔ اس درس میں خاص طور پر وہ طلباء شریک ہوتے تھے جو اپنی پوری زندگی کسی مدرسہ میں گزار دینے کی ہمت نہ رکھتے تھے یا جن کے والدین نے غالباً یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ ان کے بچے "تعلیمی تحریک" کارکن بن کر قلیل تنخواہ پر اکتفا کریں، علاوہ ازیں امروہہ اس زمانے میں طبّی حیثیت سے عروج پر تھا، حکیم سید احمد سعید صاحب افسر الاطباء دکن، حکیم سید علی حسن صاحب، حکیم سید ابن حسن صاحب، حکیم عبد السلام صاحب، حکیم عبد القیوم صاحب، حکیم حکمت اللہ صاحب اور امروہہ کے دیگر حاذق اطباء امروہہ و بیرون امروہہ میں پوری پوری شہرت رکھتے تھے، اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں طب کی اہمیت عام ذہنوں پر طاری تھی۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی حکمت مآب طبیعت نے ایسے موقع پر مناسب جانا کہ ذہنوں کی طب پسندی سے کام لیکر ان کو حدیث وتفسیر وفقہ سے بھی آشنا کر دیا جائے۔

چنانچہ شہر کے ذہین وذی استعداد طلباء کی بڑی تعداد ایسی پیدا ہوئی جنہوں نے تمام درسیات ختم کرنے کے ساتھ ساتھ طب میں بھی کمال حاصل کیا اُن میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں:۔

استاذ الاطباء مولانا حکیم فرید احمد صاحب عباسی امروہی مدظلہ، مولانا حکیم مختار احمد صاحب صدیقی امروہی مرحوم۔ مولانا حکیم سید محمود الحسن صاحب امروہی مرحوم برادر زادہ (حضرت مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ)، مولانا حکیم ظہور الحق صاحب صدیقی امروہی مرحوم، حکیم سید حامد حسن صاحب امروہی مرحوم افسر الاطباء حیدرآباد دکن (برادر علاتی حضرت مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ)

مدرسہ کے حق میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعاء

مدرسہ کے قیام کے دو سال بعد شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرید مولانا شاہ عبد الغنی صاحب پھلاودی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک مکتوب گرامی تحریر فرماتے ہیں:۔

> از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ بخدمت سراپا برکت عزیزم مولوی عبد الغنی صاحب مدرس مدرسہ امروہہ رزقہ اللہ تعالیٰ محبتہ ومعرفتہ بعد سلام مسنون ودعاء خیر وبرکت کے واضح رائے سعادت انتمائے ہو کہ آپ کا نامہ مرقومہ ۳۰ر شعبان ۱۳۰۵ھ قدسی وارد ہوا، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امید ہے کہ اپنے فضل وکرم سے آپ کے مدرسہ کی مدد واعانت کرتا رہے گا اور سب

سرمایوں سے باقی اور لازوال سرمایہ توکل ہے جس چیز کا یا جس کا اللہ جل جلالہٗ خود وکیل ہوا تو اس کا کیا کہنا ہے، آپ لوگ نظر حضرت حق کی رحمت پر رکھ کر اس کے بندوں کو باخلاص تعلیم و تلقین فرمائیے، میں بھی دعاء کرتا ہوں آپ بھی دعاء فرمائیے اللہ تعالیٰ آپ کو مستطیع فرما کر شرف زیارت سے حرمین شریفین کے مشرف فرماوے۔...........

السلام علیکم و علی من لدیکم
۲۱ ذی قعدہ ۱۳۰۵ھ قدسی
(نقل از ذخیرۂ مکتوبات اکابر در کتب خانہ پھلاؤدہ)

حضرت حاجی صاحبؒ کا پیغام مولانا امروہیؒ کے نام

حاجی محبوب خاں صاحب امروہی مرحوم نے مجھ سے ایک سے زائد مرتبہ یہ واقعہ بیان کیا کہ جب میں حج بیت اللہ کے لئے جانے لگا تو حضرت مولانا امروہی نے فرمایا کہ "حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میرا سلام عرض کرنا اور یہ کہہ دینا کہ دل حاضری کو بہت چاہتا ہے لیکن کارہائے مدرسہ فرصت نہیں دیتے" حاجی محبوب خاں صاحب نے مکہ معظمہ پہنچ کر حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ان کے ایک مخلص مرید و خلیفہ کا یہ سلام و کلام پیش کر دیا اس کے جواب میں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "ہماری یہ ٹوپی ان کو دیدینا اور یہ کہنا کہ جو کام تم امروہہ میں رہ کر انجام دے رہے ہو وہ یہاں کی حاضری سے بہتر ہے"

دارالعلوم دیوبند میں تقرر

چونکہ دارالعلوم کی پرانی روئدادیں میرے سامنے نہیں اس لئے سن تو نہیں لکھ سکتا لیکن قیام مدرسہ امروہہ کے چند سال بعد دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ نے حضرت محدث امروہی کو دارالعلوم دیوبند میں بلالیا، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو اور آپ کو برابر درجے پر رکھا گیا البتہ حضرت مولانا امروہی کی تنخواہ قدرے زیادہ رکھی گئی۔

حضرت مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ وہاں پر غالباً دوماہ سے زائد نہیں رہے اس زمانہ میں مولانا قمر الدین صاحب سہنسپوری جنہوں نے سند فراغ امروہہ سے حاصل کی ہے، دارالعلوم میں تعلیم پارہے تھے، ان کی زبانی دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ کے پہلے درس

کا حال سنئے، بیضاوی، شمس بازغہ، صدرا وغیرہ کتب حضرت مولانا امروہیؒ کے سپرد کی گئیں۔ سب سے پہلے صدرا پڑھنے والوں کو آواز دی گئی اس کتاب میں تین پنجابی طالب علم شامل تھے جن میں ایک مولوی نور الزماں پنجابی دوسرے مولوی عبدالحلیم تیسرے ایک اور ذی استعداد پنجابی طالب علم تھے جن کا نام یاد نہیں رہا۔ یہ تینوں طالب علم تمام کتابیں ختم کر کے علم حدیث پڑھنے دیوبند آئے تھے، جب حضرت مولانا امروہیؒ کی آمد ہوئی تو ان طالب علموں نے آپس میں مشورہ کیا کہ مولانا امروہی کی معقولات میں بڑی شہرت سنی ہے ان کو آزمانا چاہئے (غالباً اسی غرض سے صدرا میں شامل ہوئے) آواز دینے پر یہ تینوں طالب علم حاضر ہو گئے۔

مولانا امروہیؒ نے فرمایا اچھا شروع کیجئے۔ ایک نے پڑھنا شروع کیا، کچھ اعراب میں غلطی ہو گئی، مولانا نے خاص انداز میں فرمایا:۔ مولوی صاحب سنبھل کر پڑھئے! یہ سننا تھا کہ طالب علم کی روح فنا ہو گئی، پھر خود بتلایا یوں پڑھئے۔ اس کے بعد مولانا نے فرمایا مولوی صاحب میں ایک تقریر کرتا ہوں غور سے سن لینا۔ چنانچہ مولاناؒ نے ایک تقریر فرمائی جب تقریر ختم ہو گئی تو فرمایا اب ترجمہ کیجئے۔ درمیان ترجمہ میں ایک نے گردن اٹھائی اور کچھ پوچھنا چاہا۔ فرمایا کچھ پوچھنا ہے؟ طالب علم نے اپنا شبہ پیش کیا فرمایا میں اس کا جواب اپنی تقریر میں دے چکا ہوں آپ نے غور نہیں کیا، پھر دوبارہ تقریر فرمائی، تقریر میں اس کے شبہ کا جواب موجود تھا، بالآخر معترض صاحب نے شرم کے مارے اپنی گردن جھکا دی سبق کے بعد تینوں یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ معقولات تو دیوبندیوں کے پاس ہے " مولانا قمر الدین صاحب بیان کرتے ہیں کہ حضرت مولانا کو دیوبند میں ایک دو ماہ کا عرصہ ہوا تھا کہ مولوی نادر شاہ خاں صاحب وکیل مہتمم مدرسہ امروہہ دیوبند پہونچے، ان سے بعض اشخاص نے دریافت کیا کہ کیسے تشریف لائے، تو انہوں نے فرمایا کہ "ایک باغ ہم نے لگایا تھا جب وہ بار آور ہوا تو اس کا باغبان چلا گیا، اب وہ باغ خراب ہو چلا"

مولانا قمر الدین صاحب فرماتے ہیں کہ ہم سمجھ گئے کہ یہ حضرت مولانا کو لینے آئے ہیں، مولوی نادر شاہ خاں صاحب وکیل، حکیم مشتاق احمد صاحب مرحوم سے بھی ملنے گئے اور ان کو بتلایا کہ امروہہ میرا مکان ہے اس مقصد سے حاضر ہوا ہوں۔ ان سے بھی یہی بات کہی کہ ہمارا باغ اُجڑنے کا اندیشہ ہے حکیم صاحب نے فرمایا" خاں صاحب آپ پریشان نہ

ہوجنے آپ کے باغ کا خیال رکھا جائے گا" حکیم صاحب اطمینان دلا کر ممبروں کے پاس گئے سب ممبروں نے اطمینان دلایا کہ مولانا کو امروہہ بھیج دیا جائے گا، چنانچہ سب نے مشورہ کرکے طے کیا کہ چونکہ مدرسہ امروہہ کا قائم رکھنا بھی ضروری ہے اس لئے حضرت مولانا کو امروہہ واپس بھیج دیا جائے۔

مولانا دوبارہ اپنے مدرسہ میں تشریف لے آئے، مولوی نور الزماں صاحب بھی کچھ دنوں بعد امروہے آگئے یہاں پر ان کو کچھ عرصے کے بعد مدرس بنادیا گیا۔

نو درہ میں درس دیا

دار العلوم میں نو درہ کی سی درسگاہ میں حضرت مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ درس دیتے تھے، مولانا قمر الدین صاحب بیان کرتے ہیں "ایک دن ایسا ہوا کہ کچھ طلباء عین اس وقت جبکہ حضرتؒ درس دے رہے تھے آپ کی درسگاہ کے قریب برآمدے میں بیٹھ کر زور زور سے مذاکرہ کرنے لگے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے درسگاہ سے باہر نکل کر پرہیبت لہجے میں ان کو ڈانٹ بتلائی وہ طلباء خائف ہو کر بھاگ گئے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی درسگاہ میں جاکر پناہ لی، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "میر صاحب کو غصہ آرہا ہے" اس کے بعد کسی طالب علم کی مجال نہ تھی کہ آپ کی درسگاہ کے قریب کچھ بول سکے۔

مولانا کی علمی شہرت

حضرت قاسم العلوم کے ممتاز شاگرد ہونے کی وجہ سے ان کی علمی شہرت نہ صرف ہندوستان کے گوشے گوشے میں بلکہ بیرون ہند میں بھی ہوگئی تھی، ہندوستان کے ہر ہر صوبے کے نیز افغانستان وغیرہ کے طلباء شد رحال کرکے امروہہ آتے، یہاں پر شمع حدیث رسول کے پروانوں کا زبردست ہجوم رہتا تھا، بعض دوسرے مدارس ہند کے طلباء بھی بغرض تعلیم امروہہ آگئے تھے۔

"انشاء مظہر" کے مصنف مولانا مظہر الحق مظہر چاٹگامی تقریباً ۱۳۰۵ھ میں کانپور کے مدرسہ سے امروہہ میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے آئے چنانچہ مکتوب یازدہم میں لکھتے ہیں:۔

"قریب بست روز با تقضائے رسید بندہ از شہر کانپور نقل نمودہ بقصبہ امروہہ آمدہ بعالی

جناب فخر علمائے زمن مولانا سید احمد حسن صاحب دام نوالہم کتاب جلالین شریف ترمذی شریف ہدایہ آخرین مقامات حریری درس وارد۔(۱)

طریقۂ درس

حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر نہایت جامع، شستہ اور پُر مغز ہوتی تھی جس سے طلباء کی پوری پوری تشفی ہو جاتی تھی اور ان کا دامن طلب گلہائے مقصود سے بھر جاتا تھا، تقریر میں وہ اپنے استاذ کا مکمل نمونہ تھے (آپ کی درسی وعمومی تقریروں کے چند نمونے آگے چل کر پیش کئے جائیں گے) بعض حدیث کی کتابوں کی قرأت وہ خود کرتے تھے، طالب علم جب تک اچھی طرح مطالعہ دیکھ کر نہ آتا مجال نہ تھی کہ مولانا کے سامنے پڑھ سکتا،ان کے سامنے عبارت پڑھنے کیلئے بڑی قابلیت بڑی ہمت اور بڑی حاضر دماغی کی ضرورت تھی،ایسی غلطی جو اونچی کتابیں پڑھنے والوں کیلئے زیبا نہیں اس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے غصہ وجلال فوراً چہرۂ تاباں پر نمایاں ہو کر پورے حلقے پر اثر انداز ہو جاتا تھا، تمام طلباء تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔

جہاں تک دورۂ حدیث کا تعلق ہے مجھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد تلامذہ سے معلوم ہوا کہ کتب صحاح کو کم از کم دو سال میں ختم کراتے تھے اگر ایک سال ترمذی شریف پڑھائی تو دوسرے سال بخاری شریف اور دیگر کتب، انہوں نے دورے کی کتب کو حسب صوابدید اپنی خاص ترتیب کے ساتھ نصاب میں رکھا تھا، ترمذی کے درس میں بہت تفصیل سے تقریر فرماتے تھے ہر ہر مسئلہ کو عقلی ونقلی حیثیت سے سمجھاتے تھے، اپنے استاذ کی وساطت سے ان کو جو خاص علم کلام حاصل ہوا تھا اس کو اپنے درس میں آشکارا کرتے تھے،ان کے حلقۂ درس میں ایک طرف حضرت قاسم العلومؒ کے طریقۂ استدلال کی یاد تازہ ہوتی تھی تو دوسری طرف حکمت ولی اللٰہی اور ذکاوت عزیزی اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی تھی۔افسوس کہ آپ کی درسی تقاریر کے مکمل مجموعے جو چند سال پیشتر تک آسانی سے مل سکتے تھے باوجود تلاش کے دستیاب نہ ہو سکے ورنہ اس سے بہت کچھ علمی سرمایہ ہاتھ لگتا، تقریر ترمذی کا ایک نامکمل مجموعہ مجھے حاصل ہوا ہے جس کے چند اقتباس مستقل عنوان کے ماتحت تبرکاً پیش کروں گا۔

صاحب تذکرۃ الکرام آپکے طریقۂ تعلیم اور افادۂ تدریس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

(۱) انشاء مظہر ص ۹ مطبوعہ قیومی کانپور

”آپ ان جملہ علوم کی جو درس نظامیہ کے نظام تعلیم میں شامل ہیں تعلیم دیتے، لیکن زیادہ توجہ وانہماک حدیث وتفسیر وفقہ کی تدریس سے تھا آپ کے تلامذہ سے سنا گیا کہ بیان ایسا واضح اور پرُ شوکت ہوتا کہ دقیق سے دقیق مسائل طلباء کی سمجھ میں بہت سہولت سے آجاتے اور اس کے ساتھ مضمون کی عظمت بھی ذہن نشیں ہو جاتی۔“

طلباء کی اخلاقی نگرانی

حضرت رحمۃ اللہ علیہ طلبائے علوم دینیہ کی جہاں ہر قسم کی سہولتوں کا لحاظ رکھتے تھے وہاں ان کو یہ فکر بھی تھی کہ ان کی اخلاقی نگرانی بھی پوری طرح ہو، مدرسہ کی حدود میں اور مدرسہ کے باہر یکساں طور پر کڑی نگاہ ان پر رہتی تھی، بقول مؤلف تذکرۃ الکرام ”شاگردوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ حکیمانہ ہوتا تھا، سختی کے موقع پر سختی اور نرمی کے موقع پر نرمی“ کوئی خلاف تہذیب عمل طالب علم سے سرزد ہوتا تو اس کو فوراً ٹوک دیتے، طلباء کی وضع قطع کا خاص لحاظ رکھتے تھے۔ آپ کا جلال مشہور تھا بعض اوقات زبانی سرزنش کے علاوہ اچھے اچھے جوان اور قوی ہیکل طلباء کو تربیت کے سلسلے میں زدوکوب بھی کر دیتے تھے، درمیان درس میں اور ختم بخاری کے دن خاص طور پر نصیحتیں فرماتے تھے، حکیم محمد رفیع صاحب نے بیان کیا کہ ہماری بخاری جب ختم ہوئی تو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بے ثباتیٔ دنیا کا نقشہ کچھ اس انداز سے کھینچا کہ میں نے اور میرے ساتھ جو شریک تھے ان میں سے کئی طلباء نے اس تقریر سے متاثر ہو کر یہ تہیہ اور فیصلہ کر لیا کہ اب ہم دنیا سے بالکل بے تعلق اور شہر کی زندگی سے کنارہ کش ہو کر یاد خدا میں مشغول ہو جائیں گے، چنانچہ اس کیلئے عملی پروگرام بھی بنالیا تھا، اتفاق سے حکیم محمد رفیع صاحب کے والد کو اپنے بیٹے کا ارادہ معلوم ہو گیا حضرت مولانا کے سامنے اس کا ذکر کر دیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے سمجھایا کہ اس تقریر کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ رہبانیت اختیار کر لی جائے اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ مشہور اشعار پڑھے۔

صاحب دلے بمدرسہ آمد ز خانقاہ	بشکستہ عہد صحبت اہل طریق را
گفتم میان عالم و عابد چہ فرق بود	تا اختیار کردی ازاں ایں فریق را
گفت او گلیم خویش بدر می رود ز موج	ویں جہد می کند کہ بگیرد غریق را

حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس امر کا خاص خیال رکھتے تھے کہ طلباء اپنی متعلقہ کتابوں اور مفید دین تصنیفات کے علاوہ غیر متعلق کتابوں کے مطالعہ میں مشغول نہوں، میرے محلے کے ایک بزرگ نے بیان کیا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ایک دن احقر کے دادا مولوی بشیر احمد صاحب فریدی کے پاس تشریف لائے ہوئے تھے۔ مسجد محلّہ کے سامنے والے مکان کے تحتانی کمرے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نشست تھی، مسجد کے حجرے میں مظاہر نام کے ایک طالب علم مقیم تھے ان کو مولانا کی موجودگی کا علم نہیں تھا، اتفاق کی بات کہ اس وقت وہ طالب علم (غالباً) فسانۂ عجائب پڑھ رہے تھے، ان کیساتھ چند اور طالب علم بھی تھے کتاب پڑھتے پڑھتے جب اس شعر پر پہونچے۔

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے کان میں آواز پہونچ گئی، غصے میں آکر نیچے سے آواز دی "مظاہر! ٹھہر جا۔ میں آتا ہوں تو یہاں اسلیئے آیا ہے کہ فسانۂ عجائب پڑھے گا" یہ سننا تھا کہ طالب علم کا دم نکل گیا مع ساتھیوں کے مسجد کی دوسری جانب سے کود کر فرار ہو گیا حضرت مولانا مسجد کی طرف چل پڑے تھے، دادا مرحوم نے خوشامد کر کے غصے کو فرو کیا۔

تلامذہ

مدرسہ جامعہ امروہہ کے وہ پرانے رجسٹر جن میں فارغ التحصیل طلباء کے اسماء معہ پتے درج تھے ضائع ہو گئے ورنہ آپ کے ہزاروں شاگردوں میں سے چند سو مشاہیر کا انتخاب با آسانی ہو سکتا۔ اب صرف چند کا اندراج کیا جاتا ہے، اس فہرست میں ان تلامذہ کا نام درج نہیں ہوگا جن کا نام پہلے آچکا ہے:۔

(۱) استاذ القراء مولانا قاری ضیاء الدین صاحب مرحوم الہ آبادی
(۲) مولانا محمد فاروق صاحب انبیٹھوی سابق شیخ الحدیث جامعہ عباسیہ
(۳) مولانا عبد الرحمن صاحب سہنسپوری سابق رکن مجلس علماء بھوپال
(۴) مولانا غلام یحییٰ صاحب سابق صدر مدرس مدرسہ الٰہیات کانپور
(۵) مولانا خان زماں صاحب چند کتب صرف ونحو کے مؤلف ہیں
(۶) مولانا حکیم محمد اسحٰق صاحب کٹھوری
(۷) مولانا سید عبد الغفور صاحب سیوہاروی مرحوم

(۸) مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی مرحوم
(۹) مولانا ظہور علی صاحب بچھرایونی مرحوم
(۱۰) مولانا قمر الدین صاحب سہنسپوری
(۱۱) مولانا فضیل حق صاحب سہنسپوری
(۱۲) مولانا سید علی زینبی صاحب امروہی مرحوم
(۱۳) مولانا حافظ محمد یوسف صاحب انصاری مرحوم۔

مدرسہ اسلامیہ امروہہ آپ کے بعد

حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ امروہہ قائم کرنے والے بھی تھے، صدر المدرسین و شیخ الحدیث بھی تھے اور عملاً مہتمم بھی، اگرچہ ضابطہ میں وقتاً فوقتاً کار اہتمام متعدد اشخاص کے سپرد ہوتا رہا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مجلس شوریٰ کے مضبوط نظام کے تحت بڑی خوبی اور حسن تدبیر کے ساتھ مدرسہ کو اعلیٰ منازل پر فائز کیا۔ ان کا بڑا نصب العین اپنے استاد کی طرح یہی تھا کہ علوم نبویہ کے ماہرین زیادہ سے زیادہ پیدا ہوں، اور اسلامی تہذیب و معاشرت زیادہ سے زیادہ رواج پائے۔ اور اس راستہ سے ۱۸۵۷ء سے بعد کے پیدا شدہ زہر کا تریاق مہیا ہو جائے، بحمد اللہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوئے ان کی وفات کے بعد ان ہی کے شاگرد مولانا حافظ عبد الرحمٰن صاحب صدیقی رحمۃ اللہ علیہ (جو حضرت قاسم العلوم اور حضرت مولانا گنگوہی سے بھی مستفیض تھے) اس مدرسہ کے شیخ الحدیث و صدر المدرسین قرار پائے، حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے مولانا عبد القدوس صاحب صدیقی صدر مدرس بنے، اور مولانا اعجاز حسنین صاحب کے سپرد مدرسہ کی زمام اہتمام آئی۔

نواب وقار الملک مرحوم اور محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ

وقار الملک نواب مشتاق حسین صاحب امروہی مرحوم بڑے وضعدار، خوش اخلاق اور مذہبی انسان تھے، تعلیمی تحریک میں وہ سرسید مرحوم کے رفقاء میں سے تھے لیکن جہاں تک عقائد کا تعلق ہے ان کو سرسید سے بڑا بعد تھا۔

نواب وقار الملک اہل علم اور اہل دین حضرات سے انتہائی عقیدتمندی سے پیش آتے تھے، حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی انکو بہت ربط تھا، مدارس کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے لیکن نواب صاحب یہ چاہتے تھے کہ اس مدرسہ میں انگریزی تعلیم کا سلسلہ بھی عربی کیساتھ ہی ساتھ جاری رہے، ایک مرتبہ انہوں نے اپنی یہ رائے مجلس شوریٰ میں پیش کی، حضرت محدث امروہیؒ جس لائن پر مدرسہ کو چلا رہے تھے، اور انکے استاد کا مدارس اسلامیہ کے قائم کرنے کا جو مقصد و منشاء تھا، یہ بات اسکے خلاف تھی، اس لئے اس رائے کو قبول کرنے سے انکار فرمایا۔ نواب وقار الملک نے اپنی رائے کو منوانا چاہا وہ نہ مانی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ مجلس شوریٰ سے کوئی تعلق نہیں رکھونگا۔ اس پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خودداری کا ثبوت دیتے ہوئے فرمایا کہ شاید نواب صاحب یہ خیال کرتے ہوں گے کہ ان کے بغیر مدرسہ نہ چلے گا۔ میں نواب صاحب کی ذرہ برابر پرواہ نہ کروں گا، بعد کو نواب صاحب نے معافی مانگ لی تھی اور باہمی تعلقات بدستور خوشگوار رہے، اپنی جائیداد کا ایک حصہ نواب صاحب نے مدرسہ کے نام وقف کیا ہے۔

اولاد

حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ کی مختلف اوقات میں تین ازواج تھیں، جن میں سے ایک کے بطن سے بڑی تمناؤں کے بعد ایک صاحبزادے حضرت مولانا سید محمد صاحب رضوی عرف بنے میاں اور دو صاحبزادیاں تولد ہوئیں، صاحبزادہ موصوف نے قاری ضیاء الدین صاحب الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے تجوید سیکھی اور حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سند فراغ حاصل کی ان کے کئی صاحبزادے ہیں۔

انقلاب زمانہ کا جہاں اکثر علمی خاندانوں پر اثر پڑا ہے، وہاں یہ خاندان بھی مستثنیٰ نہ رہ سکا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کئی نبیرگان ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنے جد امجد کی میراث علمی کی تحصیل میں مشغول نہیں۔ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا۔ خدا کرے کہ اس گھرانے میں پھر کوئی شہباز علم پیدا ہو۔

حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ کی جامعیت

مناسب سمجھتا ہوں کہ اس عنوان پر بطور خود لکھنے کی بجائے دو اہل قلم حضرات کی تحریریں پیش کر دوں۔

مؤلف تذکرۃ الکرام فرماتے ہیں:۔

"معاصر علماء میں آپ کو درجۂ امتیاز حاصل تھا، علمی اور فقہی مسائل میں علماء کو جب شکوک و شبہات لاحق ہوتے حل مشکلات کی خاطر آپ ہی کی جانب رجوع کرتے۔ آپ کی رائے اور آپ کا فتویٰ علماء کے لئے سند ہوتا، جلسوں کے موقعوں پر جہاں بڑے بڑے ذی کمال اور فضلاء مجتمع ہوتے۔ آپ کی شخصیت ان سب میں نمایاں اور بلند بالا شخصیت نظر آتی، اور ان مواقع پر جب کبھی کسی دقیق علمی مسئلہ پر گفتگو فرماتے علماء ہمہ تن گوش ہوکر سنتے اور آپ کی دقت نظر اور تبحرِ علمی کا اعتراف کرتے، خدائے تعالیٰ نے آپ کی ذات بابرکات میں وہ تمام اوصاف ودیعت کئے تھے جو ایک دینی مقتداء اور مذہبی وملی پیشوا کیلئے ضروری و لازمی ہیں، صلاح و تقویٰ اور تبحرِ علمی کے ساتھ ساتھ دنیوی معاملات میں بھی آپ نہایت صائب الرائے، صاحب فہم اور حسنِ تدبیر تھے۔"

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک تعزیتی مقالے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہر شخص جس کو کچھ تجربہ ہو یہ جانتا ہے کہ دنیا میں بہت کم علماء ایسے ہوتے ہیں جن کو علمی شعبوں کی ہر ایک شاخ میں پوری دستگاہ ہو، مثلاً جن حضرات کو وعظ کہنے میں ملکہ ہوتا ہے وہ تدریس پر پورے قادر نہیں ہوتے اور جو تدریس کے کام میں مشغول ہوتے ہیں ان کو کسی مجمع میں وعظ یا تقریر کرنا مشکل ہوتا ہے دینیات میں انہماک رکھنے والے اکثر معقول و فلسفہ سے ناآشنا ہوتے ہیں اور معقولات کے ماہرین کو علوم دینیہ سے بے خبری ہوتی ہے لیکن قدرت نے اپنی فیاضی سے ہمارے مولائے ممدوح (محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ) میں یہ سب اوصاف اعلیٰ طور پر جمع کردیئے تھے۔"

مولانا کی تقریر، تحریر، ذہانت، تبحر، اخلاق، اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں کامل دستگاہ ضرب المثل تھی اور سب سے زیادہ قابل قدر اور ممتاز کمال مولانا کا یہ تھا کہ حضرت قاسم العلوم والخیرات رحمۃ اللہ علیہ کے دقیق اور غامض علوم کو ان ہی کے لب ولہجہ اور طرز ادا میں نہایت صفائی اور سلاست کے ساتھ بیان فرماتے تھے۔" (القاسم ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ)

نگینہ میں تقریر

۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء کو نگینہ ضلع بجنور میں آریوں سے مناظرہ ہوا، اس میں حضرت محدث امروہوی رحمۃ اللہ علیہ اور اس وقت کے تقریباً تمام مشاہیر اکابر نے شرکت فرمائی تھی۔ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مغفور نے فریق ثانی سے مناظرہ کیا۔ کئی دن تک محفل مناظرہ گرم رہی، غالباً تقدیر کا مسئلہ فریق ثانی کی طرف سے چھیڑ دیا گیا تھا جو طول پکڑ گیا تھا، اور کسی طرح نمٹنے میں نہیں آتا تھا، ادھر عوام الناس کے غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا سخت اندیشہ تھا اسی دوران میں ایک رات حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خواب دیکھا کہ ایک دریا ہے اس کے ایک کنارے پر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہیں۔ اور دوسرے کنارے پر حضرت قاسم العلوم تشریف فرما ہیں، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ حضرت میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں کوئی کشتی ہے نہیں جس کی ذریعہ میں آپ تک پہونچوں، کیا کروں؟ فرمایا "اس کی تدبیر میر احمد حسن سے دریافت کرو" صبح کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس خواب کی تعبیر خود ہی نکالی کہ "دریائے مناظرہ سے پار ہونے کی تدبیر میر احمد حسن صاحب امروہی بتلائیں گے۔" چنانچہ ان کے پاس پہونچے، اور فرمایا کہ رات میں نے استاد مرحوم کو خواب میں دیکھا ہے یہ صورت واقعہ تھی اور انہوں نے یہ فرمایا ہے۔"

حضرت امروہی رحمۃ اللہ علیہ نے اولاً بطور انکسار فرمایا کہ "یہ خواب و خیال کی بات ہے" اس کے بعد فرمایا کہ اگر ایسا ہی ہے تو میں ایک مشورہ دیتا ہوں اس پر عمل کر لیا جائے، اور وہ یہ ہے کہ مناظرہ ملتوی کر دیا جائے، ایسا ہو جائے کہ ایک وکیل آریوں کا اپنے مذہب کے اثبات میں تقریر کرے اور اس کو بالاتر ثابت کر دکھائے، اور دوسرا وکیل مسلمانوں کی طرف سے ہو جو مذہب اسلام کی تمام مذاہب عالم پر فوقیت اور اس کا باعث نجات ہونا عقلی دلائل سے ثابت کرے اور مجمع عام میں ہر دو مذہب کے وکیل اپنی اپنی تقریر پیش کر دیں۔"

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آریوں نے بھی اس کو مان لیا۔ مسلمانوں کی طرف سے متفقہ طور پر حضرت محدث امروہوی رحمۃ اللہ علیہ وکیل بنائے گئے۔ آپ نے آریوں اور عیسائیوں کے بھرے مجمع میں ایک معرکۃ الآراء تقریر فرمائی جس میں عقلی دلائل کی مدد سے اسلام کی جملہ مذاہب عالم پر فوقیت و برتری ثابت کی۔

اس تقریر میں توحید، رسالت، مقصد زندگی اور سیرت رسول ﷺ و سیرت صحابہ رضی اللہ عنہ پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ کا رنگ اس تقریر میں پورا پورا جھلک رہا ہے۔ افادات احمدیہ میں دعوۃ الاسلام، کے عنوان سے یہ تقریر شائع ہوگئی ہے۔ اور ۲۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ روئداد مناظرہ نگینہ میں بھی چھپ چکی ہے، ہر مبلغ اسلام اور حکمت وعقل کی روشنی میں ملت بیضا کی بالاتری ثابت کرنے والے کو اس تاریخی تقریر کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ آگے اس کے کچھ اقتباسات پیش کئے جائیں گے۔ لیکن کل تقریر کا لطف ہی کچھ اور ہے اس تقریر کا یہ اثر تھا کہ تمام مجمع دم بخود تھا بعض غیر مسلمانوں نے اس کو سن کر یہ کہا کہ اگر کسی تقریر پر ایمان لے آنا چاہئے تو یہ تقریر ایسی ہی تھی۔

حضرت محدث امروہیؒ نے اپنی تقریر کے متعلق مفتی محمد سہول صاحبؒ سابق مفتی دار العلوم دیوبند سے فرمایا تھا کہ تقریر کرتے وقت مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ میں کہاں ہوں اور کیا کہہ رہا ہوں، بس یہ محسوس ہو رہا تھا کہ استاد مرحوم پاس (۱) کھڑے ہیں اور جو وہ بتلا رہے ہیں وہ بول رہا ہوں جب وقت ختم ہوا، اور اسکی اطلاع دی گئی تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ میری تقریر کا وقت ختم ہوگیا۔"

سچ یہ ہے ؂

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

محمد ابراہیم صاحب پھلاؤدی المتخلص بہ ذوق نے تقریر نگینہ کے متعلق حسب ذیل قطعہ کہا ہے ؂

تیغ زبان حضرت احمد حسن نے کیا
مضمون آبدار کا جوہر دکھا دیا
ایسی لگائی مہر مخالف کے منہ تھے بند
کیا ہی نگینے پر یہ نگینہ جما دیا

---

(۱) مفتی صاحب مرحوم نے یہ واقعہ خود مجھ سے بیان کیا تھا اور فرمایا تھا کہ ایک مرتبہ میری ملاقات ریل میں حضرت مولانا امروہیؒ سے ہوئی اور ان کے ہاتھوں میں (غالباً) روئداد مناظرہ نگینہ تھی۔ میں نے اس روئداد میں حضرت کی تقریر کو پڑھا، اور پڑھ کر عرض کیا کہ حضرت یہ تقریر تو بالکل مولانا نانوتوی کی سی معلوم ہوتی ہے۔ فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہے۔ اور پھر یہ سب واقعہ حضرت شیخ الہند کے خواب وغیرہ کا خود ہی بیان فرمایا، اور فیضان حضرت نانوتویؒ کا ذکر کیا۔

کانوں نے جو سنے وہ مضامین عجیب تھے
آنکھوں سے علم قاسمی سب کو دکھا دیا
مشتاق تھے جو حضرت قاسم کی دید کے
گویا جمالِ قاسمی ان کو دکھا دیا
رد کر دیا دلیل سے کیا خوب باطل کو
تقریر قاسمی کا نمونہ دکھا دیا

تقریر نگینہ کے اقتباسات

شروع میں مجمع کے حسب حال خالص انسانیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعد خطبۂ مسنونہ یہ تمہیدی کلمات ارشاد فرمائے۔

"اے حاضرین جلسہ! اور اے حاضرین مجلس! یہ بندۂ ضعیف اور آپ حضرات بلکہ سب بنی آدم ایک ماں باپ کی اولاد ہیں ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند

اس لئے ہر ایک پر ضرور ہے کہ باہمد گر ایک دوسرے کی پوری ہمدردی کرے اور کامل خیر اندیشی۔ مجھ پر لازم ہے کہ بحق ہمدردی آپ حضرات کی خیر اندیشی میں تا امکان کوشش کروں، میں اپنے خدائے برتر وحدہ لاشریک لہ کو گواہ کر کے قسم کھاتا ہوں کہ مجھ کو اس وقت کھڑے ہو کر جو کچھ عرض کرنا مقصود ہے اس سے صرف آپ حضرات کی خیر اندیشی مقصود ہے اپنا کوئی مطلب ذاتی نہیں۔ لہٰذا بہ ہزار نیاز مندی یہ آرزو ہے کہ آپ حضرات میری جملہ معروضات کو فضول نہ سمجھیں اور انصاف کے ساتھ بہ توجہ خاطر سنیں۔"

اس کے بعد نہایت فصاحت وبلاغت کے ساتھ توحید ذاتی وصفاتی پر بحث فرمائی بعدہ رسالت کا اثبات کرتے ہوئے فرمایا۔

"صاحبو! میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میرا ان تمام معروضات سے کوئی مطلب ذاتی نہیں صرف بحق اُخوت و "اتحاد نوعی" آپ حضرات کی خیر

اندیشی اپنا مقصود ہے۔ اور حق ہمدردی پر ان معروضات کی بناء ہے۔ پس بہزار نیازمندی گزارش ہے کہ یہ زمانۂ نبوت محمدی ﷺ ہے، بغیر اتباع محمدی نجات کا ملنا محال ہے اگر سچی نجات کی طلب ہے تو وہم وخیال کے اتباع کو چھوڑو اور عقل صحیح اور قوت علمیہ سے...... اس مرتبہ (درجہ) کام لو کہ وہ غالب ہو، اور وہم وخیال کو اپنا تابع کر چھوڑے۔ حق کو حق دکھلادے اور باطل کو باطل۔"

صاحبو!.......... ان کے (انبیاء کے) اتباع سے انکار اور ان کی رسالت کی عدم تصدیق دو حال سے خالی نہیں کہ یا تو اشخاص منکرین اپنے کو اور اپنے وجود و بود کو بہمہ جہت مستقل جانتے ہیں اور غیر مخلوق اور انعامات خالق برتر سے جن پر بناء حق عبودیت ہے بالکل مستغنی، اور یا اپنا وجود و بود اور اپنا خَلق دوسرے خالق کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں اور دوسرے کا حق عبودیت اپنے پر لازم.... اور ظاہر کہ..... دونوں شقیں کھلی شرک کو مستلزم..... اور علی کلا الشقین اقرار توحید باطل پس ثابت ہوا اور واضح ثابت کہ اقرار توحید کو اقرار رسالت نیز لازم.... اور رفع لازم چوں کہ رفع ملزوم کو مستلزم... لہٰذا انکار رسالت انکار توحید کو نیز مستلزم...............

صاحبو!...... بالیقین جانو کہ بغیر اقرار رسالت محمدی ﷺ آپ صاحبوں کا اپنے کو موحد کہنا غلط ہے بیشک شرک ہے اور شرک کو مستلزم۔"

اس کے بعد سیرت رسول اکرم ﷺ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

"آپ کو شاید یہ خلجان ہو کہ حضور سرور عالم ﷺ کا علوم راسخہ وملکات فاضلہ میں کامل واکمل اور سب سے اعلیٰ وافضل ہونا کیونکر ثابت اور آپ کی تعلیم میں کیا خوبی..... سو میں ناکارہ ژولیدہ بیان کہ جس کو نہ کمال علمی حاصل نصیب نہ کمال عملی حاصل، ان معارف الٰہیہ ومواہب لدنیہ یعنی ان علوم راسخہ وملکات فاضلہ کی کہ قلب محمدی جن کا مخزن تھا اور معدن۔ اس تھوڑے سے وقت میں کیا تفصیل کرسکتا ہوں، اور بجز اس اجمال کے کہ جو جو کمالات دوسروں میں فرادیٰ فرادیٰ تھے اس مرکز کمالات میں سب مجتمع

تھے اور عالم مخلوق میں وہ منفرد الذات والصفات اس مصرعہ کا مصداق صحیح

ع

"آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری"

اور کیا کہہ سکتا ہوں..... مگر تاہم "اندکے از بسیارے" "ومشتے نمونہ از خروارے" آپ کے فضائل علوم ومحاسن اخلاق واحوال کو اپنے علم ناقص کے اندازہ کے موافق کچھ تھوڑا سا بیان کرتا ہوں........ سو سنئے۔

آپ ایسے زمانۂ پر آشوب میں مبعوث ہوئے، جہالت وضلالت کا پورا زور تھا اور کفر و شرک کا پورا جوش، کفر و شرک کی بغاوت وسرکشی کا اثر تا "آستانۂ عالیہ" پہونچا ہوا تھا، جاہلان عرب نے خود "دار السلطنت" ودربارِ شاہی یعنی خانۂ کعبہ کو بتکدہ بنا رکھا تھا۔ اور خود حاضر باشان درگاہِ اقدس وساکنانِ مکہ معظمہ شرک وکفر میں مبتلا اور وہ بھی اس مرتبہ (درجہ) کہ ایک نہیں دو نہیں بقدر شمار ایام سال خانۂ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے اور بقول شخصے

ہر روز انہیں چاہئے اک تازہ خریدار
صورت مری ہر روز بدل جائے تو اچھا

ہر دن کیلئے نیا بت تھا۔ ملک عرب کی یہ جہالت یہ بداخلاقی کہ باپ بیٹے کا اور بھائی بھائی کا دشمن۔ اور ایک دوسرے کے خون کا پیاسا، عرب کی جہالت عرب کی خانہ جنگی ضرب المثل۔ آپ کی وہاں ولادت اور وہاں بعثت اور وہ بھی اس حال میں کہ نہ باپ سر پر نہ دادا۔ چچا کی سرپرستی اور تربیت میں پرورش پائی، یہ حالت کہ فقر وفاقے پر مدار...... سامان علم وتہذیب وسامان ترقی کہاں تھے؟ اور کیونکر میسر..... بقول شخصے "نہ یارے نہ مددگارے نہ زورنہ زر"..... بلکہ آپ محض امی رہے اور پڑھے لکھوں کی صحبت تک بھی میسر نہ ہوئی، اس پر جب آپ نے بعد بعثت کلمۂ توحید کی تبلیغ کی اور شرک کی بیخ کنی کی..... ہر زن ومرد، چھوٹا بڑا آپ کا دشمن ہو گیا اور جو اذیتیں آپ کو دیں سب کو معلوم.... آخر یہ نوبت کہ اپنا وطن مکہ معظمہ چھوڑنا پڑا.... بایں ہمہ بیکسی وبیگانگی امی ہو کر ملک عرب کو اپنے کمالات علمی و عملی کے ساتھ اس مرتبہ ممتاز فرمایا اور اس درجے کا مہذب، کہ ان کا علم اور ان کی تہذیب ضرب المثل ہو گئی۔ شرک کی وہ بیخ کنی فرمائی کہ تمام جزیرۃ العرب میں گو اور معاصی ہوں مگر نہ شرک اب تک ہوا نہ انشاء اللہ آئندہ کوائی یوم القیمہ ہو... وہاں کے عوام وجہال کی وہ

پختہ توحید کہ دوسری جگہ کے علماء و خواص کو بھی نصیب نہیں، قبائل کے قبائل جن میں دوامی عداوت تھی ان کا باہمی عناد اور فساد بوجہ توارث و دوام کے گویا جبلی ہو گیا تھا، جیسے اوس و خزرج آپ کے فیض صحبت اور آپ کے اخلاق حمیدہ کی بدولت ایک جان دو قالب ہو گئے اور شیر و شکر ہو کر رہنے لگے۔

صاحبو!...... یہ جملہ اثر نیک۔ علوم راسخہ و ملکاتِ فاضلۂ محمدی اور آپ کے اخلاق کاملہ کا تھا یا اور کچھ؟ اس کے بعد فرماتے ہیں،۔

صاحبو! کسی کی سچی بزرگی و مقبولیت اور اس کے اصلی باکمال ہونے کا یہ بڑا ثبوت کامل ہے کہ اس کے گھر کے لوگ و اہل قرابت زن و فرزند، بھائی، برادر اور اس کے ہر وقت کے خدمتی، یاران مجلس و حاضر باشانِ خدمت کو اس کے ساتھ خاص عقیدت ہو، دل و جان سے اس کے فریفتۂ کمالات ہوں اور جان و مال سے اس پر شیدا، چند روزہ صحبت کو اغیار کیساتھ اخلاق و عادات حمیدہ اور اعمال و احوال حسنۂ مصنوعی ظاہر کر کے گذارنا سہل، اور مصنوعی طور پر ان کے سامنے بزرگ بننا آسان، مگر ہر وقت کے حاضر باشان خدمت جن کو درونی و بیرونی معاملات و عادات سے پوری اطلاع ہوتی ہے، اور ان پر کوئی حالت ظاہری و باطنی مخفی نہیں رہ سکتی تاوقتیکہ وہ ملکات فاضلہ جبلی و اصلی نہ ہوں، بیشک فریفتۂ کمالات سچے مخلص اور پورے عاشق نہیں ہو سکتے"

بعدہٗ خوبیٔ تعلیم محمدی و اخلاق محمدی کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

آپ کی خوبیٔ تعلیم اس مرتبہ کہ بعد بعثت تھوڑی مدت میں اپنے دین قویم کی کہیں سے کہیں اشاعت فرمائی، اور بعد وفات اپنی تعلیم کا وہ سچا اثر چھوڑا کہ بغیر سامان حرب و ضرب، بغیر قوت زور وزر، فقر و فاقہ کی حالت میں افضال خداوندی کے بھروسے پر تھوڑی جماعت صحابہ کو سلاطین کا مقابلہ کرنا سہل ہوا، اکناف عالم میں اس دین پاک کی روشنی پھیل گئی۔ خزائن سلاطین، غنیمت میں داخل ہوئے اور پھر وہ سچا اثر اب تک باقی کہ بفضلہٖ تعالے اس دم تک وہ روشنی پھیل رہی ہے اور پھیلتی جاتی ہے، زمانۂ حیات میں بعض سلاطین زمانہ آپ کے آستانِ عالی کے غلام ہوئے اور فتوحات کی ہر طرف سے آمد مگر آپ کا زہد فی الدنیا اس مرتبہ (درجہ) کہ حضرت عائشہؓ زوجہ مطہرۂ حضور اقدس روایت کرتی ہیں کہ مہینوں آپ کے گھر میں نہ چراغ جلتا تھا نہ آگ روشن ہوتی۔ مدار قوت پانی اور مدینہ کی

کھجوروں پر... بیشتر کھانا آپ کا جو کی روٹی تھی........ ہمیشہ موٹے قسم کا لباس پہنا...... وہ لباس پاک جس میں حضور ﷺ نے وفات پائی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں موٹی قسم کا تھا اور اس میں پیوند لگے ہوئے تھے...... ہاں عبادات و مرضیات خالق میں یہ سرگرمی کہ راتوں کھڑا رہنا اور عبادات و ریاضات شاقہ میں بسر کرنا۔

صاحبو! حضور سرور عالم اور آپ کے آل و اصحاب کی یہ مختصر سوانح عمری ہے جس سے آپ کا نبی اور سچا ملہم ہونا واضح ثابت.... بے شک ملہم کی سچائی کی بڑی دلیل اس کی سوانح عمری ہو سکتی ہے۔

دیکھو ان سوانح محمدی ﷺ واصحاب محمدی سے آپ کے علوم راسخہ اور اخلاق فاضلہ کا علی وجہ الکمال والا کمل ہونا کس مرتبہ (درجہ) بداہتہً ثابت ہوتا ہے اور علی ہذا آپ کی خوبیٔ تعلیم کس درجہ روشن، یہی تو وجہ ہے کہ ہم خود آپ کی ذات جامع کمالات کو سب سے اعلیٰ سب سے افضل اعتقاد کرتے ہیں، اور دوسروں کو اس اعتقاد کے ساتھ مکلّف .... جس کو تردد ہو دوسروں کے کمالات علمی و عملی اور دوسروں کی سوانح عمری دکھائے اور موازنہ کرے ؎

یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا
یا چل کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

سوانح محمدی کے بعد ارکان نماز کی خوبی عقلی حیثیت سے بیان فرما رہے تھے کہ وقت ختم ہو گیا۔ تقریر کے آخر میں فرمایا:۔

"افسوس کہ مجھ پر وقت معینہ کی مدت پوری ہونے کی اطلاع دے کر بار بار تقاضہ کیا جاتا ہے کہ میں اس بیان کو ختم کروں اور اس کے دائرۂ وسیع کو تنگ... ناچار میں بیٹھتا ہوں۔ کاش مجھ کو وقت کی توسیع ہوتی تو انشاء اللہ تعالیٰ تمامی احکامات شریعت محمدیہ ﷺ کی لم وحکمت کو پوری توضیح کے ساتھ واضح کر دکھاتا۔ اور چوں کہ محکوم تھا کہ جو کچھ کہوں بروئے عقل کہوں لہٰذا ہر مدعا ہر مطلب کو اپنی عقل نارسا کے موافق عقلی دلائل و عقلی براہین سے ثابت کیا گیا ہے، اگر قصور ہو میری عقل نارسا کے حوالے فرمایا جائے۔

الحمدللہ الذی کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔

ردقادیانیت

یہ بات علمی حلقوں سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مرزائے قادیان کی مصنوعی "نبوت" اور خواہ مخواہی "مسیحیت و مہدویت" کی تصدیق کرنے والوں میں امروہہ کے مولوی محمد احسن (جن کو مولوی لکھتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے) اور بھیرہ کے حکیم نور الدین نمایاں پوزیشن رکھتے تھے، ان دونوں اشخاص کو مرزا پر ایمان لانے والے شیخین کا ہم مرتبہ قرار دیتے ہیں نعوذ باللہ من ذلک۔ اول الذکر کے متعلق مورخ امروہہ صاحب تذکرۃ الکرام لکھتے ہیں:۔

> "انہوں نے آخر حصہ (عمر) میں مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوئے مسیحیت و مہدویت کی تصدیق کی اور جماعت احمدیہ (مرزائیہ) میں داخل ہوکر احمدی (مرزائی) مشرب کی تبلیغ کرتے رہے۔"

آخر میں لکھتے ہیں۔

> (ان کو) "قادیانی مشن کی جانب سے گھر بیٹھے تنخواہ برابر ملتی رہی۔"

پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان سے تحریری مناظرہ ہوا ہے اور آخر میں پیر صاحب نے اپنا بہترین علمی و تحقیقی شاہکار "سیف چشتیائی" لکھ کر مرزا پر اور ان کے خاص مرید محمد احسن صاحب پر اپنی حجت تمام کردی تھی۔

جب فتنۂ قادیانیت حضرت محدث امروہی کے وطن میں "آستین بررخ کشیدہ" داخل ہوا، اور ایک ذی علم شخص اضلہ اللّٰہ علی علم کا مصداق بن کر اس فتنہ کا شکار ہوگیا۔ ایسے وقت میں جس طرح ان کے استاد معظم حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی اسلامی رگِ حمیت جوش میں آجایا کرتی تھی، انہوں نے بھی نتائج و مآل کار کو سامنے رکھ کر بے چینی کے ساتھ اس فتنے کے فروکرنے میں انتہائی کوشش اور جد و جہد فرمائی۔ تقریریں کیں، تحریریں لکھیں، مناظرہ کرایا اور مباہلے پر تیار ہوئے۔

اس میں شک نہیں کہ بقول مولانا سید ابوالحسن صاحب ندوی ردقادیانیت میں ان چار مجاہدین اسلام کے نام سر فہرست ہیں (۱) حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ (۲) مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ (۳) مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی رحمۃ اللہ علیہ (۴) مولانا

محمد علی صاحب مونگیری رحمۃ اللہ علیہ۔(۱)

لیکن اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ مرزا کے دعوائے نبوت کے ابتداء ہی میں اگر پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابر وقت بے پناہ علمی حیثیت سے اس دجل و مکر کا قلع قمع نہ کرتے تو بعد والوں کے کاندھوں پر اس فتنے کے "دفاتر مکر" کی تردید کا زبردست بوجھ پڑ جاتا۔

(جن تاویلات کے بل بوتے پر مرزا کی "خانہ ساز" نبوت و مسیحیت حق و صداقت سے نبرد آزما ہونے چلی تھی) حضرت محدث امروہوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے پوری قوت کے ساتھ تار تار کر کے فضائے آسمانی میں اڑا دیا تھا۔ قاسمی علوم و معارف کے امانت بردار نے بروقت اس "دجالیت" کا استیصال کر کے حق امانت ادا کیا۔ اور طلباء و عوام کی ایک بڑی جماعت آغاز ہی میں آپ کی بدولت اس تحریک کے پس منظر سے خبردار اور ان "اشکالات واغلوطات" کے جوابات سے واقف ہوگئی تھی جو علمی حیثیت سے پیش کئے جاتے تھے۔ اگر اس فتنے کا سوت امروہہ کی سرزمین پر اسی وقت بند نہ کیا جاتا تو تمام یوپی میں سیلاب بن کر اس فتنے کے داخل ہونے کا اندیشہ تھا۔

مناظرہ و مباہلہ کی دعوت

لوگوں کی زبانی سنا کرتا تھا کہ حضرت محدث امروہوی نے مرزا سے مباہلہ کا اعلان کیا تھا لیکن تحریری ثبوت نہیں ملتا تھا۔ اتفاق سے محمد احسن صاحب قادیانی کی مرتب کی ہوئی روئیداد مباحثۂ رامپور سے اس سلسلے کی تحریر بھی مل گئی، حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ مرزائے قادیانی کو تحریر فرماتے ہیں۔

"بسم اللہ! آپ تشریف لائیے میں آپ کا مخالف ہوں، آپ مسیح موعود نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں، آپ اپنے مسیح موعود ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔ میں بنام خدا مستعد ہوں خواہ مناظرہ کیجئے یا مباہلہ، آپ اپنے اس دعوے کا احادیث صحیحہ معتبرہ اور قرآن پاک سے ثبوت دیجئے۔ اور میں انشاء اللہ تعالیٰ اس

---

(۱) ملاحظہ ہو ترجمۂ مقالہ عربیہ مولانا سید ابوالحسن ندوی در رد قادیانیت مندرجہ "الفرقان" بابت ماہ صفر المظفر و ماہ ربیع الاول ۱۳۷۳ ہجری

دعوے کی قرآن واحادیث صحیحہ سے تردید کروں گا۔ والسلام علی من اتبع الہدے“

راقم خادم الطلبہ احقر الزمن

احمد حسن غفرلہ،

مدرس مدرسہ عربیہ امروہہ

(ستہ ضروری مباحثہ رامپوری ص۵۶)

رامپور میں مناظرہ

امروہہ میں قادیانیت کی بنیاد رکھنے کے بعد قادیانیوں نے ریاست رام پور کو قادیانیت کا مرکز بنانا چاہا تھا اور وہاں اس فتنے سے بعض اشخاص متاثر بھی ہوگئے۔ حضرت محدث امروہیؒ نے سرزمین رام پور پہونچ کر مجلس مناظرہ منعقد کرائی۔ اکابر دیوبند ان کے ہمراہ تھے۔ ادھر قادیانیوں کے تمام ”اصاغر واکابر“ رام پور میں جمع ہوگئے تھے۔

نواب حامد علی خان والیٔ ریاست رام پور کے زیر اہتمام قلعۂ رام پور کے اندر یہ مناظرہ ہوا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری اہل اسلام کی طرف سے مناظر تھے، حضرت محدث امروہی کی یہاں پر بھی تقریر ہوئی۔ مناظرہ اور تقریر کا یہ اثر ہوا کہ قادیانیت رام پور میں مرجھا کر رہ گئی۔ حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مناظرہ کی مختصر روئیداد بصورت مکتوب پھلاؤدہ روانہ فرمائی ہے۔ جس میں انتہائی مسرت کے ساتھ اپنی جدوجہد کا تذکرہ فرمایا ہے اور حق کی فتح پر اظہار شادمانی کیا ہے۔ مناظرہ کی مکمل روئیداد اخبار ”اہلحدیث“ کے فائل سے معلوم ہوسکتی ہے۔ ۱۳۲۷ھ (مطابق ۱۵ جون ۱۹۰۹) کو یہ مناظرہ ہوا تھا مولانا شاہ عبد الغنی صاحب پھلاؤدی نے اس مناظرہ کی مندرجہ ذیل تاریخ نکالی۔

چو از مبحث بدر زد نام احسن
شکست آمد بشان میرزائی
۱۳ ھ ۱۷

مرزا کا رسالہ دافع البلاء اور اس کا موضوع

جیسا کہ لکھا جاچکا کہ مرزا صاحب کے اثرات محمد احسن صاحب کے ذریعہ امروہہ میں

پہونچ رہے تھے، حضرتؒ نے جامع مسجد اور عید گاہ میں اپنی پُر تاثیر تقاریر سے اس فتنے کی پوری علمی قوت سے تردید کی۔ محمد احسن صاحب کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ حضرت مولانا کی علمیت کے مقابل آ سکیں۔ اس تردید کی اطلاعیں وہ مرزا کو دیتے رہتے تھے چنانچہ مرزا نے ایک رسالہ "دافع البلا" ان اطلاعوں سے متاثر ہو کر لکھا اور حضرت امروہی کو براہ راست اس میں مخاطب کیا ہے اور اپنی پیشین گوئیوں سے آپ کو بھی مرعوب کرنا چاہا، مگر حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے قاسمی جذبے میں برابر ابھار پیدا ہوتا رہا۔

جس طرح مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ یہ فرمایا کرتے تھے کہ میرا وجود مرزا کے بطلان کی قد آدم دلیل ہے، کیونکہ مرزا نے ان سے مباہلہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ کاذب صادق کے سامنے مرجائیگا۔ مولانا امرتسریؒ ۱۹۴۷ء تک زندہ رہے۔ اسی طرح حضرت محدث امروہیؒ عقیدۂ اہلسنت والجماعت کی حقانیت کا ایک مجسم وزندہ ثبوت تھے۔ مرزا نے حضرت مولانا کے متعلق کیا کیا پیشین گوئیاں نہیں کیں۔ اور مباہلہ کے چیلنج کو اپنی افتاد طبیعت کے مطابق کڑواہٹ اور سختی کے ساتھ قبول کیا، دنیا جانتی ہے کہ مرزا، ۱۹۰۸ء میں ختم ہو گئے اور حضرت امروہی ۱۹۱۲ء میں عالم آخرت کو سدھارے، یہاں بھی کاذب و صادق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

رد قادیانیت میں ایک عربی تقریر

لاریبَ فی انَّ المسیح بن مریم رفعه اللّٰه اِلی السّماءِ حیًّا وماقتلوهُ و ماصلبوهُ یقینًا بل شُبّهَ لهم و سینزله الله تعالی عِند قُربِ السّاعَة بعد خروج الدجّال فی جامعِ دِمَشقَ عِند منارةِ الشرقیّة بین مهرودتین واضعًا یدیه علی المَلَکین یقطر الماءُ مِن راسهٖ کانّه خرجَ مِن دیماسٍ فیکسر الصلبَ ویقتل الخنزیرَ ویضع الجزیةَ ویقتُل علی یدیه الدجّال الاکبر ویموت الکافرُ مِن نفسه الشریفة، یقتُل الی حیث ینتهی بصره اللطیفه.
قولٌ حقٌ لایاتیه الباطل بین یدیه ولامِن خلفهٖ کما نَطَقَ بهٖ کتابُ اللّٰهِ واَخبر به النّبی الصّادق المصدوق ولایُنبّئُك مثل خبیر. فمن قال انّه مات وادعی نفسهٗ بانهٗ المسیح الموعُود فقد شاقَّ اللّٰه ورسولَهٗ واعرضَ عن النصوص الظاهرة فی کتابه و کتاب رسوله و خالَفَهُما و خالف الامر الثابت

فی الدین ومن یشاقق الرسول مِن بَعْدِ ماتبین له الهدیٰ ویتبع غیرسبیل المومنینَ نُوَله ماتولیٰ ونصلیه جهَنَّمَ وساءَ ت مَصیرا. اَلا اِنَّهم لیقولون مُنْکَرًا من القولِ وزورا. اَلاَ انه فریة بلا مریة کَبُرت کَلِمَة تخرج من افواههم ان یقولون اِلاَّ کذبا. اَلاَ انّهم فی مریة من لِقَاء عیسیٰ اَلاَ انّهم فی شکٍّ منهُ وسیبطل اللّٰه مایقول ویفتح بیننا وبینه بالحق واللّٰه خیر الفاتحین وهو علیٰ ذالِكَ کلّه وکیل وکفیٰ بهٖ وکیلاً.

فیا ایّها الذین اٰمَنُوا وصَدَّقُوا بکتاب اللّٰه وکتاب رسولهٖ علیکم ان تکونوا من هذا الضّال المضلِ علی طرفٍ بعید وحذرشدید فانّهٗ من دجّال هذه الامة صدق الله العلی العظیم وصدق رسولهٗ الکَریم لاتقوم الساعة حتی یبعثَ کذّابون دجّالون قریب من ثلثین کلّهم یزعم انه رسول الله واللّهٗ سبحانه وتعالی یهدی من یشاءُ الی صراط مستقیم و هو لکل شیء خبیر وعلیم وهو اَعلَمُ وعِلْمُهٗ اتم واحکم.

حرّره خادم الطلبه احقر الزمن:
احمدحسن الحسینی الامروهی غفرله
ولوالدیه واحسن الیهما والیه (۱)

ترجمہ اُردو

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ مسیح بن مریم علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمان کی طرف اٹھالیا اور ان کو قتل وصلیب سے بچالیا۔ وہ قرب قیامت میں خروج دجال کے بعد دمشق کے جانب شرقی کے منارہ کے نزدیک اتریں گے، وہ دو زرد چادروں میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔ وہ دو فرشتوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے ہوئے ہوں گے۔ ان کے سر سے پانی ٹپک رہا ہو گا گویا وہ ابھی غسل کر کے غسل خانہ سے برآمد ہوئے ہیں۔ وہ صلیب کو توڑ دیں گے۔ خنزیر کو قتل کر دیں گے۔ دجال اکبر ان کے ہاتھ سے قتل ہو گا۔ ان کے سانس سے کافر مر جائے گا جہاں تک ان کی نظر جائے گی باطل ختم ہو جائے گا۔ یہ باتیں حق ہیں اس میں باطل کو راہ

(۱) یہ تحریر مجھ کو حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب صدیقی مفسر کے کاغذات میں ملی تھی، وہاں سے نقل کر کے پیش کر رہا ہوں

نہیں۔ کتاب اللہ سے اور نبی صادق و مصدوق ﷺ کے اقوال سے یہی ثابت ہے۔ جو شخص دعویٰ کرتا ہے کہ مسیح بن مریم وفات پاگئے اور وہ خود (نعوذباللہ) مسیح موعود ہے اس نے اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کی اور اس نے کتاب اللہ اور احادیث کی نصوص ظاہرہ سے اعراض کیا اور امر ثابت کی مخالفت کی، وہ من یشاقق الرسول الایۃ کا مصداق ہے، یہ مرزائی جھوٹ بولتے ہیں یہ نزول عیسیٰ کے منکر ہیں، عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے قول کو باطل کر دکھلائے گا اور حق کی فتح ہوگی۔ اللہ تعالیٰ بہترین کارساز ہے اے مسلمانو! اور اے کتاب اللہ اور کتاب رسول کے شیدائیو! تم اس گمراہ اور گمراہ کن شخص سے بچتے رہو اور اس کے میل جول سے سخت پرہیز رکھو۔ اس لئے کہ یہ اس امت کا دجال ہے، حضور سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک تیس جھوٹے دجال نہ آجائیں ان میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرے گا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔

ایک ذی علم کا قادیانیت میں ابتلاء اور اس سے نجات

مولوی بدرالدین صاحب امروہوی حضرت مولانا امروہیؒ کے تلامذہ میں تھے ان کی آمد ورفت محمد احسن صاحب کے پاس ہوگئی ان کی باتیں سن کر حیات مسیح میں شک وتردد ہوگیا تھا، اہل علم ودوستوں نے ہر چند ان کو سمجھایا لیکن ان پر باطل کا اثر ہوگیا تھا اس لئے کسی کی نہ سنتے تھے اور الٹا مناظرہ کرتے تھے۔ حضرت محدث امروہیؒ کو اس کی اطلاع ہو چکی تھی، ایک دن ان کو حضرت کے پاس لایا گیا یا وہ خود بخود آئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو دیکھ کر فرمایا:۔

> "مولوی بدرالدین! ہمیں یہ غرور ہو چلا تھا کہ ہمارا شاگرد اور ہمارے پاس بیٹھنے والا باطل میں گرفتار نہیں ہوسکتا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ بات غلط ہے، تم نے ہمارے غرور کی اصلاح کردی۔ نہ معلوم کس جذبے سے یہ الفاظ فرمائے تھے کہ مولوی بدرالدین زار زار رونے لگے اور قدموں پر لوٹے لوٹے پھرے، اور فاسد عقیدے سے توبہ کی۔

فتاویٰ

حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اطراف ملک سے کثرت سے استفتاء آتے تھے، ان

کے جوابات حضرت اپنے قلم خاص سے لکھتے تھے، اور جوابات کی نقلیں اپنے کسی خوش قلم شاگرد سے نقل کرا کے اپنے پاس محفوظ کر لیتے تھے۔ اگر وہ سب جوابات کسی وقت دستیاب ہو سکے تو ایک بڑا علمی ذخیرہ حاصل ہو جائے گا۔ احقر کو چند فتاویٰ کی نقلیں حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سے حاصل ہو گئی تھیں۔ اس مختصر مجموعہ میں مولانا عبد الرحمٰن صاحب خورجوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک اہم استفتاء کا جواب بھی ہے۔ یہ استفتاء سجدۂ تعظیمی سے متعلق ہے، مولانا خورجوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے سوال میں لکھا ہے کہ اس مسئلہ کا جواب فتاوے عزیزی میں بھی ہے لیکن میری اس سے تسلی نہیں ہوئی، حضرت مولانا امروہی نے اس اہم سوال کا جواب خاص قاسمی انداز میں دیا ہے۔ چوں کہ سوال و جواب دونوں بہت مفصل ہیں اس لئے اس کو مستقل طور پر انشاء اللہ معہ ترجمہ اُردو پھر کبھی ناظرین دار العلوم کے سامنے پیش کروں گا۔ اس وقت بطور نمونہ صرف دو فتاوے پیش کرتا ہوں:۔

(۱) جواب سوال (۱) آمدہ از کاٹھیاواڑ

الجواب واللہ تعالیٰ ملھم بالحق و الصواب۔

"اولیاء کرام کی تعظیم بے شک از جملہ شعائر الاسلام ہے اور ان سے عقیدت راسخہ اور محبت صادقہ رکھنی بے شبہ مُنجملۂ آثارِ کمال ایمان ہے۔

حضور سرور عالم ﷺ خود ارشاد فرماتے ہیں:" من احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل ایمانہ۔"

مگر ہر چیز کا حسن اور اس کی خوبی اسی وقت تک محفوظ رہتی ہے کہ وہ شئے اپنے انداز پر رہے نہ کم ہو نہ زیادہ ورنہ حسن کہاں؟ بیشک بعد کمی بیشی کے وہ شئے قبیح و مذموم ہو جاتی ہے۔ حیات میں دیکھئے "خوبی طعام و خوش ذائقگئ مطعومات" جملہ نمک کے ساتھ وابستہ، مگر خوبئ ذائقہ و لذت طعام جملہ اسی وقت تک محفوظ ہے کہ نمک اپنے انداز پر محفوظ رہے نہ کم ہو نہ زیادہ، ورنہ بصورتِ کمی بیشی نمک کے عمدہ عمدہ اغذیہ کیسی بد مزہ ہو جاتی ہیں۔ اور کس درجہ باعث تلخ کامی، دینیات میں ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت عیسیٰ علی نبینا و علیہ السلام سے حسن اعتقاد رکھنا کیسا اچھا اور کس درجہ ضرور، کہ بغیر اس کے ایمان میسر نہیں۔ لیکن اگر اس درجہ افراط کے ساتھ ہو کہ ان حضرت کو عین اللہ یا ابن اللہ سمجھا جائے یا اس مرتبہ کم کہ ان کی نبوت پر اقرار نہ ہو، ایمان کہاں

(۱) سوال نہ معلوم ہو سکا کہ کیا تھا جواب سے سوال کا فی الجملہ پتہ چل رہا ہے۔

اور حسن کجا؟ اس درجہ قبیح و مذموم کہ عین کفر، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے عقیدت اور محبت راسخہ رکھنی کیسی اچھی اور کیسی ضرور اور بغیر اس کے فرقۂ ناجیہ اہل سنت و جماعت سے خارج لیکن اگر اس مرتبہ (درجہ) افراط کے ساتھ ہو کہ ان حضرت کو اول الخلفاء اعتقاد کیا جائے یا ہم مرتبۂ حضرت رسالت یا اتنا کم کہ بجائے حسن عقیدت کے بداعتقادی ہو۔ حسن کہاں؟ اس مرتبہ قبیح کہ بعد اس افراط و تفریط کے یا رافضی قرار پائے یا خارجی۔

بدعت

بدعت جو شرعاً مذموم ہے اور وہ بھی اس مرتبہ کہ ارشاد فرماتے ہیں۔ کل بدعة ضلالة و کل ضلالة فی النار۔ یا فرماتے ہیں "البدعة شرك الشرك" یعنی جیسا کہ شرک منافی ہے لاالہ الااللہ کے اور اس اول جزو ایمان کے مخالف ہے، علی ہذا بدعت دوسرے جزو ایمان کے خلاف ہے اور محمدؐ رسول اللہ کے منافی:۔ بناء اس درجہ مذمومیت کی اس امر پر ہے کہ امور شرعیہ اور مسائل احکام دینیہ جس انداز کے ساتھ شارع کی طرف سے ثابت ہیں بعد احداث بدعت و ایجاد امور جدیدہ اس اندازۂ شرعیہ پر محفوظ نہیں رہتے بلکہ ان میں یا افراط و زیادتی من عند النفس واقع ہوتی ہے یا کمی و تفریط، بالجملہ مدار حسن اعمال و خوبیٔ افعال نیز اس پر ہے کہ وہ اعمال اپنے اندازۂ شرعی پر محفوظ رہیں۔ ورنہ وہ اعمال اگرچہ از جملہ حسنات تھے بعد افراط و تفریط از جملہ سیئات ہوں گے۔ اکابر دین اور اولیاء و مقربان امت سے محبت صادقہ اور عقیدت راسخہ اس وقت حسن اور از جملہ آثار ایمان ہے کہ وہ حضرات رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اپنے اندازۂ عبودیت و مرتبہ بندگی سے متجاوز نہ ہوں ورنہ اس مرتبہ (درجہ) افراط کے ساتھ کہ ان کو عین خدا سمجھا جائے۔ یا کارخانۂ قدرت قادر مختار میں دخیل کار۔ محبت رکھنی اور اس زیادتی کے ساتھ اعتقاد کرنا عین شرک ہے اور کھلا کفر، اعاذنا اللہ و سائر المسلمین منه۔ مضمون مندرجہ سوال سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرتکبان ان اعمال قبیحہ و حرکات شنیعہ کے حضرت شیخ علیہ الرحمتہ والرضوان کو عین خدا سمجھتے ہیں۔ اور کارخانۂ قدرت میں پورا دخیل اور وہ بھی اس مرتبہ (درجہ) کہ خود حضرت شیخ علیہ الرحمتہ ایک طرف وہ لکڑیاں جس کو خود اپنے ہاتھوں سے کاٹ تراش چھیل چھال کر بندش کیا ہے۔ اور وہ پھول جس کو آپ نے گوندھا ہے بعد اس شرف کے حضرت شیخ علیہ الرحمتہ والرضوان کی

جناب اقدس تک منسوب ہوں اور ان حضرت علیہ الرحمتہ کی طرف انتساب کر کے ان کے نام زد کیا جائے اس مرتبہ مقبول ہو جاتے ہیں کہ ان کے روبرو مراتب عبودیت بجالانا اور سجدہ وطواف وغیرہ کرنا جملہ جائز ہو جاتا ہے۔ اور ان سے مرادات مانگنا صحیح ہے۔ اور ان کو پورا کرنے مرادات کی اور بیٹا وغیرہ دینے کی قدرت ہے اعاذ نا اللّٰہ من ذلک کلہ۔ یہ جملہ حرکات شنیعہ از جملہ شرکیات ہیں و منجملہ بدعات سیئہ۔ مرتکب ان کا کافر ہے یا اعلیٰ درجے کا بدعتی، ان کو چاہئے اپنی حرکات شنیعہ سے توبہ صادقہ کریں اور اس (رسم) باطل کو بالکلیہ چھوڑدیں، ورنہ حشر اپنا کفار و مشرکین کے ساتھ سمجھیں۔" وماعلینا الا البلاغ و اللّٰہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم وھو بکل شئی علیم.

(حررہ خادم الطلبہ احقر الزمن)

احمد حسن الحسینی الامروہی الچشتی الصابری غفرلہ ولوالدیہ واحسن الیھما والیہ

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرح مبین کہ اذان میں نام پاک رسول ﷺ کا سن کر انگوٹھا چومنا اور آنکھوں سے لگانا سنت ہے یا فرض، یا کیا ہے؟

الجواب: نہ سنت ہے نہ فرض نہ واجب نہ مستحب، بلکہ بدعت ہے اور بے اصل، جو احادیث کہ اس بارے میں نقل کی جاتی ہیں اور جن روایات کے بھروسے تقبیل ابہام کو سنت، یا مستحب سمجھا جاتا ہے وہ جملہ بہ تحقیق محدثین نا معتبر ہیں بلکہ از جملہ موضوعات۔ امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب فوائد مجموعہ فی احادیث الموضوعہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"حدیث مسح العینین بباطن اعلیٰ السبابتین عند قول المؤذن اشھد ان محمد ارسول اللّٰہ الخ رواہ الدیلمی فی مسند الفردوس عن ابی بکر الصدیقؓ مرفوعا قال ابن الطاھر فی التذکرۃ لایصحاانتھی." اور نیز تحریر فرماتے ہیں۔" من قال حین یسمع اشھد ان محمد رسول اللّٰہ مرحبا بحبی وقرۃ عینی محمد بن عبد اللّٰہ ثم یقبل ابھامیہ ویجعلھا علی عینہ لم یسقم و لم یرمدابدا. قال فی التذکرۃ لایصح." اور شمس الدین محمد بن عبد الرحمٰن سخاوی رحمۃ اللہ علیہ مقاصد حسنہ فی الاحادیث المشتہرۃ علی الالسنہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

" ولا یصح فی المرفوع من کل ھذا شئی "اور ملا علی قاری علیہ الرحمتہ نے "تذکرۃ الموضوعات" میں ان احادیث کو از جملہ موضوعات تحریر فرمایا ہے۔ روایات فقہ جو اس کے استحباب میں خزانتہ الروایات، کنز العباد، اور جامع الرموز و فتاوے صوفیہ سے نقل کی جاتی ہیں وہ بھی نامعتبر ہیں، کتب متداولہ و معتبرہ عند العلماء میں کہیں اس قسم کی روایات کا پتہ نہیں، اور خود یہ کتابیں جن سے ان روایات کو نقل کیا جاتا ہے اور نام ان کے اوپر مرقوم ہوئے عند العلماء نامعتبر ہیں۔ ان کتب میں رطب و یابس کو بلا تنقیح جمع کر دیا ہے۔ چنانچہ مولانا المولوی عبد الحیٔ صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالے "النافع الکبیر لمن یطالع الجامع الصغیر" میں اس مضمون کو مفصل لکھا ہے۔ بالجملہ مسئلہ تقبیل الابہامین ایک بے اصل مسئلہ ہے احادیث صحیحہ و روایات معتبرہ کے بالکل خلاف۔

واللہ سبحانہ تعالی اعلم بالصواب .

حررہ خادم الطلبہ (احمد حسن غفرلہ)

تقریر ترمذی کے دو نمونے

مفتی محمد فاروق صاحب انبیٹھوی نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر ترمذی کو قلمبند کیا ہے۔ اس کے کچھ اجزاء احقر کو مل گئے ہیں :۔

(۱) باب ماجاء اذا اقیمت الصلوٰۃ فلاصلوٰۃ الا المکتوب، نکرہ تحت نفی واقع ہوا جس سے عموم سمجھ میں آتا ہے، یعنی کوئی صلوٰۃ نہیں جب اقامت صلوٰۃ کی جاوے مگر وہی نماز جس کی اقامت کی گئی ہے۔ تو جن صاحبوں نے یہ سمجھا کہ رکعتی الفجر بھی جائز نہیں ان کے مذہب میں تو کوئی قصور نہیں، لیکن حنفیہ کو اس کا جواب دینا ہوگا کہ صریح حدیث موجود ہے کہ کوئی صلوٰۃ نہیں، پھر حنفیہ نے جو دو رکعت فجر سنت کو علیحدہ مکان میں پڑھنے کا حکم دیا اس کا کیا سبب؟ تو یا تو یہ جواب دیا جاوے کہ (حاشیہ بخاری میں) جناب مولانا احمد علی صاحب نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے استاد مولانا محمد اسحاق صاحب سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ بیہقی نے روایت کیا ہے کہ اس حدیث میں استثناء رکعتی الفجر کا موجود ہے۔ دلیل نقلی تو یہ کافی ہے، اور بپاس خاطر شوافع مان لیا جائے کہ یہ جو بخاری کے حاشیہ پر موجود ہے (بیہقی کی روایت) پایۂ صحت کو نہیں پہونچی، تو خاص حدیث میں اگر غور کیجئے اور تدبر تو جواب نکل آتا ہے، آپ نے

اذا کا لفظ فرمایا ہے۔ اور اذا دو حال سے خالی نہیں یا مکانی یا زمانی۔ اگر زمانی مراد ہو تب تو چاہئے کہ مثلاً ہم کو یقینی معلوم ہے کہ ظہر کی اقامت فلاں وقت ہوتی ہے کعبہ شریف (مسجد الحرام) یا جامع مسجد دہلی میں تو یہاں پر ہم کو سنن و نوافل کا پڑھنا ممنوع ہو، حالانکہ یہ کسی کا مذہب نہیں۔ یا مثلاً مسجد میں اقامت ہوئی (تو) معذور کو یا جو اس مسجد سے علیحدہ نماز پڑھ رہا ہو اس کو (نماز پڑھنا) ہرگز جائز نہ ہو۔ تو چونکہ زمانہ پر حمل کرنا محال کو مستلزم ہے تو وہ تو مراد ہو نہیں سکتا۔ تو اب متعین ہو گیا کہ (اذا) مکانی ہے تو حاصل حدیث یہ قرار پائیگا کہ جس مکان میں اقامت صلوۃ ہو وہاں پر صلوۃ (جائز ہے) نہ کوئی اور نماز جائز ہے۔ امام صاحب بھی یہی فرماتے ہیں کہ بے شک اس جلسے اور مکان میں جائز نہیں۔ اگر کوئی سنن پڑھے تو علیحدہ باب مسجد پر یا فصیل مسجد پر (یا) اگر اقامت اندر ہو تو باہر اور باہر ہو تو اندر پڑھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس بارے میں فقہاء مختلف ہیں، کوئی تو اس بات کا قائل ہوا کہ باب پر پڑھنا چاہئے اس نے تو اس بات پر نظر کی کہ "مرور رجل" مصلی کے سامنے جائز نہیں اگرچہ وہ باہر نماز پڑھتا ہو۔ اور کوئی اس بات کا قائل ہوا کہ باہر پڑھ لے اگر اقامت اندر ہوئی ہو اور اندر پڑھ لے اگر قامت باہر ہوئی ہو، تو اس نے اس بات پر نظر کی کہ قاری قرآن ایک آیت سجدہ چند بار اندر چلتے ہوئے پڑھے تو اس پر ایک ہی سجدہ لازم آئے گا اور اگر باہر آجاوے اور اسی آیت کو پڑھے تو دوبارہ سجدہ لازم آئے گا۔ تو چوں کہ جلسہ مختلف ہو گیا تو اس نے اس بات پر نظر کی۔ دونوں کا حکم علیحدہ ہے وہ مکان اور ہے اور یہ اور ہے۔ اختلاف چھوٹی بڑی مسجد ہونے کے باعث ہے وہ حکم پہلا چھوٹی مسجد کا تھا اور یہ بڑی مسجد کا، لیکن کوئی کہہ سکتا ہے کہ سنن ظہر میں بھی یہ حکم ہونا چاہئے (تو اس کا یہ جواب ہے) کہ اس کے (ظہر کے) بعد وقت ایسا نہیں جس کے بارے میں نہی وارد ہو جیسا کہ بعد فجر کے نہی وارد ہے، تو اس کو اس پر قیاس نہیں کر سکتے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۲) **باب فضل یوم الجمعة**: فضیلت جمعہ کی چار وجوہ بیان فرمائیں جن میں دو تو ایسی ہیں کہ جس سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ بے شک یہ یوم بہت مبارک ہے۔ اس لئے کہ اس میں حضرت آدم پیدا ہوئے نیز اسی دن داخل جنت ہوئے۔ آدم کا پیدا ہونا کیسا کچھ امر عظیم ہے جن کے بارے میں یوں ارشاد ہے کہ اپنے دست قدرت سے پیدا کیا، ملائکہ سے سجدہ کرایا، اسماء کا علم ان کو عطا فرما کر مصداق "انی جاعل فی الارض خلیفة" کا قرار

دیا۔ کیسی عظمت ہے نیز دخول جنت، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ هبوط من الجنة اور قیام ساعت کیوں کر اس کی عظمت کا باعث ہوں، اس کو تو یوں کہا جائے کہ باعث نحوستِ یوم ہے تو بجائے خود ہے، اس لئے کہ جیسے اقتران حسنات سے زمانہ کو حسن کہا جاتا ہے ایسے ہی اقتران معاصی سے زمانہ پر معصیت کا مضمون آجاتا ہے۔

ہاں جواب اس کا یہ دے سکتے ہیں کہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ "اخراج من الجنة" کتنا بڑا امر مہتم بالشان ہے اس لئے کہ حضرت آدم جن کے اونی مراتب مندرجہ بالا ہوئے ان کا اخراج ہوا (بادشاہ کا) ایک ادنی غلام کو نکالنا کوئی بڑا امر نہیں لیکن اپنے بیٹے یا وزیر اعظم کو نکالنا کتنا بڑا امر ہے۔ اور پھر یہ بہانہ نہ ہوتا تو آدم علیہ السلام اور جملہ انبیاء خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیوں کر مرتبہ ظہور میں آتے۔ وللاسباب حکم المقاصد چوں کہ یہ سبب ہو گیا ظہور انبیاء اور خصوصاً شفیع المذنبین کا پھر کیونکر نہ سعادت کا دن ہو، علی ہذا قیام قیامت افناء عالم کا سبب ہے اگر اس کو فنا نہ ہوتی بلکہ دائم اور خلود کے طور پر رہتا تو دیدار خداوندی اور جنت کا حصول ہم کو ممکن نہ تھا، لہٰذا یہ سبب ہو گیا مقصود اعلیٰ کا اس وجہ سے یوم جمعہ افضل رہا۔ اب اس میں ایک ساعت ہے کہ جس میں دعاء قبول ہوتی ہے اس کے بارے میں روایات مختلفہ ہیں تطبیق بین الروایتین یوں ہو جاوے کہ اس کو دائر و سائر رکھا جاوے اور وجہ اخفاء؟ سو جیسے لیلۃ القدر کے بارے میں ۴۵ سے کم و بیش قول ہیں ایک یہ ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک روز (شب قدر کا) علم دیا گیا۔ اور آپ باہر تشریف لائے۔ آپ دیکھتے کیا ہیں کہ دو شخص آپس میں جھگڑا کر رہے ہیں ان کی باہمی نااتفاقی سے یہ اثر پیدا ہوا کہ آپ کے قلب صافی سے باوجود ان انوار باطنی کے اس علم کو زائل کر دیا۔ (اس وقت کہ سراسر شر ہے نااتفاقی وحسد اپنا اثر کیوں کر نہ پیدا کریں گے) تو یا تو اپنے معاصی باعث اخفا ہوئے، یا یہ کہ اگر اس کو ظاہر کیا جاتا تو ہم لوگ بھروسہ کر بیٹھتے اور یہ سمجھ کر کہ (شب قدر میں) ایک شب کی عبادت کا ثواب تراسی برس کے ثواب کے برابر ہے ہماری عمریں غایۃ فی الباب ساٹھ یا ستر برس کی ہیں، بس ایک شب کی عبادت کافی ہے، لہٰذا (یہ ساعت جمعہ بھی) مخفی رکھی گئی تاکہ ہمہ اوقات کو حکم اس گھڑی کا سمجھ کر زوال سے لے کر تا بہ غروب مستوعب فی العبادۃ کر لیں۔ ع

"مراعاتِ صد کن برائے یکے"

(تاکہ) اس ایک ساعت کے طفیل میں سب ساعتیں عبادت میں صرف ہوں۔

عادات واخلاق

اتباع سنت کا خاص اہتمام تھا اخلاق حسنہ کا مجموعہ تھے، ہاں دین کی حمایت میں غصہ وجلال نمودار ہو جاتا تھا، تواضع، مہمان نوازی، شفقت علی الخلق اور صلہ رحمی میں فرد تھے۔
علم کا وقار اور دین کی عظمت قائم رکھنے کیلئے خودداری کے ساتھ رہتے تھے۔ پوری عمر درس وتدریس، وعظ وپند امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں گذار دی۔ اپنے شاگردوں سے انتہائی شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان پر دوران تعلیم میں سختی بربنائے شفقت ہی تھی اہلسنت وجماعت کے فروعی اختلافی مسائل کو حکمت عملی کے ساتھ سلجھاتے تھے، جھگڑے یا مناظرے کی نوبت نہیں آنے دیتے تھے۔ ملت بیضاء کی ترقی کا ہر لحظہ خیال رہتا تھا، دین میں خلل ڈالنے والا کوئی فتنہ ہوتا تو اس کی فوراً خبر لیتے تھے، اور جلد ختم کر دینے کی کوشش فرماتے تھے، عوام الناس سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے، مریضوں کی عیادت کے لئے جاتے تھے، شہر میں وعظ کے لئے جب کوئی بلاتا تھا بلا تکلف اس کے گھر پر پہونچ کر وعظ فرماتے، شادی وغمی کے رسم ورواج اور بدعات کی روک تھام کرتے تھے۔ شاگردوں اور مریدوں اور خادموں کے حالات کی خبر گیری رکھتے تھے، شہری طلباء کے ورثاء سے ملتے رہتے تھے، علم دین کی ضرورت اور اس کی فضیلت بیان کر کے علوم عربیہ کی عظمت عام ذہنوں اور دماغوں میں پیدا کرتے تھے، اپنی جدوجہد سے انہوں نے کافی تعداد شہری طلباء کی جمع کر لی تھی۔ باہر کے طلباء کو مہمانان رسول ﷺ تصور کرتے ہوئے اور طلباء کے حق میں وصیت رسول اکرم ﷺ کو پیش نظر رکھ کر ان کی ہر طرح کی نگہداشت ونگرانی فرماتے تھے۔ اولیاء اللہ سے خاص عقیدت اور والہانہ محبت تھی، اپنے وطن کے بزرگان دین کے مزارات پر کبھی کبھی برائے فاتحہ حاضر ہوتے تھے۔ زندہ اہل ذکر اور صاحب حال بزرگوں سے اچھے روابط تھے، اپنے عزیزوں کے مکانوں پر ان کی خیریت معلوم کرنے کیلئے پابندی کے ساتھ تشریف لے جاتے تھے، چھوٹے چھوٹے بچوں سے جب ملتے تو ان سے خوش طبعی کی باتیں کرتے، حکام وقت سے برابری اور خودداری کے ساتھ ملتے اور شہر کی کوئی ضروری آواز ہوتی اس کو پہنچاتے، انگریز اور اس کی تہذیب کے سخت مخالف تھے، درس میں بعض اوقات فرماتے کہ کونسا وقت آئیگا کہ میرے ہاتھ میں تلوار ہوگی اور ان کیری آنکھوں والوں (انگریزوں) سے جہاد کروں گا۔

حلیہ

میانہ قد، دوہرا جسم، خوبصورت و حسین چہرہ، داڑھی پر آخر میں وسمہ و مہندی کا خضاب لگاتے تھے۔

ان کا حسن مشہور تھا حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی موقعہ پر فرمایا ہے کہ ایک صاحب (غالباً الہ آباد کے) جب کسی ذی کمال کے متعلق تعریفی کلمات ادا کرتے تھے تو یہ کہا کرتے تھے میں فلاں شخص کے فلاں کمال کی رجسٹری کرتا ہوں، (یہ گویا ان کا تکیہ کلام تھا) مثلاً شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواری مرحوم مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ بہت عمدہ انداز میں پڑھتے تھے ان کے متعلق کہتے تھے کہ میں ان کی خوش الحانی کی رجسٹری کرتا ہوں۔ حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق وہ صاحب کہا کرتے تھے کہ میں "ان کے حسن کی رجسٹری کرتا ہوں" دینی عظمت و شوکت کے ساتھ ساتھ سراپا حسن اور مجسم محبوبیت تھے، ان کے بعض دیکھنے والے ان کے حسن و جمال اور فضل و کمال کو یاد کر کر کے آبدیدہ ہو جاتے ہیں، اور جگر مراد آبادی کا یہ شعر ان کے واردات قلب کا ترجمان بن جاتا ہے۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی مگر نظر میں سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں

صوفی نور اللہ صاحب عیش امروہی مرحوم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ "میں نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بشکل مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ خواب میں دیکھا ہے۔"

ان کا چہرۂ تاباں اسلامی عظمت کا مظہر تھا، ان کی جبین روشن حسن اخلاق کی آئینہ تھی، ان کے گیسوئے اقدس سے روحانی کیفیات مشک ریز اور عنبر بار تھیں ان کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا ۔ع

چہ خط چہ رخ چہ جبین لاالہ الااللہ

لباس

لباس عمدہ اور نفیس پہنتے تھے مگر بعض اوقات سفر میں بھی معمولی کپڑے زیب تن فرمانے میں عار نہ تھا، معمولی سے معمولی کپڑا بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے جسم مبارک پر زیب دیتا تھا، عمامہ ایک خاص طرز پر باندھتے تھے جو بہت ہی خوشنما معلوم ہوتا تھا، عینک لگاتے تھے حکیم مختار احمد صاحب امروہی فرماتے تھے کہ ہماری بخاری شریف جس سال ختم ہوئی تو مولانا

امروہی رحمۃ اللہ علیہ تین بزرگوں کے تین کپڑے زیب تن کئے ہوئے تھے، ان میں غالباً ٹوپی حضرت حاجی امداد اللہ کی، کرتہ پاجامہ شاہ عبد الغنی صاحب مجددی مہاجر مدنی اور حضرت قاسم العلوم نانوتوی کا باوجودیکہ تینوں کپڑے بے جوڑ تھے مگر جسم مبارک پر بہت سج رہے تھے سچ ہے۔

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی

قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

عید کے دن اعلیٰ درجے کا لباس پہنتے تھے، جب آپ اپنے مکان سے ایک بڑے مجمع کے ساتھ عید گاہ کی جانب نکلتے تھے تو لوگ کھڑے ہو کر آپ کے جمال دل افروز اور حسن دلکش کا نظارہ کرتے تھے، بڑے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہوں نے ایسے بزرگوں کے دیدار سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا ہے اور عقیدت کی آنکھوں سے زیارت کی ہے۔

مہر کا سجع

حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ کی مہر پر اوّل اوّل اسمہ احمد کندہ تھا بعدہ یہ مصرعہ سجع کے طور پر کندہ ہوا:۔ ''دل مرتضیٰ جان احمد حسن''

تصانیف

مشاغل درس میں زیادہ مصروف رہنے کے باعث حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو تصنیف و تالیف کا موقع نہیں ملا حسب ذیل دو کتابیں آپ کی علمی یادگار کے طور پر موجود ہیں:۔

(۱) افادات احمدیہ (قلمی) اس کو مولانا محمد یحییٰ صاحب شاہ جہانپوری رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب کیا ہے مشہور محشی مولانا محمد حسن صاحب سنبھلی مرحوم اور حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان ایک علمی مسئلہ میں تحریری مناظرہ ہوا تھا، طرفین کی پوری خط و کتابت اس میں درج ہے۔ آخر میں مولانا محمد حسن صاحب سنبھلی نے ہتھیار ڈال دئے تھے، کتب خانہ پھلاوُدہ میں یہ نسخہ موجود ہے اس کی نقل کسی دوسری جگہ نہیں ہے کافی ضخیم کتاب ہے۔

(۲) افادات احمدیہ (مطبوعہ) حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے نو علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں شائع ہوئی، قابل دید کتاب ہے اب کمیاب ہوگئی ہے۔

چند لطائف

حضرت رحمۃ اللہ علیہ عالمانہ ثقاہت کے ساتھ کبھی کبھی مزاح وخوش طبعی بھی فرمالیا کرتے تھے، ان کے بہت سے لطائف مشہور ہیں ان میں سے چند مختصر طریقے پر لکھتا ہوں:۔

(۱) حقہ پینے والے کو محقق فرمایا کرتے تھے۔

(۲) شاہ بہاء الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ ایک مشہور بزرگ امروہہ میں گذرے ہیں وہ ایک مرتبہ سرمہ (غالباً مدینہ کا) تحفہ میں لائے اور از راہ خوش طبعی وبے تکلفی یہ فرمایا کہ مولانا یہ سرمہ لگا کر ہمیں اپنی آنکھیں دکھانا حضرت مولانا نے برجستہ فرمایا" شاہ جی! شریف آدمی آنکھیں نہیں دکھایا کرتے۔

(۳) شیعہ قیامت میں دیدار خداوندی کے منکر ہیں۔
ایک مرتبہ اس مسئلہ کا تذکرہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے چھڑ گیا، فرمایا (اس مسئلہ میں بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں) ربّ البیت ادریٰ بمافیہ، ہر شخص اپنے گھر کا حال خوب جانتا ہے، شیعہ کہتے ہیں کہ دیدار خداوندی نہیں ہوگا وہ اپنے گھر کی بات بتلا رہے ہیں ان کو دیدار خداوندی نہیں ہوگا، یقیناً نہیں ہوگا، ہم اپنے گھر کی بات کہہ رہے ہیں کہ دیدار خداوندی ہوگا ہم کو دیدار خداوندی ہوگا، ضرور ہوگا، ضرور ہوگا۔

(۴) مراد آباد میں موتمر الانصار (دیوبند) کا جلسہ حضرت مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں ہوا تھا سہولت کی غرض سے کھانے کے ٹکٹ کا وہاں بھی انتظام تھا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ مکان طعام میں داخل ہونے لگے تو ٹکٹ ہمراہ نہیں تھا دروازے پر جو رضا کار کھڑے تھے ان سے فرمایا ہم "بیرنگ" ہیں (یعنی ہمارے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔)

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا محمود حسن صاحب محدث دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ میں خلوص ومحبت کے جو مراسم تھے وہ اس دور میں استاذ بھائیوں میں ڈھونڈنے سے بمشکل ملتے ہیں، جب حضرت امروہی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند جاتے تھے تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے لئے عید ہو جاتی تھی، باغ باغ ہو جاتے تھے، اور جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ امروہہ تشریف لاتے تو حضرت امروہی پھولے نہ سماتے شاد شاد ہو جاتے تھے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اسی تعلق کی بنیاد پر کئی مرتبہ امروہہ تشریف لائے ہیں، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاذ بھائی کی وفات سے متاثر ہوکر جو مرثیہ لکھا ہے (جس کو عنقریب آپ پڑھیں گے) وہ ایک غمگین کی درد بھری آہ ہے جو دل سے نکل کر دل پر اثر کر رہی ہے، اس مرثیہ کا ایک ایک لفظ جذبات غم کا آئینہ دار ہے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اپنے استاذ بھائی کے صاحبزادے مولانا سید محمد صاحب عرف بنے میاں پر انتہائی شفقت فرماتے تھے۔ بعض اوقات ان کو دیکھ کر جوش مسرت میں کھڑے ہو جاتے تھے، مالٹا کے خطوط میں جو احقر کے پاس محفوظ ہیں حضرت امروہی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے کو برابر یاد فرماتے ہیں، وہاں کے ایک مکتوب میں حافظ زاہد حسن صاحب امروہی کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ تو فرمایئے مولانا مرحوم کے صاحبزادے کس مشغلہ میں ہیں کتب ضروریہ سے فارغ بھی ہو چکے؟ اللہ کرے بخوبی فارغ ہوکر اپنے مقدس بزرگوں کے پیرو ہوں"۔

مالٹا کے دوسرے مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں:۔

"قاری سید محمد صاحب کو سلام مسنون!
کاش آپ یہ بھی لکھ دیتے کہ کتب درسیہ سے فارغ ہوگئے اور اب یہ مشغلہ ہے"

مولانا حافظ احمد بن قاسم العلوم اور حضرت مولانا امروہیؒ

اپنے روحانی رشتہ کی بنا پر حضرت حافظ احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ امروہہ میں کئی مرتبہ تشریف لائے، حضرت مولانا امروہی استاذ زادے کی آمد پر بڑا اہتمام فرماتے تھے۔
ربط والفت اور کشش محبت دیکھئے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ زادے ان کا آخری دیدار کرنے وفات کے وقت امروہہ پہونچ گئے تھے انہوں نے ہی نماز جنازہ پڑھائی۔

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا ادب واحترام کرتے تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ان سے تعلق خاطر تھا، مراد آباد میں موتمر الانصار کے جلسہ میں تمام اکابر ملت جمع تھے مختلف مکانوں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک دن حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ

ایک خاص مشورے کیلئے سب کو ایک جگہ جمع کرنا چاہتے تھے اپنے شاگرد مولانا انوار الحق صاحب عباسی مرحوم کو بھیجا کہ مولانا تھانوی وغیرہ سے کہو کہ مجھے ایک مشورہ کرنا ہے میں خود ان کے پاس آؤں یا وہ میری قیام گاہ پر آجائیں گے؟ جب یہ پیغام مولانا تھانویؒ نے سنا تو گھبرا کر فرمایا، مولانا تکلیف نہ فرمائیں ہم سب ان کی قیام گاہ پر آرہے ہیں۔

مناسب سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر مولانا تھانویؒ کے دو ایک ملفوظات مولانا امروہیؒ کے بارے میں اور پیش کردوں، خواجہ عزیز الحسن مجذوب مرحوم اشرف السوانح جلد اوّل کے ص ۱۵۷ و ص ۱۵۸ پر لکھتے ہیں:۔

"حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب امروہیؒ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے بہت محبوب اور ارشد تلامذہ میں سے تھے، اور طریق باطن میں غالباً شیخ العرب والعجم حضرت حاجی صاحب قدس سرہ العزیز سے مجاز تھے، آپ مشاہیر علماء ہند سے تھے اور آپ کی فصیح و بلیغ تقریر وتحریر اور مہارت مناظرہ شہرۂ آفاق تھی، آپ کا اور حضرت والا (مولانا تھانویؒ) کا مختلف جلسوں میں مختلف مقامات پر بارہا ساتھ ہوا اور دونوں کو تقریر کرنے اور ایک دوسرے کے بیان سننے کا اتفاق ہوا، جانبین ایک دوسرے کا بہت ادب و لحاظ فرماتے تھے، حالانکہ حضرت والا عمر میں بہت چھوٹے تھے ایک بار حضرت والا امروہہ میں مولانا کے یہاں مہمان ہوئے اتفاق سے بیت الخلاء پوچھنا بھول گئے، پچھلی شب میں قضاء حاجت کی ضرورت پیش آئی تو سخت پریشان ہوئے کہ اس وقت کس سے پوچھا جائے، اسی شش و پنج میں تھے کہ یکایک حضرت مولانا گھر میں سے باہر تشریف لے آئے اور دریافت فرمایا کہ استنجے کی ضرورت تو نہیں؟ حضرت والا نے ضرورت ظاہر فرمائی تو پردہ کرا کے زنان خانے میں لے گئے، بیت الخلاء میں مولانا خود اپنے دست مبارک سے استنجے کے ڈھیلے اور پانی کا لوٹا رکھ آئے، حضرت والا کو سخت گراں گذرا اور بہت پس و پیش کی حالت میں فرمایا، کہ یہ ڈھیلے تو تبرک ہو گئے اب استنجا کاہے سے کیا جاوے، لیکن مولانا نے بغایت تواضع فرمایا کہ کیا ہوا اگر میں نے ہی رکھ دیئے، حضرت والا اس واقعہ کو نقل کر

کے فرمایا کرتے ہیں کہ ہماری جماعت میں مولانا بہت ہی نفیس لباس پہنتے تھے جو بظاہر تکلف کی حد تک پہونچا ہوا معلوم ہوتا تھا چنانچہ مجھ کو یہی گمان تھا لیکن اس دن سے میں مولانا کی تواضع اور بے تکلفی اور سادگی کا بے حد معتقد ہو گیا اور سمجھ گیا کہ مولانا کی خوش لباسی کا منشاء نفاست و لطافت مزاج تھا نہ کہ تکلف، حضرت والا، حضرت مولانا کے بعض پر لطف، مناظرے، مکالمے جو نو تعلیم یافتوں سے ہوتے تھے نہایت دلچسپی کے ساتھ نقل فرمایا کرتے ہیں۔

ذیل کا واقعہ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات ہفت اختر میں حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ کے طرز استدلال سے متعلق درج ہے، فرماتے ہیں۔

"ایک مولوی صاحب ریل میں سفر کر رہے تھے کسی اسٹیشن پر کسی ضرورت سے اترے اور چند طلباء انگریزی خواں سوار ہوئے، اور ان کے اسباب کو منتشر کر دیا انہوں نے کہا، کیا آپ لوگوں کی یہی تہذیب ہے؟ خیر وہ شرمائے اور اسباب بدستور رکھ دیا لیکن اپنی شرمندگی کے انتقام میں مولوی صاحب کو بنانا چاہا، اور موقع کے منتظر رہے۔ مولوی صاحب نے اتفاق سے نماز پڑھی، بعد فراغت نماز ان طلباء نے کہا ہم کچھ پوچھ سکتے ہیں؟ مولوی صاحب نے کہا، ہاں! پوچھا، نماز فرض ہے؟ اتنا تجاہل ظاہر کیا گویا وہ جانتے ہی نہ تھے، مولوی صاحب نے کہا کہ ہاں فرض ہے سوال ہوا کہ پنج گانہ نماز فرض ہے اور ہر جگہ فرض ہے؟ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ پنجوقتہ اور ہر جگہ فرض ہے، طلبہ نے سوال کیا کہ جہاں چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی شب ہوتی ہے، جس کو "عرض "تسعین" (۹۰) کہتے ہیں وہاں کس طرح ادا کریں گے؟ مولوی صاحب نے جز بز ہو کر کہا کیا آپ لوگ وہاں سے آرہے ہیں؟ جواب ملا نہیں، کہا جا رہے ہیں؟ طلبہ نے جواب دیا نہیں، مولوی صاحب نے فرمایا بس فضول باتیں نہیں بناتے، اس پر طلبہ نے اور ایک دوسرے صاحب میانہ عمر کے تھے انہوں نے قہقہہ لگایا اس سے مولوی صاحب کو خفیف ہونا پڑا، مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس گاڑی کے متصل دوسرے ڈبے میں تھے۔ اور سب واقعہ دیکھ رہے تھے، انہیں ان میانہ عمر والے صاحب کے ہنسنے پر غصہ

آیا، اگلے اسٹیشن پر پہونچ کر ان کی گاڑی میں تشریف لے گئے اور موقع کے منتظر رہے، اتنے میں وہی صاحب نماز کے واسطے اٹھے اور طلباء اتر گئے مولانا خوش ہوئے کہ یہ تو نمازی آدمی ہیں ان کو سمجھنا سہل ہو گا، جب نماز پڑھ چکے تو مولانا نے ان سے پوچھا کہ میں کچھ دریافت کرسکتا ہوں؟ نہایت بد دماغی سے جواب دیا ہاں :۔ کیونکہ مولانا موصوف سادہ وضع تھے گو طبقہ علماء میں رنگین طبع اور شوقین شمار کئے جاتے تھے، دریافت کیا، آپ کا دولت خانہ کہاں ہے؟ اس کا بھی جواب دیدیا، پوچھا آپ کس عہدے پر ممتاز ہیں؟ وہ بھی بتادیا، دریافت کیا کہ کس وقت سے کس وقت تک روزانہ کام کرنا پڑتا ہے؟ ان صاحب نے وہ وقت بھی بتادیا۔ اس کے بعد مولانا موصوف نے سوال کیا کہ اگر گورنمنٹ کی حکومت "عرض" "تسعین" میں ہو جائے اور وہاں آپ کو بھیج دے تو وہاں یہ وقت کس طرح ملے گا؟ یہ سنکر وہ صاحب سنبھلے اور فرمایا وہاں اندازہ کرلیا جائے گا، مولانا ممدوح نے فرمایا، کہ بہت حسرت وافسوس کا مقام ہے کہ ایک حاکم مجازی کے قانون کی تو یہ عظمت کہ اس پر جو اشکال واقع ہو اس کی آپ اس طرح توجیہ کرلیں اور حاکم حقیقی کے قواعد وضوابط پر تمسخر کریں اور مضحکہ اڑائیں، جاہل اعتراض کریں اور آپ ہنسنے میں ان کا ساتھ دیں، اور اس کے جواب میں ایسے چست وچالاک ہوں وہاں آپ سے یہی جواب نہ سمجھا گیا۔ خیر وہ تو بچے تھے افسوس آپ پر ہے، بیچارے نے بنچ سے اتر مولانا کے قدموں کو پکڑ لیا اور خوب روئے اور کہنے لگے کہ ان لڑکوں کو دیکھ کر ہنسی آگئی تھی۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ "عذر گناہ بدتر از گناہ" اگر آپ کی والدہ ماجدہ سے کوئی گستاخی کرنے لگے تو آپ کو اسے دیکھ کر ہنسی آئے گی؟ یا قہر وغضب سے آپ تھرا جائیں گے، افسوس ہے کہ خدائے تعالیٰ کی عظمت ماں کے برابر بھی آپ کی نگاہ میں نہ ہوئی۔

مرض اور وفات

ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کے آخری ہفتہ میں چند روز شدید بخار آیا اس سال طاعون کی وباء

شہر میں پھیلی ہوئی تھی، بالآخر اسی میں مبتلا ہو کر "المطعون شہید" کا مصداق (۱) بن گئے۔

۲۸/۲۹ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کی درمیانی شب میں بعد نماز عشاء ۱۱ بجے شب آپ کا وصال ہوا، ۲۹ ربیع الاول مطابق ۱۹ مارچ ۱۹۱۲ء بروز شنبہ صحن جامع مسجد امروہہ کے جنوبی گوشے میں دفن (۲) ہوئے انتقال سے کچھ دیر پہلے بستر مرگ پر لیٹے لیٹے آخری وعظ فرمایا۔ بھتیجی سے وعدہ تھا کہ ان کے مکان پر وعظ فرمائیں گے، اس کے کچھ بعد ہی اللہ کے یہاں سے بلاوا آ گیا۔ اس وقت بھتیجی حاضر تھیں شاید ان سے فرمایا بھی کہ وعظ کا وعدہ تھا، لو اب سن لو، (پھر موقع ملے نہ ملے)۔

نماز عشاء کا وقت ہو گیا تو اشاروں سے آخری نماز ادا فرمائی اور پھر اللہ کا ذکر کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ رحمہ اللّٰہ رحمۃً واسعۃً.

مولانا قمر الدین صاحب سہنسپوری مدظلہ کا بیان ہے کہ حضرت مولانا کے چچازاد بھائی مولوی سید آل علی صاحب مرحوم نے ان سے فرمایا تھا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے آخری کلمات سبحان اللّٰہ وبحمدہٖ سبحان اللّٰہ العظیم تھے، نماز جنازہ استاذ زادہ حضرت حافظ احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھائی، دفن سے پہلے پہلے مراد آباد، بچھرایوں، حسن پور، سنبھل اور اطراف وجوانب کے دیہات ومضافات سے ہزاروں کی تعداد میں عوام وخواص آ گئے تھے، اتنا کثیر مجمع یہاں کسی جنازہ میں نہیں دیکھا گیا، جامع مسجد کی پشت پر پانباڑی نام کا تالاب اس وقت خشک تھا، وہاں نماز جنازہ ہوئی۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی دائمی مفارقت ایک ایسا سانحۂ دل گداز اور واقعہ جاں فرسا تھا کہ علاوہ معتقدین ومتوسلین کے ہر شخص پر سکتے کا عالم طاری تھا۔ امروہہ ہی میں نہیں اس حادثۂ عظیم سے پورے ملک میں غم والم کی لہر دوڑ گئی، خدام کے دلوں کی ہر دھڑکن ماتم کناں تھی اور ان کی آنکھوں کا ہر آنسو زبان حال سے کہہ رہا تھا کہ آہ! صد آہ اللہ کا پیارا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شیدائی، حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا خلیفۂ مجاز، حضرت مولانا نانوتوی کا محبوب شاگرد، اسلام کا محافظ، بہترین متکلم ومناظر، پوری عمر اشاعت علم دین میں گذار دینے والا معلم، جس کی صورت وسیرت سے اسلام کی حقانیت نمایاں، جس کی ہر ادا سے خلوص وللّٰہیت آشکارا، وہ آج دنیا سے چل بسا، آفتاب علم زیر زمین غروب ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

---

(۱) "شہید اعظم" بھی آپ کا مادۂ سال وفات ہے۔ (۲) وفات سے کچھ عرصہ پہلے اس جگہ کو اپنی آخری آرام گاہ کے لئے منتخب کیا اور مولوی عبد الحق صاحب عباسی سے وصیت فرمائی تھی۔

اکابر دیوبند کے آپ کی وفات پر تأثرات

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ القاسم (ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ کے ابتدائی صفحات پر اپنے جو تاثرات سپرد قلم کئے ہیں. جی چاہتا ہے کہ ان کو بعینہٖ پیش کردیا جائے:۔

"ربیع الاوّل ۱۳۳۰ھ کا آخری دن بھی مسلمانوں کیلئے نہایت پرآشوب دن تھا جبکہ ان میں سے حضرت مولانا احمد حسن صاحب محدث امروہی قدس سرہ اُٹھالئے گئے، ایسے وقت میں جبکہ مسلمانوں کی مذہبی بنیادیں متزلزل اوران کا عالی شان دین منہدم ہورہاہے اور آزادی ولامذہبی کے سیلاب نے ان کے استقامت واستقلال کو صدمۂ عظیم پہونچادیا ہے مولانا کا وجود خدا تعالیٰ کی رحمت تھی، آپ کی وفات سے اسلام کی امیدیں وابستہ تھیں، اہل اسلام آپ کو دیکھ کر اسلاف کی یاد تازہ کرلیتے تھے، آپ کا عالم سے اٹھ جانا حقیقۃً تمام عالم کیلئے یکساں مذہبی واسلامی حادثہ ہے، مسلمان ہرطرف سے مصائب وآلام حوادث وفتن کے آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔

بر زمیں نارِ رسیدہ می پرسد
خانۂ انوری کجا باشد

کے مصداق ہیں اس حالت میں ان کیلئے کوئی سہارا ہے تو یہی کہ ان کے اندر ایسے سچے عالم جو دین کو سنبھالنے اوران کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے والے ہوں موجود رہیں، مگر نہایت افسوس، نہایت قلق وحسرت، نہایت اضطراب وپریشانی کا وقت ہے کہ ان نمونۂ اسلاف اور کشتیٔ اسلام کے ناخدا بزرگان دین سے بھی دنیا خالی ہوتی جاتی ہے ....اس آخری زمانے میں جبکہ مسلمان انتہاء قعر تنزل میں اترتے چلے جاتے تھے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب و مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہما کا وجود اسلام اور مسلمانوں کیلئے پشت پناہ بنا ہوا تھا۔ حضرت قاسم العلوم والخیرات کی وفات عالمگیر اور اسلام کیلئے ناقابل تلافی حادثہ تھا، مگر آپ کے بہت سے

لائق و کامل تلامذہ میں چند حضرات اس درجے کے بھی تھے جو آپ کی جانشینی کا پورا حق ادا کر سکتے تھے، جن کو مولانا اپنی اولاد سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے، مولانا احمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں اس قدر اوصاف و کمالات مجتمع تھے کہ کسی شخص واحد میں ان کا اجتماع دشوار عادی ہے۔ علمی تبحر، ورع و تقدس اور ان کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اوصاف خاصہ میں سے تھے، آپ کی صحبت اکسیر کا حکم رکھتی تھی، خلاف شرع امور اور منکرات پر مداہنت کو ہرگز جائز نہ رکھتے تھے، مگر ان سب کمالات کے ساتھ جس امر نے آپ کو ممتاز بنا کر رفعت و عظمت کے آسمان پر پہونچا دیا وہ یہ تھا کہ آپ حضرت قاسم الخیرات رحمۃ اللہ علیہ کی "زندہ تصویر" خیال کئے جاتے تھے، مسلمانوں کو دوہرا صدمہ یہی ہے کہ "تصویر قاسمی" آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

طلبۂ علم کیلئے جبکہ ملائکہ پر بچھاتے اور زمین و آسمان کے باشندے، دریا میں مچھلیاں استغفار کرتی ہیں تو بلا شبہ مولانا کی وفات پر زمین و آسمان، جن وانس، حیوانات و نباتات اور عالم کا ہر ذرہ نوحہ گری اور دعائے مغفرت کرے تو بالکل حق بجانب ہے، دل چاہتا تھا کہ القاسم کے اسی نمبر میں مولانا کے مرض و وفات اور زندگی کے حالات ذرا تفصیل سے لکھتے، مگر ہمارے عزیز مولوی شبیر احمد سلمہ نے جو اس صدمے سے نہایت متاثر ہیں اپنے دلی جذبات کو خاص طرز میں ادا کیا ہے، بالفعل اس مضمون کو بجنسہ شائع کرنے پر قناعت کر کے آئندہ حسب موقع حالات درج کریں گے۔"

دیگر تعزیتی مضمون اور قطعات تاریخ بعد میں نقل کروں گا، پہلے آپ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا لکھا ہوا مرثیہ (جس کا ہر لفظ سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے) پڑھ لیں۔

یہ مرثیہ جمادی الاولی ۱۳۳۰ھ کے القاسم میں مدیر رسالہ کے اس نوٹ کے ساتھ درج ہے:۔

"متعدد نظمیں ہم کو وصول ہوئی ہیں یہ قطعہ، تاریخ حضرت مولانا محمود حسن صاحب عم فیضہم کی تصنیف ہے، آپ نے بعض خدام کی درخواست پر بروز جلسہ دار الحدیث صبح کو لکھ دیا تھا اور بندہ مدیر (مولانا حبیب الرحمٰن دیوبندیؒ)

نے پڑھ کر جلسہ میں سنایا تھا۔"

گم ہوئی ہے آج صد حسرت ہمارے ہاتھ سے
حضرت قاسمؒ نشانی دے گئے تھے ہم کو جو
سید العلماء امام اہل عقل و اہل نقل
پاک صورت پاک سیرت صاحب خلق نکو
معدن علم و حکم سر دفتر اہل کمال
عازم خلد بریں ہے جس کو چلنا ہے چلو
جب شبیہ قاسمی سے بھی ہوئے محروم ہم
تم ہی بتلا دو کہ پھر ہم کیا کریں اے دوستو
درد یہ پہونچا ہے سب کو اس کا منکر کون ہے
ہاں مگر اک فرق ہے تھوڑا سا گر میری سنو
لوگ کہتے ہیں چلے علامۂ احمد حسن
اور میں کہتا ہوں وفات قاسمی ہے ہو نہو
کامل و اکمل سبھی موجود ہیں پر اس کو کیا
جو کہ مشتاق ادائے قاسم خیرات ہو
اپنی اپنی جائے پہ قائم ہیں سب اہل کمال
پر جگہ استاد کی خالی پڑی ہے دیکھ لو
ہاں جنون اتحاد قاسمی میں بارہا
تم کو ہم کہتے تھے من اور آپ کو کہتے تھے تو
مجمع حسرت فرین درد و غم میں میں بھی تھا
فکر میں تاریخ کی سب نے کیا جب سر فرو
دل پُر یاس آئی کان میں میرے صدا
حک ہوئی تصویر قاسم صفحۂ دنیا سے لو

۱۳۳۰ھ

۲۰ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ مطابق ۹ اپریل ۱۹۱۲ء کو جلسۂ بنیاد دارالحدیث دارالعلوم منعقد

ہوا جس میں اکابر ملت جمع تھے اس جلسہ میں حضرت مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ کا وعظ ہونا قرار پایا تھا اور اس کا اعلان بھی ہو گیا تھا لیکن قضائے الٰہی سے وہ جلسہ سے بیس (۲۰) روز پیشتر انتقال فرما چکے تھے، یہ افتتاحی جلسہ مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ کے صدمے میں غم والم کا جلسہ بن گیا تھا، صاحبزادۂ مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ مولانا قاری سید محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس جلسے میں بلائے گئے تھے۔

اس جلسہ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم نے ایک تقریر کی جس میں دار العلوم کے کچھ حالات بیان کرنے کے بعد حضرت قاسم العلوم والخیرات کی یادگار حضرت مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت پر اظہارِ تاسف کیا اور فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صدمے سے مولانا احمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مفارقت کا صدمہ دار العلوم اور اس کے خدام کو بعض وجوہ سے زیادہ محسوس ہوا۔ اسی تقریر میں فرمایا۔

> ”صاحبو! آپ مدرسہ کا اطلاعی خط پڑھ چکے ہیں، اس میں اوّلاً حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وعظ ہونا تجویز ہوا تھا مگر یہ سانحہ کس قدر رنج دہ اور دلوں کو پاش پاش کر دینے والا ہے کہ اس وقت بجائے اس کے کہ مجمع میں مولانا مرحوم وعظ فرماتے میں ان کی وفات پر اظہار افسوس کرنے کیلئے آپ حضرات کے سامنے کھڑا ہوں، آہ اس قحط الرجال کے زمانے میں ہم کو حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کے سچے جانشیں کی مفارقت پر جس قدر صدمہ ہو بجا ہے، مولانا ایک ایسے یکتا، اور باخدا آدمی تھے کہ ان کی نظیر ہم کو ڈھونڈھے نہیں ملتی اور جو سکون ہم غم زدوں کو مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ہو گیا تھا وہ آج نہیں.......“

تقریر کے آخر میں فرمایا:۔

> ”صاحبو! آج مجھے کیا، ہماری جماعت کو مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ کی مفارقت پر زیادہ صدمہ ہے کہ مقدس حضرات نے جو مجموعی قوت دین کی حفاظت، علوم اسلام کی اشاعت، ہدایت خلق، ارشاد عباد کیلئے چھوڑی تھی آج اس کا ایک رکن رکین اٹھ گیا۔“

اس کے بعد جناب حافظ محمد عبد الرحمٰن صاحب مراد آبادی جو مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ کے

غم میں مبتلا اور مولانا حبیب الرحمٰن کی تقریر سے متاثر ہو کر دیر سے ضبط کئے بیٹھے تھے نہ رہ سکے، بے اختیار کھڑے ہوئے اور مولانا مرحوم کے فرزند دلبند کو بلا کر اپنے گلے سے لگالیا، اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے حالات، کیفیت مرض وفات، رجوع الی اللہ، مرض وفات میں مبتلا ہو کر چار پانچ گھنٹے حدیث کا سبق پڑھانا اور طلبہ سے فرمانا کہ آخری سبق ہے، مرض میں نمازوں کی پابندی۔ ذکر، فکر، نماز عشاء پڑھ کر بحالت ذکر طائر روح کا قفس عنصری سے پرواز کر جانا، اہل امروہہ کی بے تابی، رنج وغم، نماز جنازہ میں خارج از قیاس مجمع کا ہونا، کچھ ایسے پر اثر اور دل گداز لہجہ میں بیان فرمایا، کہ خود بھی روئے اور سب کو رلایا۔ (روئداد جلسہ بنیاد دار الحدیث القاسم ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ) حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے "جاں گداز سانحہ" کے عنوان سے ایک جامع اور مؤثر مضمون لکھا، جو القاسم "ماہ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ میں شائع ہوا ہے، اس میں ایک تمہید کے بعد جس میں ملت اسلامیہ پر جو جو مصائب کے اوقات آئے ہیں اور اکابر کے اٹھ جانے پر جو فتنوں کا ظہور ہوا ہے ان کا ذکر کر کے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ملت بیضاء کے نازک اوقات کا بیان کرنے کے بعد مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضرت مولانا محمد قاسم قدس سرہ نے (جن کی پاک زندگی وراثت انبیاء کا کامل مظہر تھی) حفاظت دین اور احیاء سنت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض سے ایک مدرسہ دیوبند کی سی گمنام بستی میں قائم کیا۔ اس کو چھوڑ کر داعی اجل کو لبیک کہا اس وقت چوں کہ ہماری سرپرستی کیلئے حضرت مولانا رشید احمد صاحب و مولانا محمد یعقوب صاحب و مولانا رفیع الدین صاحب قدس اللہ اسرارہم موجود تھے۔ اس لئے آپ کی وفات حسرآیات سے سب کو حزن و ملال تو بے حد ہوا، لیکن معاملات کی طرف سے گھبراہٹ اور تشویش پیدا نہیں ہوئی، کچھ دنوں بعد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ و مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انتقال فرمایا، تو سب کی امیدوں کا مرکز اور توجہات کا قبلہ تنہا مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات ٹھہر گئی، اس اثناء میں بے شک بہت کچھ فتنے اور حوادث بھی پیش آتے رہے مگر اس کوہِ وقار وعظمت کی ہستی ان سب کے لئے سپر بنتی رہی اور ہم غریبوں کو یہ اطمینان رہا کہ جب تک حضرت ہمارے اندر موجود ہیں کسی بلا یا فتنے کا مقابلہ دشوار نہیں ہے، کچھ عرصے کے بعد آخر وہ گھڑی بھی آپہنچی جس میں ہمارے ہر ایک طرح کے اطمینان و سکون کا خون ہوگیا، اور خاتم الاکابر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات نے شہادت فاروقی کا نقشہ پیش کر دیا اور بجائے کسی شخص واحد کے ان ہی حضرات مرحومین

کے متوسلین کی ایک جماعت نے مل کر اس دین کے کام کو سنبھالا لیکن آنسوؤں کے بجائے خون حسرت بہانے کا موقع ہے۔ اس جماعت کے ارکان میں سے ایک بہت بڑا رکن اعظم منہدم ہوگیا اور حضرت قبلہ مولانا احمد حسن صاحب امروہی قدس سرہ کی ناگہانی موت نے اس جماعت کی قوۃ کو نا قابل تلافی صدمہ پہونچایا اور نہ صرف یہ ہی کہ ہماری جماعت کی طاقت کو ایک بھاری صدمہ پہنچا بلکہ آج ایسا جامع معقول ومنقول عالم مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتا رہا جس کی نظیر ہمارا زمانہ بمشکل پیدا کرسکتا ہے۔ آج ہندوستان کا بڑا مقتداء دنیا سے اٹھ گیا، آج تصویر قاسمی مٹ گئی، اور آج قاسمی معارف کے "اعلیٰ شارح" نے اپنی مسند خالی چھوڑ دی "انا للّٰہ و انا الیہ راجعون فللّٰہ مااخذ ولہٗ مااعطیٰ و کل شیءٍ عندہٗ بمقدار"

حضرت مفتی صاحب کے تاثرات

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی نے ربیع الاول ۱۳۳۰ھ میں دنیا سے رخصت ہونیوالی دو عظیم شخصیتوں کا ذکر اپنے ایک مضمون میں فرمایا ہے۔ اس کا کچھ اقتباس ذیل میں درج کرتا ہوں:

"ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کا مہینہ مسلمانان ہند کے لئے ایک ایسا مہینہ تھا جس میں ان کی نظروں سے علم نبوت کے دو روشن چراغ اوجھل ہو گئے۔ بلکہ دو آفتاب غروب ہو گئے۔ اول حضرت مولانا مقتدانا الجامع بین المعقول والمنقول حاوی الفروع والاصول سیدنا الفقیہ المحدث المفسر المتکلم المولوی السید احمد حسن الامروہی افرغ اللہ علیہ شآبیب رضوانہ، دوم جناب وارث الانبیا والمرسلین ماوی الغرباء والمساکین مولانا الحافظ الحاج القاری المحدث المفسر محمد اسمٰعیل راندیری اسکنہ اللہ بحبوحۃ جنانہ۔

یہ دونوں مقدس بزرگ ان نفوس قدسیہ کے نمونے تھے جن کے نام کے ساتھ اسلام کا شیرازہ باندھا گیا تھا، جن کے دیدار سے خدا یاد آتا تھا، جن کی مجلسیں ذکر اللہ سے معمور، جن کے قلوب شراب محبت سے مخمور، جن کے متوسلین حب دین سے معمور تھے۔ اس گئے گذرے زمانے میں جبکہ علماء ربانیین کا قحط ہے، یہ صحابہ کرام کے سچے جانشین اور انبیاء علیہم السلام کے

حقیقی وارث تھے۔ ان کے انتقال سے قصر دین کی بنیادیں نہ صرف امروہہ و گجرات میں متزلزل ہوگئیں بلکہ تمام ہندوستان کی علمی و عملی دنیا میں ایک غیر معمولی زلزلہ محسوس ہونے لگا اور کیوں نہ ہو کہ ایسے علماء ربانیین دین کے عالی شان ایوان کے اساطین ہیں، میرا ارادہ ہوا کہ ان دونوں مقدس حضرات کی مختصر سیرت ناظرین القاسم کی خدمت میں پیش کر کے ان کے استحقاق کی جانب توجہ دلاؤں جن کے وہ عام مسلمین کی جانب سے مستحق ہیں، یعنی یہ کہ تمام اہل اسلام ان حضرات کیلئے صدق دل سے درگاہ الٰہی میں دعائے مغفرت و رفع درجات کریں اور ان کے حق سے سبکدوش ہوں۔ مگر چوں کہ حضرت مولانا امروہی قدس سرہ کی سیرت پر قلم اٹھانا میری بساط سے زیادہ تھا۔ اور یہ کہ ہمارے مکرم دوست مولوی شبیر احمد صاحب مولانا کی سوانح لکھنے کا ارادہ ظاہر فرما چکے تھے اس لئے میں نے ان کو مستحق اول سمجھ کر صرف مولانا راندیری رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر سیرت پر اکتفاء کیا۔“

(چنانچہ اسکے آگے ان کی سیرت جامع و مختصر انداز میں ارقام فرمائی ہے) (۱)

مؤتمر الانصار کے اجلاس میرٹھ میں اظہار غم و دعائے مغفرت

مؤتمر الانصار کے دوسرے سالانہ اجلاس میرٹھ میں شیخ رشید احمد صاحب ناظم مجلس استقبالیہ نے حافظ فصیح الدین صدر مجلس استقبالیہ کی طرف سے ایک تقریر پڑھی جس میں حضرت مولانا امروہی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات پر اظہار غم کیا گیا تھا۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی ناظم جمعیۃ الانصار، نے مؤتمر الانصار کے اس اجلاس میرٹھ میں حضرت امروہی رحمۃ اللہ علیہ کیلئے کل حاضرین سے دعائے مغفرت کرائی۔ اور سب نے بکمال اخلاص دعاء کی۔ (۲)

مراثی و قطعات تاریخ وفات

حضرت مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری تلمیذ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فارسی

(۱) القاسم جمادی الثانیہ ۱۳۳۰ھ (۲) ماخوذ از القاسم جمادی اولی ۱۳۳۰ھ

زبان میں اپنے استاد بھائی کا حسب ذیل مرثیہ لکھا۔

صد دریغا حسرتا دردا کہ کوہِ غم فتاد
بردلِ اسلامیاں ناگہ دریں دور فتن
از سرِ عالم برفتہ سایہ آں عالمے
کز فضائل بوداو محسود اقران و زمن
متصف باجملہ اوصاف حرّی اہل دیں
علم وفضل وزہد وتقویٰ خلق وعادات حسن
سید عالی نسب والا ہمم اہل کرم
خلقت و خلقش مماثل با حسین ہم حسن
زبدہ اصحاب فیض قاسم اسرار دیں
آں کہ بودہ آیتے ز آیات رب ذوالمنن
جامع شرع وطریقت کاشف اسرار حق
در علوم عقلی و نقلی امام اہل فن
برسر دنیائے دوں خاک مذلت ریختہ
باخلوص دل بحق مشغول در سر و علن
بعلائقہائے دنیا بے تعلق ماندہ او
بود گویا ذات آزادش مسافر در وطن
از ربیع الاول آخر روز، روز آخرش
بود کو بربست ناگہ رخت ازیں دار محن
شد جگر ہائے جہانے پاش پاش از صد متش
اشکہا در چشمہا بنمود دریا موج زن
سن ترحیلش دریں حالت دل بیتاب یافت
تابماندیا دسال نقل آں فخر زمن
گفت ہاتف بالیقیں از روئے بخشایش بخواں
جنت علیا قرار مولوی احمد حسن (رحمۃ اللہ علیہ)
۱۳۲۸ + ۰۲ = ۱۳۳۰ ہجری

قطعہ تاریخ از تصنیف مولانا سراج احمد صاحب رشیدیؒ

بخیا گر چاکِ گریباں کو نہ سی کیا فائدہ
دشتِ وحشت پھر اڑا دیویگا اس کی دھجیاں
چارۂ درد فراق یار جز گریہ نہیں
چارہ سازی رہنے دے اے چارہ سازِ مہرباں
اپنے آپے میں نہیں ہوں آج معذور ہوں
رونے سے مت روک مجھ کو ناصح نامہرباں
میں بھلا کیونکر نہ روؤں ناصحا تو بھی تو دیکھ
ہیں حبیب واحمد و محمود سب گریہ کناں
ہائے چھائی ہے اداسی کیا در و دیوار پر
ہوش میں آ دیکھ عالم ہو گیا ہو کا مکاں
کچھ خبر بھی ہے تجھے روتے ہیں ہم سب آج کیوں
رنج و غم کا آج ہم پر گر پڑا کوہِ گراں
حضرت قاسم کی کھو بیٹھے نشانی آج ہم
ڈھونڈھتے پھرتے ہیں اور ملتا نہیں اسکا نشاں
چشم مشتاق جمال قاسمی حیران ہے
ہو گئی تصویر قاسم آج نظروں سے نہاں
مولوی احمد حسن صاحب نے پائی ہے وفات
آج امروہے سے آئی ہے خبر یہ ناگہاں
صدمۂ ہجر شبیہ قاسم علم و ھدی
ہے مصیبت ہی مصیبت یاالٰہی الاماں
ماہتاب مستنیر آفتاب قاسمی
آج نظروں سے ہماری ہو گیا ہے وہ نہاں
تھا بیاں میں آپ کے طرز و ادائے قاسمی
یاد آتا ہے ہمیں رہ رہ کے وہ طرز بیاں

دنگ رہ جاتے تھے ان کی بزم میں اہل کمال
تھی روانی آپ کی تقریر کی بحر رواں
عالم تصویر ہوتی تھی دم تقریر بزم
ہے کہاں اب آپ سا جادو بیاں شیریں زباں
جوہر فرد آپ حسن ظاہر و باطن کے تھے
آپ کو اللہ نے کی تھیں عطا سب خوبیاں
صبر کر اے عاشق نازو ادائے قاسمی
مصرع تاریخ پڑھ اب اے سراج نوحہ خواں
یوں سروش غیب نے مجھ سے کہا از روئے لطف
اُدخل الخلد آپ کا ہے سال رحلت بیگماں

۱۳۰۰ + ۳۰ = ۱۳۳۰ھ

منشی عبدالمجید صاحب دماغ جونپوری نے بھی قطعہ تاریخ وفات لکھا، اس کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

آج امروہے میں ہے کیوں اندھیر
اُٹھ گیا کون رشک ماہ مبین
مجلس علم کیوں ہوئی سونی
کیا ہوا اس کا آج صدر نشیں
چل بسا ہائے کون جانِ جہاں
کس کے غم میں زمانہ ہے غمگین
سید احمد حسن نبیہ وفقیہ
یاد گار اکابر پیشیں!!
حسن ظاہر میں حسن باطن میں
نہیں دیکھا ہے کوئی ایسا حسین!
فکر تاریخ کی اگر ہے دماغ
لکھ دے ”تو گل ہوا چراغ دیں“

۳۰ ۱۳ ھ

حضرت مولانا حافظ عبد الغنی صاحب پھلاوَدیؒ جو بیس سال تک حضرت محدث امروہی قدس سرہ سے فیضیاب ہوتے رہے اور جن کو حضرتؒ سے والہانہ عشق تھا۔ اپنے شفیق و مربی استاد کی جدائی پر ان رقت انگیز الفاظ میں سوزش قلب کا اظہار کرتے ہیں ؎

ہے فخر علماء زمن، ہے سید احمد حسن
ہے حضرتِ استاد من رفتی چو جانِ من زتن
ہے ہے کجا رفت آں زماں در خدمت بودم دواں
تابست سالہ در جہاں بودیم ہمچو جان و تن
ہے ہے چہ عزم انگیختی بار فتگاں آمیختی
جائے تو شد خلد بریں تا گفت حافظ ایں سخن
خاکے بفرقم ریختی ہے ہے چہ کر دی جان من
در بزم قاسم علم دیں "ہاں گشت شمع انجمن"

۱۳ ھ ۳۰ ء

آخر میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن دیوبندی کا عربی مرثیہ جو علمی شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے اور جس میں زخم خوردہ قلوب کی نہایت فصاحت و بلاغت کیساتھ ترجمانی کی گئی ہے۔ اور اسکا بہترین اردو منظوم ترجمہ اور چند اشعار مرثیہ کی تضمین معہ ترجمہ اور ملاحظہ فرمائیے ؎

(۱) شمل الھدیٰ والدین عم شتاتهٗ
والدھر ساء واقلعت حسناتهٗ

(۲) باللہ این العالم الحبر الذی
تقوی الالٰہ صفاتهٗ و سماتهٗ

(۳) این الذی افنی الشبیبة کا فلا
نشر العلوم مساتهٗ و غداتهٗ

(۴) مسعودة غدواته محمودة
روحاته میمونة ضحواته

(۵) علم عن الاسلام کان محامیا
ابدا اذا ماسلمته حماته

(۶) جبل تضعضع من تضعضع رکنه
ارکاننا وتهدنا هداته

(۷) لاتحسبوه مات شخص واحد
فممات کل العالمین مما ته

(۸) ماکان اسر ع وقته لما انقضے
فکانما سنواته ساعاته

(۹) کانوا جلوسا امس حول وساده
والیوم هم حول السریر مشاته

منظوم اُردو ترجمہ :۔ از مولانا سراج احمد رشیدی مرحوم

(۱) انتقال ھادی اسلام سے
انتظام دین پراگندہ ہوا
نیکیوں کی جڑہی گویا کھد گئی
دہر بے رونق نظر آنے لگا

(۲) ہے کہاں وہ عالم یکتائے دہر
جس کا تقویٰ تھا لباس بے ریا

(۳) ہے کہاں وہ عاشق شیدائے علم
کافل نشر علوم مصطفےٰ

(۴) رات دن تعلیم علم دین میں
کر دیا اپنی جوانی کو فنا
صبح تھی محمود اور مسعود شام
چاشت تھی میمون اس کی واہ وا

(۵) جب نہ لے کوئی خبر اسلام کی
جب نہ ہو کوئی حمایت کو کھڑا
ایسے وقتوں میں تھا وہ اے دوستو
حامیٔ دین محمد مصطفےٰ

(۶) تھا علوم دین کا کوہ رفیع
فائق الاقران و عالی مرتبہ
ہل گئی بنیاد اور سارے ستوں
زلزلہ اس کو ہ میں جب آگیا
اس کے گرنے سے قیامت آگئی
قصر جمعیت ہی سارا گر گیا

(۷) موت عالم کی ہے گویا آگئی
یہ نہ سمجھو تم کہ وہ تنہا مرا

(۸) لے گئے تشریف دنیا سے وہ
سوئے فردوس برین پر فضا
ہائے کیسی جلد گذری زندگی
ہائے اب پچھتا کے یوں کہنا پڑا
ہائے گذرے سال گھڑیوں کی طرح
ہائے پل کے پل میں یہ کیا ہو گیا

(۹) کل جو پروانے تھے ان کی بزم کے
آج گرد نعش ہے ان کا پرا

تضمین مرثیہ عربی:

از مولانا عبد الرحمٰن صاحب سیوہاروی

مالی اری الاسلام قل هداته
وتفرقت انصاره و دعاته
طودالتقی و العلم زال ثباته
شمل الهدی والدین عم شتاته
والدهر ساء واقلعت حسناته

مجھے کیا ہوا ہے کہ اسلام کے ہادی کم نظر آتے ہیں اور اس کے انصار اور داعی منتشر ہو گئے،

تقوی اور علم کا پہاڑ اپنی جگہ سے ہل گیا، ہدایت اور دین کا نظام پراگندہ ہوگیا اور اس کی بھلائیاں تباہ و برباد ہوگئیں۔

قدمات مولانا الجليل الاحوذی
احمدحسن تذکاره العرف الشذی
بلبان علم قاسمی قد غذی
یا اللّٰه این العالم الحبر الذی
تقوی الاله صفاته و سماته

ہمارے آقائے بزرگ کامل الفن سید احمد حسن کا انتقال ہوگیا۔ جن کا ذکر تیز خوشبو کی مانند ہے، مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے علم کے دودھ سے انہیں غذا دی گئی تھی، خدا کی قسم وہ عالم تبحر کہاں ہے۔ جس کی علامت اور پہچان خدا کا خوف اور تقویٰ تھا۔

قد کان بحرا فی المعارف طامیا
غیثا مغیثا للمدارس هامیا
لیث المعارك للحقیقة حامیا
علم عن الاسلام کا ن محامیا
ابدا اذا ما اسلمته حماته

"وہ علوم و معارف کا بحر ذخار تھا، مدارس اسلامیہ کے لئے بے پایاں باران رحمت، کارزار کا شیر نیستاں، اور سچائی کا مددگار، وہ اسلام کا پرچم تھا اور ہمیشہ اس کا حامی، جب اس کے حامیوں نے بھی حمایت چھوڑ دی ہو۔

فمضی وغادر ناعلے جمر العضا
بجوار ارحم راحمین قد ارتضے
لم ندر کم عام مضی ومتی مضی
ماکان اسرع وقته لما انقضے
فکانما سنواته ساعاته

"وہ گذر گئے ہمیں ببول کی چنگاریوں پر تڑپتا چھوڑ گئے۔ وہ قرب ارحم الراحمین پر راضی ہوگئے، ہمیں نہیں معلوم کہ کتنے سال گزر گئے، ان کی زندگی کا زمانہ کس قدر جلد گزر گیا، گویا

کہ اس کے سال بھی ساعتوں کی طرح تھے۔"

شدوا البلاء الی جناب بلاده
ساقت سعادتهم الی ارشاده
لزموه حتی استکملوا برشاده
کانوا جلوسا امس حول وساده
والیوم هم حول السریر مشاته

"لوگ مصائب اٹھا کر ان کے شہر امروہہ پہونچے، ان کی سعادت ان کو مولانا کے ارشاد کی طرف کھینچ لے گئی، ان کی خدمت میں رہے، یہاں تک کہ ان کی ہدایت سے کامل ہو گئے، کل وہ ان کے گرد اگرد بیٹھا کرتے تھے اور آج ان کے جنازے کے ساتھ چل رہے ہیں۔"

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ

فہرست

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

مولانا عبدالرشید ارشد

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کے پہلے تک ملک میں کام کرنے والوں کا ایک ہی طبقہ تھا وہ علماء اور مذہبی مسلمانوں کا طبقہ تھا۔ ۱۸۵۷ء میں علی گڑھ اسکول قائم ہوتا ہے (جو بعد میں مسلم یونیورسٹی بنا) اس وقت سے جدید و قدیم کا فرق ہونے لگتا ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حقیقت کو پہلے دن سے سمجھ لیا تھا کہ ہندی مسلمانوں کی خیر نہیں ہے اور اب ذہنی و دماغی، مذہبی اور سیاسی اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کے رجحانات میں ایسا فرق ہو جائے گا کہ اگر بروقت علی گڑھ اسکول کے قیام کی تحریک میں اصلاحات نہ کی گئیں تو آئندہ چل کر دیوبند اور علی گڑھ کی وہ چپقلش پیدا ہوگی جو کبھی ختم نہ ہوگی اور اس خلیج کو پاٹنا مشکل ہوگا، مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی فراست ایمانی اور نگاہِ مردِ مومن کے سامنے ہندوستان کی پچاس سال قبل اور پچاس سال بعد کی سیاست تھی اس لئے آپ نے سرسید مرحوم سے خط و کتابت شروع کی اور چاہا کہ جدید و قدیم تعلیم کے فرق کو بیچ سے نکال کر صحیح اسلامی فکر کو اصولِ تعلیم کر کے میدان کو جیت لیا جائے، کیونکہ دین کی بنیاد صحیح علم و عمل پر ہے اور علم نام ہے خود شناسی اور خدا شناسی کا۔ بعض امور پر اتفاق کے باوجود کچھ حالات ایسے پیش آگئے کہ جن کی وجہ سے ان دونوں کے اشتراک سے جامع منصوبہ تیار نہ ہو سکا اور دونوں کی راہیں الگ الگ ہو گئیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایسی کمائی تھے کہ جو علوم و فنون، افکار و خیالات میں اپنے استاد کے حقیقی جانشین اور چھوڑے ہوئے کاموں کے پورا کرنے والے تھے۔ یہ شیخ الہند تھے کون تھے؟ ایک عالم ربانی و عارف یزدانی تھا جو اپنے کام و ذہن میں نہ ابوالکلام کی زبان رکھتا تھا نہ ہاتھ میں شبلی کا قلم۔ اس نے نہ

انقلاب فرانس کی تاریخ پڑھی تھی اور نہ روس اور نہ مانٹسکو کے انقلاب انگیز لٹریچر کا مطالعہ کیا تھا، وہ نہ گلیڈ سٹون کے مجموعۂ قوانین سے واقف تھا اور نہ ملٹن اسپر کے افکار و نظریات سے۔ اسنے نہ کسی دل کشی کا خط اٹھایا اور نہ عشرت کدۂ فرنگ کی کسی لذت سے کام جوئی کی تھی، ان سب چیزوں کے برعکس اس کا شیرازۂ حیات قال اللہ و قال الرسول اور اس کی زندگی کا خمیر اتباع سنت نبویہ تھا، اس کے فکر و نظر کا تار و پود احکام الٰہی کے انوار سے بنا اور شریعت اسلام کے آفتاب جہاں تاب کی شعاعوں سے گوندھا گیا تھا، سینہ میں صبر واستقامت کا ایک کوہ گراں رکھتا تھا، بظاہر وہ اپنے گوشۂ عزلت میں سب سے الگ تھا لیکن اس کی نظر جہاں بین میں زمانہ کی تمام کروٹیں اور لیل و نہار کی تمام گردشیں سمٹ کر جمع ہوگئی تھیں نیشنل کانگریس حکومت سے حقوق طلبی کی جنگ لڑ رہی تھی۔ لیکن شیخ الہندؒ یہاں اس حکومت کا تختہ ہی الٹ دینے کا نقشہ تیار کر رہے تھے۔ (مدینہ بجنور)

ہم کو تسلیم ہے کہ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد کے زبان و قلم نے غفلت کدۂ ہند کے خس و خاشاک میں آگ لگا رکھی تھی لیکن حریت طلبی کے ذوق کی خامی کا ابھی یہ عالم تھا کہ ملک کی سب سے بڑی ترقی پسند جماعت کا قدم بھی حقوق طلبی کی منزل سے آگے نہ بڑھنے پایا تھا، مگر علماء حق آنے والی جنگِ آزادی کیلئے خاموشی سے بہادر سپاہی تیار کرنے کی مہم میں مصروف تھے۔ ان کا نصب العین نہ تو دین و دنیا بہم آمیز تھا اور نہ ان کا مطمحِ نظر "درمع الدہر کیف دار" تھا بلکہ ان کا طرۂ امتیاز "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز" پر تھا۔ ان کے نزدیک دین کا مفہوم ایک مکمل نظام زندگی تھا جس کی پنہائی اور وسعت کا ایک گوشہ زمین و آسمان ہے۔

وطن، خاندان، تولد اور ابتدائی حالات

دیوبند کے چند مبارک اور ذی علم خاندانوں میں سے ایک خاندان شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ہے۔ حضرت کے جد امجد شیخ فتح علی صاحب تھے۔ جن میں سے مولانا ذوالفقار علی صاحب ایک نہایت ہی صاحب اقبال اور دینی و دنیاوی حیثیتوں سے صاحب جاہت و عزت عالم تھے۔ باوجود کرم اخلاق کے صورت سے سیادت اور رعب عیاں تھا، حق تعالیٰ نے اموال و اولاد اور صحت و عافیت سے بہرۂ وافی عطا فرمایا تھا اور مولانا اپنے شہر میں نہایت خوش قسمت اور بلند اقبال شمار ہوتے تھے۔ پچاسی سال کی عمر میں ۱۳۲۲ھ میں وفات پائی، اس وقت ساٹھ

افراد اولاد ذکور واناث چھوڑے۔ دہلی کے مشہور عربی کالج میں آپ نے استاذ العلماء والمشائخ مولانا محمد مملوک علی صاحب سے تعلیم پائی تھی۔ آپ کی تمام عمر علمی خدمات میں بسر ہوئی۔ علوم ادبیہ عربیہ سے خاص مناسبت تھی اور آپ کی نظم ونثر عرب العرباء کی یاد دلاتی تھی۔ دیوان حماسہ اور دیوان متنبیؔ کی مفید شروح تسہیل الدراسۃ اور تسہیل البیان آپ کی بہترین علمی یادگار ہیں، اور قصیدہ بردہ اور قصیدہ بانت سعاد کی شرح میں عطر الوردہ اور الارشاد جس ذوق وشوق سے تحریر فرمایا ہے، وہ حب نبوی ﷺ کی علامت اور بہترین ذخیرۂ آخرت اور کمال ایمان کی دلیل ہے، اسی طرز پر عرب کے مشہور سبعہ معلقات کی شرح التعلیقات علی السبع المعلقات تحریر فرما کر طالبان ادب پر احسان فرمایا ہے۔ اور فن معانی وبیان کو نہایت خوبی سے اردو زبان میں لکھ کر تذکرۃ البلاغت نام رکھا ہے اور قواعد وضوابط معانی کی مثالیں اساتذۂ اردو کے کلام سے دکھلا کر کمال کیا ہے بلکہ زبان اردو میں پہلے ممدوح نے اس فن کو جاری کر کے دکھلایا ہے ایسے باکمال حضرات اب، کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

جناب موصوف کی دو صاحبزادیاں اور چار صاحبزادے تھے۔

اول: فخر آباؤ اجداد حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ

دوم: مولوی حامد حسن جن کی ملازمت کا اکثر حصہ ضلع بجنور میں گذرا۔

سوم: مولانا حافظ حکیم محمد حسن صاحب استاذ وطبیب دار العلوم دیو بند، آپ نے حدیث شریف حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے اور دیگر علوم دار العلوم دیو بند میں اور اپنے بھائی حضرت شیخ الہند سے اور طب دہلی میں حکیم عبد المجید خاں صاحب مرحوم ومغفور سے حاصل فرمائی۔

چہارم: مولوی حافظ محمد محسن صاحب اکثر عمر مشغلہ ملازمت رہا۔ اپنے بڑے بھائی شیخ الہندؒ سے والہانہ محبت والفت تھی۔ ان کے ایام اسیری مالٹا میں یاد کر کے زار وقطار رویا کرتے تھے۔

حضرت مولانا ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۱ء میں بمقام بریلی (جب کہ آپ کے والد ماجد بوجہ ملازمت مع اہل وعیال وہاں مقیم تھے) عالم ظہور میں تشریف لائے۔ والد ماجد نے بطرز شائستہ اظہار مسرت کیا اور محمود حسن نام رکھا اور بعض ظریف حضرات نے والد ذوالفقار علی بتلایا۔ چھ سال کی عمر میں پڑھنے بٹھائے گئے، قرآن مجید کا اکثر حصہ میاں جی منگلوری سے پڑھا۔ بقیہ قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی کتابیں میاں جی مولوی عبد اللطیف صاحب سے پڑھیں۔ اس کے

بعد فارسی کی سب کتابیں اور ابتدائی کتب عربی اپنے معزز چچا اور مشہور استاد مولانا مہتاب علی سے پڑھیں۔ مولانا بچپن میں کھیل کود سے مجتنب و متنفر تھے۔ البتہ سیر و شکار سے ایک مناسبت اور دلی شوق تھا۔

مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی عمر پندرہ سال کی تھی اور آپ قدوری تہذیب وغیرہ پڑھ رہے تھے۔ کہ خدا تعالیٰ کے مقبول اور سراپا اخلاص بندوں کی تجویز سے ۱۵؍ محرم ۱۲۸۳ھ کو دیوبند میں ایک عربی مدرسہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تجویز سے پہلے مدرس مولانا ملا محمود صاحب بمشاہرہ پندرہ روپے ماہوار مقرر ہوئے اور دیوبند کی مشہور مسجد چھتہ میں تعلیم عربی شروع ہوئی۔

سبحان اللہ! کیا مبارک ساعت اور کیسے مخلص اور سعید حضرات تھے، کہ ان کی معمولی آواز پر پہلے ہی سال بنارس، پنجاب اور کابل تک کے طلباء جمع ہوگئے۔ اکیس طالب علموں کی جمعیت پر مدرسہ کا اجرا ہوا تھا۔ اور اخیر سال اور وقت امتحان تک اٹھہتر طلباء کا اجتماع ہوگیا، اور اب وہی مدرسہ عربی دارالعلوم دیوبند کی شکل میں دنیائے اسلام کا سب سے بڑا غیر سرکاری دارالعلوم ہے کہ جہاں سے کتاب و سنت اور علومِ اسلامیہ کے چشمے جاری و ساری ہیں، طلبہ کی کثرت ہوئی تو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ابن استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی صاحب دیوبند تشریف لے آئے۔ آپ اجمیر میں سو روپیہ پر ملازم رہ چکے تھے، پھر بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوگئے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے ارشاد پر اس خدمت کو ایک اسلامی خدمت سمجھ کر اواخر ۱۲۸۳ھ میں بیس روپے ماہوار کے قلیل مشاہرہ پر کام کرنے لگ گئے۔

پہلا اُستاد و شاگرد

مولانا شیخ الہند دارالعلوم کے سب سے پہلے طالب علم تھے۔ گویا پہلا استاد بھی "محمود" اور پہلا شاگرد بھی "محمود"۔ ۱۲۸۴ھ میں آپ نے کنز، میبذی مختصر المعانی کا امتحان دیا۔ آئندہ سال مشکوٰۃ، ہدایہ، مقامات پڑھیں۔ ۱۲۸۶ھ میں کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے پڑھیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نے اس دوران میں میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے مطبع میں تصحیح کا کام بھی کیا اور اسی طرح کبھی دہلی میں۔ اور دیوبند بھی تشریف

لاکر دارالعلوم کی دیکھ بھال کرتے۔ مولانا شیخ الہندؒ نے ان سب مقامات میں حضرت نانوتوی کے ساتھ رہ کر سفر و حضر میں سلسلہ درس جاری رکھا۔

مولانا نانوتوی کی خدمت میں سبق پڑھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ عبارت میں غلطی کرنا یا ترجمہ سمجھنے کے خیال سے ٹھہرنا گویا گناہ کبیرہ تھا۔ اس قسم کے اُمور اور بے موقع سوال سے مولانا مکدر ہو جایا کرتے تھے۔ اور سبق کا لطف ہی جاتا رہتا، جو شخص ذہین و مستعد ہوتا اور سبق کو مطالعہ میں خوب ذہن نشین کر کے جاتا، وہ مولانا کے مضامین سمجھنے کی امید کرسکتا تھا۔ اچھے اچھے ذی استعداد مولوی اس شرط پر شریک کئے جاتے تھے کہ صرف سنتے رہیں عبارت پڑھنے یا کچھ دریافت کرنے کا حق نہ ہو گا۔ لوگ خوشی سے قبول کرتے اور حاضر ہوتے۔ بہت عالی دماغ اور ذکی لوگ ہی پڑھتے اور سوال کرنے کی جرأت کرتے تھے۔

مولانا کا طرز ہی جدا تھا، حدیث ہو یا منطق، کلام ہو یا معانی، ہر فن کے متعلق عجیب و غریب تحقیقات بیان فرماتے جس سے ہر مسئلہ کی انتہائی تحقیق اور اختلافات کی تطبیق بدیہی اور مشاہد طور پر ہو جاتی تھی، اور اس قسم کے عالی مضامین بیان فرماتے کہ نہ کسی کے خیال میں آتے تھے نہ سننے میں، مولانا کی جو دو چار تصنیفات ہیں وہ بھی اسی شان کی ہیں۔

مولانا شیخ الہندؒ کا مدت سے ان کے ساتھ رہ کر ان سے استفادہ کرنا، اس بات کی دلیل تھی کہ وہ ان کی استعداد و صلاحیت دماغی کے معترف تھے، لہٰذا ان کی خواہش تھی کہ یہ ذہین طالب علم مجھ سے جو کچھ حاصل کرسکتا ہے کر لے۔ مولانا شیخ الہندؒ قدرتی طور پر طبع سلیم، ذہن رسا اور قوی حافظہ کے مالک تھے۔ یہ سب وجوہ مزید شفقت کا باعث تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مولانا نانوتوی اپنی بصیرت اور نورِ فراست سے سمجھ رہے تھے کہ یہ شخص اپنے زمانہ کا مجاہد پیکر اور ملت اسلامیہ کا مایۂ ناز فرزند ہو گا، لہٰذا اسکی جتنی بہتر سے بہتر تربیت ہوسکے کی جائے۔

مدرس دارالعلوم

مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۸۹ھ میں صحاح ستہ اور دیگر علوم وفنون کی اعلیٰ کتابیں مولانا کی خدمت میں ختم فرما کر بطور معین مدرس دارالعلوم میں پڑھانے لگے۔ ۱۹/ ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ میں مدرسہ کے جلسۂ دستار بندی اور اہل اسلام کے مجمع عام میں اس وقت کے اکابر شیوخ و علماء کی موجودگی میں مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی دستار بندی ہوئی۔ اگرچہ مولانا اپنی تعلیم کے آخری

سالوں ہی میں بطور معین مدرس کام کرنے لگ گئے تھے، اور فراغ و تحصیل تعلیم کے بعد باقاعدہ مدرسین کی فہرست میں شمار ہونے لگے تھے، تاہم ۱۲۹۲ھ میں طلبہ کی کثرت کی وجہ سے ایک مدرس چہارم جو تنخواہ دار ہو کی ضرورت محسوس فرمائی گئی۔ دوسرے کئی ایک ذہین و فطین دارالعلوم کے فارغ حضرات بھی موجود تھے اور اپنی تعلیم کے زمانہ میں وہ بعض حثیثیوں سے مولانا سے فائق نظر آتے تھے۔ لیکن اس زمانہ کے مقدس مہتمم اور سلسلۂ نقشبندیہ کے مشہور شیخ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ کی فراست صادقہ سے نظرِ انتخاب مولانا شیخ الہندؒ پر پڑی۔ اور مولانا کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ سے ذکر کیا۔ آپکے والد ماجد کو اللہ تعالیٰ نے وسعت اموال عطا فرمائی تھی اور یوں بھی نہایت غیور و شریف تھے، اس لئے ان کو گوارانہ ہوا کہ ان کا لڑکا مدرسہ میں معاوضہ لے کر کام کرے۔ لیکن دوسرے بزرگانِ مدرسہ کو اپنے بہت سے مصالح پیش نظر تھے۔ لہٰذا ان سب بزرگوں کے ادب کو ملحوظ رکھ کر خاموش رہے اور مولانا شیخ الہندؒ ۱۲۹۲ھ میں بمشاہرہ پندرہ روپے ماہوار مدرس چہارم مقرر ہوئے۔

مولانا اگرچہ چہارم کے مدرس تھے اور خود بھی فرمایا کرتے تھے، کہ "ابتدا میں قطبی اور قدوری پڑھا لینے کو بھی میں غنیمت سمجھتا تھا" لیکن طلبہ پہلے ہی سے آپ سے بڑی کتابیں پڑھ رہے تھے، اور اب رفتہ رفتہ آپ کی علمی استعداد اور خداداد ذہانت ظاہر ہونے لگی اور اوپر کی کتابیں بھی حسب موقعہ آپ کے زیر درس آنے لگیں۔ ۱۲۹۳ھ ہی میں آپ صحاح ستہ کی نہایت مشکل اور اہم کتاب ترمذی شریف، مشکوٰۃ شریف، اور ہدایہ وغیرہ جیسی نو کتابوں کے اسباق روزانہ بے تکلف پڑھایا کرتے تھے۔ ۱۲۹۵ھ میں تو صحاح ستہ کی دوسری کتب کے علاوہ سب سے بڑی اور افضل کتاب اور اصح الکتب بعد کتاب اللہ بخاری شریف بھی آپ نے پڑھائی۔

حج بیت اللہ

۱۲۹۴ھ میں بزرگانِ ہندوستان نے بیت اللہ کا قصد کیا اور اس قافلے میں حضرت مولانا محمد قاسمؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا رفیع الدینؒ مہتمم دارالعلوم، حضرت مولانا محمد یعقوبؒ اور دیگر بہت سے منتخب روزگار صلحاء و علماء شامل تھے۔ مولانا شیخ الہندؒ بھی زیارت حرمین شریفین نیز ان اکابر علماء کی معیت کو بڑی

سعادت سمجھتے ہوئے ساتھ شامل ہو گئے۔ ہندوستان سے ایسے نیک اور بلند پایہ علماء کا قافلہ حج کیلئے روانہ ہوا ہو، اس کی نظیر نہ سابق میں ملتی ہے اور نہ آئندہ امید ہے۔ جس اسٹیشن پر گاڑی رکتی شوق زیارت میں سینکڑوں بندگان خدا مصافحہ اور دست بوسی کیلئے موجود ہوتے۔

بمبئی میں بیس روز جہاز کا انتظار کرنا پڑا۔ پھر سب قافلہ جہاز میں سوار ہو کر تیرہ دن میں جدہ اور وہاں سے اونٹوں پر مکہ معظمہ پہنچ گیا۔ مرشدوں کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ ان دنوں مکہ معظمہ میں تھے، طواف زیارت کے بعد سارا قافلہ ان کی زیارت کو حاضر ہوا اور بعد فراغت حج مدینہ منورہ روانہ ہوئے اور بیس دن وہاں قیام فرمایا۔

شاہ عبدالغنی دہلوی سے اجازت حدیث اور حاجی امداد اللہ سے شرفِ بیعت

استاذ الاساتذہ شاہ عبدالغنی دہلوی مہاجر مدنی مدینہ منورہ میں تھے، سب حضرات ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جناب ممدوح بھی کمال شفقت اور گوناگوں عنایات فرماتے، اور باوجود انتہائی کم گوئی کے باخلاق وعنایات ہر ایک سے حسب درجات و مراتب گفتگو فرماتے۔ ہر عالم کو یہ خواہش ہوتی ہے کہ اگر کسی مشہور محدث یا استاذ حدیث سے ملاقات ہو تو اس سے اجازت لے لی جائے، اور پھر جن بزرگوں سے واسطے کم آتے ہوں ان سے اجازت لینے کو ہر کوئی سعادت سمجھتا ہے۔ مگر مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا استاد کا کمال ادب ملاحظہ کیجئے کہ مولانا نانوتویؒ کی موجودگی میں شاہ صاحب سے اجازت و سند حدیث لینا خلاف نیازمندی سمجھا۔ لیکن واپسی کے قریب جب حضرت استاذ ہی نے تحریک فرمائی تو حضرت شاہ صاحب نے بکمالِ بشاشت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو سند حدیث عطا فرمائی۔

مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ واپس آکر ایک ماہ قیام ہوا تو حضرت نانوتوی کی استدعاء خفیہ پر شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہؒ نے نہ صرف مولانا شیخ الہند کو شرف بیعت عطا فرمایا بلکہ خلافت واجازت بیعت سے بھی ممتاز کیا، اور بعد میں تحریری اجازت نامہ ہندوستان روانہ فرمایا۔

مراجعت وطن

بعض رفقاء کو مصارف کی دشواری ہونے لگی تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اشارہ پر

مجبوراً یہ مقدس قافلہ مراجعت فرمائے ہندوستان ہوا۔ جدہ پہنچ کر کلفت انتظار سے بچنے کے لئے جلد ایک ایسے جہاز میں سوار ہو گئے، جس میں مسافر کثیر اور جگہ تنگ تھی۔ باوجود باہمی مروّت وایثار کے سب کو نہایت دقت اور تکلیف پیش آئی، حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ کو مقامات مقدسہ اور اپنے بزرگوں کی جدائی کی کلفت اور خانۂ کعبہ کے ادب واحترام کی وجہ سے دور تک پا پیادہ چلنے کی تکلیف سے خاصی تکان تھی۔ جدہ اور مکہ معظمہ کے درمیان بدد (حدہ) پہنچ کر بخار ہو گیا۔ جہاز کی تنگی اور کشمکش سے اس پر مزید اضافہ ہوا، سوار ہونے کے تیسرے دن بعد صفراء کے دورہ سے بخار تیز ہو گیا۔ رفتہ رفتہ مرض اتنا بڑھ گیا کہ ساتھی مایوس ہو گئے، جہاز میں وبا بھی تھی۔ دو تین آدمی روزانہ فوت ہو جاتے تھے، اس سے اور زیادہ خطرہ تھا، نہ دوا تھی نہ علاج نہ جائے راحت نہ سکون۔ مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ نے خدمت گذاری میں دن رات ایک کر دیا، اور استاد کا خوب خوب حق خدمت ادا کیا۔ تمام رات بیدار رہتے، عدن پہنچے تو بھاگ دوڑ کر کہیں سے کونین، گلاب اور لیموں وغیرہ تلاش کر کے لائے، اور حضرت مولانا کو قدرے افاقہ ہونے پر قافلہ کی جان میں جان آئی، چودھویں روز جہاز بمبئی پہنچا، دو ایک روز وہاں قیام کر کے مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ اپنے استاد اور مربی و مرشد کو ان کے قصبہ نانوتہ میں پہنچا کر ربیع الاول ۱۲۹۵ھ میں دیوبند واپس آئے۔

شیخ الہند رحمۃ اللہ کی غیر حاضری میں تقریباً چھ ماہ مولانا عبد العلی رحمۃ اللہ ان کی جگہ کام کرتے رہے۔ واپسی پر آپ بدستور سابق درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت نانوتوی نے بھی دیوبند قیام فرما لیا۔ اس لئے استفادہ کمالات استاذ کے لئے شیخ الہند رحمۃ اللہ کی مشاغل علمیہ میں دلچسپی اور زیادہ ہو گئی۔ نو نو دس دس اسباق روزانہ پڑھاتے، اپنی مشہور کتاب "ایضاح الادلہ" تحریر فرماتے اور حضرت استاد کو سنا کر خوشنودی حاصل کرتے، اور شب کا بہت سا حصہ علاوہ کتب بینی کے عبادت و اوراد و وظائف میں گذارتے۔ انہی دنوں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ تحصیل علم کے لئے دیوبند تشریف لائے۔ اور منجملہ اور اسباق کے ملا حسن اور مختصر المعانی حضرت شیخ سے پڑھیں۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ اپنے ان مشاغل حسنہ میں جن کو وہ ذخیرۂ آخرت سمجھتے تھے، نہایت محویت کے ساتھ مشغول تھے کہ ناگاہ ۱۲۹۷ھ میں واقعۂ ہائلہ اور صدمۂ جانکاہ حضرت نانوتوی کی وفات کا پیش آیا۔ حضرت واپسی سفر حج میں مریض ہو کر صحت یاب ہو گئے تھے،

لیکن کھانسی کی شکایت رہ گئی تھی۔ اور کبھی کبھی تنفس کا دورہ ہو جاتا تھا۔ ۱۲۹۷ھ میں مرض میں زیادتی ہوگئی اور بہت ضعیف ہوگئے، پنج شنبہ ۴؍ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ کو انتقال فرماگئے۔ اس کے تیسرے دن بعد سہارنپور میں حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری نے بھی وفات پائی، اور صرف ایک دن کے فاصلہ سے دنیا اپنے وقت کے دو بہترین محدثوں سے خالی ہوگئی اور طبقہ صلحاء اور اہل علم پر غم پر غم اور صدمہ پر صدمہ پڑا، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

رحلتِ استاد کا اثر

مخدوم استاد کی وفات کے حادثہ نے حضرت شیخ الہندؒ کو بالکل پژمردہ کردیا، تعلیم و تعلم سے دل سرد ہوگیا، رنج وغم تو تھا ہی اس کے ساتھ یہ خیال بھی دل نشیں ہوگیا تھا، جس کو کبھی خود ہی اظہار فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے مشاغل علمی اور درس و تدریس صرف اس لئے تھے کہ کچھ استعداد اور قابلیت پیدا ہو جائے۔ اور حضرت کے مضامین وارشادات کو سمجھنے لگیں، اب کہ حضرت ہی رخصت ہوگئے، اس قیل و قال اور بے نتیجہ اشغال سے کیا فائدہ! فکر معاش نے ایسا ہی تنگ کیا تو گھاس کھود کر بسر کرلیں گے۔ چنانچہ آپ نے مدرسہ آنا بھی چھوڑ دیا، اور اپنے مکان میں گوشہ نشینی اختیار کرلی، حضرت اس عزم پر مضبوطی سے قائم تھے، مگر حق تعالی نے آپ کے ذریعہ سے احادیث نبویہ کی نشر واشاعت اور علوم دینیہ کی خدمت اور فیوض قاسمیہ کی افادیت مقدر فرمائی تھی، حضرت مولانا کا قدر شناس کون ہوسکتا ہے، لیکن حوادث و نوازل کے وقت اہل عزم وثبات خود بھی سنبھلتے ہیں اور دوسروں کو سنبھالتے ہیں، اور حق تعالی کے علم میں جو امر مقدر ہوتا ہے باوجود ظاہری نامساعدات کے اس کے لئے ایسے ہی اسباب پیدا کردیتا ہے۔

مہتمم صاحب نے ایک دو مرتبہ سمجھایا اور تیسری مرتبہ اپنے ساتھ مدرسہ لے آئے۔ گوشہ نشینی اور علوم اسلامیہ کی خدمت میں جو کچھ فرق ہے وہ حضرت بھی خوب سمجھے ہوئے تھے. مگر دوسری حالت کا غلبہ تفرید و تجرد کو ترجیح دیتا تھا۔ مولانا رفیع الدین صاحب قدس سرہ کے ارشاد نے الہام ربانی اور لطیفۂ غیبی کا کام کیا۔ بزرگوں کی عظمت اور ان کے اوامر کی قعت حضرت کے قلب میں ہمیشہ بدرجہ کامل رہی۔ مولانا ممدوح کے ارشاد کی تعمیل کی اور چشم گریاں درس جاری فرمایا۔

حضرت نانوتوی کے مخصوص تلامذہ میں سے دوسرے شاگرد مولانا احمد حسن امروہوی رحمۃ اللہ علیہ بھی ترکِ تدریس میں حضرت مولانا کے ہم خیال اور شریکِ حال تھے۔ ایک ماہ تک مغموم ومحزون اور شغل تعلیم سے کنارہ کش رہے، لیکن اہل دیو بند کے اصرار خصوصاً حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد سے مجبور ہو کر بدستور سابق مراد آباد کی مسجد شاہی کے مدرسہ کی مدرسی میں مشغول ہو گئے۔

ربیع الاول ۱۳۰۲ھ میں دار العلوم کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس اول کی وفات کا سخت صدمہ پیش آیا۔ مولانا ممدوح خود بھی ایک نمونۂ سلف، جامع العلوم، جامع شریعت وطریقت بزرگ تھے۔ اور حضرت نانوتوی کے ہم عصر اور جانشین سمجھے جاتے تھے، مدرسہ کے سرپرست اگر چہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ قرار پائے تھے، مگر چونکہ آپ کا قیام اپنے وطن گنگوہ میں تھا اس لئے ہر وقت ہر معاملہ میں شریکِ حال نہ رہ سکتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات سے کلی وجزوی ہر قسم کے امور میں نہایت قوی اعانت پہنچتی تھی، اور ہر قسم کے فیوض وبرکات سے دار العلوم متمتع ہوتا رہتا تھا، اور یہ کہ تمام علماء عصر مولانا کے والد ماجد مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خوشہ چیں اور شاگرد تھے، ایسے قوی الاثر جامع الصفات عالم کے سایہ سے محروم ہو جانا دار العلوم کے لئے کوئی معمولی صدمہ نہ تھا، لیکن سوائے صبر وتسلیم چارہ کار کچھ نہ تھا۔

اس حادثہ کے بعد مولانا سید احمد صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو فنون ریاضیہ میں خصوصیت کے ساتھ امام کہلانے کے مستحق تھے، بمشاہرہ چالیس روپے مدرس اول مقرر ہوئے۔ مولانا ملا محمود صاحب دیو بندی پینتیس روپے پر مدرس دوم اور حضرت مولانا تیس روپے مشاہرہ پر مدرس سوم اور مولانا عبد العلی صاحب مدرس چہارم۔

اس تغیر سے تقریباً دو ہی سال کے بعد دار العلوم کے سب سے قدیم اور بافیض عالم ملا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہو گئی، اور حضرت مولانا انہی کے مشاہرہ پر مدرس دوم ہو گئے۔ ترقیٔ مدارج اور اضافۂ مشاہرہ سے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے کارِ تعلیم پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا، حضرت بخلوص وللّٰہیت تمام علوم کی کتابیں پڑھا رہے تھے، اور طلبہ نہایت شوق اور گرویدگی کے ساتھ دن رات میں جب بھی موقع ملتا تھا، حضرت کے فیوض حاصل کرتے رہتے تھے۔

دارالعلوم کے صدر مدرس

۱۳۰۵ھ میں مولانا سید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس اول اپنی ضروریات کے خیال اور بعض مصالح سے بڑی تنخواہ پر بھوپال تشریف لے گئے، تعلیم تو حضرت پہلے ہی سے بڑی جماعتوں کو دے رہے تھے، اور جیسا کہ سابق میں گذرا اب سے بارہ سال پہلے ۱۲۹۲ھ و ۱۲۹۵ھ سے کتب صحاح و بخاری شریف و دیگر علوم کی انتہائی درسیات پڑھا رہے تھے۔ اب آپ مولانا سید احمد صاحب کے مشاہرہ پر باتفاق آراء اکابر و اصاغر مدرس اول نامزد ہوئے، اس وقت سے آخر عمر یعنی ۱۳۳۹ھ تک چونتیس سال حضرت مولانا صدر مدرس رہے، اور آپ کی ذات بابرکات سے مدرسہ کو جو ترقی ہوئی وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ مولانا کو کبھی ترتیب درجات اور مقدار مشاہرات پر نظر نہیں ہوئی، اور جیسا کہ ان کے طرز عمل سے ظاہر ہے وہ ہمیشہ دارالعلوم کی خدمت کو خدائے تعالیٰ کا کام اور دینی فرض سمجھ کر بجالاتے رہے۔ مشاہرہ قبول فرماتے تھے، مگر بضرورت و کراہت، اگر آپ متاع دنیا کی طلب فرماتے تو بہت مواقع ایسے تھے کہ لوگ حضرت کو سر آنکھوں پر بٹھاتے اور صالح روپیہ مشاہروں اور نذرانوں کی صورت میں پیش کرتے، لیکن آپ نے باوجود ذاتی ضرورتوں کے ہمیشہ اپنے استاد (قدس سرہ) کے لگائے ہوئے باغ دارالعلوم دیوبند کی سرسبزی و شادابی کو مطمح نظر بنائے رکھا، اور اسی دینی خدمت میں عمر تمام کر دی۔ دارالعلوم کے مخالفوں نے بدنیتی سے موقع بہ موقع دل میں رنجش ڈال کر علیحدگی پر آمادہ کرنا چاہا، مگر ناکام رہے، پیر جی عبدالرزاق صاحب گنگوہی مہتمم مدارس اسلامیہ دہلی نے محبت اور حسن نیت سے کوئی تحریک کا موقعہ نہ چھوڑا مگر دل میں حسرت ہی لئے دنیا سے رخصت ہو گئے کہ حضرت دہلی قیام فرما کر فیوض جاری فرمائیں۔ اور بجا طور پر الامام المحدث شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خاندان کی نیابت کا حق دہلی میں رہ کر ادا فرمائیں۔

استقامت، استقلال اور محنت وریاضت

۱۳۱۲ھ میں جب بوجہ گرانی دیگر مدرسین کے مشاہروں میں اضافہ ہوا تو بحکم حضرت گنگوہی قدس سرہ آپ کا مشاہرہ پچاس روپے ہو گیا۔ آپ نے خاموشی سے قبول فرمالیا۔ دو مرتبہ استاد شفیق حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں ”محمود حسن ....

کب تک مدرسہ سے مشاہرہ لیتے رہو گے"...... دونوں مرتبہ پورا عزم مشاہرہ چھوڑ دینے کا فرمایا، لیکن حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ادب سے مجبور تھے، اجازت نہ دی بلکہ ہنس کر فرمایا، کہ "نہیں ان کو کہنے دو، ہرگز نہ چھوڑو"...... مگر جب حضرت مولانا ممدوح کی وفات ہوگئی، اور ماتحت مدرسین کے اضافہ کے ساتھ آپ کے پچھتر روپے مقرر ہوئے، تو آپ نے اضافہ بالکل قبول ہی نہ فرمایا، اور کچھ عرصہ کے بعد مشاہرہ بالکل بند کردیا، پھر بھی اسی پابندی اور دلسوزی سے درس دیتے رہے۔

حضرات منتظمین کی جان فشانی اور تدابیر حسنہ اور مدافعت اعداء کو بھول جانا کفران نعمت ہے۔ اور مناسب مواقع پر اس کا مفصل اظہار واجب ولازم ہے،مگر اس میں بھی شک نہیں کہ حضرت مولانا کی معنوی برکت کے ساتھ ظاہری مستعدی وتندہی اور دل سوزی نے بھی مدرسہ کے لئے باران رحمت کا کام کیا، اور مدرسہ دیوبند کو ایک عظیم الشان دار العلوم کی حیثیت تک پہنچادیا۔ صبح کی نماز ادا فرماکر درس کے لئے آجاتے۔ کبھی پیشاب یا وضو کے لئے درمیان میں اٹھتے تو مضائقہ نہیں ورنہ متصل اور مسلسل درس دیتے ہوئے گیارہ بارہ بج جاتے تھے۔ اور ظہر کے بعد یہی مشغلہ موجود تھا...... عشاء کے بعد بہت دیر تک کتب بینی کرنا اور پھر کچھ دیر آرام کر کے اپنے مولیٰ کی عبادت اور بطرز مسنون ادائے تہجد میں مشغول ہونا اور بعد تہجد کے طلبہ کی ایک جماعت کو سبق پڑھانا اور نماز فجر کے بعد سے عصر تک تعلیم میں مصروف رہنا آپ کا ہمیشہ معمول رہا۔

حضرت نے ۱۲۸۹ھ سے بحیثیت معین المدرسین دار العلوم میں کار تعلیم شروع فرمایا تھا۔ اور ۱۲۹۲ھ میں آپ باقاعدہ مدرس ہوگئے تھے، اس لحاظ سے چوالیس سال کامل خدمت تعلیم میں بسر فرمائے، اور ۱۲۹۵ھ سے ۱۳۲۳ھ تک تواڑتیس سال کامل علی الاتصال حضرت نے علم دین کی اشاعت فرمائی۔ اس درمیان میں حضرت نے سوائے معمولی چند روزہ سفروں کے نہ کوئی طویل سفر فرمایا نہ اور کوئی ایسا شغل پیش آیا، نہ کوئی مرض لاحق ہوا جس سے کارِ تعلیم میں دو چار ماہ کا طویل حرج واقع ہوتا۔ یہ نصف صدی (تقریباً) کا زمانہ کچھ کم نہیں ہے ہندوستان میں کیا، ان آخری قرنوں میں دنیا میں ایسے بہت کم علماء شمار ہو سکتے ہیں، جنہوں نے اس قدر طویل زمانہ افادۂ تلامذہ اور علوم اسلامیہ کی خدمات میں گذارا ہو۔

حضرت سے چونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ علمی کام لینا تھا۔ اس لئے ظاہری مختصر قد وقامت اور

ضعیف بدن کے ساتھ اندرونی قوئ نہایت مضبوط بنائے تھے، باوجود خدمت تعلیم میں اس قدر محنت کرنے کے اور باوصف شب بیداری اور کثرت ذکر اللہ کے نہ ضعفِ دماغ کی شکایت رہتی تھی نہ ضعفِ بصر کا فعل، نہ دواؤں کے محتاج تھے نہ مقویات کے خواہاں معمولی سادہ غذا استعمال فرماتے تھے اور وہ بھی بہت قلیل۔

اس عرصہ میں تمام ہندوستان میں آپ کے علوم وکمال خصوصاً فن حدیث کے تبحر اور مہارت کی دنیا میں شہرت ہوگئی تھی، اور جا بجا آپ کے فیوض پھیل گئے تھے، ہر نواح میں آپ کے شاگرد یا شاگردوں سے فیض یافتہ عالم باعث اشاعت علوم و موجب ہدایت خلق اللہ بن گئے۔ دارالعلوم میں دو قدیم بزرگوں کے سوا تمام مدرس آپ کے شاگرد اور فیض یافتہ ہیں اور ہندوستان کی کوئی قابل اعتماد علمی درسگاہ ایسی نظر نہیں آتی جہاں آپ کے بلاواسطہ یا بالواسطہ شاگرد مسند درس پر متمکن نہ ہوں۔

کابل، قندھار، بلخ، بخارا، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور یمن تک کے لوگ آپ کے علوم وفیوض سے مالامال ہوکر گئے۔ مولانا محمد اسحاق امرتسری ایک باخدا عالم نمونہ اتقیائے سلف نے مدینہ منورہ جاکر درس جاری فرمایا۔ ان کی وفات کو زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ مولانا صدیق احمد صاحب اسی مقدس دارالہجرت میں مخصوص طور سے اپنے مکان اور مسجد نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں اشاعت علم کرنے لگے، اور ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا حلقۂ درس خاص مسجد نبوی میں سیدالعرب والعجم کے روضۂ منورہ و مطہرہ کے سامنے ایسی عظمت و برکت سے جاری ہوا کہ بڑے بڑے کامل الفن اساتذہ کے حلقے مختصر رہ گئے، اور شرفائے مدینۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اولاد مولانا موصوف کی خدمت میں زانوئے ادب طے کرنے لگی۔ ذلك فضل الله يوتيه من يشاء. حضرت نے تمام عمر چٹائی پر بیٹھ کر درس دیا۔ اخیر میں مرض بواسیر کا عارضہ ہوا تو بعض مخلصین نے کمانی دار گدہ بنوا کر رکھ دیا تھا، اس پر بضرورت بیٹھتے تھے مگر کسی قدر گرانی و کراہت محسوس کر کے۔

تبحر علمی اور طریق درس

حضرت موصوف تفسیر، حدیث، اصول فقہ، منطق، معانی کی کتب محنت اور شوق سے بے تکلف پڑھاتے تھے، اور ابتداء میں تو بہت ہی زیادہ مشغولیت و مشقت برداشت فرماتے

تھے، مگر آخر میں بھی ۱۳۲۰ھ تک پانچ چھ گھنٹہ روزانہ درس دیتے تھے، اس زمانہ کے بعد کچھ ضعف و امراض کے اور نیز اس لئے کہ حضرت کے ممتاز تلامذہ علامہ انور شاہ محدث کشمیریؒ۔ مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ میں موجود تھے، آپ حسب ضرورت روزانہ دو یا تین گھنٹے درس دیتے تھے، اور ترمذی شریف و بخاری شریف تقریبا ساڑھے نو ماہ میں بہ طمانیت تمام کرا دیتے تھے۔

حضرت کا حلقۂ درس نہایت مہذب اور شائستہ ہوتا تھا، دوسرے مدارس کے فراغ یافتہ اور بڑے بڑے ذہین طالب علم نہایت مؤدب طریق سے حاضر خدمت رہتے اور حضرت کمال عظمت و وقار سے درس دیتے اوپر اوپر کی فضول باتوں کا ذکر تک نہ تھا۔ دوسروں کی تحقیر اپنی تعریف کا نام و نشان نہ تھا۔ ہنسی مذاق اور تفریح طبع کے جملے یا ذاتی حالات کا بیان بالکل مفقود، خطاب بالکل عام ہوتا تھا۔ کسی کی خصوصیت نہ تھی، کم سواد طالب قرأت کرنے سے خود ڈرتے تھے، اور بے موقع سوال کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے، مستعد طالب علم بار بار اور طرح طرح سے اپنے شکوک و شبہات پیش کرتے تھے۔ اس طرح کہ حلقۂ درس بالکل مجلس مناظرہ بن جاتی تھی۔ کبھی حضرت کے الزامی جواب طالب علم کو ساکت کر دیتے تھے، اور کبھی جامع مانع تقریر شفاء لمافی الصدور کا کام دیتی تھی۔ الزامی جواب میں ملکہ تام تھا، دو چار دفعہ اسی طرح ٹالتے رہتے۔ بہت رد و بدل کے بعد تحقیق شروع فرماتے اور اس خوبی اور قوت استدلال سے تقریر فرماتے کہ سائل کو شرح صدر ہو جاتا۔

بہت سے ذی استعداد ذہین و فطین طالب علم جو مختلف اساتذہ کی استعداد سے استفادہ کرنے کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اپنے شکوک و شبہات کے کافی شافی جواب پانے کے بعد حضرت مولانا کی زبان سے آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے معانی و مضامین عالیہ سن کر سر نیاز خم کر کے معترف ہوتے کہ یہ علم کسبی نہیں ہے اور ایسا محقق عالم دنیا میں نہیں ہے۔

حلقۂ درس دیکھ کر سلف صالحین واکابر محدثین کے حلقۂ حدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا۔ قرآن و حدیث حضرت کو ازبر تھے اور ائمہ اربعہ کے مذاہب زبان پر اور صحابہ و تابعین، فقہاء، مجتہدین کے اقوال محفوظ، تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتی تھیں، نہ منہ میں کف آتا تھا، نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو ادق اور بھدی بناتے تھے، نہایت سہل اور سلیس

الفاظ میں بامحاورہ اردو میں اس روانی اور تسلسل سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا تھا دریا امنڈ رہا ہے، یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے اب بھی کئی دیکھنے والے موجود ہوں گے کہ وہی منحنی جسم اور منکسر المزاج ایک مشت استخوان ضعیف الجثہ مرد خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا، اور بارہا مسجد کے فرش پر بلا کسی بستر کے لیٹا ہوا نظر آتا تھا، مسند درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر خدا ہے جو قوت وشوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے۔ آواز میں کرختگی آمیز بلندی نہ تھی، لیکن سننے والے جانتے ہیں کہ جب صدر درسگاہ "نودرہ" میں تقریر فرماتے تو (باوجود درجہ قرآن مجید و مکتب فارسی کے بچوں کی بلند آواز کے) مدرسہ کے دروازہ تک بے تکلف قابل فہم آواز آتی تھی۔

لہجہ میں تصنع اور بناوٹ نام کو نہ تھی، چہرہ بنالینا یا آنسو بھرلانا حضرت کا کام نہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے تقریر میں اثر دیا تھا۔ بات دلنشین ہو جاتی تھی اور سننے والا یہی سمجھ کر اٹھتا تھا کہ جو فرمارہے ہیں حق ہے۔ اس لئے بہت سے لوگ جو دور ہی دور سے دشمنوں کے افتراء کئے ہوئے عقائد فاسدہ سن کر بدعقیدہ ہو جاتے تھے اپنی اولاد و عزیزوں کے دیوبند آکر تحصیل علم کرنے میں اس لئے مانع نہیں ہوتے تھے کہ یہ بھی اسی رنگ میں رنگے جائیں گے۔

استاد رحمتہ اللہ علیہ کے حقائق ودقائق نقل فرماتے اور اپنی تحقیقات عجیبہ اور مضامین عالیہ سناتے، مگر مفسرین ومحدثین شراح و مصنفین کا ادب اس درجہ ملحوظ رکھتے تھے کہ کہیں شائبہ تنقیص بھی نہ آنے پاتا۔

مسائل مختلف فیہا میں ائمہ ثلثہ رحمہم اللہ بلکہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے اور مختصر طور سے دلائل بھی نقل کرتے، لیکن جب امام ابوحنیفہؒ کا نمبر آتا تو مولانا کے قلب میں انشراح، چہرہ پر بشاشت، تقریر میں روانی لہجہ میں جوش پیدا ہو جاتا، دلیل پر دلیل، شاہد پر شاہد، قرینہ پر قرینہ بیان کرتے چلے جاتے تقریر رکتی ہی نہ تھی۔ اور اس خوبی سے مذہب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو ترجیح دیتے تھے، کہ سلیم الطبع اور منصف المزاج لوٹ جاتے تھے، دور دور کی مختلف المضامین احادیث جن کی طرف کبھی خیال بھی نہ جاتا تھا، پیش کر کے اس طرح مدعا بیان ثابت فرماتے کہ بات دل میں اتر جاتی تھی اور سامعین کا دل گواہی دیتا اور آنکھوں سے نظر آجاتا تھا کہ یہی جانب حق ہے۔

بایں ہمہ ائمہ اسلام کا ادب واحترام اور ان کے کمالات کا اعتراف حضرت کی تعلیم کا ایک

جزو لاینفک ہوگیا تھا، خود بھی ایسی ہی تقریر فرماتے اور صراحت سے ذہن نشین کراتے کہ مذاہب مجتہدین حق ہیں اور سب مستدل بالکتاب والسنۃ ان کی تنقیص موجب بدبختی ہے اور "سوءِ ادب باعثِ خسران" بے شک حضرت رحمتہ اللہ علیہ من عمل بما یعلم اتاہ اللہ علم مالم یعلم کے مصداق اور اس شعر کے محمل تھے:۔

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

اس کے ساتھ ہی آپ نے نہایت محنت شاقہ اٹھا کر اور بقول کسے دودِ چراغ کھا کر کتب بینی اور مطالعہ کا نہایت زیادہ اہتمام فرمایا تھا۔ خصوصاً شروح احادیث بکمال غور و فہم مطالعہ فرمائی اور بعض کو کئی مرتبہ دیکھنے کی نوبت آئی۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ ذرا "عینی" اٹھا لاؤ احقر (حضرت سید میاں صاحبؒ) نے عرض کیا کہ حضرت بخاری کی شرح یا ہدایہ کی، فرمایا اس کو کئی مرتبہ دیکھ چکا، ہدایہ کی شرح لے آؤ۔

لیکن حضرت صرف شراح کی تعلیم کے احاطہ میں محصور نہ تھے بلکہ وہ مضامین عجیب انہیں شروح وحواشی کے مطالعہ سے آپ کے ذہن مصفی میں آتے تھے جو دید تھے نہ شنید، حضرت نے شروح احادیث کا عطر نکال کر رکھ دیا ہے، اور ہمارے فقہاء و شراح کے مجمل دلائل کو اس شرح وبسط سے بیان کیا ہے کہ باید وشاید محدثین میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ائمہ مجتہدین میں سے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خاص تعلق تھا۔

امام بخاری کے علوم اللہ تعالیٰ نے آپ پر کھول دئے تھے یہاں تک کہ نظر بندی مالٹا کی یکسوئی میں آپ نے خود بخود اس داعیۂ الٰہی سے مجبور ہوکر تراجم بخاری کے متعلق تحریرات لکھنی شروع فرمائی تھیں، بخاری کے متعلق کوئی شخص سوال کرتا تو خوش ہو جاتے اور بیان فرمانا شروع کردیتے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کے خطبہ میں امام بخاری پر تعریض کر کے جو گرفت کی ہے۔ اس پر فرمایا کرتے تھے کہ جب ملاقات ہوئی تو بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے خادم و عقیدت مند ہوگئے، کاش اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات ہو جاتی تو امام بخاری اپنے تمام اعتراضات واپس لے لیتے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے لئے حق تعالیٰ نے حضرت کو شرح صدر کردیا تھا، اسی کا اثر طلبہ پر تھا بمقتضائے آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔ وہ دقیق فرق وہ لطائف و رموز سناتے

کہ طالب علم بے ساختہ سبحان اللہ کہہ اٹھتے۔ اگر امام صاحب کے مناقب بیان فرمانے لگتے تو ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا بیان فرماتے چلے جاتے تھے سلسلۂ کلام ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ مالٹا سے واپسی کے بعد ایک روز حسبِ عادت عصر کی نماز پڑھ کر بیٹھے تھے مجمع تھا امام صاحب کا ذکر آ گیا پھر کیا تھا لطائف ودقائق، حالات وواقعات بیان ہونے لگے اور جب تک مغرب کی اذان نہ ہوگئی سلسلہ ختم ہی نہ ہوا۔ حضرت مولانا کا طرز تحدیث اور جمع بین الاقوال والاحادیث وہی تھا جو ہندوستان کے نامی گرامی علمی خاندان حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبد العزیز قدس سرہ کا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے اقوال کو نہایت اعتبار واعتقاد کے ساتھ نقل فرماتے اور نہایت ادب سے نام لیتے۔ آپ کی سند حدیث کا سلسلہ حضرت شاہ صاحب ہی پر منتہی ہوتا ہے۔ آپ کے کمال تبحر پر نظر فرما کر اگرچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبد الرحمٰن پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے بقاعدۂ محدثین آپ کو اجازت حدیث عطا فرمائی تھی۔ لیکن درس وتدریس اور قرأت وتحدیث کے لحاظ سے آپ کی سند حدیث دو طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تک اور ان کے اساتذہ کرام کے ذریعے محدثین ومؤلفین کتب احادیث اور جناب سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔

اول: عن مولانا الشیخ محمد قاسم عن مولانا شیخ عبدالغنی، عن مولانا الشاہ محمد اسحق، عن مولانا شاہ عبدالعزیز، عن مولاناالشاہ ولی اللّٰہ رحمۃ اللّٰہ علیہم اجمعین۔

ثانی: عن مولاناالشیخ احمدعلی السھارنفوری، عن مولانا الشاہ محمد اسحاق، عن مولانا شاہ عبدالعزیز، عن مولانا الشاہ ولی اللّٰہ قدس اللّٰہ اسرارھم۔

حضرت مولانا کے بلاواسطہ فارغ التحصیل وعالم شاگرد چالیس سال میں کم درجہ اوسط پچیس سالانہ رکھنے کے بعد ایک ہزار ہوتے ہیں اور معمولی شاگردوں اور بعض کتب پڑھ کر چلے جانے والوں اور بالواسطہ شاگردوں کی تو کچھ انتہا ہی نہیں۔

دار العلوم دیوبند کے بانیوں اور سرپرست حضرات اور منتظمین میں چونکہ خلوص اور تقدس بدرجہ کمال موجود تھا، اس لئے دار العلوم ابتدا ہی سے روز افزوں ترقی کے مدارج طے کر رہا تھا، اور ان کی ظاہری وباطنی توجہ کے آثار وبرکات اس میں جلوہ نما ہو رہے تھے، اور اسی کا

نتیجہ اس کو بھی سمجھنا چاہئے کہ دیگر اکابر کے بعد حضرت مولانا اس کی صدر مدرسی کے لئے تجویز کئے گئے۔ پھر آپ کی علمیت وشہرت وعظمت اور شب وروز محنت اور ایثار وخلوص اور باطنی ہمت کی وجہ سے جو شہرت وعظمت دار العلوم کو حاصل ہوئی وہ محتاج بیان نہیں ہے اور گویا آپ ہی کے فیوض نے اس کو بجا طور پر دار العلوم کا لقب دلوایا ہے۔ اس کے منتظمین نے جب بڑے بڑے خطرناک فتنوں میں سے اس کو سلامت بچا کر نکالا اور شدید طوفانوں میں سے اسے ساحل نجات پر لگایا تو مولانا ان کے پشت پناہ تھے اور جب اپنی حسن سعی سے اس کو مدارج ترقی پر پہنچایا تو حضرت ان کے دست راست تھے۔

حضرت کو دار العلوم سے اس قدر گہرا تعلق رہا ہے کہ شاید ہی کسی کو نصیب ہو، حضرت کے والد ماجد اس کے ابتدائی بانیوں اور اولین سرپرست ممبروں میں تھے۔ حضرت کبھی اس کے سابقین بہترین طلبہ میں تھے۔ کبھی معین کہلاتے تھے، کبھی مدرس سوم وچہارم نظر آتے تھے، کبھی مدرس دوم سے صدر مدرسی کی مسند پر ممتاز دکھلائی دیتے تھے، اور اسی کے ساتھ ساتھ کبھی ممبر شوریٰ اور کبھی اعلیٰ سرپرست تسلیم کئے جاتے تھے۔ ہر حادث کی انتہا ہے اور ہر شئے کو فنا، افسوس ہے کہ اس کے بعد حضرت کے روحانی سرپرست ہونے کا نمبر آیا تو رخصت کا وقت بھی قریب آ پہنچا، یعنی آپ دار العلوم کی مسلسل پینتالیس سال تک خدمت کرتے ہوئے ملک وملت کی آزادی کی خاطر جب کمر ہمت باندھ کر میدان میں نکلے تو پھر دار العلوم سے رخصت ہونے کا وقت آ گیا جس کی تفصیل آئندہ آتی ہے۔

شیخ الہندؒ کی سیاسی خدمات

آئندہ مضمون حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی خود نوشت سوانح نقش حیات ج ۲، سے ماخوذ ہے۔ ہم نے بعض جگہ مضمون کو مختصر کر دیا ہے (ارشد)

تحریک انقلاب عُرف ریشمی خطوط کی سازش

ہندوستان جب کہ سولہویں اور سترہویں صدی میں آسمانِ سیاست پر آفتاب درخشاں بن کر چمک رہا تھا اسی زمانہ میں سامانِ کسوف بنکر منحوس یورپین قومیں پہلے پر تگیز پھر ان کی دیکھا دیکھی انگریز، فرنچ، ڈچ، جرمن وغیرہ ہندوستان آئیں۔ یہاں کے بادشاہوں اور حکام

نے مہمان نوازی کے فرائض حسب عادت سلاطین ہند انجام دیئے۔ ان کو نہ صرف داخلہ کی اجازت دی بلکہ سکونت، تجارت اور حقوق شہریت وغیرہ بلا رکاوٹ دیئے گئے۔ انگریز بھی مثل دیگر اقوام اس خوان نعمت سے فیض یاب ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سے انگریز تاجر اطراف وجوانب ہند میں پھیل گئے، ان کو اپنے یورپین ہم وطن اقوام سے رقیبانہ کشمکشیں بھی پیش آئیں۔ بالآخر ۱۷۰۰ء میں ان کے تقریباً ایک سو تاجروں کی منظم جماعت بنام ایسٹ انڈیا کمپنی بن گئی۔ جس نے تجارتی کاروبار اجتماعی قوت سے جاری کیا، اور غدارانہ بلکہ ظالمانہ طریقہ سے بہت زیادہ کمایا۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ان کی نیتیں فاسد اور ارادے نہایت خباثت آمیز ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ۱۷۵۷ء میں نواب سراج الدولہ آف بنگال پر حملہ کر دیا، اور اس کے ارکین دولت میں سے میر جعفر اور امی چند دو وزیروں کو توڑ لینے میں کامیاب ہو کر ملک گیری اور حکومت شروع کر دی۔ یہ چسکا ان کو ایسا لگا کہ ہر وقت اور ہر آن یہی دھن لگی رہتی تھی بالآخر ۱۸۰۳ء تک تقریباً اکثر ہندوستان میں ان کا مکمل اثر اور پورا اقتدار قائم ہو گیا اور اس قدر جرأت ہوگئی کہ بادشاہ دہلی سے جبراً اپنی حکومت پر دستخط کرا کر ملک میں اعلان کرادیا کہ ...... "خلقت خدا کی ملک بادشاہ کا حکومت کمپنی بہادر کی" ان حالات کو علماء اسلام دیکھتے تھے اور دل ہی دل میں کڑھتے رہتے تھے آخر کار حکام سلطنت کی غفلت، بے پرواہی، بے وفائی، بزدلی، اربابِ اقتدار کے آس پاس کے نفاق کے مظاہروں وغیرہ نے مجبور کیا کہ عام مسلمانوں کو متنبہ کیا جائے۔ (اس سے قبل شاہ ولی اللہ دہلوی اپنے مخصوص انداز میں کتابی صورت میں تحریروں کے ذریعہ حکام وارباب اقتدار کو طرح طرح سے انتباہ کر چکے تھے، لیکن یہ لوگ ٹس سے مس نہ ہوئے) چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین وفرزند حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے آزادی کے متعلق فتویٰ دے دیا اور عام مسلمانوں کو ہندوستان کے آزاد کرانے کے فریضہ کو سمجھایا۔ اس وقت سے مسلمانوں اور خصوصاً اہل علم میں یہ تحریکِ انقلاب شروع ہوئی، اور تقریباً بیس برس کے عرصہ میں تمام ہندوستان میں شعلۂ جوالہ بن کر یہ تحریک پھیل گئی، اور ایک مکمل نظام اور مکمل قوت شروع ہوگئی۔ ۱۸۲۴ء میں مغربی سرحد (سابقہ صوبہ سرحد) میں پہنچ کر اس کی عملی کارروائی جاری ہوگئی جس کی امارت وقیادت حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہما نے کی (اس کی تفصیل دیکھنے کے لئے مولانا غلام رسول مہر کی تصنیف سیرت شہید اور

مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی تصنیف "سیرۃ سید احمد شہید" ملاحظہ فرمائی جائے، جن میں اس تحریک کے متعلق سیر حاصل تفصیل پیش کی گئی ہیں) چھ برس تک کامیابیوں کے ساتھ یہ کاروائی جاری رہی مگر انگریزی چالبازیوں اور آپس کے نفاق اور غداریوں کی وجہ سے ۱۸۳۰ء میں شکست ہوئی اور تحریک تقریباً فیل ہو گئی۔ انگریزوں نے شر کا ء تحریک پر عرصہ دراز تک انتہائی آزار اور انتقامی تکلیف کے اعمال جاری رکھے اور ملک میں ہندوستانیوں کی عام لوٹ کھسوٹ اور ایذا دہی میں وہ انسانیت سوز حرکتیں کیں، جن کی وجہ سے انگریزوں سے ملک بھر میں عام ناراضگی پھیل گئی۔ اور ۱۸۵۷ء کا مشترک واقعہ پیش آیا جس میں ہندو اور مسلمان آپس میں مل کر ہندوستان کی آزادی کے لئے سربکف ہو گئے تھے۔ بدقسمتی اور خائنوں کی بدعملی کی وجہ اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ ہندو اور مسلمان سب ہی برباد کئے گئے، مگر مسلمانوں پر بربادی اور مظالم بہت زیادہ ڈھائے گئے اور ہر قسم کے انتہائی مصائب سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ شدتِ مظالم اور انگریزوں کی فوجی اور اسلحۂ جدیدہ کی بے پناہ طاقت کی نمائش کی بناء پر ہندوستانیوں میں جنگ کے ذریعہ انقلاب برپا کرنے کی ہمت نہ رہی، خوف وہراس کا دور دورہ ہو گیا، اور مظالم شنیعہ کا اندھیرا بہ نسبت سابق کئی گنا زائد پھیلا دیا گیا۔

بالآخر تنگ ہو کر آئینی انقلاب کی تحریک ۱۸۸۵ء میں بصورت کانگریس جاری کی گئی، اس کی رفتار بہت دھیمی تھی اور بالمقابل انگریز ہر قسم کے توڑ کی کاروائی کر رہا تھا تا آنکہ بنگال کی تقسیم کی نوبت آ گئی۔ لارڈ کرزن نے بنگال میں چاروں طرف افتراق کا جال پھیلا دیا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو لڑا کر حکومت برطانیہ نے اپنا مقصد خوب حاصل کیا، مگر پھر مجبور ہو کر دربار کے موقع پر تقسیم کے منسوخ کر دینے کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۰۰ء میں یوپی میں ناگری کا اور اس کے بعد کانپور میں مسجد کا اور کلکتہ میں توہین جناب سردارِ دو عالم ﷺ اور پھر فائرنگ کا فتنہ برپا کر دیا۔ ادھر ترکی جو عرصہ دراز سے مسلمانوں کا قبلہ توجہ اور خلیفہ دینی چلا آتا تھا اس کے ساتھ مظالم اور دردناک ناانصافیوں خصوصاً جنگ طرابلس اور بلقان اور تقسیم ممالک اسلامیہ کے ایسے واقعات لگاتار پیش آئے جنہوں نے تمام ملک میں عموماً اور مسلمانوں کے قلوب میں خصوصاً بے چینی پیدا کر دی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ العزیز جن کی گہری نظر واقعات عالم اور بالخصوص ہندوستان اور ترکی پر زیادہ مرکوز رہتی تھی، ان واقعات سے اس قدر متاثر ہو گئے کہ ان کے لئے آرام وچین تقریباً حرام ہو گیا۔ تاریخ دانی

اور گزشتہ واقعات ہند و ممالک اسلامیہ ایشیاء وافریقہ اور یورپ وغیرہ پر غائرانہ نظر نے ان کو مجبور کر دیا کہ وہ مذکورہ بالا حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان عمل میں نہ صرف خود نکلیں بلکہ ہندوستان کے ذی اثر علماء و قائدین کے ساتھ مل کر ایک ایسی تحریک چلائیں، جس سے انگریز قوم کے منحوس قدم ہندوستان سے نکل جائیں تا کہ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ ممالک اسلامیہ وافریقہ وغیرہ سے بھی اس کا اقتدار ختم ہوئے۔

حضرت شیخ الہند ﷫ کی مختصر تاریخ میں ہم ذکر کر کے آئے ہیں کہ مولانا مرحوم کو تعلیم و تربیت کا شرف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور مرشدوں کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمہم اللہ اجمعین سے حاصل تھا۔ سالہا سال ان کی خدمت عالیہ میں انتہائی اخلاص اور شغف بلکہ عاشقانہ جذبات کے ساتھ رہنا ہوا تھا۔ اور ان حضرات کی وہ کامل ہستیاں تھیں، جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں علم آزادی بلند کر کے شاملی، تھانہ بھون وغیرہ پر سے انگریزی اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ان کے سینوں میں ہمیشہ آزادی اور جہاد کی مبارک آگ سلگتی رہتی تھی۔ اس لئے حضرت شیخ الہند ﷫ کے دل میں انگریزی اقتدار کے فنا کر دینے کا جذبہ مستقل طور پر ہونا طبعی ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں چونکہ حضرت رحمتہ اللہ علیہ کو قدرت کی فیاضیوں سے ایسا قلب عطا ہوا تھا، جس میں انسانی غیرت، اخلاص اور للّٰہیت، وطن اور قومی حمیت، اسلامی ہمدردی وغیرہ کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی۔ دماغ ایسا قوی الحافظہ عطا کیا گیا، جس میں نہ صرف نقلیہ و عقلیہ کے بے شمار مسائل محفوظ رہتے تھے۔ بلکہ واقعاتِ تاریخیہ اور اشعار ادبیہ اردو فارسی، عربی کے بے شمار خزانے بھی جمع رہتے تھے۔ ذکاوت اور سمجھ ایسی اعلیٰ درجہ کی عطا ہوئی تھی، کہ مشکل سے مشکل مسائل ادنیٰ توجہ سے حل فرما دیتے تھے۔ اس لئے بیرون ہند کے مذکورہ بالا واقعات خصوصاً بلقان اور طرابلس کے دل گداز اور ہولناک مظالم اور اندرون ہند کی انگریزوں کی روز افزوں چیرہ دستیوں اور شرمناک وحشت و بربریت لوٹ کھسوٹ کی فراوانی نے انتہائی درجہ میں مایوس اور مضطرب کر دیا، اور آمادہ کر دیا تھا کہ عواقب اور نتائج سے بے نیاز ہو کر میدان انقلاب میں سر بکف کفن بر دوش نکل پڑیں۔ زمانہ کی تاریکیاں، موسم کی کالی کالی گھٹائیں احوال کی نزاکتیں، اہل ہند بالخصوص مسلمانوں کی ناگفتہ بہ کمزوریاں رکاوٹ بن کر سامنے آئیں، اور کچھ عرصہ اسی غور و خوض میں گذرا مگر چونکہ پانی سر سے گزر چکا تھا، اس لئے خوب سمجھ سوچ کر صرف قادر مطلق پر اعتماد اور بھروسہ کر کے کام شروع کر دیا۔

شروع شروع میں قیاس سے بھی زیادہ مشکلات سامنے آئیں، سخت اور تند آندھیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ باد سموم کے جھلسا دینے والے تھپیڑوں نے طمانچے مارے۔ احباب واقارب مار آستین بن گئے۔ ہر شخص ناصح اور خیر خواہ بن کر سد راہ بنا اور کیوں نہ ہوتا۔ انگریز نے اس قدر پیش بندی کر رکھی تھی کہ سیاسیات کی طرف آنکھ اٹھانا سن ستاون کا سماں باندھتا تھا۔ آزادی اور انقلاب کا اگر کوئی خواب بھی دیکھ لیتا تھا تو پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ ہوم رول یا خود اختیاری حکومت کی خواہش بھی زبان پر لانا برقِ جہاں سوز سے زیادہ تباہ کن شمار کی جاتی تھی۔

برطانیہ تشددات اور مظالم نے اس قدر قلوب اور دماغوں کو متاثر کر رکھا تھا کہ بہت سے نفوس میں اللہ تعالیٰ کا خوف اس قدر نہ پایا جاتا تھا جتنا کہ انگریز کا خوف مستولی تھا۔ خفیہ پولیس اور سی آئی ڈی میں ایسے ایسے لوگ کام کر رہے تھے کہ جن پر شبہ کرنا بھی بے دینی اور کفر سمجھا جا سکتا تھا۔ چاروں طرف خفیہ پولیس کا جال بچھا ہوا تھا پھر کس طرح امید کی جا سکتی تھی کہ کوئی شخص بھی ہم خیال اور ہم زبان یا ہم عمل ہو سکتا ہے۔ خصوصاً جب ہر شخص آزادی کے ذکر کرنے سے بھی کان پر ہاتھ دھرتا ہو۔ بہر حال مولانا نے تمام خطرات سے قطع نظر ضروری سمجھا اور "ہر چہ بادا باد من کشتی در آب انداختم" کہتے ہوئے اللہ کا نام لے کر اس بحر ذخار اور ہولناک طوفان میں کود کر آگے بڑھے اور لوگوں کو ہم خیال اور رفیق سفر بنانے لگے۔ بڑے بڑے علماء اور مشائخ سے چونکہ ناامید اور مایوس تھے (جیسا کہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ مشہور لوگوں کو بہت زیادہ خطرات لاحق ہوتے ہیں اس لئے اپنے تلامذہ اور مخلص سمجھ دار مریدوں کو ہم خیال بناتے رہے، جن میں سے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم بھی ہیں۔ مولانا عبید اللہ صاحب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خاص فدائی اور نو مسلم شاگرد تھے۔ سمجھ اور حافظہ اعلیٰ پیمانہ کا اور ہمت واستقلال بے نظیر قدرت نے عطا فرمایا تھا۔ اس زمانہ میں دہلی میں مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ میں تعلیمی کام کرتے تھے۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی تعلیم سے نوجوانانِ اسلام کے عقائد اور خیالات پر جو بے دینی اور الحاد کا زہریلا اثر پڑتا ہے اس کو زائل کیا جائے اور قرآن کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ ان کے شکوک وشبہات دین اسلام سے دور ہو جائیں اور وہ سچے پکے مسلمان بن جائیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ دہلی تشریف لے گئے، اور مولانا عبید اللہ صاحب سے ملاقات کی اور تذکرہ میں فرمایا کہ "جب کہ انگریزی حکومت اور اقتدار ہندوستان میں قائم ہے تو جس مدت تک تم اپنی اس تعلیم اور اس مدرسہ سے دس بیس آدمی

صحیح الخیال مسلمان بناؤ گے، اس مدت میں انگریز ہزاروں کو ملحد اور زندیق بنادیں گے" اور واقعہ بھی یہی تھا (ڈبلیو ہنٹر کہتا ہے کہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں سے پڑھا ہوا کوئی ہندو یا مسلمان ایسا نہیں ہے جس نے اپنے بزرگوں کے عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو) چنانچہ مولانا عبید اللہ صاحب کی سمجھ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اسکیم آگئی اور وہ عالی ہمتی اور تن دہی کے ساتھ تمام ہولناک خطرات کو پس پشت ڈالنے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ حضرت رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ رولٹ اپنی رپورٹ میں کہتا ہے کہ ...... مولوی عبید اللہ نے (مولانا) محمود حسن کے خیالات پر اثر ڈالا حالانکہ مولوی عبید اللہ تو تعلیمی جد و جہد میں منہمک اور مشغول تھے میں نے ان کو ادھر سے کھینچ کر سیاسیات اور برطانیہ کے خلاف جنگ میں ڈالا۔

الغرض حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو بالکل اپنا ہم خیال اور اپنا ہم عمل بنالیا۔ چونکہ ان کے بہت سے احباب اور جان پہچان والے سندھ، پنجاب اور سرحد وغیرہ میں تھے، انہوں نے اپنے معتمد علیہ حضرات کو بار بار سفر کر کے استوار کیا اور اس تحریک کا ممبر بنایا، نیز دہلی میں رفتہ رفتہ ہم خیال لوگ ہوتے گئے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم، مولانا محمد علی جوہر مرحوم، مولانا شوکت علی مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ حضرات کے لئے بھی مولانا عبید اللہ صاحب ذریعہ بنے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بار بار مولانا عبید اللہ کو سرحد، یاغستان، سندھ وغیرہ میں بھیجا، اور وہاں کے لوگوں سے تعلقات قائم کر کے اس اسکیم کو جاری کیا (یہ اسکیم کیا تھی اس کا مفصل تذکرہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے سیرتی خاکہ میں ملاحظہ کیا جائے)

اِس تحریک آزادی میں غیر مسلموں کی شرکت

حضرت شیخ الہند نے ایک مستقل مکان اپنے مکان کے قریب کرایہ پر لے رکھا تھا، جس کو کوٹھی کے نام سے مشہور کیا جاتا ہے۔ اس میں حضرت کے غیر مسلم ہم خیال دوست اور رفقاء انقلاب ٹھہرا کرتے تھے۔ ان کو رازداری کے ساتھ خدام خاص ٹھہرا دیتے تھے۔ اکثر تنہائی کے اوقات میں یارات کو ان سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی باتیں ہوتی تھیں۔ یہ لوگ سکھ یا بنگالی ہندو انقلابی (بنگال پارٹیشن والے) ہوتے تھے، چونکہ رازداری کا بہت زیادہ خیال رکھنا پڑتا تھا اس لئے ان کے نام اور پتے معلوم نہ ہو سکے اور نہ حضرت سے پوچھنے کی نوبت

آئی، علاوہ مذکور بالا حضرات کے غیر مشہور حضرات اس تحریک کے ہم خیال اور مشن آزادی کے ممبر بے شمار تھے، جن کی تفصیل تطویل چاہتی ہے۔ اور نہ ان کے ذکر کرنے کی ضرورت ہے ہم نے نہایت سرگرم لوگوں کی فہرست پیش کر دی ہے، اور یہ پانچ شاخیں بتلادی ہیں جو کہ علاوہ مرکز دیوبند کے ہمارے علم میں آسکیں۔ ا۔ دین پور، ۲۔ امروٹ، ۳۔ کراچی محلّہ کھڈہ، ۴۔ چکوال ہر جگہ کام کرنے والے حضرات اپنی تیز تر مساعی کی اور انتہائی اخلاص کی بنا پر صدر کہلانے کے مستحق ہوتے تھے، ورنہ باقاعدہ تقرر صدر اور سیکریٹری وغیرہ کا مقتضائے وقت اور ماحول کی بناء پر ممکن تھا نہ وقوع میں آیا۔ ہم نے جس جگہ پر بھی صدر یا ناظم وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں، ان میں عملی استحقاق مراد ہے رسمی کاروائی مراد نہیں۔

حضرت شیخ الہند کی ابتدائی کارگذاری

اس تحریک کی ابتدا میں ضروری سمجھا گیا کہ چونکہ بغیر تشدد (وائلنس) ہندوستان سے انگریزوں کا نکلنا اور وطن عزیز کا آزاد کرانا ممکن نہیں ہے(۱) اس کے لئے مرکز اور اسلحہ، سپاہی، مجاہدین وغیرہ ضروری ہیں۔ بنابریں مرکز یاغستان (آزاد قبائل) قرار دیا گیا کہ وہاں اسلحہ اور جانباز سپاہیوں کا انتظام ہونا چاہئے، اس کے علاوہ چونکہ آزاد قبائل کے نوجوان ہمیشہ جہاد کرتے رہتے ہیں، اور قوی ہیکل و جانباز ہوتے ہیں اس لئے ان کو متفق اور متحد کرنا اور ان میں جہاد کی روح پھونکنا بھی ضروری کیا گیا، اور انہی سے کامیابی کی امید قائم کی گئی۔ اس بناء پر ضروری سمجھا گیا کہ مندرجہ ذیل امور عمل میں لائے جائیں:۔

(الف) ان علاقوں کے باشندوں سے آپس کے نزاعات قدیمہ اور شخصی و قبائلی دشمنیوں کو مٹایا جائے۔

(ب) ان میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

(ج) ان میں جوش جہاد اور آزادی کی تڑپ پیدا کی جائے۔

(د) حضرت سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کے لوگ (جماعت مجاہدین سرحد جو کہ ستیانا اور چمرقند میں مقیم ہیں اور ان میں اور دیگر قبائل میں تنفر اور شکر رنجیاں جو عرصہ سے چلی آتی ہیں،

---

(۱) اس وقت نان وائلنس کا حربہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا اور کانگریس کی جو کوششیں ۱۹۱۲ء تک تھیں ان سے کامیابی کی تمنا موہوم بلکہ عبث تھی۔ کیوں کہ انگریز اپنی ڈپلومیسی سے ایسی رکاوٹیں پیدا کر دیتا تھا کہ پوری جد و جہد ایک لمحہ میں ختم کر دیتا تھا۔

ان کو دور کرنا چاہیے (۱) چنانچہ اس لئے مولانا سیف الرحمٰن صاحب کو دہلی سے، مولانا فضل ربی اور مولانا فضل محمود صاحب کو پشاور سے بھیجا اور مولانا محمد اکبر صاحب وغیرہ کو آمادہ کیا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اس علاقہ میں بہت سے شاگرد اور مخلص موجود تھے، ان سبھوں

(۱) یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہند اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے معتمد علیہ ساتھیوں کا اجمالاً تذکرہ کر دیا جائے کہ ان کے تذکرے کے بغیر یہ مضمون نامکمل رہے گا۔

۱: حاجی ترنگ زئی: ۔ترنگ زئی تحصیل چارسدہ ضلع پشاور میں اتمان زئی (خان عبدالغفار خاں کا گاؤں) کے قریب ایک گاؤں کا نام ہے حاجی صاحب اسی گاؤں کے تھے۔ اور اسی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ان کا نام فضل واحد تھا۔ نہایت متقی اور پرہیزگار انسان تھے صاحب علم وعمل اور مشہور پیران طریقت و سلوک میں سے تھے۔ حضرت مولانا شاہ نجم الدین معروف بہ بڑے ملا کے خلیفہ اور جانشین تھے۔ مولانا نجم الدین صاحب بڑے ملا حضرت مولانا شاہ عبدالغفار صوائی معروف بہ حضرت صوات صاحبؒ کے جانشین تھے۔ مولانا عبدالغفور صاحب ریاست صوات (سوات) کے والی تھے۔ موجودہ والی سوات جہاں زیب، مولانا عبدالغفورؒ کے پڑپوتے ہیں (حضرت مولانا شمس الحق افغانی مدظلہ شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور حاجی ترنگ زئی مرحوم کے پیر بھائی مولانا غلام حیدر صاحبؒ سے بیعت اور خلیفہ مجاز ہیں) مولانا عبدالغفورؒ نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ مل کر جہاد میں حصہ لیا تھا اور ان کی کافی معاونت کی تھی۔ حاجی ترنگ زئی بھی اپنے پیران طریقت کے قدم بہ قدم چل کر غزا و سلوک دونوں کے مرد میدان تھے۔ اس زمانہ میں ان سے زیادہ مقبول و معروف کوئی پیر اس علاقہ میں نہ تھا یاغستان اور آزاد قبائل میں ان کے ہزارہا مرید تھے یہی وجہ تھی کہ مولانا عبیداللہ سندھی شیخ الہندؒ کے ایما پر بار بار ان کے پاس گئے اور ان کو مجبور کیا کہ وہ آزاد علاقہ ہجرت کر جائیں اور وہاں کمان سنبھالیں، کیوں کہ وہاں بے شمار مجاہدین تھے اور اسلحہ پر کوئی پابندی نہ تھی، جنگ عظیم کی وجہ سے انگریز کی مشاق پلٹنیں باہر گئی ہوئی تھیں، لہٰذا یہاں آزاد قبائل میں ان کو حاجی صاحب کی وجہ سے بار بار شکست فاش ہوئی۔ بالآخر انگریز نے ڈپلومیسی اختیار کی اور امیر حبیب اللہ خاں والی کابل کو درمیان میں ڈالا اور لکھوکھا روپیہ سرداران قبائل میں تقسیم کر کے یہ مشہور کیا کہ بغیر امیر کے جہاد جائز نہیں، لہٰذا امیر حبیب اللہ جو بادشاہ ہیں ان کے ہاتھ پر بیعت کی جائے اس دو دھاری تلوار کا اثر یہ ہوا کہ حاجی صاحب کے ساتھیوں میں پھوٹ پڑ گئی اور ان کی طاقت کمزور ہوئی اور شکست پر شکست کھانے لگے۔ آخر کار حاجی صاحب مرحوم کو ان کے ساتھی علاقہ مہمند میں لے گئے۔ وہ وہاں محفوظ ہو کر اقامت پذیر ہو گئے، اور وہیں وفات پائی (رحمۃ اللہ تعالیٰ ورضی اللہ عنہ وارضاہ آمین)

۲: مولانا سیف الرحمٰن: ۔اصل میں قندھار کے تھے۔ آباؤ اجداد نے پشاور کے پاس سکونت اختیار کی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے علم حدیث حاصل کیا۔ عرصہ دراز ریاست ٹونک میں درس و تدریس میں مشغول رہے اخیر میں مدرسہ فتح پوری دہلی میں مدرس اول ہو گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ان کو ہم خیال بنایا اور یاغستان ہجرت کرنے کا مشورہ دے کر روانہ کیا۔ لوگوں کو وعظ و تقریر کے ذریعہ جہاد پر تیار کرتے رہے۔ نہایت ذہین صاحب علم اور اعلیٰ درجہ کے مقرر تھے، چونکہ حضرت شیخ کے کہنے پر ملازمت چھوڑی تھی، لہٰذا حضرت ان کو ماہ بماہ خرچ بھیجتے رہتے تھے۔ حاجی صاحب ترنگ زئی کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے شکست کے بعد کابل چلے گئے۔ امیر حبیب اللہ خاں کے آخری عہد میں انگریزوں کے احتجاج پر مولانا منصور کے ساتھ یاغستان روانہ کر دئے گئے۔ مولانا کو جلال آباد میں برٹش افغانوں نے اپنی معیت میں لے کر ہندوستانی معاملات سے علیحدگی کا عہد لے لیا۔ اب وہ مستوفی الممالک کے ساتھ رہنے لگے امیر حبیب اللہ کی زندگی تک مستوفی الممالک کے ساتھ رہے اور مستوفی کو جو کام انگریز دیتا اس میں اس کی امداد کرتے۔ سردار امان اللہ خان کے عہد میں آزاد ہو کر کابل پہنچے اور بڑے عہدوں پر فائز ہو گئے۔

۳: مولانا منصور صاحب انصاری: ۔ان کا اصلی نام محمد میاں تھا حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (باقی اگلے صفحہ پر)

نے گاؤں گاؤں اور قبیلہ قبیلہ میں پھر کر زمین ہموار کی اور ایک عرصہ میں بفضلہ تعالیٰ بڑے درجہ تک کامیابی نظر آنے لگی۔ انہی مقاصد کیلئے بار بار حاجی ترنگ زئی صاحب سے بھی استدعا کی گئی کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑ دیں اور انگریزی حدود سے باہر جا کر ان مقاصد کیلئے کوشش

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) کے نواسے اور پیر جی عبداللہ انصاری ناظم دینیات علی گڑھ یونیورسٹی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ انبیٹھہ کے متوطن تھے دارالعلوم معینیہ اجمیر میں کام کرتے رہے۔ شیخ الہندؒ کے ساتھ ترجمۂ قرآن میں معاون رہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے نائب بن کر جمعیۃ الانصار میں کام کرتے رہے شیخ الہندؒ کے ساتھ حجاز گئے۔ مکہ معظمہ میں گورنر حجاز غالب پاشا سے شیخ الہندؒ کی ملاقات کے بعد ہدایات لے کر ہندوستان لوٹے تاکہ یہاں کام کریں۔ حسب رپورٹ رولٹ غالب نامہ ان کے پاس تھا۔ آپ ہندوستان آئے اور ریشمی رومال کا انگریزوں کو پتہ مل چکا تھا پکڑ دھکڑ شروع تھی۔ لہٰذا بھیس بدل کر یاغستان چلے گئے اور وہاں سے کابل۔ انگریز کے احتجاج پر مولانا سیف الرحمٰن کے ساتھ یاغستان روانہ کر دئے گئے مگر یہ کسی طرح بھیس بدل کر اور نام محمد منصور انصاری رکھ کر گرفتاری سے بچ گئے اور سی آئی ڈی کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ امیر امان اللہ کے زمانہ میں کابل چلے گئے اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ امیر امان اللہ کے تخت نشین ہونے کے بعد کابل سے جو سرکاری وفد استنبول گیا تھا اس کے ایک رکن تھے۔ پھر ماسکو میں افغانی سفارت خانہ میں بطور مشیر شریک رہے۔ کئی ایک سیاسی، اسلامی رسائل تصنیف کر کے شائع کئے۔ ان کے اہل و عیال کو ہندوستان میں ڈاکٹر انصاری تمیں روپیہ ماہوار دیتے رہے، ان کے بڑے صاحبزادے مولانا حامد انصاری عرصہ دراز تک "مدینہ" بجنور کی ایڈیٹری نہایت قابلیت کے ساتھ کرتے رہے پھر بمبئی جا کر روزنامہ "جمہوریت" جاری کیا مولانا منصور کا انتقال کابل میں ہوا (رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ آمین)

۴: **مولانا عزیز گل**:۔ قصبہ زیارت کاکا صاحب ضلع پشاور کے باشندہ، دیوبند کے فارغ اور حضرت شیخ الہند کے خادم خاص، صوبہ سرحد اور یاغستان میں بار بار حضرت شیخ الہندؒ کے سفیر کی حیثیت سے گئے۔ حاجی صاحب ترنگ زئی اور دیگر خوانین کو تحریک کے ہمنوا بنانے میں مولانا سندھی کے ساتھ ہوتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ہمیشہ ساتھ رہے اسارت مالٹا میں بھی ساتھ تھے۔ لوگوں نے سی آئی ڈی مشہور کیا کہ حضرت شیخ الہند ان سے بدظن ہوں، لیکن نہ حضرت بدظن ہوئے اور نہ ہی ان کا دل میلا ہوا۔ آخر تک ساتھ رہے۔ حضرت کے رازدار خزانچی اور معتمد علیہ رہے۔ حضرت کی وفات کے بعد بھی کتنا عرصہ حضرت کے مکان پر قیام پذیر رہے۔ ایام تحریک خلافت میں دیوبند خلافت کمیٹی کے صدر رہے۔ پھر مدرسہ رحمانیہ روڑکی میں صدر مدرس ہو گئے بعد وہاں ایک انگریز عورت سے اس کی خواہش پر تیسرا نکاح کیا اور پشاور چلے گئے۔

۵: مولانا احمد اللہ صاحب:۔ پانی پت ضلع کرنال کے باشندے اور حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاءؒ کی اولاد میں سے تھے۔ فراغت دیوبند کے بعد مختلف جگہوں میں درس و تدریس کا کام کرتے رہے پھر ترجمۂ قرآن میں حضرت شیخ الہندؒ کے معین ہوئے ان کی دیانت و امانت پر شیخ کو بہت اعتماد تھا بسا اوقات حضرت کی ڈاک انہی کی سپرد ہوتی تھی۔ حضرت حجاز جاتے ہوئے انہیں اپنا نائب بنا گئے۔ ان کے پاس مشن کے ممبروں اور چندوں کا رجسٹر تھا۔ یہ ان کو لے کر پانی پت چلے گئے۔ اور وہیں سے تمام کاروائیاں عمل میں لاتے تھے۔ حضرت اونچے کاموں میں اپنا نائب حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کو بنا گئے تھے دونوں حضرات مل کر مشن کا کام کرتے تھے۔ گرفتاریوں کے وقت پولیس کے آنے سے چند گھنٹہ قبل تمام کاغذات چھپا چکے تھے۔ ان سے بہت پوچھ گچھ کی گئی مگر انہوں نے کسی امر کا اقرار نہ کیا۔ اس کے بعد ان پر ایک مسلمان سی آئی ڈی مسلط کیا گیا۔ جو نہایت اخلاص کا اظہار کرتا اور احکام شریعت پر مستعدی سے عمل کرتا رہا اور دن رات ان کی خدمت کرتا رہا۔ ان کو اس پر اعتماد ہو گیا اس نے آہستہ آہستہ تمام باتیں پوچھ لیں اور مشن کا ممبر بن گیا۔ وہ تمام معلومات حاصل کر کے غائب ہو گیا۔ اس پر ان کو گرفتار کر لیا گیا، مگر چونکہ الزامات کا کوئی تحریری ثبوت نہ تھا اور نہ ہی یہ اقرار کرتے تھے۔ لہٰذا ان کو پنجاب کے بعض علاقوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ ایک عرصہ کے بعد مولانا محمد چکوالی جو کہ اس سے قبل معافی مانگ کر آزاد ہو چکے تھے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کریں۔ ان کو مختلف مجبوریاں درپیش تھیں، ان کے حل کرنے کے خیال سے تاخیر فرمارہے تھے کہ جنگ عمومی چھڑ گئی اور کچھ عرصہ بعد ترک بھی مجبور کردیئے گئے کہ جنگ کا اعلان کردیں۔ ان کے دو جنگی جہاز جو انہوں نے انگلستان میں بنوائے تھے، اور ان پر کروڑوں

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) وہ آئے اور انہوں نے کہا کہ تحریک ختم ہو چکی ہے۔ گورنمنٹ کے پاس متعدد تحریری ثبوت ہیں آپ بھی معافی مانگ لیں۔ ایک ہمدم و ہمراز کا مشورہ قبول کرنا پڑا۔ اس کے چند دن بعد ان کو آزاد کردیا گیا۔ پانی پت واپس آ کر تعلیمی مشاغل میں مشغول ہو گئے۔ اور تقسیم ہند سے کچھ پہلے بمرض ہیضہ پانی پت میں انتقال ہو گیا (رحمہ اللہ تعالیٰ)

۶: **مولانا ظہور محمد خاں**:۔ سہارنپور کے باشندے اور حضرت شیخ الہند کے فدائی اور مخلص شاگرد تھے۔ نہایت زیادہ ساکت و صامت اور ٹھوس کام کرنے والے سرگرم ممبر تھے۔ مشن میں ابتداء سے داخل ہوئے اور ہمیشہ ممبر بنانے اور چندہ فراہم کرنے کا کام کرتے رہے۔ حضرت کو ان پر بہت اعتماد تھا۔ مدرسہ رحمانیہ رڑکی میں صدر مدرس تھے کہ ان کو گرفتار کیا گیا۔ الٰہ آباد لے جائے گئے بہت پوچھ گچھ کی گئی مگر یہ گونگے بن گئے کوئی جواب نہ دیا دو چار دن سختی کے بعد چھوڑ دیئے گئے۔ حضرت شیخ کی واپسی کے بعد چند سال زندہ رہ کر انتقال کر گئے (رحمہ اللہ تعالیٰ)

۷: **شیخ عبد الرحیم مرحوم سندھی**:۔ حیدرآباد کے باشندہ اور مولانا سندھی کے مخلص و فادار نو مسلم دوست تھے۔ مشن کے سرگرم ممبر اور نہایت دیندار تھے مولانا سندھی نے ان کو ہموار کیا تھا۔ اور مولانا سندھی کو سرحد افغانستان تک پہنچانے میں انہوں نے بہت زیادہ مدد کی تھی آچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی تھے۔ عرصہ دراز تک سندھ میں ہندوؤں کو تبلیغ اسلام کرتے رہے۔ بہت سے لوگ ان کی مساعی سے مسلمان ہو گئے جن میں ڈاکٹر شمس الدین بھی تھے۔ شیخ صاحب نے اپنی صاحبزادی کا نکاح ڈاکٹر صاحب سے کیا تھا۔ مولانا سندھی کے کابل جانے کے بعد مولانا سندھی کی خط و کتابت انہی سے ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ کچھ خطوط گورنمنٹ کے ہاتھ لگ گئے اور راز فاش ہو گیا مگر یہ روپوش ہو گئے اور پھر ہاتھ نہیں آئے۔ کہا جاتا ہے کہ سرہند میں بیمار رہ کر انتقال کر گئے۔ رحمہ اللہ علیہ۔ ان کے روپوش ہونے کے بعد مشن کی برانچ حیدرآباد سندھ کا کام تقریباً ختم ہو گیا۔

۸: **حضرت مولانا غلام محمد صاحب دین پوری مرحوم**:۔ موضع دین پور تحصیل خان پور سابقہ ریاست بہاول پور کے باشندے اور مشہور شیخ طریقت حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈی کے خلیفہ اول تھے۔ بہت لوگ ان سے بیعت تھے۔ چونکہ مولانا سندھی کے پیر بھائی اور ان کے پیر و مرشد کے خلیفہ تھے۔ لہٰذا ان کا اور مولانا سندھی کا آپس میں بڑا گہرا تعلق وارتباط تھا۔ گویا دین پور اس تحریک کا ثانوی مرکز تھا، مولانا عبید اللہ کابل جاتے ہوئے اپنی صاحبزادی کو انہی کے پاس چھوڑ گئے جن سے بعد میں مولانا غلام محمد صاحب کا نکاح ہوا۔ ان سے ایک فرزند ارجمند پیدا ہوئے۔

ریشمی خط مولانا غلام محمد صاحب کے پاس بھی پہنچا تھا۔ انقلاب کی تیاری کے جملہ سامان یہاں جمع کر لئے گئے تھے اور مزید کوشش جاری تھی کہ فوج کی بڑی مقدار خان پور اسٹیشن پہنچی وہاں کے مخلصین نے فوراً مرکز کو خبر دی۔ راتوں رات تمام رائفلیں کارتوس وغیرہ منتشر کر دیئے گئے۔ صبح کو انگریز افسر مع فوج دین پور پہنچا تو تفتیش کی کوئی چیز نہ تھی۔ ریشمی خط ایک ڈبہ میں بچوں کے کھلونوں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ افسر نے اس ڈبہ کو اٹھایا مگر اوپر کے کھلونوں کو دیکھ کر رکھ دیا۔ غرضیکہ مخبری کے مطابق کوئی چیز نہ نکلی۔ اطراف و جوانب سے ہزاروں مخلص جمع ہو چکے تھے۔ دین پور میں گرفتار کرنے کی افسر کو جرأت نہ ہوئی۔ افسر نے استدعا کی کہ ہمارا بڑا افسر خانپور ہے اس سے چل کر ملئے۔ وہاں جانے پر کہا کہ یہاں سے وہ بہاول پور چلے گئے ہیں۔ اس لئے بہاول پور تشریف لے چلئے۔ غرضیکہ آپ کو اس طرح ورغلا کر لے جایا گیا اور ضلع جالندھر کے ایک قصبہ نور محل میں نظر بند کر دیا گیا۔ کچھ ثبوت فراہم نہ ہونے پر چھوڑ دیئے گئے۔ مولانا کے کئی صاحبزادے فاضل دیو بند ہیں۔ بڑے صاحبزادے مولانا عبد الہادی صاحب آج کل گدی نشین ہیں۔ نہایت صالح، متقی اور مرجع خلائق ہیں۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری مولانا غلام محمد صاحب کے خلیفہ تھے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اشرفیاں خرچ ہوئی تھیں انگریزوں نے ضبط کر لئے اور اسی قسم کے دوسرے غیر منصفانہ معاملات ان سے پیش آئے جو کہ ان کو جنگ میں گھسیٹنے والے تھے۔ یہ ان معاملات کے علاوہ تھے۔ جو کہ طرابلس غرب اور بلقان کریٹ یونان وغیرہ میں قریبی زمانہ میں پیش آئے تھے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا)

۹: **مولانا ابوالحسن تاج محمود صاحب امروٹی:۔** امروٹ ضلع سکھر کے باشندے اور سید العارفین حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈی کے دوسرے خلیفہ تھے۔ مولانا عبید اللہ صاحب کو ان سے بہت وابستگی تھی۔ انہوں نے ہی مولانا سندھی کا نکاح ماسٹر محمد عظیم خاں یوسف زئی کی لڑکی سے کرایا تھا اور مولانا سندھی نے امروٹ رہ کر بہت کچھ تعلیم و تربیت حاصل کی۔ موصوف خدارسیدہ متقی پرہیزگار اور نہایت جوشیلے بزرگ تھے۔ لاکھوں مرید تھے ان کی کرامات کا ان اطراف میں بڑا چرچا ہے۔ مولانا سندھی نے ان کا تعارف حضرت شیخ الہند سے کرایا۔ متعدد مرتبہ دیوبند آئے۔ اور حضرت شیخ بھی ان سے ملنے امروٹ گئے ان کا مقام سندھ کے اس علاقہ میں مشن کا مرکز رہا۔ گرفتار ہوئے اور چند دن بعد رہا کر دیئے گئے۔ ایام تحریک خلافت میں انتقال فرمایا (رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی وارضاہ)

۱۰: **مولانا محمد صادق صاحب کراچوی:۔** مولانا موصوف محلہ کھڈہ کراچی کے باشندے تھے کتب عالیہ درسیہ اور دورہ حدیث حضرت شیخ الہند سے پڑھا۔ ان میں اور مولانا سندھی میں گہرے تعلقات تھے مشن کے ممبر بنے اور سرگرمی سے کام کیا۔ جنگ عظیم میں جب انگریزوں نے عراق پر حملہ کیا تو انہوں نے لس بیلا وغیرہ بلوچستانی علاقہ میں بغاوت کرا دی۔ کراچی سے ہر ہفتہ عراق کو جہاز میں فورس جایا کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے مسٹر ٹاؤنشنڈ کمانڈر محاذ عراق میں بڑھتا ہوا ہر پڑاؤ پر پیش قدمی کر رہا تھا۔ فوجیں یکے بعد دیگرے ایک ایک پڑاؤ کو سنبھالتی جاتی تھیں۔ اور پیچھے سے کمک پہنچتی رہتی تھی اس طرح نظام پیش قدمی کا چلتا تھا۔ جب بلوچستان وغیرہ میں بغاوت ہو گئی تو وہ فورس اور فوج جو بصرہ کو جاری تھی اس داخلی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے سندھ میں اتار دی گئی کئی ہفتہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ مسٹر ٹاؤنشنڈ اپنی فتح مندی کے نشہ میں آگے بڑھتا چلتا گیا پیچھے سے کمک نہ پہنچی تو کوت العمارہ میں محصور ہو گیا کچھ عرصہ بعد جب بغاوت فرو کرنے کے بعد ہندوستان سے فوج پہنچی تو ترکی فوجوں نے حصار نہایت مضبوط کر لیا تھا نہ اندر سے کسی کو نکلنے دیتے نہ باہر سے جانے دیتے کئی ماہ تک محصور رہ کر مجبوری ٹاؤنشنڈ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ جب محصور ہوا تو اس کی فوج تیس ہزار تھی۔ جب آزاد کیا گیا تو کل تیرہ ہزار تھی۔ یہاں ہندوستان میں مخبری پر مولانا محمد صادق کو گرفتار کر لیا گیا۔ مگر خاطر خواہ ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے کاٹھواڑ (مہار اشٹر کا شہر) میں نظر بند کر دیئے گئے۔ جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد رہا کئے گئے دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور جمعیۃ علماء ہند کا کام نہایت اولوالعزمی سے کرتے رہے۔ ۱۸ رجون ۱۹۵۳ء کو وفات پا گئے (رحمہ اللہ تعالیٰ)

۱۱: **مولانا فضل ربی صاحب:۔** شیخ الہند کے شاگرد رشید اور جوشیلے لیکن مستقل مزاج تھے۔ اپنے وطن ضلع پشاور میں علمی مشاغل میں مصروف تھے کہ شیخ الہند کے حکم سے یاغستان میں چلے گئے اور لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرتے تھے۔ حاجی ترنگ زئی کے ساتھ جہاد میں برابر کے شریک رہے۔ شکست کے بعد کابل چلے گئے اور اپنی علمی استعداد اور اعلیٰ قابلیت کی بنا پر علمی ڈیپارٹمنٹ، افغانستان میں ملازم ہو گئے۔ اور غالباً آج تک اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں متعلقین ان کے ساتھ ہیں۔

۱۲: **خان عبد الغفار خاں:۔** موصوف اتمان زئی کے رہنے والے اور مشہور لیڈر ہیں ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خاں مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ رہے ہیں۔ تعارف کے محتاج نہیں۔ حضرت شیخ الہند سے ان کا بھی رابطہ تھا جب بھی ملاقات کرنی ہوتی تو دیوبند لائن کے کسی اگلے پچھلے اسٹیشن پر ملاقات کرتے اور ٹکٹ کسی دور جگہ کا ہوتا۔ اور پھر وہاں جا کر اتر جاتے اور اس طرح بار ہا ہوا اور سی آئی ڈی کو مطلق علم نہ ہو۔ کا آج کل افغانستان میں ہیں۔

۱۳: **ڈاکٹر انصاری مرحوم:۔** ڈاکٹر صاحب مرحوم کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں تین بھائی تھے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

بہر حال ترکی حکومت نے مجبور ہو کر اعلانِ جنگ کر دیا تو اس پر تقریباً آٹھ یا نو محاذوں سے حملہ کیا گیا۔ انگریزوں نے عراق (بصرہ) پر، عدن پر، سویز پر چناق قلعہ پر اسی طرح روس نے متعدد تین چار محاذوں پر۔ اس یورش کی وجہ سے مسلمانوں میں جس قدر بھی بے چینی ہوتی

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) حکیم نابینا (حکیم عبد الوہاب صاحب) مرحوم سب سے بڑے تھے۔ منجھلے حکیم عبد الرزاق تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب چھوٹے تھے تینوں بھائیوں کو حضرت شیخ الہند سے بہت تعلق تھا۔ حکیم نابینا صاحب نے دیوبند میں تعلیم پا کر حدیث حضرت گنگوہیؒ سے پڑھی اور بیعت بھی ہوئے اور مرنے سے قبل وصیت کی کہ میری قبر حضرت گنگوہیؒ کے پاس بنائی جائے، چنانچہ انتقال کے بعد ان کی لاش ایک کار میں گنگوہ لے جا کر ان کو حضرت گنگوہی کے قریب دفن کیا گیا۔ ڈاکٹر انصاری بعض مصالح کی بناء پر ظاہری طور پر دیوبند آمد و رفت نہیں رکھتے تھے مگر ہمیشہ حضرت شیخ کی تحریک کے مالی معاون و سرپرست رہے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے گورنمنٹ کے اعلیٰ کارکنوں کے ذریعہ سے بہت سی خبریں معلوم کر لیتے تھے اور حضرت شیخ کو اطلاع دیتے تھے۔ جنگ عظیم کے شروع پر انہوں نے ہی اطلاع دی تھی کہ عنقریب شیخ الہند کی گرفتاری ہو جائے گی۔ لہٰذا وہ حجاز چلے جائیں اور ڈاکٹر صاحب ہی نے حضرت اور رفقاء کے ٹکٹوں کا انتظام کیا تھا ان کے بھائی حکیم عبد الرزاق بمبئی تک ساتھ گئے اور جملہ امور کی دیکھ بھال کی اور مصارف حجاز نقد ادا کئے۔ اور اس خیال سے کہ حجاز میں گرانی شدید ہے اور وہ رقم ختم ہو گئی ہو گی اگلے سال شیخ الہند کے بھانجے اور داماد قاضی مسعود کو ایک ہزار روپے دے کر اپنے خرچ پر بھیجا۔ اور پیچھے گھر پر بھی تکفل فرماتے رہے۔ مولانا عبید اللہ صاحب نے جب دہلی میں مدرسہ تعلیم القرآن قائم کرنا چاہا تو حضرت شیخ الہند خود دہلی تشریف لائے اور مولانا سندھی کا ڈاکٹر صاحب سے تعارف کرایا۔ اور وہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے تعارف کا ذریعہ بنے۔ مولانا سندھی کے اپنے الفاظ ہیں۔

> ”حضرت شیخ الہندؒ نے جس طرح چار سال دیوبند رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا۔ اسی طرح دہلی پہنچ کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے اس غرض کی تکمیل کیلئے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مولانا ابو الکلام اور محمد علی مرحوم سے ملایا اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔“

ایام جنگ بلقان میں ہلال احمر کے لئے جو دو وفد استنبول بھیجے گئے تھے اس کی ایک پارٹی کے صدر ڈاکٹر صاحب تھے۔ الغرض یہ حضرت شیخ الہندؒ کے مشن آزادی کی چوتھی برانچ جو کہ دہلی میں تھی کے صدر تھے۔ اور نہایت رازداری اور سرگرمی سے کام کرتے تھے۔ البتہ مولانا عبید اللہ کے دہلی آجانے اور نظارۃ المعارف قائم کرنے کے بعد ان کی ظاہری جدوجہد کچھ ڈھیلی پڑ گئی جو ان کے کابل جانے کے بعد پھر قوی ہو گئی۔ ایام دار و گیر میں ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائی حکیم عبد الرزاق صاحب کو سی آئی ڈی نے بلایا اور بہت کچھ سوالات کئے گئے۔ سوائے مالی امداد کے اور کوئی گرفت کی چیز گورنمنٹ کے پاس نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائی نے اقرار کیا اور کہا کہ مولانا ہمارے مذہبی پیشوا اور مرشد ہیں ہم پر ان کی ضروریات مہیا کرنا اور خدمات بجالانا فرض تھا اور ہے۔ ہم اس کو بجالاتے رہے۔ گورنمنٹ کی طرف سے کہا گیا کہ مولانا گورنمنٹ کے باغی ہیں، آپ ان کی امداد کرتے ہیں تو جواب دیا کہ مولانا باغی نہیں ہیں ان کو بغاوت کے ثبوت میں سی آئی ڈی کی رپورٹیں دکھائی گئیں تو انہوں نے فرمایا کہ یہ جھوٹ ہے قابل یقین نہیں ہے۔ جب حکومت کی طرف سے ان رپورٹوں کی صداقت کا اصرار کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے مذہبی پیشوا اور مرشد دین ہونے کی بناء پر امداد کی ہے اگر حکومت مولانا کو ایسا سمجھتی ہے تو میں حاضر ہوں جو سزا مجھ کو دینا چاہتے ہو دو۔ چونکہ سچائی کے ساتھ اقرار کر لیا تھا ادھر یورپ کے تعلیم یافتہ اور آئین سے بخوبی واقف تھے اس لئے حکومت نے ان پر دست درازی کرنا خلاف مصلحت سمجھا۔ ان کو بھی اور ان کے بھائی کو بھی چھوڑ دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب اخیر تک سیاسی جدوجہد میں نہایت مستعدی کے ساتھ شریک رہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کم تھی۔ چنانچہ احوال موجودہ سے حضرت شیخ الہند ﷫ نے حاجی ترنگ زئی صاحب کو مطلع کیا اور ضروری قرار دیا کہ وہ یاغستان چلے جائیں، اور ضروری کاروائی عمل میں لائیں۔ اسی طرح مرکز یاغستان اور اس کے کارکنوں کو لکھا، چنانچہ جب حاجی مرحوم پہنچے مجاہدین کا جمگھٹا

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) تحریک خلافت اور کانگریس کے ممبر رہے۔ ۱۹۲۷ء میں کانگریس کے صدر بنائے گئے۔ جب تک زندہ رہے قومی لوگوں کا قیام ان کی کوٹھی پر ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں ہزاروں کے لحاظ سے ماہوار ان کا قومی لیڈروں کی آؤ بھگت اور قیام وطعام پر لگ جاتا تھا۔ بعض اوقات ایک ایک وقت پر سینکڑوں رہنما ان کی کوٹھی پر ہوتے اور کھانا کھاتے۔ مشہور و معروف آدمی ہیں مزید بیان کی حاجت نہیں کئی دفعہ جیل گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ آخری ایام میں انہی کے ہاں رہ کر علاج کراتے رہے اور یہیں انتقال فرمایا۔ ۱۹۳۶ء میں دہرہ دون سے دہلی جاتے ہوئے ریل میں انتقال کیا دہلی میں مدفون ہوئے اس صدی میں ہندوستان میں جو چند بڑے مخلص لیڈر ہوئے ان میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔

۱۴: **مولانا محمد احمد چکوالی**:۔ چکوال ضلع جہلم پنجاب کے باشندے۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور مولانا سندھی کے مخلص دوست اور مشن کے سرگرم ممبر تھے۔ مشن تحریک آزادی کی پانچویں شاخ جو کہ پنجاب میں تھی موصوف اس کے صدر تھے نہایت استقلال اور بے جگری کے ساتھ شریک سفر رہے۔ ہزاروں کو ہم خیال اور ممبر بنایا۔ دیوبند میں ان کی آمد و رفت بارہا ہوئی۔ ایام دارو گیر میں ان کو بھی گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا ابتدا میں کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکا اور نہ آپ نے اقرار کیا مگر جب کاغذات گورنمنٹ کے ہاتھوں میں آگئے اور سی آئی ڈی نے ان کو دکھلائے تو ان کی باتوں میں آکر اقرار کرنے اور آئندہ سیاسیات سے علیحدہ رہنے کا وعدہ کرنے پر مجبور ہوگئے۔ چنانچہ ان کو رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے سیاسیات میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ لاہور میں ایک موٹر سے ٹکرا کر زخمی ہو کر انتقال فرما گئے رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔ ان کے صاحبزادہ ڈاکٹر عبدالقوی لقمان صاحب لاہور میں کام کر رہے ہیں اور ان کی صاحبزادی حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے عقد میں آئیں۔

۱۵: **حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہ العزیز**:۔ قصبہ رائے پور ضلع سہارنپور کے باشندے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلیفہ اکبر تھے۔ نہایت بزرگ متقی، باخدا انسان تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد دوست تھے۔ ابتداء میں حضرت شیخ الہند نے ان کو خبر تک نہیں کی اور سالہا سال تک اپنی سرگرمی عمل میں لاتے رہے اور انتہائی اخفا کو جیسا کہ مقتضائے وقت تھا کام میں لائے۔ مگر اس قسم کی کاروائی مخلص دوست سے کیسے چھپ سکتی تھی اور ان کو خبریں ملتی رہیں۔ ۱۳۳۰ھ میں میں (مولانا حسین احمد مدنی) ہندوستان آیا تو رائے پور حاضری کے وقت حضرت نے فرمایا کہ شیخ الہندؒ لوگوں سے بیعت جہاد لے رہے ہیں یہ تو بہت خطرناک امر ہے۔ انگریز کو اگر خبر ہوگئی تو دارالعلوم کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے اور مسلمانوں کا یہ مرکز علمی اجڑ جائے گا۔ چونکہ مجھ کو (حسین احمد مدنی) اس کی خبر نہ تھی اظہار لاعلمی کا اظہار کیا اور یہ عرض کیا کہ میں خود شیخ الہندؒ سے پوچھوں گا۔ مولانا عزیر گل نے حضرت شیخ سے عرض کیا کہ حسین احمد کو بھی اس مشن میں شامل کرنا چاہئے تو آپ نے فرمایا کہ اس کو مشوش نہیں کرنا چاہئے وہ چند دنوں کے لئے ہندوستان آیا ہے۔ میں نے رائے پور سے واپسی پر مولانا عبدالرحیم صاحب کا مقالہ ذکر کیا تو شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دعا فرمائی تھی کہ پچاس برس تک یہ دارالعلوم قائم رہے۔ سو بحمد اللہ پچاس برس گزر چکے ہیں اور دارالعلوم اپنی خدمات باحسن وجوہ انجام دے چکا ہے۔ یہ سن کر میں دم بخود ہو گیا اور سمجھ گیا کہ جو واقعات نقل کئے جا رہے ہیں وہ صحیح ہیں اور حضرت کا اس امر میں پختہ خیال ہو چکا ہے اب اپنے ارادہ سے ٹل نہیں سکتے۔ اور نہ کوئی ہٹا سکتا ہے چنانچہ یہی ہوا۔ کچھ عرصہ بعد مولانا عبدالرحیم صاحب اور شیخ الہند کی آپس میں تنہائی میں کھل کر بات چیت ہوئی تو حضرت شیخ الہند نے ان کو اپنا ہم خیال اور ہمنوا بنالیا۔ اور دونوں حضرات یک جان دو قالب ہوگئے اور آخر تک اسی پر قائم رہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

شمار سے زیادہ ہوگیا، مجاہدین چمرقند (حضرت سید احمد شہید) کی جماعت میں مل گئے۔ بالآخر کچھ عرصہ کے بعد جنگ چھڑ گئی اور بفضلہٖ تعالیٰ مجاہدین کو غیر متوقع کامیابی ہونے لگی اور انگریزوں کو جانی اور مالی بیحد نقصان اٹھا کر اپنی سرحد پر لوٹ آنا پڑا اور اپنے استحکامات قدیمہ میں پناہ لینا ناگزیر ہو گیا۔ اس پر انگریز نے بالمقابل متعدد مذکورہ ذیل کاروائیاں شروع کردیں۔ (الف) فوجوں کو اطراف ہندوستان سے جمع کر کے بڑی مقدار میں سرحد پار بھیجنا (ب) عوام میں پروپیگنڈا کرنا کہ یہ جہاد نہیں ہے جہاد بغیر بادشاہ کے نہیں ہوتا بغیر بادشاہ کے جہاد حرام ہے۔ (ج) پانی کی طرح روپیہ خرچ کرنا اور اپنے لوگوں کو قبائل کے سرداروں کے پاس بھیجنا اور مال وزر بے شمار دے کر ان کو جماعت مجاہدین اور حاجی صاحب موصوف سے توڑنا (د) عوام میں تبلیغ کرنا کہ مسلمانان سرحد اور افغانوں کے بادشاہ امیر حبیب اللہ خاں والیٔ افغانستان ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے بیعت جہاد کرنا چاہئے۔ اور اس وقت تک انتظار ضروری ہے جب تک وہ جہاد کا علم بلند نہ کریں (ہ) اس وقت مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ کاغذوں پر بیعت جہاد کر کے دستخط کریں۔ اور امیر کابل کے نائب السلطنت سردار نصر اللہ خاں کے دفتر میں یہ کاغذات بھیجیں (و) امیر حبیب اللہ خاں کو مختلف وعدوں کے سبز باغ دکھلا کر اور بے شمار اموال اور نقد روپیہ دے کر اپنی طرف مائل کرنا اور جہاد کے لئے کھڑے ہونے سے روکنا اور یہ وعدہ کرنا کہ اس جنگ سے فارغ ہو کر تمہارے لئے فلاں فلاں وعدے پورے کردیئے جائیں گے، ان اور ان جیسی دیگر ڈپلومیسیوں کا اثر ہونا طبعی طور پر لازمی تھا۔ چنانچہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا)

اعلان جنگ کے بعد جب شیخ الہند حجاز جانے لگے۔ تو انہیں کو اپنا قائم مقام بنا گئے اور اپنے کارکنوں کو تاکید کردی کہ مولانا شاہ عبدالرحیم کو میرا قائم مقام سمجھنا اور مہتم بالشان امور کو ان سے مشورہ لے کر اور پوچھ کر انجام دینا اور جزوی امور کو مولانا احمد اللہ انجام دیتے رہیں گے چنانچہ اسی طرح عمل در آمد رہا کیا۔ حضرت رائے پوری نہایت دل سوزی، استقلال اور عالی ہمتی سے انتہائی رازداری کے ساتھ امور مہم کو انجام دیتے رہے۔ اور ان کے خاص خدام بھی دلچسپی لیتے رہے مگر افسوس کہ ہمارے مالٹا میں اسیر ہونے کے کچھ بعد ہی مولانا رائے پوری مریض ہوئے اور عرصہ تک بستر مرض پر ناچارگی اور ضعف میں مبتلا رہے۔ ایام دارو گیر میں سی آئی ڈی کا افسران کے پاس بھی تفتیش و تحقیق کے لئے گیا۔ مولانا مرحوم نے تمام الزام کی تردید کردی اور بعض میں لاعلمی کا اظہار کیا جس پر وہ ناکام واپس آیا۔ اور کہنے لگا کہ مولانا جھوٹ بولتے ہیں۔

(حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کے جانشین حضرت مولانا شاہ عبدالقادر ہوئے جن کا لاہور میں انتقال ہوا ان کا مفصل تذکرہ مستقل عنوان سے علیحدہ آرہا ہے)

حضرت شاہ عبدالرحیم کے انتقال کی خبر حضرت شیخ الہند کو بزمانہ اسارت مالٹا پہنچی اور حضرت شیخ الہند کو بہت صدمہ ہوا اور عرصہ تک رہا۔ ان کے مرثیہ میں ایک قصیدہ بھی لکھا جو آپ کے قصائد میں موجود ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ۔

اثر ہوا اور بہت برا ہوا۔ مگر اتنا نہ ہوتا اگر مجاہدین کو رسد اور کارتوسوں کی نیز دیگر اسلحہ کی کمی کی مشکلات نہ پیش آ جاتیں۔ ادھر یہ کیا گیا کہ مسلمانانِ ہند کے ہیجان اور اضطراب کو روکنے کے لئے ہندوستان میں اعلان کیا گیا (الف) ترکوں کو جنگ کے لئے ہم نے مجبور نہیں کیا بلکہ ترک از خود جنگ میں داخل ہوئے ہیں، اور ہم تو ان کے اعلان کی وجہ سے جنگ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں، حالانکہ ترکوں کو جنگ پر انگریزوں نے مجبور کیا تھا جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں (ب) یہ جنگ سیاسی ہے مذہبی نہیں ہے، حالانکہ فتح بیت المقدس پر وزیرِ اعظم انگلستان لائڈ جارج نے اپنے بیان میں اس کو صلیبی جنگ قرار دیا تھا۔ (ج) ہم مسلمانوں کے مقدس مقامات جدہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بغداد وغیرہ پر بمباری نہ کریں گے اور نہ کوئی اثر جنگ کا ان مقاماتِ مقدسہ پر پڑنے دیں گے۔ مگر بالکل اس کے خلاف عمل کیا گیا جس کا تذکرہ ہم مفصل طور سے عہد شکنیوں کے باب میں کر چکے ہیں۔ (د) ترک مسلمانوں کے خلیفہ نہیں ہیں، حالانکہ ۱۸۵۷ء میں سلطان عبد الحمید مرحوم کا فرمان مسلمانوں کے لئے انگریزوں سے نہ لڑنے اور ان کی اطاعت کرنے کا بحیثیت خلافت حاصل کیا، اور ہندوستان میں پروپیگنڈا کیا کہ خلیفہ کے حکم پر چلنا مذہبی حیثیت سے فرض ہے۔

چنانچہ امیر عبد الرحمٰن خاں والئی کابل مرحوم اپنی تزک میں لکھتے ہیں، کہ اسی فرمانِ خلیفہ کی بناء پر سرحدی قبائل ٹھنڈے پڑ گئے۔ بہر حال ترکوں کے خلیفۂ اسلام نہ ہونے اور عدم استحقاق خلافت پر فتوے لکھوائے گئے اور بار بار حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے دستخط اور تصدیق کے لئے پیش کئے گئے، مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور بھرے مجمع میں پھینک کر لکھنے والوں کو بہت برے الفاظ کہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا سفرِ حجاز

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس برابر کیفیاتِ جہاد کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ ابتدائی کمزوریوں میں کارکنانِ مرکز کا پیغام آیا کہ رسد اور کارتوسوں کے ختم ہو جانے کی وجہ سے سخت مجبور رہیں۔ جب تک ان دونوں کا انتظام نہ ہو جہادِ حریت جاری نہیں رہ سکتا۔ بحمد اللہ ہمارے پاس بہادر آدمیوں کی کمی نہیں ہے مگر رسد اور اسلحہ کے بغیر ہم بالکل بے دست و پا ہیں۔ ساتھ کی لائی ہوئی روٹیوں کے ختم ہو جانے پر مجاہد بے ہتھیار ہو جاتا ہے اگر کارتوس اور رسد کافی

مقدار میں ہو تو توپوں اور مشین گنوں، ٹینکوں وغیرہ کا ہم بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ آپ جلد از جلد کسی حکومت کو ہماری پشت پناہی اور امداد کے لئے تیار کیجئے۔ چنانچہ اس امر کی بناء پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ارادہ بدلا اور مولانا عبید اللہ صاحب کو کابل اور خود کو استنبول پہنچنا ضروری قرار دیا۔ مولانا عبید اللہ صاحب کے کابل جانے کی تفصیل ہم ان کی ذاتی ڈائری سے ناظرین کے سامنے پیش کر چکے ہیں، اور حضرت شیخ الہند کے حجاز جانے کی تاریخی تفصیل ہم سفرنامہ مالٹا میں لکھ چکے ہیں (۱) ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں، ہاں سیاسی کارناموں کو باقتضاء

---

(۱) سفرنامہ "مالٹا" کا وہ مضمون جس کے متعلق اوپر اشارہ ہوا وہ یہ ہے:۔

مولانا مرحوم کا حجاز کو روانہ ہونا:۔ ماہ شوال ۱۳۳۳ھ میں قصد فرمایا چونکہ مولوی عزیز گل صاحب خاص خادم کو اپنے وطن کی طرف جانا اور اپنے اکابر سے ملنا اور اجازت چاہنا ضروری تھا، اس لئے ان کی واپسی کا انتظار فرمایا۔ اس مدت میں سامانِ سفر قدرے مہیا ہوگیا، عالی جناب حکیم عبد الرزاق صاحب غازی پوری برادر بزرگ جناب ڈاکٹر انصاری نے اس سفر میں نہایت زیادہ امداد دی جس کے حضرت مولانا مرحوم ہمیشہ ممنون منت رہا کئے۔ حکیم صاحب موصوف مولانا سے پہلے بمبئی پہنچ گئے، اور ہر قسم کا ضروری سامانِ سفر نہایت فراخ دلی کے ساتھ مہیا کر دیا۔ بلکہ جائے قیام اور ٹکٹ وغیرہ کا بھی انتظام کافی طور پر کر دیا۔

مولانا کے رفقائے سفر:۔ مولانا کی روانگی ایک معمولی شخص کی روانگی نہ تھی بہت سے ارباب عقیدت استفاضہ اور خدمت کے لئے ساتھ ہو لئے جن میں سے خاص خاص حضرات حسب ذیل ہیں۔

مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری، مولانا محمد سہول صاحب بھاگل پوری، مولوی محمد میاں صاحب انبیٹھوی مولوی عزیز گل صاحب ساکن زیارت کاکا صاحب، حاجی خان محمد صاحب سرونجی، مولوی وحید احمد صاحب وغیرہ۔

مولانا کے سفر کی نسبت افواہ عام:۔ لوگوں میں مشہور ہوگیا کہ مولانا دیوبند سے ہجرت کر کے جا رہے ہیں۔ اور اب ہمیشہ حرمین شریف میں عمر بسر فرمائیں گے اور چونکہ مولانا مرحوم نے بخوف وفات اپنی جائداد شرعی طریقہ پر ورثاء میں تقسیم کر دی تھی۔ اس لئے اور بھی لوگوں کو اس خیال سے تقویت ہوئی۔ مولانا نے ایک عرصہ تک کیلئے اپنے گھر کے مصارف کا بھی انتظام کر دیا تھا اس خاص افواہ کی وجہ سے ہر اسٹیشن پر لوگوں کا بہت بڑا مجمع زیارت کیلئے موجود رہتا تھا۔ طلباء مدرسہ نے اپنے اپنے اعزا کو تاریخ روانگی سے تار کے ذریعہ مطلع کر دیا تھا۔ غرضیکہ اسٹیشن پر ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا جس کی وجہ سے مصافحہ کرنا بھی سخت دشوار تھا، مشایعت کرنے والے بھی بہت سے ساتھ ہو گئے تھے۔ دہلی میں مولانا مرحوم نے گاڑی میں تاخیر ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر جا کر چائے بھی نوش فرمائی اور بہت تھوڑی دیر قیام فرما کر گاڑی کے وقت اسٹیشن پر آگئے۔ ناگرہ ریلوے سے روانہ ہوئے۔ راستہ میں رتلام۔ راندیر میں بھی قدرے قیام فرمایا۔ کیوں کہ ان مقامات پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خاص خاص لوگ تھے جنہوں نے سخت اصرار فرمایا تھا۔

راندیر سے راونہ ہو کر بمبئی پہنچے اور انجمن محافظ حجاج کے آفس میں جس کو حکیم عبد الرزاق صاحب نے پہلے سے آراستہ کر رکھا تھا قیام فرمایا۔ وہاں بھی مولانا کے زائرین کا ایک بڑا مجمع رہتا تھا۔ اگر انجمن کے کارکن انتظام کافی نہ کرتے تو غالباً مولانا کو آرام کی صورت ممکن ہی نہ ہوتی۔

بمبئی سے مولانا کی روانگی:۔ جو تاریخیں اکبر جہاز کی روانگی کی تھیں اس کے ٹکٹ مولانا مرحوم اور ان کے ساتھیوں کے لئے لیے گئے تھے۔ مولانا اور ان کے بعض خاص خدام کے ٹکٹ سیکنڈ کلاس کمرہ کے اور باقی ماندہ چھتری تنق کے تھے۔ چنانچہ بروز شنبہ ۷ ذی قعدہ ۱۳۳۳ھ کو جہاز پر سوار ہو کر جدہ کو روانہ ہو گئے۔ چونکہ اکثر ہمراہیوں کی طبیعت دریائی سفر سے مانوس نہ تھی اس لئے عموماً ان کو بدمزگی اور چکر وغیرہ کی شکایت پیش آئی، جس کی وجہ سے میوہ جات (باقی اگلے صفحہ پر)

وقت ہم نے اس میں چھپایا اور ذکر نہیں کیا۔ اور بعض امور کا جان بوجھ کر انکار کیا تھا۔ کیوں کہ ماحول اس وقت میں اسی کو چاہتا تھا، اب چونکہ موانع زائل ہو گئے ہیں، اس لئے صرف اسی کو ناظرین کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، چونکہ اس وقت سرحد کے واقعات ہو رہے تھے، حکومت ہند بوکھلائی ہوئی تھی اور وہ معمولی شبہ پر بھی گرفتار کر کے نظر بند کر رہی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے متعلق سی آئی ڈی کی اطلاعات خود ہندوستان میں اور سرحد یاغستان

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) اور عمدہ غذائیں اپنے موقع پر صرف نہ ہوئیں، جن کی بڑی مقدار حکیم صاحب نے مولانا اور ان کے رفقاء کے لئے مہیا کی تھی بلکہ بہت سی چیزیں ضائع ہوئیں، بوجہ ظہور جنگ ان دنوں قرنطینہ جزیرہ کامران سے اٹھالیا گیا تھا، اور قریب جدہ کے مقام سعد میں ہوتا تھا چنانچہ وہاں جہاز نے لنگر ڈالی اور بخیر و خوبی مولانا اور ان کے رفقاء اترے اور ایام قرنطینہ نہایت عافیت سے انجام دے کر جدہ پہنچے۔

خفیہ پولیس کی افواہ:۔ بمبئی میں سوار ہوتے وقت بعض لوگوں نے مولانا کے رفقاء سے یہ کہا کہ تقریباً آٹھ دس آدمی تمہارے ساتھ خفیہ پولیس کے ہیں ان سے احتیاط رکھنا (ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ بیان صحیح تھا یا غلط) چونکہ یہ بات اہل جہاز کو معلوم ہو چکی تھی۔ کسی شخص نے جو کہ غالباً جدہ یا مکہ معظمہ کا رہنے والا تھا۔ اس کو ترکی پولیس تک پہنچادیا اور جو لوگ مشتبہ تھے ان کے نام و نشان بتادیئے اور کہہ دیا کہ یہ لوگ مولانا پر مسلط ہو کر آئے ہیں، حالانکہ اس قسم کا خیال نہ مولانا کو تھا اور نہ ان کے رفقاء کو۔ ترکی پولیس نے فوراً ان لوگوں کو گرفتار کر لیا اور مولانا مرحوم کی خدمت میں پولیس کا افسر تصدیق کرانے کے لئے حاضر ہوا۔ مولانا خود تو آفس میں نہ گئے مگر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب وغیرہ کو بھیج دیا۔ چونکہ واقعی طور پر کوئی یقینی بات تھی ہی نہیں اس لئے مولوی صاحب موصوف نے یہی بیان دیا کہ ہم کو کوئی یقین ان لوگوں کے سی آئی ڈی ہونے یا مولانا پر مسلط کئے جانے کا نہیں ہے ہم کوئی شہادت ایسی نہیں دے سکتے جس کا ہم کو علم نہیں۔ مگر پولیس ترکی نے اس جواب کو اس پر حمل کیا کہ چونکہ ان لوگوں کو پھر ہندوستان جانا ہے، اس لئے صریح طور پر اپنی معلومات کو ظاہر نہیں کر سکتے۔ الحاصل ترکی پولیس نے ان لوگوں کو زیر حراست رکھا اور اسی طرح ان کو جج کرا کر یہ کہا کہ اگر تم اپنے محافظ سپاہیوں کا خرچ دو تو تم کو مدینہ منورہ کی زیارت کی اجازت مل سکتی ہے ورنہ تم کو ہندوستان واپس ہونا پڑے گا چونکہ ان لوگوں کے پاس اپنا خرچ نہ تھا۔ اس لئے وہ بمبئی واپس کر دیئے گئے۔

دوسری افواہ:۔ بعض خفیہ پولیس کے افسروں کا بیان ہے کہ جب مولانا مرحوم بمبئی پہنچے تو وہاں کے پولیس افسر کے پاس تار آیا کہ مولانا کو بمبئی میں گرفتار کر لیا جائے اور آگے جانے نہ دیا جائے۔ چونکہ مولانا کے پاس بہت بڑا مجمع رہتا تھا اس لئے بمبئی کے مقامی حکام کو بلوہ کا خوف ہوا اور اس وجہ سے انہوں نے عملدرآمد سے پہلو تہی کی۔ پھر دوسرا حکم روانگی کے بعد جہاز کے کپتان کے پاس پہنچا کہ مولانا کو جدہ میں اترنے نہ دیا جائے بلکہ جہاز پر ہی گرفتار کر لیا جائے۔ مگر یہ حکم اس کے پاس اس وقت پہنچا جب کہ مولانا جزیرہ سعد میں برائے قرنطینہ اتر چکے تھے اس لئے ہمیں معذوری رہی (ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ دونوں بیان کہاں تک صحیح ہیں مگر ہم کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوئے)

مولانا مرحوم کی جدہ سے روانگی اور مکہ معظمہ میں داخلہ:۔ ۲۷ ذی قعدہ ۱۳۳۳ھ کو مولانا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اونٹوں کی سواری پر مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے اور اٹھائیسویں کو مکہ معظمہ میں شب بحرہ گذار کر شام کو داخل ہوئے۔ وہ زمانہ طبعی طور پر حجاج کے ہجوم کا ہوتا ہے مگر چونکہ جنگ کی وجہ سے بہت ملکوں سے حجاج کی آمد و رفت بند یا کم پڑ تھی اس وجہ سے حسب دستور ہجوم میں کمی ضرور تھی مگر تاہم مکہ معظمہ کی گلیاں اور مکانات مسافرین سے لبریز تھے۔ حرم محترم میں بھی لوگوں کی کثرت تھی، مولانا مرحوم طواف قدوم وسعی وغیرہ کرنے کے بعد احباب سے ملنے اور ادائے عبادت میں بدل و جان مشغول ہوئے۔

میں بہت زیادہ اور خطرناک تھیں اس لئے بڑی نگرانی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اسی وجہ سے زور دیا تھا کہ آپ جلد از جلد انگریزی عملداری سے نکل جائیں۔

زمین فقر بوسم دیو اینجا در کمند آمد
نگاہ حضرت محمود و نیک دیوبند آمد
قیامت را بقامت بستے دادم غلط کردم
قیامت ہا بلاگردان آں بالا بلند آمد
ادب نا آشنا قدرِ سخنہائش چہ میداند
کہ در درگاہ حضرت ہر کہ آمد ارجمند آمد
چہ خوانم از تمنائش چہ گویم از تماشائش
تمنا خود فروش آمد تماشا خود پسند آمد
بہ پیش روئی لیلیٰ مہرومہ را برنمی تابم
نگاہ حضرت مجنوں چہا مشکل پسند آمد
زانفاس گرامی خاک پنجاب آبرو وارد
گرامی از مریدانش عظامی سربلند آمد

حضرت رحمتہ اللہ نے حجاز جانے کا ارادہ کرلیا۔ پہلے سے کوئی تذکرہ نہ تھا فوراً روانہ ہو گئے، اب حکومت کا شبہ اور قوی ہوگیا چونکہ ترکی حکومت جنگ کر رہی ہے۔ حضرت شیخ الہند وہاں جا کر ساز باز کرلیں گے، اس لئے ان کو روکنا اور گرفتار کرلینا چاہئے۔ مگر وہ ملک کے اندرونی ہیجان اور گڑبڑ سے اس زمانہ میں بہت بچتی تھی، اس لئے ان کی گرفتاری کے احکام جاری کئے گئے، مگر اس طرح کہ ہیجان کی نوبت نہ آئے۔ حضرت کے سفر کی خبر سے غیر معمولی لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ گرفتاری کے لئے گورنمنٹ بمبئی کے نام گورنر یوپی کا تار پہنچا، تو جہاز روانہ ہو چکا تھا پھر گورنر یوپی نے بواسطہ مرکزی حکومت عدن کے گورنر کو تار دیا کہ مولانا محمود حسن صاحب کو جہاز سے اتار لو مگر یہاں بھی لوگ ڈاکٹر انصاری صاحب کے لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے تار میں اس قدر تاخیر کردی کہ جہاز عدن سے روانہ ہوگیا۔ پھر تار جدہ میں جہاز کے کپتان کو دیا گیا کہ ان کو جہاز میں گرفتار کرلو۔ اترنے نہ دو، مگر اس وقت گورنر حجاز کا انتظام یہ تھا کہ جدہ سے پہلے حجاج کو جزیرہ سعد میں اتار کر مکہ معظمہ پہنچایا جائے، اس لئے وہ تار کپتان

کو اس وقت ملا جب کہ تمام حجاج جزیرہ سعد میں اتر چکے تھے۔ البتہ حضرت شیخ الہند کے ساتھ متعدد سی آئی ڈی بمبئی بلکہ پہلے سے کر دیئے گئے تھے، تا کہ وہ تمام حرکات وسکنات کی نگرانی رکھیں اور نوٹ کرتے رہیں۔ مگر جزیرہ سعد میں اترتے ہی بعض لوگوں نے ترکی پولیس کو اطلاع کر دی کہ فلاں فلاں شخص انگریزوں کے سی آئی ڈی ہیں، ان کو ترکی پولیس نے گرفتار کر لیا اور اپنی حفاظت میں حج کرا کر ہندوستان واپس کر لیا تاہم کچھ مخفی لوگ باقی رہ گئے۔ بہر حال گرفتاری کی کوششیں پیچھے تھیں اور حضرت شیخ الہند اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آگے آگے اس طرح محفوظ ہو کر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

حافظ عبدالجبار صاحبؒ دہلوی سے مولانا شیخ الہندؒ کی ملاقات

مکہ معظمہ میں بہت سے ہندوستانی تاجر کام کرتے ہیں۔ مگر دہلی کے تاجر حاجی علی جان مرحوم کے خاندان کی وہاں خصوصی حیثیت ہے۔ تجارت بھی ان کی بڑے پیمانہ پر ہے اور دینداری اور علمی حیثیت بھی ان کی اونچی ہے۔ اہل شہر اور حکام میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس خاندان کا حضرت سید احمد شہید رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے متبعین مجاہدین ستیانہ وغیرہ سے بھی قدیمی تعلق ہے، اس لئے حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ حافظ عبدالجبار صاحب سے جو کہ اس خاندان میں معمر اور سمجھدار اور امتیازی حیثیت رکھتے تھے ملے اور ان سے:۔

گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات

معاملات ذکر کر کے گورنر غالب پاشا سے ملاقات کرانے کی استدعا کی۔ انہوں نے اسی وقت ایک ہندوستانی معاملہ فہم نوجوان تاجر کو جو کہ تسبیحوں کی تجارت کرتے تھے اور ترکی اور عربی زبان سے خوب واقف تھے بلایا، اور حضرت شیخ الہند کے ساتھ کر دیا۔ وہ گئے اور غالب پاشا سے ملاقات کرا دی اور جو باتیں حضرت شیخ الہند نے کیں ان کا ترجمہ کر کے غالب پاشا کو سمجھایا، غالب پاشا نہایت توجہ اور غور سے تمام باتوں کو سنتے رہے۔ معمولی ملاقات کے بعد کہا کہ آپ کل اسی وقت تشریف لائیں، اس وقت میں جواب دوں گا۔ حضرت شیخ الہند اس روز واپس آ گئے، غالب پاشا نے ہندوستان کے معزز تاجروں سے بالا بالا تحقیق کی کہ مولانا محمود حسن کی حیثیت ہندوستان میں کیا ہے؟ لوگوں نے حضرت کی علمی اور عملی حیثیت، شہرت

اور قبولیت کی بہت اونچی شان بتلائی۔ لہٰذا اگلے دن حضرت جب ملاقات کے لئے تشریف لے گئے، تو بہت زیادہ اعزاز کیا اور نہایت تپاک سے ملے اور جو کچھ حضرت نے کہا قبول کیا۔ دیر تک تحریک اور مشن آزادی کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ پھر حضرت نے فرمایا میں انور پاشا سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا ان سے ملنے کی آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے میں جو کچھ کہتا ہوں وہ انور پاشا ہی کا کہنا ہے۔ مگر حضرت نے انور پاشا سے ملنے کا اصرار کیا تو انہوں نے ایک تحریر تمام ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اپنی طرف سے بحیثیت گورنر حجاز لکھ کر دی اور ایک تحریر گورنر مدینہ بصری پاشا کے نام لکھ دی کہ یہ معتمد علیہ شخص ہیں، ان کا احترام کرو اور ان کو استنبول انور پاشا کے پاس پہنچا دو۔ اور ایک تحریر انور پاشا کے نام لکھ دی کہ یہ معتمد علیہ شخص ہیں۔ ان کے مطالبات پورے کیجئے۔ پھر تحریک آزادی کے متعلق حضرت شیخ کو ہدایات کیں۔ کہ آپ تمام ہندوستان کو آزادیٔ کامل کے مطالبہ پر آمادہ کریں، ہم ہر قسم کی امداد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں ہم سے جو کچھ ہو سکے گا ضرور کریں گے۔ عنقریب صلح کی مجلس منعقد ہوگی، تو ہم اور ہمارے خلفاء جرمنی اور آسٹریلیا وغیرہ ہندوستان کی مکمل آزادی کے لئے پوری جدوجہد کریں گے۔ ایسا نہ ہونا چاہئے کہ ہندوستانی لیڈر سست پڑ جائیں اور انگریزوں کی باتوں میں آکر اس کے انتداب (میڈیٹ) یا اس کی تابعداری پر راضی ہو جائیں۔ تمام ہندوستانیوں کو اخباروں، عام مجمعوں، تقریروں، تحریروں میں اندرونِ ہند اور بیرونِ ہند ایک زبان اور ایک قلم ہو کر یہی مطالبہ رکھنا چاہئے اور جب تک مقصد حاصل نہ ہو جائے ساکت نہ ہونا چاہئے۔ اس کا پروپیگنڈا پوری طرح جاری کرنا چاہئے، اس مقصد کے لئے آپ کو واپس جانا اور آپس میں اتفاق و اتحاد کے ساتھ مطالبہ کرانا ازبس ضروری ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس وقت انگریز مجھ کو نہایت خطرناک نظر سے دیکھتے ہیں۔ میں اگر ہندوستان جاؤں گا تو راستے ہی میں گرفتار کر لیا جاؤں۔ مگر میں اپنے رفقاء کو اس کام کے لئے تیار کر کے ہندوستان بھیجتا ہوں، اگرچہ وہاں کی جماعتیں کانگریس وغیرہ اس پر عملدرآمد کر رہی ہیں مگر اب آپ کے حکم کے موافق کوشش زیادہ ہوگی اور پہلے سے زیادہ زوردار طریقے پر یہ مطالبہ جاری کیا جائے گا۔ میں بالفعل بالا بالا ہندوستان کی مغربی حدود میں جانا چاہتا ہوں وہاں میرے مشن کے لوگ کام کر رہے ہیں۔ ان میں مل کر کام کروں گا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد جب تک وہ مکہ معظمہ میں رہے دو تین ملاقاتیں نہایت رازدارانہ ہوئیں۔ مکہ معظمہ کے

ہندوستانی باشندوں یا انگریزی سی آئی ڈی کو خبر نہ ہو سکی۔ پھر غالب پاشا طائف کو اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ کو روانہ ہو گئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ارادہ تھا کہ مدینہ منورہ میں تھوڑے دن قیام کر کے استنبول روانہ ہوں گے، اپنے تمام ساتھیوں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا محمد میاں صاحب، مولانا سہول صاحب وغیرہ کو آخری قافلہ میں مدینہ منورہ سے ہندوستان کو روانہ کر دیا۔ جدہ پہنچ کر ان کو کوئی جہاز ہندوستان جانے والا نہ ملا۔ اس لئے وہاں ٹھہرنا پڑ گیا۔ جدا ہوتے وقت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو دیو بند کے مرکز پر کام کرنے کی ہدایات فرمائیں، اور بہت سے خفیہ امور پر مطلع فرمایا اور مولوی محمد میاں صاحب کو جو کہ بعد میں محمد منصور انصاری کے نام سے مشہور ہوئے خاص شعبوں کی نگرانی سپرد کی، غالب پاشا کی تحریر بھی ان ہی کو دی گئی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اگرچہ پہلے سے اس تحریک آزادی میں شریک نہیں تھے، مگر مدینہ منورہ میں پہنچ کر بالکل متحد اور ہم نوا ہو گئے تھے۔

میرا سیاسیات میں داخل ہونا

میں اس وقت تک نہ مشن آزادئ ہند میں شریک ہوا تھا نہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی عملی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ مدینہ منورہ پہونچنے کے بعد حضرت شیخ الہند نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا خلیل احمد صاحب کو طلب فرما کر اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع فرمایا میں اس وقت تک علمی جدوجہد میں مشغول تھا، اگرچہ مدینہ منورہ میں اس سے پہلے جب کہ محاذ سویز کے لئے متطوعین (والنٹروں) کو بھیجنا شروع کیا گیا تھا، ترغیب جہاد پر تقریر کرنے کی نوبت آئی تھی اور اس سے متاثر ہو کر کچھ لوگ اس محاذ پر جہاد کے لئے مدینہ منورہ سے گئے تھے۔ مگر اس کے علاوہ عملی جدوجہد کی نوبت نہیں آئی تھی، اب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات اور خیالات سن کر میں بھی متاثر ہوا اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بھی۔ یہ وقت میری سیاسیات کی ابتداء اور بسم اللہ کا وقت ہے اور یہی وقت حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی شرکت کا ہے، رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ آمین۔ اس کے بعد مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب تک حجاز میں رہے بالکل متفق اور ہم نوا رہے۔ تقدیری امور پیش آکر رہتے ہیں، کچھ لوگ حضرت مولانا خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جہاز میں لاہور کے باشندے رفیق رہے تھے، ان میں سے دو نوجوان مدینہ منورہ میں رہ گئے، ہندوستان

واپس نہیں ہوئے۔ جب تک عام حجاج مدینہ منورہ میں مقیم رہے کوئی تفتیش ترکی پولیس نے نہ کی مگر قافلہ روانہ ہونے کے بعد تجسّس اور ہر باقی رہنے والے کی دیکھ بھال شروع ہوئی۔ وہ دونوں لاہوری نوجوان پولیس انسپکٹر کی نظر میں مشتبہ ثابت ہوئے۔ پولیس نے ان کو گرفتار کرلیا، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب ؒ سیدھے سادھے بزرگ تھے، ان کو ان دونوں کے متعلق حسن ظن تھا مولانا نے ان کی گورنر مدینہ کے یہاں برأت کی، اس لئے پولیس کمشنر نے مولانا کو بھی مشتبہ قرار دیا اور گورنر مدینہ منورہ بصری پاشا کو نہ صرف ان دو نوجوانوں کی طرف سے بلکہ مولانا خلیل احمد صاحب کی طرف سے بھی بدظن کرنا شروع کیا۔ ادھر مولانا مرتضٰی حسن صاحب نے جدہ سے ہر ڈاک میں طویل طویل خطوط پانچ پانچ چھ چھ ورقوں پر بھیجنے شروع کیے۔ وہاں ان کو کوئی کام نہ تھا حضرت شیخ الہند کو بلادھڑک مضامین لکھتے تھے اور چونکہ بوجہ جنگ ڈاک خانہ میں کوئی خط غیر عربی کا ترکی نہیں لیا جاتا تھا، تو انہوں نے بدویوں کے ذریعے بھیجنا شروع کیا وہی ڈاک لانے والا بدوی نجی طریقہ پر لاتا تھا پوسٹ آفس کی مہر اور ٹکٹ ان پر نہیں تھے یہ طریقہ حجاز میں جاری تھا وہ ڈاک لانے والا بدوی کچھ اجرت لے کر مکتوب الیہ کو پرائیویٹ خط پہنچادیتا تھا۔ کسی طریقہ سے وہ خطوط بدوی سے پولیس کمشنر نے حاصل کر لئے وہ خطوط سنسر ہوئے تو پولیس کمشنر کو ان کے ترجموں سے اور بغیر پوسٹ آفس آنے سے شبہ ہوا اس نے گورنر مدینہ "بصری پاشا" کو بدظن کردیا۔ جب کہ ہم سب مطمئن تھے۔ پولیس کمشنر کی طرف سے گورنر مدینہ طیبہ کے پاس یہ شکایتیں پہونچیں اور وہ ان سب حضرات سے بدظن ہوگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب حضرت شیخ الہندؒ صاحب اس سے ملنے اور استنبول جانے کے لئے تقاضا کرنے گئے تو اس کا رخ بدلا ہوا پایا اور دیکھا کہ وہ غیر اطمینان بخش باتیں کررہا ہے۔ اس پر مزید یہ کارروائی کی گئی کہ دونوں حضرات (شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب) کو آفس میں بلا کر پوچھ گچھ کی گئی کہ دونوں کے جوابات قلم بند کر کے شام کو بھیجے گئے۔ اس لئے سب کو فکر ہوئی کہ کہیں کوئی فتنہ سامنے نہ آجائے، جنگ کا زمانہ ہے ہر ایک حکومت اس وقت انتہائی احتیاط سے کام لیتی ہے۔ حضرت شیخ الہند ؒ نے ان احوال کو دیکھ کر اسی ترجمان (مکی تاجر) کے واسطے سے غالب پاشا کو خط لکھا کہ یہاں گورنر مدینہ رکاوٹ ڈال رہا ہے، پولیس کمشنر نے گورنر مدینہ کو مشتبہ کردیا ہے کیونکہ اس کو ہمارے مخالفین نے بدظن کردیا ہے، اس خط کے پاتے ہی غالب پاشا نے گورنر مدینہ کو

نہایت تاکیدی خط لکھا کہ مولانا محمود حسن صاحب بہت بڑے اور معتمد علیہ شخص ہیں میں نے پوری تحقیق کرلی ہے ان پر ہرگز شبہ نہ کرو اور ان کے منشا کے مطابق ان کو انور پاشا کے پاس روانہ کردو۔ اس سے گورنر مدینہ منورہ کا رویہ اور خیال یک بارگی بدل گیا۔ اور اس نے حضرت رحمتہ اللہ علیہ کو بلا کر معذرت کی اور پولیس کمشنر کو بلا کر تنبیہ کی اور حضرت شیخ الہند کو کہا کہ آپ تیاری کرلیں جب آپ تیار ہو جائیں گے بھیج دیا جائے گا۔ اس کے ایک دو دن بعد ہی خبر آئی کہ انور پاشا اور جمال پاشا مدینہ منورہ آرہے ہیں۔

انور پاشا اور جمال پاشا کی مدینہ منورہ میں آمد اور ملاقات

اس وقت تک مدینہ حجاز ریلوے جاری تھی، ٹرین آتی جاتی تھی، تار بھی جاری تھا یکایک تار آیا کہ یہ دونوں وزیران جنگ دورہ کرتے ہوئے کل کو مدینہ منورہ پہنچ رہے ہیں ہم نے بھی عرضی تیار کی، حکومت مدینہ منورہ بھی استقبال کی تیاری میں مشغول ہوگئی اور اہل شہر بھی استقبال کی تیاری میں مصروف ہوگئے، چونکہ انور پاشا اس زمانہ میں حکومت ترکیہ کے وزیر جنگ تھے اور جمال پاشا چوتھے فیلق (ڈویژن) کے جو کہ محاذ جنوبی اور غربی پر یعنی میدان سویز سینا، حجاز پر متعین تھا، اس لئے انور شاہ کا فریضہ تھا کہ مرکز کی خبر گیری رکھتے ہوئے ہر محاذ کی محافظت کریں اور جمال پاشا کو صرف اپنے محاذ کی خبر گیری ضروری تھی اس لئے انور پاشا تمام محاذوں کا دورہ کرتے ہوئے جب محاذ جنوبی پر پہنچے اور سوریہ (سیریا شام) اور سویز وغیرہ سے فارغ ہوئے تو ضروری معلوم ہوا کہ بادشاہِ دوجہاں سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کا شرف بھی حاصل کرلیں۔ اس لئے مدینہ منورہ کی حاضری کا ارادہ کیا گیا۔ اور جمعہ کے مبارک دن اس کے لئے سفر کیا گیا، چنانچہ جمعہ کی صبح کو تقریباً ۹ یا ۱۰ بجے وہ اسپیشل ٹرین جس میں یہ دونوں وزراء اور ان کے رفقاء تھے حسب اعلان مدینہ منورہ پہنچی، وقت معین سے پہلے مشتاقان ملاقات اور زائرین کی بے شمار تعداد نے تمام اسٹیشن اور اس کے جوانب کو بھر دیا تھا اہل شہر اور حکومت اور فوج کی طرف سے جلوس کا انتظام تھا۔ رؤساء شہر اور معززین کا تعارف کرلیا گیا ایڈریس کا جواب دینے کے بعد مسجد نبوی کی طرف روانگی ہوئی، چونکہ جمعہ کا وقت قریب آگیا تھا اس لئے یہی قصد کیا گیا کہ زیارت حضور علیہ السلام سے فارغ ہو کر مسجد ہی میں ٹھہرے رہیں۔ نماز جمعہ سے فراغت کے بعد قیام گاہ پر جائیں۔

جلوس کی روانگی کے وقت متنٹن سواری کے لئے پیش کی گئی تو انور پاشا نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم غلامانہ طریق سے بارگاہ نبوت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ اس لئے پیدل چلیں گے، اہل شہر نے پہلے ہی سے جلوس کی مندرجہ ذیل ترتیب دے رکھی تھی۔ اربابِ طریقت کا مجمع مع اپنے اپنے مریدین کے سب سے آگے آگے زریں جھنڈے لئے ہوئے اور ذکر و تسبیح بالجہر کے ساتھ اشعار مدحیہ پڑھتے ہوئے چل رہا تھا انکی سات یا آٹھ جماعتیں تھیں۔ اسکے بعد حرم محترم نبوی کے خدام کی علیحدہ علیحدہ مختلف جماعتیں تھیں۔ مؤذنوں کی جماعت، جاروب کشوں کی جماعت، اماموں کی جماعت، خطیبوں کی جماعت علیحدہ علیحدہ تھیں، سب کے اخیر میں حجرہ شریفہ کے خصوصی خدام آغاوات (خواجہ سراؤں) کی جماعت تھی۔ سب کے سب اپنی اپنی یونیفارم (وردیاں) پہنے ہوئے حمد و صلوۃ دعا و ثناء پڑھتے ہوئے خراماں خراماں چل رہے تھے، ان کے پیچھے ان کے رفقاء اور حکام شہر تھے ان کے بعد اہل شہر تھے تمام جلوس کے دائیں بائیں مسلح فوجیوں کی قطار تھی، میں (کاتب الحروف) تاک میں تھا کہ موقعہ ملے تو انور شاہ کے پاس پہنچوں اور عرضی پیش کر دوں۔ چنانچہ قطار چیر کر انور پاشا کے پاس پہنچا اور اس عرضی کو جس میں حضرت شیخ نے تنہائی میں ملاقات کی استدعا کی تھی پیش کر دی، انہوں نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری کو دے دی، مفتی ماموں بری کو جو کہ مدینہ منورہ میں تمام مذہبی اور دینی طبقات کے رمی سردار تھے اور نقیب الاشراف شامی رحمۃ اللہ علیہ کو جو کہ رفقاء انور پاشا میں سے تھے میں نے پہلے سے تیار کر لیا تھا، ان کی اعانت اور ہمدردی کی وجہ سے مجھ کو کسی طرف سے روک ٹوک نہیں کی گئی۔ میں عرضی دے کر واپس آیا تو بعد میں معلوم ہوا کہ عرضی پر غور کیا گیا اور دونوں مذکورہ بالا معززین کی سعی سے مغرب کے بعد کا وقت تنہائی میں ملاقات کا دیا گیا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب موقعہ ملاقات پر پہنچے۔ ایک تنہا اور بند کمرہ میں ملاقات ہوئی، جمال پاشا سے باتیں ہوئیں، غالب پاشا کا خط ان کو دکھایا گیا۔ بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے اور تمام باتیں غور اور اطمینان سے سنیں اور فرمایا کہ: تحریک مطالبہ آزادی اہل ہند کو متفقہ طور سے جاری رکھنا چاہئے۔ جب تک مقصود یعنی آزادی کامل حاصل نہ ہو جائے ساکت نہ ہوں، عنقریب صلح کی مجلس بیٹھے گی۔ ہم اہل ہند کی آزادی کیلئے پوری جد و جہد عمل میں لائیں گے، تم لوگ مطمئن رہو اور جس طرح ممکن ہوگا ہم ان کی یعنی اہل ہند کی امداد و اعانت کریں گے۔ اس وعدہ اور عہد کیلئے انہوں نے کہا کہ تمہاری خواہش کے مطابق تحریر بھی دیں گے۔ ہم نے عرض

کیا کہ تحریر صرف ترکی زبان میں نہ ہونی چاہیے۔ بلکہ عربی اور فارسی میں بھی ہونی چاہئے تاکہ اہل ہند سمجھ سکیں، انہوں نے اس کو قبول کیا مگر یہ کہا کہ چونکہ یہاں کا قیام حسب پروگرام تھوڑا ہے۔ اور مقامی مشاغل بہت زیادہ ہیں اس لئے ہم شام (دمشق) جا کر تحریریں مکمل بھیج دیں گے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مطالبہ کیا کہ مجھ کو حدود افغانستان تک بالا بالا پہنچا دیا جائے۔ ہندوستان کے راستے سے مجھ کو وہاں تک (مرکز تحریک یعنی یاغستان) اس وقت پہونچنا غیر ممکن ہے۔ انہوں نے اس سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ روس نے اپنی فوجیں ایران میں داخل کر کے افغانستان کا راستہ کاٹ دیا ہے اور سلطان آباد تک پہنچ گیا ہے اس لئے یہ امر ہمارے قبضہ سے اس وقت باہر ہے۔ یا تو آپ جدہ ہی کے راستے سے اپنے وطن واپس جائیں اور اگر آپ کو اپنی گرفتاری کا خطرہ ہے تو حجاز یا ترکی علمداری میں کسی دوسری جگہ قیام فرمائیں۔ یہ اطمینان بخش باتیں ہو جانے کے بعد ہم واپس آگئے۔

مسجد نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں جلسہ علماء اور حضرت شیخ الہندؒ

مفتی ماموں بری مرحوم صدر علماء مدینہ کے پاس انور شاہ کا حکم اسی شب میں پہنچا کہ میں علماء مدینہ منورہ کی تقریریں سننے کا شائق ہوں، مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہر ایک عالم کے حلقۂ درس میں علیحدہ علیحدہ جا کر تقریریں سنوں اس لئے میری خواہش ہے کہ صبح کو بعد از اشراق مسجد نبوی میں علماء مدینہ جمع ہو جائیں اور اپنی اپنی تقریروں سے ہم کو مستفیض فرمائیں۔ مفتی صاحب موصوف چونکہ ہمارے استاذ الاساتذہ حضرت شیخ عبد الغنی صاحب مرحوم مجددی دہلوی کے شاگرد تھے، اس لئے کاتب الحروف اور حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ نہایت دوستانہ بلکہ مشفقانہ تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے نقیب العلماء کو بھیجا کہ انور پاشا چاہتے ہیں کہ صبح کو اشراق کے بعد علماء کا اجتماع مسجد نبوی (حرم محترم) میں ہو اور علماء تقریر کر کے حاضرین کو مستفیض کریں اس لئے تجھ کو اس وقت حاضر ہونا چاہئے۔ اور میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر دو حضرات مشائخ بھی تشریف لائیں ہمارے لئے یہ زریں موقعہ تھا ہم نے قبول کیا۔

چنانچہ اجتماع ہوا اور مقام صدارت انور پاشا کے لئے تسلیم کیا گیا۔ مفتی صاحب ان کے سامنے وسط میں بیٹھے اور اپنے بائیں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بائیں مولانا خلیل احمد

صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بائیں کاتب الحروف کو بٹھایا گیا، مفتی صاحب کو تقریر کا حکم ہوا۔ حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب رحمہم اللہ نے یہ عذر کیا کہ ہم ہندوستانی ہیں ہم کو عربی زبان میں تقریر کی عادت اور مہارت نہیں ہے۔ اس لئے ہم معافی چاہتے ہیں پھر مجھ کو حکم کیا گیا مجھ کو عربی زبان میں عادت تھی ہی میں نے حسب مناسب وقت فلسفۂ جہاد پر مبسوط اور مفصل تقریر کی جس سے عقلی اور نقلی دلائل سے روشنی ڈالی کہ نوعِ انسانی کی فلاح اور بہبودی کے لئے جہاد عقلی طور پر ضروری ہے، اسی میں انسانوں کی ترقی اور بہبودی اور کمال مضمر ہے، اس کے علاوہ مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دیا گیا تھا یہ تقریر تقریباً آدھ گھنٹہ یا اس سے زیادہ جاری رہی۔ اس کو حاضرین مجلس نے بہت پسند کیا اور نہایت توجہ اور غور سے سنتے رہے۔ بعد از تقریر سبھوں نے خوشی اور ممنونیت کا اظہار کیا۔

اس کے بعد دوسرے علماء نے دوسرے موضوعوں پر تقریریں کیں مگر افسوس کہ حاضرین مجلس نے ان کی تقریروں کو اس قدر استحسان کی نظر سے نہیں دیکھا۔ تقریباً دو گھنٹہ کے بعد یہ جلسہ ختم ہو گیا۔ انور پاشا نے کچھ نقد حاضر ہونے والے علماء کے لئے بذریعہ مفتی صاحب موصوف بطور نذرانہ بھیجا جو کہ پانچ اشرفی فی کس تقسیم کیا گیا، حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب نے عذر کیا کہ ہمارے پاس خرچ کافی مقدار میں موجود ہے۔ ہم کو حاجت نہیں ہے تو کہا گیا کہ یہ نقد صدقہ اور خیرات نہیں۔ یہ عطیہ شاہانہ ہے، اسکو قبول کرنا چاہئے تو دونوں حضرات نے قبول فرما کر مجھ کو ہی دے دیا۔

انور پاشا اور جمال پاشا کا شام کو روانہ ہونا اور تحریرات کا وہاں سے بھیجنا

اس جلسہ کے چند گھنٹہ بعد دونوں حضرات اور ان کے رفقاء اسپیشل ٹرین میں شام کو روانہ ہو گئے، اور دو تین دن کے بعد تحریریں تینوں زبانوں میں مرتب شدہ دونوں وزیروں کے دستخط سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بذریعہ گورنر مدینہ منورہ شام سے آ گئیں۔ مضمون سب کا ایک ہی تھا صرف زبان کا فرق تھا جس میں ہندوستانیوں کے مطالبۂ آزادی کے استحسان اور ان سے اس مطالبہ میں ہمدردی کو ظاہر کرتے ہوئے ان کی اس بارے میں امداد و اعانت کا وعدہ تھا اور ہر اس شخص کو جو کہ ترکی رعیت یا ملازم ہو حکم تھا کہ مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند پر اعتماد کرے اور ان کی اعانت میں حصہ لے۔

تحریرات اور وثائق کا ہندوستان پہنچانا

چونکہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو دھن لگی ہوئی تھی کہ جس طرح ممکن ہو میں مرکز تحریک یاغستان جلد از جلد پہنچ جاؤں۔ اگرچہ اعلیٰ درجہ کے ترکی آفیسر اس کو پسند نہیں کرتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ آپ ترکی قلمرو میں قیام کر کے یہاں ہی سے اپنی تحریک چلاتے رہیں، اس لئے تجویز فرمایا کہ ان تحریروں کے فوٹو متعدد لئے جائیں اور ہر مرکز اور برانچ پر پہنچا دیئے جائیں، مگر انگریزی علمداری میں جانے والوں کی چونکہ نہایت سخت تفتیش ہوتی تھی کسی چیز کا نکال کر لے جانا نہایت مشکل ہوتا تھا، اس لئے تجویز فرمایا کہ لکڑی کا صندوق کپڑے کے رکھنے کا بنوایا جائے اور اس کے تختوں کو اندر سے کھود کر اس میں کاغذات رکھ دیئے جائیں اور پھر تختوں کو اس طرح ملا دیا جائے کہ جوڑ ظاہر نہ ہو۔ اس وقت ایک نہایت ماہر اور استاد بڑھئی ہمارے مکان میں لکڑی کا کام کر رہا تھا۔ اس سے کہا گیا اس نے اسی طرح جاوی لکڑی کا صندوق بنا دیا۔ اور کھدے ہوئے تختے میں کاغذ رکھ کر اس طرح بند کر دیا کہ باہر سے دیکھنے والا کتنا ہی مبصر کیوں نہ ہو شبہ بھی نہ کر سکے۔ صندوق میں کچھ زائد کپڑے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اور کچھ نئے کپڑے اور شامی تھان ریشمی اور غیر ریشمین مشجر وغیرہ کے بچوں اور عورتوں کے لئے رکھ دیئے گئے، اور چونکہ ہر مہینہ میں تجارتی جہاز مغل کمپنی کا غلہ اور سامان لے کر جدہ آتا تھا اور واپسی پر بقیہ حجاج کو لے جاتا تھا تجویز ہوا کہ اس میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے بقیہ رفقاء اور حضرت مولانا خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء روانہ کر دیئے جائیں۔ چونکہ زمانہ جنگ کا تھا اس لئے جہازوں کی آمد و رفت عام دستور کے مطابق جاری نہ تھی۔ اس لئے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے رفقاء میں سے مولانا ہادی حسن صاحب رئیس خانجہاں پور ضلع مظفر نگر اور حاجی شاہ بخش صاحب سندھی جو کہ حیدر آباد سندھ کے باشندے اور مشن آزادی کے پہلے سے ممبر تھے باقی رہ گئے تھے اور جانے کا قصد فرما رہے تھے۔ (۱) اور ان کو وہ صندوق دے دیا گیا اور سمجھایا گیا کہ اپنے مکان پر پہنچ کر ان کاغذات کو نکال لیں اور حاجی نور الحسن صاحب (رئیس موضع رتھیڑی ضلع مظفر نگر) کو دے

---

(۱) بلکہ اس مقصد سے وہ مہینہ پہلے جدہ روانہ ہو چکے تھے۔ مگر بندرگاہ پر جہاز نہ ملنے کی وجہ سے وہ اور شاہ بخش صاحب موصوف مکہ معظمہ جا کر بانتظار جہاز ٹھہر گئے تھے، حضرت شیخ الہند مع دیگر رفقاء مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ پہنچے، تو اس وقت تک یہ وہیں تھے اور جہاز کے منتظر تھے۔

دیں گے وہ احمد مرزا صاحب فوٹو گرافر دہلی سے ان تحریروں کے فوٹو اتروا کر چند کاپیاں لے لیں گے اور فلاں فلاں جگہ پہنچادیں گے۔

حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے رفقاء مدینہ طیبہ سے مکہ معظمّہ کو

حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقاء کا قافلہ ۱۲ر جمادی الثانی کو مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر اخیر ماہ مذکورہ میں مکہ معظمّہ پہنچا۔ حضرت شیخ الہند قدس سرہ اللہ العزیز نے چند روز مکہ معظمّہ میں قیام فرما کر طائف کا قصد فرمایا اور ۲۰ر رجب کو آپ طائف روانہ ہو گئے۔ مگر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور دیگر رفقاء مکہ معظمّہ میں رہ گئے۔ حضرت شیخ الہند شریف حسین کی بغاوت کی وجہ سے طائف میں محصور ہو گئے۔ جب دس شوال کو طائف سے واپس ہو کر مکہ معظمّہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا خلیل احمد صاحب اور دوسرے رفقاء جہاز آجانے کی وجہ سے جدہ روانہ ہو گئے ہیں، چونکہ کوئی خبر حضرت شیخ الہند کے طائف سے واپس ہونے کی نہیں تھی اس لئے یہ سب حضرات بغیر انتظار اور بلا ملاقات روانہ ہو گئے تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ضروری سمجھا کہ ان سے وداعی ملاقات کی جائے۔ اس لئے حضرت شیخ الہندؒ بھی جدہ روانہ ہو گئے۔ جب جہاز سامان وغیرہ اتار کر اور اپنی ضروریات پوری کر کے تیار ہو گیا۔ تو جانے والے حضرات ٹکٹ لے کر سوار ہو گئے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے ساتھ ان کی اہلیہ محترمہ اور حاجی مقبول احمد صاحب تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھیوں میں سے مولانا ہادی حسن خانجہاں پوری اور حاجی شاہ بخش صاحب سندھی تھے ان سبھوں کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ساحل (پورٹ) تک رخصت کیا اور جہاز روانہ ہو گیا۔

تحریرات کا ہندوستان پہنچنا اور سی آئی ڈی کی تفتیش سے بچ کر نکل جانا

بمبئی میں سی آئی ڈی کو اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مخلصین کو خیال تھا کہ اسی جہاز میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائیں گے۔ اس لئے انگریزی پولیس سی آئی ڈی اور اہل شہر کا بہت بڑا مجمع جہاز پر پہنچ گیا تھا۔ اسی مجمع میں سے ایک صاحب نے جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مخلصین میں سے تھے۔ مولانا ہادی حسن صاحبؒ سے کہا کہ اگر کوئی چیز محفوظ رکھنی ہو تو مجھ کو فوراً دے دیجئے، میں اس کو نکال دوں گا اور جہاں پہنچانا ہو اس کا پتہ دے دیجئے۔ وہاں پہنچا

دوں گا۔ مولانا ہادی حسن صاحب اگرچہ پہلے سے ان سے واقف نہیں تھے۔ مگر ان کے مخصوص انداز سے ان کے اخلاص وصداقت کا یقین ہوگیا اور صندوق ان کے حوالے کردیا۔ یہ صاحب عام مسافروں کے سامان کے ساتھ یہ صندوق بھی قلیوں سے اٹھوا کر لے گئے اور فوراً اسٹیشن لے جاکر بذریعہ پارسل چلتا کردیا۔ پولیس اور سی آئی ڈی حضرت شیخ الہندؒ کو ڈھونڈنے میں مشغول تھی جب یہ یقین ہوگیا کہ حضرت شیخ الہندؒ نہیں ہیں، البتہ ان کے ساتھ کے کچھ لوگ ہیں۔ تو پولیس نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور مولانا ہادی حسن صاحب کو حراست میں لے لیا اور نہایت سخت تلاشی لی۔ حتی کہ ہاتھ کی چھڑی بھی توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کردی۔ مگر بحمد اللہ کوئی مشتبہ چیز نہیں نکلی (۱)۔ پھر ان سب کو پولیس کی حراست میں نینی تال پہنچادیا گیا۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے پوچھ گچھ ہوئی تو فرمایا کہ میں فلاں جہاز فلاں تاریخ کو گیا تھا۔ مولانا محمود حسن صاحب کا ساتھ نہ جاتے میں تھانہ آتے میں۔ البتہ عام حاجیوں کی طرح حج وزیارت میں میری شرکت بھی رہی، میں ان کی پارٹی میں نہیں ہوں۔ ایک ہفتہ یا عشرہ حضرت مولانا موصوف کو رکھ کر چھوڑ دیا گیا۔ البتہ مولانا ہادی حسن صاحب کو روک لیا گیا ان سے بہت زیادہ پوچھ گچھ ہوئی۔ ڈرایا دھمکایا گیا۔ سختی بھی کی گئی۔ اور لالچ بھی دیا گیا۔ مگر یہ نہایت مستقل رہے۔ کسی راز کی خبر نہیں دی جب ہر قسم کی سختی اور طمع دینے پر بھی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی تو ایک ڈیڑھ ماہ بعد آپ کو بھی رہا کردیا گیا۔

صندوق خانجہاں پور میں

مولانا محمد نبی صاحب کو کسی ذریعہ سے معلوم ہوگیا تھا کہ صندوق کے تختوں میں کوئی راز کی چیز ہے۔ جیسے ہی صندوق پہنچا۔ اس کے کپڑے نکال کر لکڑی کے دوسرے صندوق میں رکھ دیئے گئے، اور اس صندوق کو توڑنا شروع کردیا۔ ان کی اطلاع صحیح ثابت ہوئی اور ایک تختہ کے اندر سے تینوں کاغذات برآمد ہوئے فوراً ہی ان کو نکال کر محفوظ کرلیا۔

---

(۱) حاجی شاہ بخش صاحب سندھی کے پاس ان انقلابی اخباروں کے پرچے تھے جن کو خیری برادرس نے برلین سے جاری کیا تھا اور جو اعلانات ترکی سے ترغیب جہاد وغیرہ میں شائع ہوئے تھے۔ ان سب کو انہوں نے زنبیل میں حفاظت سے رکھ رکھا تھا۔ جب جہاز پر پولیس کی یہ یورش دیکھی تو یہ اس بھیڑ میں زنبیل ہاتھ میں لٹکائے ہوئے پھرتی سے نکل گئے۔ چونکہ غیر معروف شخص تھے کسی کو شبہ بھی نہ ہوا۔ مگر جب وطن پہنچے تو گرفتار کرلئے گئے۔ اور کچھ دنوں نظر بند رہ کر رہا ہوگئے۔

پولیس کی یورش، تلاشی اور حضرت شیخ الہندؒ کی کرامات

تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ایک صاحب کے بیان سے سی آئی ڈی نے پتہ چلا لیا کہ وہ کاغذات ایک صندوق میں مولانا ہادی حسن صاحب کے یہاں ہیں۔ فوراً مولانا کے مکان پر پولیس کی دوڑ پہنچی اور مکان کا محاصرہ کر لیا۔ ایک عجیب و غریب اتفاق تھا کہ مولانا محمد نبی صاحب اس وقت ان تحریروں کو نکالے ہوئے نقل کر رہے تھے۔ سپاہیوں کی دوڑ دیکھ کر جلدی میں ان کاغذات کو توڑ مروڑ کر صدری کی جیب میں رکھ لیا اور صدری مردانہ مکان میں ایک کھونٹی پر لٹکا دی۔

تلاشی دس بجے سے شروع ہوئی اور نہایت سختی کے ساتھ چار بجے تک جاری رہی۔ عورتوں کو ایک کمرہ میں الگ بند کر دیا تھا ہر شخص کی تلاشی لے کر مردانہ مکان سے بھی نکال دیا گیا صرف ایک نمبردار صاحب پولیس کے ساتھ رہے تھے ہر ایک چیز کی تلاشی لی گئی۔ کھیل کھلونوں اور عورتوں بچوں کی ڈبیوں تک کو کھول کھول کر دیکھا گیا۔ کپڑوں کے صندوق کی کم بختی آئی۔ اس کا ایک ایک تختہ توڑ کر ریزہ ریزہ کیا گیا، مگر جس چیز کی تلاش تھی وہ دستیاب نہ ہوئی۔ کیونکہ یہ صندوق وہ صندوق ہی نہ تھا۔ اور عجیب اتفاق یا حضرت شیخ الہندؒ کی کرامت یہ تھی کہ اس صدری پر کسی کی نظر نہ گئی جو مردانہ مکان میں سب کے سامنے کھونٹی پر ٹنگی ہوئی تھی اور جس میں وہ خزانہ تھا جس کی جستجو میں پولیس سرگرداں تھی۔

چھ گھنٹہ کی سرگرم تفتیش اور تلاشی کے بعد پولیس کو ناکام واپس ہونا پڑا۔ موضع رتھیڑی ضلع مظفر نگر میں ہے۔ یہاں جناب حاجی نور الحسن صاحب رہتے تھے جن کے متعلق حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز کے یہ طے فرما دیا تھا کہ وہ ان تحریروں کے فوٹو لے کر اور اس کی کاپیاں کرا کر فلاں فلاں مرکز میں بھیجیں گے، پولیس حاجی صاحب کے یہاں بھی پہنچی مگر ناکام واپس ہوئی۔

حاجی احمد مرزا فوٹو گرافر دہلی کے یہاں تلاشی اور ناکامی

سراغ رساں نے پولیس کو صحیح بتایا تھا کہ حاجی احمد مرزا صاحب کے یہاں تحریروں کے فوٹو لئے جائیں گے، چنانچہ پولیس نے حاجی صاحب کی دوکان پر چھاپہ مارا۔ مگر اب تک وہ

تحریریں حاجی صاحب کے یہاں نہیں پہنچی تھیں۔ حاجی نورالحسن صاحب رحمتہ اللہ علیہ اسی وقت ان کو لے جارہے تھے، جب حاجی صاحب فوٹو گرافر صاحب کی دوکان کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ پولیس دوکان کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ حاجی صاحب ان تحریروں کو جیب میں ڈالے ہوئے الٹے پاؤں واپس ہوگئے۔

دوسرے وقت حاجی نورالحسن صاحب مرزا صاحب کی دوکان پر پہنچے، مرزا صاحب کی ثابت قدمی اور پختگی ملاحظہ کیجئے کہ پولیس ایک دفعہ چھاپہ مار چکی ہے۔ خدشہ اور خطرہ موجود ہے مگر ہر خطرہ سے بے نیاز ہوکر حاجی صاحب نے فوٹو لئے۔ عین اسی وقت کہ پلیٹیں پانی میں پڑی ہوئی تھیں اور پانی کا طشت میز کے نیچے رکھا ہوا تھا پولیس پہنچ گئی۔ ساری دکان چھان ماری ہر ایک البم ٹٹولا۔ مگر اس طشت پر کسی کی نظر نہیں گئی۔ اس کو حضرت شیخ الہندؒ کی کرامت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ بہرحال پولیس یہاں سے بھی ناکام واپس ہوئی۔

حاجی صاحب کا حسب ہدایت کام کرنا

فوٹو کی کاپیاں تیار ہوگئیں۔ حاجی نورالحسن صاحب نے ان کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور جہاں جہاں پہنچانے کا حکم تھا۔ پہنچادیا۔ یہ غلط ہے کہ ان تحریرات کو جلادیا گیا جیسا کہ مولانا عبیداللہ صاحب ذاتی ڈائری میں لکھتے ہیں۔ وہ تو اس زمانہ میں کابل میں تھے ان کو غلط خبر پہنچائی گئی۔ یہ تمام فوٹو ذمہ داران مراکز کے پاس پہنچا تو دیئے گئے تھے مگر چونکہ حکومت کی طرف سے تشدد اور چھان بین بہت زیادہ ہورہی تھی تو ممکن ہے کہ بعض لوگوں نے ان کو جلادیا ہو تاکہ کوئی خدشہ باقی نہ رہے۔

ان تحریرات کا کارآمد ہونا

یہ تحریرات اور وثائق بہت زیادہ کارآمد ہوئے اور حکومت ترکیہ اور اس کے خلفاء پوری طرح امداد کرتے رہے۔ مگر قدرت نے پانسہ ہی پلٹ دیا۔ جرمنی اور ترکی کی فتح مندی کے بعد جب امریکہ انگریزوں کا حلیف بن گیا اور مسٹر ولسن کے پرفریب نکات سامنے آئے تو یکایک حالت بدل گئی۔ اور کل کی فتح آج کی شکست بن گئی۔ امریکہ کی بے شمار فوجیں اور لاتعداد ہتھیار جب اتحادیوں، انگریزوں اور فرانس وغیرہ کی مدد پر آگئے اور ادھر شریف حسین نے

غدر اور خیانت کر کے انگریزوں کی حمایت میں ترکوں اور ان کی قوت کو ہر قسم کا نقصان پہنچایا۔ عربوں اور ترکوں میں انتہائی نفرت پھیلادی۔ تا آنکہ سوریا، فلسطین، عراق وغیرہ میں عرب کے عوام ترکوں کو قتل وغارت کرتے تھے اور عرب سپاہی ترکی فوج میں سے بھاگنے لگے۔ اور جدوجہد سے جان چرانے لگے تو طبعی طور پر ہر جگہ ناکامی ہی سامنے آگئی اور جو کچھ نہ ہونا چاہئے تھا وہ واقع ہوگیا۔ تفصیلات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ خدا مالک ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔

حضرت شیخ الہند کا طائف روانہ ہونا اور محصور رہو جانا

انور پاشا اور جمال پاشا سے جب تحریری دستاویز حاصل کرلیں تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا قصد تھا کہ کسی طرح ایران کے راستے بالا بالا یاغستان (یعنی اپنی تحریک کے مرکز پر) پہنچ جائیں، مگر روسی اور انگریزی فوجوں نے راستہ روک لیا تھا، جنگی محاذ ان راستوں پر قائم ہوگئے تھے، اس لئے یہی قصد فرمایا کہ بحری راستے سے سفر کیا جائے اور بمبئی نہ جایا جائے۔ بلکہ بلوچستان کے کسی بندرگاہ (مکران وغیرہ) پر بھیس بدل کر بادبانی جہاز سے پہنچیں اور پھر یاغستان کو وہاں سے روانہ ہو جائیں۔ مگر چونکہ مختلف مصالح سے آخری ملاقات غالب پاشا سے ضروری سمجھتے تھے چند ضروری باتیں اسی ملاقات میں طے کرنی تھیں۔ اس لئے پہلے مکہ معظّمہ اور پھر وہاں سے طائف کے لئے روانہ ہوگئے۔ غالب پاشا ان دنوں طائف میں تھے۔ حضرت نے عام لوگوں سے یہی ظاہر فرمایا کہ مکہ معظّمہ میں ان دنوں گرمی زیادہ ہے اور مسجد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کی زیارت بھی کرنی ہے۔ اس لئے میں طائف جارہا ہوں۔ نصف شعبان تک واپس آجاؤں گا۔ چنانچہ ۲۰/ رجب کو مکہ معظّمہ سے روانہ ہو کر ۲۳/ ۲۴/ رجب کو طائف پہنچے اور دو تین دن کے بعد غالب پاشا سے ملاقات کی۔ کچھ باتیں طے ہوئیں اور کچھ کیلئے دوسری ملاقات کا وعدہ ہوا۔ یہ وقت آنے نہ پایا تھا کہ شریف حسین نے بغاوت کردی ہم سب طائف میں محصور ہو کر رہ گئے۔ جس کی تفصیل (۱) ہم نے سفر نامہ

---

(۱) سفرنامہ اسیر مالٹا جس کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی عبارت درج ذیل ہے۔
حضرت شیخ الہند بہ معیت سید امین عاصم صاحب آمد ورفت کا اونٹ کرایہ کرکے۔ ۲۰/ رجب ۱۳۳۴ھ کو روانہ ہو کر ۲۳/ ۲۴ رجب کو طائف پہنچے۔ شہر پناہ کے باہر ایک باغ میں فروکش ہوئے۔ جس کا انتظام سید صاحب نے پہلے سے کر رکھا تھا۔ باغ کے بالائی حصہ کے مکان میں سید امین عاصم صاحب معہ اپنے متعلقین تھے۔ اور نیچے کے ایک حصہ میں (باقی اگلے صفحہ پر)

میں لکھدی ہے۔ لیام حصار میں حضرت رحمتہ اللہ علیہ ایک مرتبہ غالب پاشا سے ملے۔ پاشا موصوف نے چند اصولی باتیں بتانے کے بعد مجبوریاں ظاہر کیں اور کہا کہ آپ مکہ معظمہ جا کر ہندوستان کو جلد از جلد چلے جائیں۔ اور ہندوستانی رائے عامہ کو آزادی کامل کے مطالبہ پر

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) مولانا رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ اس سفر میں مولانا کے ہمراہ فقط تین آدمی تھے۔ مولوی عزیز گل صاحب، وحید احمد اور کاتب الحروف حسین احمد،

طائف:۔ طائف حقیقتاً ایک چھوٹا سا قصبہ ہے مگر اس کا اطلاق بہت بڑے حصے پر کیا جاتا ہے۔ جس میں بہت سے قصبات اور دیہات شامل ہیں یہ قطعہ زمین کا بہت اونچائی پر واقع ہے۔ اونٹوں کے راستہ سے تین دن میں یہاں پہنچتے ہیں۔ کیونکہ چکر زیادہ ہے اور چڑھائی با آسانی طے ہوتی ہے اور جبل کوہ کے راستے سے جس میں خچر گدھے گھوڑے چلتے ہیں۔ ۲۴ر گھنٹے بلکہ اس سے کم میں آدمی پہنچ جاتا ہے۔ مگر راستہ دشوار گزار ضرور ہے۔ آدھے راستے سے ہوا بالکل متغیر ہو جاتی ہے۔ جب کہ مکہ معظمہ میں سخت گرمی کی وجہ سے شب کو بھی آرام نہ آتا ہو۔ طائف میں پتلی رضائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں کا موسم گرمیوں میں نہایت عمدہ رہتا ہے جا بجا باغات ہیں ہر قسم کے میوے پیدا ہوتے ہیں۔ انگور، انجیر، برشومی، (ناگ پھل) انار، آڑو، آلوچی وغیرہ جملہ سرد ملکوں کے میوے بکثرت اور عمدہ ہوتے ہیں زراعت اور سبزی ہر قسم کی پیدا ہوتی ہے۔ جا بجا نہریں بھی ہیں۔ کنویں میٹھے بکثرت ہیں۔ بارش بھی خوب ہوتی ہے حجاز کے لئے طائف، ہند کے لئے شملہ کی مانند ہے۔ ترکی کے گورنر اکثر گرمیوں کے زمانہ میں طائف میں رہا کرتے تھے اور بڑے درجہ کے حکام اور اہل عرب شریف وغیرہ بھی وہاں ہی چلے جاتے تھے۔

فتنہ حجاز:۔ جب ہم مکہ معظمہ میں پہنچے تو عجیب عجیب افواہیں مشہور تھیں۔ عام بدوؤں اور اہل شہر کی زبانی سنا جاتا تھا کہ عنقریب بدعملی ہونے والی ہے۔ شریف حسین انگریزوں سے ملا ہوا ہے اور بغاوت کرنیوالا ہے۔ مگر ترکی افواج کے استقلال میں کوئی فرق نہ تھا۔ ترکی فوج تمام حجاز میں غالباً چار پانچ ہزار تھی کیونکہ اکثر فوج دوسرے مقامات پر جنگ پر چلی گئی تھی۔ شریف نے باب عالی کو اطمینان دلا رکھا تھا کہ حجاز کا ذمہ دار میں ہوں۔ یہاں زیادہ قوت رکھنے کی ضرورت نہیں بجائے ضرورت جنگ پر اپنی قوت لے جاؤ۔ یہ موجودہ فوج بھی جدہ، مکہ، طائف پر منقسم تھی ہم کو یہ بھی اس وقت کہا گیا کہ جلد طائف جانا اور لوٹ آنا چاہئے مبادا بدعملی ہو جائے مگر ہم کو یقین کامل نہ ہوا۔ اسی زمانہ میں یہ خبر بھی مشہور ہوئی تھی کہ گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے کوئی خط شریف کے نام آیا ہے کہ یا تو تم ترکوں کو حجاز سے نکال دو ورنہ ہم شریف علی کو جو پہلے شریف حجاز تھا اور شریف حسین کا بہنوئی ہے اور اس وقت مصر میں مقیم تھا۔ اس کو حجاز کا شریف بنا کر بھیجیں گے۔ نہ معلوم یہ خبر کہاں تک صحیح تھی، جدہ میں ہمیشہ جنگی آگبوٹ آتے اور بندرگاہ میں تین تین چار چار، اور کبھی کم زیادہ ہو جاتے تھے اور کھڑے رہ کر چلے جاتے تھے نہ وہ کچھ تعرض کرتے تھے اور نہ ترکی حکومت۔

ہم ان واقعات کو دکھانا نہیں چاہتے جو کہ اس فتنہ کے زمانہ میں ہوئے۔ اس مقام پر تو صرف حضرت مولانا رحمتہ اللہ علیہ کا سفر نامہ لکھنا ہے۔ ہم کو طائف پہنچ کر کچھ طبیعت سیر ہونے کا موقعہ ہاتھ نہ آیا تھا۔ کہ شتربان آیا اور کہا کہ اگر چلتے ہو تو شتر حاضر ہے۔ ورنہ آٹھ دن بعد آؤں گا۔ مطوف صاحب اور ہم لوگوں کی رائے ہوئی کہ ایک ہفتہ اور یہاں قیام کر لیا جائے اس کے بعد مکہ معظمہ چلنا چاہئے۔ اتفاق وقت سے اس وقت طائف میں میوے بہت کم تھے شہتوت اور خوبانیوں وغیرہ کا ابتدائی موسم تھا البتہ شہد خوب آتا تھا۔ دو چار دن بعد مولانا مرحوم نے تقاضا فرمایا کہ مکہ معظمہ جانا چاہئے مگر شتربان جا چکا تھا۔ ایک دو دن بعد پھر تقاضا فرمایا ہم نے جب دوسری سواریاں تلاش کیں، تو معلوم ہوا کہ آئندہ آنے والے واقعات نے خلاف عادت مولانا کو تقاضائے سفر پر مجبور کیا ہے۔ جن کو نظر کشفی سے معلوم کر لیا تھا، مگر چونکہ ضبط اور اخفاء کا مادہ بہت زیادہ تھا اور مقام رضا میں قدم راسخ تھا۔ اس لئے چند مرتبہ ظاہری تقاضا کرنے کے بعد چپ ہو رہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

متفق کر لیں۔ مجلس صلح میں جو عنقریب منعقد ہونے والی ہے۔ انگریز پوری کوشش کرے گا کہ ہندوستان آزاد نہ ہو یا کم از کم ہندوستان کو زیر سایہ برطانیہ اندرونی آزادی یعنی آدھی آزادی طے ہو، مگر ہندوستانی باشندوں کو چاہئے کہ بغیر مکمل آزادی کے کسی چیز پر راضی نہ ہوں۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) اور پھر معلوم ہوا کہ طائف نہایت زیادہ خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اس لئے جو لوگ باہر باغوں میں مقیم ہیں ان کو شہر پناہ میں چلے جانا ضروری ہے۔ چنانچہ ہمارے مطوف سید امین عاصم صاحب معہ اپنے اہل و عیال سید علی حبشی کے مکان پر چلے گئے اور ہمارے لئے بھی وہاں ایک کوٹھری لے دی، تمام شہر میں اس وقت عجیب ہل چل تھی ۹ر شعبان روز شنبہ کو ہم لوگ شہر میں چلے گئے تھے۔ ترکی افسروں کو بھی یہ بات محسوس ہو گئی انہوں نے شہر کے اردگرد حسب قواعد مورچے بنائے اور جن جن باغوں اور مکانوں کو مورچہ کے لئے مناسب جانا ان کو خالی کرالیا۔ گیارہویں شعبان ۱۳۳۴ھ کی شب کو صبح صادق کے قریب چاروں طرف سے شریف کی فوجوں نے چڑھائی کی جو کہ زیر کمانداری عبداللہ بیگ کام کر رہی تھیں، صبح صادق کے وقت ہم سب بہ معیت حضرت مولانا مرحوم صبح کی نماز کے لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مسجد میں جا رہے تھے کہ ناگاہ ایک بندوق کی آواز آئی۔ پھر تو چاروں طرف سے بندوقیں چلنے لگیں۔ ترکی فوج جس نے چاروں طرف حسب قواعد جنگ مورچے بنا رکھے تھے پورے طور سے جواب دیتی رہی۔ اگرچہ ترکی فوج کی تعداد ایک ہزار مسلح سپاہی تھی۔ باقیماندہ لوگ مسلح نہ تھے۔ مگر چونکہ منظم جماعت تھی اس نے بدوی فوجوں کو بہت زیادہ اور قوی نقصان پہنچایا بدوؤں کی مقدار بہت زیادہ بتائی جاتی ہے۔ اس سے دو دن پہلے مکہ معظمہ، جدہ، منبع، مدینہ منورہ میں یہی واقعہ پیش آ چکا تھا۔ کیونکہ شریف نے انتظام کیا تھا کہ ایک ہی دن میں سب جگہ یہ کام ہو۔ اس جنگ کی وجہ سے جو لوگ طائف میں غلہ اور ترکاری میوہ لاتے تھے ان کا آنا بند ہو گیا۔ ادھر فوجی حکام کو رسد کی فکر ہوئی۔ حسب قواعد جنگ انہوں نے تاجروں سے موجودہ غلہ کی نصف مقدار لینی شروع کی سب نے خوشی سے دے دیا۔ اس کی مقدار میں سے نصف لے لیا اور نصف چھوڑ دیا۔ اور لئے ہوئے نصف کی قیمت اس وقت کے حساب سے لگا کر اس کو رسید دے دی۔ کہ حکومت ترکی بعد از جنگ یہ مقدار تجھ کو ادا کرے گی۔ البتہ جن لوگوں نے چھپایا۔ ان پر شدت کی گئی اور تمام مال تجارت ان کا خورد و نوش اور ضروریات فوجی کی قسم کا لے لیا گیا۔ فقط بمقدار ان کے اہل و عیال کی ضرورت کے ان کو دے دیا گیا۔ ادھر تو شہر میں غلہ کی کمی ادھر آمد بالکل بند، غرض کہ اس وجہ سے شہر میں سخت گرانی ہو گئی۔ پھر شریف کے لوگوں نے شہر کو بھی اوپر سے بند کر دیا۔ اس وجہ سے پانی کی سخت تکلیف ہوئی۔ قشلہ فوجی قیام گاہ کا کنواں نہ ہوتا تو بہت زیادہ اشکال کا سامنا کرنا پڑتا، اگرچہ شریف کی فوج کثیر التعداد بھی تھی اور اس کے پاس نئی عمدہ انگریزی رائفلیں بھی تھیں اور انگریزی سامان جنگ نہایت کثرت سے تھا، مگر باوجود سعی بسیار ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ جب انہوں نے ہجوم کیا منہ کی کھائی۔ دن رات برابر گولیاں چلتی رہتی تھیں۔ ترکی فوج ان کے مجمعوں پر توپوں سے گولے برساتی تھی۔ نصف رمضان تک یہی حالت رہی۔ اس کے بعد وہ مصری فوجیں جو جدہ میں اس کے قبضہ میں لے لینے کے بعد اتاری گئی تھیں۔ اور جنہوں نے مکہ معظمہ کے قلعہ اور قشلہ کو توپوں کے ذریعے فتح کیا تھا طائف میں معہ توپوں کے پہنچیں اور طائف کے چاروں طرف سے توپیں سات یا آٹھ جگہ نصب کر کے قلعہ اور قشلہ پر گولہ باری کرنے لگیں۔ صبح صادق سے تقریباً ۱۲ر بجے تک یہ عمل ہوتا رہا۔ اس کے بعد توپیں ٹھہر جاتی تھیں ترک بھی ان کا جواب دیتے تھے یہی حال عید مبارک تک رہا۔ افسوس کہ عید کے دن بھی شریف کے لوگوں نے جنگ کو موقوف نہ کیا۔

مولانا کا رمضان طائف میں:۔ چونکہ رمضان کا مہینہ طائف میں نہایت بدامنی کی حالت میں واقع ہوا تھا۔ اس لئے نہ تو دن کو حسب خواہش لوگوں کو خوراک کا انتظام کرنا ممکن ہوتا تھا۔ نہ مساجد وغیرہ میں تراویح کا انتظام حسب ضرورت ہو رہا تھا۔ مسجد ابن عباسؓ وہاں کی بڑی مسجد ہے اس میں بھی تراویح الم ترکیف سے ہوتی تھیں اور اس میں بھی بہت کم آدمی آتے تھے۔ باقی لوگ محلہ کی مسجدوں اور اپنے مکانوں پر پڑھتے تھے کیونکہ ہر وقت گولیاں (باقی اگلے صفحہ پر)

تقریباً ڈیڑھ مہینہ محصور رہنے کے بعد اہل طائف کے ساتھ ہم کو باہر آجانے کی سہولت حاصل ہوئی اور چھ شوال کو ہم وہاں سے نکل کر مکہ معظمہ پہنچے۔ شریف عبداللہ بن شریف

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) اوپر سے گزرتی تھیں۔ مولانا نے اولاً مسجد ابن عباس میں حسب سابقہ عادت تراویح پڑھنا شروع کیں۔ مگر چونکہ راستہ وہاں کا ایسا تھا جہاں پر گولیاں برابر آتی رہتی تھیں اس لئے اس مسجد میں جاتے وقت خطرہ ضرور رہتا تھا اور پھر ایک شب میں یہ واقعہ پیش آیا کہ نماز مغرب پڑھ کر فارغ ہوئے ہی تھے۔ ابھی تک نفل وغیرہ پڑھ رہے تھے۔ اندھیرا ہو چکا تھا کہ بدوؤں نے ہجوم کیا، مسجد ابن عباسؓ کی چھت اور میناروں پر بھی ایک بڑا دستہ ترکی فوج کا تھا۔ اور مسجد کے قریب جو دروازہ تھا وہاں پر مورچہ بھی تھا۔ غرض کہ طرفین میں خوب تیز گولی اور گولوں کی بارش دیر تک ہوتی رہی خود مسجد میں بھی برابر گولیاں برستی رہیں۔ جو لوگ مسجد میں باقی تھے وہ ایک کونہ میں جدھر گولیوں کے آنے کا گمان نہ تھا بیٹھ گئے، اس روز تراویح بھی نہیں ہوئی صرف چند آدمی بوقت نماز عشاء فرض عشاء ایک طرف پڑھ کر جب سکون ہوا چلے گئے۔ اس کے بعد احباب خصوصاً سید امین حاکم نے اصرار کیا کہ آپ مسجد ابن عباسؓ میں نماز کے لئے نہ جایا کریں۔ دروازہ مکان کے قریب جو مسجد ہے۔ اس میں ہمیشہ نماز باجماعت پڑھا کریں۔ چنانچہ تمام رمضان اوقات خمسہ کی نماز وہاں پڑھا کرتے تھے اس میں تراویح فقط الم ترکیف سے ہی پڑھی گئیں۔ اس کے بعد مولانا رحمۃ اللہ علیہ نوافل میں سحر کے وقت تک مسجد میں مشغول رہتے تھے اور مولوی عزیز گل صاحب اور کاتب الحروف بھی اسی مسجد میں علیحدہ علیحدہ نفلوں میں وقت گزارتے چونکہ گرمیوں کی رات تھی۔ جلد تر سحور کا وقت ہو جاتا تھا پھر آکر کچھ سحری پکاتے جو کہ میٹھے چاول ہوتے تھے شکر چونکہ وہاں نہ ملتی تھی۔ اس لئے شہد کے بجائے شکر چاول اور چائے میں استعمال کرتے تھے اور اکثر تو نمکین چاول بغیر گوشت پکایا جاتا تھا اس وقت طائف میں چاول وغیرہ بھی دستیاب ہونا مشکل ہو تا تھا ایک آنہ والی روٹی آٹھ آنہ کو بمشکل ملتی تھی مگر دہلی کے تاجروں میں سے حاجی ہارون مرحوم نے تھوڑے چاول مولانا مرحوم کے لئے ہدیہ بلا طلب بھیج دیئے تھے جو کہ عمدہ قسم کے تھے۔ انہوں نے بہت کام دیا اس مدت میں جو کہ تقریباً دو ماہ تھی ہم نے دس بارہ اشرفی طائف میں بوجہ سخت گرانی کھا ڈالی۔

طائف سے روانگی:۔ عید کے بعد چونکہ تمام اہل شہر بھوک سے مرنے لگے تھے۔ حکام کے پاس جاکر شکایت کی کہ اب ہمارے پاس کھانے کیلئے کچھ نہیں رہ گیا۔ ہمارے پاس جتنے حیوانات دودھ سواری کے تھے کھا ڈالے۔ سب غلہ ختم ہو گیا اب ہمارے لئے کوئی صورت کیجئے۔ ہم سب مرے جاتے ہیں انہوں نے کہا کہ اچھا صبح کے آٹھ بجے سے بارہ بجے تک باب ابن عباسؓ سے روانگی کیلئے ہم تم کو اجازت دیں گے ہم اپنی حد میں تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ شریف کے آدمی تم کو نقصان پہنچائیں تو ہم اس کے ذمہ دار نہیں۔

الحاصل لوگوں کو اس طرح ایک فارم معہ ان کے اہل و عیال کے نام دیا جاتا تھا اور ان سے عہد لیا جاتا تھا۔ کہ وہ کہیں جاکر ترکی حکومت سے جنگ نہ کریں گے۔ چنانچہ ۶/ شوال ۱۳۳۴ھ کو بوقت صبح ہم بھی باب ابن عباسؓ سے نکلے اور وہاں سے چل کر پھرتے ہوئے۔ (قیم) میں پہنچے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر شریف کا بیٹا عبداللہ بیگ جو کہ کمانڈر بدوؤں کا تھا مقیم تھا اور تمام فوجی حرکات کا یہی مرکز تھا یہیں مصری فوج کے خیمے بھی تھے۔ چونکہ ہمارے پاس نہ سواری تھی اور نہ نقد وغیرہ اور راستہ دور تھا۔ ادھر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نہایت ضعیف تھے تین دن تک پہاڑی راستہ کو قطع کرنا آسان نہ تھا علاوہ ازیں اسباب بھی تھا اس وجہ سے وہاں جانا ضروری ہوا۔ عبداللہ بیگ سے ملاقات ہوئی اعزاز و اکرام سے پیش آیا ایک خیمہ کھڑا کرنے کا حکم دیا۔ ایک دنبہ ذبح کر کے دعوت پیش کی عرب میں عادت ہے کہ معزز مہمان کی دعوت میں دنبہ ذبح کرنا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو وہ کامل اکرام مہمان کا شمار نہیں ہوتا۔ اور پھر انجیر وغیرہ میوہ جات بھیجے اور ایک اشرفی نذر کی اور کہا کہ شب کو یہاں قیام کرو۔ علی الصبح تم کو روانہ کر دیا جائے گا۔ مگر علی الصبح لڑائی پر چلا گیا۔ اس کے لوگوں نے خالی پشت شتر کا انتظام کر دیا۔ کرایہ بھی خود دیا اور زاد راہ بھی۔ اس طرح وہاں سے روانہ ہو کر ہم دسویں شوال کو مکہ معظمہ علی الصبح پہنچے۔

حسین باغی کیمپ کا کمانڈر تھا۔ اس نے ایک شب ہماری مہمانداری کر کے صبح تک مکہ معظمہ تک ہماری سواری کا انتظام کر دیا۔ ہم دس شوال کو مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ چونکہ زمانہ حج کا قریب تھا اس لئے حضرت شیخ الہند کا ارادہ ہوا کہ حج تک یہاں قیام کیا جائے آنے والے حجاج سے اہل و عیال کی خیر و عافیت بھی معلوم ہو جائے گی، اور ممکن ہے کوئی متعارف یا رشتہ دار بھی آ جائے۔ تو اس سے اس کا بھی پتہ چل جائے گا کہ انگریزی پالیسی حضرت شیخ الہند کے متعلق اور دیگر سیاسیوں کے متعلق کیا ہے۔ اگر نرمی ہوئی تو بمبئی کے راستہ سے واپس ہوں ورنہ کوئی دوسری صورت اختیار کرنی پڑے گی۔ اتفاقاً قاضی مسعود احمد صاحب آخری جہاز میں اوائل ذی الحجہ میں آ گئے ان سے احوال معلوم ہوئے۔

ڈاکٹر انصاری اور حکیم عبد الرازق صاحب رحمہ اللہ کی غیر معمولی ہمدردی اور حضرت شیخ الہندؒ کے ایک عزیز

ڈاکٹر انصاری صاحب اور ان کے بھائی حکیم عبد الرزاق صاحب رحمہم اللہ کو خیال ہوا کہ حجاز شریف میں گرانی زیادہ ہے۔ حضرت شیخ الہند تنہا نہیں ہیں۔ بلکہ آپ کے ساتھ اور رفقاء بھی ہیں۔ ویسے بھی حضرت موصوف کا حوصلہ فراخ اور دسترخوان وسیع ہے۔ لہٰذا حضرت کے پاس جو اثاثہ ہوگا وہ ختم ہو گیا ہوگا۔ اب کوئی اور رقم بھیجنی چاہیے۔ حج کا زمانہ تھا حجاج جا رہے تھے۔ کسی معتمد حاجی کے ذریعہ رقم بھیجی جا سکتی تھی، لیکن ان دونوں رہنماؤں کی غیر معمولی ہمدردی کا فیصلہ یہ ہوا کہ حضرت کے کسی قریبی عزیز کو جو خانگی حالات سے پوری طرح واقف اور خانگی امور میں بے تکلف ہو بھیجا جائے تاکہ رقم کے ساتھ حضرت کو اپنے متعلقین کے معاملات بھی تفصیل سے معلوم ہو جائیں، چنانچہ حضرت کے ایک خاص عزیز کو جن کا نام لینا مناسب معلوم نہیں ہوتا اس خدمت کے لئے جو ان کے لئے سعادت تھی، کیونکہ حضرت کی زیارت کے ساتھ حج بیت اللہ کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہو رہا تھا۔ نامزد کیا گیا۔ مزید برآں تار کے ذریعہ جہاز میں سیٹ بھی متعین کرالی۔ اور روانگی کے لئے ایسا وقت مقرر کیا کہ بمبئی پہنچ کر جہاز کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ بلکہ فوراً ہی جہاز پر سوار ہو جائیں۔ چنانچہ یہ عزیز دفعتاً دیوبند سے روانہ ہوئے اور بمبئی پہنچتے ہی بندرگاہ پر چلے گئے۔

اس عجلت اور رازداری کا یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ حکومت کو رکاوٹ پیدا کرنے کا موقع

نہیں مل سکا۔ یہاں تک کہ عزیز موصوف کی روانگی کا علم بھی حکومت کو اس وقت ہوا جب جہاز روانہ ہو چکا۔ لیکن اس طرح روانگی سے حکومت کو شبہ بھی ہو گیا۔ اس لئے حکومت ہند کی طرف سے عدن تار دیا گیا کہ جہاز پر تلاشی لی جائے اور مشتبہ کاغذات وغیرہ قبضہ میں کر لئے جائیں۔ چنانچہ جب جہاز عدن پہنچا تو پولیس کی جمعیت جہاز پر آئی۔ اور عزیز موصوف کی تلاشی لی، مگر کوئی چیز ایسی بر آمد نہ ہو سکی جس پر شبہ کیا جا سکے، لہٰذا پھر عزیز موصوف بخیریت جدہ اور پھر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ حضرت کو اہل وعیال کی خیریت معلوم ہوئی تو آپ بہت خوش ہوئے۔ پھر عزیز موصوف اور ان کے رفقاء نے جن میں مولانا ولی حسن صاحب حسن پوری بھی تھے بیان کیا کہ گورنمنٹ برطانیہ کی پالیسی حضرت کے بارے میں بہت سخت ہے جب تک اطمینان نہیں ہو جاتا کسی مسافر کو اترنے نہیں دیا جاتا۔ اس لئے کسی طرح مناسب نہیں کہ حضرت اس زمانہ میں بمبئی پہنچیں یا ہندوستان تشریف لے جائیں۔

عزیز موصوف نے ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کا بھیجا ہوا ایک ہزار روپیہ پیش کر دیا۔

مولانا محمد ابراہیم صاحب کا راندیر سے ایک ہزار روپیہ بھیجنا

مذکورہ بالا رقم کے علاوہ ایک ہزار روپیہ مولانا محمد ابراہیم صاحب اور راندیر کے احباب نے تاجروں کے ذریعے بھیجے تھے جو انہیں ایام میں پہنچے تھے ان دونوں رقموں کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ عبد الجبار دہلوی کے یہاں بطورِ امانت جمع کرا دیا، چنانچہ مالٹا میں ضرورت پڑنے پر رقم منگوائی گئی اور کام آئی، فجزاھم اللہ احسن الجزاء

عزیز موصوف کی واپسی

اس وقت تک مدینہ منورہ پر ترکوں کا قبضہ تھا اور ہر قسم کی کوششوں کے باوجود شریف حسین کی اور انگریزوں کی فوجیں کامیاب نہ ہو سکی تھیں۔ جنگ جاری تھی اور حجاز کی آمد ورفت کے راستے مسدود تھے۔ لہٰذا عزیز موصوف مدینہ طیبہ نہیں جا سکے۔ اور حج سے فراغت کے بعد پہلے ہی جہاز سے آپ کو واپس ہونا پڑا۔ اس قدر عجلت سے واپسی کا ایک اور سبب بھی تھا۔ جس سے انگریزی حکومت کے شبہات میں اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ جب واپسی کے لئے عزیز موصوف جہاز پر سوار ہوئے تو بہاء الدین محافظ حجاج اور سی آئی ڈی انسپکٹر نے بڑی سختی سے

تلاشی لی اور ہر ایک چیز چھان ماری، مگر کوئی مشتبہ چیز بر آمد نہ ہوئی جہاز بمبئی پہنچا تو پھر ان کی تلاشی لی گئی اور ان کو حراست میں لے کر الٰہ آباد پہنچا دیا گیا۔

افشاء راز

یہ محترم عزیز حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز سے جو رشتہ رکھتے تھے اس کا تقاضا تھا کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ تحریک ہی کے کام سے پوری رازداری کے ساتھ کارکن کی حیثیت سے اتنا طویل سفر کر کے آپ حجاز شریف پہنچے تھے اس کے علاوہ چونکہ مولانا ہادی حسن صاحب جو کہ مذکورہ بالا "تاریخی صندوق" لے کر آئے تھے۔ جہاز سے اترتے ہی گرفتار کر کے نینی تال میں نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ لہٰذا تشویش اور بے چینی تھی کہ جس مقصد کے لئے اتنی کوشش کی گئی۔ اتنی مصیبتیں جھیلی گئیں اور جس راز کو اس طرح مخفی کیا گیا۔ یہ سب کچھ بے نتیجہ رہے گا۔ بلکہ ممکن ہے کہ اس کے اثرات تباہ کن ثابت ہوں، اس بناء پر حضرت شیخ الہند نے عزیز موصوف کو صندوق کا راز بھی بتا دیا۔ اور یہ بھی فرمادیا کہ ان تحریروں کے فوٹو لے کر فلاں فلاں مقام پر فلاں فلاں صاحب کے پاس بھجوائے گئے ہیں۔

دوسری طرف عجیب وغریب قصہ یہ تھا کہ عزیز موصوف کمزور دل، نا تجربہ کار اور نو گرفتار تھے۔ اور سی آئی ڈی کے وہ افسر (۱) جنہوں نے الٰہ آباد میں ان سے گفتگو کی وہ پولیس کے کہنہ مشق شاطر اپنے فن کے بہترین ماہر تھے۔ ان افسروں نے ڈرا دھمکا کر پولیس کی جابرانہ کارروائیاں بھی تھیں کہ اگر ثابت ہو جائیں تو نہ معلوم کتنوں کو جام شہادت نوش کرنا پڑتا اور کتنے عبور دریائے اور حبس دوام کی سزا پاتے، صندوق کا قصہ بھی انہیں کے ذریعہ معلوم ہوا گویا سی، آئی، ڈی کو دولت کا خزانہ مل گیا، فوراً مظفر نگر پولیس کو تار دیا گیا اور مظفر نگر سے یورش خاں جہاں پور پہنچی اور مولانا ہادی حسن صاحب کے مکان کی تلاشی لی گئی۔ پھر حاجی نور الحسن صاحب اور حاجی احمد مرزا فوٹو گرافر کی تلاشی بھی اسی انکشاف کا نتیجہ تھا۔ جس کا ذکر پہلے صفحات میں گزر چکا ہے۔

---

(۱) یعنی، ا۔ مسٹر سین، ۲۔ تصدق حسین باپوزی، ۳۔ مظہر علی تھانوی، یہ تینوں افسر یوپی میں کام کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند اور ان کے مشن آزادی کے متعلق ان تینوں نے بہت سرگرمی سے کام کیا تھا۔ مسٹر سین انگریز تھا یوپی سی آئی ڈی کا افسر اعلیٰ تھا۔ مگر مہذب قانون کا پابند تھا۔ اس میں کسی قدر انسانیت بھی تھی لیکن تصدق حسین اور مظہر علی نہایت جابر و ظالم تھے ان میں انسانیت اور تہذیب نام کو نہ تھی انہوں نے حضرت کے ساتھیوں پر نہایت وحشیانہ مظالم کئے سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

حج کے بعد حضرت شیخ الہند کا مکہ میں قیام اور گرفتاری

حضرت شیخ الہند نے اس سفر میں پہلا حج ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ میں کیا تھا۔ پھر دوسرا حج طائف سے واپسی پر ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ میں کیا۔ قاضی مسعود احمد صاحب اور دوسرے واقف حضرات کے روانہ ہو جانے کے بعد حضرت کو فکر ہوئی کہ جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو کر یاغستان پہنچنے کی کوئی تدبیر ہونی چاہئے۔ حضرت نے بار بار فرمایا مکہ معظمہ میں ہمارا قیام مناسب نہیں۔ کیونکہ انگریزی حکومت ہم سے بدظن ہی نہیں بلکہ برہم اور مخالف ہے اور شریف حسین انگریزی حکومت کے آلۂ کار ہیں۔ لہٰذا کسی بہتری کی توقع عبث ہے۔ اس لئے جلد از جلد کوئی صورت ہونی چاہئے کہ یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ لیکن اگر تنہا حضرت کی ذات مبارک ہوتی تو معاملہ آسان تھا مگر یہاں تو صورت یہ تھی کہ حضرت کے ساتھ چند رفقاء تھے، جو اپنا سب کچھ قربان کر کے حضرت کے ساتھ ہوئے تھے۔ وہ حضرت کو کسی حال میں چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے اور نہ حضرت کی جدائی پسند کرتے تھے۔ چونکہ ترجمۂ قرآن شریف کا سلسلہ جاری تھا، لہٰذا کتابوں کا ایک ذخیرہ بھی ساتھ رہتا تھا سردی اور گرمی کے کپڑوں کے علاوہ ضعیف العمری اور امراض کی بناء پر دوائیں بھی ساتھ رہتی تھیں۔ اس قسم کی اور بھی ضروریات تھیں۔ ان سب کے حمل و نقل کے لئے چند سواریاں درکار تھیں۔ اور خاموشی سے دفعتاً روانہ ہونا مشکل تھا تاہم جب حضرت کا شدید تقاضا ہوا تو ایسا انتظام کیا گیا کہ خفیہ طور سے یہاں سے روانگی ہو جائے، چنانچہ ہم دو چار روز بعد روانہ ہونے والے تھے کہ تدبیر کے راستہ میں تقدیر حائل ہو گئی جس کی تفصیل یہ ہے کہ۔

محرم ۱۳۳۵ھ کی اخیر تاریخوں میں شیخ الاسلام مکہ معظمہ عبداللہ سراج کی طرف سے نقیب علماء مکہ عصر کے بعد آیا اور کہا کہ مجھ کو شیخ الاسلام نے بھیجا ہے اور حضرت شیخ الہند سے اس محضر کی تصدیق چاہی ہے۔ مولانا کے اس پر دستخط کرا دو۔ اس کو دیکھا گیا تو عنوان یہ تھا "من علما مكة المكرمة المدرسين بالحرم الشريف المكی" (مکہ مکرمہ کے علماء کی جانب سے جو مکہ کے حرم شریف میں درس دیتے ہیں) اور اس میں تمام ترکوں کی تکفیر اس بناء پر کی گئی تھی کہ انہوں نے سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کو معزول کیا ہے۔ شریف حسین کی بغاوت کو حق بجانب اور مستحسن قرار دیا گیا تھا اور ترکوں کی خلافت کا انکار تھا وغیرہ

وغیرہ۔ حضرت نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ چونکہ یہ محض ان علماء کی طرف سے ہے جو حرم مکی میں پڑھاتے ہیں۔ اور میں ہندوستان کا باشندہ ہوں اور حرم مکی میں مدرس بھی نہیں ہوں۔ اس لئے مجھ کو کسی طرح اس پر دستخط کرنا درست نہیں ہے۔ وہ واپس چلا گیا حاضرین میں سے بعض احباب نے کہا کہ اس کا نتیجہ خطرناک ہے۔ حضرت نے جواب دیا کہ پھر کیا کیا جائے نہ عنوان اجازت دیتا ہے اور نہ معنون، معنون میں جو باتیں ذکر کی گئی ہیں۔ وہ سرا سر خلافِ شریعت ہیں۔ اس کے بعد سنا گیا کہ شیخ الاسلام عبد اللہ سراج بہت برہم ہوئے۔ خطرہ تھا کہ وہ لوٹ کر آئے گا اور کچھ جواب دے گا۔ دو چار دن کے بعد شریف حسین خود جدہ گیا اور وہاں سے حکم بھیجا کہ فوراً مولانا محمود الحسن اور ان کے رفقاء اور سید ہاشم اور حکیم نصرت حسین کو گرفتار کر کے بھیجو۔ اس پر بہت تشویش ہوئی اور مختلف طریقوں سے اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا گیا مگر کچھ نفع نہیں ہوا۔ اس کی پوری تفصیل سفر نامہ (۱) میں صحیح طور پر ذکر کر دی گئی ہے یہاں جس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

---

(۱) حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تصنیف "سفر نامہ اسیر مالٹا" میں تحریر فرماتے ہیں"

ایام حج میں اورنگ آباد کے خان بہادر مبارک علی مکہ معظمہ تشریف لائے سرکاری آدمی تھے لن ترانیاں خوب ہانکتے تھے شریف صاحب کے یہاں پہنچے۔ ترکوں کو ہر مجلس میں برا کہتے تھے۔ حکومت موجودہ کی مدح سرائی میں زبان خشک ہو جاتی تھی۔ انہوں نے ظاہر کیا کہ میں گورنمنٹ ہند کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں۔ تاکہ حجاز کے احوال کو دریافت کر کے واقعی باتیں اہل ہند کو بتاؤں۔ کیونکہ ہند میں اس وقت بے چینی پھیلی ہوئی ہے اور عموماً اہل ہند برطانیہ پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے بادشاہِ حجاز کو برا بھلا کہتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ایک اعلان علمائے مکہ کی طرف سے مجھ کو دیا جائے جس میں ترکوں اور ان کی حکومت اور خلافت کی برائیاں ہوں۔ ان کے استحقاق خلافت پر پرزور مضمون سے رد کیا گیا ہو۔ اس میں موجودہ انقلاب اور حکومت حاضرہ کی بھلائیاں ذکر کی گئی ہوں چنانچہ ایک ایسا محضر تیار کیا گیا، اور وہاں کے ان علماء سے جن کو دربار شریف میں دخل تھا اور صاحب عزت و شوکت شمار لئے جاتے تھے اس پر دستخط اور مہر کرایا گیا بہتوں نے خوشی سے اور بہتوں نے خوف سے دستخط اور مہر کر دیا۔ خان بہادر موصوف کے پاس جب یہ محضر پہنچا تو انہوں نے کہا ان علماء کو کوئی ہند میں نہیں جانتا کون تصدیق کرے گا مناسب ہو گا کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب جو کہ علماء ہند میں ایک مشہور اور مسلم شخص ہیں ان کے اور دیگر علماء ہند کے دستخط اور مہر ہوں۔ (نہ معلوم یہ اسی لئے وہاں بھیجے گئے تھے کہ اس ذریعہ سے مولانا مرحوم کو وہاں سے پکڑا جائے یا یہ قضیہ باتفاقیہ تھا)

الحاصل اس مضمون کو وہاں کے شیخ الاسلام مفتی عبد اللہ سراج جو کہ زمانہ حکومت ترکیہ میں مفتی احناف تھے اور اب انقلاب کے بعد عہدہ شیخ الاسلامی اور وکالت شرافت پر مامور ہو گئے تھے بذریعہ نقیب العلماء مولانا کے پاس بھیجا اور آخر محرم الحرام ۱۳۳۵ھ میں عصر کے بعد وہ اس محضر کو لے کر مکان پر آیا۔ اس زمانہ میں وہاں مکہ معظمہ سے جو لوگ مہاجرین ہند اور علم دوست تھے انہوں نے ظہر کے بعد مولانا مرحوم سے بخاری شریف کو شروع کر رکھا تھا۔ مکان اقامت پر ہی درس دیا کرتے تھے، اور جب وہ کاغذ آیا تو چونکہ اس کی سرخی تھی من علماء مكة المكرمة المدرسين بالحرم الشريف المكی "یعنی یہ تحریر مکہ معظمہ کے ان علماء کی طرف سے ہے جو حرم شریف مکی میں پڑھاتے [illegible] (باقی اگلے صفحہ پر)

خلاصہ یہ ہے کہ ہم سب گرفتار کر کے جدہ بھیجے گئے ۲۴؍ صفر ۱۳۳۵ھ کو بوقت صبح زیر حراست جدہ پہنچے اور تقریباً ایک مہینہ زیر حراست رکھے گئے۔ پھر ۱۸؍ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کو خدیوی جہاز سے اسی طرح زیر حراست سویز بھیجے گئے۔ ۲۲؍ ربیع الاول کو سویز پہنچے۔ وہاں سے گوروں کی حراست میں جو کہ پندرہ یا سولہ تھے اور بندوق اور سنگینوں سے مسلح تھے ہم کو قاہرہ ریل میں بھیجا گیا اور اسی دن عصر کے بعد ہم کو جنیر کی سیاسی جیل (معتقل) میں داخل کر دیا گیا اور اگلے دن سے بیانات لینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بیان لینے والا شخص انگریز تھا۔ اردو نہایت سلیس اور صاف بولتا تھا اس کے پاس بڑی بڑی ضخیم کتابیں اور فائل تھے، جن میں سی آئی ڈی کے بیان اور رپورٹیں درج تھیں۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ ہماری گرفتاری فقط شریف کے محضر پر دستخط نہ کرنے اور شریف کی شکایت کی وجہ سے ہوئی ہے۔ مگر بعد میں بیانات لینے اور سوالات کرنے اور بار بار اس کے ان کتابوں کے دیکھنے اور حوالہ دینے سے ظاہر ہوا کہ یہ گرفتاری تحریک آزادی کی ان جملہ کاروائیوں کی بناء پر ہوئی ہے جو کہ یاغستان، کابل،

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) اس لئے ان سے کہا گیا کہ اولاً اس سرخی کی وجہ سے کوئی استحقاق نہیں کہ حضرت مولانا اس پر کچھ لکھیں۔ کیونکہ نہ وہ علماء مکہ میں سے ہیں اور نہ حرم مکی یعنی مسجد الحرام میں مولانا نے کبھی تدریس کی۔

ثانیاً اس میں قوم ترک کی مطلقاً تکفیر کی گئی ہے اور در بارہ اس کے جو کچھ احتیاط اور سخت احکام ہیں آپ کو معلوم ہے۔

ثالثاً اس میں وجہ تکفیر سلطان عبد الحمید خان کا تخت سے اتار دینا لکھا گیا ہے۔ حالانکہ کسی فقیہ نے اس کو موجبات کفر میں سے قرار نہیں دیا۔

رابعاً اس میں خلافت سلاطین آل عثمان کا انکار کیا گیا ہے حالانکہ یہ امر مخالف نصوص شرعیہ میں ہے۔

خامساً، اس میں اس انقلاب اور حرکت کو مستحسن دکھایا گیا ہے اور یہ بھی شرعاً نہایت قبیح واقع ہوا ہے" چونکہ کاتب الحروف کی نقیب العلماء سے کچھ پہلے سے معرفت تھی۔ اس لئے ان سے تمام کیفیتیں ظاہر کر دینے کے بعد یہ کہا گیا کہ تم شیخ الاسلام سے یہ کہہ دینا کہ مولانا نے اس پر دستخط اور مہر کرنے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ اس کا عنوان اہل مکہ اور مدرسین حرم کے ساتھ مخصوص ہے۔ میں آفاقی شخص ہوں۔ پردیسی ہونے کی وجہ سے مجھ کو کوئی استحقاق اس پر دستخط کرنے کا نہیں اور یہ کہا گیا کہ ابھی دوسری وجہوں کو ان پر ظاہر نہ کرنا اگر پھر انہوں نے اصرار کیا تب ان وجہوں کو پیش کیا جائے گا۔ وہ اسی وقت واپس ہو گئے اور پھر کوئی جواب نہ لائے۔ اس محضر کا شہر میں پہلے سے چرچا تھا جو لوگ حقانی تھے ان کو خوف لگا ہوا تھا کہ اگر ہمارے پاس آیا تو ہم کیا جواب دیں گے۔ اور کس طرح جان چھڑائیں گے مولانا مرحوم کے رد کرتے ہی پورے شہر میں مشہور ہو گیا کہ مولانا نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اب تو دوسروں کو بھی ہمت ہو گئی۔

ادھر شیخ الاسلام صاحب کو تنبیہ ہوئی۔ انہوں نے عبارت سابقہ بالکل بدل ڈالی اور اس طرح اس کو لکھا کہ اس میں سے مبحث تکفیر بالکل خارج ہو گیا مگر دستخط کرنے کو پھر نہیں بھیجا۔ جو عبارت دوسری مرتبہ بنائی گئی تھی اس پر پہلے علماء سے فقط دستخط لے کر اخبار "القبلۃ" میں چھاپ دیا گیا اور اسی کو خان بہادر مبارک علی خاں لے کر روانہ ہو گئے خیر خواہوں نے مولانا مرحوم سے کہا کہ شریف آپ کو کہیں اذیت نہ پہنچائے مولانا مرحوم نے فرمایا کہ پھر کیا کیا جائے۔ مذہبی حیثیت سے اس پر مہر و دستخط کسی طرح درست نہ تھا آئندہ جو کچھ تقدیر الٰہی میں ہوگا جھیلیں گے۔

فرنٹیئر اور دیوبند وغیرہ میں مدتوں سے ہوتی رہیں اور جن کی مخبری اپنوں اور پرایوں دونوں نے کی ہے۔ بہت سی ایسی باتیں بھی پوچھی گئیں جن کے متعلق یقین تھا کہ کسی کو اطلاع نہیں ہے۔ حضرت شیخ الہند کے متعلق اس کے پاس بہت بڑا رجسٹر تھا۔ بہرحال ہر شخص نے جوابات حسب اقتضاء وقت اپنی سمجھ کے مطابق دیئے اگرچہ ہم میں سے سب کے سب ایسے ہی تھے کہ جن کو ایسے امور کا سابقہ اس سے پہلے نہیں پڑا تھا۔ اور بوجہ اس خیال کے کہ یہاں مصر میں ہندوستان کے واقعات اور وہاں کی کارروائیوں کا جاننے والا کوئی نہ ہوگا۔ ہم نے آپس میں کوئی قرارداد بھی طے نہیں کی تھی۔ مگر اظہار اور جوابات سب کے تقریباً ایک ہی جیسے رہے۔ اگرچہ علیحدہ علیحدہ ہوئے۔ جیزہ کی جیل (معتقل) میں تقریباً ایک مہینہ رکھنے اور بیانات لے لینے کے بعد پاسپورٹ مرتب کیا گیا اور ۲۴/ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۶/ فروری ۱۹۱۷ء میں ہم کو مالٹا روانہ کر دیا گیا۔ گوروں کی پوری گارد مسلح سنگینوں سے ہماری حراست کرتی تھی اسی روز شام کو مالٹا جانے والے جہاز پر سوار لئے گئے۔ اور ۲۹/ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ میں مالٹا پہنچ گئے۔

۲/جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو تقریباً تین برس دو مہینہ مالٹا میں رہ کر ہم مالٹا سے روانہ ہوئے۔ روانگی کے وقت رخصت کرنے کے لئے تمام ترکی آفیسر جو کہ اس وقت تک رہا نہیں ہوئے تھے صدر اعظم ترکی سے لے کر نیچے کے عہدوں تک سب کے سب خود جمع ہو گئے، اور بہت زیادہ محبت اور شفقت کا اظہار فرماتے رہے۔ شیخ الاسلام خیر الدین آفندی نے خاص طور سے ہاتھ اٹھا کر آواز سے دعا مانگنی شروع کی اور تمام آفیسروں نے ان کی موافقت کی۔ آمین آمین کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔ پھر سب نے نہایت تپاک سے آبدیدہ ہو کر رخصت کیا یہ مجمع اور سماں نہایت عجیب و غریب تھا، بہت سے دنیاوی وجاہت اور دولت والے مالٹا سے اس سے پہلے روانہ ہوئے مگر ایسا بڑا مجمع اور اتنے بڑے رتبے والوں کا اجتماع اور اتنی محبت اور اخلاص کا مظاہرہ اور اس ہیئت دعائیہ اور آمین کا اظہار کسی کے لئے نہیں ہوا تھا۔ انگریز افسر بہت سے وہاں موجود تھے۔ اس حالت کو دیکھ کر نہایت تعجب کرتے تھے۔ مگر یہ عزت حقانی تھی جس میں نفسانیت کا کوئی شائبہ نہ تھا، وہ شخص جس نے قول و عمل میں کبھی اپنی بڑائی کا مظاہرہ نہ کیا جس کو اہل دولت اور اصحاب مناصب کے اختلاط سے وحشت ہو جس کو تکلف صوری اور طلب وجاہت دنیاوی سے نفرت ہو۔ جس کی چال

ڈھال بیٹھنا، اٹھنا، رفتار و گفتار و غیرہ سب سے مسکنت اور تواضع ٹپکتی ہو۔ اس کی یہ عزت اور تمکنت، خلق خداوندی میں عام قبولیت، اس کے انتہائی تقویٰ اور للّٰہیت اور بارگاہِ خداوندی میں بلند پائے گی کا اثر نہ تھا تو کس چیز کا تھا؎

قبولیت اسے کہتے ہیں مقبول ایسے ہوتے ہیں

این سعادت بزور بازو نیست
گرنہ بخشد خداء بخشندہ

رحمہ اللّٰہ تعالی وارضاہ وامدنا بامدادہ فی الدنیا والآخرۃ آمین.

۲۵/ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۵/ مارچ ۱۹۲۰ء آگبوٹ اسکندریہ پہنچا اور ۲۶/ جمادی الثانی سیدی بشر مین جو کہ قرارگاہ اسرار مصر میں تھا۔ داخل کردیئے گئے۔ تقریباً اٹھارہ روز وہاں قیام کرنے کے بعد ۱۳/ رجب ۱۳۳۸ھ کو بمطابق ۲/ اپریل ۱۹۲۰ء کو وہاں سے سویس کو روانہ کردیئے گئے سویس میں بھی ہم سنگینوں کے پہرہ میں اسیروں کے کیمپ میں مثل سیدی بشر داخل کئے گئے یہاں پونے دو مہینہ کیمپ میں رہنا پڑا۔ ۵/ رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۲/ مئی ۱۹۲۰ء اتوار کے دن آگبوٹ پر پہنچایا گیا۔ ۱۲/ رمضان ۱۳۳۸ھ کو جہاز عدن پہنچا چونکہ عدن میں جہاز ایک دن ٹھہرا تھا تو ہم کنارہ پر گئے اور تین تار ہندوستان کردیئے۔ ایک حضرت حکیم محمد حسن صاحب کو دیوبند میں دوسرا ڈاکٹر انصاری کو دہلی میں تیسرا حکیم اجمیری کو بمبئی میں ہم نے دے دیا۔ جس سے تمام احباب کو اطلاع ہوگئی تار کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

"ہم ۸/ جون تک بمبئی پہنچیں گے۔ مختصر یہ کہ ۲۰/ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ ۸/ جون ۱۹۲۰ء کو تین برس سات مہینے کے بعد بمبئی پہونچا کر ہم کو رہا کیا گیا۔

بمبئی پہنچنے اور خلافت کمیٹی کے استقبال کرنے کی کیفیت

بمبئی پہنچنے پر سب سے پہلے سی آئی ڈی کا افسر انگریز مع دو تین ہندوستانی افسروں کے آیا اور حضرت شیخ الہند سے کہا کہ میں تنہائی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ حضرت اس کے ساتھ کمرہ میں چلے گئے۔ اس نے کہا "مولوی رحیم بخش صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ آپ بغیر ان کے ملے ہرگز جہاز سے نہ اتریں" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ ہمیں جہاز پر ہی یہ معلوم ہوگیا

تھا کہ اب ہم بالکل آزاد ہیں ہم نے مولوی رحیم بخش صاحب کا بہت انتظار کیا جب وہ نہیں پہنچے تو میں اور مولانا عزیر گل صاحب اسباب لے کر کناہ پر چلے گئے، بعد کو مولوی رحیم بخش صاحب آئے۔ حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات کی اور کہا کہ آپ کے لئے اسپیشل ڈبہ ریل میں میں ریزرو کرا دوں گا۔ آپ ابھی اتریں اور ریل پر چلے چلیں۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ کا انتظار کر کے حسین احمد اور مولوی عزیر گل کنارے پر چلے گئے ہیں وہ آجائیں تو روانگی ہو سکے گی۔ چونکہ ہمارے کنارہ پہنچنے پر زور کی بارش ہوگئی اور دریا میں طوفان آگیا۔ جہاز دریا میں کنارہ سے دور لنگر انداز ہوا تھا۔ اس لئے اس روز کوئی ہوڑی حضرت شیخ الہند کو جہاز سے لانے کے لئے نہ مل سکی۔ اگلے روز ۲۱ ؍رمضان کو حضرت اتر سکے۔ مولوی رحیم بخش صاحب گورنمنٹ کے بھیجے ہوئے آئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ حضرت شیخ الہند تحریک خلافت میں شریک نہ ہوں اور بالا بالا ریل پر سوار ہو کر دیوبند چلے جائیں، سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو جائیں۔ اسی لئے وہ اگلے دن اتارنے کے لئے اسٹیمر پر پہنچے۔ مگر جب لانچ کنارہ پر پہنچی تو مولانا شوکت علی مرحوم اور ہزاروں اشخاص ممبران خلافت کمیٹی نے زوردار استقبال کیا۔ نعرہ ہائے تکبیر سے فضا گونج اٹھی۔ اور حضرت کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور کار میں سوار کر کے اپنی قیام گاہ پر جس کو پہلے سے تجویز کر چکے تھے لے گئے۔ مولوی رحیم بخش صاحب ہجوم کی شدت کی وجہ سے حضرت کے پاس بھی نہیں پہنچ سکے۔ چونکہ خلافت کی تحریک اور اس کے جملہ کارکن حضرت کے مذاق آزادیٔ ہند اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے ہم نوا تھے اس لئے بالطبع ان سے مل گئے اور مولوی رحیم بخش صاحب مرحوم کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔

جلسۂ عام اور سپاس نامہ

مسلمانانِ بمبئی کی طرف سے خلافت کمیٹی کے زیرِ انتظام کھتری مسجد میں جلسہ عام کیا گیا۔ اس جلسہ میں خلافت کمیٹی اور اہل شہر کی طرف سے حضرت کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا گیا۔

دہلی لکھنؤ، دیوبند وغیرہ سے استقبال کیلئے آنے والے حضرات

ان حضرات کی فہرست جنہوں نے دور دراز سے بمبئی پہنچ کر پورٹ پر حضرت کا استقبال کیا بہت طویل ہے خاص خاص اسماء گرامی یہ ہیں۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم

مہتمم دارالعلوم دیوبند معہ صاحبزادگان، مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری مرحوم، جناب حکیم محمد حسن صاحب مرحوم، و برادرِ خورد حضرت شیخ الہندؒ، مولانا محمد حنیف صاحب مرحوم و خواہرزادہ و داماد حضرت شیخ الہندؒ، حکیم عبدالرزاق صاحب غازی پوری برادر کلاں ڈاکٹر انصاری مرحوم، نواب محی الدین خاں صاحب مراد آباد قاضی بھوپال مرحوم، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مرحوم مہتمم و صدر مدرس امینیہ دہلی۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب عرف ڈاکٹر انصاری مرحوم، حاجی احمد مرزا صاحب مرحوم فوٹوگرافر دہلی۔

مولانا عبدالباری صاحب مرحوم فرنگی محلی اور مسٹر گاندھی

بمبئی کے دو روزہ قیام میں حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم بھی قیام گاہ پر تشریف لائے اور تنہائی میں سیاسیات حاضرہ پر بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ اسی اثنا میں مسٹر گاندھی بھی تشریف لائے اور حضرتؒ سے گفتگو کی۔

دہلی کو روانگی

بمبئی میں دو روزہ قیام فرما کر ۲۳/ اور ۲۴/ رمضان المبارک کی درمیانی شب میں ایکسپریس سے دہلی روانہ ہوئے اور ۲۵/ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۳/ جون ۱۹۲۰ء کی صبح کو دہلی پہنچے۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ شب کے آخری حصہ میں دہلی سے روانہ ہو کر ۲۶/ رمضان المبارک کی صبح کو ۹ بجے دیوبند پہنچ گئے۔

فللہ الحمد والمنة

حضرت شیخ الہند کی عام مقبولیت اور راستہ میں اسٹیشنوں پر استقبال

ایک وہ زمانہ تھا کہ نہ صرف اجانب بلکہ تلامذہ، مریدین اور عزیز و اقارب کو یقین تھا کہ حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء کو پھانسی دی جائے گی ورنہ کم از کم حبس دوام اور عبور دریائے شور کی سزا پائیں گے۔ اس لئے مریدوں اور شاگردوں تک نے نہ صرف تعلق ارادت اور شاگردی سے انکار کر دیا تھا بلکہ تعارف سے بھی منکر ہو گئے تھے۔ خاص خاص لوگ نہ صرف مکان پر آتے ہوئے گھبراتے تھے، بلکہ اس محلہ اور کوچہ میں سے بھی نہ گزرتے تھے جہاں حضرت کا دولت خانہ تھا۔ اور حضرت کے لئے تحقیر و ملامت کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔

بعض مدعیان اخلاص تو جان و عزت کے خطرہ سے انگریزوں کے سی آئی ڈی اور مخبر بن گئے تھے۔ اب یہ زمانہ بھی ان کے سامنے آگیا کہ ہندوستان اور بیرون ہند جہاں بھی حضرت شیخ پہنچتے۔ لوگ سروں پر بٹھاتے ہر ایک اسٹیشن پر عقیدت مند مخلصین کا ہجوم پروانوں کی طرح ٹوٹ پڑتا تھا۔ حضرت شیخ الہند تک پہنچنا اور آپ سے مصافحہ کرنا جوئے شیر لانے سے کم دشوار نہ تھا۔ دہلی، غازی آباد، میرٹھ شہر، میرٹھ چھاؤنی، مظفرنگر، دیوبند وغیرہ میں یہ حالت تھی کہ باہر لے جانے یا عوام کی زیارت کرانے کے لئے لوگوں کو سروں پر اٹھانا پڑا۔ لوگ اس مقبولیت کو دیکھتے تھے اور انگشت بدنداں تھے کہ کیا سے کیا ہوگیا۔

ذالك فضل الله يوتيه من يشاء يعزمن يشاء ويذل من يشاء انه على كل شئ قدير.

رولٹ رپورٹ کے الفاظ اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ رولٹ کمشنر کے الفاظ بھی ناظرین کے سامنے پیش کردیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ دشمن جو اپنی سطوت و طاقت کے نشہ میں بدمست ہوکر کہتا تھا کہ میں سمندروں کا خدا ہوں۔ میری حدود مملکت میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا، مجھ پر اگر آسمان ٹوٹ پڑے تو میں سنگینوں پر اٹھالوں گا۔ اس مغرور اور جابر طاقت نے اس تحریک سے کیا اثر لیا۔ اس کی نظر میں اس تحریک کی کیا حیثیت تھی۔ اس کی بنیادیں کتنی مضبوط تھیں۔ اور کس طرح کامیابی کی کنارے پر پہنچ گئی تھی۔ اسکے نتائج کیا ہوئے۔ اور اس تحریک نے دیس کی کیا کیا خدمتیں سرانجام دیں اور اس کے کارکنوں نے کس طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر کام کیا الفضل ماشهدت به الاعداء رولٹ کمیٹی رپورٹ کے پیرا نمبر ۱۶۴ میں درج ہے اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی خطوط کے واقعات کا انکشاف ہوا، اور حکومت کو اس سازش کا پتہ چلا یہ ایک منصوبہ تھا جو اس خیال سے ہندوستان میں تجویز کیا گیا تھا کہ ایک طرف شمال مغربی سرحدات پر گڑبڑ پیدا کرے اور دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کی شورش (۱)

---

(۱) اگر فقط یہ مسلمانوں کے لئے منصوبہ ہوتا تو راجہ مہندر پرتاپ کو صدارت کیوں دی جاتی اور حکومت موقتہ میں غیر مسلموں کے لئے ایسی جگہ کیوں تجویز کی جاتی جیسا کہ آئندہ آئے گا۔ ۲۔ اگر صرف مسلمانوں کے لئے یہ منصوبہ تھا تو ہر دیال کی کوششیں اور مولانا برکت اللہ کی اعانتیں کیا گواہی دیتی ہیں۔ دیکھو رولٹ رپورٹ فصل پنجاب۔ ۳۔ جبکہ مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بنتا تھا۔ جیسا کہ آئے گا اور وہ کرشنا ورما کا دوست اور امریکی غدر پارٹی کا ممبر تھا جس میں رام چندر جیسا مشہور و معروف بھی ممبر تھا تو اس میں فقط مسلمانوں کی شورش کیوں ذکر کی گئی۔ بلکہ یہ ایک ہندوستانیوں کی آزادی کی تحریک تھی جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شریک تھے البتہ مسلم عنصر غالب تھا۔ جیسا کہ ہم نے ممبروں کے شمار میں دکھلایا ہے اور یہی امر مولانا عبید اللہ صاحب ذاتی ڈائری میں لکھ رہے ہیں۔

سے اسے تقویت دیکر برطانوی راج ختم کر دیا جائے۔

اس منصوبہ کو مضبوط کرنے اور عمل میں لانے کے لئے مولوی عبید اللہ نامی ایک شخص نے اپنے تین ساتھیوں عبد اللہ، فتح محمد، محمد علی، کے ساتھ اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو پار کیا۔ عبید اللہ پہلے سکھ تھا بعد میں مسلمان ہوا۔ اور دیوبند ضلع سہارنپور کے مذہبی مدرسہ میں تعلیم حاصل کر کے مولوی بنا۔ وہاں اس نے اپنے باغیانہ اور برطانیہ کے خلاف خیالات کا زہر چند مدرسین اور طلبہ میں پھیلا دیا، جن لوگوں پر اس نے اپنا اثر ڈالا۔ ان میں سب سے بڑی شخصیت مولانا محمود حسن صاحب کی تھی جو مدتوں تک درسگاہ دیوبند کے صدر مدرس (۱) رہے۔ عبید اللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور و معروف فارغ التحصیل مولویوں کے ذریعے ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف ایک عالم گیر اسلامی (پان اسلامک) تحریک چلائے (۲)۔

---

(۱) یہ بالکل برعکس معاملہ ذکر کیا گیا ہے۔ مولانا عبید اللہ نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو متاثر نہیں کیا بلکہ مولانا شیخ الہند انگریزوں کے مظالم شنیعہ اور مسلسل بے راہیوں۔ واقعات ماضیہ اور حالات حالیہ سے متاثر ہوئے اور انہوں نے مولانا عبید اللہ صاحب کو اس طرف کھینچا۔ جیسا کہ ہم نے حضرت شیخ الہند کے اس مقولہ کو پہلے بھی نقل کیا ہے اور مولانا عبید اللہ صاحب نے اپنی ڈائری میں بار بار اس کو ذکر کیا ہے یہ بات محض اصحاب غرض نے گورنمنٹ کو سمجھائی تھی کہ مولانا عبید اللہ نے حضرت کو متاثر کیا ہے یہ تو کہہ نہیں سکتے تھے کہ تمہارے سابقہ اور لاحقہ طرابلس اور بلقان کے معاملات اور ہندوستان کے مظالم اس کے باعث ہوئے ہیں بیچارے مولوی عبید اللہ کو ہدف ملامت بناتے رہے۔

(۲) یہ بھی بالکل غلط اور افترا ہے۔ ہندوؤں کو اس تحریک سے بھڑکانے کیلئے ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہمیشہ سے انگریزوں کی عادت رہی ہے۔ مولانا عبید اللہ صاحب اس تحریک سے بہت پہلے ہی اعتقاد جمائے ہوئے تھے کہ ہندوستان کی آزادی اور بہتری اسی میں ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہو وہ اپنی ڈائری ص ۸۷، میں لکھتے ہیں "میری طالب علمی کا پہلا زمانہ تو ایسا ہے کہ اس وقت میں سوائے اسلام اور مسلمان کے اور کسی چیز کی ہستی نہیں مانتا تھا۔

لیکن مطالعہ پختہ ہوا تو مجھے ہندوستانیت اور ہندو مسلم اتحاد کا خیال اور اس کی ضرورت زور سے محسوس ہونے لگی۔ ہاں عملی حصہ لینے کے لئے مجھے اس زمانہ میں کوئی موقعہ نہیں ملا۔ اس کے بعد جب مسلمانوں کی مرکزی جماعتوں سے میرا تعارف ہوا تو میں نے مناسب طور پر اپنے بزرگوں اور دوستوں کو اس طرف توجہ دلانی شروع کی اور میری مسرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے امید سے زیادہ کامیابی نظر آئی" ذاتی ڈائری ص ۸۸" اور یہی مطمح نظر اور مشورہ حضرت شیخ الہند کا مولانا عبید اللہ صاحبؒ کے لئے نشان راہ تھا۔

چنانچہ امیر حبیب اللہ خاں سے ملاقات کے باب میں ص ۸۱، پر لکھتے ہیں "مجھے یہاں صراحت اعتراف کی ضرورت ہے کہ اگر شیخ مغفور کا صحیح مشورہ نہ ملتا تو میری بات اس قدر موثر نہ ہوتی اور میں اپنے آپ کو بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے دربار میں پیش نہ کرتا۔ بلکہ ایک مسلم کی صورت میں متعارف ہوتا اور چند دنوں بعد مجھے مسلک ہندوستانیت بتانے کی یقیناً ضرورت پیش آتی" (ذاتی ڈائری ص ۸۲) امیر حبیب اللہ خاں نے بھی یہی مشورہ مولانا عبید اللہ صاحب کو دیا تھا۔ چنانچہ ڈائری کے ص ۲۱ میں لکھتے ہیں:۔ میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خان نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تکمیل میرے لئے (باقی اگلے صفحہ پر)

مگر مہتمم صاحب اور ارباب شوریٰ نے اس کو اور اس کے چند وابستگان کو نکال کر اس تجویز کو درمیان میں ہی ختم کر دیا(۱) مولانا محمود حسن صاحب بہ حال میں دیوبند میں ہی رہے۔ اور عبید اللہ سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مولانا کے مکان پر خفیہ مجالس قائم ہوتیں اور کہا جاتا ہے کہ سرحد کے کچھ آدمی بھی ان میں شریک ہوا کرتے۔ ۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو مولانا محمود حسن نے میاں محمد نامی ایک شخص اور دوسرے دوستوں کے ساتھ مولوی عبید اللہ کی پیروی کی اور ہندوستان چھوڑ دیا۔ مگر یہ لوگ شمال کا رخ کرنے کے بجائے عرب کے خطۂ حجاز میں پہنچ گئے۔ روانہ ہونے سے پیشتر عبید اللہ نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ اور دو کتابیں شائع کی تھیں۔ جن میں اس نے باغیانہ تعصب کی تبلیغ کر کے ہندوستانی مسلمانوں کو فریضۂ جہاد سے متاثر کرنا چاہا تھا۔ اس شخص (مولانا عبید اللہ) اور اس کے دوسرے دوستوں اور مولانا شیخ الہند کا اہم مقصد یہ تھا کہ بہ یک وقت ہندوستان پر باہر سے بھی حملہ کر لیا جائے اور

---

(۱) یہ غلط ہے کہ یہ تجویز آزادی ہند اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی اس وقت تک ظاہر ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ بعض مسائل دینیہ مختلف فیہا کو درمیان میں رکھا گیا اور مولانا سندھی سے دو بلند پایہ معاصرین کو بدظن کر کے ان کی تضلیل و تکفیر پر آمادہ کیا گیا اور اسی اختلاف کی بناء پر مولانا سندھیؒ کو دارالعلوم دیوبند سے الگ کیا گیا۔ ان میں سے ایک بزرگ کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا چنانچہ آپ نے مولانا سندھیؒ سے معافی مانگی بہر حال اصلی سبب وہ امر ہے جس کی بناء پر مسٹن گورنر یوپی دیوبند اور دارالعلوم میں گیا تھا اور مہتمم صاحب کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا"۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگریس کا ایک دائمی بن گیا۔

یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ خان کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی بنائی۔ جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے گیا سشن نے منظور کر لیا۔ برٹش امپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس میں فخر محسوس کر سکتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریزیڈنٹ ہوں۔ (ذاتی ڈائری)

خیال فرمائیے کہ رولٹ کمیٹی اس تحریک کو پان اسلامک تحریک کہتی ہے اور تحریک چلانے والا اس کو ہندوستانی تحریک کہتا ہے اور اسی نام کو اپنی تحریک کے لئے موثر قرار دیتا ہے۔ یہی اس کا عقیدہ اس سے پہلے کا ہے اور پان اسلامک اور اتحاد اسلامی تحریک کو امیر کابل کی ناپسندیدہ تحریک قرار دیتا ہے اور اسی کو حضرت شیخ الہند کا مشورہ قرار دیتا ہے۔ مگر رولٹ کمیٹی افتراق پھیلانے کے لئے اس کو پان اسلامک کہتی ہے۔

ہم پہلے بار بار عرض کر چکے ہیں کہ غالب پاشا گورنر حجاز نے بھی زور دیا تھا کہ تمام ہندوستانیوں کو متحد کیا جائے یعنی ہندو مسلمان پارسی سکھ وغیرہ ہندوستانیوں کے اتحاد سے آزادی کی سکیم چلائی جائے۔ پان اسلامک میں یہ کہاں ہو سکتا ہے۔ حضرت شیخ الہند نے نہ صرف اس کو قبول فرمایا تھا بلکہ پہلے سے اس پر عامل تھے۔ ان کے مشن میں سکھ اور انقلابی ہندو شریک تھے۔ جن کی وجہ سے ایک مستقل مکان دیوبند میں کرایہ پر لے رکھا تھا رولٹ کمیٹی کی یہ رپورٹ جھوٹ اور افتراء نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک ۱۸۲۴ء اور جہاد حریت ۱۸۵۷ء بھی ہندو مسلم اتحاد [illegible]

ہندوستانی مسلمانوں میں بغاوت بھی پھیلائی جائے۔ ہم اس جدوجہد کی تفصیل بتلاتے ہیں جو وہ اپنے مقصد کو کامیاب بنانے کے لئے عمل میں لائے۔ عبیداللہ اور اس کے دوستوں نے پہلے ہندوستانی متعصب جماعت (مجاہدین) سے ملاقات کی اور بعد میں کابل پہنچے۔ وہاں عبیداللہ کی ملاقات ترکی جرمنی مشن سے ہوئی اور ان کے ساتھ اس نے بھائی چارہ قائم کیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کا دیوبندی دوست میاں محمد بھی اس سے جاملا یہ شخص مولانا محمود حسن صاحب کے ساتھ عرب گیا تھا، اور وہاں سے ۱۹۱۶ء میں جہاد کا ایک اعلان حاصل کر کے واپس آیا تھا جو مولانا نے حجاز کے ترکی سپہ سالار غالب پاشا سے وصول کیا تھا۔ یہ دستاویز غالب نامہ کے نام سے مشہور ہے۔ محمد میاں نے اس کی کاپیاں راستہ میں ہندوستان اور سرحدی قبائل دونوں جگہ تقسیم کیں۔ مولوی عبیداللہ اور اس کے رفیق ساتھیوں نے برطانوی حکومت کے خاتمہ پر موقتہ حکومت کے لئے ایک تجویز تیار کی تھی۔

اس تجویز کے مطابق مہندر پرتاپ نامی ایک شخص کو صدر ہونا تھا۔ یہ شخص ایک معزز خاندان کا جوشیلا ہندو ہے۔ ۱۹۱۴ء کے آخر میں اسے اٹلی سوئٹزرلینڈ اور فرانس جانے کا پاسپورٹ دیا گیا۔ یہ سیدھا جنیوا گیا اور وہاں بدنام زمانہ ہردیال سے ملا۔ ہردیال نے اسے جرمن قونصل سے ملایا۔ وہاں سے یہ برلن آیا۔ بظاہر اس نے وہاں جرمنوں کو اپنی اہمیت کے مبالغہ آمیز تصور سے متاثر کیا اور اسے ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا۔ خود مولانا کو وزیر ہند اور مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بننا تھا۔ مولانا برکت اللہ کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا اور برلن کے راستہ کابل پہنچا تھا۔ وہ ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا لڑکا تھا اور انگلستان امریکہ اور جاپان کی سیاحت کر چکا تھا۔ ٹوکیو میں وہ ہندوستانی زبان کا پروفیسر مقرر ہوا تھا۔ وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف سخت لب ولہجہ کا ایک اخبار جاری کیا جس کا نام اسلامک فرنیٹرنٹی (اسلامی برادری) تھا۔ حکومت جاپان نے اس کو بند کر کے اسے پروفیسری سے معزول کیا اور وہ جاپان کو چھوڑ کر امریکہ میں اپنی غدار برادری سے جاملا۔ ۱۹۱۶ء کی ابتدا میں مشن کے جرمنی ممبر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر افغانستان سے چلے گئے۔ ہندوستانی ممبر وہیں رہے اور حکومت موقتہ وپروپزنل گورنمنٹ نے روسی ترکستان کے گورنر اور زار روس کو خطوط بھیجے جن میں اس نے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لئے امداد کی دعوت دی گئی تھی ان خطوط پر راجہ مہندر پرتاپ کے دستخط

تھے اور یہ خطوط بعد میں برطانیہ کے ہاتھ آگئے۔ زار کو جو خط لکھا گیا تھا وہ سونے کی تختی پر تھا۔ اور اس کی ایک تصویر ہمیں (رولٹ کمیٹی کے ارکان کو) دکھلائی گئی تھی حکومت موقتہ کی ایک تجویز یہ تھی کہ ترکی حکومت سے روابط قائم کئے جائیں۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مولانا عبید اللہ نے اپنے پرانے دوست مولانا محمود حسن (شیخ الہند) کے نام ایک خط لکھا۔ اس خط کو ایک دوسرے خط کے ساتھ جو ۸ر رمضان (۹ر جولائی ۱۹۱۶ء) کو محمد میاں انصاری نے لکھا تھا۔ ملا کر ایک لفافہ میں شیخ عبدالرحیم کے پاس حیدر آباد سندھ بھیج دیا گیا۔ شیخ عبدالرحیم تب سے غائب ہے۔ لفافہ پر ایک تحریر تھی جس میں شیخ عبدالرحیم سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ خطوط کسی قابل اعتماد حاجی کے ذریعے مولانا محمود حسن صاحب کے پاس مکہ معظمہ پہنچائے جائیں، اور اگر کوئی دوسرا قابل اعتماد حاجی نہ مل سکے تو شیخ صاحب خود ہی یہ خدمت سرانجام دیں۔ مولانا محمود حسن کے نام کے خطوط جو حکومت برطانیہ کے نام آئے ہیں ہم نے خود دیکھے ہیں۔ یہ خطوط زرد ریشم پر لکھے گئے ہیں۔ محمد میاں کے خط میں جرمن اور ترک مشن کی سابقہ آمد، جرمنوں کی واپسی اور ترکوں کے معطل قیام (۱) بھاگے ہوئے (مہاجر) طالب علموں کے واقعات، غالب نامہ کی اشاعت کا ذکر تھا اور حکومت موقتہ اور ایک حزب اللہ کے قیام کی تجویز درج تھی۔ اس فوج کی بھرتی ہندوستان سے کرنا تجویز ہوئی تھی۔ اور اس کا کام اسلامی حکومتوں کے درمیان سلسلہ اتحاد قائم کرنا تھا۔ مولانا محمود الحسن سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ سارے واقعات

---

(۱) ۱۹ر فروری ۱۹۱۵ء تاریخ کے لئے جو سازش تیار ہوئی تھی اس کا مقصد ایک رجمنٹ اور میگزین پر حملہ کرنا تھا اس تاریخ کو ۱۴۰، آدمی جن میں سے کچھ مسلم تھے۔ ریل کے ذریعے فیروزپور پہونچے۔ مگر فوج نے پیش بندیاں کی تھیں اور یہ سازش ناکام رہی ان میں سے پندرہ مسلمان طالب علم سرحد کے ہندوستانی متعصبین (مجاہدین) سے جانے کے لئے نکل چکے تھے۔ رولٹ کمیشن رپورٹ فصل پنجاب پیرا ۱۴۱، ہم نے پنجاب سے متعلقہ فصل میں بتایا ہے کہ فروری ۱۹۱۵ء میں لاہور کے ۱۵ طالب علموں نے کالج چھوڑا اور مجاہدین سے جا ملے اسکے بعد وہ کابل گئے وہاں ان کو پہلے تو سختی سے نظر بند کر رکھا گیا اور بعد میں رہا ہو کر نگرانی کے ماتحت نقل و حرکت کی اجازت دی گئی۔ وہ ہندوستان واپس آئے، تین کو حکومت روس نے گرفتار کر کے برطانوی حکومت کے حوالہ کیا۔ انہوں نے اپنے برتاؤ کے متعلق ندامت کا اظہار کیا اور انہیں مشروط معافی مل گئی ان پندرہ طلباء کو ان کے مداحوں نے مہاجرین کا لقب دیا تھا۔ ان میں سے جو دو واپس ہوئے ان کے بیانات ہم نے پڑھے ہیں ایک طالب علم تو ایک مطبوعہ ٹریکٹ سے متاثر ہوا تھا جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ سلطان ترکی نے اعلان کیا ہے کہ چونکہ برطانوی حکومت کی طرف سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر حملہ کر کے ان مقامات کی بے حرمتی کا خطرہ ہے۔ اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کو ہجرت کر کے کسی اسلامی ملک میں جانا چاہئے۔ دوسرے طالب علم کو بھی سلطانی اعلان سے جوش آیا تھا اور انگریزی اخبار کی تصویر سے بھی اسے صدمہ پہنچا تھا۔ جو اس کے خیال میں نفرت کی لہریں پیدا کرنے والی تھی۔ (حاشیہ ۵۸، ۵۹)

سلطنت عثمانیہ تک پہنچادیں، مولانا عبید اللہ کے خط میں حزب اللہ کا مرتب و مکمل نقشہ تھا اس فوج کا مرکز مدینہ میں قائم ہونا تھا۔ خود مولانا محمود حسن صاحب کو اس کا سالار بننا تھا۔ ثانوی مراکز مقامی سالاروں کے ماتحت قسطنطنیہ طہران اور کابل میں قائم ہونے تھے۔ اور کابل کا سالار عبید اللہ کو بننا تھا۔ اس فہرست میں تین سرپرستوں، بارہ جرنیلوں اور کئی اور اعلیٰ فوجی عہدہ داروں کے نام درج ہیں۔ لاہور کے طلبہ میں سے ایک کو میجر جنرل بننا تھا اور چھ کو لیفٹیننٹ کرنیل، ان اعلیٰ عہدہ داروں کے لئے جن اشخاص کو تجویز کیا گیا تھا ان میں سے اکثر کے ساتھ اس تقرر کے بارے میں ملاقات نہ ہوسکی تھی، مگر اس ساری اطلاع کی وجہ سے جو ریشمی خطوط میں دی گئی تھی چند پیش بندیاں مناسب سمجھی گئیں اور وہ عمل میں لائی گئیں۔ ۱۹۱۶ء میں مولانا محمود حسن اور اس کے چار ساتھی برطانوی حکومت کے قبضہ میں آگئے۔ اور وہ اس وقت برطانوی نگرانی میں جنگی قیدی ہیں۔ غالب نامہ پر دستخط کرنے والا غالب پاشا بھی جنگی قیدی ہے۔ اسنے یہ اقرار کیا ہے کہ محمود حسن کی پارٹی نے میرے سامنے ایک خط رکھا تھا اور میں نے اس پر دستخط کئے ہیں اس خط کے مشہور حصوں کا ترجمہ یہ ہے:۔

"ایشیاء یورپ اور افریقہ کے مسلمان اپنے آپ کو ہر قسم کے ہتھیار سے مسلح کر کے خدا کے راستے میں جہاد کرنے کے لئے کود پڑے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین اسلام دشمنوں پر غالب آگئے ہیں۔

اس لئے مسلمانو! جس عیسائی حکومت کے بند میں تم پڑے ہوئے ہو اس پر حملہ کرو دشمن کو مرنے پر مجبور کر کے پختہ عزم کے ساتھ اپنی ساری جد جہد عمل میں لانے کی جلدی کرو۔ ان پر اپنی نفرت اور دشمنی کا اظہار کرو۔ یہ بھی تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ مولوی محمود حسن آفندی (سابق صدر مدرس مدرسہ دیوبند ہندوستان سے تعلق رکھنے والے) ہمارے پاس آئے اور ہمارا مشورہ طلب کیا ہم نے اس بارے میں اس سے اتفاق کیا اور اسے ضروری ہدایات دیں۔ اگر وہ تمہارے پاس آئے تو تمہیں اس پر اعتماد کرنا چاہئے اور آدمیوں اور روپیوں اور ہر اس چیز سے امداد کی جائے۔ جس کی ضرورت اسے پیش آسکتی ہے۔ (۱)

رولٹ کمیٹی کے ارکان کو اگرچہ واقعات کا صحیح اور مکمل علم نہیں ہو سکا۔ تاہم ان تحریروں

---

(۱) ذاتی ڈائری از ص ۵۳، تا ۶۰، رولٹ کمیٹی کی رپورٹ

سے حضرت شیخ الہندؒ کی جلالت وعظمت اور ان کے بلند ارادوں اور استقلال و عالی ہمتی اور بلند پروازی کا کافی اندازہ ناظرین کو ہوگیا ہوگا مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے بارہا فرمایا۔

"حضرت شیخ الہندؒ تو اس تحریک میں ایسے بلند مقام پر پہنچ گئے کہ ہمارے اذہان اور خیالات بھی وہاں تک نہ پہنچے تھے"۔

اور جب حضرت رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو تعزیت کے لئے دیوبند تشریف لائے اور روکر کہنے لگے کہ:۔

"حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کے انتقال نے ہماری کمر توڑدی"

یورپین تو میں ہر اس شخص کو جو اپنی قوم اور وطن کا فدائی اور خیر خواہ ہو نہایت عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھتی ہیں اور اس کا احترام کرتی ہیں۔ اگر چہ سیاستہً وہ دشمن ہی ہو۔ مالٹا کی اسارت گاہ میں بڑے بڑے فوجی اور ملکی آفیسر انگریز آتے تھے۔ تو حضرت شیخ الہند کو دور سے دیکھ کر ہیٹ (انگریزی ٹوپی) اتار کر سلام کرتے تھے اور باادب کھڑے ہو کر گفتگو کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند کھڑے بھی نہیں ہوتے تھے بلکہ بسا اوقات اپنے ترجمۂ قرآن کے لکھنے میں مصروف رہتے۔ مگر یہ فوجی اور ملکی بڑے بڑے آفیسر آکر باادب کھڑے ہو جاتے تھے اور آپ کی مصروفیتوں کو نہایت ادب سے دیکھتے رہتے تھے۔ حالانکہ معمولی گورا بھی بڑے بڑے گورنمنٹ پرستوں، ہندوستانی نوابوں اور راجاؤں کی ادنیٰ درجہ کی تعظیم و تکریم عمل میں نہیں لاتا تھا۔ پرنس جرمنی (جرمن کا شاہزادہ) جو کہ اڈن جہاز سے گرفتار ہوا تھا اور مالٹا میں ایک عرصہ تک رہا تھا ہمیشہ حضرت کی خدمت میں بالخصوص بقر عید کے موقعہ پر حاضر ہوتا تھا اور مبارک بادی پیش کرتا تھا اور یہی حال بڑے بڑے فوجی اور سول افسروں جرمنی، اسٹرین، بلگیرین اور ترکوں کا تھا۔ مسٹر برن جو کہ گورنر یوپی کا سیکرٹری انگریز تھا۔ مولانا عزیز گل صاحب سے بعض استادوں کے تذکرہ پر کہنے لگا کہ گڑ گڑ ہی رہا اور شکر چینی بن گئی (یعنی تمہارے وہ اساتذہ کم ہمتی کی وجہ سے نیچے ہی رہے اور تم اولوالعزمی اور بلند ہمتی کی وجہ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئے) یہ تو دنیاوی عزت اور وقعت کا معاملہ ہے مگر ہم کو اللہ تعالیٰ کے یہاں آخرت میں اس سے بدر جہازائد وقعت کی امیدیں ہیں ؎

سگ اصحاب کہف روزے چند — پے مردم گرفت مردم شد

پسر نوح بابداں بہ نشست — خاندان بنوتش گم شد

حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ اس مدت مدینہ کی اسارت کی مشقتیں برداشت کر کے ہندوستان آئے تو ان کے جذبۂ حریت اور انگریز دشمنی میں کوئی کمزوری یا کمی نہ تھی۔ بلکہ ہندوستانی مارشل لاء رولٹ ایکٹ کے نفاذ جلیانوالا باغ وغیرہ کے واقعات اور ترکی مملکت کی تقسیم اور معاہدہ سیورے اور ترکوں کے ساتھ انتہائی بے انصافیوں نے اس آگ کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ بمبئی میں اترتے ہی مولانا شوکت علی مرحوم اور خلافت کمیٹی کے ممبروں وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی لکھنؤ سے اور مسٹر گاندھی احمد آباد سے حضرت شیخ الہند کے استقبال کے لئے تشریف لائے نیز دوسرے لیڈروں سے خلوت اور جلوت میں باتیں ہوئیں تو آپ نے بھی عدم تشدد نان وائلنس کا پروگرام ہندوستان کے آزاد کرانے کیلئے ضروری قرار دیا۔ اور پھر اسی طریقہ پر تمام خلافت کمیٹی اور کانگریس کی تجویز کردہ باتوں کی موافقت کی۔ دیوبند پہنچ کر چند دنوں قیام فرما کر ضروری سمجھا کہ کوڑا جہان آباد ضلع فتح پور ہسوہ میں تشریف لے جائیں اور حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم کی والدہ اور اہلیہ محترمہ اور ان کے بچوں کی تعزیت کریں۔

حضرت شیخ الہندؒ کا سفر کرنا

حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم، حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور مخلص خاص خادم تھے، اگرچہ وہ مشن آزادی کے ممبر (۱) نہ تھے مگر مکہ معظمہ میں بایں ارادہ ساتھ ہو گئے تھے کہ مدینہ منورہ ساتھ جائیں گے۔ برطانیہ کی غلط کاری سے ان کو بھی رفقاء میں شمار کر دیا گیا اور گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ قاہرہ مصر میں بیان لینے والے انگریز نے خود کہا کہ ان کا غذات (ڈائری اور سی آئی ڈی کی رپورٹوں) میں آپ کا کہیں تذکرہ نہیں پاتا ہوں۔ تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میں ان باتوں سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا۔ جن کو سی آئی ڈی نے ان کاغذات میں ذکر کیا ہے مجھ کو گرفتار کرنا بالکل دہاندلی ہے، ص ۵۶، سفر نامہ میں ان کے جوابات کی تفصیل درج ہے۔ مگر اندھیر نگری چوپٹ راج میں کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال وہ ہمارے ہی ساتھ مالٹا میں نہایت اطمینان اور استقلال سے رہے اور پھر بیمار ہوئے اور وہیں انکا انتقال ہو گیا۔ حضرت شیخ الہند کو ان کے انتقال سے بہت صدمہ ہوا تھا۔ ان کی ضعیف العمر والدہ اور دیگر

---

(۱) اور نہ ہندوستان سے ساتھ آئے تھے۔ بلکہ اگلے سال وہ اور سید ہاشم صاحب سوڈان اور مکہ ہوتے ہوئے آئے تھے۔ جب حضرت شیخ الہند مدینہ منورہ سے واپس آئے تو مکہ معظمہ میں ملاقات ہوئی۔

متعلقین سے حضرت کو بہت ہمدردی تھی اس لئے یہ سفر ضروری خیال کیا گیا۔ الہ آباد (۱) والوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے وہاں اترنے کا اصرار کیا وہاں اچھا خاصا اجتماع قاری عبد الرحمٰن صاحب مرحوم کے مدرسہ میں ہو گیا۔ تو حضرت نے مولانا شبیر احمد کو تقریر کے لئے فرمایا۔ اس تقریر میں خلافت کمیٹی کی حمایت اور تائید پر زور طریقہ پر کی گئی تھی۔ پھر غازی پور، فیض آباد، لکھنؤ میں فرنگی محل میں عبد الباری صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرمایا۔ مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم نے حسبِ ارشاد حضرت شیخ الہندؒ لکھنؤ میں تقریر فرمائی۔ اس کے بعد مراد آباد ہوتے ہوئے واپس ہو گئے۔

شیخ الہند کا خطاب اور قدوم مبارک کی برکات

حضرت کی تشریف آوری اور خلافت کمیٹی کی شرکت اور تائید اور آزادیٔ ملک کی تڑپ اور اس راستہ میں جاں بازی اور استقلال و اخلاص یہ ایسے امور نہ تھے کہ قلوب کو مسخر نہ کریں، چنانچہ عام مسلمانوں کے قلوب آپ کی طرف نہایت اخلاص کیساتھ جھک گئے اور عموماً لوگوں میں انتہائی محبت اور قبولیت جاگزیں ہو گئی۔ چنانچہ خلافت کمیٹی کے زعماء نے آپ کیلئے شیخ الہند کا لقب تجویز کیا، جو کہ ہر طرف اور ہر جماعت میں مقبول ہو گیا اور بمنزلہ جزء اسمی بن گیا اور باوجودیکہ حضرت رحمتہ اللہ علیہ تقریر کے عادی نہیں تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں مقبولیت نے خلقت میں ایسی قبولیت پیدا کر دی کہ لوگ عموماً آپ پر پروانہ وار فدا ہونے لگے اور یہ تحریک خلافت اور آزادی برقی طاقت کیساتھ مسلمانوں کے دل اور دماغ پر چھا گئی۔

حضرت شیخ الہندؒ کی بیماری

حضرت شیخ الہندؒ اس سفر حجاز سے پہلے گھٹنوں کے درد اور وجع المفاصل میں مبتلا رہتے تھے، سردیوں میں یہ مرض ترقی کر جاتا تھا۔ سیڑھیوں پر چڑھنا اترنا نہایت مشکل ہوتا تھا۔ علاوہ اس کے بواسیر، کثرت بول وغیرہ امراض کی بھی شکایت رہتی تھی مگر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اس سفر میں اس طرح شامل حال ہوا کہ تمام زمانۂ اسارت میں یہ تکالیف بہت کم اور تقریباً

---

(۱) مولانا فاخر صاحب الہ آبادی سے ملاقات کرنے کے لئے دائرہ شاہ اجمل صاحب میں تشریف لے گئے اور مبلغ لہ سجادہ نشین (یعنی فاخر صاحب الہ آبادی) کو پیش کئے۔ یہ حضرت شیخ کی کرامت تھی کہ اس روز جس نے نذر پیش کی گیارہ روپے ہی پیش کئے۔ (بحوالہ مولانا سید شاہد صاحب خلف مولانا سید فاخر صاحب)

معدوم ہو گئی تھیں۔ مالٹا نہایت سرد جگہ ہے۔ ہم کو ابتداً ہیں خیموں میں رکھا گیا تھا۔ سردی خیموں کے باہر تو انتہائی درجہ کی پڑتی ہی تھی مگر اندر بھی اس قدر پڑتی تھی کہ باوجود کہ لکڑی کی چارپائیوں پر نیچے گدہ اور اوپر دو کمبل ہوتے تھے۔ پھر بھی آدھی رات کے بعد سردی کی شدت سے نیند نہیں آتی تھی۔ مگر حضرت رحمتہ اللہ علیہ حسب عادت ڈیڑھ دو بجے اٹھتے پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے اور چونکہ پیشاب کے بار بار آنے کی بیماری تھی ایک شب میں کئی کئی مرتبہ ضرورت پڑتی تھی تاہم بلا تکلف بار بار وضو کرتے تھے، اگرچہ بعد میں ہم گرم پانی اور آگ کے مہیا کرنے کا انتظام بھی کر سکے تاہم اس قسم کا انتظام عرصہ تک نہیں ہو سکا تھا۔ تب بھی بلا تکلف حضرت رحمتہ اللہ علیہ اپنے اعمال بجالاتے رہے اور اس قدر بیماریوں کی شکایتیں تمام سفر میں نمودار نہ ہوئیں جو پہلے تھیں۔ البتہ ہندوستان پہنچ جانے کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں شکایات لوٹ آئیں اور بڑھنے لگیں۔

حضرت رحمتہ اللہ علیہ کا وہ جذبۂ آزادیٔ ہند اور انگریزوں کے یہاں سے نکالنے کا نہ صرف قائم رہا بلکہ اور قوی اور ترقی پذیر ہو گیا۔ ان میں مصائب مالٹا وغیرہ سے کوئی کمزوری نہیں ہوئی بار بار فرمایا کرتے تھے کہ میں پختہ ارادہ لئے ہوئے ہوں کہ اس بیماری سے اچھا ہوتے ہی تمام ہندوستان میں دورہ کروں گا اور ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو آزادی کی مکمل جدوجہد کیلئے آمادہ کروں گا۔ اور یقیناً اگر عمر وفا کرتی تو ضرور وہ ایسا کرتے مگر قدرت کو منظور نہ تھا گوناگوں امراض ترقی کرتے رہے باوجودیکہ یونانی اور ڈاکٹری معالجوں کی فراوانی تھی۔ اور ہر ایک نہایت فدائیت کا دم بھرتا تھا اور خلوص دل سے کوشاں تھا، مگر تقدیر کے سامنے تدبیر کیا کر سکتی ہے۔

حضرت رحمتہ اللہ علیہ کا سفر علی گڑھ اور قیام جامعہ ملیہ

تحریک خلافت کا زور تھا، انگریزوں کی غداری سے لوگوں میں سخت برہمی تھی ترک موالات کا جوش تھا اس لئے چاہتے تھے کہ علی گڑھ یونیورسٹی برطانیہ سے ترک تعلق کرلے مگر پرانے سرکار پرست ٹرسٹیان یونیورسٹی کب اس کو گوارا کر سکتے تھے۔ انہوں نے سخت مخالفت کی جس کے نتیجہ میں مولانا محمد علی مرحوم اور ان کے ہم خیال لوگوں کے ساتھ طلباء یونیورسٹی کی ایک بڑی اور معتدبہ جماعت یونیورسٹی سے جدا ہو گئی۔ اور آزاد درسگاہ قائم

کرنے کے لئے جس میں کوئی مداخلت حکومت برطانیہ کی نہ ہو تیاری کرنے لگی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ناگپور میں اجلاس کانگریس ہوا تھا اور اس میں نان کوپریشن کی تحریک پاس ہو چکی تھی۔ اس کے خلاف مسٹر جناح اور ان کے موافقین کی آواز بہت کمزور پڑگئی تھی اور یہ پارٹی حد درجہ اقلیت میں آگئی تھی، ملک کے تمام اہل الرائے ہندو اور مسلمان برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہو رہے تھے۔ مسٹر گاندھی کی رائے قبولیت عامہ حاصل کر چکی تھی حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ سے ترک موالات کے متعلق طلباء یونیورسٹی نے فتویٰ حاصل کرلیا تھا۔ جس میں حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے ترک موالات کی تمام دفعات میں کانگریس کی موافقت کی تھی اور تمام مسلمانوں اور طلبہ یونیورسٹی کو زوردار مشورہ دیا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں گورنمنٹ سے قطع تعلق کریں اور تمام کالج اور اسکول گورنمنٹ امداد چھوڑیں۔ اور اگر کالجوں اور اسکولوں کے زعماء ایڈنہ چھوڑیں تو طلبہ ایسے کالجوں اور اسکولوں سے نکل آئیں۔ نیز ملازمان حکومت انگریزی ان ملازمتوں سے علیحدہ ہو جائیں، جن میں حکومت کی امداد خالص طور پر ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ، اس ہی فتویٰ کی وجہ سے گورنمنٹ نے سر رحیم بخش کو خصوصی طور پر دوسری مرتبہ حضرت رحمتہ اللہ علیہ کو سمجھانے اور فتویٰ واپس لینے کے لئے بھیجا تھا مگر حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے اسی فتویٰ ترک موالات پر اصرار کیا اور واپس نہیں لیا۔ جیسا کہ طلباء مسلم یونیورسٹی کے پاس ترک موالات کا مفصل فتویٰ بھیجا گیا تھا۔ اسی طرح خلافت کمیٹی کے کارکنوں نے بھی فتویٰ حاصل کیا اور وہ چھپ کر شائع ہوا۔ فتویٰ مذکورہ کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم قال اللہ تعالیٰ ولاتنازعوا فتفشلو وتذھب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصابرین" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور آپس میں اختلاف نہ ہونے دو کہ بزول ہو جاؤ اور تمہاری ہوا بگڑ جائے تم کو نہایت صبر سے کام لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولاتعاونو اعلی الاثم والعدوان اور تم کو نیکی اور تقویٰ کی معاونت کرنی چاہئے اور زیادتیوں کی معاونت مت کرو۔

ومن یتولھم منکم فانہ منھم ان اللہ لایھدی القوم الظالمین.
کفار کے موالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہے اور جس نے ان کی دوستی اور

معاونت باقی رکھی وہ شخص بھی ان ہی سے شمار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا۔

گر پڑے ہے آگ میں پروانہ سا کرم ضعیف
آدمی کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو

امابعد آج جب کہ شرق وغرب کے مسلمانوں پر قیامت خیز مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ جب کہ اندیشہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کا جہاز امنڈتے طوفانوں کی موجوں سے ٹکرا کر (خدا نہ کرے) پاش پاش ہو جائے جب کہ ہر فرد مسلم کی روح موت کی دھمکیاں دینے والے حوادث سے لرز رہی ہے۔ بلکہ اگر عاقبت بینی سے کام لیا جائے، تو ہر ایک ایشیائی اور خصوصاً ہر ایک ہندوستانی اپنی اخلاقی جرأت اور آزادانہ مستقبل کو سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ علماء ہند کی تعداد کثیر اور ہندو ماہرین سیاست کا بہت بڑا طبقہ اس جدوجہد میں ہے کہ اپنے جائز حقوق اور واجبی مطالبات کو پامال ہونے سے بچائیں۔ کامیابی تو ہر وقت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن جو فرض شرعی قومی اور وطنی حیثیت سے کسی شخص پر عائد ہوتا ہے۔ تو اس کے ادا کرنے میں ذرہ بھر تاخیر کرنا ایک خطرناک جرم ہے۔ میں اصل فطرت سے کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ اور جیسا کہ میری طویل زندگی سے شاہد ہے میرا مطمح نظر ہمیشہ مذہب رہا ہے اور یہی وہ مطمح نظر ہے۔ جس نے مجھے ہندوستان سے مالٹا اور مالٹا سے پھر ہندوستان پہنچایا۔ پس میں ایک لمحہ کے لئے کسی ایسی تحریک سے اپنے کو علیحدہ نہیں پاتا جس کا تعلق تمام جماعت اسلام کی فوز وفلاح سے ہو یا دشمنان اسلام کے حربوں کے جواب میں حفاظت خود اختیاری کے طور پر استعمال کی گئی ہو۔ مالٹا سے واپس آکر مجھ کو علم ہوا کہ ہندوستان کے ارباب بسط وکشاد نے آخری طریقۂ کار اپنے فرض کی ادائیگی اور اپنے جذبات و حقوق کے تحفظ کا قرار دیا ہے وہ قرآن کریم کی صحیح اور ایک صریح تعلیم اور رسول اکرم ﷺ کے ایک روشن اسوہ حسنہ کو مضبوط تھام لیں اور نفع وضرر قومی کا موازنہ اور عواقب ملیمہ کی پوری جانچ کر کے اس کو بے خوف وخطر

انجام تک پہنچائیں، اور اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اعداء اسلام کے ساتھ تعاون و موالات کو اعتقاداً و عملاً ترک کردیں اس مسئلہ کی شرعی حیثیت ناقابل انکار ہے۔ اور ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہی اقتضا ہونا چاہیئے کہ وہ

۱۔ سرکاری اعزازوں اور خطابات کو واپس کردے۔

۲۔ ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کردے۔

۳۔ صرف اپنے ملک کی اشیاء اور مصنوعات کا استعمال کرے

۴۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے اس کے علاوہ جو تجاویز وقتاً فوقتاً شائع کی جائیں ان پر عمل کریں۔ بشرطیکہ:۔

۱۔ اتباع شریعت کیا جائے۔ اور عمل در آمد میں خلاف حکم شرع کا ارتکاب پیش نہ آئے۔

۲۔ نیز اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں فساد یا نقائص امن کا اندیشہ ہو ان سے احتراز کیا جائے۔ اور ہر کام میں افراط و تفریط سے بچکر اعتدال مد نظر رہے۔

۳۔ ارشاد عثمان ۔ اذا احسن الناس فاحسن معهم واذا اساؤ افاجتنب اساتهم (جب لوگ اچھا کام کریں تو ان کے اچھا کرنے میں شریک رہو۔ اور جبکہ برا کریں تو برائی سے بچتے رہو) کا لحاظ رکھنا ہر ایک امر میں مفید اور ضروری سمجھا جائے۔ واللہ الموفق والمعین۔

العبد محمود حسن عفی عنہ دیوبندی

۳/ ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ

اس کے بعد یہی فتویٰ جمعیۃ علماء ہند کے متفقہ فیصلہ کی صورت میں تقریباً ۵ سو علماء کے دستخط سے شائع کیا گیا(۱)۔ الغرض اس تحریک اور اسی فتویٰ اور اسی تحریر کی بناء پر مسلم نیشنل یونیورسٹی قائم کرنے کی بنیاد ڈالی گئی جو کہ بعد میں جامعہ ملیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ اگر زعماء مسلم

---

(۱) حضرت مولانا حافظ احمد صاحب زادہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم اور مہتمم دار العلوم دیوبند کو گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب سر جیمس گورنر یوپی نے دلوایا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو واپس کردیا اور ایسی موثر تقریر مجمع خصوصی میں فرمائی کہ نہ صرف حافظ صاحب مرحوم بلکہ تمام مجمع متاثر ہو کر بیک زبان واپسی کا متقاضی ہوا۔

یونیورسٹی پہلے سے آزاد اور قومی لوگوں کی بات مان لیتے تو یہ افتراق نہ ہوتا۔ بہرحال گورنمنٹ پرستوں کے انگریزوں کی چیرہ دستیاں اور غداریاں دیکھتے ہوئے غلامی اور انگریز پرستی کو ہی سراہا۔ جوشیلی روحیں کب اس کو گوارا کرسکتی تھیں انہوں نے ہر قسم کی مشکلات کو برداشت کیا۔ مگر جب اصلاح ممکن نہیں ہوئی تو مجبوراً آزاد نیشنل یونیورسٹی کیلئے جلسہ کرنا چاہا۔ اور اہل الرائے کو دعوت دی اور حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کو صدر بنانا چاہا، حضرت اس وقت سخت بیمار تھے۔ چلنا پھرنا ممکن نہ تھا۔ خدام نے اس سفر کو خطرناک اور نہایت تکلیف دہ ظاہر کیا دوسری طرف دعوت دینے والوں کا اصرار تھا کہ ہماری جدوجہد کی کامیابی کا مدار اس پر ہے کہ حضرت صدارت فرمائیں۔ دیر تک فریقین کی گفتگو سننے کے بعد حضرت کا جواب حسب ذیل تھا:۔

"اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو ضرور شریک ہوں گا"

چنانچہ ۱۶/ صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۰ء اجلاس کی تاریخ مقرر ہوگئی، حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے خطبۂ صدارت کا مضمون مولانا شبیر احمد صاحب کو بتلا کر تحریر کا حکم دیا۔ اور جب مولانا شبیر احمد صاحب مسودہ لکھ کر لائے تو اس کو سن کر حسب منشاء ترمیم فرما کر چھپنے کا حکم دیا گیا۔

اس مدت میں مرض اور ترقی کرتا گیا۔ ہر قسم کا علاج جاری تھا۔ مگر بجائے فائدہ زیادتی تھی، بخار لازمی صورت اختیار لئے ہوئے تھا ضعف اور نقاہت ترقی پذیر تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کا تقاضہ تھا کہ حضرت رحمتہ اللہ علیہ کو دہلی لے جایا جائے۔ تاکہ میں پوری توجہ سے اپنی آنکھوں کے سامنے علاج کروں اور دوسرے اہل الرائے سے بھی مشورہ کرسکوں۔ مگر چونکہ علی گڑھ کی تاریخیں مقرر ہو چکی تھیں اس لئے قرار پایا کہ علی گڑھ کے جلسہ سے فارغ ہوکر براہ راست دہلی روانہ ہو جائیں گا۔ ور برائے معالجہ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمائیں گے۔

میرا علی گڑھ اور پھر دہلی پہنچنا اور حضرت کا اجلاس میں صدارت فرمانا

دیوبند سے تار آیا کہ میں فلاں گاڑی سے علی گڑھ جارہا ہوں تو مجھ سے وہاں مل، حسب الحکم میں وہاں پہنچا۔ حضرت رحمتہ اللہ علیہ مجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ جناب عبدالمجید صاحب خواجہ کی کوٹھی پر قیام تھا وہیں میں بھی قیام پذیر ہوا۔ اگلے روز جلسہ میں حضرت رحمتہ اللہ علیہ

نے شرکت اور صدارت فرمائی ضعف اور بیماری کی وجہ سے خود چل نہیں سکتے تھے دو شخصوں کے کندھوں پر ٹیک کر چلنا ہوتا تھا۔ خطبہ جناب مولانا شبیر احمد صاحب نے پڑھا۔ جو کہ مطبوع ہے اس کے مندرجہ ذیل فقرے قابل یادگار ہیں۔

(۱) میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر الٰہی کی روشنی جھلک رہی ہے۔ لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف وہراس طاری ہو جاتا ہے خدا کا یقین نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب وضرب کا۔

پھر چند سطور کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

(۲) اے نونہالان وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی جانب بڑھایا اور اس طرح ہم نے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔

(۳) آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں۔ وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بے شک کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں۔ یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا اچھا ہے۔

(۴) ہماری قوم کے سر برآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا ہے۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں

جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول وفروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی احساسات اور اسلامی فرائض فراموش کردیں، اور ان میں قوم وملک کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو وہ درسگاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے۔ اس لئے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ ہو اور جس کا تمام تر نظام عملی اسلامی اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت اور تعلیم اور زبان کے متعلق جو ارشاد حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا ہے منصف انگریز بھی یہی بلکہ اس سے زیادہ تسلیم کرتے ہیں چنانچہ ڈبلوڈبلو ہنٹر ص ۲۰۲، میں ۱۸۷۱ء میں لکھتا ہے۔

"مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی طرح وہ لوگ اقلیت میں ہیں جو واقعی باغیرت اور خوددار ہوں۔ دنیادار لوگ ہمیشہ قائم حکومت کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمارے انگلو انڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباء واجداد کے مذہب سے انکار کرنا نہ جانتا ہو۔ ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس کے یخ بستہ حقائق کے مقابلے میں آتے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں۔ ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل کے علاوہ ہم کو عافیت پسند طبقہ کی امداد حاصل ہے۔ یہ لوگ جو کچھ بے ضرر اعتقادات اور تھوڑی بہت جائداد کے مالک ہیں اپنی نمازیں ادا کرتے اور بڑے اہتمام سے مسجدوں میں جاتے ہیں لیکن ضروری اور اہم مسائل پر سوچنے کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے"۔(۱)

علی گڑھ سے واپسی

اجلاس مذکورہ سے فارغ ہوکر حضرت رحمۃ اللہ علیہ دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت توجہ سے علاج فرمایا چونکہ

(۱) ص ۲۰۲، ہمارے ہندوستانی مسلمان مترجم ڈاکٹر صادق حسین ایم اے بی ایچ

اس سے پہلے امرتسر میں جمعیۃ العلماء کا انعقاد مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی رحمتہ اللہ علیہ کی مساعی جمیلہ اور مولانا کفایت اللہ صاحب مولانا احمد سعید صاحب اور دیگر حضرات کی جدو جہد سے ہو چکا تھا۔ اس لئے اہلِ الرائے حضرات نے ضروری سمجھا کہ اب اس کا دوسرا اجلاس دہلی میں بڑے پیمانہ پر حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کی صدارت میں منعقد کیا جائے۔ تاکہ احوالِ حاضرہ میں علمائے اسلام کا زیادہ سے زیادہ اتفاق ہو سکے۔ کیونکہ حضرت کو عام مقبولیت حاصل ہے۔ مسلمان سب سے زیادہ آپ کے گرویدہ اور آپ کے ساتھ حسن اعتقاد رکھتے ہیں اور آپ پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔

حضرت رحمتہ اللہ علیہ سے اس کی استدعا کی گئی تو آپ نے قبول فرمایا اور ۷، ۸، ۹؍ ربیع الاول اجلاس کی تاریخ مقرر کی گئی۔ حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے مفتی کفایت اللہ صاحب کو تحریر خطبۂ صدارت پر مامور فرمایا اور مضامین ضروریہ ذکر فرمادیئے۔ چنانچہ مفتی صاحب مرحوم نے مسودہ تحریر کر کے پیش فرمایا اور حضرت کو سنایا۔ بعد ضروری اصلاحات اور ترمیم کے حضرت نے چھپوانے کا ارشاد صادر فرمایا۔ خود حضرت اس قدر بیمار اور ضعیف تھے کہ جلسہ میں باوجودیکہ وہ دہلی میں تھا نہیں جاسکتے تھے۔ جلسہ میں خطبہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب نے پڑھا۔ مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء اپنی کتاب علماء حق ص ۲۱۵، میں تحریر فرماتے ہیں۔

> ”حضرت شیخ قدس اللہ سرہ العزیز اگرچہ حیات مقدسہ کے بالکل آخری دور میں تھے، مگر علماء ملت کی آرزو یہی تھی کہ جمعیۃ علماء حضرت شیخ الہند کی صدارت کا تاریخی امتیاز حاصل کرے۔ اور آپ کے فیوض سے وطنی اور ملی سیاست کے متعلق ایسے بنیادی اصول معلوم کرلے جس پر کاربند ہو کر اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرتی رہے۔
>
> حضرت شیخ الہند کا خطبۂ صدارت اگرچہ نہایت مختصر تھا مگر علماء ملت اور ملی سیاست کے تقاضے کو پورا کرنے کے لئے مکمل اور کافی تھا۔
>
> ۱۔ اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے جس سے ترک موالات فرض ہے۔
>
> ۲۔ تحفظ ملت اور تحفظ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں اگر برادران

وطن ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحق شکریہ ہیں۔

۳۔ استخلاص وطن کے لئے برادران وطن سے اشتراک عمل جائز ہے۔ مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو۔

۴۔ اگر موجودہ زمانہ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز کا استعمال مدافعت اعداء کے لئے جائز ہو سکتا ہے۔ باوجودیکہ قرون اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں تامل نہ ہوگا کیونکہ موجودہ زمانہ میں ایسے لوگوں کے لئے جن کے ہاتھ میں توپ، بندوق ہوائی جہاز نہیں ہیں یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔" (۱)

حضرت شیخ کی اختتامی تحریر جو آخری اجلاس میں پڑھی گئی۔ اس کے چند جملے بلفظہ درج ذیل ہیں۔

"کچھ شبہ نہیں کہ اختتامی تحریر جو آخری اجلاس میں پڑھی گئی اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر تعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے مقاصد کے حصول میں موید بنادیا ہے اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق واتحاد کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اسکے لئے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کے لئے میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حال اگر اس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لئے ناممکن بنادے گی۔ ادھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا۔ اور اسلامی اقتدار کا اگر کافی دھندلا نقشہ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا اس لئے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے۔ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقت ور ہو۔ ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر واستبداد سے شکست دے سکے گی۔ ہاں یہ

(۱) ص ۱۶، خطبۂ صدارت مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ پائدار اور خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دلنشیں کر لیجئے۔ اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے، جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ صلح وآشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذار سانی اور دل آزاری مقصود ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی مقامات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لئے اپنے مذہب کی حد سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذار سانی کے درپے رہتے ہیں۔ میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ میری گذارش دنوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریزرویشنوں کی تائید سے دھوکا نہ کھانا چاہئے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے اور ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہئے۔

اگر فرض کرو، ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پئے یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے لئے مہلک نہیں۔ البتہ دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائی اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں اتفاق کے حق میں سم قاتل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورہ کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے“(۱)

حضرت شیخ الہندؒ کی بیماری اور وصال

حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی بیماری اور وصال کی تفصیل تو جناب مولانا اصغر حسین صاحب

(۱) ص ۱۸، خطبۂ صدارت حضرت شیخ الہند مطبوعہ مطبع قاسمی) (از علمائے حق ۳۱۸)

مرحوم نے اپنے رسالہ حیات شیخ الہندؒ میں بڑی تفصیل سے لکھی ہے۔ جس کو نقل کرنے میں بہت تطویل ہے۔ بناء بریں اس کا اختصار ناظرین کے لئے پیش کرتے ہیں۔

"حضرت رحمتہ اللہ علیہ ۲۰/رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۸/جون ۱۹۲۰ء کو ایک بجے دن کو مالٹا سے بمبئی پورٹ پر تشریف فرما ہوئے۔ بمبئی میں دو دن قیام فرما کر ۲۳/رمضان شب جمعہ مطابق ۱۰/جون بعد از مغرب روانۂ وطن ہوئے۔ ۲۴/رمضان المبارک مطابق ۱۲/جون ۱۹۲۰ء بوقت صبح دہلی پہنچے ڈاکٹر انصاری مرحوم کے یہاں قیام فرمایا۔ ایک روز قیام فرما کر ۲۵/رمضان المبارک مطابق ۱۳/جون ۱۹۲۰ء بروز یک شنبہ بوقت صبح دہلی سے روانہ ہوئے اور اسی روز ۹/بجے دیوبند پہنچے، استقبال کرنے والوں کا ہر اسٹیشن پر جس طرح نہایت زیادہ ہجوم تھا یہاں پر بھی بہت زیادہ ہجوم تھا۔ اسٹیشن سے سیدھے دارالعلوم تشریف لے گئے۔ مہمانوں کی اطراف وجوانب سے بہت زیادہ آمد تھی۔ بناء بریں ۱۳۳۸ھ ۱۰/شوال تک دیوبند ہی میں قیام فرمانا پڑا۔ ورنہ پختہ ارادہ تھا کہ جلد از جلد مولانا حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم کے مکان پر کوڑہ جہاں آباد ضلع فتح پور مرحوم کی تعزیت کے لئے پہنچیں جہاں ان کی والدہ ماجدہ اور دیگر متعلقین موجود تھے۔ وہاں سے الہ باد غازی پور، فیض آباد، لکھنؤ مراد آباد ہوتے ہوئے ۲۵/شوال کو دیوبند واپس ہوئے۔ چونکہ اہلیہ محترمہ سخت بیمار تھیں اس لئے درمیانی مقامات پر نہ جا سکے (اگرچہ عقیدت مندوں کے بہت تقاضے تھے) ۷/ذی الحجہ میں دیوبند میں موسمی بخار اور تپ ولرزہ کا بہت زیادہ شیوع ہوا۔ چنانچہ عشرہ محرم کے بعد خود حضرت رحمتہ اللہ علیہ بھی مبتلا تپ ولرزہ ہو گئے۔ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ وجع مفاصل اور بواسیر کی تکلیف سابق ہندوستان پہنچنے کے بعد عود کر آئی تھی۔ تاہم اس کا تحمل فرماتے تھے اور نشست وبرخاست آمد ورفت پر زیادہ اثر نمایاں نہیں ہونے دیتے تھے۔ مگر اس تپ ولرزہ نے یکبارگی اتنا ضعیف کر دیا کہ نشست وبرخاست آمد ورفت کی طاقت جاتی رہی۔ معالجہ یونانی اور ڈاکٹری جاری تھا۔ بعد انتہائی کمزوری اور مرض کے اواخر محرم سے افاقہ تدریجی طور پر شروع

ہوا۔ مگر افاقہ کی رفتار بہت سست تھی ۲/ صفر کو بتقریب صحت احباب اور طلباء دارالعلوم کی دعوت کی گئی جس کا اہتمام مخلصین نے از خود کیا تھا۔ افسوس کہ قدرت کو یہ خوشی باقی رکھنی منظور نہ تھی۔ ۶/ صفر کو پھر بخار آیا اور پیچش بھی ہوگئی اور ضعف اور مرض میں اضافہ ہوتا گیا۔ تا آنکہ اطباء نے ورم جگر تشخیص کیا۔ اسی زمانے میں سفر علی گڑھ کی تحریک ہوئی جس کو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ چنانچہ ۱۶/ صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۰ء بروز جمعہ علی گڑھ میں جلسہ ہوا، حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے جمعہ پڑھ کر صدارت فرمائی۔ کمزوری اس قدر تھی کہ خود نہیں پڑھ سکتے تھے مولانا شبیر احمد مرحوم نے خطبہ پڑھا۔ اگلے روز علی گڑھ سے واپس ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر دہلی تشریف لے گئے معالجہ نہایت توجہ سے ہوا جس سے تخفیف کے آثار نمایاں تھے ۱۴/ ربیع الاول تک اطمینانی حالت رہی، مگر ۱۵/ ربیع الاول یوم شنبہ کو پھر لرزہ بخار آیا اور حالت نہایت نازک ہوگئی بخار بہت تیز ہوگیا۔ حالت اگرچہ تشویشناک تھی مگر ہوش و حواس بجا تھے۔ آدمی پہچانتے تھے بہت ضعیف آواز سے بات بھی فرماتے تھے۔ مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم سوانح ص ۱۴۶، میں لکھتے ہیں (۱۸ کی شب کے متعلق) رات بھر یہی حالت رہی۔ سینہ پر بلغم تھا جس کو ضعف کی وجہ سے دفعہ نہیں کر سکتے تھے صبح کو شہد کا شربت دیا گیا تو خلاف امید حلق میں اتر گیا۔ ۶/ بجے کچھ اجابت ہوئی۔ اور خود اپنے ہاتھ سے پانی سے استنجا کیا۔ ضعف لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا تھا۔ اور باوجود ہوش بجا ہونے کے ایک استغراقی حالت تھی۔ مخصوص لوگ چارپائی کے گرد جمع تھے دل دھڑک رہے تھے طبیعت ہراساں تھی کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ سات بجے کے بعد (۱۸/ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ یوم سہ شنبہ ۳۰/ نومبر کو بہت تغیر ہوگیا حضرت دنیا سے بالکل غافل ہوگئے۔ تنفس طویل اور غیر طبعی ہوگیا اور انقطاع عن الدنیا و توجہ الی الرفیق الاعلی کا گمان غالب آنے لگا۔ چارپائی کے گرد حاضرین خاموشی اور آہستگی سے ذکر اللہ میں مشغول تھے کہ اسی حالت میں حضرت نے اس غیر فانی اور واجب الوجود ہستی کو یاد کیا، جس کے

نام پر اپنے آپ کو محو کر دیا تھا یعنی بلند آواز سے ۳/ مرتبہ اللہ اللہ اللہ فرمایا۔

مولانا شبیر احمد مرحوم کا بیان ہے (جس کو مولانا جلیل صاحب نے نقل فرمایا کہ) حضرت نے تھوڑی دیر آنکھ کھول کر چھت کی طرف دیکھا پھر فرمایا کہ مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں ہے مگر افسوس تو یہ ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں۔ تمنا تو یہ تھی کہ میدان جہاد ہوتا اور اعلاء کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے ٹکڑے کئے جاتے۔ اس کے بعد بلند آواز سے اللہ اللہ سات مرتبہ کہا۔ آٹھویں مرتبہ آواز بند ہو گئی۔ دیکھا تو زبان تالو سے لگی ہوئی تھی۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے سورۂ یٰسین شروع کی مگر وہ جوشِ گریہ اور ادب کی وجہ سے بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے تھے اس لئے مولوی حافظ محمد الیاس صاحب نے پڑھنا شروع کیا۔ سورۃ قریب الختم ہوئی تو حضرت نے خود بخود حرکت کر کے اپنا بدن سیدھا اور درست کر لیا۔ ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر سیدھی کر لیں اور ۸/ بجے جب کہ مولوی صاحب بالکل اخیر پر پہنچے تو حضرت نے ذرا آنکھ کھولی اور تصدیق قلبی کی تائید کے لئے زبان کو حرکت دی اور خاص الیہ ترجعون کی آواز پر قبلہ رخ ہو کر ہمیشہ کے لئے آنکھ بند کر لی کس اور سہولت سے سانس منقطع ہو گیا اور روح مقدس روح وریحان وجنۃ نعیم کی بہار دیکھنے کے لئے تمام اہل اسلام کو یتیم و بے کس چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئی اور رفیق اعلیٰ سے جا کر مل گئی انا للہ وانا الیہ راجعون وفات سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نمونہ ہے"(۱)

غمزدہ اور پریشان حال حاضرین کے صدمے اور قلق و بے قراری کا اندازہ آسان نہیں ہے۔ کچھ دیر تو یہ حالت رہی کہ ایک کو ایک کی خبر نہ تھی کسی کی آہ نکلی کوئی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایسے جانکاہ حادثات پر آہ و نالہ اور چیخ و پکار ایک معمولی بات ہے، مگر حضرت رحمتہ اللہ علیہ کا فیض صحبت کام آیا اور رضا بالقضا کا مضمون غالب ہوا۔

نصف گھنٹہ کے بعد منزل اول (قبر) کا فکر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے بھائی صاحب (حکیم محمد حسن صاحب) اور خدام سے استفسار فرمایا کہ اگر دہلی دفن کرنا آپ

(۱) سوانح شیخ الہند [illegible]

مناسب سمجھیں تو محدثین (حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور احفاد کرام رحمہم اللہ تعالیٰ) کے مزارات میں سامان کیا جائے اور اگر دیوبند کا خیال ہو تو وہاں کا انتظام عمل میں آوے۔ جواباً کہا گیا کہ حضرت کی آرزو تھی کہ اپنے مخدوم استاد کے جوار باکرامت میں جگہ ملے اور یہی آرزو اور کشش دوسری دنیا (مالٹا) سے کھینچ کر لائی تھی نیز صاحبزادیاں بھی اب تک دہلی نہ پہنچیں تھیں اس لئے یہی رائے (۱) ہوئی کہ دیوبند لے چلنا چاہئے۔ (سوانح ص ۱۴۸)

دیوبند کو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس مضمون کا مفصل تار روانہ کیا کہ حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی وفات ہو گئی۔ جنازہ شام کو دیوبند پہنچے گا اس کے بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم اطلاع دینے اور کفن و تابوت اور ریل کے انتظامات میں مصروف ہوئے۔ ادھر خدام نے غسل کا انتظام کیا حکیم محمد حسن صاحب نے مخصوص شاگردوں کی امداد سے بطریق مسنون غسل دیا اور کفن پہنا کر تابوت میں رکھا۔ جو کہ نہایت اہتمام سے بہت جلد تیار کر لیا گیا تھا، اور ڈاکٹر صاحب کی وجاہت سے بارہ بجے تک ڈاکٹری سرٹیفکیٹ اور ریل کے متعلق تمام انتظامات درست ہو گئے جن کی تکمیل میں دوسروں کو بہت وقت اور تاخیر پیش آتی۔

ڈاکٹر صاحب ہی کا تار امروہہ میں میرے پاس وفات اور جنازہ کے دیوبند لے جانے کا اسی روز شام کو پہنچ گیا تھا حالانکہ میں نے امروہہ پہنچنے کی ان کو کوئی اطلاع نہیں دی تھی غالباً سی آئی ڈی، نے ان کو اطلاع دی ہو گی دہلی میں آناً فاناً وفات کی خبر مشہور ہو گئی۔ اور ہندوؤں نے اپنی اپنی دوکانیں فوراً بند کر دیں۔ ہزاروں مسلمان ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئے اور جنازہ تیار ہوتے ہی نماز جنازہ کے متقاضی ہوئے۔ حکیم محمد حسن صاحب برادر خورد حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم لوگوں کی خواہش اور اصرار ہے تو تم جنازہ پڑھ لو میں شریک نہ ہوں گا تاکہ مجھ کو نماز کے دہرانے کا اختیار رہے اور میں دیوبند میں پھر نماز اعزہ و اقارب کے ساتھ پڑھ سکوں۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کے سامنے میدان میں

---

(۱) مگر مولانا جلیل احمد کا بیان یہ ہے کہ مجھ کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی رائے یہ ہی تھی کہ حضرت کو مقبرہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ میں دفن کیا جائے۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ میں دو مشکلات میں مبتلا ہوں ایک یہ کہ دیوبند لے جائیں تو مذہب حنفی میں یہ غیر مستحسن ہے اور دوم یہ کہ یہاں کے مقابر میں دفن کریں تو چونکہ اس وقت حضرت رحمتہ اللہ علیہ سے تمام مسلمانوں کو انتہائی شغف اور محبت ہے لہٰذا خوف ہے کہ لوگ قبر کو پختہ نہ کر دیں۔ اور ہم کتنا ہی صدائے احتجاج بلند کریں کچھ بھی نہ سنیں۔ پھر فرمایا کہ اہون البلیتین یہی ہے کہ جنازہ ہی لے جایا جائے۔ وہاں قبر کے پختہ کرنے کا احتمال نہیں ہے۔ اور صاحبزادیوں کی بھی اشک شوئی ہو جائے گی اس لئے اسی کو اختیار کیا گیا۔

ایک مرتبہ بہت بڑے مجمع کے ساتھ نماز ادا کی گئی۔ اس کے بعد جنازہ آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ لوگ بڑھتے جاتے تھے اندازہ کیا جاتا ہے کہ اسٹیشن کے قریب پہنچ کر بیس ہزار آدمیوں کی تعداد ہوگئی۔ وہاں پھر دوسری مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ ڈھائی بجے کے بعد دہلی سے وہ گاڑی جس میں تابوت تھا روانہ ہوئی پھر شہر میرٹھ اور چھاؤنی میرٹھ پر نماز جنازہ پڑھی گئی۔ ساڑھے سات بجے شب کو تابوت دیوبند اسٹیشن پر پہنچا۔ ازدحام نہایت عظیم الشان تھا، بمشکل تمام جنازہ اسٹیشن سے نکلا اور بہت دیر میں مکان پر پہنچا۔ چونکہ قبر پہلے سے تیار تھی۔ اس لئے بہت سے لوگوں کی رائے ہوئی کہ ابھی رات ہی میں دفن کر دیا جائے مگر چونکہ صاحبزادیاں اور داماد جو کہ تار ملنے کے بعد دیوبند سے دہلی کو روانہ ہو چکے تھے اور ابھی راستہ ہی میں تھے کہ جنازہ غازی آباد آ گیا۔ اس لئے وہ غازی آباد اتر گئیں۔ مگر ہجوم کی زیادتی اور ٹرین کی جلدی سے روانگی اور ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے ساتھ نہ ہو سکی تھیں۔ اس لئے ترجیح اس کو دی گئی کہ صبح تک جنازہ دفن نہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ اگلی ٹرین سے رات میں آ گئیں بہت سے عقیدت مند اور مخلصین کا بے شمار اجتماع سہارنپور مظفر نگر وغیرہ اطراف وجوانب سے ہوگیا۔ اور اعلان کر دیا گیا کہ نماز جنازہ اور دفن صبح کی نماز کے بعد کیا جائے گا، صبح تک یہ اجتماع اور بھی زیادہ ہوگیا۔ جنازہ صبح کی نماز کے بعد دارالعلوم دیوبند میں پہونچایا گیا۔ نودرہ اور باہر کا صحن آدمیوں سے بھرا ہوا تھا بمشکل تمام صف بندی ہوئی اور حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے ولی اقرب اور برادر عزیز مولانا حکیم محمد حسن صاحب جنہوں نے اب تک نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی۔ با قلب مضطر و چشم تر نماز پڑھانے کھڑے ہوئے تمام مجمع پر ایک پر کیف سکونت طاری تھی اور ایک ہیبت و نورانیت مشاہد ہو رہی تھی۔ خواہ اس کو جذبات حسرت سمجھئے یا واقعیت و حقیقت کہئے۔ (سوانح ص ۱۵۲)

دیوبند میں اس وقت تک بڑے بوڑھوں نے بھی کبھی کسی جنازہ کے ہمراہ اس قدر مجمع نہیں دیکھا تھا۔ مدرسہ کے دروازہ سے قبرستان تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ جنازہ مقبرہ میں پہنچا یعنی بیالیس برس کی ظاہری جدائی کے بعد دنیا کی کشاکش سے استراحت کے لئے یہ شاگرد رشید فخر استاذ اپنے مقدس مرشد استاد کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ قبر تیار تھی جنازہ قریب لا کر رکھا گیا۔ مولانا حکیم محمد حسن صاحب اور حضرت کے داماد اور بعض مخصوص خادم قبر میں اترے۔ چاشت کا وقت تھا۔ نو بجے تھے کہ قدوۃ الواصلین، امام المحدثین والعارفین،

قطب عالم علوم و کمالات، بطل حریت، آزاد کنندۂ ہندوستان، حاتم دوراں، بخاری زماں، کوہ وقار و حلم، آفتاب معرفت و علوم، گنجینۂ حکمت الٰہیہ خزینۂ احادیث سنن نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ) کو لحد میں اتار دیا گیا۔ اور شریعت و طریقت کے آفتاب عالم تاب کو ہمیشہ کے لئے نظروں سے چھپا دیا گیا۔ ایک غمزدہ کی زبان نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا ؂

مٹی میں کیا سمجھ کے چھپاتے ہو دوستو!
گنجینۂ علوم ہے گنجینۂ زر نہیں،

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون رضی اللّٰہ عنہ وارضاہ آمین

مسیحائے زماں پہنچا فلک پر چھوڑ کر سب کو
چھپا چاہ لحد میں وائے قسمت ماہ کنعانی
جو تھا موصل الی اللہ ہو گیا واصل بحق ہے ہے،
پھریں ہیں ڈھونڈتے سر گشتگان تیہہ حیرانی
زمانے نے دیا اسلام کو داغ اس کی فرقت کا،
کہ تھا داغ غلامی جس کے تمغائے مسلمانی،
نہیں ہے سینۂ مجروح کم گنج شہیداں سے
تمنائیں جو تھیں دل میں ہوئی ہے سبکی قربانی
فضائل ہائے شتی میں سے کوئی ایک دکھلا دے،
کئے تھے حق تعالیٰ نے جو مولانا کو ارزانی
فقط ایک آپ کے دم سے نظر آتے تھے سب زندہ
بخاری، غزالی، بصری و شبلی ونعمانی
جنہیں چھوڑا تھا تم پر حضرت امداد و قاسم نے
کرے گا کون ان سب بیکسوں کی ہائے چوپانی
حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم وبہار آخر شد

تصانیف

(۱) ترجمہ قرآن مجید

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے درس و تدریس اور سیاسی مشاغل کے باوجود کئی ایک کتب تحریر فرمائی ہیں۔ ان سب میں سر فہرست قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ، قرآن پاک مالٹا جیل میں سرانجام پایا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے شاید حضرت کو مالٹا جیل میں محبوس ہی اس لئے فرمایا تھا کہ وہ ترجمۂ قرآن کی تکمیل کر سکیں۔ سورۂ مائدہ تک حواشی تحریر فرمائے تھے کہ رہائی مل گئی۔ اور بقیہ فوائد و حواشی علامہ شبیر احمد عثمانی نے پورے لئے۔

اس ترجمہ و تفسیر کو اللہ تعالیٰ نے اتنی مقبولیت عطا فرمائی کہ شاید کسی اور ترجمہ و تفسیر کو حاصل نہ ہوئی ہو۔ یہی ترجمہ و تفسیر فارسی میں ترجمہ ہو کر حکومت افغانستان کے اہتمام سے کابل سے شائع ہوئی، تاج کمپنی لاہور نے اس ترجمہ و تفسیر کو اتنی عمدگی اور نفاست سے شائع کیا ہے کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔

۲۔ تراجم ابواب بخاری

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صحیح بخاری کے تراجم کی تشریحات ہیں جو نہایت مشکل کام ہے۔

۳۔ تقریر ترمذی بزبان عربی

یہ تقریر ترمذی شریف کے حاشیہ پر چھپ چکی ہے۔ اور مقبول خاص و عام ہے۔

۴۔ حاشیہ ابوداؤد شریف

یہ بھی حدیث پاک کی خدمت ہے

۵۔ حاشیہ مختصر المعانی

عربی معانی کی مشہور کتاب پر حاشیہ

۶۔ ایضاح الادلہ

۷۔ شرح اوثق العری فی تحقیق الجمعۃ فی القریٰ

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کی شرح مضمون نام سے ظاہر ہے۔

۸۔ جهد المقل فی تنزيهيه المعزو المذل

۹۔ ادلہ کاملہ ۱۰۔ افادات محمود۔ ۱۱۔ کلیات شیخ الہندؒ

مرقع حیات (رباعی)

محمود کہ زد قلم بحرف باطل
بربست احرام کعبہ حضرت دل
مردانہ، بزندان بلا رفت وے
باطل را حق نگفت حق را باطل

مولانا گرامی مرحوم

مرقع وفات

محمود کہ بود مرکز سر وجود
آں نقطہ قضا ز لوح ہستی نبر دود
ہر کس کہ باد رسد بجائی برسد
محمود رسید در مقام محمود

مولانا گرامی مرحوم

آہ شیخ الہند مولانائی محمود حسن
رفت زیں دار فنا ید وست در دار بقا
بہر تاریخ وصاش برور ہاتف شدم
ناگہاں آمد بگوش من عظامی ایں ندا
بے سروپا گشتہ اند از دست بیداد اجل
علم و مجد و ورع و تقوی فقر و تسلیم و رضا

۱۳۳۹ھ عظامی مرحوم

سوانح علمائے دیوبند

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ

فہرست

حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ

"فخر العلماء" از سید اشتیاق اظہر　　　　تلخیص:۔ ڈاکٹر نواز دیوبندی

فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح کی ترتیب کی ضرورت پر بہت سے اکابر علماء نے زور دیا ہے۔ مولانا نسیم احمد فریدی نے تذکرہ بزرگان دیوبند کے سلسلہ میں حضرت مولانا احمد حسن محدث امروہوی کی حیات مبارک پر اپنے مضمون میں جس کی پہلی قسط دار العلوم دیوبند کے رسالہ دار العلوم کی اشاعت دسمبر ۱۹۵۲ھ میں چھپی لکھا ہے کہ "یوں تو قاسم العلوم والمعارف کے شاگردوں کی تعداد بہت کچھ ہوگی لیکن یہ تین شاگرد بہت ہی مشہور ہوئے ہیں۔ اتنے مشہور کہ جہاں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی آتا ہے ان تینوں کا نام بھی آجاتا ہے۔ (۱) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب محدث دیوبندی (۲) سید العلماء حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہی اور (۳) فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے سوانح قاسمی میں مولوی رحمٰن علی نے تذکرہ علمائے ہند میں، مولوی عبد الرحمٰن امرتسری نے اپنے "سفر نامہ" میں نیز دیگر تذکرہ نویسوں نے حضرت مولانا نانوتوی کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی ان تینوں شاگردوں کا ذکر حضرت قاسم العلوم کے تذکرہ کے ضمن میں کیا ہے۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی جلد سوم کے آخر میں ماثر قاسمی کے عنوان کے تحت صفحہ ۱۸۹ پر ارقام فرمایا ہے کہ "یوں بھی سیدنا الامام الکبیر کے تلانذہ اور شاگردوں کی تعداد خواہ جتنی بھی کم ہو لیکن نہ صرف ایک شیخ الہند بلکہ ان کے رفقاء درس مولانا احمد حسن امروہوی، مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمہم اللہ جیسے اس کا بجا حق رکھتے ہیں کہ ایک مستقل جلد میں ان بزرگوں اور ان سے نفع اندوزوں کا ذکر کیا جائے۔

حضرت فخر العلماء نے اپنے دونوں متذکرہ بالا ہم سبق احباب کے مقابلہ میں بہت کم

عمر پائی مگر آپ نے اپنی ذہانت و صلاحیت، علمیت و حکمت، تقریر و تحریر اور درس و تدریس کے میدان میں جو کارنامے انجام دیئے وہ کسی طرح کم نہیں اور ان کا ذکر اپنے موقعہ پر آئے گا۔

خاندان

جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے انوار قاسمی صفحہ ۴۲۸ میں تحریر فرمایا ہے کہ "مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کی اولاد میں سے تھے" یہی بات انہوں نے قاسم العلوم کے صفحہ ۹۷ میں تحریر فرمائی۔ اس کے علاوہ اس کتاب کے صفحہ ۹۸ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے حوالہ سے بھی یہی بات دہرائی گئی اور قاری صاحب کے جو الفاظ انہوں نے نقل کئے ہیں وہ یہ ہیں۔ "مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی خاندان قدوسیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت قطب عالم کی اولاد میں سے تھے" حالانکہ یہ واقعہ نہیں ہے۔ یہ بات البتہ درست ہے کہ حضرت فخر العلماء کی دادی قطب عالم حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کی اولاد میں سے تھیں۔ اور درگاہ قدوسیہ کے سجادہ نشیں شاہد عماد الاسلام کی صاحبزادی تھیں۔ اس لحاظ سے آپ خاندان قدوسیہ کے فرد بن سکتے ہیں۔

سیدنا ابو ایوب انصاریؓ

فخر العلماء دراصل سیدنا ابو ایوب انصاری کی اولاد میں تھے۔ سلسلہ نسب یوں ہے:۔
فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی بن شاہ عبد الرحمٰن بن شاہ حبیب اللہ بن شاہ بونی سہارنپوری بن غلام بو علی بن شرف الدین بن غلام محی الدین بن عبد الرشید بن فضیل محمد بن قاضی محمد کبیر بن قاضی امین الدین عرف قاضی امن شہید بن خواجہ امین الدین بن خواجہ فرید الدین بن خواجہ محمد فاضل بن خواجہ ہاشم بن خواجہ علاؤالدین بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ شرف الدین بن خواجہ تاج الدین بن خواجہ منہاج الدین بن خواجہ ہاشم بزرگ بن شیخ الاسلام خواجہ ولی اسلام عبد اللہ انصاری پیر ہدایت بن خواجہ ابو منصور محمد بن علی بن محمد بن احمد بن علی بن جعفر بن منور مست بن سیدنا ابو ایوب انصاری صحابی رسولؐ۔

حضرت شیخ عبد القدوس اور مولانا رشید احمد سے نسبی تعلق

قطب عالم حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی سے آپ کا سلسلہ نسب نانا اور دادا دونوں

کے طرف سے ملتا ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی بھی انصاری خاندان سے وابستہ تھے۔ آپ اپنی والدہ اور والد دونوں کی جانب سے انصاری الاصل تھے مگر والدہ کی جانب سے آپ کا سلسلۂ نسب قاضی محمد کبیر بن قاضی امین شہید پر جاکر حضرت فخر العلماء کے شجرۂ جدی سے مل جاتا ہے

مولانا خلیل احمد اور مولانا صدیق احمد سے نسبی تعلق

حضرت فخر العلماء اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کا جدی سلسلہ بھی حضرت قاضی امین الدین عرف قاضی امین شہید پر جاکر مل جاتا ہے۔

حضرت نانوتوی کے داماد مولانا عبداللہ صاحب سے نسبی تعلق

جس طرح حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری اور حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھوی سے حضرت فخر العلماء کا نسبی تعلق تھا بعینہٖ یہی تعلق حضرت مولانا عبداللہ صاحب ناظم دینیات و داماد حضرت قاسم العلوم و خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی تھا۔ حضرت مولانا عبداللہ صاحب صاحبزادے تھے حضرت مولانا انصار علی صاحب کے اور وہ صاحبزادے تھے شاہ احمد علی صاحب کے جو حضرت سہارنپوری اور حضرت انبیٹھوی کے دادا تھے اور یہاں آکر ان تینوں بزرگوں کا سلسلہ مل جاتا ہے اور آگے قاضی امین شہید پر حضرت فخر العلماء کا سلسلہ ان کے سلسلۂ نسب سے مل جاتا ہے۔

حضرت فخر العلماء کی ننھیال اور سلسلۂ نسب

حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی بادشاہ دہلی ابو المظفر بہادر شاہ ظفر کے پیر طریقت حضرت شاہ حسن عسکری شہید خلیفہ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کے سب سے بڑے نواسے تھے، آپ کی والدہ الٰہی بیگم حضرت شاہ صاحب کی حقیقی صاحبزادی تھیں۔ والدہ کی طرف سے آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ حضرت فخر العلماء بن مسماۃ الٰہی بیگم بنت شاہ حسن عسکری شہید بن سید حسین بخش بن سید غلام سادات دہلوی بن سید عبدالواحد بن سید احمد بن سید عبدالعلیم

زنجانی بن سید حسین بن سید فتح اللہ بن سید حسن بن سید کمال الدین بن سید صدر الدین بن سید امام محمد بن سید زین العابدین بن مخدوم سید لطیف الحسن بن سید اسحاق مدنی المکی بن سید رضی الدین عرف ابراہیم بن سید سراج الدین بن سید ابراہیم بن سید عماد الدین بن سید عماد الاسلام بن سید کمال الدین بن سید نور الدین بن سید شاہ محمد بن سید تاج الدین بن سید ابو المنصور بن سید ابو بکر بن سید ابو صدیق بن سید ابو محمد جیلانی بن سید ابو محمد حسین بن سید محمد یعقوب بن سید ابو الفرح بن سید امام ابو حمزہ بن سید امام علی رضا بن سید امام موسیٰ کاظم بن سید امام جعفر صادق بن سید امام محمد باقر بن سید امام زین العابدین بن سید نا امام حسین بن حضرت فاطمۃ الزہرا ابنت محمد رسول اللہ ﷺ بن عبد اللہ۔

حضرت صابر بخش دہلوی سے تعلق

حضرت فخر العلماء کا اپنے نانہالی سلسلہ کی وجہ سے دہلی کے مشہور چشتی صابری سلسلہ کے بزرگوں سے بھی تعلق تھا۔ حضرت شاہ غلام سادات دہلوی سے تو اس بناء پر کہ وہ حضرت شاہ حسن عسکری شہید کے حقیقی دادا تھے۔ سلسلۂ نسب میں اس تعلق کو واضح کیا جا چکا ہے۔ لیکن حضرت فخر العلماء اسی تعلق سے چشتیہ صابریہ سلسلہ کے ایک اور بزرگ سے بھی نسبی تعلق رکھتے تھے۔ جن کا نام حضرت شاہ محمد چشتی تھا اور جن کو اکابر دہلی قدوۃ العارفین کے نام سے جانتے ہیں۔ اسی طرح سے آپ کا نانہالی تعلق حضرت شاہ صابر بخش دہلوی سے بھی تھا وہ بھی حضرت شاہ غلام سادات دہلوی کے حقیقی پوتے اور حضرت شاہ حسن عسکری شہید کے حقیقی چچا حضرت شاہ غلام نصیر الدین کے فرزند ارجمند تھے۔ اسی تعلق سے آپ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھوی کے حقیقی خالہ زاد بھائی تھے۔ حضرت مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کی والدہ مسماۃ امت اللہ حضرت فخر العلماء کی والدہ الٰہی بیگم کی حقیقی بہن تھیں۔ اور حضرت شاہ حسن عسکری ان دونوں بزرگوں کے حقیقی نانا تھے۔

شیخ المشائخ حضرت منشی حافظ علی سے قرابت قریبہ

حضرت فخر العلماء کے دادھیالی سلسلہ میں حضرت منشی حافظ علی صاحب ایک مشہور صاحب تصوف بزرگ گذرے ہیں جو آپ کے حقیقی پھوپھا، آپ کے والد کے حقیقی پھوپھی

زاد بھائی اور آپ کے پرداداشاہ بوبنی کے حقیقی نواسے تھے۔ ان کے سوانح نگار جناب محمود علی نے آپ کو شاہ ولایت گجرات دکن کے خطاب سے بھی یاد کیا ہے۔ حضرت منشی حافظ علی صاحب کی ولادت ۱۲۱۱ھ میں ہوئی۔

شجرہ کی اور اہم باتیں

حضرت فخر العلماء کے جدی سلسلۂ نسب میں دو حضرات قابل ذکر ہیں۔ ایک حضرت شیخ الاسلام محمد عبداللہ انصاری اور ان کے والد ابو محمد الانصاری۔ داراشکوہ نے سفینۃ الاولیاء کے صفحہ ۱۹۵ میں تحریر کیا ہے کہ حضرت ابوالمنصور محمد الانصاری حضرت شریف حمزہ عقیل کے مریدوں میں تھے۔ آپ نے حضرت ابوالمظفر ترمذی سے کسب فیض کیا۔

حضرت فخر العلماء کی ولادت

خاندانی روایات کے مطابق جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے وقت حضرت فخر العلماء کی عمر بارہ سال کے قریب تھی۔ اس حساب سے آپ کا سن ولادت ۱۸۴۶ء قرار پاتا ہے یہ اس ممکنہ سن سے مختلف ہے جس کا قیاس پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی نے قاسم العلوم کے صفحہ ۹۸ میں کیا ہے۔ انہوں نے حضرت فخر العلماء کا سن پیدائش حضرت شیخ الہند کے سن پیدائش ۱۸۵۳ء ہی کو قرار دیا ہے، حضرت فخر العلماء کی پیدائش کا سن قرار دینے کے سلسلہ میں ان کے دوسرے بھائیوں اور بہنوں کی پیدائش سے اندازہ لگانا پڑے گا۔ آپ کے سب سے چھوٹے بھائی شاہ مظہر حسین کی عمر ان کی صاحبزادی حمیدہ بیگم اہلیہ جناب اشفاق حسین قدوسی کے بقول جنگ آزادی کے وقت ڈیڑھ سال کی تھی اور دونوں کے درمیان تین بہنیں اور پیدا ہوئیں۔ گویا اولاد اول میں حضرت فخر العلماء کے بعد اولاد پنجم یعنی مولوی مظہر حسین کی پیدائش جنگ آزادی سے ڈیڑھ سال قبل کی ہے۔ اس لحاظ سے بھی خاندانی روایات کی تائید ہوتی ہے جس سے آپ کا سن ولادت ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء قرار پاتا ہے۔ دوسرے حضرت شیخ الہند کے سن ولادت کو حضرت فخر العلماء کے سن ولادت پر قیاس کرنا اس لئے ٹھیک نہیں کہ حضرت فخر العلماء نے اپنی تعلیم کا آغاز حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی طرح دیوبند میں نہیں کیا۔ دار العلوم کے اول صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی نے سوانح قاسمی میں اس

بات کی تصدیق کی ہے کہ حضرت فخر العلماء نے اول مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے تحصیل علم کی، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حضرت فخر العلماء جب مدرسہ دیوبند میں پہنچے تو علمی حیثیت سے ان کی استعداد نئے طالب علموں کے مقابلہ میں زیادہ تھی۔ پھر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے اپنے کانووکیشن ایڈریس میں دیوبند کے پنجتن کی علمی کاوشوں اور استعداد کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ ان میں سے اکثر نے مدرسہ دیوبند میں تحصیل علم کی۔ اس اشارہ کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان پانچوں میں سب کے سب نے مکمل طور پر دارالعلوم دیوبند میں تحصیل علم نہیں کی۔ ان میں سے کم از کم دو یعنی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قاسم العلوم سے میرٹھ میں اور حضرت فخر العلماء نے گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد سے تحصیل علم کی تھی۔ ان حالات کی روشنی میں حضرت فخر العلماء کا سن ولادت ۱۸۴۶ھ یا ۱۸۴۷ء قرار پاتا ہے۔

حضرت فخر العلماء کے دادا

حضرت فخر العلماء کے دادا شاہ حبیب اللہ سہارنپور کے رہنے والے تھے اور شاہ بو بنی سہارنپوری کے فرزند ارجمند تھے لیکن چوں کہ آپ کی شادی قطب عالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے سجادے شاہ عماد الاسلام کی صاحبزادی فہیم النساء کے ساتھ ہوئی تھی اس لئے وہ اخیر وقت میں سہارنپور سے گنگوہ تشریف لا کر آباد ہوگئے تھے۔ حضرت شاہ حبیب اللہ کے والد شاہ بو بنی سہارنپور کے رئیس تھے۔ اور اس شہر کی بو بنی کی مسجد آپ ہی کی تعمیر کردہ تھی جو حضرت حاجی امداد اللہ کے دادا پیر حضرت شاہ عبدالرحیم ولایتی کا مرکز تھی۔ حضرت سید احمد شہید جب سہارنپور تشریف لائے تو اس مسجد میں ان دونوں بزرگوں کی ملاقات ہوئی اور اسی مسجد میں ان دنوں حضرت سید صاحب نے قیام فرمایا۔ حضرت مولانا سید محمد میاں نے علمائے ہند کے شاندار ماضی کی جلد دوم کے صفحہ ۱۱۸ میں "سہارنپور مسجد بو بنی میں قیام ہوا" کے عنوان کے تحت ارقام فرمایا ہے کہ ولی محمد صاحب رئیس سہارنپور، مفتی شرف الدین صاحب، محمد یار خاں صاحب، الٰہی بخش صاحب، امام الدین صاحب، کریم الدین صاحب ہمن خاں محمد حسین، مولوی شاہ رمضان روڑکی والے جو بعد میں مجاہدین کا قافلہ لے کر سرحد پہنچے تھے یہیں (مسجد بو بنی میں) بیعت ہوئے، سید صاحب نے بیعت کے بعد آپ کو خلافت عطا

فرمائی۔ حکایات اولیاء مصنفہ مولوی اشرف علی تھانوی کے صفحہ ۷۸ پر بھی بوبنی کی مسجد کا ذکر ہے، جس سے اس کے اہم ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت امیر شاہ خاں نے اسی صفحہ پر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حوالہ سے اس مسجد میں حضرت سید احمد شہید بریلوی اور حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتی شہید کی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔

حکایت ۱۴۵ ۔ خاں صاحب نے فرمایا کہ یہ قصہ میں نے مولانا نانوتوی سے سنا ہے کہ سید صاحب تشریف لائے تو بوبنی کی مسجد کی طرف جا نکلے اس زمانے میں شاہ عبدالرحیم صاحب ولائتی رحمۃ اللہ علیہ اسی مسجد میں رہتے تھے۔ جب آپ مسجد کے نیچے تشریف لائے تو آپ نے فرمایا کہ اس مسجد میں کوئی بزرگ رہتے ہیں، ہمراہیوں نے عرض کیا کہ ہاں حضور! ایک بزرگ رہتے ہیں۔ سید صاحب یہ سن کر مسجد میں تشریف لے گئے اور حجرہ میں جا کر کواڑ لگا لئے۔ جب باہر نکلے تو سید صاحب ہنستے ہوئے نکلے اور شاہ عبدالرحیم صاحب روتے ہوئے نکلے۔ اس قسم کے دو یا تین اور جلسے ہوئے کہ سید صاحب ہنستے ہوئے اور شاہ عبدالرحیم صاحب روتے ہوئے نکلے۔ چوتھے یا پانچویں جلسہ میں سید صاحب اپنی حالت پر نکلے اور شاہ صاحب روتے ہوئے نکلے۔ اس کے بعد شاہ عبدالرحیم صاحب سید صاحب سے بیعت ہو گئے۔ یہ قصہ بیان کر کے مولانا نانوتوی نے فرمایا کہ اول کے جلسوں میں جو سید صاحب ہنستے ہوئے اور شاہ صاحب روتے ہوئے نکلے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ سید صاحب کی نسبت شاہ صاحب پر غالب تھی اور شاہ صاحب کی نسبت سید صاحب پر اور آخر مرتبہ جو سید صاحب اپنی حالت پر اور شاہ صاحب روتے ہوئے نکلے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ سید صاحب کی نسبت کو غلبہ ہو گیا تھا۔ بہر حال یہ مسجد بوبنی جو حضرت فخر العلماء کے پردادا شاہ بوبنی نے سہارنپور میں تعمیر کرائی تھی بڑے بڑے بزرگوں کا مسکن رہی ہے، حضرت کے دادا شاہ حبیب اللہ نے حضرت شاہ عماد الاسلام کی صاحبزادی سے شادی کر کے فوراً بعد نقل مکانی نہیں کی۔ آپ نے اپنی صاحبزادی کی شادی حضرت منشی حافظ علی صاحب سے سہارنپور ہی میں کی۔ جناب حافظ محمود علی نے "آئینہ کرامت" کے عنوان سے حضرت حافظ صاحب کی جو سوانح شائع کی ہے اس کے صفحہ ۶ پر یہ تحریر ہے کہ "آپ کی شادی شاہ حبیب اللہ بن شاہ بوبنی صاحب مرحوم جو آپ کے حقیقی ماموں تھے ان کی صاحبزادی سے حسب رواج خاندان بڑی دھوم دھام سے ہوئی" بہر حال حضرت شاہ حبیب اللہ اواخر عمر میں گنگوہ آ کر آباد ہو گئے۔ آپ

نہایت متقی پرہیز گار شریف اور سید ھے بزرگ تھے۔ حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے اپنی مشہور تصنیف تذکرۃ الرشید میں حضرت شاہ حبیب اللہ کا ایک واقعہ حضرت گنگوہی کی زبانی نقل کیا ہے۔ جو اس تصنیف کے صفحہ ۲۷۷ پر ملفوظات کے تحت درج ہے۔ حضرت گنگوہی فرماتے ہیں کہ مولوی مظہر حسین (برادر خورد حضرت فخر العلماء) صاحب کے دادے ایک بھولے آدمی تھے۔ ان کے لڑکے عبدالرحمٰن نے (حضرت فخر العلماء کے والد) جن کی قبر دیوار غربی احاطہ خانقاہ (قطب عالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی) کے قریب ہے۔ ایک دن رمضان کی ستائیس یا اٹھائیس تھی اپنے والد سے کہا کہ ابا جی میں نے چاند دیکھا۔ انہیں یقین آگیا اور کہتے پھرے لو بھئی چاند ہو گیا کل کو عید ہے۔ لوگوں نے کہا کہ مولوی صاحب غضب کرتے ہو بھلا ستائیس یا اٹھائیں کو بھی چاند دکھائی دیتا ہے۔ وہ بولے کہ میرا بیٹا عبدالرحمٰن چھوٹا نہیں اس کی بالی نگاہ ہے دیکھ لیا ہوگا"۔

حضرت فخر العلماء کے والد کی شادی

حضرت شاہ حسن عسکری کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اس لئے ان کی خواہش تھی کہ ان کی کم از کم ایک اولاد ضرور ان کے پاس رہے۔ اس لئے انہوں نے اپنی لڑکی کیلئے ایک ایسے نوجوان کی تلاش کی جو ان کے یہاں قیام پر رضامند ہو۔ خوش قسمتی سے انہیں زیادہ تلاش نہیں کرنا پڑا اور اپنی گھر داماد کیلئے خود اپنے سگے خالہ زاد بھائی کے روپ میں بڑا داماد مل گیا۔ یہ سگے خالہ زاد بھائی شاہ عبدالرحمٰن بن شاہ عبدالرحمٰن بن شاہ حبیب اللہ بن شاہ بو بنی سہارنپوری تھے۔ شاہ عبدالرحمٰن کی والدہ اور حضرت شاہ حسن عسکری شہید کی والدہ سگی بہنیں تھیں اور شاہ عماد الاسلام سجادہ نشیں درگاہ قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی صاحبزادیاں تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بڑی لڑکی الٰہی بیگم کا عقد شاہ عبدالرحمٰن کے ساتھ کر دیا جو خاندانی روایات کے بقول حسن سیرت اور حسن صورت دونوں خصوصیتوں سے مالا مال تھے۔

شاہ عبدالرحمٰن کی اولاد

شاہ عبدالرحمٰن نے شادی کے بعد سے لے کر جنگ آزادی کے وقت تک حضرت شاہ حسن عسکری ہی کے ساتھ اپنا وقت گذارا۔ شاہ حسن عسکری اس زمانہ میں دہلی میں ترکمان

دروازہ کے پاس رہا کرتے تھے۔ یہ مکان حویلی نما تھا اور حضرت مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کے جو حضرت شاہ صاحب کے نواسے تھے قیام دہلی تک موجود تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس مکان کی دیواریں دوہری تھیں۔ جنگ آزادی کے موقعہ پر جب دہلی میں افراتفری ہوئی تو قرب وجوار کے سینکڑوں افراد نے اپنا مال و زر حضرت شاہ صاحب کے مکان میں بطور امانت جمع کرادیا۔ لیکن جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد حضرت شاہ صاحب اور ان کے متوسلین نہایت پریشانی کے عالم میں دہلی سے نکلے اور یہ امانتیں اسی مکان میں محفوظ رہیں۔ جب شاہ حسن عسکری پر مقدمہ چلا تو انہیں پھانسی کی سزا دی گئی اور ان کی ساری املاک ضبط کر لی گئی۔ چنانچہ یہ مکان بھی ضبط ہوا اور جب دہلی کی کسی توسیعی اسکیم کے تحت اسے منہدم کیا گیا تو اس مکان سے لاکھوں روپیہ کی تمسکات، امانتیں، نقد اور زیورات کی صورت میں نکلیں بہرحال شاہ عبدالرحمٰن اپنی اہلیہ اور بیگم کے ہمراہ اسی مکان میں حضرت شاہ صاحب کے ہمراہ قیام پذیر رہے۔ یہیں ان کی تمام اولادیں ہوئیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

شاہ عبدالرحمٰن

- فخر العلماء حضرت مولانا فخرالحسن
- پیر جی مظہر حسین
- اولیاء بیگم
- انبیاء بیگم
- قطبی بیگم

حضرت فخرالعلماء کے والد

حضرت فخرالعلماء کے والد شاہ عبدالرحمٰن جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے فرشتہ صورت اور فرشتہ سیرت تھے۔ اور حضرت شاہ حسن عسکری انہیں اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ لیکن جب جنگ آزادی ناکام ہوئی اور حضرت شاہ حسن عسکری نے دہلی کو خیر باد کہا تو ان کے داماد اور لڑکی بھی ان کے ہمراہ دہلی سے ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ عجب افراتفری کا دور تھا۔ خاندانی روایات کے مطابق حضرت شاہ عبدالرحمٰن زنانے لباس میں دہلی سے روانہ ہوئے اور بڑی دقتوں اور دشواریوں کے بعد گنگوہ پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ مگر اس قومی سانحہ نے ان کی زندگی کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیا اور آپ کا انتقال جنگ آزادی کے تیسرے سال یعنی ۱۸۶۰ء میں ہوگیا۔ ان کا کم عمری میں انتقال بھی ایک سانحہ سے کم نہیں تھا۔ مگر ان کی جواں سالہ اہلیہ

جنہوں نے اپنے والد بزرگوار کی شہادت کا سانحہ بھی مشکل سے دو سال ہوئے دیکھا تھا۔ اب اس دنیا میں یکہ وتنہا رہ گئیں۔ اور ان کی مدد کیلئے سوائے ان کے پندرہ سالہ فرزند فخر الحسن کے اس دنیا میں کوئی موجود نہیں تھا۔ حکومت وقت کے معتوب کی دختر ہونے کی وجہ سے جان پہچان والے تو کیا اعزاء واقربا بھی ان سے ملنے سے کتراتے تھے۔

حضرت فخر العلماء کا بچپن

حضرت مولانا فخر الحسن کی ولادت دہلی میں ہوئی تھی اور انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی کے بارہ سال دہلی میں اپنے محترم ومقدس نانا اور اپنے فرشتہ خصلت والد کی زیر نگرانی میں گذارے اور یہیں انہوں نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز کیا۔ ان کا بچپن کا یہ دور خوشیوں اور شادمانیوں سے مملو تھا۔ ایک طرف نانا نانی دوسری طرف باپ ماں تیسری جانب خالائیں۔ چوتھی جانب چھوٹے بھائی بہن۔ دولت عزت راحت سب ان کو میسر تھا۔ خاندانی روایات کے مطابق صبح سے شام تک ڈیوڑھی پر عقیدت مندوں کا ہجوم اور غربا وفقراء کی یورش رہا کرتی تھی۔ ایک طرف لوگ برکت حاصل کرنے دعائیں کرانے اور اپنی روحانی تربیت کیلئے دیوانہ وار آرہے ہیں۔ اور ان میں امیر وغیرب شہزادے شہزادیاں امراء اور بااقتدار طبقہ کے لوگ سب شامل تھے۔ دوسری جانب صبح سے شام تک کھانا اور خیرات تقسیم ہو رہی ہے۔ حضرت فخر العلماء اس ماحول میں خراب ہو سکتے تھے کبر ونخوت کا شکار ہو سکتے تھے طلب علم اور جد وجہد زندگی سے بے نیاز اور بیگانہ ہو سکتے تھے مگر انہوں نے دیکھا کہ اس ہجوم عقیدت منداں اور اس کثرت خیرات وبخشش کے ماحول میں ان کے نانا جو اور جوار کی روٹی پر اکتفا کرتے ہیں اور پستہ پلاؤ، بادام پلاؤ، متنجن اور اسی قسم کے انواع واقسام کے لذیذ کھانوں کی موجودگی میں بھی سنت نبوی پر عمل کرتے ہوئے موٹے جھوٹے کھانوں کو پسند فرماتے ہیں۔ اور کم گوئی اور کم خوری کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ اس لئے ان کے کردار پر اگر اثر پڑا تو اسی تقدس وپاکیزگی، بے نفسی وایمان داری، انکسار اور حلم کا اور یہی خصوصیات آگے جاکر ان کی زندگی کے سفر میں رفیق اور معاون ثابت ہوئیں جب حالات نے تبدیل ہوکر انہیں مصائب وشدائد زمانہ کا شکار بنادیا۔

والدہ محترمہ

مگر ان کی زندگی پر سب سے گہری چھاپ ان کی والدہ محترمہ کی ہے انہوں نے اپنی والدہ سے ہمت و جرأت، استقلال و بہادری کا سبق لیا۔ ایک تو یہ الٰہی بیگم تھیں جنہوں نے اپنے والد کے دور عروج میں سکون، نظم، خوشحالی اور فارغ البالی کے مزے لوٹے۔ انہوں نے وہ دور بھی دیکھا جس میں ان کی شادی شدہ زندگی کے تیرہ چودہ سال بھی تھے جب ان کا سب سے اہم کام والد والدہ، شوہر اور بچوں کی خبر گیری کے بعد غرباء و مساکین میں کھانا اور خیرات تقسیم کرنا تھا۔ خاندانی روایات کے مطابق یہ کام صبح سے شام تک جاری رہتا تھا، اور اس میں اس کھانے کی تقسیم بھی شامل تھی جو شاہ وقت، بیگمات شاہی، شہزادوں اور شہزادیوں اور امراء کے یہاں سے پیر و مرشد کی خدمت میں بطور نذر آتا تھا۔ مگر جس کے بارے میں حضرت شاہ حسن عسکری کی ہدایت تھی کہ اسے بھی غرباء و مساکین میں بانٹ دیا جائے۔ لیکن جب حالات نے پلٹا کھایا، فارغ البالی عسرت میں بدل گئی دوست دشمن اور اپنے بیگانے بن گئے تو انہوں نے اپنے بیمار شوہر اور اپنے پانچ بچوں کی زندگی کی پوری ذمہ داری قبول کی اور اس ذمہ داری کو کماحقہ پورا کیا۔ ناز و نعم میں پلنے والی یہ پردہ نشیں خاتون وقت پڑنے پر کوہ ثبات اور ہمت و جرأت کی چٹان ثابت ہوئی۔ آپ جب اپنے بیمار شوہر اور بچوں کو لے کر جن میں ایک شیر خوار بچہ بھی شامل تھا در بدر کی ٹھوکریں کھاتی قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں پھرتی گنگوہ پہنچیں تو ایسا کوئی سہارا بظاہر نہیں تھا کہ جو گذر اوقات کے لئے کافی ہوتا۔ خاندانی روایات کے مطابق آپ کے پاس ہیرے کی انگوٹھی تھی جو دور ابتلا میں اپنی قیمت سے بہت کم پر فروخت کی گئی اور اس سے قوت لایموت کا سلسلہ چلا۔ تین سال کے اندر شوہر نامدار نے وفات پائی اور بحوالہ مولانا رشید احمد گنگوہی اپنی والدہ کے جد اعلیٰ قطب عالم حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ اب یہ خاتون محترم تھیں اور ان کی پانچ اولادیں جن میں سب سے بڑے حضرت فخر العلماء صرف پندرہ برس کے تھے۔ خاندانی روایات کے مطابق دونوں نے مل کر گھریلو معاملات کو سنبھالا اور والدہ محترمہ نے کپڑے سی سی کر اپنے بچوں کی پرورش کی، یہ خاتون جن کی ابتدائی زندگی جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے انتہائی آرام سے گذری تھی اب ایک شہید کی بیٹی اور ایک مجاہد کی بیوہ

تھیں۔ اسی عالم میں ان کی باقی تمام زندگی گذری، اسی ماحول میں بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی ہوئی اور اسی عالم میں بڑے بیٹے اور دو بیٹیوں کی مستقل جدائی اور رحلت کا غم انہوں نے اٹھایا۔ مگر ہر صدمہ اور ہر آفت کا انتہائی خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ حضرت فخر العلماء کی سیرت پر اپنے ابتدائی دنوں میں جس طرح اپنے نانا شاہ حسن عسکری کا اثر پڑا اسی طرح اپنی بہادر، دبنگ، جرأت مند با حوصلہ اور نیک سیرت ماں کا بھی اثر پڑا۔ الٰہی بیگم نے اپنے بچوں کو بڑی مشکل سے پالا تھا اس لئے وہ انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھے اور ان بچوں کے بچے بھی۔ خاندانی روایات کے مطابق جب لڑکی قطبی بیگم اہلیہ حکیم محمد اسمٰعیل گنگوہی اجمیری کا وصال ہوا تو ان کے ایک صاحبزادے حکیم محمد سعید اور دو صاحبزادیاں امت ایمان اور میمونہ حیات تھیں۔ انہوں نے اپنے چھوٹے صاحبزادے شاہ مظہر حسین کو ہدایت کی کہ وہ اپنی بڑی بیٹی ام سلمہ کا نکاح حکیم اسمٰعیل سے کردیں تاکہ ان کے نواسے اور نواسیاں تکلیف میں نہ رہیں۔ حکیم صاحب اور مسماۃ ام سلمہ کی عمر میں بڑا تفاوت تھا اس لئے مولوی مظہر حسین کو تردد تھا مگر والدہ مرحومہ کا یہ کہنا کہ اگر تم نے میرا کہنا نہیں مانا تو میں تمہارا دودھ نہیں بخشوں گی بہت بڑی وارننگ تھی۔ لہٰذا یہ نکاح ہو کر رہا۔ اسی طرح جب ان ہی قطبی بیگم کی لڑکی امت ایمان کا جن کی شادی مولوی محمد صاحب رام پوری سے ہوئی تھی عین عالم جوانی میں انتقال ہو گیا، تو پھر ان کے حکم پر مولوی محمد مظہر حسین کی دوسری بیٹی ام کلثوم کی شادی مولوی محمد صاحب سے کی گئی۔ اور یہاں بھی اسی قسم کا مسئلہ درپیش تھا۔

الٰہی بیگم نے جوانی ہی میں حوادث کا مقابلہ ہنسی خوشی کرنا سیکھا تھا۔ لہٰذا وہ بڑی سے بڑی افتاد سے نہیں گھبراتی تھیں۔ جس وقت ان کے بڑے بیٹے فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن کا وصال ہوا تو ان کے نواسے حکیم محمد سعید کے نکاح کی تیاریاں تھیں، جب حضرت والا کے انتقال کی خبر کانپور سے گنگوہ پہنچی تو خاندانی روایات کے مطابق سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ شادی ملتوی کردی جائے۔ مگر واہ رے الٰہی بیگم کا حوصلہ کہ بڑے بیٹے کے انتقال کا صدمہ بھی ہے اور اولاد کے ساتھ محبت کا اندازہ متذکرہ بالا سطور سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود فرمایا کہ جو ہونا تھا ہو کر رہا اب شادی کو ملتوی کرنے سے کیا فائدہ، چنانچہ شادی وقت مقررہ پر ہوئی مگر بشریت کے اپنے تقاضے تھے اس لئے اسمیں وہ دھوم دھام نہ ہو سکی جس کا یہ موقعہ تھا۔ ان کی ہمت اور بہادری کے جو واقعات بیان کئے

جاتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ تحریک آزادی کے رکن رکین حضرت شاہ حسن عسکری کی یہ بڑی بیٹی ہمت واستقلال، صبر وشکر، جرأت وجوش کا ایک ایسا پیکر تھیں جن کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اور ان کے بڑے فرزند حضرت فخر العلماء نے اپنی مختصر مگر بھرپور زندگی میں ملک وملت اور دین اسلام کی جو خدمت کی اس کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔

گنگوہ کی تاریخی حیثیت

حضرت فخر العلماء کی گنگوہ واپسی ہر چند ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے باعث تھی لیکن جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے آپ کی دادی حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کی درگاہ کے متولی اور سجادہ نشیں حضرت شاہ عماد الاسلام کی صاحبزادی تھی، اس لئے دہلی سے گنگوہ منتقلی خلاف توقع نہیں تھی، گنگوہ کا تاریخی قصبہ جو ضلع سہارنپور میں ضلع کے صدر مقام سے ۳۶ر میل کے فاصلہ پر دریائے جمنا کے کنارے آباد ہے، حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کے شاہ آباد (مشرقی پنجاب) سے گنگوہ منتقل ہونے کے بعد برصغیر کا ایک اہم علمی اور روحانی مرکز بن چکا تھا۔ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی دراصل ردولی کے رہنے والے تھے، لیکن آپ نے ۸۹۷ھ میں ردولی سے ہجرت فرما کر شاہ آباد ضلع کرنال کو اپنا مستقر بنایا۔ جہاں آپ سینتیس سال قیام فرمارہے، اس کے بعد آپ وہاں سے گنگوہ منتقل ہو گئے اور سلطان ابراہیم لودھی کی شکست سے ایک سال قبل یعنی ۱۵۲۴ء میں وہاں قیام پذیر ہو چکے تھے۔ حضرت شیخ کا جس مقام پر اب روضہ ہے اس زمانہ میں وہ جگہ دریائے جمنا کی گذر گاہ تھی، لیکن دریائے جمنا حضرت شیخ کے حکم سے وہاں سے تین میل دور ہٹ گئی اور اب سرائے پیرزادگان سے تین میل ہی کے فاصلے پر بستی ہے، حضرت والا کے جو مرید آپ کو شاہ آباد سے گنگوہ لائے تھے، انہوں نے آپ کو نہایت عزت واحترام سے اپنے یہاں ٹھہرایا اور گنگوہ کا یہ محلّہ جو اس زمانے میں شہر کے قریب آباد تھا اور سرائے کہلاتا تھا اب سرائے پیر کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس میں زیادہ تر حضرت شیخ کی اولاد آباد ہے اسی محلّہ میں مگر کسی قدر فاصلہ پر حضرت شیخ کی اولاد میں سے حضرت نظام الدین بلخی تھانیسری کے خلیفہ اجل حضرت شیخ ابو سعید گنگوہی کا مزار پر انوار بھی ہے جن کے مشہور خلیفہ شاہ محب اللہ الہ آبادی کے سلسلہ میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے پیر اور دادا پیر بیعت تھے۔ جناب محمد اسمٰعیل انصاری نے جو خود گنگوہ

شریف کے رہنے والے ہیں۔ اور جن کا خاندان حضرت فخر العلماء کے عقیدت مندوں میں شمار کیا جاتا ہے لکھا ہے کہ مجھے اتنا معلوم ہے کہ گنگوہ ایک قدیم اور پرانی بستی ہے بچپن سے سنتا چلا آیا ہوں کہ قدیم زمانہ میں یہاں کسی ہندو راجہ گنگ کی حکمرانی تھی۔ اس زمانہ میں ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں جنہیں اس زمانہ میں سلطنتیں کہا جاتا تھا بٹا ہوا تھا۔ اب کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان حملہ آور ہوئے یا تبلیغ کے لئے آئے جن کی مزاحمت کی گئی اور قتال بھی ہوا۔ اس اطلاع کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ قصبہ گنگوہ سے باہر ایک میل کے فاصلہ پر سات قبریں ہیں جو ہفت شہید کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ قبریں آج کل کی قبور سے زیادہ دراز اور لمبی ہیں کیونکہ قدیم زمانہ میں لوگ زیادہ قوی زیادہ لمبے اور زیادہ قوی الجثہ ہوتے تھے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ شہاب الدین غوری کے زمانہ میں آئے کیونکہ اس سے پہلے کسی مسلمان فاتح کی اس طرف آنے کی کوئی اطلاع نہیں ملتی جو قصبہ کی سطح سے تقریباً ۷۰، ۸۰ فٹ بلند ہے۔ یہ آبادی خالصتاً ہندو آبادی ہے۔ اور اس جگہ گنگوہ کی جامع مسجد ہے، بلندی کی وجہ سے مسجد کا کنواں اتنا گہرا ہے کہ پانی دیکھنے سے تارے کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس علاقہ میں راجہ گنگ کے قلعے اور محلات تھے، جو کسی بزرگ کی بددعا سے الٹ دیئے گئے، محلات کا ہونا غیر یقینی نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس علاقہ کے نشیبی حصہ میں اب جو مکانات تھے ان میں پرانی تعمیرات کے آثار اور نشانات بالکل نمایاں تھے۔ اگرچہ اب تک کوئی ایسے آثار نہیں ملے جنہیں آثار الصنادید کہا جاسکے۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس حصہ میں خاص تعمیرات ہوسکتی ہیں وہاں پر مزید تعمیرات بن چکی ہیں۔ اور کسی شخص نے اس عنوان پر نہ تحقیق کی اور نہ کھدائی وغیرہ ہوئی۔ البتہ بالکل وسط میں ایک بزرگ کا مزار ہے جسے شاہ تلک کا مزار کہا جاتا ہے اس مزار کے بالکل متصل تقریباً ایک دو گز کے فاصلہ پر ہندوؤں کی عالیشان عمارات کھڑی ہوگئی ہیں۔ اور اسی جگہ کسی زمانہ میں پولیس اسٹیشن تھا جو اب پولیس چوکی میں تبدیل ہوگیا ہے کیونکہ پولیس اسٹیشن کی نئی تعمیر قصبہ سے باہر ہوچکی ہے۔ شاہ تلک کا مذکورہ بالا مزار ہندو عمارات اور سرکاری اُردو اسکول کے درمیان واقع ہے۔

گنگوہ کی تاریخی حیثیت کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اس کی اہمیت کی اصل وجہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا قیام گنگوہ ہے، جس کے باعث یہ سرزمین اولیائے کبار

کے لئے مقدس اور شاہان اسلام کے لئے محترم بن گئی۔ حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے اپنی تاریخی سوانح "تذکرۃ الرشید" میں لکھا ہے کہ "دسویں صدی ہجری میں عالم کے دماغ معطر کرنے والا شاداب پھول یعنی شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہٗ کا وجود باجود ارغ ہندوستان کے لئے مایۂ ناز اور نسل نعمانی وذریت ابو حنیفہ کوفی میں وہ آفتاب ہدایت تھا جس نے دنیا میں چھائی ہوئی ظلمت وتاریکی پر نور عرفان وضیائے ایقان کی چمکدار شعاعیں ڈالیں اور دل آویز مہک سے عالم کے دل موہ لئے۔" حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے بعد جس عظیم شخصیت نے گنگوہ کی شہرت وعظمت میں چار چاند لگائے وہ حضرت فخر العلماء کے پیر ومرشد اور استاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی دل آویز شخصیت تھی جو خاندانی اعتبار سے بھی حضرت فخر العلماء کے ہم جد تھے کہ دونوں ہی انصاری النسل اور حضرت ابو ایوب انصاری کی اولاد میں تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے جب معرفت اور شریعت کے علوم سے دنیا کو منور کرنے کا فیصلہ کیا تو ان کی نگاہ انتخاب اسی قدوسی خانقاہ پر پڑی جہاں حضرت فخر العلماء کے والد اور دادا مدفون ہیں۔ اور جہاں سے فرنگیوں نے حضرت فخر العلماء کے حقیقی نانا اور جنگ آزادی کے ہیرو شاہ حسن عسکری شہید کو گرفتار کیا تھا، حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید مطبوعہ محبوب المطابع دہلی کے صفحہ ۱۵ پر کیا خوب کہا ہے کہ "شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۳ر جمادی الآخر ۹۴۵ھ میں وصال پایا اور اس عالم سے جسمانی انقطاع فرمایا۔ اور تیرہویں صدی کا آخری سال ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ اس خاندان ایوبی کا نام باقی رکھنے والے اور قدوسی مسند کی عزت سنبھالنے والے نونہال نے اپنے وجود مسعود سے خانۂ عالم کو معمور کیا اور وہی قصبہ گنگوہ آباد کیا جس میں قدوسی خانقاہ اپنے شیخ کے سچے جانشیں کی تلاش میں تین سو برس سے پریشان حال اور ویران پڑی تھی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی شفقت ومحبت بجا طور پر ناز کر سکتی ہے بلکہ حضرت فخر العلماء کی یہ ایک اہم خصوصیت بھی ہے کہ جہاں وہ انصاری النسل ہونے پر فخر کر سکتے ہیں وہاں انہیں یہ فخر بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی دادی حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی اولاد میں تھیں۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد جس شخصیت کے نام سے گنگوہ کی عظمت میں اضافہ ہوا وہ یہی حضرت فخر العلماء کی شخصیت ہے جو دنیائے اسلام میں حضرت مولانا فخر الحسن محدث گنگوہی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

حضرت فخر العلماء گنگوہ میں

حضرت فخر العلماء اپنے والد اور والدہ کے ہمراہ جب گنگوہ تشریف لائے تو عیش و عشرت کی بجائے تنگی اور تنگدستی کا دور دورہ تھا۔ دہلی سے گنگوہ کا سفر، بھیس بدل کر مسافت طے کرنا۔ آزادی کی جدو جہد میں (جس کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے انہوں نے دیکھا جس میں ان کے نانا نے پیش پیش حصہ لیا) دہلی کی تباہی، فرنگیوں کی فتح، یہ وہ سارے نظارے تھے جو ان کے نانا کے سامنے سے گزرے پھر وہ اس آتش سیال سے گزر کر گنگوہ کے نسبتاً پرسکون ماحول میں داخل ہوئے، ان کے والد جو قطب عالم حضرت شیخ عبد القدوس کے سجادہ عماد الاسلام کے حقیقی نواسے تھے بیمار تھے، ایک والدہ کا دم تھا جو حوصلہ اور ہمت کا مینار تھیں۔ لیکن جیسا کہ ہر دور میں ہوتا ہے، مصیبت میں خدا یاد آتا ہے۔ مسلمانوں کو اگر اس دور میں آسرا تھا تو وہ صرف خدا کی ذات سے تھا۔ لہٰذا ہر شخص اللہ سے رجوع کر رہا تھا۔ پھر حضرت فخر العلماء کا خاندان تو اہل اللہ کا خاندان تھا، لہٰذا جب حضرت کی تعلیم و تربیت کو پھر جاری کرنے کا مسئلہ پیدا ہوا جو اس افراتفری کے باعث مہینوں معطل رہی تھی تو یہی فیصلہ ہوا کہ دینی تعلیم کا جو سلسلہ دہلی میں جاری تھا اسے از سر نو شروع کیا جائے۔ والدہ ماجدہ نے ہیرے کی انگشتری بیچ کر جو رقم حاصل کی تھی اسی سے سرائے پیر زادگان میں ایک مکان خریدا گیا تاکہ سر چھپانے کی جگہ تو میسر ہو اور بیمار شوہر کی تیمار داری کی جائے۔

حفظ قرآن پاک کی سعادت

حضرت والا کے والدین کو سب سے پہلے تو اسی بات کی فکر ہوئی کہ انہیں کلام پاک حفظ کرایا جائے جیسا کہ حضرت قاسم العلوم کے کانووکیشن ایڈریس کے مطابق مسلمانوں میں خواہ وہ طبقہ امراء میں ہوں یا طبقہ متوسط میں، علوم دینیہ کا شغل بالکل نہیں تھا۔ اور یہی حال گنگوہ کا تھا۔ اگرچہ اس قصبہ کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ اس سرزمین میں قطب عالم حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی ابدی استراحت فرما رہے تھے۔ آپ کا مزار اور خانقاہ سرائے پیر زادگان میں واقع تھے، اور حضرت والا کی اولاد یہاں بہت بڑی تعداد میں شاد و آباد تھی اور آپ ہی کے مزار اور خانقاہ سے تھوڑے فاصلہ پر مگر محلّہ سرائے پیر زادگان ہی میں آپ کے پوتے

اور حضرت شیخ نظام الدین تھانیسری بلخی کا مزار بھی تھا لیکن یہاں بھی اور حضرت قطب عالم کی اولاد میں علم کا ذوق و شوق نہیں تھا۔ حضرت فخر العلماء اگرچہ براہ راست قطب عالم کی اولاد میں نہیں تھے مگر ان کی دادی حضرت شیخ کی اولاد میں تھیں بحمد اللہ دینی علوم کی طرف مائل تھے۔ اور حضرت والا کے والد ماجد شاہ عبد الرحمٰن جو براہ راست حضرت شاہ عماد الاسلام کے نواسے تھے، اپنے فرزند کے اس طبعی اور قدرتی میلان سے خوش تھے اس لئے انہوں نے حضرت فخر العلماء کو دینی علوم کی تحصیل کی راہ پر لگا دیا۔ اور خوش قسمتی سے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی جو کہ اس وقت تک جیل کی صعوبتوں کو چھ ماہ تک برداشت کرنے کے بعد آزاد ہو کر گنگوہ میں طالبان دین حق اور خدمت اہل حق کے متلاشیوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی اور جن سے تعلق خاطر بھی تھا اس لئے حضرت فخر العلماء ان کی خدمت میں علوم دینی کے حصول کے لئے حاضر خدمت ہو گئے۔ لیکن اس زمانے میں گنگوہ میں حفاظ کی بڑی کمی تھی اس لئے تراویح پڑھانے کیلئے حفاظ بڑی مشکل سے ہاتھ آتے تھے۔ لہٰذا والدین کی رضامندی اور اجازت سے حفظ قرآن کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا اور حضرت فخر العلماء نے اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت سے قرآن پاک حفظ کر کے محراب سنانا شروع کر دی۔ مگر حضرت والا کی عمر شریف بہت زیادہ نہیں تھی اس لئے کبھی کبھی نیند کا غلبہ ہو جاتا تھا مگر ان کی خوش الحانی اور قرآن پاک کو نہایت صاف صاف الفاظ اور روانی کے ساتھ سنانے کی وجہ سے قصبہ کے لوگ انہیں بہت چاہتے تھے۔

حضرت گنگوہی کی شاگردی

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ حضرت فخر العلماء نے انہی ایام میں حضرت مولانا رشید احمد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ خاندانی روایات میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۶۷ء میں دیوبند جانے سے پہلے آپ نے گنگوہ میں قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا۔ آپ نے اس زمانہ میں حضرت گنگوہی سے کیا تعلیم حاصل کی اور اس کا پتہ نہیں چلتا۔ مگر چونکہ گنگوہ میں حضرت فخر العلماء کی آمد کے بعد جو ۱۸۵۷ء کے اواخر یا ۱۸۵۸ء کے اوائل میں ہوئی۔ اور ان کی دیوبند روانگی جو ۱۸۶۷ھ میں ہوئی کے درمیان کافی وقفہ ہے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے حضرت مولانا رشید احمد

صاحب سے حدیث کی کتابیں یقیناً پڑھ لی ہوں گی اور اگر پورا دورہ مکمل نہ کیا ہوگا تو دو چار اہم کتابوں کا مطالعہ تو ضرور حضرت گنگوہی کی خدمت میں رہ کر کیا ہوگا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے سوانح قاسمی حصہ اول کے صفحہ ۷۴ میں حضرت قاسم العلوم کے شاگردوں کے ذکر کے تحت حضرت فخر العلماء کا جو ذکر کیا ہے اس کے الفاظ سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت والا نے مدرسۂ دیوبند میں داخلہ سے قبل حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی کی تھی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔ دوسرے مولوی فخرالحسن صاحب گنگوہی ہیں، درستگیٔ مزاج میں مولانا کے قدم بہ قدم بلکہ کچھ بڑھ کر ہیں، عمدہ استعداد ہے انہوں نے بھی مدرسہ دیوبند میں تحصیل کی ہے۔ اور اول جناب مولوی رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے مکمل طور پر تحصیل علم کی تھی۔ خود تذکرۃ الرشید کے مصنف مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے اپنی مذکورہ بالا تصنیف کی جلد اول میں جو حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات ہے۔ یہ تحریر فرمایا کہ حافظ امیر حسن گنگوہی مولوی مومن علی گنگوہی، مولوی فخر الحسن گنگوہی، پیر جی عبدالرزاق گنگوہی، مولوی نذیر احمد انبیٹھوی، مولوی اللہ رکھے انبیٹھوی، مولوی عبدالرحمٰن کرنالی، مولانا فتح محمد تھانوی، مولانا محمود حسن ساڈھوڑوی، اور مولوی امیر حسن انبیٹھوی کو بھی حضرت سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ (ص: ۱۹۷)

حضرت گنگوہی کا درس اور اس کی نوعیت

حضرت گنگوہی کے درس میں تعلیم و تعلم کے ساتھ غذائے روحانی کا بندوبست بھی تھا۔ حضرت فخر العلماء نے حضرت گنگوہی کے درس کی اس خصوصیت کا ذکر اپنی ایک مجلس میں کیا جس میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی بھی تھے۔ یہ غالباً کانپور کی بات ہے۔ جہاں یہ دونوں حضرات گذشتہ صدی کی آخری دہائی میں باہم یکجا تھے۔ حضرت تھانوی کی زبانی حضرت فخر العلماء کی اس روایت کو سنئے۔ یہ روایت اس حدیث شریف سے متعلق ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ "مجھے یونس علیہ السلام پر فضیلت نہ دو۔ جب یہ حدیث حضرت گنگوہی کے درس میں آئی تو طلبہ نے اپنے اشکال بیان کئے۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ "میں نے اس سلسلہ میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکایت سنائی جو مولانا فخرالحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کی تھی۔ کہ جب بخاری شریف کے درس میں یہ حدیث آئی تو

شاگردوں نے یہ اشکال پیش کیا کہ آنحضرت ﷺ تو حضرت یونس علیہ السلام بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام سے یقیناً افضل تھے۔ پھر آپ نے اس کی نفی کیوں فرمائی۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہی تو افضل ہونے کی دلیل ہے۔ جو افضل ہوتے ہیں وہ یہی کہا کرتے ہیں کہ میں افضل نہیں، شاگردوں نے پھر اشکال کیا۔ حضرت مولانا نے پھر سمجھایا۔ لیکن طلبہ نے عرض کیا کہ حضرت ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا، پھر مولانا نے دوسری قوت سے کام لینا چاہا۔ فرمایا اچھا میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ اپنے سے افضل یا کم تر۔ سب نے عرض کیا کہ حضرت "چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک" ہماری حقیقت ہی کیا ہے، حضرت کے سامنے، پھر فرمایا کہ اچھا اب یہ بتاؤ کہ تم مجھے سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا۔ عرض کیا بالکل سچا۔ پھر فرمایا کہ اگر میں کسی بات کی قسم کھا کر کہوں۔ پھر تم مجھے سچا سمجھو گے یا نہیں۔ کہا کہ تب تو اور بھی زیادہ آپ کی بات کا یقین کریں گے۔ جب ان سب باتوں کا اقرار کرا چکے تو فرمایا کہ تو اب میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم میں سے ہر ہر شخص کو اپنے سے ہزار درجہ افضل سمجھتا ہوں۔ بس یہ فرمانا تھا کہ ساری مجلس تڑپ گئی۔ سب بے تاب ہو گئے۔ لوٹنے لگے۔ اور مولانا چپکے سے اٹھ کر حجرے میں جا بیٹھے۔ درس وغیرہ ختم ہو گیا۔ اگلے دن جب پھر سبق شروع ہوا تو فرمایا کہ کہو بھئی اب بھی اس حدیث میں کچھ شبہ ہے سب نے بالاتفاق عرض کیا کہ حضرت اب تو کوئی شبہ نہیں رہا" اس حکایت کو بیان کرنے کے بعد پھر حکیم الامت (مولانا تھانوی) نے فرمایا کہ حضرت گنگوہی نے یہ تعریف کے مقصد سے نہیں کیا، ہمارے حضرات اس کا قصد نہیں کرتے تھے مگر ہر شے میں ایک خاصیت ہے صدق میں بھی خاصیت ہے کہ از دل خیز دو بر دل ریزد۔ (یہ واقعہ خدام الدین لاہور سے پیش کیا گیا)

دارالعلوم دیو بند سے وابستگی

حضرت گنگوہی کی خدمت میں اکتساب علم کا سلسلہ جاری تھا جس میں اس مدت کے دوران جب آپ حضرت مولانا حکیم ضیاء الدین کے ہمراہ حج پر تشریف لے گئے یعنی ۱۲۸۰ھ سے لے کر ۱۲۸۴ھ تک فخر العلماء حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے علوم دین کا درس حاصل کرتے رہے۔ لیکن اگلے سال یعنی محرم الحرام ۱۲۸۳ھ میں جب مدرسہ دیو بند کا باقاعدہ آغاز ہوا تو آپ اپنے استاد اور اپنی والدہ محترمہ سے اجازت لے کر دیو بند پہنچے۔ آپ کی والدہ ماجدہ جو

آپ کے والد کے انتقال کے بعد اپنے تمام بچوں کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت کی نگراں تھیں۔ اپنے بڑے صاحبزادے کو اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتی تھیں لیکن جب انہوں نے فخر العلماء کے طلب علم کے جذبہ کو دیکھا اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی رضامندی پائی تو پھر حضرت والا کو دیوبند روانہ کرنے اور حصول علم کے جذبۂ اعلیٰ کی تسکین کی خاطر انہیں اپنے سے الگ کرنے پر رضامند ہوگئیں۔ یہ بھی الٰہی بیگم کی زندگی میں بڑی کڑی آزمائش کا مرحلہ تھا۔ لیکن ان کے بے مثال جذبۂ ایثار نے ان کی مامتا پر غلبہ حاصل کر کے نور نظر کو اپنے سے جدا کرنے پر راضی کرلیا، اگرچہ گھر کے مالی حالات اور بے ولی اور بے مربی خاندان کی ذمہ داریاں اس بات کی متقاضی تھیں کہ بڑا بیٹا جو مرحوم باپ کا قائم مقام ہوتا ہے اسے اپنے پاس ہی رکھا جائے۔ مگر آفریں ہے شاہ حسن عسکری شہید کی بیٹی اور شاہ عبد الرحمٰن کی بیوہ پر کہ اس نے اپنے بڑے بیٹے کے جذبۂ علم اور جوش جہاد کی قدر کی اور اسے اپنے سے جدا ہو کر دار العلوم دیوبند کے سابقون الاولون کی صف میں شامل ہونے کی اجازت دیکر انہیں (حضرت فخر العلماء کو) دیوبند کے پنجتن میں شامل کرنے کی عزت بخشی۔

دار العلوم دیو بند میں گنگوہ کا پہلا متعلّم

خاندانی روایات کے مطابق حضرت فخر العلماء مدرسہ دیوبند کے قیام کے فوراً بعد ہی حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء اور اپنی والدہ ماجدہ کی اجازت سے مدرسۂ دیوبند میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کیلئے تشریف لے گئے۔ وہ اس مقدس و متبرک تعلیمی ادارے میں گنگوہ کے پہلے طالب علم تھے، دیوبند کے ابتدائی سالوں کی رپورٹ اگر مطالعہ میں آتیں تو پتہ چلتا کہ حضرت فخر العلماء نے کب داخلہ لیا مگر یہاں بھی حضرت مولانا اصغر حسین دیوبندی نے اپنی مشہور تصنیف حیات شیخ الہند کے صفحہ ۱۶۷ پر حضرت فخر العلماء کو حضرت شیخ الہند کا بے تکلف ہم سبق بتایا، جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت فخر العلماء اول سال ہی سے مدرسۂ دیوبند میں حضرت شیخ الہند کے ہم سبق تھے۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے قاسم العلوم کے ترجمہ انوار النجوم ۹۶ پر لکھا ہے کہ "دار العلوم کا افتتاح ۱۲۸۳ھ میں ہوا اور مولانا فخر الحسن نے ۱۲۸۹ھ میں دار العلوم سے علوم معقولات و منقولات کی تکمیل کی، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آغاز ہی میں دار العلوم میں آکر داخل ہوئے۔ آپ شیخ الہند حضرت مولانا

محمود الحسن اسیر مالٹا کے ہم سبق تھے" ان کا نام حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے شاگردوں میں بھی شامل ہے (ملاحظہ ہو تاریخ دیوبند از جناب محبوب علی رضوی۔ صفحہ ۱۴۴ وحیات یعقوب ومملوک صفحہ ۶۴) دار العلوم کے تیسرے سال کی رپورٹ میں جو فتاویٰ دار العلوم کی جلد اول میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے بطور تمہید شائع فرمائی ہے یہ درج ہے کہ اس سال حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے کتب حدیث ترمذی وغیرہ کا امتحان دیا۔ اسی طرح مفتی صاحب قبلہ نے ۱۸۸۹ء کی رپورٹ کے حوالہ سے سندات فضلاء کے عنوان کے تحت فرمایا کہ اس سال حضرت فخر العلماء نے چھ دیگر طلبہ کے ساتھ دار العلوم سے سند فراغ حاصل کی۔ مگر اس میں حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کا نام نہیں ہے اور یہ تو دار العلوم دیوبند کی ۱۲۹۰ء کی رپورٹ سے اور اس سال کے کانووکیشن اور حضرت قاسم العلوم کے کانووکیشن ایڈریس سے ظاہر ہے کہ اس کانووکیشن میں جن پانچ قابل فخر علماء نے دستار فضیلت حاصل کی اور جنہیں دیوبند پنجتن کے خطاب سے نوازا گیا، ان میں حضرت فخر العلماء کا نام نامی شامل تھا۔ مگر ان پانچ خوش قسمت، خوش بخت اور صاحب استعداد بزرگوں میں صرف حضرت فخر العلماء اور مولانا فتح محمد تھانوی کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ انہوں نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اکتساب علم کیا تھا، اور جو بیک وقت حضرت قاسم العلوم، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے شاگرد رشید تھے۔

حضرت قاسم العلوم کی شاگردی

یہ دیوبند ہی کا قیام تھا جس میں حضرت فخر العلماء حضرت قاسم العلوم کے شاگرد بنے، ان کے زیر اثر آئے اور ان کی ذاتی توجہ محبت اور شفقت ہی نے حضرت مولانا کو فخر العلماء بنایا۔ حالانکہ جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے قاسم العلوم ترجمہ انوار النجوم کے صفحہ ۹۷ پر ارقام فرمایا ہے کہ مولانا فخر الحسن نے سفر و حضر میں دار العلوم دیوبند کے علاوہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث اور دیگر علوم کی کتابیں بھی پڑھیں۔ میرٹھ، نانوتہ اور دیوبند میں مولانا (حضرت قاسم العلوم) کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔

حضرت قاسم العلوم جنگ شاملی کے ہیرو ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت حاجی امداد اللہ

مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی تلوار اور قلم بھی تھے، اور جن سے قدرت کو جنگ آزادی کی ناکامی کا بدلہ لینے کیلئے ایک گروہ مجاہدین پیدا کرنے کا کام لینا تھا۔ حضرت فخر العلماء جب دیوبند آئے تو ہر طرح قاسم العلوم کے شاگرد بنے اور وہ تحریک دیوبند کے رکن رکین بننے کے اہل بھی تھے۔ حضرت فخر العلماء دیوبند تحریک کے رموز و نکات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ وہ اس معاملہ میں تحریک کے محرک اول اور سربراہ کے قدم بہ قدم بلکہ اسے کامیاب بنانے میں ان سے بھی بڑھ کر تھے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، اور حضرت قاسم العلوم کے شاگردوں میں سے صرف یہ خصوصیت انہیں ہی حاصل ہے کہ وہ ابتدائے تحریک ہی سے اس کو کامیاب بنانے کیلئے اپنے تمام ساتھیوں کے مقابلہ میں نہایت بہتر طور پر تیار تھے۔ اور ان کی تیاری ذہن و فکر میں پوری صلاحیتوں کے ساتھ تھی۔ ان کے استاد کو بھی ان کی ان خداداد صلاحیتوں کا پوری طرح اندازہ تھا۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے عشق

مگر یہ محبت یک طرفہ نہیں تھی۔ حضرت فخر العلماء کو بھی حضرت قاسم العلوم سے ایسی محبت تھی کہ انہوں نے بھی اپنی ساری زندگی استاذ پر تج دی۔ انہوں نے کہا کہ تم نگینہ چلے جاؤ تو یہ بے چوں وچرا نگینہ چلے گئے۔ انہیں حکم ہوا کہ مدرسہ عبد الرب چلے جاؤ تو یہ وہاں چلے گئے۔ انہیں ہدایت فرمائی کہ تم خورجہ جاؤ تو یہ خورجہ چلے گئے۔ ان سے کہا کہ تم ابن ماجہ کی تصحیح کیلئے دہلی جاؤ تو یہ دہلی چلے گئے۔ غرضیکہ ان کی زندگی اس طرح بسر ہونے لگی جس طرح پروانہ کی زندگی شمع کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ انہوں نے حضرت قاسم العلوم کی محبت میں اپنی خانگی زندگی تک تباہ کرلی اور حضرت قاسم العلوم کی وفات تک ان سے جدا نہیں ہوئے۔ وہ جو کام بھی کرتے تھے حضرت قاسم العلوم کی اجازت حاصل کرنے کے بعد، اور اگر یہ کہا جائے کہ انہیں فنافی الاستاد کا درجہ حاصل تھا تو یہ غلط نہیں ہوگا۔ حد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے لڑکے کا نام بھی حضرت قاسم العلوم کے مشورہ سے رکھا، قاسم العلوم کے مکتوب دہم میں اس واقعہ کا تذکرہ موجود ہے۔ اس خط میں حضرت قاسم العلوم اپنے چہیتے شاگرد حضرت فخر العلماء کو لکھتے ہیں کہ۔ (اصل خط فارسی میں ہے۔ یہاں اس کا وہ ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو قاسم العلوم مع ترجمہ انوار النجوم کے صفحہ ۱۰۲ پر ہے) "پہلی گذارش تو یہ ہے کہ لڑکے کی

پیدائش مبارک ہو۔ بہت بخشنے والا خدا عمر دراز کرے اور بخت نیک کو مددگار بنائے۔ اور علم وعمل سے بہرۂ وافر عطا فرمائے۔ آمین! اس کا نام محمد نورالحسن یا محمد حسن اچھا لگتا ہے۔ مگر ان کے خاندان میں اگر کوئی اس نام کا ہو تو اس صورت میں عورتوں کو غالباً یہ نام پسند نہیں آئیں گے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں عرض کریں (ولادت گنگوہ میں ہوئی تھی) جو کچھ وہ فرمائیں وہی نام رکھ دیں "حضرت قاسم العلوم نے نام تجویز کرنے کے ساتھ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے مشورہ کا حکم دیا تھا مگر شاگرد رشید کیلئے تو حضرت قاسم العلوم کی تجویز ہی کافی تھی لہٰذا فرزند اول کا نام نورالحسن ہی رکھا گیا۔

حضرت مولانا فخر العلماء کی زندگی کو اسی لئے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ حصہ جو قیام دارالعلوم سے شروع ہو کر حضرت قاسم العلوم کی دیوبند میں تدفین پر ختم ہوا۔ دوسرا زندگی کا وہ دَور جو حضرت قاسم العلوم کی رحلت سے شروع ہو کر کانپور میں بساطیوں کے قبرستان میں خود ان کی تدفین پر ختم ہوا، دور اول میں حضرت فخر العلماء حضرت قاسم العلوم کی تلوار اور قلم تھے، اور دور ثانی میں آپ اپنے استاذ گرامی کے ارشادات کے مبلغ، آپ کی تحریروں کے مرتب، آپ کی سوانح کے مولف، اور فیوض قاسمی کے پیکر نظر آتے ہیں، گویا طالب علمی کے دَور سے لے کر لحد کی آغوش میں جانے کے وقت تک حضرت فخر العلماء نے اپنے استاذ کی مرضی اور منشاء کے مطابق زندگی کا سفر طے کیا۔ اور ان ہی کی محبت کو متاع عزیز سمجھتے ہوئے اپنی زندگی کو مالک حقیقی کے سپرد کیا۔

شاگردوں کے انتخاب کی وجہ

حضرت قاسم العلوم بلاوجہ شاگردوں کے انتخاب میں محتاط نہیں تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ گنجینۂ علم تھے، اور آپ کی تقریروں کو سمجھنے کے لئے بھی اعلیٰ استعداد درکار تھی۔ ان کی احتیاط برمحل، مناسب تھی۔ جیسا کہ مولانا انوار الحسن شیرکوٹی نے فرمایا کہ وہ اپنے شاگردوں کی صلاحیتوں کو مختلف انداز اور مختلف سمتیں عنایت کرتے تھے، مگر ان کے شاگردوں میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت فخر العلماء ہمہ جہت صلاحیتوں کے مالک تھے، یعنی انہیں درس وتدریس اور تحریر وتقریر میں حضرت قاسم العلوم سے مناسبت خاص ہونے کے ساتھ ان کے اندر وہی جذبۂ جہاد کار فرما تھا جس کے سوتے حضرت قاسم العلوم کے

ذہن سے پھوٹتے تھے، پھر بھی ان دو شاگردوں کی صلاحیتوں میں فرق تھا، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بموجب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ درس و تدریس اور حضرت فخر العلماء تصنیف و تالیف کے میدانوں میں الگ الگ حضرت قاسم العلوم کے جانشین تھے۔ حضرت شیخ الہند آگے چل کر اور حضرت قاسم العلوم کی صحبت اختیار کرنے کے بعد جذبۂ جہاد میں حضرت قاسم العلوم ثانی ثابت ہوئے، مگر حضرت فخر العلماء جنگ آزادی کے جن حوادث سے گزر کر حضرت قاسم العلوم کی خدمت میں داخل ہوئے تھے۔ ان حوادث نے انہیں پہلے ہی جذبۂ جہاد سے سرشار کر رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت فخر العلماء کا اپنی ترتیب شدہ سوانح قاسمی میں تذکرہ کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا کہ "مولوی فخر الحسن درستگیٔ مزاج میں مولانا کے قدم بہ قدم ہیں۔" بلکہ کچھ بڑھ کر ہیں، تو اس کا ضرور کچھ نہ کچھ سبب ہوگا۔

مدرسہ اسلامی عربی نگینہ بجنور

مدرسہ اسلامی عربی نگینہ ضلع بجنور حضرت قاسم العلوم کی تحریک پر قائم کیا گیا۔ اور اس کے صدر مدرس کے عہدے پر حضرت قاسم العلوم کے حکم پر حضرت فخر العلماء کا تقرر کیا گیا تھا۔ جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے قاسم العلوم مع اردو ترجمہ انوار النجوم کے صفحہ ۹۷ پر ارقام فرمایا ہے کہ حضرت فخر العلماء نے تعلیم سے فارغ ہو کر مدرسہ عربیہ قاسم العلوم جامع مسجد نگینہ میں ملازمت کی جیسا کہ مجموعہ قاسم العلوم کے خطوط میں حضرت قاسم العلوم کے ارشادات سے واضح ہوتا ہے۔ حضرت فخر العلماء کی نگینہ میں آمد و قیام ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۴ء کے اواخر یا ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۵ء کے اوائل میں ہوا۔

ضلع بجنور میں یہی مدرسہ مذہبی علوم کے لئے واحد درسگاہ کی حیثیت سے شہرت پا گیا۔ یہاں تک کہ اطراف و جوانب کے علاوہ بلخ، بخارا و غیرہ ولایات بیرون ہند کے طلبہ بھی یہاں جوق در جوق آتے رہے۔ پس مدرسہ نے اپنا مرکز دار العلوم دیوبند کو ہی قرار دیا۔

لیکن ابتدائے زمانہ میں ایک وقت مدرسہ قاسمیہ عربی نگینہ پر ایسا آیا کہ اس کے اولین صدر مدرس کو اسے خیر باد کہنا پڑا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے استاد مکرم کو جو خط لکھا اس کا جواب حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوب یازدہم میں موجود ہے۔

مولانا انوار الحسن شیر کوٹی کی تصنیف "قاسم العلوم مع اردو ترجمہ انوار النجوم" سے خط کا لفظی ترجمہ پیش خدمت ہے، یہ خط حضرت فخر العلماء کے نام ہے۔ خط کا آغاز اس طرح ہوتا ہے "رہین منت ہائے بے پایان احباب محمد قاسم عفی اللہ عنہ بخدمت سراپا مکرمۃ جامع کمالات عزیزم مولوی فخر الحسن صاحب۔ اس کے بعد خط کا متعلقہ حصہ حاضر خدمت ہے۔ یہ ٹکڑا مولانا انوار الحسن کی متذکرہ بالا تصنیف کے صفحہ ۱۰۲ اور ۱۰۳، ۱۰۴ پر ہے "باقی نگینہ (ضلع بجنور یوپی) کی بنیاد کے اندر خرابی آنے سے مجھے دو وجہ سے رنج ہوا۔ ایک تو تمہاری طرف سے اور دوسرے نگینہ والوں کی طرف سے کہ کیا حوصلہ کے پست ہیں۔ ہاں ہر نعمت کہ پہلے کی ہوئی کوشش کے بغیر مل جاتی ہے نا قدر شناس لوگ اس کو اس قدر ضائع کر دیتے ہیں۔ یا رب یہ کیا زمانہ ہے شریفوں سے سمجھ کا مادہ ہی لے لیا۔ باوجودیکہ انسان کو فرشتوں پر برتری حاصل ہے جیسا کہ "رکوع" (اور جب کہ آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں، پارہ۔ا۔ سورہ بقرہ رکوع۔ ۴) اس دعوی پر گواہ ہے، یہ انسان اس قدر بے قدر ہو جائے، جب ہم غور کی نظر سے دیکھتے ہیں تو یہ سب قدرت کی نیرنگیاں معلوم ہوتی ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کریم ﷺ نے سچ فرمایا ہے کہ علم اٹھالیا جائے گا۔ (یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہے) پوری حدیث یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا فرماتے تھے کہ قیامت کی شرطوں میں سے یہ ہے کہ علم اٹھالیا جائے گا اور جہالت بڑھ جائے گی۔ اور بہت ہو گا زنا اور شراب نوشی بہت ہو جائے گی۔ مرد کم ہوں گے اور عورتیں زیادہ ہوں گی تا آنکہ پچاس عورتوں پر ایک خبر گیری کرنے والا ہو گا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ علم تحلیل ہو گا اور جہل پیدا ہو گا (بخاری و مسلم سے علامات قیامت میں مشکوۃ شریف میں اس حدیث کو نقل کیا گیا ہے) خیر خدا پر نظر رکھیں اور بالکل ہراساں نہ ہوں، تنگی کے ساتھ خدا کی مرضی ہے (یہ مشہور تیسویں پارے کی سورت الم نشرح میں ہے) اگر ایک دروازہ حکمت سے بند فرماتے ہیں، تو کیا خوب ہے کہ دوسرے دروازے کھول دیں گے، بقول شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ (حکمت خدا اگر بہ بند د درے، بہ رحمت کشاید در دیگرے) لیکن ظاہر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خوان نعمت کو نگینہ سے اٹھائیں گے تو پھر نہیں بچھائیں گے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شاید یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ

مدت دراز تک نگینہ کا یہ مدرسہ قائم رہا اور نگینہ والے اسے کسی نہ کسی طرح چلاتے رہے۔ (سوانح قاسمی، جلد دوم، ص: ۳۰۳) یہ مدرسہ بحمد للہ اب تک قائم ودائم ہے اور اسے ضلع بجنور یوپی کے دینی مدرسوں میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

ابن ماجہ کی تصحیح وتشریح

مدرسہ اسلامیہ عربیہ قاسمیہ نگینہ تو فضل خداوندی سے چلتا رہا ہے اور بحمد اللہ اب تک زندہ اور سلامت ہے، لیکن حضرت فخر العلماء کا نگینہ میں رزق پورا ہو چکا تھا۔ لہٰذا آپ نے نگینہ سے رخت سفر باندھا اور دہلی تشریف لے گئے۔ دہلی جانے کا سبب بھی حضرت قاسم العلوم کی ذات تھی۔ آپ نے اپنے اسی خط میں آگے چل کر حضرت فخر العلماء کو دہلی جانے کا مشورہ دیا تھا۔ اس خط کے متعلقہ حصہ کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے "میرے عزیز جناب گرامی اگر اپنی ملازمت کی جگہ (نگینہ) سے اٹھیں تو اس ناچیز کی سمجھ میں یہ بھلا معلوم ہوتا ہے کہ اول دہلی پہنچیں اور منشی ممتاز علی صاحب اور منشی عبد الرزاق صاحب سے ملاقات کرلیں شاید مطبع میں کوئی صورت پیدا ہو جائے" حضرت قاسم العلوم کے ایک اور خط میں جو فیوض قاسمیہ کے خطوط میں گیارہویں نمبر پر ہے حضرت فخر العلماء کے دہلی جانے کا تذکرہ ہے، یہ خط فیوض قاسمیہ کے صفحہ ۳۸، ۳۹، ۴۰ اور ۴۱ پر ہے۔ اس خط میں حضرت قاسم العلوم اپنے سفر دہلی کی افواہوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے اس بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کی "بات صرف اتنی ہے کہ مولوی فخر الحسن دہلی کے ارادہ سے روانہ ہوئے ہیں اگر انہیں مدرسہ حافظ عزیز الدین میں کوئی مناسب ملازمت مل گئی تو وہاں قیام کریں گے ورنہ کچھ روز تصحیح ابن ماجہ کے سلسلہ میں جو مطبع میں شروع ہوگئی ہے قیام کریں گے" جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے قاسم العلوم مع اردو ترجمہ انوار النجوم کے صفحہ ۹۷ پر یہ تحریر فرمایا ہے کہ نگینہ کے مدرسہ کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مطبع مجتبائی دہلی میں جو اس وقت منشی ممتاز علی میرٹھی کی ملکیت میں تھا (آپ نے) تصحیح کتب پر ملازمت کی، بہرحال ان متذکرہ بالا باتوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت فخر العلماء ۱۲۹۲ھ سے لے کر ۱۲۹۴ھ تک دہلی میں مقیم رہے۔ اولاً آپ نے ابن ماجہ کی تصحیح کا کام کیا۔ جو یقیناً ان کا ایک بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔ اور اپنے مقام پر اس کا تذکرہ ہے لیکن بعد ازاں انہیں مدرسہ عبد الرب میں ملازمت مل گئی۔

مدرسہ عبدالرب

جناب انوارالحسن شیر کوٹی نے "قاسم العلوم مع اردو ترجمہ انوارالنجوم" میں اسی مکتوب یازدہم کے سلسلہ میں جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے صفحہ ۱۰۴ کے فٹ نوٹ میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ اس عبارت کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نگینہ کی ملازمت کے بعد مولانا فخرالحسن صاحب حسب مشورہ مولانا محمد قاسم صاحب دہلی پہنچے ہوں گے۔ اور منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں کام کیا ہوگا، بعد ازاں دہلی میں قیام کے باعث مدرسہ عبدالرب میں ملازمت ملی، انہی مولانا انوارالحسن نے اپنی متذکرہ بالا تصنیف کے صفحہ ۹۷ پر مولانا فخرالحسن گنگوہی کے تعارف کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ مطبع مجتبائی میں تصحیح کے کام کے بعد آپ نے مدرسہ عبدالرب میں ملازمت کی۔ مولانا شیر کوٹی فرماتے ہیں کہ بعد ازاں مدرسہ دہلی میں بھی ملازم رہے جیسا کہ قاسم العلوم کے مکتوب نہم میں آپ کے نام کے ساتھ مدرس مدرسہ دہلی لکھا ہوا ہے۔ (یہ مکتوب قاسم العلوم کے چوتھے نمبر میں جس پر ۱۵ جمادی الثانی ۱۲۹۴ھ کی تاریخ پڑی ہے شائع ہوا ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ نگینہ سے واپس آنے کے بعد اور ابن ماجہ کی تصحیح سے فارغ ہونے کے بعد آپ اس وقت تک مدرسہ عبدالرب میں مدرس ہو گئے تھے۔ اور جب حضرت قاسم العلوم ربیع الاول ۱۲۹۴ھ میں دہلی تشریف لائے تو آپ مدرسہ عبدالرب میں نہ صرف ملازم تھے بلکہ وہیں احاطۂ مدرسہ میں مقیم تھے۔ جناب انوارالحسن شیر کوٹی نے اپنی متذکرہ بالا تصنیف میں قاسم العلوم کے اشتہار کے حوالہ سے جو اس کی اشاعت سے قبل منشی ممتاز علی نے چھاپ کر شائع کیا تھا یہ تحریر فرمایا ہے کہ حضرت مولانا نانوتوی نے خود دہلی تشریف لا کر ان مکاتیب کی اشاعت سے قبل خود کتابت کے بعد تصحیح کی تھی۔ جناب انوارالحسن شیر کوٹی نے لکھا ہے کہ مذکورہ اشتہار سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا ربیع الاول ۱۲۹۴ھ سے کچھ پہلے دہلی میں آکر مقیم ہونا خود منشی صاحب کے مکان پر مولانا کا قیام پذیر ہونا (جو بازار چاوڑی میں رہتے تھے) قاسم العلوم کے مکتوبات مولانا سے حاصل کرنا مولانا کا مکتوبات اور کتابت کردہ کاپیوں پر نظر ثانی اور ان کی تصحیح کرنا ثابت ہے۔ یہ مدرسہ عبدالرب دہلی ہی میں واقع تھا۔ امیر الروایات میں امیر شاہ خاں صاحب سے روایت ہے کہ "مدرسہ عبدالرب پہلے امام گلی کی طرف تھا اور اس میں مولوی

احمد حسن صاحب امروہی اور مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی مدرس تھے۔ مولانا محمد قاسم صاحب اس زمانہ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں کام کرتے تھے مگر مولوی احمد حسن امروہی اور مولوی فخر الحسن صاحب کی وجہ سے مدرسہ میں سویا کرتے تھے (امیر الروایات، صفحہ ۲۵) اتنا لکھنے کے بعد جناب شیر کوٹی نے آگے بیان فرمایا کہ "اس روایت سے صاف معلوم ہوگیا کہ مولانا فخر الحسن صاحب مدرسہ عبد الرب دہلی میں ملازم تھے کہ مولانا محمد قاسم صاحب کے قیام کا زمانہ جو ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں قاسم العلوم کی تصحیح کا وقت تھا جیسا کہ قاسم العلوم کے ٹائیٹل سے واضح ہے مدرسہ عبد الرب کا اس زمانہ میں نام مدرسہ دہلی تھا۔ مولانا نسیم احمد فریدی نے حضرت مولانا احمد حسن کے حالات پر جو مقالہ رسالہ دار العلوم میں شائع فرمایا اس کی پہلی قسط میں جو دسمبر ۱۹۵۳ء کے شمارہ میں شائع ہوئی، آپ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ مدرسہ عبد الرب کا پہلا نام مدرسہ دہلی تھا اور حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہوی نے "مولانا خلیل الرحمٰن امروہی کو جو قلم خاص سے لکھی ہوئی سند عطا فرمائی (جو کہ احقر کے پاس محفوظ ہے) اس میں اپنے دستخط کے ساتھ جو عبارت تحریر فرمائی ہے اس میں فی المدرسۃ العربیۃ فی الدہلی لکھا ہوا ہے، تحفۂ سید میں جو مولوی سعید صاحب کی تصنیف ہے تحریر ہے کہ "مدرسہ عبد الرب" پرانا مدرسہ اور مسجد ہے اور مولوی صاحب موصوف کی یادگار ہے۔ کشمیری دروازہ کے علاقہ میں واقع ہے۔ دینی تعلیم بخوبی ہوتی ہے، ہر سال ماہ شعبان میں فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کی جاتی ہے اور یہاں کے سند یافتہ اطراف ہند میں پھیل کر دینی خدمات انجام دیتے ہیں۔ بڑے بڑے نامور علماء اس مدرسہ میں تعلیم دے چکے ہیں۔ مولوی عبد الرب صاحب شہر دہلی کے خاندانی مولوی تھے۔ واعظ شریں بیان بھی تھے۔ ان کے وعظ میں خاصا اثر تھا مسجد کی عمارت پہلے سے دو چند کردی گئی ہے۔ جناب امیر الدین نے بھی تفسیر ابر کرم میں مولوی عبد الرب کی بہت تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ یادش بخیر بدر العلماء و مولانا و مخدومنا مولوی عبد الرب صاحب فخر ہند علیہ الرحمتہ یہ بزرگ نیک نام جامع کمالات صوری و معنوی و نکتہ سنج حدیث بندی تھے۔ آپ کے اوصاف میں نہ زبان کو طاقت تحریر ہے اور نہ قلم کو یارائے تحریر، دلائل عقلیہ اور فنون حکمیہ کو آپ کی ذات گرامی پر ناز تھا اور علوم عربیہ کو آپ کی زبان دانی سے افتخار تھا۔ خلق و علم اور حلم کا کچھ حساب نہ تھا۔ بحر البیانی میں روئے زمین پر

ان کا جواب نہ تھا۔ حضرت مرحوم راقم کے وعظ میں استاد شفیق تھے۔ وعظ جو کچھ فقیر نے حاصل کیا وہ حضرت ہی کا فیض تھا۔ الٰہی اس مرحوم علیہ الرحمتہ کو جنت میں خوش رکھے۔ اس سے پہلے ان کی سحر البیانی کا ذکر جامع مسجد دیوبند کی تعمیر اور دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔ مرحوم حضرت قاسم العلوم کے دوست بھی تھے۔ جس کا ثبوت فیوض قاسمیہ کے خطوط سے ہوتا ہے۔ بہر حال ان کا مدرسہ بہت مشہور تھا یادگار دہلی کے مصنف ظہیر الدین سید احمد ولی الدین نے بھی اس کا ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "تار گھر سے دو سڑکیں جاتی ہیں ایک جانب مغرب جو مدرسہ مولوی عبد الرب مرحوم کو جاتی ہے اور پھر گندے نالے ہوتی ہوئی ریل کی سڑک کے برابر سیدھی چھوٹے دروازے سے نکل جاتی ہے۔ یہ مدرسہ نہایت خوبصورت بنا ہوا ہے غربی جانب میں مسجد کا دوہرا دالان ہے، اس کے شمال میں دو حجرے ایک میں مدرسہ کا دفتر رہتا ہے دوسرے میں استاد اور طالب علم رہتے ہیں۔ جنوب میں نہایت پاکیزہ کمرہ، موزوں صحن، اِدھر اُدھر حجرے بیچ میں حوض دروازہ کے متصل کنواں، اس کو مولوی عبد الرب صاحب نے اس غرض سے بنایا تھا کہ اس میں مدرسہ جاری رہے اور علوم دینیہ کی تعلیم ہوا کرے، تاریخ دارالعلوم دیوبند میں بھی حضرت مولانا عبد العلی کے حوالہ سے مدرسہ عبد الرب کا ذکر ہے اور حضرت شیخ الہند کی سوانح میں جو میاں جی اصغر حسین دیوبندی نے تحریر فرمائی اس حوالے سے مدرسہ اور مسجد کا ذکر ہے۔ بہر حال یہ وہ مدرسہ ہے جس نے حضرت مولانا عبد العلی میرٹھی کو محدث دہلوی کے خطاب سے نواز اور اس میں قریب قریب دو سال حضرت فخر العلماء نے درس دیا۔

حج بیت اللہ

حضرت فخر العلماء نے جہاں اپنے استاد کی مہربانی سے مدرسہ قاسمیہ نگینہ کی صدارت فرمائی۔ اور اس کے بعد مطبع مجتبائی میں ابن ماجہ کی تصحیح فرمائی اور اس کے بعد مدرسہ عبد الرب دہلی میں درس و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ اسی طرح اپنے استاد کی مہربانی سے حج بیت اللہ کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ خاندانی روایات میں اس حج کا بہت ذکر ہے اور حضرت فخر العلماء کے دوسرے صاحبزادے مولانا حافظ فیض الحسن گنگوہی نے ابو داؤد کا جو حاشیہ مطبع نامی کانپور (جس کے مالک جناب منشی رحمت اللہ تھے) میں چھپوایا، اس میں بھی انہوں نے

حضرت فخر العلماء کے نام کے ساتھ الحاج کا خطاب تحریر فرمایا ہے، اس حج میں حضرت قاسم العلوم کے ہمراہ جو لوگ تھے ان کا اور اس سفر حج کا تذکرہ سوانح قاسمی، حیات یعقوب و مملوک اور تذکرۃ الرشید میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے، جناب مولانا محمد یعقوب صاحب نے لکھا ہے کہ حج شوال ۱۲۹۴ھ میں شروع ہوا اور ربیع الاول ۱۲۹۵ھ میں تمام حضرات حج سے واپس اپنے اپنے وطن واپس آگئے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے الفاظ یہ ہیں "پھر اسی سال ارادہ جناب مولانا مولوی رشید احمد صاحب کا حج کو جانے کو ہوا۔ احقر بھی تیار ہوا اور چلتے میں مولانا کو بھی ساتھ لے لیا۔ اور مولوی صاحب کے ساتھ اور کچھ کتنے ہی معتقد اور خادم آپ کے روانہ ہوئے۔ شوال ۱۲۹۴ھ میں روانہ ہوئے اور ربیع الاول ۱۲۹۵ھ کے اول میں اپنے وطن واپس آئے۔ اس سفر میں تمام قافلہ علماء کا تھا۔ اٹھارہ بیس مولوی فاضل ساتھ تھے۔ اور عجیب لطف کا مجمع تھا۔" جناب مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی جلد سوم کے صفحہ ۱۵ میں تحریر فرمایا ہے کہ "جس کا مطلب عیسوی سن کے حساب سے یہ ہوا کہ ۱۸۷۷ء اوائل ماہ اکتوبر یا اواخر ستمبر کی کسی تاریخ میں روانہ ہوئے۔ اور ۱۸۷۸ء ماہ فروری کی کسی تاریخ میں ہندوستان واپس لوٹے۔ تذکرۃ الرشید کے مصنف مولانا عاشق الٰہی کا کہنا تھا کہ "سارا قافلہ کچھ اوپر سو کا تھا۔ (صفحہ ۲۲۹) اور مولانا مناظر احسن گیلانی کا کہنا ہے کہ "ان بزرگوں میں سے بڑی تعداد تو سہارنپور ہی کے اسٹیشن پر پہنچ کر رفاقت کا حق ادا کرنے کے لئے حاضر ہو گئی تھی۔ اور کچھ لوگ ایسے تھے جو پہلے ہی سے راہی بمبئی ہو چلے تھے، اور جو لوگ نہ آگے روانہ ہو سکے اور نہ سہارنپور پہنچنے کا موقع ان کے لئے باقی رہا۔ ان ہی کا بیان ہے کہ ان لوگوں کے لئے جس ریلوے اسٹیشن سے ساتھ ہونا آسان ہوا سوار ہوئے اور آگے پیچھے بھی روانگی بہ نیت معیت و ہمرکابی کا سلسلہ بندھا رہا" جناب مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ سیدنا امام الکبیر ریل پر جس وقت سوار ہوئے اس وقت آپ کے پاس کچھ نہیں تھا لیکن جونہی کہ سہارنپور سے گاڑی آگے بڑھی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں کہ کچھ نہیں معلوم کہ کس نے یہ خبر پھیلا دی کہ فلاں گاڑی سے مولانا نانوتوی سفر حج کے لئے جا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ جس قابل ذکر اسٹیشن پر بھی گاڑی ٹھہرتی تھی خلق اللہ کا ایک ہجوم پر نظر آتا تھا۔ لوگ مولانا کو ڈھونڈتے ہوئے اس ڈبہ تک پہنچتے تھے جس میں آپ

جلوہ فرما ہوتے تھے۔ ملاقات و مصافحہ کے بعد ملنے والے ہدایا اور تحائف کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی استطاعت اور ہمت کے مطابق حضرت والا کی خدمت میں رقمیں بھی پیش کرتے چلے جارہے ہیں۔ کہتے تھے کہ پھلوں مٹھائیوں کا ڈھیر تھا جو جمع ہو گیا تھا۔ غازی آباد پہنچنے پر گاڑی بدلنی پڑی وہاں سے الہ آباد جانے والی ٹرین پر لوگ سوار ہوئے۔ راستے میں پھر وہ تماشہ پیش نظر تھا۔

حضرت فخر العلماء غالباً غازی آبادی سے ہمراہ ہوئے اس کے بعد یہ قافلہ بمبئی میں ۲۲ روز قیام کرنے کے بعد بمبئی سے جدہ روانہ ہوا اور تیرہ دن بعد جدہ پہنچ گیا۔ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی لکھتے ہیں کہ گھر سے جو کچھ لے کر نہیں نکلا تھا۔ کیا عجب تماشہ ہے کہ بمبئی پہنچتے تک اس کے پاس اتنا کچھ ہو گیا کہ خود ہی نہیں بلکہ اپنے ساتھ کتنوں کو حج وزیارت کی سعادت سے شرف اندوز ہونے کا موقع اس کی وجہ سے مل گیا۔ مولانا منصور علی خان حیدر آبادی نے جو اناوہ سے حضرت نانوتوی کے ہمراہ اس قافلہ میں شامل ہو گئے تھے لکھا ہے کہ جدہ میں پہنچ کر چند روز قیام کرنا پڑا۔ سواری نہیں ملی (مذہب منصور) اس دشواری کے باعث قافلہ دو حصوں میں بٹ گیا مگر حضرت قاسم العلوم اور ان کے ہمراہی مولانا منصور علی خان کے بیان کے مطابق قریب صبح صادق کے وہاں (مکہ میں) داخل ہوئے "مکہ شریف جب قریب آیا غسل فرمایا، جناب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب بطور استقبال کے تشریف لائے (مذہب منصور صفحہ ۱۷۹) اور یہ سارا قافلہ، بقول عاشق الٰہی، اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ) کی اس رباط میں مقیم رہا، جو بقول حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ایک مخلص نے خرید کر حارۃ الباب میں حضرت ایشیاں (یعنی حاجی صاحب) کے نذر کی تھی۔ اور اسی رباط کے دروازے کے اوپر مولانا صاحب (مولانا نانوتوی) اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے قیام کیا (صفحہ ۷۹ مذہب منصور) یہی مولانا منصور علی خان حیدر آبادی آگے چل کر رقمطراز ہیں کہ دروازہ کے اوپر کے بالا خانہ پر ٹھہرا دینے کے بعد حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا یہ دستور تھا کہ اپنے دونوں عزیز مہمانوں سے ملنے کیلئے کبھی کبھی خود اوپر تشریف لے جایا کرتے اور جوں ہی حاجی صاحب پر دونوں کی نظر پڑتی یہ کھڑے ہو کر تعظیم دیا کرتے تھے اور نہایت مؤدب دوزانو ہو کر ان کے روبرو بیٹھ جاتے۔

حضرت فخر العلماء خورجہ میں

حضرت قاسم العلوم کے ساتھ حج سے واپس آنے کے بعد حضرت فخر العلماء پر دہلی میں رزق کے دروازے بند ہو چکے تھے لہٰذا حضرت نانوتوی کے حکم پر خورجہ ضلع بلند شہر کا سفر اختیار کیا۔ اور خورجہ کے مدرسہ میں جو کہ حضرت قاسم العلوم کا قائم کردہ تھا اور جس میں مولانا احمد حسن امروہوی نے بھی درس دیا۔ پڑھانا شروع کر دیا مگر یہاں ملازمت کی نوعیت پرائیوٹ تھی۔ اور یہ ۱۲۹۵ھ تا ۱۲۹۷ھ تک کا دور تھا۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی کے صفحہ ۴۲۸ میں ارقام فرمایا کہ آپ ۱۲۹۵ھ میں نواب عظیم اللہ خاں رئیس خورجہ کے پاس تیس روپیہ ماہوار پر ملازم تھے۔

حضرت قاسم العلوم کی علالت و رحلت

حج سے واپسی کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی صحت برابر خراب رہی یہاں تک کہ آپ نے ۴ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو دیوبند میں انتقال فرمایا۔ آپ کے مرید حکیم مشتاق احمد نے جو ایک قطعہ زمین خاص قبرستان کے لئے اسی وقت وقف کیا تھا اس میں انہیں دفن کر دیا گیا۔ حضرت فخر العلماء جو اپنے استاد کی علالت کے دوران برابر ان کی تیمار داری کے لئے دیوبند اور نانوتہ جاتے رہتے تھے، انتقال کے وقت دیوبند ہی میں موجود تھے۔ حضرت امیر شاہ خاں صاحب نے حکایات اولیاء کی حکایت نمبر ۳۴۶ میں جو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے منسوب ہے یہ فرمایا کہ یہ وہ زمانہ تھا جس زمانہ میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بہ مرض الموت علیل تھے۔ مولوی فخر الحسن نے اس واقعہ کو حضرت مولانا کی خدمت میں بیان کیا تو آپ گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور گھبرا کر فرمایا کہ آخر مولوی محمد یعقوب نے ایسا کیا۔ توبہ توبہ بھائی یہ کام انہیں کا تھا۔ کیونکہ وہ مجذوب ہیں۔ اگر ہم ایسی گستاخی کرتے تو ہماری گردن نپ جاتی۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے اس حکایت پر جو حاشیہ لکھا ہے وہ یہ ہے "قولہ کیونکہ وہ مجذوب ہیں بعض مراتب مجذوبیت میں ایسے اقوال مجذوب کی بڑ سمجھ کر عفو فرما دیئے جاتے ہیں اور بعض مجاذیب ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر جذب کا اثر کسی بھی وقت ہو جاتا ہے،

احقر نے خود مولانا سے سنا ہے کہ ایک بار خط لکھ کر میں نے دستخط کرنا چاہا تو اپنا نام بھول گیا بجز جذب اور اس کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔

استاد کے انتقال پر صدمہ

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی رحلت حضرت فخر العلماء کی زندگی میں ایک نئے موڑ کا باعث تھی۔ اب تک یعنی زمانۂ طالب علمی سے لے کر حضرت قاسم العلوم کی وفات تک حضرت فخر العلماء کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا اور اس میں فرزندوں کے نام تک کا معاملہ شامل ہے جس میں حضرت قاسم العلوم کے ایماء، منشا اور ہدایت کو دخل نہ ہو۔ لیکن اب جبکہ مشفق استاد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو حضرت فخر العلماء کی زندگی میں ایک اندھیرا سا چھا گیا۔ جب تک وہ حیات تھے تو جہاں انہوں نے جانے کا حکم دیا اشارہ کیا تو اس کام میں لگ گئے۔ جب حکم دیا کہ شاہ جہانپور چلو تو حاضر تھے۔ جب روڑکی جانے کا حکم ہوا تو وہاں موجود، منگلور جانے کی ہدایت کی تو ہدایت سر آنکھوں پر۔ اب کون ہدایت دینے والا، حکم دینے والا اور مشوروں سے نوازنے والا باقی بچا تھا۔ مولانا کی زندگی کے آئندہ ادوار کا جب جائزہ لیا جائے گا تو پتہ چلے گا کہ اس حادثہ نے ان کی زمانۂ حیات کی کایا پلٹ دی اور انہوں نے حضرت قاسم العلوم کے انتقال کے بعد درس و تدریس کے پیشہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا۔ حضرت فخر العلماء کیلئے یہ رحلت ایسا سانحہ تھی جس کا اثر مرتے دم تک ان پر باقی رہا اور وہ ان کی رحلت کے بعد ۱۸ سال زندہ تو رہے لیکن یہ زندگی ایسی تھی جو حسرت و یاس کی مستقل آماجگاہ تھی۔ حضرت فخر العلماء نے اپنا غم غلط کرنے کے لئے اپنے استاد کی سوانح لکھی "ترتیب علوم قاسمی" کی اشاعت کا بیڑہ اٹھالیا۔ اور اس کام میں اپنے آپ کو اتنا منہمک و مصروف کر لیا کہ وہ ان کی زندگی کے تمام کارناموں پر حاوی ہو گئے۔

۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۸۰ء تک کے خاندانی حالات

قبل اس کے کہ ہم حضرت فخر العلماء کی زندگی کا دوسرا رخ پیش کریں ان کے خاندانی حالات اور انہوں نے جو مذہبی، دینی، اسلامی، اور علمی کارنامے اپنے استاد کے ہمراہ

ان کے ایماء پر اور نگرانی میں سر انجام دیئے ان کا تذکرہ ہو جائے اور حضرت فخر العلماء نے اپنے استاذ کی رحلت کے بعد "ماثر قاسمی" کی حیثیت سے افکار اور تقاریر قاسم العلوم کی اشاعت کیلئے جو عظیم الشان جدو جہد کی ہے اور ان کی سوانح کی ترتیب کیلئے جو جدو جہد کی ہے اس کا بیان ہو جائے، اس لئے کہ یہ تمام خدمات جلیلہ اور سرگرمیاں حضرت قاسم العلوم کی نگرانی ہی میں جاری وساری رہیں اور ان کی تربیت ہی کا ایک عکس تھیں۔ یہ کارنامے دراصل ایک ایسا دائرہ ہیں جن کا مرکز حضرت قاسم العلوم کی ذات گرامی تھی۔ سب سے پہلے حضرت فخر العلماء کے خاندانی واقعات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ سوانح فخر العلماء کا لازمی حصہ ہے اور ان کے بغیر حضرت والا کی خدمات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت فخر العلماء کی شادی

حضرت فخر العلماء کی شادی ان کے اپنے ہی خاندان کی ایک خاتون کے ساتھ ہوئی۔ حضرت والا اس شادی سے بہت خوش تھے اور اس شادی کے ابتدائی سال نہایت مسرت اور لطف کے ساتھ بسر ہوئے اور اس دوران میں آپ کے دو صاحبزادے محمد نور الحسن اور محمد فیض الحسن پیدا ہوئے جن کے نام حضرت قاسم العلوم کے مشورہ اور ایماء پر رکھے گئے۔ حضرت فخر العلماء کی اہلیہ اپنے نامدار شوہر کی اسی توجہ اور محبت کی خواہاں تھیں جو ان کی شادی کے ابتدائی ایام میں حاصل تھی۔ لیکن یہ مرد مسلمان ہندوستان میں احیائے اسلام اور بقائے دین کی روز افزوں جدو جہد میں جو اس کے محبوب اور شفیق استاذ کی زیر کمان ملک گیر پیمانے پر جاری تھی مصروفیت کے باعث انہیں پیش نہیں کر سکا۔ نتیجتاً ابتداء میں تلخی ہوئی اور آخر کار طلاق پر نوبت آئی۔ حضرت فخر العلماء نے یہ منزل طے تو کی مگر ذاتی طور پر انہوں نے اس کا بہت گہرا اثر قبول کیا اور گنگوہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور انکی والدہ آخر وقت تک اپنے بڑے بیٹے کی جدائی اور انہیں ایک بار دیکھ لینے کی آرزو اپنے دل میں لئے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

جدی مکان

جناب اسمٰعیل انصاری نے لکھا ہے کہ حضرت والا کا مکان جو بحمد اللہ ابھی تک باقی ہے

میرے مکان سے تقریباً پچاس گز کے فاصلہ پر محلّہ قاضی بہاؤالدین میں جو عرف عام میں جونتر ٹیلہ کہلاتا ہے واقع ہے یہ مکان سڑک سے تقریباً نو فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور غالباً اسی وجہ سے اس محلّہ کو چبوترہ یا چبوترے کی اعانت سے جونتری ٹیلہ کہتے ہیں۔

باپ کی طرح احترام

جناب اسمٰعیل انصاری فرماتے ہیں کہ مجھے تفصیل کے ساتھ معلوم نہیں کہ حضرت فخر العلماء کا شغل درس وتدریس تھا یا تجارت، لیکن شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طرف رجحان رہا۔ (تجارت کی طرف نہیں طبابت کی طرف رجحان تھا) میں معاش کے سلسلہ میں اکثر قصبہ (گنگوہ) سے باہر رہا کرتا تھا۔ حضرت والا میرے دادا قاضی ولی محمد کے ہم عصر تھے۔ جن کا انتقال ۱۹۰۱ء میں ہو گیا شاید حضرت مولانا ان سے بھی پہلے تشریف لے گئے یا انتقال فرما گئے، لہٰذا مجھے ان کی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔ میرے تایا صاحب قبلہ حاجی خلیل کا ان سے بہت تعلق تھا اور بقول میرے والد صاحب مرحوم ومغفور یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں ان کا (حضرت فخر العلماء کا) ادب باپ کے برابر کرتا تھا۔ حضرت گنگوہی کو اپنی ان بہن سے بڑی محبت تھی اس لئے کہ وہ ان کے والد اور اپنے حقیقی ماموں مولوی محمد شفیع کا بڑا لحاظ کرتے تھے اور انہیں مثل اپنے والد کے جانتے تھے، یہ محض بیان نہیں ہے بلکہ امر واقعہ ہے خود حضرت گنگوہی نے اپنے ایک خط میں جو حکیم عبد العزیز خاں کے نام ہے مولوی محمد شفیع کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ تو میرے پدر شفیق کی جگہ ہیں" خط کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے "رہا بندہ سو پہلے بھی عرض کیا تھا اور اب بھی کہ بسبب مرض سابق کے کمی بہت ہے مگر اب جو کچھ تخفیف ہوتی جاتی ہے تو بہت قوی ہوتی جاتی ہے اور حضرت (حاجی امداد اللہ مہاجر مکی) کا ارشاد نقل کر دیتا ہے اور ماموں محمد شفیع صاحب جب شوق طلب حضرت مرشد سلمہ بیان کرتے ہیں تو کہتے کہ تو کسی طرح چلا ہی جاؤں اگر شدت مرض کا اندیشہ نہ ہو اور در صورت ارادہ وہ بھی تسلی دیتے ہیں تو اب یوں عزم ہو رہا ہے کہ ذی قعدہ کے اول میں اگر عزم پختہ ہو ہی گیا تو ماموں صاحب سے ان کے وعدہ کا خرچ لے کر چلا جاؤں گا۔ پھر اگر تا بمبئی مجھ کو کچھ دقت نہ ہوئی تو آگے سبقت کروں گا۔ اور اگر اس سفر بمبئی میں موقع اور مناسب نہیں ہوا اور ہمت نہ بندھی اور آگے جانا مشکل معلوم ہوا تو واپس

چلا آؤں گا اس ہی واسطے کسی کو جانے نہ جانے کی اطلاع نہیں کرتا ہوں کہ اگر مریدوں نے کچھ خدمت تواضع کی اور پھر واپس چلا آیا تو بہت مطعون ہونا پڑے گا کہ روپیہ لینے کے واسطے یہ بات مشہور کی تھی چھپ کر جاؤں گا اور اس عرصہ میں حال جہاز اور کرایہ بھی دریافت ہو جائے گا۔ اپنا تو یوں قصد ہو رہا ہے مگر تم کو اس حالت میں سفر ہرگز مناسب نہیں جانتا ہوں اور ماموں صاحب نے کہہ دیا ہے کہ اگر تو جاوے تو جس قدر روپیہ درکا ہوگا مجھ سے طلب کر لینا۔ ان سے روپیہ لینے میں مجھ کو یوں بھی اندیشہ نہیں کہ اگر واپس چلا آیا تو طعنہ نہ کریں گے کیونکہ وہ تو میرے پدر مشفق کی جگہ ہیں۔

مولانا مظہر حسین کی شادی

شاہ عبد الرحمٰن رحمتہ اللہ علیہ کی سب سے چھوٹی اولاد اور حضرت فخر العلماء کے واحد بھائی مولوی شاہ مظہر حسین کی عمر جنگ آزادی کے وقت ڈیڑھ سال اور والد ماجد کے انتقال کے وقت ساڑھے چار سال تھی، آپ نے ابتدائی تعلیم گنگوہ میں پائی اور اس کے بعد دار العلوم دیوبند میں اپنی بقیہ تعلیم مکمل کی، مگر انہیں حصول علم سے زیادہ رغبت نہیں تھی جو ان کے بڑے بھائی کو اللہ نے ودیعت کی تھی۔

مولوی مظہر حسین تمام عمر لاابالی نہیں رہے، یہ ساری لاپرواہی حضرت فخر العلماء کی زندگی تک ہی تھی، ان کی رحلت کے بعد مولوی مظہر حسین نے کئی سال نواب زادہ لیاقت علی خان کے والد نواب رستم علی خان کی اس جائیداد اور املاک کی نگرانی فرمائی جو یوپی کے ضلع مظفر نگر میں تھی۔ اور آپ ۱۳۱۳ھ سے ۱۳۳۸ھ تک دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے اور خود حضرت گنگوہی کے ایماء پر انہیں یہ اعزاز دیا گیا تھا جس کا تاریخ دیوبند میں بھی ذکر موجود ہے۔ گنگوہ میں آپ جس مکان میں آخر عمر تک مقیم رہے وہ مولوی محمد شفیع صاحب ہی کا مکان تھا جو قطب عالم حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کی خانقاہ کے بہت قریب واقع ہے اور جس میں خاندانی روایات کے مطابق حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کا حجرہ بھی شامل ہے۔ یہ جگہ استعمال میں لائی نہیں جاتی۔ اسی طرح یہ وہی مکان ہے جس میں حضرت شیخ کے انتقال کے بعد شہنشاہ ہمایوں جب بغرض فاتحہ گنگوہ آیا تو ٹھہرا تھا اور یہیں اس کے حکم سے حضرت شیخ کے مزار کی تعمیر کا آغاز ہوا تھا۔

جناب اسمٰعیل انصاری نے لکھا ہے کہ مجھے حضرت اقدس (حضرت فخر العلماء) کے خاندان کے افراد کی تفصیل معلوم نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ان کے ایک بھائی جن کا نام نامی اسم گرامی مظہر حسین صاحب تھا سرائے میں آباد تھے۔ میں نے ان کی زیارت کی ہے۔ اس زمانہ میں ان کا ضعیفی کا عالم تھا اور علالت نے بھی گھیر لیا تھا۔ یہ اگرچہ انصاری تھے، لیکن سرائے میں جا کر پیر زادگان سے تعلق کی بناء پر کہ حضرت کی دادی قطب عالم کے سجادہ شاہ عماد الاسلام کی صاحبزادی تھیں شاہ جی مظہر حسین کے نام سے موسوم ہو گئے تھے، ان کے تین صاحبزادے تھے، شاہ حاجی عزیز حسین جو نہایت نیک منکسر المزاج اور نازک طبع لوگوں میں سے تھے، مرنجان مرنج قسم کے تھے، اور جن کا انتقال پاکستان آکر ابھی غالباً دو سال پہلے ہو گیا تھا، ان کے چھوٹے بھائی شاہ حنیف حسین صاحب تھے جو مدرسہ دیوبند کے فاضل جوشیلے خوبصورت مولوی اور اچھے مقرر تھے، ان کا انتقال جوانی ہی میں ہو گیا۔ ان سے چھوٹے حافظ شاہ (قاری) ظریف حسین صاحب تھے، جو افسوس ہے کہ ہم سے جدا ہو گئے۔

بہنوں کی شادی

حضرت فخر العلماء کی بہن قطبی بیگم کی شادی حکیم محمد اسمٰعیل دیوبندی اجمیری کیساتھ ہوئی جو علوم دینی میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے شاگرد تھے، اور حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید میں حضرت گنگوہی کے جن ممتاز شاگردوں کے نام دیئے ہیں۔ ان میں حکیم محمد اسمٰعیل صاحب کا نام بھی شامل ہے، مگر حکیم محمد اسمٰعیل صاحب کا ابتدائی زمانہ بڑی تنگی و ترشی کا تھا۔ یہاں تک کہ خاندانی روایات کے مطابق جب وہ بغرض تلاش ملازمت رامپور گئے اور انہوں نے نواب صاحب رام پور کی خدمت میں قصیدہ پیش کیا تو دس روپیہ ماہوار پر داروغۂ اصطبل کے عہدہ پر ان کا تقرر ہوا، جو ایک اہل علم کی حیثیت سے ان کے شایان شان نہیں تھا۔ لہٰذا وہاں سے دہلی پہنچے۔ جب آپ دہلی روانہ ہوئے تو اثنائے راہ میں کانپور میں اپنے برادر نسبتی حضرت فخر العلماء کے پاس قیام پذیر ہوئے، جو اس زمانہ میں وہاں مقیم تھے اور حضرت نے انہیں طب پڑھنے کا مشورہ دیا اور جب حکیم محمد اسمٰعیل صاحب نے یہ مشورہ قبول کر لیا تو آپ انہیں اپنے ہم درس حکیم عبد المجید خاں کے پاس دہلی لے گئے اور حکیم عبد المجید خاں نے حضرت فخر العلماء سے کہا کہ آپ ایک شہ باز کو میرے پاس

لائے ہیں مگر میں صرف اس شرط پر انہیں پڑھاؤں گا کہ میرے پاس قیام کریں۔ حکیم محمد اسمٰعیل نے یہ مشورہ مان لیا اور حکیم عبد المجید خان سے طب پڑھنا شروع کی۔ دہلی میں طب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد حکیم محمد اسمٰعیل صاحب گنگوہی اجمیر شریف گئے اور وہاں طبیب کی حیثیت سے آپ نے بڑی شہرت اور ناموری پائی اور جب وہ اپنے بمبئی کے مداحوں کے مشورے پر اجمیر شریف سے بمبئی پہنچے اور وہاں پر آپ نے مطب شروع کیا تو وہاں آپ کو حکیم اجمیری کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

حکیم محمد اسمٰعیل صاحب نے بہ حیثیت طبیب اگرچہ بہت نام پایا مگر انہیں علوم دینی سے بدستور شغف رہا اور آپ برابر دار العلوم دیو بند کے مسائل میں دلچسپی لیتے رہے آپ ۱۳۱۳ھ سے لے کر ۱۳۴۱ھ تک دار العلوم کی مجلس شوری کے رکن رہے۔

حضرت فخر العلماء کی دوسری بہن انبیا بیگم کی شادی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے ساتھ ہوئی۔ حضرت امام ربانی قدس سرہ (حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی) نے خطبۂ نکاح پڑھ کر ڈھائی ہزار روپیہ مہر قرار دے کر اپنے روحانی بیٹے کا عقد کیا۔

حضرت فخر العلماء کی تیسری بہن کا نام اولیاء بیگم تھا جن کی انبیٹھہ میں سجادہ نشین شاہ محمد صادق صاحب سے شادی ہوئی تھی اور جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

علوم قاسمی کی اشاعت

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے حضرت فخر العلماء کی زندگی کا بیشتر حصہ حضرت قاسم العلوم کی سوانح اور علوم قاسمی کی اشاعت میں گزرا، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح کا کام سب سے پہلے حضرت فخر العلماء نے کیا، اکابرین دیو بند نے یہ کام حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کیا تھا، مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سوانح قاسمی مرتبہ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مقدمہ میں انکشاف فرمایا ہے کہ حضرت قاسم العلوم کے انتقال کے فوراً بعد حضرت مولانا احمد صاحب نے سوانح قاسمی کی ترتیب کا کام حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد فرمایا، مولانا طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں "حضرت والد مرحوم نے (مولانا محمد احمد صاحب نانوتوی خلف الصدق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ) فرمایا کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد بڑے مولانا (شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ)

سے عرض کیا کہ وقت کا تقاضہ ہے کہ آپ دو چیزیں مرتب فرمادیں، ایک قرآن شریف کا اُردو ترجمہ اوراس کے مختصر تفسیری فوائداور دوسرے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات۔ مولانا نے بڑی امنگ اور آرزو سے فرمایا کہ میں انشاء اللہ ضرور ان دونوں باتوں کی تکمیل کروں گا اس پر والد مرحوم نے فرمایا کہ "پھر میں وہ تمام مواد آپ کی خدمت میں پیش کردوں جو میرے پاس موجود ہے! فرمایا کہ ضرور" اسی پر میں نے ایک بہت بڑا پلندہ جس میں حضرت کے ملفوظات واقعات، علوم، مکتوبات اور حالات کا ایک ذخیرہ بندھا ہوا تھا لاکر پیش کردیا، مولانا اس سے بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ اب میں سوانح مرتب کروں گا اور ان قلمی یادداشتوں سے میرا ذہن ان سینکڑوں واقعات کی طرف منتقل ہوگا، جو میرے ذہن اور سینہ کی امانت ہیں، اب انشاء اللہ وہ سب سینہ سے سفینہ میں آجائیں گے۔ حضرت والا مرحوم نے فرمایا کہ مولانا اس پلندہ کو لے کر مردانہ بیٹھک کی الماری میں رکھ کر خوش خوش گھر تشریف لے گئے۔ شاید ایک گھنٹہ کے بعد ہی جب اس ذخیرہ کو لینے کیلئے باہر تشریف لائے اور الماری کھولی تو وہ پلندہ غائب تھا پھر ہر چند اسے تلاش کیا، اور خاک تک چھان ماری پلندہ نہ ملا۔ فرمایا، کہ حضرت مولانا اور ہم سب پر اس درجہ اس کا صدمہ پڑا کہ جیسے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات آج ہوئی ہے، اور عرصہ دراز تک یہ صدمہ اور حیرت ہم پر چھائی رہی، بالآخر صبر کر کے بیٹھ رہے۔ (صفحہ ۱۰) حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے آخر کار کلام پاک کا اردو ترجمہ و تفسیر مرتب فرما کر حضرت مولانا محمد احمد صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک آرزو تو پوری کردی، مگر ان کی دوسری خواہش کہ وہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات مرتب کریں پوری نہ کر سکے، حالانکہ ملفوظات اور تحریری یادداشتوں کے بغیر بھی وہ یہ کام انجام دے سکتے تھے اور انہیں اس کام کے لئے ۱۸۸۰ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک کا طویل وقت بھی ملا تھا۔

حضرت فخر العلماء کی مرتب کردہ سوانح قاسمی

حضرت فخر العلماء نے اپنے رسالہ انتصار الاسلام کے دیباچہ میں اس سوانح قاسمی کا جو انہوں نے مرتب فرمائی ہے ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔ "بندہ نے جناب مولانا مرحوم کی سوانح عمری لکھی ہے اور عجائب واقعات گزرے ہیں اور جو جو کارہائے نمایاں مولانا مرحوم نے کئے ہیں ان کا مفصل حال بیان کیا ہے اور بہت سے متفرق واقعات علمی و عملی جن سے جناب

مولانا کا یکتائے روزگار ہونا علوم ظاہری و باطنی میں ظاہر ہوتا ہے مشرح مرقوم کئے ہیں، اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ جناب مولانا مغفور کیا کیا چیزیں یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ اور غرض اس جمیع تفصیل سے یہ ہے کہ شاید کوئی کمر ہمت باندھے اور اپنے مقدور کے موافق ایسے امور کے اجراء میں کوشش کرے اور مضامین عالیہ سے نفع اٹھائے اور اوروں کو پہنچائے، یہ سوانح عمری لائق دید ہے شاید ایسی عجب چیز بھی اس زمانہ میں کوئی اور ہو۔ یہ سوانح عمری چونکہ ایک کتاب ہوگئی ہے اس لئے بالفعل اس کا شائع ہونا ذرا دشوار ہے اگر خدا کو منظور ہوا تو اس کا بھی وار آجائے گا" اس واضح اعلان کی موجودگی میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت قاسم العلوم کے شاگردوں میں سے کسی نے اپنے استاد گرامی کی سوانح ترتیب دینے کی کوشش نہیں کی، لیکن افسوس کہ یہ سوانح شائع نہ ہوسکی لیکن اس کی ذمہ داری فخرالعلماء پر نہیں ہے، قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سوانح قاسمی مرتبہ مولانا مناظر احسن گیلانی کے مقدمہ میں اپنے والد مرحوم کے حوالہ سے اس سوانح کا بھی ذکر کیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں، حضرت والد مرحوم نے فرمایا کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ کی ایک مفصل سوانح جس میں کثرت سے علوم و معارف اور مختلف علمی حقائق کو اسباب حدوث اور واقعات کے ساتھ بیان کیا گیا تھا، مولانا فخرالحسن گنگوہی (تلمیذ خاص حضرت نانوتوی قدس سرہ) نے مرتب کی جو تقریباً ایک ہزار صفحات تک پہنچ چکی تھی اور سلسلہ آگے بھی چلا، یہ گویا حضرت کی علمی سوانح تھی جس میں سیرت و کردار پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی تھی، چنانچہ اس کا تذکرہ مولانا فخرالحسن صاحب کے بعض اعلانات میں بھی ملتا ہے جس کی طباعت کا وعدہ بھی کتابت و طباعت اور کاغذ کی سہولت آجانے پر کیا تھا، حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ مولانا فخرالحسن اپنی خانگی مجبوریوں سے گنگوہ کی سکونت ترک فرما کر (جس کا ذکر اپنے مقام پر ہوچکا ہے) کانپور منتقل ہوئے، مکان کا ایک حصہ اپنی کتابوں کیلئے مخصوص کر لیا اس میں یہ سب قلمی یادداشتیں بھی رکھ دیں، اس کتب خانہ کی ترتیب کے چند دن بعد ہی ان کے کتب خانہ کو آگ لگائی گئی جس سے سارا کتب خانہ جل کر راکھ ہوگیا اور اس میں وہ سوانح کا مسودہ بھی ضائع ہوگیا" مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی کے حصہ دوئم میں لکھا ہے کہ "کوئی شبہ نہیں کہ مولانا فخرالحسن مرحوم کی مرتب کردہ یہ سوانح عمری اگرچہ جل کر ناپید ہوچکی ہے لیکن ان کی اس کتاب کی نوعیت اور قدر و قیمت کا سرسری اندازہ ان کے اس تحریری بیان سے ہوتا ہے بلکہ

چاہا جائے تو ان کی مرتبہ سوانح عمری کے مشتملات و مضامین کی اجمالی فہرست ان کے اسی بیان کو ہم قرار دے سکتے ہیں، پھر اس کے ساتھ جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ ساری معلومات جن کے اندراج کی اطلاع اس کتاب کے متعلق دی گئی ہے یہ حلقۂ قاسمی کے ایک ایسے رکن رکین کی فراہم کردہ معلومات ہیں جو علاوہ زمانی معیت اور مکانی قرب کے سیدنا امام الکبیر کے ممتاز ترین تلامذہ میں شمار ہوتے تھے، ان کو براہ راست خود حضرت والا سے ان مضامین عالیہ کے سمجھنے کا موقع ملا تھا، جن پر اس حکمت قاسمی کی بنیاد قائم ہے، گو اپنا تعارف کراتے ہوئے اس موقع پر مولانا فخر الحسن صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ بندہ کا بھی ایک ادنیٰ شاگردوں میں شمار ہوتا ہے اگرچہ سب میں ادنیٰ ہے لیکن اس انتساب کو اپنا فخر جانتا ہے۔" لیکن سوانح نگاری کی اس مہم میں غیر معمولی کامیابی جو ان کو میسر آئی تھی اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے بہ ایں انکسار و کم نفسی جوش مسرت میں بے ساختہ یہ الفاظ ان کے قلم سے چھلک پڑے ہیں، ارقام فرماتے ہیں کہ " یہ سوانح عمری لائق دید ہے شاید ایسی عجیب چیز بھی اس زمانہ میں کوئی اور ہو" گویا یہی مطلب ہوا کہ جیسے صاحب سوانح کی شخصیت اپنے عہد کی ایک عجیب و غریب بے مثال ہستی تھی اسی طرح یہ سوانح بھی مرتب کتاب کے نزدیک اپنے زمانہ کے عجائب و نوادر ہی میں شمار ہونے کی مستحق تھی، سچ پوچھئے تو جب سے مولانا فخر الحسن مرحوم کے مندرجہ بالا الفاظ میری نظر سے گزرے ان کی کتاب اور ان کی غیر معمولی محنت و مشقت کی بربادی پر زیادہ اور بہت زیادہ افسوس ہو رہا ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ اپنی اس کتاب میں انہوں نے کیا کچھ لکھا ہوگا ان ہی کے بیان سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ہمارے مصنف امام (مولانا محمد یعقوب صاحب) کی مرتبہ سوانح عمری ضخامت کے لحاظ سے جیسے ایک کتابچہ ہے اس کے برعکس مولانا فخر الحسن کی لکھی ہوئی سوانح عمری مستقل کتاب کا قالب اختیار کر چکی تھی ان کے الفاظ ہیں کہ "یہ سوانح عمری چونکہ ایک کتاب ہوگئی ہے" اور اگرچہ ضخامت تو نہیں بتائی گئی لیکن آگے انہوں نے جو یہ لکھا ہے کہ "اسی لئے بالفعل شائع ہونا اس کا ذرا دشوار ہے" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صفحات اس کتاب میں کافی ہوں گے مگر اب اس پر بحث ہی فضول ہے، البتہ مولانا فخر الحسن مرحوم کے مذکورہ بیان سے ان کی کتاب کے مضامین کی جو قدر و قیمت اور رفعت تھی وہ سامنے آگئی ہے، آئندہ سیدنا امام الکبیر کے سوانح نگاروں کیلئے روشنی کے مینار کا کام دے سکتی ہے، خصوصاً ان کے بیان کا یہ آخری جزو یعنی "جناب

مولانا مذکور کیا کیا چیزیں اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ مولانا فخر الحسن نور اللہ مرقدہ کی فہرست مضامین کے اس جزو کی تعبیر خاکسار نے مآثر قاسمی سے کی ہے اور اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ سوانح قاسمی کی مطبوعہ اور شائع شدہ دو جلدوں کی تکمیل کے بعد بھی کام تشنۂ تکمیل ہے۔(۱)

جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی کے صفحہ ۴۳۲،۴۳۱ میں حضرت مولانا فخر الحسن کی "سوانح قاسمی" کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ "یہ سب کارنامے مولانا فخر الحسن صاحب کے ہیں جنھوں نے اپنے استاد کی تقریروں اور مناظروں کو مرتب کیا اور پھیلانے کی کوششیں کیں، تمام شاگردوں میں (اکابرین دار العلوم کی منشاء، تحریک اور تعاون کے بغیر) حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کے کارناموں کو انہوں نے ہی اُجاگر کرنے کی کوشش کی اور حضرت قاسم العلوم کی وفات کے بعد بہترین سوانح عمری لکھی؛ قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سوانح قاسمی کے مقدمہ میں اور جناب مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے سوانح قاسمی جلد سوم کے صفحات ۱۸۱ر تا ۱۸۳ر میں حضرت فخر العلماء کی سوانح کے جلنے اور ضائع ہونے کا جو ذکر کیا ہے وہ محلِ نظر ہے، حضرت فخر العلماء نے یہ تصنیف اپنی وفات سے بہت قبل حضرت قاسم العلوم کے انتقال کے فوراً بعد لکھی تھی جیسا کہ انہوں نے انتصار الاسلام کی اشاعت کے موقع پر ارقام فرمایا، گویا یہ ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ کی بات ہے، ان کا انتقال ۱۳۱۵ھ یا ۱۸۹۷ء میں ہوا جس کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا اور حضرت فخر العلماء کے کتب خانہ میں آگ لگنے کا واقعہ ۱۹۳۱ء میں ہوا اس کے مطلب یہ ہوتے ہیں کہ یہ مسودۂ کتاب ۵۱ر سال تک بغیر اشاعت کے پڑا رہا، پھر یہ کہ حضرت فخر العلماء کے خاندان میں ان کی رحلت کے بعد بھی علم رہا اور ان کے دونوں صاحبزادوں یعنی حضرت مولانا حافظ نور الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا فیض الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ مجاز طریقت حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ اور شاگرد رشید حضرت مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کی زندگی کا بیشتر حصہ لکھنے پڑھنے میں گزرا، حضرت مولانا کے ان صاحبزادوں کے مسلم الثبوت، اصول الشاشی اور حسامی پر حواشی بھی شائع ہوئے اور یہ کام حضرت فخر العلماء کے دوسرے صاحبزادے حضرت مولانا فیض الحسن نے حضرت والا کے مکان میں مطبع سعیدی قائم کر کے ایک اور ادارہ تصنیف و تالیف و تشہیر بنام مخزن العلوم قائم کر کے بطریق احسن انجام دیا، ان ہی صاحبزادے نے حضرت

---

(۱) سوانح قاسمی ج ۳ ص ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳

فخر العلماء کی مشہور تصنیف حاشیہ ابوداؤد اور سنن ابن ماجہ کی طباعت کا بندوبست کیا اس لئے یہ تصور کرنا کہ ان کے علم میں ایسی شہرۂ آفاق کتاب جس کے مسودہ کی تشہیر ۱۸۸۰ء کے قریب خود حضرت فخر العلماء نے فرمائی اور بقول قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس بارے میں حضرت فخر العلماء نے کئی اعلانات بھی فرمائے، اور ان میں سوانح کی ضخامت کا ایک ہزار صفحات سے زیادہ ہونا بھی بتایا، اس کتاب کی اشاعت کے لئے ان کے صاحبزادوں نے کوئی کوشش نہیں کی، پھر یہ کہ مولانا فیض الحسن کتب خانہ میں آگ لگنے کے واقعات کے بعد ۱۲ر سال زندہ رہے اور حضرت مولانا نور الحسن تیرہ چودہ سال، اور ان حضرات نے اپنے متعلقین سے اتنے بڑے علمی اور ادبی حادثہ کا ذکر نہیں کیا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ پھر ایک بات اور ہے ۱۹۳۱ء میں جب فخر العلماء کا کتب خانہ جلا اور حضرت مولانا فیض الحسن کا سارا اسباب لٹا اور حضرت مولانا اور ان کا خاندان صرف ان کپڑوں سے جو ان کے جسم پر تھے بچ کر چٹائی محال سے ٹپکاپور گیا تو اس موقع پر حضرت کے داماد اور مولوی مظہر حسین کے فرزند ثانی جناب قاری حافظ ظریف حسین بھی کانپور میں موجود تھے۔ اور وہ ۱۹۶۵ء تک حیات رہے انہوں نے بھی اس عظیم کتاب کے جلنے کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔

ان امور سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ حضرت فخر العلماء کا کتب خانہ جو ان کی رحلت کے بعد ان کے فرزند ثانی کے حصہ میں آیا اس میں یہ یادگار مسودہ موجود نہیں تھا بلکہ اسے خود حضرت فخر العلماء کی زندگی میں دیوبند کے اکابرین میں سے کسی ایک کو بغرض اشاعت بھیج دیا گیا تھا، جس کا علم حضرت والا کی اولاد کو نہیں تھا، سوانحہ مخطوطہ کے مسودہ کو پہلے حضرت مولانا فخر الحسن کا مسودہ سمجھنا اور بعد میں اسے منشی فضل حق کے نام سے موسوم کرنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید حضرت فخر العلماء نے یہ مسودہ ۱۳۱۱ھ یا ۱۳۱۲ھ میں ان کے طلب کرنے پر منشی صاحب کو بھیج دیا ہو اور ۱۳۱۳ھ میں ان کے جبری استعفے سے اس کی اشاعت کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا ہو اور بعد میں وقت گزرنے کے بعد حضرت فخر العلماء کا مسودۂ کتاب خراب وخستہ حالت میں جب برآمد ہوا تو اسے منشی فضل حق کی تصنیف سمجھ لیا گیا ہو، پھر اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قاری محمد طیب صاحب کے بقول "ابھی چند سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ مجھے جناب قاری عتیق احمد صاحب رکن دار العلوم کے پاس حضرت کی سوانح کا ایک ناقص مسودہ من حیث لا یحتسب دستیاب ہوا جو صفحہ ۷ سے ۵۶ تک مسلسل

ہے اور درمیان کے کچھ منتشر اوراق مسودہ کے بیچ میں سے نکلے ہیں، اس میں فہرست مضامین کے اوراق مکمل ملے جن میں ۴۳ر عنوانات اصولی قائم کئے گئے ہیں۔ اور ہر اصولی عنوان کے نیچے ضمنی عنوانات کی کافی تعداد ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سوانح کے اصول پر نہایت مکمل طریقہ سے مرتب کی گئی ہے، سن ولادت کے عنوان کے نیچے مرض وفات تک کی توضیح، نوعیت علاج، معالجین کی فہرست، اندارج حالات نزع ووفات، بعد وفات مبشرات ومقامات، نماز جنازہ کی تفصیلی کیفیت، جنازہ پر غیر معمولی ہجوم کے واقعات تعزیت کنندوں کا مہینوں ہجوم، مراثی اور قصائد تعزیت وتواریخ اخبارات میں مضامین تعزیت وغیرہ اتنے ضمنی عنوانات صرف ایک عنوان وفات کے نیچے درج ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر مکمل صورت میں سوانح مرتب ہوئی ہوگی، درمیانی اوراق میں بعض صفحات پر ۱۵۸ کا ہندسہ پڑا ہوا ہے اور بعض پر اس سے بھی آگے کا جس سے واضح ہے کہ اس سوانح کی ضخامت بھی کافی ہوگی۔

سوانح نگار عموماً مشاہدات بیان کرتا ہے اکثر واقعات میں اپنی شرکت بھی ظاہر کرتا ہے حتی کہ خانگی معاملات درج کرتے ہوئے ان میں بھی معتمدانہ دخل ظاہر کرتا ہے، جس سے واضح ہے کہ سوانح نگار حضرت صاحب سوانح کے مزاج میں دخیل اور بارسوخ فرد ہے مگر افسوس کہ سوانح کا اول وآخر ندارد ہے جس سے مولف کا پتہ چل سکتا ہے، مگر اس میں بھی حیرت ناک بات یہ ہے کہ صفحہ ۵۶ سے آگے جہاں سے عنوانات فہرست میں جہاد اور اجتماعی خدمات کا ذکر ہے وہیں سے مسودات غائب ہیں، یعنی ذاتی سیرت تو ۵۱ر صفحات تک فی الجملہ آگئی ہے مگر خدمات ومعاملات کا حصہ غائب ہے اسی حصہ کے منتشر اور پھٹے ہوئے کچھ اوراق ملے ہیں جن میں حضرت کا جنگ روم وروس کے سلسلہ میں ترکوں کے لئے چندہ جمع کرنا، خلافت اسلامیہ ترکی سے مسلمانان ہند کو وابستہ رکھنے کی مساعی، دارالعلوم کے احاطہ میں طلبہ کو فنون سپہ گری سکھلانا، دارالعلوم میں محکمہ، قضا قائم کر کے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو قاضی بنانا اور مسلمانوں کے معاملات کو شرعی اصول پر طے کرنے کی صورتیں پیدا کرنا وغیرہ مذکور ہے، مگر ناقص انداز میں کوئی صفحہ ندارد ہے کوئی پھٹا ہوا ہے کوئی ناقابل انتفاع ہے بمشکل آئی گلاس سے کچھ پڑھا جاتا ہے۔(۱)

(۱) سوانح قاسمی ج ۱ ص ۱۱

آپ اس طویل اقتباس کو پڑھئے اور حضرت فخر العلماء کے اس اعلان کو جسے انتصار اسلام سے اوپر نقل کیا گیا ہے اور ان معروضات پر توجہ دیں جن کا ذکر آگ میں جلنے کے سلسلہ میں کیا گیا تو کیا یہ قیاس کرنا مشکل ہے کہ یہ مسودہ حضرت فخر العلماء کا مرتب کردہ ہے، پھر یہ کہ اس مسودہ کے جو اقتباسات مختلف کتابوں اور رسائل میں پیش کئے گئے ہیں۔ ان سے اور حضرت فخر العلماء کے انداز تحریر سے جو انتصار اسلام، تقریر دل پذیر اور مباحثہ شاہجہانپور میں نظر آتا ہے سے موازنہ کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک ہی شخصیت کا انداز ہو سکتا ہے، اور ان سب سے الگ جناب انوار الحسن شیر کوٹی کا انوار قاسمی کے صفحہ ۳۳۴ / میں یہ کہنا کہ ''مولانا فخر الحسن صاحب نے مولانا محمد قاسم صاحب ﷫ کی جو سوانح عمری لکھنے کا اوپر ذکر کیا ہے افسوس چند اوراق کے سوا وہ ضائع ہوگئی اور پھر انہی کا یہ بیان جو تذکرہ ادباء دار العلوم دیوبند کی قسط نمبر ۱۵ میں جو رسالہ دار العلوم کی اشاعت بابت جون ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی ہے کہ ''حضرت مولانا کی سوانح عمری آپ کے ارشد تلامذہ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی مرحوم نے لکھی تھی جیسا کہ موصوف نے انتصار الاسلام میں حوالہ دیا ہے۔ لیکن وہ کہاں ہے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے مدتیں گزریں جب دیکھی تھی، بعض حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دار العلوم دیوبند کے خزانہ میں تبرکات کے ساتھ منسلک ہے'' کیا ظاہر کرتا ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اکابر دیوبند کو چاہئے کہ وہ کم از کم اتنا تو تسلیم کریں کہ حضرت فخر العلماء کا مسودۂ سوانح کسی اور کی تصنیف نہیں ہے۔

حضرت قاسم العلوم کی تصانیف

حضرت قاسم العلوم کی تقریروں، تحریروں، اشعاروں اور خطوط پر مشتمل تصانیف کی کل تعداد ۳۱ ہے جس کی اپنی جگہ پر تفصیل پیش کی جا رہی ہے، ان کا ماخذ الدلیل المحکم، تقریر دل پذیر، جناب ایوب قادری کی کتاب ''محمد احسن نانوتوی ﷫'' پروفیسر انوار الحسن شیر کوٹی کی ''انوار قاسمی'' اور مولانا سید عبد الرؤف عالی کا مضمون ''حضرت نانوتوی قدس سرہٗ العزیز کی تصانیف'' ہے، ان میں سے ۲۳ تصانیف ان کے خطوط پر مشتمل ہیں، ان تصانیف میں ۱۰ / تصانیف ایسی ہیں کہ جن کا املا حضرت فخر العلماء کے ہاتھ کا ہے یا ان اشعار اور خطوط پر

مشتمل ہیں جو ان سے متعلق ہیں، گویا حضرت قاسم العلوم کے علوم اور خیالات کی بنیادی کتابوں کی اشاعت حضرت فخر العلماء کی کوششوں اور کاوشوں کی مرہون منت ہے اور یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس پر شاگرد رشید کو جتنا فخر ہو وہ کم ہے، یہی وجہ ہے کہ خانوادۂ قاسمی کے اہم ستون مولانا قاری محمد طیب صاحب انہیں تصنیف و تالیف کے میدان میں اپنے استاد مکرم کا جانشیں تسلیم کرتے ہیں، اور ان تصانیف ہی پر کیوں اکتفا کیا جائے، حضرت قاسم العلوم کی ان تصانیف میں بھی جو ان کے مختلف خطوط پر مشتمل ہیں جا بجا حضرت فخر العلماء کا تذکرہ موجود ہے، بلکہ ان کے ایک خط سے ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت فخر العلماء کی دہلی میں موجودگی کا سبب سنن ابن ماجہ کی تصحیح ہے۔

حضرت قاسم العلوم کی اہم تصانیف جیسے تقریر دل پذیر، حجتہ الاسلام، انتصار اسلام، مباحثہ شاہ جہاں پور، قبلہ نما، گفتگوئے مذہبی اور قاسم العلوم پر حضرت فخر العلماء کی گہری چھاپ ہے، حضرت فخر العلماء کا ارادہ تو یہ تھا کہ وہ حضرت قاسم العلوم کی تمام تحریروں کو باقاعدہ تصحیح اور حواشی کے ساتھ شائع فرمائیں مگر عمر نے وفا نہیں کی، انہوں نے اتنی عمر نہیں پائی جو ان کے دوسرے ساتھیوں یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کو اور حضرت سید العلماء مولانا احمد حسن امروہویؒ کو میسر آئی، حضرت شیخ الہندؒ کا وصال ۱۹۲۰ء اور حضرت سید العلماء کا وصال ۱۹۱۴ء میں ہوا، حضرت فخر العلماء حضرت شیخ الہندؒ سے ۲۳؍سال قبل اور حضرت سید العلماء سے ۱۵؍سال قبل جنت کو سدھارے مگر اس کے باوجود انہوں نے تن تنہا حضرت قاسم العلوم کے ارشادات اور نظریات کی اشاعت کیلئے جدوجہد کی، انہوں نے خود انتصار اسلام کے دیباچہ میں لکھا تھا کہ۔ ”اور جناب مولانا کی وہ تحریریں جو زیر طبع ابتک نہیں آئی ہیں اور وہ کئی سو جز ہوں گی ان کے شائع کرنے پر بندہ نے کمر ہمت باندھی ہے خداوند کریم مدد کرے“ آفریں ہے انکے حوصلہ پر، اگر وہ اپنے ساتھیوں کی عمروں کو پہنچتے تو پھر کسی کو سوانح قاسمی کے بارے میں موجودہ تشنگی کا احساس نہ ہوتا اور حضرت قاسم العلوم کے تمام معارف اور علوم منظر عام پر آجاتے مگر ”ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال“ بہر حال انہوں نے اس ضمن میں جو کچھ کیا وہ بھی کسی اور شاگرد قاسم العلوم کے مقدر میں نہیں تھا اور عقائد قاسمی کی اشاعت بھی بڑی حد تک ان کی کوششوں کی مرہون منت ہے، حضرت فخر العلماء نے ان کتابوں کی اشاعت کے بارے میں جو کوشش فرمائی اس کا اب

ذیل میں جائزہ لیا جاتا ہے۔

(۱) تقریر دل پذیر

یہ حضرت قاسم العلوم کی آخری تصنیف ہے اور اس کی تکمیل سے پہلے ہی حضرت نے انتقال فرمایا، حضرت فخر العلماء نے جن کی نگرانی میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "سخت افسوس ہے کہ یہ رسالہ پورا بھی نہ ہونے پایا ادھورا ہی تھا کہ مصنف مرحوم خلد بریں کو تشریف لے گئے، اور یہ رسالہ کیا بہت سے کام ادھورے رہ گئے" مصنف مرحوم فرماتے تھے کہ دو بحثیں لکھنی باقی ہیں ایک بحث تو قبلہ اور احکام متعلقہ قبلہ کی رہ گئی ہے، دوسری بحث یہ رہ گئی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو خدا کے ساتھ کیا رابطہ ہے اور نبیوں میں آپس میں بہ اعتبار مرتبہ کیا فرق ہے اور کیوں ہے "لیکن اس میں آگے چل کر اس عزم کا اظہار فرمایا کہ وہ انشاء اللہ ان دونوں بحثوں کو تحریر کریں گے۔ حضرت فخر العلماء کے اس مقدمہ کا جو اس کتاب کے صفحۂ اول اور دوم پر محیط ہے سرخی یہ ہے "می باید دید" اس عنوان کے تحت آپ فرماتے ہیں کہ "لاکھ لاکھ شکر ہے اس صانع کا جس نے انسان کو اشرف المخلوقات اس لئے بنایا کہ اس کو جانے پہچانے اور اس کی پرستش کرے، پھر اس میں سے بعضوں کو پیام رسانی کے لئے منتخب کیا اور اپنا فرمان اسکے حوالہ کیا جس میں اس کے جاننے، پہچاننے، عبادت کرنے کی تاکید اور اس کے طریقے بیان کئے، پھر ہر زمانہ میں ان پیامبروں کے کے نائب مقرر کئے جو پیام رسانی کرتے رہے اور مخلوق کو خدا کی طرف بلاتے رہے، من جملہ نائبوں کے اس زمانہ میں ایک یہ شخص تھا جس کو تھوڑے دن ہوئے کہ ہم تم مولانا محمد قاسم سلمہ اللہ تعالیٰ کہا کرتے تھے۔

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا ۔ کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کیلئے

اور اب مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

ہمارے آگے کسی نے جب ان کا نام لیا ۔ دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

اس رسالہ میں جس کا نام تقریر دل پذیر ہے سارے جہاں کو پیام خداوندی ایسی خوش اسلوبی سے پہنچا دیا کہ کسی اہل عقل کو بروئے عقل اس کے چارہ نہیں کہ خدا کو یگانہ و یکتا جانے، پیغمبروں کو اپنے اپنے زمانہ میں واجب الاطاعت سمجھے اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو خاتم النبیین سمجھ کر ان کی اطاعت و تابعداری میں اپنی نجات منحصر سمجھے، یہ رسالہ زبان حال سے یہ پکار رہا ہے کہ۔

فیض محمد واہے آئے جس کا جی چاہے نہ آئے آتش دوزخ میں جائے جسکا جی چاہے

اب بھی کوئی عقل کا اندھا دین محمدی کو نہ اختیار کرے، اپنے لئے خدا کا غضب اور دوزخ کی آگ پسند کرے تو وہ جانے خدا کی حجت قائم ہو چکی۔ اس رسالہ میں جو جو عیب و نقصان اور مذہبوں میں تھے وہ بہ دلائل ثابت کر کے یہ ظاہر کر دیا کہ بروئے عقل اس زمانہ میں سوائے دین اسلام کے اور کوئی دین ایسا نہیں جس کے اختیار کرنے سے انسان کی نجات ہو سکے بہرحال یہ رسالہ بے نظیر ہے، چشم روزگار نے بھی مثل اس کے کوئی کتاب یا رسالہ نہ دیکھا ہوگا، ناظر فہیم و منصف بعد ملاحظہ کے اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھے گا، کئی برس ہوئے اس رسالہ کے چند جزو بریلی میں طبع ہوئے تھے اور سال گذشتہ میں چند جزو بھاولپور میں طبع ہوئے تھے اور دونوں میں بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں اور مصنف مرحوم نے جو اجزاء اس کے بعد تصنیف فرمائے تھے وہ بھی ابھی یوں ہی رکھے تھے، ادھر اس زمانہ میں ایسے رسالہ کی نہایت ضرورت تھی اس لئے بندہ نے اس رسالہ کو جتنا مصنف مرحوم نے تصنیف کیا تھا نہایت صحت کے ساتھ طبع کرنا شروع کیا ہے اور فائدے فٹ نوٹ میں لکھ دیئے ہیں تاکہ جس کسی کو کوئی خاص مضمون دیکھنا ہو آسانی سے دیکھ لے اور جہاں ضرورت سمجھی حاشیہ بھی لکھ دیا ہے۔ لیکن سخت افسوس ہے کہ یہ رسالہ پورا ہونے نہ پایا تھا (گویا موجودہ نسخہ کی کتابت طباعت، تصحیح، فٹ نوٹ اور حاشیہ کی ترتیب وغیرہ کا سلسلہ حضرت قاسم العلوم کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا) ادھورا ہی تھا کہ مصنف مرحوم خلد بریں کو تشریف لے گئے اور یہ رسالہ کیا بہت سے کام ادھورے رہ گئے، مصنف مرحوم فرماتے تھے کہ دو بحثیں لکھنی باقی ہیں ایک بحث تو قبلہ اور احکام متعلقہ قبلہ کی رہ گئی ہے دوسری بحث یہ رہ گئی کہ انبیاء علیہم السلام کو خدا کے ساتھ کیا رابطہ ہے اور نبیوں میں آپس میں بہ اعتبار مرتبہ کے کیا فرق ہے اور کیوں ہے؟ چونکہ مصنف مرحوم کی عمر نے وفا نہ کی اور کیوں کر کرتی ہے

چرا کہ عمر گرامی بکس وفا نہ کند

اور جتنے دنوں اس جہاں میں رہے اکثر بیمار رہے اس لئے یہ دونوں بحثیں سینہ ہی میں رہیں سفینہ میں نہ آئیں، اگرچہ قبلہ کی بحث رسالہ قبلہ نما میں تمام و کمال موجود ہے مگر چونکہ

وہ اور طرز پر ہے اس لئے اس رسالہ عام فہم میں داخل ہونے کے قابل نہیں رہی، دوسری بحث کا مسودہ تو مولانا کی کسی تحریر میں میری نظر سے نہیں گزرا اس لئے یوں جی چاہتا ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ ان دونوں بحثوں کو بطرز سلیس لکھ کر اس رسالہ کو پورا کردے تو بہت اچھا ہو، اگرچہ یہ کام بہت مشکل ہے لیکن پھر بھی محال تو نہیں، بندہ بھی خداوند علیم، کلیم کے بھروسہ پر اس رسالہ کو پورا کرنے کا ارادہ کر رہا ہے مگر چونکہ پھر بھی یہ کام نہایت مشکل ہے اور اپنا یہ حال ہے کہ علم وفضل تو در کنار ہوش وحواس بھی درست نہیں اس لئے اہل بحث کی خدمت میں عرض ہے کہ اس رسالہ کو پورا کرنے کی طرف توجہ کریں اور جس سے جو کچھ ہوسکے دریغ نہ کرے۔

صدائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے

اور بندہ تو قسمت آزمائی ضرور کرے گا اگر خداوند علیم نے مدد کی تو یہ کام گو کتنا ہی دشوار کیوں نہ ہو آسان ہو جائیگا، کریں گے آپ فقط تہمت نیک نامی میرے ذمہ لگ جائے گی۔ بندہ نے اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر اتنا ارادۂ بلند کیا ہے اس لئے امید ہے کہ پورا ہو جائے گا۔

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی اے خانۂ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

دعائے خیر کا امیدوار فخر الحسن سیاہ روز وسیاہ کار۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے بھی اس عظیم تصنیف کے نامکمل رہ جانے پر اظہار افسوس کیا، جناب مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسم جلد دوم صفحہ ۸۱ ہ‍ر میں ارقام فرمایا ہے کہ "جیسا کہ معلوم ہے "تقریر دل پذیر" نامی کتاب میں اسلام کے علمی وعملی نظام کو تدبیر واستدلال کے نئے پہلو میں ڈھالنے کا ارادہ سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا تھا لیکن چند ابتدائی ابواب سے زیادہ کتاب نہ لکھی جاسکی۔ (حضرت مولانا کو سہو ہوا صرف دو بحثیں باقی رہ گئی تھیں) شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "تقریر دل پذیر کے تمام نہ ہونے کا قلق شائقان اسرار علمیہ کو ہے" افسوس ہے کہ حضرت فخر العلماء کی جلد موت نے انہیں ان دو بحثوں کو مکمل طور پر پیش کرنے کی سعادت سے محروم رکھا لیکن یہ کیا کم ہے کہ ان کی کوشش اور سعی بلیغ سے یہ کتاب صحیح اور شستہ انداز میں تمام ضروری فوائد اور حواشی کے ساتھ منظر عام پر آگئی۔

۲۔ حجتہ الاسلام

حجتہ الاسلام حضرت قاسم العلوم کی دوسری اہم ترین تصنیف تھی، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ "تقریر دل پذیر کے تمام نہ ہونے کا قلق شائقان اسرار علمیہ کو ہے "اس کے مکافات کی صورت بھی اس رسالہ حجتہ الاسلام سے بہتر دوسری نہیں ہوسکتی، حضرت فخر العلماء پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسے سب سے پہلے شائع فرمایا، مطبع قاسمی دیوبند سے جو پہلا ایڈیشن رسالہ حجتہ الاسلام کا شائع ہوا ہے۔ اس کے دیباچہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ "مولانا مولوی فخرالحسن رحمہ اللہ نے اسکے مضامین کے لحاظ سے اس کا نام حجتہ الاسلام تجویز فرما کر اول بار شائع فرمایا تھا۔ حضرت فخر العلماء نے علوم قاسمی کی اس اہم یادگار تصنیف کے آغاز میں یہ جملے ارقام فرمائے ہیں"

الحمدللہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی خاتم النبین محمدو علی آلہ واصحابہ اجمعین۔ امابعد کمترین فخرالحسن عفا اللہ عنہ خدمت میں ناظرین رسالہ ہذا (حجتہ الاسلام) کے عرض پرداز ہے کہ ۱۲۹۴ھ میں جو جلسہ شاہ جہاں پور میں ہوا تھا، اس میں جو تقریر جناب مولانا مرشدنا مولوی محمد قاسم صاحب مدظلہ نے اہل جلسہ کے سامنے درباب اثبات توحید ور سالت وحقانیت دین اسلام بہ دلائل عقلیہ بیان کی تھی چونکہ وہ تقریر اہل اسلام کے لئے موجب تسکین قلب ہے، اس لئے اس کا طبع کرنا ضروری جانا تاکہ ہر خاص وعام مستفید ہوں اور وہ تقریر بعینہ یہ ہے "حضرت فخر العلماء نے ترکی اور جواب ترکی والی بات نہیں کی بلکہ اس کا براہ راست کریڈٹ حضرت قاسم العلوم کو دیا جیسا کہ اس کے سرورق سے ظاہر ہوتا ہے، سرورق یہ ہے حجتہ الاسلام "از تصانیف مولانا محمد قاسم مرحوم، چونکہ کتاب تحذیر الناس اور تتمہ حجتہ الاسلام کے ساتھ شائع ہوئی، اس لئے پرنٹ لائن یہ ہے۔ حجتہ الاسلام (۱۳۰۸ھ) تحذیر الناس از تصانیف مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم ومغفور کہ فی الواقع فائز المرام خاص وعام ہے بہ اہتمام مولوی محمد عبدالاحد سلمہ طبع شد)

جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی کے صفحہ ۴۲۹ میں تحریر فرمایا ہے کہ رسالہ حجتہ الاسلام دراصل حضرت قاسم العلوم لکھکر اپنے ہمراہ لے گئے تھے، یہ تحریر ۱۲۹۴ھ کے شاہجہانپور کے جلسہ میں تقریر کے طور پر لکھی گئی تھی لیکن اس کی طباعت کیلئے سب سے پہلا قدم

مولانا فخر الحسن نے اٹھایا انہوں ہی نے اس کا نام حجتہ الاسلام تجویز کیا، مگر تحریر کو جلسہ میں پڑھنے کی نوبت نہیں آئی تھی، بہرحال رسالہ حجتہ الاسلام بھی مولانا فخر الحسن کی کوشش سے مطبع مجتبائی میں چھپا، جناب مولانا محمد یعقوب صاحب نے بھی سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ میں اسی تقریر کا ذکر فرمایا ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں کہ اس وقت میں نے یہ سنا تھا کہ غالباً حاجت کسی تحریر کے پیش نظر کرنے کی بھی ہوگی اس پر مولوی صاحب نے (حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ) وہیں بیٹھ کر کچھ تحریر کیا تھا، اور اس کا نام حجتہ الاسلام رکھا ہے وہ کتاب طبع ہوگئی ہے۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی جلد دوم کے صفحہ ۴۸۰، ۴۸۱ اور ۴۸۲ میں اس کتاب کی اہمیت کا تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ ”جہاں عمل کے لئے خدا شناسی کے ان میلوں سے روشنی ملتی ہے وہاں عجیب بات ہے کہ علم کے دائرہ میں ہم جن ”نظریات فائقہ“ کی تعبیر ”حکمت قاسمی“ سے کر سکتے ہیں، یا چاہیے کہ کریں، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی میلوں کی بدولت پہلی دفعہ وہ قلم بند ہوئے، میرا اشارہ سیدنا امام الکبیر کی مشہور تصنیف ”حجتہ الاسلام کی طرف ہے اس کتاب میں کیا ہے! ظاہر ہے کہ اس پر بحث کا موزوں ترین مقام تو سیرت طیبہ کے بعد کی جلد ہی ہو سکتی ہے جس میں آپ کے خصوصی نظریات کی ترتیب و تبویب کا کام کیا جائے گا، مختصر لفظوں میں سردست اس سلسلہ میں بس اتنی بات کافی ہے کہ اس کتاب کا خاص ایڈیشن (جناب مولانا گیلانی نے اس کا پہلا ایڈیشن مرتبہ فخر العلماء نہیں دیکھا تھا) جب شائع ہوا تھا تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ارقام فرمایا تھا کہ ”اس تحریر کی نسبت حضرت مولانا (سیدنا امام الکبیر) کی زبان مبارک سے یہ بھی سنا گیا کہ جو مضامین تقریر دل پذیر میں بیان کرنے کا ارادہ ہے وہ سب اس تحریر میں آگئے ہیں، اس قدر تفصیل سے نہ سہی بہ اجمال ہی سہی“ اس کے بعد کتاب کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”تائید احکام اسلام اور مدافعت خلیفہ قدیمہ وجدیدہ کے لئے جو تدبیریں کی جاتی ہیں ان کو بجائے خود رکھ کر حضرت خاتم العلماء (سیدنا امام الکبیر) کے رسائل کے مطالعہ میں کچھ وقت ضرور صرف فرمائیں اور پورے غور سے کام لیں اور انصاف سے دیکھیں کہ ضروریات موجودہ زمانہ حال کیلئے وہ سب تدابیر سے فائق و مختصر اور بہتر و مفید تر ہیں یا نہیں“ بظاہر ان

الفاظ کا تعلق اگرچہ عام رسائل سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ ترجحتہ الاسلام ہی کے افادی پہلوؤں کی طرف حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ان جامع ومانع الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف میں صرف اشارہ فرمایا تھا کہ حجتہ الاسلام کا مسودہ رواروی میں لکھا گیا تھا۔

لیکن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے حجتہ الاسلام کی دوبارہ اشاعت کے موقع پر جو دیباچہ تحریر فرمایا اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ معرکتہ الآرا تصنیف جسے حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قاسم العلوم کی مشہور تصنیف قرار دیا ہے ایک روز کامل اور کسی قدر شب میں بیٹھ کر مکمل ہوئی، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یہ ہیں "بندہ محمود حمد وصلوٰۃ کے بعد طالبان معارف الٰہیہ اوور دل دادگان اسرار ملت حنفیہ کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ ۱۸۷۶ء میں پادری نولس صاحب اور منشی پیارے لال صاحب ساکن موضع چاندپور متعلقہ شاہ جہاں پور نے جب ایک میلہ بنام میلہ خداشناسی موضع چاندپور میں منعقد کیا۔ اور اطراف وجوانب میں اس مضمون کے اشتہار بھجوائے کہ ہر مذہب کے علماء آئیں اور اپنے اپنے مذہب کے دلائل سنائیں اور اس وقت معدن الحقائق مخزن الدقائق مجمع المعارف، بحر اللطائف، جامع الفیوض والبرکات، قاسم العلوم والخیرات سیدی ومولائی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ متعنا اللہ معارفه نے اہل اسلام کی طلب پر میلۂ مذکور کی شرکت کا ارادہ ایسے وقت میں مصمم فرمایا کہ تاریخ مباحثہ، ۷ مئی سر پر آگئی، چونکہ یہ امر بالکل معلوم نہ تھا کہ مذاہب اور بیان دلائل کی کیا صورت تجویز کی گئی ہے، اعتراضات وجوابات کی نوبت آئے گی یا زبانی اپنے اپنے مذہب کی حقانیت بیان، یا بیانات تحریری ہر کس کو پیش کرنے پڑیں گے، تو بہ نظر اعتبار حضرت مولانا قدس سرہ کے خیال مبارک میں آیا کہ ایک تحریر جو اصول اسلام اور فروع ضروریہ بالخصوص جو اس بیان کے مناسب ہوں، سب کو شامل ہو، حسب قواعد عقلیہ منضبط ہونی چاہیے، جس کے تسلم میں عاقل منصف کو کوئی دشواری نہ ہو، اور کسی قسم کے انکار کی گنجائش نہ ملے۔ چونکہ وقت تنگ تھا، اس لئے عجلت کیسا تھ غالباً ایک روز کامل اور کسی قدر شب میں بیٹھ کر ایک تحریر جامع تحریر فرمائی۔"

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے اس بات کا انکشاف فرمایا ہے کہ حجتہ الاسلام کا یہ خصوصی ایڈیشن مطبع احمدی علیگڑھ میں چھاپا گیا، جناب گیلانی نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے

دیباچہ کا اقتباس پیش کرنے کے بعد تحریر فرمایا کہ "بہت سے واقعات تاریخ میں ایسے گزرے ہیں کہ جن کے دور رس نتائج کا اندازہ ان کے وقوع کے زمانہ میں نہیں کیا جا سکتا تھا، جو بعد کو لوگوں کے سامنے آئے۔ یہی حجتہ الاسلام کتاب لکھی تو گئی کل ایک دن اور ایک رات کے کچھ حصہ میں لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ اس کے مضامین سے دنیا کب تک کن کن حالات میں کس حد تک مستفید ہوتی رہے گی اور کتنوں کی دینی راتیں اس کتاب کی روشنی سے دن بنتی چلی جائیں گی۔(۱)

بہر حال یہ عظیم الشان علمی کارنامہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے حضرت فخر العلماء کی کوشش اور کاوش سے پہلی بار منظر عام پر آیا اور آپ نے اسے مطبع مجتبائی کے تعاون سے شائع فرما کر آئندہ آنے والی نسلوں کو اس کے استفادہ کا موقع فراہم کر دیا۔

۳۔ تتمہ حجتہ الاسلام

حضرت مولانا قاسم العلوم کی یہ تصنیف جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے ربوہ کے قادیانی کتب خانہ میں موجود ہے۔ اور راقم نے اس کی نقل وہاں سے حاصل کی ہے، نقل شدہ حصہ جسے راقم کے ایک ماتحت نے ربوہ کی لائبریری سے نقل کیا ۱۸۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔ آخر میں یہ نوٹ درج ہے کہ "واضح ہو کہ تقریر مولانا مرحوم کی بسیط ہے پہلے جس قدر اس کا حصہ ہم کو پہنچا تھا چھاپ کر پیش کش ناظرین کیا تھا، اب بقیہ تقریر مولانا ممدوح کی مولانا عبد الغنی صاحب کے ذریعہ حاصل ہوئی، اس کو بھی بطور تتمہ حجتہ الاسلام طبع کیا، افسوس ایک حصہ تقریر کا اب بھی باقی رہ گیا اور ہاتھ نہ لگا، ناچار جہاں تک کہ فقرہ ختم ہوتا تھا ختم کر دیا گیا، ناظرین معاف فرمائیں" حجتہ الاسلام کے جس خاص ایڈیشن کا تذکرہ جناب مناظر احسن گیلانی نے فرمایا اور جو بقول ان کے مطبع احمدی علیگڑھ میں چھپا اور مولانا انوار الحسن شیر کوٹی نے جس ایڈیشن کا تذکرہ انوار قاسمی میں کیا جو بقول ان کے مطبع قاسمی دیو بند میں چھپا اس کا راقم نے مطالعہ نہیں کیا جس سے پتہ چلتا کہ تتمہ حجتہ الاسلام کی یہ عبارت اصل کتاب میں شامل کر دی گئی ہے یا نہیں، بہر صورت حضرت فخر العلماء نے اس سلسلہ میں جو کاوش فرمائی اس کی نظیر نہیں ملتی۔

---

(۱) [illegible]

۴۔ انتصار اسلام

حضرت قاسم العلوم کا ایک اہم علمی کارنامہ ان کی وہ تقریریں ہیں جو روڑکی میں آپ نے پنڈت دیانند سرسوتی کے مقابلہ میں کیں اور جنھیں فخر العلماء نے انتصار اسلام کے نام سے شائع فرمایا ہے، جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ؒ اور دیانند سرسوتی کے عنوان سے انوار قاسمی کے صفحہ ۵۲۸/ میں تحریر فرمایا ہے کہ ۱۸۷۶ء اور ۱۸۷۷ء کے مباحثوں کے بعد (جو شاہ جہاں پور میں منعقد ہوئے) حضرت قاسم العلوم نے آریا مذہب کے بانی دیانند سرسوتی کا ناطقہ بند کیا۔ جس سے ۱۸۷۷ء کے مذہبی مباحثے میں شاہ جہاں پور سے انہیں شناسائی حاصل تھی، اور اس کی مذہب دانی کا اندازہ بھی خوب کرلیا تھا، ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء میں حضرت قاسم العلوم حج کو تشریف لے گئے، اور مارچ ۱۸۷۸ء میں واپس آئے ضیق النفس اور کھانسی کی بیماری آپ کو لاحق تھی اور سخت تکلیف رہتی تھی کہ اس اثنا میں روڑکی میں سرسوتی سے مناظرے کیلئے تشریف لے گئے، روڑکی میں دیانند کی آمد قاسم العلوم کا مناظرے کیلئے تشریف لے جانا اور دیانند کا پہلو تہی کرنا اسکی تمام تفصیلات "انتصار اسلام کی اشاعت" کے عنوان کے تحت تحریر فرمایا ہے کہ "۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۷ء میں روڑکی میں حضرت قاسم العلوم نے پنڈت دیانند سرسوتی کے اسلام پر اعتراضات کے جو جوابات لکھے تھے، ان کو بھی مولانا فخر الحسن صاحب نے ہی شائع کیا اور اس رسالے کا نام بھی انتصار اسلام رکھا۔"

اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ "کمترین فخر الحسن عفی اللہ عنہ خدمات عالیہ میں ناظرین رسالہ ہذا کی عرض پرداز ہے کہ یہ جو رسالہ جس کا نام انتصار اسلام کمترین نے رکھا ہے، مصنفہ جناب آیت من آیات اللہ حجۃ اللہ فی الارض سلطان الاذکیاء صوفی صافی غازی، حاجی حافظ مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم ومغفور طاب اللہ ثراہ کا ثمر ہے" اس عبارت میں جہاں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو صوفی صافی اور حاجی لکھا ہے وہاں غازی بھی لکھا جو شاملی اور تھانہ بھون کے جہاد کی طرف اشارہ کرتا ہے اور جو حضرت قاسم العلوم کے جہاد میں شامل ہونے کی مستند دلیل ہے، راقم کا خیال ہے کہ یہاں پر غازی سے ان کی وہ فتح وکامرانی بھی مراد ہے جو انہیں شاہ جہاں پور کے دو مذہبی مباحثوں میں حاصل ہوئی اور جہاں

سے وہ بقول مولانا محمد یعقوب صاحب فتح اور کامرانی کا علم لہراتے ہوئے واپس آئے،

اس رسالہ کا ایک ایڈیشن کتب خانہ اعزازیہ دیوبند نے شائع کیا ہے جس میں حضرت فخر العلماء کے دیباچہ کے ساتھ حضرت مولانا محمد میاں دیوبندی نے ضروری حواشی بھی تحریر فرمائے ہیں اور حضرت فخر العلماء کے دیباچہ سے قبل ایک التماس شائع کیا ہے، جس میں انتصار اسلام میں حواشی کی ضرورت کا اظہار فرمایا ہے، حضرت مولانا محمد میاں تحریر فرماتے ہیں کہ "مرجع الاساتذہ حجتہ الاسلام مجدد الملت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ العزیز کی دقت نظری، علمی تبحر اور کلام کی جامعیت اس سے بہت بالا ہے کہ بیان تحریر میں آسکے، لہٰذا ہم جیسے ناقص العلم جو سطحی نظر کے عادی ہیں اگر یہ دعویٰ کریں کہ یقیناً مولانا کی مراد کو پہنچ گئے تو حقیقت یہ ہے کہ اپنے تعلّی آمیز جہل مرکب کی کھلی ہوئی دلیل ہوگی اور پھر اس صورت میں مولانا کی تصانیف پر شرح یا حاشیہ لکھ کر عالم کے سامنے پیش کرنا تو گویا اپنی کم علمی کو طشت از بام کرنا ہے، مگر چونکہ میرے بعض اساتذہ نے رسالہ انتصار اسلام کی مختصر مگر اب حد سے زیادہ اور سخت دشوار خدمت کی انجام دہی کیلئے حکماً ارشاد فرمایا تو توکلاً علی اللہ اپنی ناقص استعداد اور ناکافی علم کے مطابق لکھ دیا، خاکسار کو نقصان استعداد بلکہ ناکارگی کا خود اعتراف ہے لہٰذا اگر غلطی ہو تو اہل علم سے درخواست ہے کہ یا تو مطلع فرما کر شکریہ کا موقع عنایت کریں اور یا چشم پوشی فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

بہرحال انتصار اسلام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار عالیہ میں ایک اہم حیثیت کا حامل رسالہ ہے، اس رسالہ میں ایک خوبی بھی ہے جس کا ذکر حضرت فخر العلماء نے خود فرمایا ہے، اور وہ یہ کہ اس رسالہ کے مضامین کو مکمل بنانے کیلئے انہوں نے اس میں اضافے کئے ہیں، حضرت فخر العلماء کے الفاظ یہ ہیں "انتصار اسلام میں دس اعتراضات کا جواب ہے اور بہ نظر مناسب بندہ نے پنڈت جی کے اس اعتراض کا جواب جو شاہ جہاں پور کے مباحثہ میں بہشت و دوزخ کے وجود پر کیا تھا اس رسالہ میں شامل کردیا ہے اور فرشتوں اور جنوں کے موجود خارجی ہونے کے ثبوت میں جو تقریر مولانا نے وہاں بیان فرمائی تھی اس کو بھی یہاں درج کردیا ہے۔

ان الفاظ سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ حکمت قاسمی کی جتنی روشنی حضرت فخر العلماء کے قلب پر تھی اور ان کے ذہن و فکر پر محیط تھی اس کا عشر عشیر حضرت قاسم العلوم کے کسی

اور شاگرد میں نہیں تھا، اس سلسلہ میں تقریر دل پذیر کے اس دیباچہ کی طرف بھی توجہ فرمایئے جس میں حضرت فخر العلماء نے فرمایا تھا، کہ اس بے نظیر تصنیف میں جو دو بحثیں نامکمل رہ گئی ہیں وہ اسے خود پورا کرنے کی کوشش کریں گے، یہ دعویٰ صرف وہ شخص ہی کرسکتا ہے جو علوم قاسمی کا صحیح نکتہ داں ہو اور بلا شبہ حضرت فخر العلماء صحیح معنوں میں حضرت قاسم کے علوم کے ترجمان تھے

۵۔ قبلہ نما

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے "سوانح عمری مولانا محمد قاسم "نانوتویؒ میں تحریر فرمایا ہے کہ "اس سال (۱۲۹۵ھ) شعبان میں روڑکی سے خبر ملی کہ پنڈت دیانند تشریف لائے ہوئے ہیں، اور مسلمانوں کے مذہب پر کچھ اعتراض مشتہر کئے ہیں، اہل روڑکی مولانا پر بضد ہوئے کہ آپ تشریف لائیں، مولانا باوجود ضعف اور مرض کے تشریف لے گئے اور بہت سے خادم ساتھ ہوئے اور اطراف وجوانب سے بہت سی مخلوق مولانا کی تقریر کے اشتیاق میں جمع ہوگئی، مگر وہ بندہ اللہ کا گفتگو پر پکا نہ ہوا اور اینڈی بینڈی شرطیں کرتا تھا جس سے عاقلان خود میدانند اس کی نیت سمجھ میں آتی تھی، آخر غرض وہ چلدیا اور مولانا نے وہاں ایک وعظ کیا اور اس کے اعتراضوں کے جواب ذکر فرمائے پھر واپس دیوبند تشریف لاکر رمضان وطن (نانوتہ) میں کیا اور اس عرصہ میں تحریر اس تقریر کی شروع کی جو اس کے جواب میں فرمائی تھی، اصل اعتراض اس کا استقبال قبلہ پر تھا کہ یہ بت پرستی ہے اس رسالہ کا نام قبلہ نما ہے، بہت بڑے پائے کا رسالہ ہے، حضرت فخر العلماء نے بھی جب اس کی اشاعت کا اہتمام فرمایا تو یہی لکھا کہ یہ رسالہ پنڈت دیانند سرسوتی کے ایک اعتراض کے جواب میں تحریر فرمایا تھا، آپ نے انتصار اسلام کے دیباچہ میں لکھا ہے" کہ خانہ کعبہ کے طرف سجدہ کرنے پر جو اعتراض ہے اس کا جواب چونکہ بہت شرح وبسط رکھتا ہے اس کو جناب مصنف مرحوم ہی نے ایک جدا رسالہ کردیا ہے اور اس کا نام قبلہ نما فرمایا کرتے تھے "اس دیباچہ میں آگے چل کر حضرت فخر العلماء فرماتے ہیں کہ القصہ انتصار اسلام گو عجیب رسالہ ہے مگر قبلہ نما عجیب وغریب ہے، غالباً کئی صدی سے کسی کان نے ایسے مضامین عالیہ نہ سنے ہوں گے اور نہ کسی کی آنکھوں نے دیکھے ہوں گے، زیادہ کیا عرض کروں ناظرین بعد ملاحظہ خود دیکھ لیں گے انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب قبلہ نما بھی طبع ہوکر شائع ہوتا ہے۔

اس رسالہ کی افادیت اور اہمیت کے بارے میں حضرت فخر العلماء کے ارشادات پہلے ہی پیش کیے جا چکے ہیں، مولانا مناظر احسن گیلانی نے اس دیباچہ پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ شاید قبلہ نما کے علاوہ حضرت قاسم العلوم نے باقی اعتراضات کے جواب بھی لکھے تھے، اور شاید وہ شائع ہو چکے ہیں اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں رسالہ انتصار اسلام کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، بہر حال انہوں نے حضرت والا کے جوابات کے بارے میں یہ لکھا کہ "گو ان تحریروں کا باعث تو پنڈت دیانند ہی ہیں مگر اس طرح حضرت قاسم العلوم نے حقائق و معارف کے مخفی خزانوں کو قبلہ نما میں وقف عام فرما دیا، جناب گیلانی نے لکھا ہے کہ بہر حال پنڈت جی کا مسلمانوں پر "کعبہ پرستی اور کعبہ کی دیواروں کے پتھروں کی پرستش و عبادت کا الزام" بجائے خود اس کی نوعیت جو کچھ بھی ہو ان کے علم و فضل، فکر و نظر کے متعلق جو رائے بھی اس اعتراض کے سننے والے قائم کریں لیکن ہم تو پھر بھی شکر گذار ہی ہیں کہ ان ہی کے بھڑکائے ہوئے شر سے خیر کا دروازہ ہم پر کھل گیا۔ سیدنا الامام الکبیر نے ان کی اسی مضحکہ خیز اپج کے جواب میں حقائق و معارف کے مخفی خزانوں کو قبلہ نما میں وقف فرما دیا" "اور اس ایک اعتراض کے جواب میں جو کچھ ارقام فرمایا گیا ہے وہی بیسیوں اعتراضوں کے جواب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اس سے اندازہ کیجئے، کہ اعتراض جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کل تین سطروں میں ختم ہو گیا لیکن متوسط تقطیع کے ایک سو سولہ (۱۱۶) صفحات صرف اسی ایک اعتراض کے جواب میں اسی لئے کافی ہوئے ہیں کہ سطریں حد سے زیادہ گنجان اور گھنی ہیں ورنہ عام کتابت کے لحاظ سے جہاں تک میرا تخمینہ ہے کم از کم تین سو صفحات سے کم میں یہ کتاب ختم نہیں ہو سکتی تھی۔(۱)

راقم کو اس بات کا بہت افسوس ہے کہ انتصار اسلام جیسی اہم تصنیف جس کو حضرت فخر العلماء نے مرتب کیا تھا اور خود ہی اس کا نام تجویز کر کے اول بار شائع فرمایا تھا سوانح قاسمی کی ترتیب کے سلسلہ میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کو فراہم نہیں کی گئی، اور اکابرین دار العلوم کے اس بورڈ (جو جناب گیلانی کی اس عظیم تصنیف پر نظر ثانی کے لئے مقرر کیا گیا تھا) نے بھی کتاب کی طباعت سے قبل مسودہ میں انتصار اسلام کی نشاندہی نہیں کی، حالانکہ اس قسم کی نشاندہی کے سوانح قاسمی میں متعدد نشان ملتے ہیں۔

(۱) سوانح قاسمی ج ۲ ص ۵۰۳

جناب گیلانی نے انتصار اسلام کی اشاعت کے بارے میں صرف قیاس سے کام لیا ہے حالانکہ یہ کتاب عام طور پر دستیاب ہے، جناب گیلانی نے سوانح قاسمی جلد دوم کے صفحہ ۵۰۲ میں ارقام فرمایا تھا کہ "سیدنا امام الکبیر نور اللہ قلوبنا انوار علومہ ومعارفہ نے جواب میں حقائق واسرار کے سر بمہر گنجینوں کو وقف عام فرمادیا صرف اسی اعتراض کا (کہ مسلمان ہندوؤں کو بت پرست کہتے ہیں اور خود ایک مکان کو سجدہ کرتے ہیں جس میں بہت سے پتھر ہیں، جو مسلمان جواب دیتے ہیں بعینہٖ بت پرست کہہ سکتے ہیں، اسلئے مسلمان بھی بت پرستوں سے کم نہیں) جواب قبلہ نما میں شائع ہوا ہے۔ جس کے مضامین پر بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے، کتاب اُردو میں ہے پڑھنے والے چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں۔ پنڈت جی کے باقی اعتراضات کیا تھے ان اعتراضوں کے جوابوں کو قلمبند کرنے کا موقع حضرت والا کو ملا یا نہ ملا اس کا پتہ نہیں چل سکا قبلہ نما کے دیباچہ کی مذکورہ بالا عبارت میں خصوصاً یہ ارقام فرما کر "ان کے جوابوں کو لکھ کر نذر احباب کروں" آگے یہ اطلاع جو دی گئی ہے کہ "الحمد للہ خدا تعالیٰ نے میرے ارادے کو پورا کیا۔ بظاہر اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس اعتراض کے سوا پنڈت جی کے دوسرے اعتراضوں کا جواب بھی زیر تحریر آچکا تھا لیکن کسی وجہ سے وہ شائع نہیں ہو سکا۔"

کاش انہیں پتہ مل جاتا کہ حضرت فخر العلماء نے نہ صرف یہ کہ ان دس اعتراضوں کے جواب کا نام انتصار اسلام تجویز فرمایا بلکہ اس کی اشاعت کا بندوبست بھی فرمایا اور اس رسالہ کے دیباچہ میں انہوں نے یہ بھی تحریر کیا کہ قبلہ نما عجیب وغریب ہے، غالباً کئی صدیوں سے کسی کان نے ایسے مضامین عالیہ نہ سنے ہوں گے اور نہ کسی آنکھوں نے دیکھے ہوں گے حضرت فخر العلماء نے قبلہ نما کے بارے میں اتنے زبردست الفاظ لکھنے کے بعد یہ ارقام فرمایا کہ زیادہ کیا عرض کروں ناظرین بعد ملاحظہ دیکھ لیں گے انشاء اللہ قبلہ نما بھی انتصار اسلام کی طرح طبع ہو کر شائع ہوا چاہتا ہے۔" ارباب دار العلوم دیوبند ہی اس بات کی وضاحت کر سکتے ہیں کہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کو حضرت قاسم العلوم کی سوانح ترتیب دینے کیلئے ضروری مواد کی فراہمی کے وقت کس بنا پر انتصار اسلام مہیا کرنے سے احتراز کیا گیا اور مسودہ کی وصولیابی کے بعد جب اس پر نظر ثانی کی گئی تو کن اسباب کے تحت مذکورہ بالا عبارت کی مناسب طور پر یا حاشیہ اور فٹ نوٹ کے ذریعہ جیسا کہ کئی مقامات پر ہو چکا ہے تصحیح نہیں کی گئی۔

۶۔ مباحثۂ شاہجہانپور

جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی کے صفحہ ۴۳ میں ارقام فرمایا ہے کہ موضع چاند پور ضلع شاہجہانپور میں ۱۸۷۶ء مطابق ۱۲۹۳ھ میں جو تحقیقات مذاہب کے سلسلہ میں جلسہ ہوا تھا اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے شرکت فرمائی تھی تو اس جلسہ کی پوری کیفیت منشی محمد حیات مہتمم مطبع ضیائی میرٹھ نے لکھ کر شائع کی، لکھتے ہیں کہ "مولوی محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ارادہ کیا اور ۵؍ مئی ۱۸۷۶ء کو بعد عشاء بمعیت مولوی فخر الحسن صاحب ساکن گنگوہ ضلع سہارنپور و مولوی محمود حسن صاحب ساکن دیوبند و مولوی رحیم اللہ صاحب ساکن بجنور ریل پر پہنچے" لیکن اسی موضع چاندپور میں جب اگلے سال ۱۹؍ ۲۰؍ مارچ ۱۸۷۷ء کو جلسہ ہوا تو اس میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے حقانیت اسلام پر جو تقریریں کیں اور عیسائیوں کے اعتراضات کا جواب دیا۔ اس کو بھی (یعنی پہلے سال کی روداد کے علاوہ) مولانا فخر الحسن صاحب نے مباحثۂ شاہ جہاں پور کے نام سے شائع کیا، حضرت فخر العلماء نے مباحثۂ شاہ جہانپور کو اپنے اہتمام سے پہلے ضروری اور تفصیلی حواشی کے ساتھ شائع فرمایا، راقم کی نگاہ سے اس کے دو ایڈیشن گزرے ہیں، جس کا ٹائیٹل ایک ہے صرف ایک ایڈیشن میں ۱۹۰۴ء کا سن پڑا ہے اور دوسرے پر ۱۹۱۴ء کا۔ ٹائیٹل کا مضمون یہ ہے۔

و کلمتہ اشرفی العلیا

الحمد اللہ والمنت کہ مجموعہ تقریرات اعتراضات مشہور بہ نزدیک و دور مباحثہ شاہجہاں پور کہ رئیس المتکلمین جناب سیدنا و مولانا مولوی محمد قاسم الخیرات در مجمع عام پنڈت دیا نند و منشی اندرمنی و پادری اسکاٹ مفسر انجیل و پادری نولس صاحبان وغیرہ در ۱۲۹۵ھ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بمقام شاہجہانپور کردہ اند۔ اس کے بعد صفحہ دو پر دیباچہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوا اس کے بعد یہ شعر ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب   گر دلیلت باید از وے رومتاب

اس کے بعد یہ الفاظ تحریر ہیں:۔ یا اللہ تیری ذات پاک سب پر محیط ہے اور سب پر غالب سب تیرے جویاں اور سب تیرے طالب، لیکن تیری معرفت وہم کی رسائی سے الگ، خیال کی بجالی سے پرے، قیاس کی وسعت سے باہر ہے اس لئے تیرے سچے رسول نے وہی خدا اوں

کی بندگی سے دنیا کو چھڑایا اور جو قدرتی اصول تو نے ہر انسان کے دل میں رکھدیئے ہیں ان کو شگفتہ کیا، تیرے کلام پاک نے ایمان بالغیب کی تعلیم دی اور تیری جانب رجوع کرنے کا ایسا طریقہ سکھایا جو فی الحقیقت ہماری بندگی اور تیری خدائی، ہمارے نقص اور تیرے کمال کے لئے شایان شان ہے۔ یااللہ تیرا سب سے پچھلا مگر سب سے افضل رسول جو تیرے مقدس کلام سے گویا ہوا اور جس نے تیری روشن ہدایت سے عقل کو نور اور دل کو سرور بخشا اس نے ایسا علم اور ایسی مستقیم راہ نسل انسانی کو بتائی ہے کہ انسان کے حق میں کامل رحمت اور اعلیٰ نعمت ہے علیہ ﷺ و آلہٖ واصحابہٖ اجمعین، لیکن طلب صادق اور شوق کامل درکار ہے۔ اب بھی نائبان رسول اور علماء فحول ایسے موجود ہیں کہ جن کا بیان منشائے الٰہی کی تفسیر اور علم انبیاء علیہم السلام کی تشریح ہے اور اس سے سامعین کے دل کو تشفی اور پڑھنے والوں کے قلب کو کامل خوشی حاصل ہوتی ہے، چنانچہ میلۂ خداشناسی واقع شاہجہانپور میں جو علماء اسلام و ہندو و عیسائیوں کا مباحثہ ہوا اس کی کیفیت ناچیز کمترین انام فخرالحسن نام اہل نظر کے روبرو پیش کرتا ہے" اس کے بعد حضرت فخرالعلماء نے میلہ خداشناسی کی پوری روداد سال گذشتہ کے واقعات اور متعلقہ تقاریر کو پیش کرنے کے بعد آخر میں یہ بتایا کہ آپ نے حسب ضرورت تقریروں کے سلسلہ میں ضروری حواشی لکھے ہیں ان کے الفاظ یہ ہیں، اب التماس راقم الحروف یہ ہے کہ کمترین نے تامقدور اصل حال میں کمی بیشی نہیں کی اس لئے جوبات ایسی تھی کہ کسی تقریر سے مستنبط ہوتی تھی یا اس کے مناسب تھی اس پر اس کے ذکر کی نوبت نہیں آئی تھی اس کو حاشیہ پر لکھ دیا ہے، البتہ اس وقت کے الفاظ یاد نہیں رہے اور نہ بہت سے مضامین کی ترتیب پر اطمینان ہو سکتا ہے۔ عجیب نہیں کہ تقدیم تاخیر ہوگئی ہو اطلاعاً عرض کر دیا کہ کسی صاحب کو اور کچھ احتمال نہ ہو مگر ہاں یہ جو کچھ عرض کیا ہے اس میں عمداً کوئی بات زیادہ کم نہیں کی۔

اس فٹ نوٹ سے بھی اس بات کا اظہار ہوتا ہے جس کا ذکر اس سے قبل تقریر دل پذیر اور حجتہ الاسلام کے سلسلہ میں ہو چکا ہے کہ حضرت فخرالعلماء کو علوم قاسمی کا صحیح ادراک تھا اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے استاد کے مضامین اور رسائل کی اشاعت کے موقع پر ضروری اضافے اور ضروری حواشی رقم فرمائے اور ان کے علاوہ کسی اور شاگرد قاسمی نے یہ جرأت نہیں کی۔

۷۔ گفتگوئے مذہبی

مولانا عبد الرؤف عالی نے دار العلوم اپریل ۱۹۶۷ء کے شمارے میں "حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہٗ کی تصانیف" کے سلسلہ میں اپنے مضمون کی جو آخری قسط شائع فرمائی ہے اس کے مطابق گفتگوئے مذہبی جس کا تاریخی نام میلۂ خدا شناسی ہے، پہلی بار ۱۲۹۲ھ میں طبع ہوئی، مضمون متذکرہ بالا کے بقول حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تصنیف اردو میں ہے اور ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے، مولانا عالی نے لکھا ہے کہ شاہ جہانپور کے ایک ہندو رئیس نے بغرض تحقیق مذاہب ایک مجلس مباحثہ منعقد کی تھی یہ اس مجلس کی تفصیلی روداد ہے جس میں حضرت قاسم العلوم دعوت اسلام پیش کرنے کیلئے تشریف لے گئے تھے۔

اس اجتماع میں آپ نے عیسائیوں کے اعتراضات کا مکمل رد فرمایا، پہلے عقائد اسلام کی وضاحت کی اور اس کے بعد نصاریٰ کے مسلک پر تقریر فرمائی دو روز مباحثہ جاری رہا، دوسرے روز مسئلہ تقدیر پر آپ کی مفصل تقریر ہوئی جس میں تثلیث کا رد کیا گیا، اور خدا کی ملوکیت کو بنائے تقدیر ٹھرایا اور اس کے دلائل بیان فرمائے، چونکہ یہ اس اجتماع کی تفصیلی روداد ہے اس لئے مستشرقین کے اعتراضات اور جزئی واقعات بھی قلمبند کئے گئے ہیں۔

غالباً یہ مولوی فخر الحسن کی صاحب کی تحریر ہے خود حضرت نانوتوی کی تحریر نہیں مگر اس میں آپ ہی کے مضامین عالیہ اور تقریریں درج ہیں جو اگرچہ تفصیل اور اس دقت نظری کی حامل نہیں جو آپ کے دوسرے مضامین میں ملتی ہیں مگر انداز اور اصول وہی ہیں جو آپ کے علوم اور معارف کیلئے مخصوص ہیں، زبان بھی اجتماع کی رعایت سے سہل استعمال کی گئی ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں یہ بات شبہ سے بالاتر ہے کہ اس تصنیف کا املاء حضرت مولانا فخر الحسن صاحب کا ہے اس لئے کہ راقم الحروف کے سامنے گفتگوئے مذہبی مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی سن ۱۳۲۴ھ کا جو نسخہ ہے اس کے صفحہ تین کی آخری سطر میں حضرت فخر العلماء کی شاہ جہانپور میں موجودگی اور حضرت قاسم العلوم کی وفات کا تذکرہ ہے، اور ناشرین کی حیثیت سے محمد ہاشم علی مہتمم مطبع ہاشمی اور محمد حیات مہتمم مطبع ضیائی کا نام درج ہے، مگر جیسا کہ اس زمانہ کا دستور ہے، مولف کی حیثیت سے کسی کا نام درج نہیں لہٰذا مولانا عالی کا یہ اندازہ بالکل صحیح ہے کہ اس تحریر کا املا حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی کا ہے جو ناشرین کے برعکس

شاہجہانپور کے اس میلہ خداشناسی میں حضرت قاسم العلوم کے ہمراہ تھے، اور خود انہوں نے مباحثہ شاہجہانپور کے صفحہ ۴ پر اس کا ذکر کیا ہے۔

۸۔ قاسم العلوم

جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے اس نام سے حضرت قاسم العلوم کے وہ دس مکاتیب جو رسالہ قاسم العلوم اول، دوم، سوم، اور چہارم، میں الگ الگ اور الگ الگ تاریخوں میں دہلی سے طبع ہوئے تھے، اور جن میں تین خط حضرت مولانا فخر العلماء کے نام تھے اب پاکستان میں یکجا طور پر مولانا انورالحسن شیرکوٹی کے اہتمام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان تمام خطوط کی زبان اس دور کے رواج کے مطابق فارسی ہے، مگر قاسم العلوم کی حالیہ اشاعت میں فارسی عبارت کے بالکل متصل اردو میں ترجمہ بھی موجود ہے جو حضرت شیرکوٹی کے قلم کی پیداوار ہے، لیکن مولانا سید عبدالرؤف عالی کے مضمون کے مطابق جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ حضرت فخر العلماء کے نام حضرت قاسم العلوم کے متذکرہ بالا تین خط قاسم العلوم کے نام سے ۱۲۹۳ء میں طبع ہو چکے ہیں یہ فارسی زبان میں ہیں اور ان کا موضوع حکمت شرعیہ ہے، مولانا عالی نے اپنے متذکرہ بالا مضمون میں لکھا ہے کہ "قاسم العلوم میں آپ کا ایک خط مکتوب نہم کے نام سے درج ہے جو مولوی فخرالحسن کے نام ہے، اس میں شہادت حسین رضی اللہ عنہ پر اہل سنت والجماعت کے نقطہ نظر سے تفصیلی بحث ہے، چند مقدمات قائم کر کے بالترتیب ہر مقدمہ پر تفصیلی گفتگو ہے، پہلے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کی مسلمہ حیثیت کے بارے میں روافض اور اہل سنت کا جو بنیادی اختلاف ہے اس کی وضاحت کی گئی ہے پھر نظریہ امامت، عزل ونصب، خلیفہ خلع بیعت معصومیت ائمہ اور ناقضین بیعت کی حیثیت اور واقعات کربلا کی نوعیت پر علمائے اہل سنت کی آراء بیان کی گئی ہیں۔ اس پوری بحث پر حضرت والا (مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ) نے پندرہ اصول اہل سنت کی جانب سے پیش فرمائے ہیں، محققانہ اور مجتہدانہ طرز نگارش پوری طرح نمایاں ہے، دوسرا خط مکتوب دہم کے نام سے انیس مضمون پر مشتمل ہے، اس میں مشہور شیعی محقق طوسی کے اعتراضات کا رد ہے عقلی ونقلی دلائل بڑی خوبصورتی اور دلنشینی کے ساتھ پورے خط میں موجود ہیں، گیارہواں خط ایک مشہور حدیث کی توضیح پر مبنی ہے اور سات صفحات پر پھیلا ہوا ہے، روافض نے اس حدیث کو جو غلط

معنی پہنائے ہیں ان کی تردید اور تاریخ و سیر کی روشنی میں صحیح مفہوم کی وضاحت کی ہے، اس خط میں اگرچہ آپ کے مخصوص کلامی رنگ کی جھلک کم ہے لیکن اپنی جگہ وزن ہے، مولانا شیرکوٹی نے متذکرہ بالا مکتوب نہم کا فارسی سے اردو میں جو ترجمہ فرمایا تھا وہ بھی ایک الگ مضمون کی صورت میں دارالعلوم میں شائع ہو چکا ہے اور راقم الحروف نے ان خطوط کا نسبتاً تفصیلی ذکر آگے چل کر کیا ہے جو اپنے مقام پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

۹۔ قصائد قاسمی

حضرت قاسم العلوم کی تصنیفات میں جن کا تعلق حضرت فخرالعلماء سے ہے یہ نویں تصنیف ہے جو حضرت قاسم العلوم کی ادبی اور شعری حیثیت کا لوہا منواتی ہے، یہ قصائد ابتداء میں حضرت فخرالعلماء کی زیرنگرانی ۱۳۰۹ء میں طبع ہوئے تھے، اور اس کا تذکرہ قصائد قاسمی کے صفحہ ۴؍اور ۵؍ میں موجود ہے، یہ تصنیف مکتب رشید یہ ملتان بیرون جوہر گیٹ نے باہتمام عبداللہ محمد قاسم ملتانی شائع کی ہے۔

جناب انوارالحسن شیرکوٹی کے مطابق "اس میں" ان تمام اردو، فارسی اور عربی اشعار کو شامل کر دیا گیا ہے جو حضرت قاسم العلوم کی تصنیف ہیں، اشعار تعداد میں ۳۹۲؍ ہوتے ہیں" ان میں سے پہلا قصیدہ بہاریہ ہے جو سرکار دوعالم تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہایت والہانہ انداز میں لکھا ہوا ہے اور جو عشق رسول میں سرتاپا محویت کا منظر پیش کرتا ہے، اس نعتیہ قصیدہ میں ایک سو اکیاون اردو اشعار ہیں دوسرا قصیدہ بھی اردو زبان میں سلطان عبدالحمید خان کی شان میں لکھا گیا ہے۔ اس قصیدہ میں ۵۶؍ اشعار ہیں جن کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت قاسم العلوم کو خلیفۃ المسلمین سے کتنی گہری عقیدت تھی، قصائد قاسمی کا تیسرا قصیدہ بھی خلیفۃ المسلمین کی شان میں ہے مگر اس قصیدہ کی زبان فارسی ہے اس قصیدہ میں ۴۹؍ اشعار ہیں اور ان میں بھی اردو قصیدہ کی طرح سلطان عبدالحمید خان سے والہانہ عقیدت و محبت کا اظہار کیا گیا ہے، چوتھا ایک اور قصیدہ ہے جو عربی زبان میں ہے یہ بھی سلطان مذکور کی توصیف میں ہے اور ۶۴؍ اشعار پر مشتمل ہے، پانچواں شجرہ خاندان چشتیہ صابریہ ہے جو فارسی اشعار میں مولانا نے لکھا ہے اور جس کے اول و آخر میں دعائیہ اشعار ہیں یہ منظوم شجرہ ۲۷ اشعار میں پھیلا ہوا ہے۔

اس کے علاوہ قصائد قاسمی میں تین عربی قصائد جو سلطان عبد الحمید خان کی شان میں ہیں حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، حضرت مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کے بھی شامل ہیں، قصائد قاسمی میں قصائد عربیہ کے عنوان کے تحت جو عبارت عربی میں درج ہے اس میں تحریر ہے کہ عربی قصائد حضرت مولانا فخر الحسن صاحب کی تحریک پر لکھے گئے ہیں اور اس عبارت عربی میں حضرت فخر العلماء کے نام کیساتھ جو القاب لکھے گئے ہیں، وہ کم از کم دو سطروں میں متعلقہ ہیں، عبارت کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔ "اب میں ان چند مدحیہ قصائد کا ذکر کروں گا جو دولت عالیہ (خلیفۃ المسلمین) کے ادائے شکر کے طور پر مدارس اسلامیہ کے متعدد علماء نے فاضل اجل وحید المثال، حضرت مولانا مولوی محمد فخر الحسن سلمہ اللہ تعالیٰ کے کہنے پر جنہوں نے ان حضرات میں دینی حمیت وغیرت کو بیدار کیا لکھے ہیں" ان تعریفی کلمات سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت فخر العلماء اپنے استاد اور بزرگوں کی نگاہ میں کس قدر قابل احترام تھے اور آپ کے مشوروں کو کس قدر منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا

۱۰۔ تحذیر الناس

میں اس سلسلہ میں دار العلوم دیوبند کے مفتی اعظم مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی کے اظہار خیال کے صرف اس حصہ کی نقل ہی پر اکتفا کروں گا جو اس کتاب سے متعلق ہے مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ "تحذیر الناس تصنیف کی گئی اور اس پر اعتراضات کئے گئے تھے۔ ان کے جوابات میں بھی مولانا حضرت فخر العلماء کے قلم نے خوب جوہر دکھائے اس رسالہ کی اشاعت کے موقع پر بھی فخر العلماء نے مفید حواشی لکھے ہیں۔

تربیت قاسمی کے ثمرات

حضرت قاسم العلوم نے جن افراد کو اپنے مخصوص نظریات کی ترویج واشاعت اور ہندوستان میں بقائے اسلام، اصلاح رسوم اور فرنگی حکومت اور اس کی زیر سرپرستی فرنگی مبلغوں اور پھر ان فرنگی اثرات کے تحت اپنے نظریات اور طرز زندگی بدلنے والے مسلمانوں کی تالیف قلوب اور سب سے بڑھ کر جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں میں جو ذہنی اور فکری

اضمحلال اور پستی، بے ہمتی، مایوسی اور یاس کا عالم طاری ہوگیا تھا، اس کو دور کر کے انہیں از سر نو فرنگیوں کے مقابلہ میں جو ہندوستان میں مسلمانوں کے اصلی دشمن اور سارے ہندوستان کو عیسائی بنانے کا عزم وارادہ رکھتے تھے تیار کرنے کے قاسمی پروگرام کو چلانے کیلئے تیار کیا تھا ان میں حضرت فخر العلماء کو ایک اہم مقام حاصل تھا، قاسمی پروگرام کے چار بنیادی مقاصد تھے۔

ا۔ فرنگی تسلط کے خلاف جد وجہد میں شرکت

پہلا پروگرام یہ تھا کہ جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ولی اللٰہی تحریک کی نئی خطوط پر ترتیب ہو تا کہ دار الحرب ہندوستان کو ایک بار پھر فرنگی تسلط سے آزاد کیا جائے، یہ کام مدرسوں کے ذریعہ ہوسکتا تھا کیونکہ نئے حالات میں براہ راست تحریک چلانا اور رضاکار تیار کرنا اور فوجی تیاریاں کرنا مناسب نہیں تھا، یہ کام اب مکتب میں بیٹھ کر اور مدرسوں کے درو دیوار کے سایہ میں ہوسکتا تھا جہاں نئے انقلاب کے کارکن آسانی کے ساتھ تیار کئے جاسکتے تھے، اور ان کے کردار وعمل کی اصلاح اور تربیت سے ایک ایسے گروہ کو پیدا کیا جاسکتا تھا، جو نئی تحریک کو ملک کے کونہ کونہ میں پھیلائے اور اپنے اپنے مقام پر داعی اور نقیب کا کام کرے اس پروگرام کی کامیابی کا یوں اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ برصغیر کی تحریک آزادی کے دو حلقوں میں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ میں حضرت قاسم العلوم کے نام لیوا صف اول میں شامل تھے، اور اس سے قبل ریشمی رومال اور خلافت کی تحریک ان کے نام سے سرخرو تھی۔

حضرت قاسم العلوم نے اس پروگرام کے تحت دار العلوم دیوبند قائم فرمایا اور اپنی کوشش اور کاوش سے دینی مدارس کا ایک جال ملک کے کونہ کونہ میں پھیلا دیا، ان کی ہی کوششوں کا ثمرہ تھا کہ ملک میں کم از کم دو ہزار دینی مدارس ایسے قائم ہوگئے جن کو براہ راست ان کے تربیتی پروگرام کا مرکز کہا جاسکتا تھا۔ حضرت قاسم العلوم نے اپنے اس تربیتی پروگرام کے آغاز میں دار العلوم دیوبند اور اس کے ملحقہ دینی اداروں کی قیادت اپنے تربیت یافتہ گروہ کے حوالے کی، دار العلوم دیوبند حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں، مدرسہ عربیہ گلاؤٹھی حضرت سید العلماء کی نگرانی میں اور مدرسہ قاسمیہ عربیہ نگینہ حضرت فخر العلماء کی نگرانی میں دیدیئے گئے۔ اور جب حالات نے تقاضا کیا کہ دہلی میں تربیتی مرکز قائم کئے جائیں تو سب سے پہلے فخر العلماء اور سید العلماء کو مدرسہ عبد الرب میں درس دینے کے لئے حوصلہ افزائی کی

گئی اور بعد میں یہ مدرسہ اپنے ایک اور شاگرد مولوی عبد العلی کے سپرد فرمایا۔

ان کے علاوہ خورجہ مراد آباد اور امروہہ میں حضرت سید العلماء کی نگرانی میں تین مختلف عربی مدارس کو کامیاب بنانے کیلئے حضرت سید العلماء کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا گیا، مولانا منصور علی خان کو منگلور کے مدرسہ میں مقرر فرمایا گیا۔ اور دار العلوم دیو بند کے ایک اور شاگرد اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کے حقیقی نواسے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری دار العلوم دیو بند کے بعد برصغیر کے دوسرے سب سے اہم دینی مدرسہ مظاہر العلوم کے صدر مدرس بنائے گئے اور حضرت فخر العلماء کو خورجہ بھیجا گیا۔ حضرت قاسم العلوم نے لمبی زندگی نہیں پائی مگر ان کی ۴۹ر سالہ مختصر مدت حیات میں اتنے بہت سے دینی مدرسوں کا قائم ہونا اور فرنگیوں کی بدگمانیوں، حوصلہ شکنی اور مخالفت کے باوجود جس میں ابنائے وطن کی کدورتوں کو بھی دخل حاصل ہے اتنے بڑے پیمانے پر کامیابی حاصل کرنا بلا شبہ قدرت خداوندی کا ظہور ہے، مگر یہ ظہور حضرت قاسم العلوم کی ذات بابرکات کی صورت میں نمایاں ہوا۔

حضرت فخر العلماء جب حضرت قاسم العلوم کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے تو وہ ہر طرح قاسمی پروگرام کی اس مشق کو کامیاب بنانے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتے تھے، اگر حضرت قاسم العلوم جنگ آزادی کے دوران اہل فرنگ کے مقابلہ میں توپ و تفنگ کے ساتھ ہی نہیں لسانی اور قلبی میدان میں بھی صف آراء تھے، اور اس بناء پر فرنگیوں کے معتوب قرار پائے اور فرنگی استبداد اور فرنگی وارنٹ سے بچنے کے لئے چھ ماہ روپوش ہوئے، اور اس عرصہ میں ان کی گرفتاری کی تمام کوششیں خدا کے فضل و کرم کے سبب کامیاب نہ ہوسکیں تو حضرت فخر العلماء بھی معتوبین فرنگ کی صف میں نمایاں مقام رکھتے تھے، وہ ایک ایسی عظیم المرتبت شخصیت کے نواسے تھے جس کو انگریزوں نے جنگ آزادی کا رکن رکین بلکہ محرک سمجھتے ہوئے توپ کے دہانے پر رکھ کر اڑا دیا، یعنی حضرت شاہ حسن عسکری شہید اور ان کے والد جو جنگ آزادی سے قبل اور اس کے دوران اپنے خسر کے سچے رفیق تھے، یعنی شاہ عبد الرحمٰن (اور جن کو محض اس بناء پر انگریزوں نے چھوڑ دیا کہ وہ موت و حیات کی کشمکش یعنی کینسر کے مہلک مرض میں گرفتار تھے) نے خاص طور پر اپنے بڑے بیٹے میں حریت کی ایسی لگن پھونک دی تھی کہ ان کے استاد اور حضرت قاسم العلوم کے رفیق درس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب

کو ان کے بارے میں (حضرت فخر العلماء) یہ لکھنا پڑا کہ وہ درشتگیٔ مزاج میں مولانا کے قدم بہ قدم بلکہ کچھ بڑھ کر تھے یہ درشتگیٔ مزاج، آزادی کی سچی لگن اور انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی کی شروع کرنے کی وہ تڑپ تھی جو حضرت قاسم العلوم کا خاص ورثہ تھی اور جس کا مظاہرہ حضرت والا کی اس تقریر سے ہوا جس کے باعث اکابرین دیوبند حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی زیر قیادت معرکہ تھانہ بھون اور معرکہ شاملی میں خوش دلی اور پورے جوش ایمانی کے ساتھ شریک ہوئے۔

حضرت فخر العلماء حلقۂ قاسمی میں شامل ہونے سے پہلے ہی جہاد آزادی کے ایک کارکن بن چکے تھے بلکہ اگر یوں کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ آزادی کی یہی لگن اور فرنگیوں کے خلاف ان کا یہی جذبہ انہیں گنگوہ سے دیوبند لے گیا ورنہ علمی میدان میں حضرت گنگوہی کی قربت اور موجودگی ان کیلئے دار العلوم دیوبند کے نعم البدل کا کام دے سکتی تھی، آزادی کا یہی جذبہ اور فرنگیوں کے استبداد کے خلاف جدوجہد کا یہی عزم انہیں گنگوہ سے دیوبند لے گیا جہاں حضرت قاسم العلوم کی محبت، توجہ اور تڑپ نے دو آتشہ کا کام دیا، یہی وجہ ہے کہ وہ حضرت قاسم العلوم کے شاگردوں میں جدوجہد اور جذبہ اور تربیت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہی تھے۔ دیوبند میں رہے تو آزادیٔ وطن کے جذبہ کے ساتھ اور اس کے بعد جب آپ کو آپ کے استاد نے نگینہ، دہلی، سہارنپور اور خورجہ بھیجا تو یہاں بھی آپ نے قاسمی پروگرام کی اس شق کے تکملہ کیلئے سرِدھڑ کی بازی لگادی اور درس وتدریس کے ذریعہ اپنے شاگردوں کو قاسم العلوم کا پیغام آزادی پہنچاتے رہے، دینی مذہبی مدرسوں کے قیام کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ نئی جنگ آزادی کیلئے مجاہد اور رضاکار تیار کئے جائیں بلکہ یہ بھی تھا کہ مسلمان نوجوانوں میں استعداد اور صلاحیت پیدا کی جائے تا کہ وہ تحریک آزادی کے ہراول دستے کی قیادت کرنے کے اہل بھی ثابت ہو سکیں، استعداد اور صلاحیت دار العلوم دیوبند اور اسکے ملحقہ دینی اور مذہبی اداروں کے نصابی پروگرام کا ایک جزو تھی جس کی بناء پر علماء کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جسے عام طور پر علماء حق کہا جاتا ہے اور جن کے کارناموں سے ہماری تاریخ آزادی عبارت ہے، حضرت فخر العلماء نے اپنی استعداد اور صلاحیت سے حضرت قاسم العلوم کے پروگرام کی اس بنیادی شق کو بھی کامیاب بنایا، آپ کی اپنی تصانیف اور پھر اپنے استاد گرامی کی تصانیف کی کماحقہ اشاعت اس میدان میں آپکی کامیابی کی دلیل ہیں۔

۲ عیسائی اور ہندو مبلغین کی یلغار کا کامیاب مقابلہ

فرنگیوں نے جنگ آزادی سے قبل محدود پیمانے پر (اسلیئے کہ وہ اس وقت تک براہ راست حکمراں نہیں بنے تھے اور جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ملک گیر پیمانے پر چونکہ اب وہ تمام ہندوستان کے بلاشرکت غیرے مالک و مختار تھے) ہندوستانی آبادی کو جس میں مسلمان بھی شامل تھے عیسائی بنانے کی کوشش کی۔ان کی اس ضمن میں ایک کوشش تو یہ تھی کہ پہلے انگریزی زبان کو فروغ دیا جائے پھر انگریزی کے مدارس کھول کر ہندوستانی نوجوانوں کو ذہنی اور عملی طور پر عیسائی بنایا جائے اور انہیں مغربی طرز حیات کا دلدادہ بنایا جائے اور آخر میں ملازمتوں کا لالچ دیا جائے تاکہ انگریزی اخبار نویسوں کے بقول جنگ پلاسی کی دوسری صدسالہ تقریبات کے موقع پر تمام ہندوستان عیسائی نظر آئے،اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کے بھی یہی مقاصد تھے،انگریزوں کے پاس اقتدار تھا،سرمایہ تھا، علوم جدیدہ کی نگاہیں خیرہ کرنیوالی تجلیاں تھیں،اس کے مقابلہ میں مسلمان شکست خوردہ، افلاس زدہ،مایوسیوں اور محرومیوں کے شکار اور سب سے بڑھ کر احساس کمتری میں مبتلا،حضرت قاسم العلوم نے اس کا ایک تدارک تو یہ کیا کہ انہوں نے دیوبند اور دوسرے مقامات پر مدارس قائم کئے،علوم قدیمہ کی افادیت واہمیت پر زور دیا اور تحریر و تقریر کے ذریعہ لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کی کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ضرور ناکام ہوئی ہے مگر اسلام کو شکست نہیں ہوئی، ان کا یہ پروگرام ”اپنی جدوجہد آپ کرو“ کے اصول پر ترتیب دیا گیا تھا جس میں سرکاری امداد کو قبول کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

حضرت قاسم العلوم اور ان کے ساتھیوں نے انتہائی بے سروسامانی کے باوجود محض اللہ کے توکل پر اپنے کام کو جاری رکھا،اور انہیں ان کے مشن میں کامیابی ہوئی مگر ایک میدان اس ضمن میں ایسا تھا جہاں انہیں حکومت وقت سے براہ راست ٹکر لینا پڑی یہ میدان تبلیغ کا میدان تھا،مگر یہاں بھی بہ ظاہر پلڑا عیسائی مبلغین کے حق میں تھا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ حلقۂ فاتحین میں شامل تھے،دوسرے یہ کہ انہیں وقت کے حکمرانوں کی حمایت حاصل تھی،تیسرے یہ کہ انگریزوں کا انصاف یعنی فرنگی عدالتوں کے جج بھی ان فرنگی مبلغین کی حمایت میں سینہ سپر تھے اور اسی حمایت میں وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے ہی انصاف کا گلا گھوٹنے

پر تیار تھے، چوتھے یہ کہ ان فرنگی مبلغین کے قبضہ میں ملازمتیں تھیں، نوکریاں تھیں، اعزاز و اکرام کی بارشیں تھیں، اس کے برخلاف مسلمانوں میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے مایوسی تھی، بے حسی تھی، پستی تھی اور ان کی قوت عمل اور قوت مدافعت نہ ہونے کے برابر ہو چکی تھی، لیکن اسکے باوجود حضرت قاسم العلوم اور ان کے شاگرد جن میں حضرت فخر العلماء سر فہرست ہیں جان پر کھیل کر سامنے آئے اور تحریر و تقریر کے ذریعہ عیسائی مبلغین اور ان کی شہ پر سرگرم عمل ہونیوالے ہندو مبلغین کے دانت کھٹے کر دیئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ رد نصاریٰ میں صرف حضرت قاسم العلوم اور ان کے شاگردوں ہی نے حصہ نہیں لیا بلکہ دوسرے مسلمان مبلغین بھی اس میں پیش پیش رہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ دہلی اور اس کے بعد شاہجہانپور، روڑکی اور میرٹھ کے مناظروں میں مسلمانوں کی کامیابی کا تمامتر انحصار حضرت قاسم العلوم پر رہا اور ان میں تواتر کے ساتھ حضرت فخر العلماء کا نام آتا ہے، اور یہی نہیں بلکہ ان معرکوں کی قلمی روادادیں مرتب کرنے اور ان معرکوں میں حضرت قاسم العلوم کی تحریروں اور تقریروں کو شائع فرما کر حضرت فخر العلماء نے وہ اہم اور عظیم کارنامہ انجام دیا ہے جس پر مسلمانوں کو بالعموم اور حضرات دیوبند کو بالخصوص حضرت فخر العلماء کا احسان مند ہونا چاہئے کہ آج حضرت قاسم العلوم کی وہ کاوش جو انہوں نے عیسائیوں کے خلاف انجام دیں ہماری تاریخ کا ایک اہم حصہ اسلئے بنی ہیں کہ ان کے شاگرد رشید نے ان کی تشہیر اور ترتیب کا کام انجام دے کر انہیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دیا۔

جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی کے صفحہ ۴۹۵ پر میں عیسائیت کی تبلیغ اور عیسائی مبلغین کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے اور جناب امداد صابری نے اس سلسلہ میں ایک مفصل اور مدلل کتاب بھی تصنیف فرمائی ہے مگر اس کا ہمارے موضوع سے تعلق نہیں، بہرحال اتنا ضرور عرض کرنا ہے کہ جن عیسائی مبلغین نے ہندوستان کے گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ میں جاکر تقریریں کیں ان میں جنگ آزادی سے قبل پادری رابرٹ کلاوک، پادری عماد الدین پانی پتی، پادری کالی چرن، اینڈریو گاوڈنی، پادری وارث الدین، تھامس ہنٹر، پادری دینا ناتھ، ڈاکٹر جے سی ارلنگر، پادری جی ایل ٹھاکر، ڈاکٹر تھوڈور لانٹن، پٹیل، پادری طالب الدین، پادری رام چندر، پادری نوٹس، پادری فنڈر، پادری اینگ کا نام قابل ذکر ہے، مگر چونکہ ہندوستان پر اس وقت تک انگریزوں کا مکمل تسلط نہیں ہوا تھا اس لئے مسلمانوں میں کلی طور پر احساس

شکست موجود نہیں تھا بلکہ عیسائیت کے خطرہ کا جیسے جیسے احساس شدید ہوتا تھا مسلمانوں میں عام طور پر اور مسلمان علماء میں خاص طور پر دین کی حفاظت کا جذبہ پیدا ہوتا جاتا تھا اور شاہ ولی اللہ اور ان کے فرزند اکبر شاہ عبد العزیز کے متبعین اور مقلدین اپنی سرگرمیوں میں تیزی کے ساتھ اضافہ کرتے جاتے تھے اور عیسائی مبلغین کے مقابلہ میں جن سرکردہ علماء نے حصہ لیا ان میں پروفیسر انوار الحسن شیر کوٹی کے بقول "شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی، مولانا آل حسن، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خان صاحب اکبرآبادی، مولانا اشرف الحق صاحب صدیقی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا ابو المنصور صاحب دہلوی کا نام قابل ذکر ہے۔

۱۸۵۷ء سے پہلے مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے کئی مناظروں میں جن میں آگرہ کا مناظرہ جو ۱۰/ اپریل ۱۸۵۸ء کو ہوا تھا شامل ہے پادری فنڈر کا قلع قمع کر دیا، لیکن جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد رد عیسائیت کی سرگرمیوں کا محور حضرت قاسم العلوم کی ذات گرامی تھی، جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے تو یہ فرمایا ہے کہ (انوار قاسمی ۴۹۷) حضرت قاسم العلوم بحیثیت مبلغ اسلام کسی معاملہ میں اپنے آپ کو پابند نہ رکھتے تھے، وہ اللہ کے مجاہد اور مبلغ تھے آج نانوتہ کل دیوبند، کچھ دن میرٹھ تو بعض ایام دہلی، دین کیلئے جہاں ضرورت پڑی دوڑ جاتے، اسی لئے دار العلوم دیوبند کا سب کچھ ہونے کے باوجود بحیثیت مستقل استاد کام کرنے کا انہوں نے کبھی ارادہ ہی نہیں رکھا، جہاں جاتے عشاق طالب علم ساتھ ہوتے ان عشاق شاگردوں میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے حضرت فخر العلماء بھی شامل تھے، آپ کا پہلا معرکہ پادری تاراچند سے بقول مولانا محمد یعقوب صاحب ۱۲۹۴ھ میں ہوا، حضرت مولانا محمد یعقوب کے بقول مولوی صاحب نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ تم بھی کھڑے ہو کر بازار میں کچھ بیان کرو اور جہاں لوگ بمقابلہ نصاریٰ بیان کرتے ہیں ان کی امداد کیا کرو، جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے یہ بات ذرا اور وضاحت سے بیان کی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ حضرت قاسم العلوم نے جب ان پادریوں کی یہ ڈھٹائیاں اور کلیلیں دیکھیں تو نہ رہا گیا، عموماً جہاں حضرت قاسم العلوم قیام پذیر ہوتے شاگرد بھی ہمراہ ہوتے تھے اور درس و تدریس کا سلسلہ وہیں جاری رہتا تھا۔

منعم بہ دشت و کوہ و بیابان غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

بہر حال شائقین علم اور عشاق شاگرد بھی خانہ بدوشوں کے ہمراہ ہوئے، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ قاسم العلوم نے اپنے شاگردوں کو عیسائیوں کے جواب کیلئے فرمایا کیونکہ ان کو اس مقصد کیلئے مناسب سمجھا لیکن جب شاگردوں کے جوابات کا سلسلہ عیسائیوں کے مقابلہ کیلئے چل نکلا تو حضرت قاسم العلوم تک نوبت پہنچی (انوار قاسمی صفحہ ۴۹۹) مولانا محمد یعقوب صاحب نے سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی ﷺ میں فرمایا کہ آخر مباحثہ کی ٹھہری اور مولوی محمد قاسم صاحب بے کسی کی شکل وصورت بنائے اور اپنا نام چھپا جاتا موجود ہوئے، ایک پادری تاراچند تھا اس سے گفتگو ہوئی اور آخر وہ بند ہوا اور گفتگو سے بھاگا، یہ دراصل حضرت فخر العلماء کی مناظروں میں شرکت کا نقطہ تھا آغاز اور اسی کام کے لئے خاص طور پر قاسم العلوم نے انہیں تیار کیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت قاسم العلوم مجموعہ خطوط قاسم العلوم کی تصحیح کے سلسلہ میں دہلی میں منشی امتیاز علی صاحب کے یہاں مقیم تھے اور بقول جناب امیر شاہ خاں صاحب مصنف امیر الروایات "مولوی فخر الحسن گنگوہی اور مولوی احمد حسن امروہی کی وجہ سے اکثر مدرسہ عبد الرب میں جہاں یہ دونوں شاگرد مدرس تھے، اور مقیم تھے قیام فرمایا کرتے تھے۔"

حضرت قاسم العلوم کا دوسرا معرکہ عیسائی اور ہندو مبلغین سے ۷/۸ رمئی ۱۸۷۶ء کو چاند پور ضلع شاہجہاں نپور میں ہوا، جہاں ان کا مقابلہ پادری نولس ماسٹر شاہجہانپور اسکول، پادری مولا داد خاں، پادری اینک، مسٹر جوٹل اور پیارے لال کبیر پنتھی وغیرہ سے ہوا، حضرت قاسم العلوم اس مباحثہ میں شرکت کیلئے ۵ رمئی کو بعد عشا بہ معیت مولوی فخر الحسن صاحب ساکن گنگوہ ضلع سہارنپور و مولوی محمود حسن صاحب ساکن دیوبند ضلع سہارنپور و مولوی رحیم اللہ صاحب ساکن بجنور (ہر سہ شاگردان قاسمی) ریل پر پہنچے" (۱)

آپ ۶ رمئی کو شاہ جہانپور پہنچے اور ۷ رمئی کو تقریر فرمائی، آپ کی دوسری تقریر ۸ رمئی کو ہوئی اور اسی روز تیسری بار بھی تقریر فرمائی اور اس طرح میدان جیت لیا، اس کا ثبوت وہ اخباری رپورٹ ہے جو اخبار خیر خواہ عالم دہلی کی اشاعت مورخہ ۱۹ رمئی میں شائع ہوئی، یہ اخبار دہلی محلہ بلبلی خانہ سے ۱۸۷۳ء میں نکلنا شروع ہوا تھا مہینہ میں تین بار یعنی ۵/۱۵ اور ۲۵ رکو نکلتا تھا مالک اس کے سید میر حسن رضوی اور ایڈیٹر شہزادہ عبد الغنی تھے،

---

(۱) انوار قاسمی ص ۵۰۱

اور مطبع احمدی سے شائع ہوتا تھا میلہ خداشناسی کی رپورٹ یہ ہے کہ "۷؍ مئی ۱۸۷۶ء کو شاہجہانپور میں میلۂ خداشناسی منعقد ہوا کئی روز پیشتر اخباروں میں میلہ مذکورہ کے باب میں اشتہارات مشتہر کرائے گئے تھے اس لئے اس کی شہرت سن کر دور دراز دیار واقصاب سے خلقت جمع ہوگئی اور ہر ایک ملت ومذہب کا متنفس اس جلسہ میں موجود تھا، علمائے اسلام کی طرف سے مولانا محمد قاسم صاحب مولوی ابوالمنصور امام مناظرہ ومرزا جالندھری، احمد علی دہلوی، مولوی نعمان صاحب وکیل سرکار، مولوی رنگین صاحب بریلوی وغیرہ اور ہندوؤں میں سے کبیر پنتھی پیارے لال اور برہمن سماج وغیرہ کے بہت سے لوگ موجود تھے اژدہام خلقت کا قریب چار ہزار ہوگا اور انتظام میلہ کا جناب مولوی موتی میاں صاحب رئیس اعظم شاہجہانپور کے متعلق تھا، مولوی صاحب موصوف کا حسن انتظام قابل تحسین تھا کہ کسی متنفس کو کسی امر کی تکلیف نہ ہونے پائی، ہر شخص کو آب ونان سے سیر کیا، ایک طرف اہل اسلام کا خیمہ افتادہ تھا، اور اہل اسلام بلند آواز سے اذان نماز کی دے کر اپنے مذہب کی رسومات ادا کرتے تھے اور نماز پڑھتے تھے، اور ایک طرف پادری نولس عیسائیوں کے ساتھ خیمہ زن تھے اور گرجا کرتے تھے، دوسری جانب کٹر پنتھیوں کا غول اترا ہوا تھا وہ لوگ گاتے مرلی اور بین بجاتے علیٰ ہذا اپنے اپنے مذاہب کی رسومات بے روک ٹوک ہر شخص ادا کر رہا تھا، ایک بڑا عالیشان خیمہ پہلے ہی سے لگا ہوا تھا جس کے اندر ہزاروں کرسیاں ودریاں تھیں، اہل اسلام کے مقابلہ میں عیسائی لوگ تھے، پادری نولس صاحب نے افتادہ ہوکر لوگوں کو اپنے مذہب کے فضائل سنائے اور بطور خلاصہ کے جناب مولوی موتی میاں نے قلمبند کئے "پندرہ منٹ اور دس منٹ گفتگو کرنے کی اجازت ہر ایک شخص کو دی گئی، پادری صاحب کے درس کا خلاصہ یہ تھا کہ خدا ایک اور خدا کی قدرت سے انجیل تمام دنیا میں مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر پھیل گئی اور برخلاف دین محمدی کے اس مذہب کی کتاب اتنی نہیں پھیلی، مرزا جالندھری نے کہا کہ میں پنجاب کا باشندہ ہوں میلہ کا نام سن کر آیا ہوں سو آج نہایت مبارک دن ہے کہ ہم سب ایک جگہ جمع ہو کر مذہب کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں اور پادری صاحب نے جو دعویٰ کیا کہ انجیل تمام دنیا میں جمع ہو کر پھیل گئی ہے پس پھیلنا ہر ایک شے کا دو طور سے ہوتا ہے روحانی اور ظاہری، سو پادری صاحب فرماویں کہ انجیل کس طور سے پھیلی۔

پادری صاحب نے کہا روحانی طور پر، مرزا موصوف نے فرمایا کہ ہم کیونکر سمجھیں کہ وہ روحانی طور پر پھیل گئی کیونکہ اس میں کوئی روحانی بات نہیں پائی جاتی، اس کے علاوہ جناب نولس اپنے مریدوں کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں کہ تم ابھی سے دوسری خوشخبری یعنی انجیل کی طرف مائل ہو گئے ہو اور حواریوں کی عین حمایت میں کوئی کہتا تھا کہ میں نولس کا ہوں اور کوئی کہتا کہ میں یوحنا کا ہوں مسیح کا کوئی نہیں کہتا تھا، زمانہ متزلزل میں بہت خونریزیاں ہوئیں۔ لوتھر مصلح مذہب عیسائی کے خلاف پوپ دوم کا وعظ کہتا تھا، قریب تین کروڑ کے عیسائی قتل ہو کر نیا فرقہ پروٹینٹ کا ایجاد ہوا، اب جو عیسائیوں کے ہاتھ بہت سے زرخیز ملک آئے خصوصاً ہندوستان وغیرہ تو کیسے انجیل نہ پھیلے سوائے ظاہر طور کے اور کوئی برکت روحانی طور پر ہم کو دکھلائی نہیں دیتی، پھر ایک وکیل صاحب نے جن کا اسم مبارک ہم بھول گئے تائید اسلام میں نہایت عمدہ گفتگو کی، ہندوؤں کی طرف سے پنڈت اجودھیا پرشاد صاحب ڈپٹی کلکٹر نے از حد شستہ تقریر کی جس کا جواب عیسائیوں سے اس وقت نہ بن پڑا، پیارے لال کبیر پنتھی نے ایک درس کیا اور کبیر کی پیدائش کنول کے پھول سے عجیب طور پر بیان کی اور اس کی تردید عیسائیوں نے خوب کی، ابوالمنصور صاحب اور علماء کی تقریر جو باعث طوالت ہے ہم نہیں لکھ سکے، ۸/ مئی سن فال کے جلسہ میں مولانا محمد قاسم صاحب نے درس دیا اور فضائل اسلام بیان کئے، پادری صاحب نے تثلیث کا بیان عجیب طور سے ادا کیا اور کہا کہ ایک خط میں تین اوصاف پائے جاتے ہیں طول، عرض عمق، سو تثلیث ہر طرح سے ثابت ہے، مولوی موصوف (مولانا محمد قاسم صاحب) نے اس کو اسی وقت رد کر دیا، پھر مولوی صاحب اور پادری صاحب تقریر کے معاملہ میں بحث کرتے رہے اس میں جلسہ برخاست ہو گیا۔

تمام قرب وجوار میں اور چاروں طرف شور وغل مچ گیا کہ مسلمان جیت گئے جہاں ایک عالم اسلام کا کھڑا ہوتا اس کے اردگرد ہزاروں آدمی جمع ہو جاتے، اول روز کے جلسہ میں جو اعتراضات اہل اسلام کے تھے، ان کا جواب عیسائیوں نے کچھ نہ دیا مسلمانوں نے عیسائیوں کے جوابات حرف حرف دیئے اور فتح یاب ہوئے، سچ ہے آفتاب کے مقابلہ میں چراغ کو کہاں فروغ ہوتا ہے، روسائے شہر شاہجہانپور نے نہایت حسن انتظام کیا اس اژدھام میں کسی اہل مذہب کو کسی نوع کا کچھ صدمہ نہ ہوا۔"

حضرت قاسم العلوم مناظر بھی تھے اور مبلغ بھی چنانچہ انہوں نے اس موقع پر آئے ہوئے ہزارہا اشخاص کے مجمع کو جن میں پادری بھی شامل تھے اسلام لانے کی تبلیغ کی اور بعدہٗ مولوی (محمد قاسم) صاحب نے واعظین سے فرمایا کہ میلے میں متفرق ہو کر وعظ بیان کرنا چاہئے۔ چنانچہ واعظین نے بجز مولوی ابوالمنصور علی صاحب کے علی الاعلان منادیٔ اسلام اور رد عیسائیت کرنا شروع کیا اور قبل مغرب تک (۷/مئی کی روداد میلہ خداشناسی کے مطابق) تمام میلے میں عجیب کیفیت رہی اور عنایت ایزدی سے کوئی پادری مقابل نہ ہوا خدا معلوم کیوں جان چرائے پڑے رہے" دوسرے دن یعنی ۸/مئی کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روز بھی مجلس مناظرہ سے قبل مولانا محمد قاسم صاحب اور رفقائے مجلس مناظرہ نے باقاعدہ جلسہ کی کاروائی سے پہلے موقع پا کر حسب تجویز مولانا محمد قاسم صاحب سب نے متفرق ہو کر لوگوں میں اسلام کی تبلیغ اور منادی کی"۔

تیسرا معرکہ

حق وباطل کا وہ تیسرا معرکہ جس میں حضرت قاسم العلوم کو عیسائی اور ہندو مبلغوں کے مقابلہ میں کامیابی ہوئی شاہجہانپور کا دوسرا میلۂ خداشناسی تھا، جو ۱۹/اور ۲۰/مارچ ۱۸۷۷ء کو منعقد ہوا، جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی کے صفحہ "۵/میں ارقام فرمایا ہے کہ" ہرسال کی طرح منشی پیارے لال نے پھر مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے علماء، پادریوں اور پنڈتوں کو دعوت اور اشتہار بھجوائے، اس سال کے مباحثے کی رپورٹ مولانا فخر الحسن گنگوہی تلمیذ قاسم العلوم نے مباحثہ شاہجہانپور کے نام سے چھپوائی، وہ خود بھی اس میں شامل ہوئے تھے اور پچھلے سال بھی گئے تھے "بقول حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی حضرت قاسم العلوم، مولوی ابوالمنصور دہلوی اور دس بارہ اور بھی ان کے ساتھ کچھ شوقین کچھ مناظرین دلی سے شاہ جہاں پور کو روانہ ہوئے اور ۱۷/مارچ ۱۸۷۷ء کو شاہجہاں پور پہنچے، اس کے بعد مولانا فخر الحسن بتاتے ہیں کہ سب لوگ مولانا عبد الغفور سلمہ اللہ تعالیٰ کے مکان پر گئے اور ۱۸/مارچ کو آرام کیا ۱۹/مارچ کو مناظرین اہل اسلام اخیر رات سے اٹھ کر میدان مباحثہ کی جانب روانہ ہوئے۔

حضرت فخر العلماء فرماتے ہیں کہ "اور سب صاحب سوار مولوی محمد قاسم صاحب

پاپیادہ (موضع سرہانگ پور متصل موضع چاندپور ضلع شاہجہانپور) طلوع آفتاب سے کچھ بعد پہنچے، مولوی محمد قاسم صاحب نے ضروریات سے فراغت حاصل کر کے وضو کیا اور نوافل ادا کیے اور نہایت خشوع وخضوع سے دعا مانگی، کیونکہ مولوی صاحب دلی سے برابر یہی ہر شخص سے فرماتے آئے تھے کہ اس بے نیاز سے دعا کرو کہ کلمہ حق غالب آئے، آپ نے بعد عصر ۱۹ مارچ کو پہلا وعظ فرمایا، اس کے بعد پادری محی الدین سیتاپوری کے جواب میں ایک اور تقریر فرمائی یہ تقریر مجمع کی وجہ سے شامیانے سے باہر میدان میں فرش پر ہوئی۔

حضرت فخر العلماء نے انتصار اسلام میں تحریر فرمایا ہے کہ عصر کے بعد نماز پڑھ کر آپ نے ایک گھنٹہ تک ایسا زور و شور کا وعظ کیا کہ تمام جلسہ حیران رہ گیا اور ہر شخص پر ایک سکتہ کا عالم تھا (کیوں نہیں ہوتا جب آپ اور آپ کے رفقاء دہلی سے برابر کلمہ حق کے غالب ہونے کی دعا مانگتے آئے تھے) وہاں سے واپس آنے کے بعد آپ نے رسول کریم ﷺ کی فضیلت پر تقریر فرمائی، دوسرے روز دو جلسے ہوئے پہلا جلسہ (۸) بجے سے (۱۱) بجے تک، دوسرا جلسہ ایک بجے سے چار بجے تک، اس روز بھی آپ نے تین تقریریں کیں یہاں تک کہ میلہ کے خاتمہ کے بعد آپ نے ساتویں بار تقریر فرمائی اور سوامی دیانند اور پادری صاحبان میدان سے فرار ہونے پر مجبور ہوئے، جناب مولانا محمد یعقوب نے سوانح عمری حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ میں لکھا ہے کہ ''حتی کہ پادری لوگ عین جلسہ میں سے ایسے بے سروپا بھاگے کہ ٹھکانہ نہ معلوم ہوا اور اپنی بعض کتابیں بھی بھول گئے، اس جلسے سے جناب مولانا محمد قاسم صاحب کامیاب واپس آئے اور نصرت دین اسلام کی ہمیشہ کیلئے ثابت ہوگئی اور فتح دین اسلام ان کی ذات سے پوری ظاہر ہوئی۔''

چوتھا معرکہ

حضرت قاسم العلوم کا چوتھا معرکہ حق جس میں انہوں نے پنڈت دیانند کو دوسری بار راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا روڑکی میں ہوا، جس میں حضرت قاسم العلوم کے تینوں معرکوں کی طرح حضرت فخر العلماء اول سے آخر تک شریک تھے۔ اور انہوں نے اس کی روداد انتصار اسلام کے نام کے ساتھ شائع فرمائی، یہ معرکہ ۱۲۹۵ء مطابق ۱۸۷۸ء میں حضرت قاسم العلوم کی وفات سے تقریباً دو سال قبل ہوا تھا۔ اور اس میں آپ علالت ونقاہت

کے باوجود شریک ہوئے تھے، ابتداء میں حضرت قاسم العلوم کی رائے تھی کہ سوامی دیانند کے مقابلہ میں ان کے شاگرد جائیں مگر وہ اس پر تیار نہیں ہوا اور کہا میں صرف مولوی قاسم صاحب سے مقابلہ کروں گا۔ اسی پر دریافت احوال کیلئے حضرت قاسم العلوم نے حضرت فخر العلماءؒ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور مولوی حافظ عبد اللہ کو حکم دیا کہ وہ روڑکی جا کر حالات کا جائزہ لیں۔ یہ تینوں شاگرد مولوی منظور علی جوالاپوری کے ہمراہ روڑکی گئے اور سوامی دیانند سے ملے حضرت فخر العلماء نے فرمایا کہ جمعہ کی نماز کے بعد ہم چاروں معہ چند اشخاص اہل روڑکی پنڈت جی کی کوٹھی پر جو سرحد چھاؤنی میں تھی گئے، ہمارے ہمرائیوں میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ پنڈت جی اپنے اعتراضوں کا جواب ان لوگوں سے سن لو یہ لوگ اسی لئے آئے ہوئے ہیں پنڈت جی نے کہا کہ میں نہیں سنتا نہ مجھے فرصت ہے نہ میں گفتگو کا آرزومند ہوں اور نہ میں نے اشتہار میں مباحثہ کی خواستگاری کی۔ کسی نے میری اطلاع کے بغیر اگر اشتہار چسپاں کر دیا ہو تو مجھے خبر نہیں ہر چند ہم لوگوں نے اصرار کیا مگر پنڈت جی نے نہیں نہیں کے سوا کچھ نہیں کہا۔ اس ردوبدل میں پنڈت جی کئی بار ایسے لئے گئے کہ دم بخود ہونا پڑا پھر ہم نے پنڈت جی سے یہ دریافت کیا کہ آپ جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب کے ساتھ مباحثہ کرنے پر تو راضی ہیں یا ان سے بھی راضی نہیں، پنڈت جی نے کہا کہ میں خوامخواہ متقاضی اس امر کا نہیں ہوں لیکن اگر جناب مولانا ممدوح تشریف لے آئیں تو مباحثہ کیلئے آمادہ ہوں اور کسی سے تو مباحثہ نہیں کروں گا، وجہ اس تخصیص کی پوچھی تو کہا کہ میں تمام یورپ میں پھرا ہوں اب تمام پنجاب میں پھر کر آیا ہوں ہر اہل کمال سے مولانا کی تعریف سنی ہے، ہر کوئی مولانا کو یکتائے روزگار کہتا ہے اور میں نے بھی مولانا کو شاہجہانپور کے جلسہ میں دیکھا ہے ان کی تقریر دل پذیر سنی ہے، اگر آدمی مباحثہ کرے تو کامل یکتائے روزگار سے کرے جس سے کچھ فائدہ ہو کچھ نتیجہ نکلے۔ حضرت فخر العلماء اس ملاقات کے بعد دیوبند گئے اور حضرت قاسم العلوم روڑکی آئے حضرت فخر العلماء حضرت قاسم العلوم کے حکم پر منگلور بھی گئے اور مولانا منصور علی کو بلا کر لائے مگر سوامی دیانند نے مناظرہ کرنے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ روڑکی ہی سے فرار ہو گئے، مجبوراً حضرت قاسم العلوم کو ان کے بغیر اہل روڑکی کے سامنے تین تقریریں کرنا پڑیں جن میں سوامی دیانند کے اعتراضات کا جواب اور اسلام کی حقانیت پر دلائل تھے، حضرت قاسم العلوم نے روڑکی میں خود تقریریں

ہی نہیں کیں بلکہ اپنے شاگردوں کو حکم دیا کہ وہ بھی روڑکی میں جابجا تقریریں کریں اور پنڈت جی کے اعتراضات کا جواب دیں۔

حضرت فخر العلماء نے انتصار اسلام میں لکھا ہے کہ ادھر تو پنڈت دیانند حضرت قاسم العلوم سے مناظرہ کرنے میں پہلو تہی کر رہے تھے ادھر مولانا کا ہم لوگوں کو شہر میں وعظ کہنے کا حکم ہوا، حضرت فخر العلماء فرماتے ہیں کہ ”ادھر تو یہ قصہ ہوا اور ادھر جناب مولانا نے ہم لوگوں کو حکم دیا کہ بازار میں کھڑے ہو کر پکارنے لگو اور کہہ دو (یعنی پکار پکار کر کہدو) کہ پنڈت جی پہلے تو بہت زبان درازیاں کرتے تھے، اب زبان درازیاں کہاں گئیں ؟ ذرا مردوں کے سامنے آئیں کوٹھی سے باہر نکلیں اور یہ فرمایا کہ پنڈت جی کے اعتراضوں کے جواب علی الاعلان بیان کردو چونکہ یہ کام کچھ ایسا مشکل نہ تھا جناب مولوی محمود حسن صاحب اور مولوی حافظ عبد العدل صاحب کو تکلیف کرنی پڑتی اس لئے بندہ نے اس کی تعمیل کردی، یعنی پنڈت جی کے اعتراضوں کے جواب علی الاعلان کئی روز تک بیان کئے اور پنڈت جی کے مذہب جدید پر، بہت سے اعتراضات کئے اور بہت ہی غیرت دلائی، اگرچہ مجمع عام میں پنڈت جی کے متعدد شاگرد بھی ہوتے تھے لیکن کسی کو اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ لب کشا ہو نہ اتنی غیرت آتی کہ پنڈت جی کو کشاں کشاں میدان میں لاتے اور اسی مضمون کے اشتہار بازاروں میں چسپاں کر دیئے۔“

حضرت قاسم العلوم کا پانچواں اور آخری معرکہ

سوامی دیانند روڑکی سے فرار ہو کر میرٹھ پہنچے اور حضرت قاسم العلوم میرٹھ والوں کے بلانے پر میرٹھ تشریف لے گئے، مگر یہاں بھی انہوں نے حضرت قاسم العلوم کے مقابلہ میں آنے سے گریز کیا۔ جناب مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ”پھر پنڈت دیانند کہیں پھر پھرا کر میرٹھ پہنچے اور وہاں بھی ان کے وہی دعوے تھے، واقعی جسے شرم نہ ہو جو چاہے کرے۔ اتفاقاً جناب مولوی صاحب بھی ان دنوں میرٹھ کا ارادہ فرما رہے تھے کہ وہاں کے بعض صاحبوں نے بلانے کی تحریک کی، غرض مولانا میں ہر چند مرض کے غلبہ اور ضعف کے سبب قوت نہ تھی مگر ہمت کر کے پہنچے تو وہ بہانہ اور حیلہ کر کے وہاں سے کافور ہو گیا وہاں بھی اس کا جواب مولانا نے ایسے ہی کچھ بیان کیا“ حضرت قاسم العلوم کے ان معرکوں میں

حضرت فخر العلماء کا چار میں شرکت فرمانا اور ان میں سے تین مباحثوں کی روداد اور دو تحریری تقریروں کی اشاعت ثابت ہے۔ پھر یہ کہ ان تمام معرکوں میں حضرت قاسم العلوم کے وہی تن تنہا شاگرد نظر آتے ہیں جنھوں نے تحریر کے ساتھ تقریر کے جوہر بھی دکھائے اور اپنے استاد کے حکم پر کئی روز تک نہ صرف روڑکی کے بازاروں میں تقریریں کیں بلکہ سوامی دیانند کے مذہب جدید پر اعتراضات کر کے اور ان اعتراضات کو بطور مضمون اشتہارات میں چھاپ کر بازاروں میں چسپاں کر کے اہم ملی اور دینی فرض کو پورا کیا اور اپنے آپ کو حضرت قاسم العلوم کے علوم و معارف، مجاہدات و نظریات کا مشتہر اور مبلغ ثابت کیا، حضرت مولانا عبدالحیؒ نے نزہۃ الخواطر کی جلد آٹھ کے صفحہ ۳۵۴ میں ارقام فرمایا ہے کہ ”علمائے ہند میں شیخ وقت علامہ فخر الحسن ابن عبدالرحمٰن حنفی گنگوہی رحمہ اللہ اپنے اوقات کا بیشتر حصہ ہندوؤں اور عیسائیوں سے مناظرہ کرنے میں صرف کرتے اور مناظرہ انہ انداز گفتگو ہی پسند فرماتے، آپ شیخ الرجل مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے اکابر تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں اور ان کے رفقائے کار اور قریبی حلقہ کے افراد میں تھے“

امت اسلامیہ کو فرنگی اثرات سے بچانے کی جدوجہد

حضرت قاسم العلوم کے مشن کی تیسری اہم شق ان مسلمانوں کی اصلاح تھی جو لارڈ میکالے کی پالیسی کے تحت مغربی طرز زندگی کے پیرو اور مغربی افکار وخیالات کے اس حد تک دلدادہ ہوگئے تھے کہ انہیں اپنا مذہب اور اپنے مذہب کی تعلیمات فرسودہ اور مہمل معلوم ہوتی تھیں اور جنھیں مغربی علوم وفنون کو اپنانے اور آزمانے میں مسلمانوں کی نجات نظر آتی تھی، یہ بھی بڑا مشکل مسئلہ تھا اور ایسے مغرب زدہ لوگوں کو دوبارہ اپنے قدیم طرز حیات اور مشرقی انداز فکر کی طرف واپس لانا بظاہر امر محال معلوم ہوتا تھا، مگر حضرت قاسم العلوم اللہ کا نام لے کر اس میدان کو سر کرنے کیلئے کمربستہ ہوگئے، اور جس طرح انہوں نے بے سروسامانی، پست ہمتی، احساس کمتری اور شکستگی کے ماحول میں حکمرانوں کی مخالفت کے باوجود عیسائی مبلغوں کی کوششوں پر پانی پھیر دیا حالانکہ وقت، سرمایہ، دولت اور ابھرتی ہوئی نخوت وتکبر سب ہی عیسائی مبلغوں کے ساتھ تھے۔ ملازمت کا لالچ اور مستقبل کی تابناکی ان کی اتباع میں نظر آتی تھی مگر اللہ نے دین کو فتح ونصرت سے ہمکنار کرنے کا جو وعدہ کیا تھا، اس کو تو ہر حال میں پورا ہونا تھا

اس طرح اس میدان میں بھی کامیابی اہل حق کا مقدر بن چکی تھی۔ اس مغرب زدہ گروہ کے سرخیل سرسید احمد خاں تھے بظاہر دونوں مسلمانوں کی بگڑتی ہوئی قسمت کے بنانے والے تھے لیکن حضرت قاسم العلوم روایات قدیمہ اور علوم مذہبی کے دلدادہ تھے اور ان کی فکر و فہم کے مطابق جب تک ان علوم کے ذریعہ مسلمان نوجوانوں کی مذہبی اور علمی استعداد کو ترقی نہیں دی جاتی اس وقت تک علوم جدیدہ کی جانب توجہ نہیں ہونی چاہئے۔ ان کے یہاں اول علوم قدیمہ اور علوم مذہبی آتے تھے اور اس کے بعد علوم جدیدہ۔

سرسید دونوں علوم کو ایک ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے پھر یہ کہ مغربی علوم وفنون کی بظاہر چونکا دینے والی روشنی نے انہیں اسلامی نظریات اور افکار کے بارے میں بھی نئے انداز فکر کا حامل بنادیا تھا، حضرت قاسم العلوم کھل کر نہ تو مغربی علوم وفنون کی مخالفت کرنا چاہتے تھے اور نہ انگریزی زبان کے مخالف تھے، مگر اتنا ضرور جانتے تھے کہ علوم قدیم اور جدید کا ایک ساتھ تعلیم دینا طلبہ کی استعداد پر برا اثر ڈالے گا یہ اختلافات اپنی جگہ اصولی ضرور تھے مگر سنگین نہیں تھے، لیکن اوہام اور ابہام کا ماحول اور مغربی افکار وخیالات کے تحت اسلام کے بنیادی اصولوں کے بارے میں گلکاریاں ان کو پسند نہیں تھیں اور وہ اسے دین کی بقا کیلئے مضرت رساں سمجھتے تھے، چنانچہ انہوں نے سرسید کو فہمائشی اور اصلاحی خطوط لکھے جو ان کی تصنیف تصفیۃ العقائد میں موجود ہیں۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی میں تحریر فرمایا ہے کہ "حضرت قاسم العلوم جھگڑوں سے خواہ وہ دین کیلئے ہوں اور خواہ دنیا کے بیزار نظر آتے ہیں، لیکن اصلاح امت کا کام چونکہ اصولی ہے اسلئے اس سے غافل نہ ہوکر سید صاحب کو جو اصلاحی خط لکھ چکے ہیں وہ لکھنا ضروری تھا۔

یہ دور ۱۲۸۶ء ۱۸۶۶ء کا ہے مگر ان کا اصلاحی کام اسکے بعد بھی جاری رہا، حضرت فخر العلماء نے جو علوم قاسمی کے صحیح نقیب اور ترجمان ہیں انتصار اسلام میں جو مباحثہ روڑکی کی روداد ہے اور جس کی ترتیب ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں کی ہے اپنی ان کوششوں کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے سرسید کے خیالات کی اصلاح کیلئے انجام دی تھیں، اور ان سے مقصود جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے سرسید کے دینی عقائد کی اصلاح نہیں تھی بلکہ اس گروہ مسلمین کی اصلاح تھی جو مغرب زدہ اور مغربی افکار اور مغربی طرز حیات ومعاشرت کے چکر میں گرفتار ہو چکا تھا، اور ان مقاصد سے ہم آہنگ تھا جو لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کا اہم حصہ تھے۔

حضرت فخر العلماء نے اسی رسالہ انتصار اسلام میں جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے تحریر فرمایا ہے کہ اس رسالہ میں سرسید احمد خان صاحب بہادر کے اوہام کا بھی جواب ہے، کیونکہ حضرت چند امور میں پنڈت جی (سوامی دیانند) کے ہم ذہن ہیں، شیطان اور جن اور فرشتوں کے وجود خارجی کے دونوں منکر ہیں اور جنت دوزخ کے وجود حقیقی کا دونوں کو انکار ہے، اگر سید صاحب اور ان کے ہم مذہب بہ نظر انصاف ان تقریروں کو ملاحظہ کریں گے تو امید خدا سے یوں ہے کہ ان کے جی سے سارے وسوسے دور ہو جائیں گے اور شیطان کے وجود خارجی کا اقرار کریں گے، جنوں اور فرشتوں کے جسمانی ہونے میں کچھ وہم بھی نہ کریں گے، اور جنت دوزخ کے وجود حقیقی کا یقین کریں گے، جنت میں داخل ہونے کی تیاری کریں گے دوزخ سے بچنے کی فکر فرمائیں گے۔

اتنا لکھنے کے بعد حضرت فخر العلماء اپنی کوششوں کا ذکر مزید فرماتے ہیں جو انہوں نے سرسید کے اصلاح خیالات کیلئے کی ہیں آپ فرماتے ہیں کہ "جناب خان صاحب بہادر نے جو سورۂ بقرہ کی تفسیر لکھی ہے اس میں شیطان اور تمام جن اور فرشتوں اور دوزخ و جنت کے وجود حقیقی خارجی کا انکار کیا ہے اور معجزات انبیاء کی تاویلیں کی ہیں اس کا جواب بندہ نے لکھا ہے جو قریب الاختتام ہے، اگر خدا کو منظور ہوا اور اس کی طبع کا سامان میسر ہوا تو وہ بھی عنقریب طبع ہو کر ناظرین کے ملاحظہ میں گزرے گا۔ چونکہ یہ دیباچہ اس وقت لکھا گیا تھا جب حضرت قاسم العلوم کا وصال ہو چکا تھا۔ اسلئے کہ اس دیباچہ میں انکی رحلت کا تذکرہ اور سوانح قاسمی کی ترتیب کا ذکر ہے، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت قاسم العلوم کے وصال کے بعد بھی حضرت فخر العلماء معارف قاسمی کے نگہباں اور مبلغ و ناشر کی حیثیت سے اپنے فرائض کی تکمیل میں اپنے دوسرے ہم سبقوں سے بہت زیادہ بلکہ تن تنہا مستعد اور چاق و چوبند نظر آتے ہیں اور یہ ان کے جانشین قاسم العلوم ہونے کا نہایت واضح ثبوت ہے۔

۴۔ اصلاح الرسوم

حضرت قاسم العلوم کے مقدس مشن کی چوتھی اور اہم شق اصلاح الرسوم ہے۔ ہر دور میں جب دین میں انحطاط ہوتا ہے تو قوم غلط قسم کی رسموں اور اوہام کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہی حال جنگ آزادی سے قبل اور اس کے فوراً بعد امت کا تھا، ہندوؤں کی دیکھا دیکھی عقد بیوگان کے

سلسلہ میں اور شادی بیاہ کی تقاریب میں ہندو مذہب کی پیروی کی جھلکیاں نظر آنے لگی تھیں۔ مسلمانوں میں بیواؤں کا عقد نہایت معیوب سمجھا جانے لگا تھا اور شادی بیاہ کے موقع پر فضول رسوم اور بے جا اسراف کے نمونے بہ کثرت دیکھنے کو ملتے تھے، حضرت قاسم العلوم نے سب سے پہلے بیوہ خواتین کی شادی کے مسئلہ کو اٹھایا اور اپنی تقریروں سے ثابت کیا کہ "بیواؤں کی شادی عین اسلام ہے۔ سوانح مخطوطہ میں ذکر ہے کہ "نکاح ثانی بیوگان کو (مسلمان) ایسا برا اور سخت عیب سمجھتے تھے کہ کرنا تو کرنا اگر کوئی نام بھی لے لیتا تھا تو مرنے مارنے کو مستعد ہو جاتے تھے، اول لوگوں کے کانوں میں جو یہ نئی بات پڑی تو چونکے (حالانکہ حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک میں عقد بیوگان بھی ایک اہم موضوع تھا) اور گھر گھر اس کا چرچا ہوا اور بعض نے (مولانا محمد قاسم صاحب کے) خلاف بھی منصوبے بنائے۔ مگر الحمد للہ حکمت قاسمی رنگ لائے بغیر نہ رہی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مستورات میں وعظ ہونے لگے اور بیواؤں کے کانوں تک مضامین نکاح پہنچنے لگے۔ کوئی بیوہ اور وارث بیوہ ایسا نہ رہا جس کے کان تک نکاح ثانی کے فضائل نہ پہنچے ہوں" حضرت قاسم العلوم نے صرف تقریروں ہی سے اس مسئلہ کے حل کی سعی نہیں کی بلکہ خود اپنی بیوہ بہن کی شادی کر کے عملی طور پر عقد بیوگان کی مہم کا آغاز فرمایا اور اس طرح اپنے پدر روحانی کی دعائیں حاصل کیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ نے ایک خط میں حضرت قاسم العلوم کے اس مبارک اور نیک اقدام کو سراہا یہ خط درج ذیل ہے۔

"ہماری جان سے عزیز مولوی محمد قاسم صاحب کی خدمت میں مکرر لکھتا ہوں (اس سے پہلے بھی حاجی صاحب اپنی خوشنودی کا اظہار ایک خط کے ذریعہ فرما چکے تھے) کہ اپنی ہمشیرہ اور برخوردار ضیا احمد کو سلام دعا کے بعد کہیں کہ اس احقر کو تمہارے اس (نکاح ثانی) نیک کام سے بہت خوشی ہوئی خدائے تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور دینی اور دنیاوی نعمتوں سے مالا مال فرمائے۔"

"حضرت فخر العلماء جو اپنے استاد محترم کے سچے اور حقیقی پیرو تھے کس طرح قاسم العلوم کے افکار و نظریات کی ترویج و اشاعت کے معاملہ میں پیچھے رہتے اور کیوں رہتے اور کیوں انکا تتبع نہ فرماتے، لہٰذا انہوں نے اپنی بیوہ بہن اولیاء بیگم کی (جن کی پہلی شادی امیٹھہ میں شاہ محمد صادق سجادہ نشین امیٹھہ سے ہوئی تھی کے وصال کے بعد ان کی) دوسری شادی جناب عزیز علی کے ساتھ کی جس سے دو اولادیں محمد قاسم اور صدیقہ خاتون کی ولادت ہوئی۔

جناب محبوب انصاری نے اپنے خط مورخہ ۲۰/مارچ ۱۹۶۴ء میں اس کی تصدیق کی ہے کہ بہن صدیقہ صاحبہ جو اولیاء بیگم کے دوسرے خاوند سے بڑی بیٹی ہیں، حضرت فخر العلماء عقد بیوگان کے سلسلہ میں اپنے استاد مکرم کے ہر طرح شریک کار تھے، اس کا اندازہ فیوض قاسمی کے ایک خط سے ہوتا ہے جو حضرت قاسم العلوم نے مرزا عبد القادر بیگ صاحب مراد آبادی کو تحریر کیا تھا، اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا صاحب نے حضرت فخر العلماء کے ذریعہ حضرت قاسم العلوم کو اپنے نکاح ثانی کے بارے میں مطلع کیا تھا اور جس میں انہوں نے بتایا تھا کہ انہوں نے یہ عقد ثانی حضرت قاسم العلوم کی تحریک سے متاثر ہو کر اپنی بیوہ چچی کے ساتھ کیا تھا حضرت قاسم العلوم کا خط یہ ہے۔

"جناب مرزا صاحب السلام علیکم کل چوتھے رمضان شریف کو مولوی فخر الحسن صاحب نے آپ کا عنایت نامہ عنایت کیا۔ اور آپ کے نکاح ثانی کا قصہ زبانی بھی بیان فرمایا (ملاحظہ فرمایئے، اپنے شاگرد کا کس احترام کے ساتھ تذکرہ فرما رہے ہیں) جزاک اللہ، آپ کا نکاح جو بیوہ چچی قرابتی دینی کے بنظر احیائے سنت واقع ہوا" یہ خط فیوض قاسمی میں چھٹے نمبر پر ہے۔

جہاں تک شادی بیاہ کے موقع پر بے جا اسراف اور فضول رسموں کا تعلق ہے حضرت فخر العلماء اپنے استاد گرامی کی پیروی میں سب سے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ اگر آپ کے استاد نے اپنی لڑکی کی شادی کے موقع پر انتہائی سادگی سے کام لیا تو اور شادیوں کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ جب آپ کی بہن انبیا بیگم کا حضرت مولانا خلیل احمد کے ساتھ عقد ہوا تو تذکرۃ الخلیل کے مطابق انتہائی سادگی کے ساتھ شادی ہوئی، دس بارہ براتی انبیٹھہ سے آئے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی سادگی اور خاموشی کے ساتھ اپنے فرزند روحانی کا حضرت فخر العلماء کی بہن کے ساتھ نکاح فرمادیا، اس نکاح کی تفصیل پہلے ہی اپنے مقام پر بیان کی جاچکی ہے۔ ان تمام باتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت فخر العلماء دامے، درمے، قدمے، سخنے، حضرت قاسم العلوم کے اصلاحی، انقلابی، تدریسی اور تبلیغی مشن کے اہم ترین ستون تھے، اور جناب مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے بارے میں یہ بات بلاوجہ نہیں لکھی تھی، کہ آپ (فخر العلماء) درستگی مزاج میں مولانا (حضرت قاسم العلوم) کے قدم بہ قدم ہی نہیں بلکہ کچھ بڑھ کر ہیں۔

حضرت فخر العلماء کی زندگی کا نیا رخ

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے حضرت قاسم العلوم کی رحلت کا حضرت فخر العلماء کو بے حد غم ہوا اور وہ حضرت کی تجہیز وتکفین سے فارغ ہونے کے بعد گنگوہ واپس آگئے۔ استاد کی موت نے ان کی زندگی میں ایک عظیم خلا پیدا کر دیا تھا، اب تک یعنی محرم الحرام ۱۲۸۳ھ سے لے کر ۱۲۹۷ھ تک کا دور جو عیسوی حساب سے مئی ۱۸۶۶ء سے شروع ہو کر ۱۸۸۰ء تک جاری رہا، اس میں زندگی کے ہر موڑ پر انہیں اپنے استاد کی شفقت اور رہنمائی حاصل تھی۔ تعلیم و تعلم ہو، درس و تدریس ہو، رد نصاریٰ کی مہم ہو اور اصلاح احوال مسلمین ہو حضرت فخر العلماء ہر جگہ حضرت قاسم العلوم کے قدم بہ قدم نظر آتے ہیں۔ لیکن اب زندگی میں کوئی بنیادی کشش باقی نہیں رہی تھی بس ایک یہ تو کام تھا کہ حضرت قاسم العلوم کے معارف اور ان کی زندگی کے کارناموں کو اُجاگر کیا جائے لہٰذا چند ماہ گنگوہ میں قیام کے بعد حضرت فخر العلماء دہلی تشریف لے گئے اور مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی کے تعاون سے حضرت قاسم العلوم کے افکار واقوال کی نشر واشاعت کے کام میں منہمک ہو گئے۔

مطبع مجتبائی نے جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے حضرت قاسم العلوم کی تقریباً ۲۳ تصانیف کو ایک بار نہیں بلکہ کئی بار شائع کیا اور حضرت فخر العلماء اس میں مولوی عبدالاحد کے مددگار اور معاون رہے۔ اسکے علاوہ آپ نے دہلی کے قیام کے دوران ابن ماجہ اور ابوداؤد پر حاشیئے لکھے، اور ابن ماجہ کا حاشیہ بڑے اہتمام سے وہیں شائع ہوا۔ آپ ۱۲۹۷ھ کے آخر یا ۱۲۹۸ھ کے اوائل میں دہلی آئے اور ۱۳۰۳ھ تک یعنی ۱۸۸۶ء تک آپ نے وہیں قیام کیا، آپ کا یہ تمام متر زمانہ معارف قاسمی کی ترتیب اور سوانح قاسمی کی تحریر میں گزارا لیکن اس کے علاوہ آپ نے اس زمانہ میں طب کی تعلیم کے حصول پر بھی توجہ کی۔

حکیم محمود خاں کی شاگردی

اپنے دور کے سب سے بڑے طبیب اور خاندان شریفی کی مایۂ ناز شخصیت جس سے آپ کے قدیم خاندانی روابط تھے وہ حکیم محمود خاں اعظم تھے، جن کے سامنے آپ نے زانوئے تلمیذ طے کیا، حکیم محمود خان کے والد حکیم صادق خان اور خاندان شریفی کے موسس حکیم

شریف خان کے حضرت شاہ حسن عسکری ان کے والد شاہ حسین بخش اور ان کے والد شاہ غلام سادات اور ان کے بزرگ شاہ محمد چشتی قدس سرہ سے نیاز مندی کے روابط تھے، لہذا جب آپ حکیم محمود خاں کے یہاں حصول طب کیلئے حاضر ہوئے تو ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، اس وقت تک فخر العلماء اپنے استاد مکرم حضرت قاسم العلوم کےعلوم کے ناشر، اور ان کے جانشین کی حیثیت سے پہلے ہی علمائے وقت کے حلقہ میں ایک اہم مقام حاصل کر چکے تھے۔

لہٰذا قابل استاد نے اپنے ذہین شاگرد کی دل کھول کر پذیرائی کی اور اپنے فرزندوں عبد المجید خان اور واصل خان کے ساتھ بیٹھا کر پڑھایا، ایک تو شاگرد ذہین دوسرے استاد قابل، تیسرے لائق و فائق ہم سبق، حضرت فخر العلماء نے اس طرح تکمیل طب کی کہ جب فارغ التحصیل ہوکر نکلے تو بقول حکیم محمد یوسف گنگوہی برادر خورد حکیم محمد اسمٰعیل اجمیری حکیم محمود خان نے فرمایا کہ جہاں تک علم طب کا تعلق ہے وہ تو مولوی فخر الحسن صاحب لئے گئے، حکیم محمد یوسف گنگوہی نے حکیم محمود خان کے یہ الفاظ خود ان کے فرزند اکبر حکیم عبد المجید خان سے سنے تھے۔

حیات اجمل کے مصنف قاضی عبد الغفار نے لکھا ہے کہ حکیم محمود خان نے خود ہی اپنے درس کو جس میں طلبہ کسب فن کیا کرتے تھے ایک مدرسہ طبیہ کی صورت میں منتقل کر دیا یہی وہ درس تھا، جس میں انہوں نے حضرت فخر العلماء کو فخر الحکماء بنادیا، اور خاندان شریفی کے ارکان کو خاص کر حکیم عبد المجید خان کو ان کا بہت ہی دلدادہ بنادیا، اسلئے کہ خاندان شریفی کا یہ مایۂ ناز سپوت جس نے اپنے عظیم والد حکیم محمود خان کے انتقال کے بعد باپ کی مسند حکمت کو زینت دی یہ جانتا تھا کہ وہ اپنے باپ کے بقول علاج معالجہ میں ان کا صحیح جانشیں ہے، لیکن جہاں تک فن طب اور اس کی باریکیوں کا سوال ہے یہ نعمت خاندان شریفی سے نکل کر حکیم فخر الحسن کے دماغ میں منتقل ہو چکی ہے۔ "حکیم محمود خان جانتے تھے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اس فن کا زوال بھی یقینی تھا لیکن محمود خان نے بادشاہوں اور حاکموں کی سرپرستی کے بغیر بھی اپنے فن کو ترقی دینے کا ارادہ کیا۔ (انکی) تحریک کا سنگ بنیاد مدرسہ طبیہ تھا جو انہوں نے جاری کیا" (۱)

لیکن مدرسہ کے اجراء سے پہلے ہی انہوں نے یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ اپنے خداداد

(۱) حیات اجمل ص ۲۱۔

اور خاندانی علم کو مستحق اور ذہین طالب علموں تک ضرور پہنچائیں گے اور ان کا یہ عزم حکیم فخر الحسن کی ذہانت وذکاوت اور علم طب میں ان کی غیر معمولی استعداد اور قابلیت کے روپ میں نظر آتا ہے۔ مولانا عبد الحئی نے اپنی مشہور تصنیف نزہۃ الخواطر جلد آٹھ کے صفحہ ۳۵۴ میں بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ حضرت فخر العلماء نے طب افضل الاطباء شیخ محمود بن صادق شریفی دہلوی ؒ سے حاصل کی اور آخر عمر میں علاج معالجہ کا سلسلہ بھی کانپور میں اختیار فرمایا۔

حکیم محمود خان اعظم حکیم محمود خان اکبر شاہ ثانی کے عہد میں پیدا ہوئے، اپنے والد حکیم صادق علی خان سے اکتساب علم کیا اور بہادر شاہ کی تاجداری کا پورا دور گزار کر ۱۸۹۲ء مطابق ۱۳۰۹ھ میں انتقال فرمایا، قاضی عبد الغفار نے سچ کہا ہے کہ ”ان کے علم وفضل کی داستان ایک علیحدہ تالیف چاہتی ہے، ہندوستان میں آج تک ان کے علم وفضل اور کمال فن کے افسانے زبان زد ہیں، ان کی تشخیص اور معالجہ کے عجیب وغریب قصے بیان کئے جاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر خدا نے ان کو غیر معمولی شخصیت نہ عطا کی ہوتی تو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اس خاندان اور اس کے ساتھ طب یونانی کی بقا نا ممکن تھی۔“

محمود خان اپنے خاندان میں ایک غیور مگر دردمند طبیعت لے کر آئے تھے، غریبوں کے حال پر خاص التفات فرماتے تھے۔ لیکن امیروں کیلئے بے حد تند خو تھے، مطب میں مجال نہیں تھی کہ کوئی امیر کسی غریب سے آگے بڑھ کر نبض دکھا دے۔ اہل دُول سے کبھی مرعوب نہیں ہوتے تھے اور والیان ریاست اگر علاج کے لئے بلاتے تو ہزاروں خوشامدوں اور التجاؤں کے ساتھ جاتے تھے“ قاضی عبد الغفار نے آگے چل کر جنگ آزادی کے دوران ان کی بے مثال خدمات، بے خوفی، غرباء کی امداد اور گرفتاری کے واقعات کا بھی تذکرہ کیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ فخر الحکماء حضرت مولانا حکیم فخر الحسن کے استاد کس مرتبہ کے مالک تھے۔

قاضی عبد الغفار نے حیات اجمل میں جو اُن کے چھوٹے صاحبزادے مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی سوانح ہے تحریر فرمایا ہے کہ ”۱۸۵۷ء کا زمانہ ان کی جوانی کا زمانہ تھا خوش قسمتی سے خاندان شریفی ان تباہیوں کی زد میں نہیں آیا (حکیم صاحب کی گرفتاری کی بناء پر یہ بیان محل نظر ہے) اس کا ایک سبب خود حکیم محمود خان کا شخصی اعزاز تھا، جس وقت برطانوی فوجیں دہلی میں داخل ہوئیں تو نابھا پٹیالہ اور جند کی فوجیں ان کے ساتھ تھیں اور ان کے

مہاراجگان نے برطانوی افسران سے کہدیا تھا کہ شریفی خاندان کی حفاظت کی جائے، اس لئے کہ قلعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ چنانچہ انگریزی فوج نے دہلی میں داخل ہوتے ہی اس گھر کی حفاظت کیلئے پہرہ بٹھادیا (بعض اطلاعات کے مطابق حفاظت کا کام مہاراجہ جند کے فوجی دستے نے انجام دیا) اور تمام خاندان اس دارو گیر سے بچا رہا، مرزا غالب نے بھی حالات غدر کے سلسلہ میں اس واقعہ کا یوں ذکر کیا ہے۔

جب انگریزوں کو مجاہدین پر غلبہ حاصل ہوا تو دہلی سے لوگ بھاگے، اس موقع پر حکیم محمود خان نے لاکھوں کروڑوں روپیہ کے اثاثے اپنے پاس بطور امانت رکھے "قاضی عبدالغفار" "حیات اجمل" کے صفحہ ۱۵۔۱۶ میں ارقام فرماتے ہیں کہ "جب دہلی والے بھاگے تو ہزارہا اشخاص نے حکیم محمود خان کی حفاظت میں اپنا اثاثہ چھوڑ دیا، حالت یہ تھی کہ لوگ حکیم صاحب کے پاس اپنا قیمتی سامان، زیور، جواہرات محفوظ کرنے کیلئے لاتے تھے، اور حکیم صاحب ایک کوٹھری بتادیتے تھے کہ اس میں رکھ جاؤ، چنانچہ یہ کوٹھری چھت تک لوگوں کے پلندوں، گڈیوں اور بکسوں سے بھر گئی، بقول حکیم محمد احمد خاں مرحوم اندازہ یہ تھا کہ اس وقت اس کوٹھری میں دو کروڑ روپیہ سے زیادہ کی امانتیں رکھی ہوئی تھیں۔

یہ مرتبہ دلی میں محمود خان ہی کا تھا کہ لوگ ان کی کوٹھریوں میں اس طرح اپنی دولت ڈال جاتے تھے۔ غدر کے بعد (یعنی جنگ آزادی کے خاتمہ کے بعد) جب اپنے گھروں کو واپس آئے تو حکیم صاحب نے اس کوٹھری کا دروازہ کھلوادیا اور فرمایا کہ جس کا جو سامان ہو وہ پہچان کرلے جائے۔ قاضی عبدالغفار نے اس کے بعد حکیم محمود خان کی ان سرگرمیوں پر روشنی ڈالی جو جنگ آزادی کے خاتمہ کے بعد انہوں نے انجام دیں قاضی صاحب حیات اجمل میں لکھتے ہیں کہ "اسی طرح دہلی میں اور خصوصاً بلی ماران کے محلّہ میں جو ہزارہا جائیدادیں ضبط ہوئیں ان کیلئے حکیم محمود خان حکام کے پاس جاتے تھے اور انہیں واگذاشت کرادیتے تھے جو لوگ گرفتار تھے انہیں رہا کرانے کیلئے کوتوالی جایا کرتے تھے اور یہ کہہ کر کہ یہ میرے عزیز ہیں انہیں رہا کرالیتے تھے۔

حالانکہ عام طور پر کچہری اور عدالت میں جانے سے وہ سخت نفرت کرتے تھے تاہم غدر کی مصیبت میں دن رات مخلوق کی جو خدمت انجام دی اس کے قصے عرصہ تک دہلی میں زبان زد خاص وعام رہے، ایک طرف مزاج کی وہ سختی اور تمکنت کہ اہل حکومت کی صورت دیکھ کر چین

بہ جبین ہو جاتے تھے اور دوسری طرف طبیعت کی یہ نرمی اور گداز کہ غریبوں اور گرفتاران بلا کی خاطر کوتوالی کا چکر لگاتے تھے۔

شفاء الملک حکیم محمد حسن قریشی نے دستور الاطباء کی جلد اول کے صفحہ ۱۱۱ر میں حکیم محمود خان کے حالات درج کئے ہیں آپ فرماتے ہیں کہ "حکیم صادق علی خان کے بعد ان کے نامور فرزند حکیم محمود خان جانشین ہوئے، حکیم محمود خان بے حد ذہین تھے ان کی نباضی، تشخیص اور تجویز کے عجیب وغریب قصے اب تک زبان زد عام ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انہیں اسی کام کیلئے پیدا کیا تھا، اس کے ساتھ ان کو چوہتر سال (قاضی عبد الغفار کے مطابق بہتر سال) کی طویل عمر نصیب ہوئی جس کی وجہ سے ان کو غیر معمولی تجربہ حاصل ہو گیا، حکیم محمود خان کی شہرت نہ صرف اطراف ہند میں پھیلی بلکہ افغانستان، ترکستان، ایران، عراق اور عرب تک کے مریض ان کا شہرہ سن کر دہلی کا طواف کرنے لگ گئے۔

لیکن ان کے شاگرد رشید حضرت فخر العلماء کے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے طب یونانی کی نعمتوں سے اہل ہندوستان کو عموماً اور اہل دہلی کو خصوصاً اس قدر نوازا کہ وہ دوسرے طبی علوم سے استفادہ کی جانب ملتفت نہیں ہوتے تھے اور ڈاکٹروں کی توجہات کی پرواہ نہیں کرتے تھے حضرت فخر العلماء کا کہنا تھا کہ حکیم محمود خان کی بدولت جن امراض کا علاج امیروں کیلئے ہزاروں لاکھوں کے اخراجات کا باعث تھا، وہی علاج غرباء کو کوڑیوں کے مول میسر تھا، ان کے بقول

طب یونانی نے اپنی حکمتوں کے خزانے اس طرح عوام اور غرباء پر وا کئے کہ یہ طریقۂ علاج ان کی امیدوں اور آرزوئں کا سہارا بن گیا اور انہیں کسی، خاص کر طب مغربی کی حاجت اور ضرورت ہی نہیں رہی، حکیم فخر الحسن فرماتے تھے کہ ہندوستان میں مغربی علوم اور جدید فنون کے مقابلہ میں حکیم محمود خان ایک ایسا سخت حصار تھے جسے انگریزی حکومت توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکی اور طب یونانی جس کے بارے میں عام طور پر مایوسی کا اظہار کیا جاتا تھا، ان کی مہربانی اور توجہ سے ایک ایسی زندہ جاوید حقیقت بن گئی جس سے کسی کو انکار کی گنجائش نہ تھی۔

حکیم محمود خان اپنی محیر العقول ذہانت کے باعث علاج الامراض میں نت نئے تجربوں کا باعث تھے اور ان کے عجیب وغریب طریقۂ علاج کا تمام لوگ لوہا مانتے تھے، یادگار دہلی کے مصنف ظہیر الدین نے دہلی کے حالات کے تحت حکیم محمود خان کی حویلی اور ان کے بے مثال

طریقۂ علاج کے کئی واقعات بیان کئے ہیں، آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "حکیم غلام رضا خاں کی حویلی سے آگے بڑھ کر بائیں جانب حاذق الملک حکیم عبد المجید خان کی حویلی ہے، آپ شریف خان خاندان کے فرد تھے، دہلی کے تمام اطباء بلکہ ہندوستان کے مشاہیر حکمائے ہند یونانی میں حکیم محمد شریف خان کا خاندان مانا ہوا مشہور و معروف ہے اور واقعی حکیم شریف خان اپنے زمانہ میں یکتا تھے، ایک فن طب ہی نہیں بلکہ دیگر علوم میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے، بہت سے رسائل و حواشی آپ کی تصنیف ہیں مگر طبع نہیں ہوئے، شرح اسباب پر ان کا مبسوط حاشیہ موجود ہے عنقریب طبع ہونے کی امید ہے، حکیم شریف خان کے بعد آپ کے صاحبزادے حکیم صادق علی خان نے مطب سنبھالا اور اپنے والد مرحوم کی طرح زمانہ میں نام پیدا کیا، ان کے بعد ان کے صاحبزادے حکیم محمود خاں صاحب کا شہرہ ہوا اور دور دور کے اطباء ان کا لوہا مان گئے۔ تشخیص امراض کے ساتھ قیافہ کو اتنا دخل تھا کہ دور سے مریض کی صورت دیکھ کر اس کا مرض بتادیتے تھے، ہر شخص کو اس کی حیثیت کے مطابق نسخہ دیتے تھے (حضرت فخر العلماء کے حوالے سے یہ بات پہلے ہی بیان ہو چکی ہے) قیافہ میں وہ کمال تھا کہ علاوہ امراض کے اور بھی بہت سی باتیں بتادیتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک صاحب نے محض امتحان کے لئے ایک رنڈی کو ڈولی میں بٹھا کر کہار کے ساتھ حکیم صاحب کے مطب میں روانہ کیا، مطب کا وقت نہ تھا حکیم صاحب شطرنج کھیلتے تھے اتنے میں ڈولی آئی حکیم صاحب نے نبض دیکھنے کیلئے ڈولی میں ہاتھ ڈالا اور نبض پر ہاتھ رکھتے ہی فوراً ڈولی کا پردہ الٹ دیا اور فرمایا کہ قطامہ ڈولی میں بیٹھ کر آئی ہے، اس قسم کے اور بھی بہت سے قصے مشہور ہیں حکیم صاحب کا مزاح بہت بڑھا ہوا تھا اس لئے ایسی باتیں سرزد ہوتی تھیں کہ مریضوں کو ہنستے ہنستے کچھ دوا بتاتے اور وہ لوگ مزاح سمجھتے اور درحقیقت وہی ان کا علاج ہوتا تھا۔

فخر الحکماء کانپور میں

حکیم محمود خان سے اکتساب علم کرنے کے بعد حکیم فخر الحسن نے ان کی نگرانی میں مطب شروع کیا اور ان کے زیر ہدایت نسخہ نویسی شروع ہوئی، انہوں نے چند ماہ میں وہ استعداد حاصل کرلی کہ حکیم محمود خان کو ان پر فخر ہونے لگا۔ اسی زمانہ میں کانپور کے بہت لوگ خاص کر

بساط خانہ کانپور کے مخیر افراد جن کی برادری کا ایک بہت بڑا حصہ دہلی میں بھی موجود ہے اور جس سے ان کے خاندانی روابط بھی تھے، حکیم محمود خان سے درخواست کرنے لگے کہ آپ بھی کبھی کبھی کانپور تشریف لے جایا کیجئے تاکہ اہل کانپور کو آپ کی ذات گرامی سے نفع ہو۔ بساطی برادری کی دہلی میں بھی بہت عزت تھی اور اس برادری کے بعض افراد کی حکیم محمود خان سے بھی نیازمندی تھی، اس لئے حکیم محمود خان پر جب ان لوگوں کا اصرار بڑھا تو ایک روز حکیم صاحب نے ان لوگوں سے حکیم فخر الحسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ تم ان کو کانپور لے جاؤ یہ بالکل میرے مثل ہیں۔

حکیم صاحب کا یہ ارشاد اگر ایک طرف استاد کا شاگرد پر بے پناہ اعتماد کا مظہر ہے تو دوسری طرف شاگرد کی اعلیٰ صلاحیتوں، استعداد، ذہانت اور قابلیت کی نشاندہی بھی کرتا ہے، چنانچہ حکیم فخر الحسن کانپور آئے اور یہاں آکر باقاعدہ مطب کیا، چونکہ آپ حکیم محمود خان کے فرستادے کی حیثیت سے کانپور آئے تھے لہٰذا بساطی بازار کے لوگوں میں آپ حکیم دہلوی کے نام سے مشہور ہوئے، مگر آپ کا یہاں زیادہ دل نہیں لگا اور پھر اپنے استاد کی خدمت میں واپس دہلی پہنچ گئے، دہلی سے الفت ومحبت کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ استاد گرامی کی ذات تھی لیکن اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ حضرت فخر الحکماء نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ جسے بچپن کہتے ہیں دہلی میں اپنے نانا حضرت شاہ حسن عسکری شہید کی سرپرستی میں گزارا تھا، اور بچپن کے نقوش ان کے ذہن میں بدستور جاگزیں تھے۔ لیکن کانپور جانے اور وہاں رہنے کی وجہ سے اس شہر کے بعض مشہور اشخاص اور علمی شخصیتوں سے ان کے ذاتی مراسم ہو چکے تھے، جن میں جناب عبد الرحمٰن خان مالک مطبع نظامی مولانا عبد الجلیل وکیل رفیق خاص پنڈت موتی لال نہرو اور جگی لال جن کا خاندان آج کل شمالی ہند کے امیر ترین خاندانوں میں شمار کیا جاتا ہے قابل ذکر ہیں۔

ان حضرات نے فخر العلماء پر بہت زور دیا، حکیم محمود خان بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کے شاگرد رشید کے حالات بہتر ہوں، اس لئے آخر کار حکیم فخر الحسن کو دہلی کی سکونت ترک کر کے کانپور میں آباد ہونا پڑا، مگر اب جو آپ کانپور تشریف لائے تو بساط خانہ آپ کا مستقر نہ تھا، اب آپ کا مستقل قیام چٹائی محل میں تھا جو مولوی عبد الجلیل وکیل اور جگی لال کا محلہ تھا اور جہاں سے عبد الرحمٰن خان کا مطبع اور مکان زیادہ دور نہیں تھا۔ فخر الحکماء نے اس محلہ

میں ایک مکان خرید لیا اب گویا ان کا، مولوی عبد الجلیل کا اور جگی لال کا مکان ایک ہی محلّہ اور ایک ہی سڑک پر واقع تھا۔ اس زمانہ میں ان کے تعلقات کانپور کے مشہور قاضی خاندان اور جنگ آزادی کے ایک اور ہیرو عظیم اللہ خان اور نانا راؤ کے دوست قاضی محمد اسمٰعیل کے بڑے صاحبزادے قاضی احمد حسین سے ہوئے، جن سے حضرت فخر الحکماء کی بعد میں قرابت بھی ہوئی۔ آپ نے اپنے ایک اور ہم محلہ پنڈت پرتھی ناتھ سے دوستی پیدا کی، چند سال بعد مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی کانپور آئے اور اس طرح ان سے بھی رابطہ ہوا، غرض کہ حضرت فخر الحکماء کا یہ دور حیات جو ۱۳۰۲ھ سے لے کر ان کی رحلت ۱۳۱۵ھ تک کانپور میں نہایت فارغ البالی، ذہنی سکون اور علمی و عملی سرگرمیوں میں بسر ہوا یہ ان کی فتوحات کا دور تھا اور اس دور میں وہ کانپور کی نہایت مشہور و معروف علمی اور طبّی شخصیت بن گئے۔

حکیم ناطق لکھنوی کی روایت ہے کہ اس زمانہ میں کانپور میں ایک بہت بڑا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا جس میں ایک شخص نے جنون کے عالم میں اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا، فریق مخالف یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ قتل عالم جنون میں ہوا، طرفین سے عجیب عجیب نکات اٹھائے گئے، آخر عدالت نے ماہر طبیب کی حیثیت سے آپ کو عدالت میں طلب کیا۔ اگرچہ فخر الحکماء اپنے اساتذہ کی طرح کچہری اور عدالت میں جانے سے اجتناب کرتے تھے لیکن یہ معاملہ فن طب سے متعلق تھا، حکیم ناطق لکھنوی فرماتے ہیں کہ آپ عدالت میں تشریف لے گئے اور آپ نے دو روز مسلسل جنون اور اس کی اقسام پر بیان دیا۔

حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت فخر الحکماء نے عدالت کو بتایا کہ جنون کی ۵۰ر قسمیں ہوتی ہیں اور پھر ہر ہر قسم کا الگ الگ تذکرہ فرمایا۔ ان ہی حکیم ناطق کا بیان ہے کہ اس گفتگو کو سننے کیلئے کمرۂ عدالت دونوں دن کھچا کھچ بھرا رہا، ہر شخص اس عجیب تقریر سے محو حیرت تھا مگر راقم کو اس پر کوئی حیرت نہیں اس لئے کہ اسے یاد ہے کہ حکیم محمود خان نے حکیم عبد المجید سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ تم ضرور علاج معالجہ میں میرے جانشین ہو اور میرے علم کو پہنچے ہو لیکن جہاں تک فن طب کا تعلق ہے یہ تو مولوی فخر الحسن اپنے ہمراہ لے گئے (بحوالہ حکیم محمد یوسف گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بہ روایت حکیم محمد یعقوب قدوسی) اور حکیم محمود خان جیسے تنک مزاج شخص کے منہ سے غلط بات نہیں نکل سکتی تھی۔ کانپور کے ایک مشہور طبیب ڈاکٹر عبد الصمد بھی آپ کی طبّی قابلیت کے معترف تھے اور شہر کے دوسرے

حکماء جن میں حکیم خواجہ اور حکیم پیارے صاحب بہت مشہور ہیں اکثر معاملات میں آپ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

جناب دور ہاشمی کا بیان

جناب دور ہاشمی کانپوری جنھیں حضرت جگر مراد آبادی کا شاگرد رشید ہونے کا شرف حاصل ہے، اور جن کی ذات سے کانپور اور بنگلور (جنوبی ہند) کی ادبی سرگرمیوں کو تقویت او تقویت مزید حاصل ہوئی اور جو حضرت فخر الحکماء کے سب سے بڑے پوتے ہیں اپنی یادداشت میں تحریر فرماتے ہیں کہ "مولوی عبدالجلیل جو کانپور کے ایک ممتاز اور مشہور وکیل تھے آپ (حضرت فخر الحکماء کے) نہ صرف بحیثیت دوست بلکہ بہ اعتبار معالج کانپور آئے تھے، آپ کا قیام محلہ چٹائی محل میں مولوی عبدالجلیل صاحب کی عظیم الشان کوٹھی میں رہا، اسی اثناء میں جب آپ کی شہرت ہوئی اور کانپور کے عوام کو آپ کے دواؤں اور علاج سے شفا ملتی رہی تو وہاں کے ہندو خاص طور پر حکیم صاحب کے گرویدہ ہو گئے جن میں کانپور کے مشہور کروڑپتی جگی لال (موجودہ پدم پت سنگھانیہ کے جدامجد) اور کانپور کے مشہور وکیل پنڈت پرتھی ناتھ (جن کے نام پر آج بھی کانپور میں پنڈت پرتھی ناتھ ہائی اسکول موجود ہے) ان کے اصرار پر حکیم صاحب کو کانپور میں مستقل رہائش اختیار کرنا پڑی، اور پھر آپ نے کچھ دنوں بعد محلہ چٹائی محل میں اپنا ذاتی مکان بھی تعمیر کرلیا (جس کا نچلا حصہ مطب، دواخانہ اور کتب خانہ کیلئے وقف تھا اور اوپر کے حصہ میں رہائش تھی) اور مکان سے ملحق (نہایت عظیم الشان کرسی کی جس میں دو مینارے اور تین گنبد تھے) ایک مسجد کی بناڈالی، مکان تو آج باقی نہیں لیکن مسجد موجود ہے" یہ مکان جسے ۱۹۳۱ء کے ہندو مسلم فساد میں سامان لوٹنے کے بعد آگ لگادی گئی تھی اور جس میں آپ کا عظیم الشان کتب خانہ بھی جل کر راکھ ہو گیا تھا، آپ کے ورثاء نے جگی لال کے اعزا میں سے ایک کے ہاتھ فروخت کر دیا اور اسی عزیز نے اسے منہدم کر کے اپنے مکان کے اندر شامل کر لیا۔" جناب دور ہاشمی نے آگے چل کر اپنے منجھلے بھائی جناب وحید الحسن کے حوالہ سے حضرت فخر الحکماء کی طبّی زندگی کا ایک واقعہ بھی اپنی یادداشت میں لکھا ہے۔ مرحوم فرماتے تھے کہ میرے بھائی وحید الحسن کا بیان ہے کہ کانپور کے مشہور اور مقبول طبیب حکیم خواجہ محمد صاحب جو ہمارے خاندانی طبیب تھے انہوں نے غالباً ۱۹۲۷ء میں میرے

بھائی سے کہا کہ کہو تو تمہارے دادا مرحوم (حکیم فخر الحسن ؒ) کا ایک نسخہ تیار کر دوں جو میرے پاس خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے، بھائی نے پوچھا کہ وہ نسخہ کیا ہے؟ تو حکیم صاحب موصوف نے بتایا کہ ڈیڑھ من خالص دودھ میں ایک تولہ شنگرف کو پکانا ہے اور یہ کام چالیس دن میں مکمل ہوگا کیونکہ دودھ کو کونڈ پر رات دن پکانا ہوگا یہاں تک کہ خشک ہو جائے اور اس کے بعد جب دودھ خشک ہو جائے تو پھر شنگرف کھرل کر کے سفوف بنایا جائے گا اور اس کی خوراک روزانہ ایک ماشہ ہوگی جو ایک پاؤ گرم دودھ کے ساتھ استعمال ہوگی، حکیم خواجہ کا کہنا تھا کہ یہ نسخہ نہ صرف مقوی باہ تھا بلکہ رگوں اور پٹھوں کو مضبوط اور طاقت ور بناتا تھا اور اس سے عمر بڑھتی ہے۔

اسی طرح حضرت فخر الحکماء کے بارے میں خاندانی روایات میں ہے کہ وہ روزانہ صبح سویرے نہار منہ ایک امرود کے استعمال کی بہت تعریف کرتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ اس طرح امرود کے استعمال سے معدہ کے جملہ امراض ختم ہو جاتے ہیں۔ خاندانی روایات کے مطابق انہوں نے یہ بات ڈاکٹر عبدالصمد صاحب کی والدہ کو بتائی تھی۔ اور وہ تازندگی روزانہ صبح سویرے ایک امرود استعمال کرتی تھیں، جناب دور ہاشمی کی یادداشت میں ہے کہ خود حضرت فخر الحکماء نے یہ شنگرف والا نسخہ استعمال کیا تھا جس کی بناء پر انہیں سردی کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اور وہ انتہائی سردی میں بھی وائل کا فالسائی رنگ کا انگرکھا استعمال کرتے تھے اور گرمیوں کے ایام میں انہوں نے اپنے گھر میں ایک گہرا گڑھا کھدوالیا تھا جس میں دوپہر کو بیٹھے رہتے تھے۔

حضرت فخر الحکماء کی کامیاب ادویات

حضرت فخر الحکماء کے صاحبزادے مولانا حافظ فیض الحسن گنگوہی نے اپنی تصنیف اصول الشاشی مع عمدۃ الحواشی کے آخری صفحہ میں اپنے والد کے اہم نسخوں کا ذکر فرما کر ان کے مختصر خواص کا تذکرہ فرمایا ہے، جس سے حضرت فخر الحکماء کی طبّی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔ مولانا فیض الحسن کے الفاظ یہ ہیں "العلم علمان علم الادیان و علم البدان چونکہ علمی خدمت کے پہلو بہ پہلو بہ مصداق حدیث شریف مذکور بدنی خدمت بھی موجب سعادت تھی اور ادھر جناب والد ماجد مولانا حافظ حکیم مولوی فخر الحسن گنگوہی مرحوم و مغفور فخر تلامذہ

روزگار جناب حذاقت مآب حکیم محمود خان صاحب دہلوی کے مجرب و مفید اور بیش بہا نسخے میرے پاس وراثتاً موجود تھے، جن سے بوجہ وفات حسرت آیات جناب والد مرحوم و مغفور عام لوگ متمتع نہ ہو سکتے تھے اور نہ آئندہ کسی زمانہ میں ان سے عام فائدے کی امید کی جاسکتی تھی، اس لئے اور نیز اس لئے کہ اگر کوئی صاحب مستفید ہوں تو ان مرحوم کے حق میں ممکن ہے کہ بمقتضائے خاص الانسان عبدالاحسان دعائے خیر کر گزریں اور جناب باری عزاسمہ اس انتفاع کا سبب قریب ہونے کی وجہ سے کیا عجب ہے کے ان کے متعلق اپنی نکتہ نوازی کو کام فرما جائیں اور اس طرح سے میں ان کے حقوق سے سبکدوش ہو جاؤں۔ چند کثیر الوقوع امراض کے نسخے تیار کر کے اس کتاب کے ٹائیٹل پر جو علمی خدمت کا ایک قابل قدر علمی نمونہ ہے بغرض رفاہ عام درج کئے جاتے ہیں، اگر ناظرین نے فائدہ اٹھانے میں پہلو تہی نہ کی تو انشاء اللہ چند مفید عام نسخے اور بھی تیار کر لئے جائیں گے۔ ان دواؤں کے یہ نام ہیں (۱) سفوف سلیمانی (۲) خوشبودار سی (۳) تمباکو کے قوام کی نقری مشکی گولیاں (۴) حب معطر دہن (۵) دوائے قمل (۶) سرمہ دور نما (۷) عرق مسی (۸) شربت مقوی باہ و اعضائے رئیسہ (۹) مانع غشیان و قے (۱۰) حب سرفہ نمبر اول (۱۱) حب سرفہ نمبر ۲ (۱۲) حب سرفہ نمبر ۳ (۱۳) حب سرفہ نمبر ۴ (۱۴) حب بخار (۱۵) قبض کشا (۱۶) سنون جامع انفع (۱۷) اکسیر احمر (۱۸) عرق عصبہ مرکب مصفی خون (۱۹) طلا معجز نما مشک والا (۲۰) حب سرخ (۲۱) عجیب روغن (۲۲) بواسیر کی گولیاں (۲۳) سفوف سوزاک (۲۴) حبوب ڈبہ و خلل شکم (۲۵) سنون (منجن) مستحکم دنداں خوشبودار (۲۶) سرمہ مجلی بصر (۲۷) سرمہ مقوی نظر (۲۸) سرمہ دافع سوزش (۲۹) حب حیات (۳۰) حب ترش (۳۱) جب قبض (۳۲) حب مسہل (۳۳) اکسیر اصفر (۳۴) حب جریان (۳۵) جب ممسک (۳۶) حب پیچش (۳۷) حب طلال (۳۸) حب آتشک (۳۹) روغن مقوی دماغ (۴۰) حب مقوی اعضائے رئیسہ۔

ہیضہ کا علاج

حضرت مولانا حافظ فیض الحسن نے لکھا ہے کہ حضرت فخر الحکماء نے کانپور میں ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑنے پر ایک نسخہ تجویز فرمایا تھا جس میں ۹۰ فیصد کامیابی ہوئی، آپ نے اس نسخہ کا

تذکرہ فرماتے ہوئے اصول الشاشی مع عمدۃ الحواشی کے آخری صفحہ پر یہ ارقام فرمایا ہے "یوں تو ہیضہ کے بہت علاج ہوئے اور کم و بیش مفید بھی ہوئے مگر جناب والد مرحوم کا یہ مجرب اور بیش بہا نسخہ اپنی معجز نما تاثیر سے تیر بہدف ہوا، اب سے دور کانپور میں تیرہ چودہ برس کا عرصہ ہوا کس شدت کا ہیضہ ہوا تھا روزانہ ہزاروں موتیں ہوتی تھیں، اس وقت جناب والد مرحومؒ (حضرت فخر الحکماء مولانا حکیم فخر الحسن گنگوہی) نے عام طور پر اسی نسخہ کا استعمال فرمایا تھا فرماتے تھے (حضرت فخر الحکماء) کہ "۹۰ فیصد کے حساب سے مبتلائے ہیضہ شفایاب ہوئے تھے" خیال فرمایئے کہ اب سے ۹۵ برس پہلے (۱۹۸۰ء) جب میڈیکل سائنس نے ترقی کے وہ مدارج طے نہیں کئے تھے جواب ہمیں نظر آرہے ہیں اسی وقت ہیضہ جیسے موذی مرض کے خلاف طب یونانی کی حدود میں رہتے ہوئے ایسا کامیاب نسخہ ترتیب دینا جس میں ہیضہ سے اموات میں ۹۰ فیصد کمی ہو جائے اپنی جگہ کتنا حیرت انگیز اور عظیم الشان کارنامہ تھا۔

عقد ثانی

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے حضرت فخر الحکماء کی زندگی کا آخری حصہ جو کانپور میں بسر ہوا وہ ان کے حیرت انگیز طبّی کمالات پر مشتمل ہے، جس کے باعث ان کو مالی اعتبار سے وہ آسودگی حاصل ہوئی جو اس سے پہلے ان کو حاصل نہیں تھی، آپ نے اپنے دونوں فرزندوں یعنی مولانا حافظ مولوی نور الحسن اور مولانا حافظ فیض الحسن کو اعلیٰ تعلیم کیلئے دہلی روانہ کیا، جہاں ان دونوں نے مدرسہ حسین بخش میں تعلیم حاصل کی، ان دونوں نے اپنے والد ماجد کے حکم پر حضرت فخر العلماء کے خالہ زاد بھائی مولانا صدیق احمد انبیٹھوی سے مالیر کوٹلہ میں بھی تعلیم حاصل کی مگر ابھی ان کی تعلیمی زندگی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی تھی کہ ان کے سر سے ان کے والد کا سایہ اٹھ گیا، مگر ان دونوں نے بہرحال اپنی دینی اور دنیوی تعلیم اس حادثۂ جانکاہ کے باوجود مکمل کی اور اس ضمن میں انہیں اپنی دادی کی سرپرستی اور توجہ حاصل رہی۔ دونوں فرزندوں کے دور رہنے اور والدہ ماجدہ کے گنگوہ میں مستقل قیام کے باعث حضرت فخر العلماء کی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا، جس کا فی الوقت پر ہونا ممکن نہیں آتا تھا آپ کے احباب نے ایسے ماحول میں آپ پر زور دیا کہ آپ نکاح ثانی فرمائیں اس وقت آپ کے عزیز دوست مولوی عبد الجلیل کی اہلیہ کی بہن بتول بیگم موجود تھیں۔

آپ نے ان سے عقد ثانی فرمالیا جنھیں عرف عام میں بتولن بھی کہتے تھے اور ان ہی سے آپ کی آخری اولاد اور آخری صاحبزادے محمد احمد تولد ہوئے، مگر یہ ابھی صرف چھ سال کے تھے کہ حضرت فخر العلماء نے وصال فرمایا اور آپ کے فرزند ثانی حضرت مولانا حافظ فیض الحسن نے ان کی تربیت فرمائی، حضرت فخر العلماء کا یہ دور جیسا کہ پہلے کئی بار بیان کیا جاچکا ہے فارغ البالی کا دور تھا اور اگرچہ انہوں نے گنگوہ کی سکونت ترک کردی تھی لیکن اس کے باوجود وہ چاہتے تھے کہ ان کے دونوں فرزند گنگوہ ہی میں بود و باش اختیار کریں، اس لئے وہ اپنے چھوٹے بھائی مولوی مظہر حسین کو وقتاً فوقتاً کافی روپیہ بھیجتے رہتے تھے، اس وقت تک مولوی مظہر حسین کے خلف الرشید مولوی حاجی عزیز حسین تولد ہو چکے تھے، اس لئے جب رقم گنگوہ روانہ کی جاتی تھی تو حضرت فخر العلماء اپنے چھوٹے بھائی کو ہدایت کرتے کہ وہ تینوں لڑکوں کے نام سے یعنی نور الحسن فیض الحسن اور عزیز حسین کے نام سے جائیداد خرید لیں اور رقوم کی روانگی کا سلسلہ ان کی زندگی کے آخری دنوں تک جاری رہا۔ حضرت والد کی دوسری اہلیہ الہ آباد کے سید منور علی کی بڑی صاحبزادی ہیں جو الہ آباد سے کانپور آکر اس لئے آباد ہو گئے تھے کہ ان کی بہن ثریا بیگم کی شادی ننھے نواب سے (جو نواب آغا میر وزیر اودھ کے صاحبزادے تھے) ہوگئی تھی ان ہی ننھے نواب کی بہن کی شادی نواب دولہا سے ہوئی تھی جن کا احاطہ نواب صاحب آج بھی کانپور میں بے حد مشہور ہے۔ ننھے نواب ہی کے تعلق سے ثریا بیگم کو وثیقہ ملا اور ان کے رشتے سے بتولن بیگم کو بھی ایک معقول وثیقہ ملتا رہا جس کا کچھ حصہ ان کے صاحبزادے محمد احمد کو بھی ملا اور وہ قیام پاکستان تک یہ وثیقہ وصول کرتے رہے۔

مرض الموت

حضرت فخر العلماء کو جب کانپور میں قیام کرتے ۱۲/ سال کی مدت ہوگئی تو آپ بیمار پڑے، لیکن خاندانی روایت کے مطابق آپ ذیابطیس کے پرانے مریض تھے اور یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ بعض حلقے کہتے ہیں کہ شنگرف کے کشتہ کے ردعمل نے ان کو مرض الموت میں مبتلا کردیا، بہرحال کوئی صورت ہو حضرت فخر العلماء نے ابتداء میں خود اپنا علاج کیا مگر جب وہ مایوس ہوگئے، تو پھر انہوں نے دوسرے حکماء سے رجوع کیا، لیکن ان حکیموں نے جو دوائیں بھی تجویز کیں حضرت فخر الحکماء ان کو پہلے ہی استعمال کر چکے تھے، جناب دور ہاشمی کی یاد

داشت کے مطابق جب حکیم صاحب کا زمانہ رحلت کے قریب آیا تو دوسرے مشہور طبیب حکیم صاحب کے پاس آتے تھے اور اپنے مجوزہ نسخے حکیم صاحب کو استعمال کرنے کی ترغیب دیتے تھے لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہتی تھی جب حکیم صاحب یہ فرماتے تھے کہ وہ یہ دوائیں پہلے ہی استعمال کر چکے ہیں۔" الغرض حضرت فخر العلماء ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں وصال فرما گئے اور بساطیوں کے قبرستان میں دفن ہوئے، آپ کے انتقال پر آپ کے احباب میں غم و افسوس کی لہر دوڑ گئی اور مولوی عبدالجلیل وکیل نے آبدیدہ ہوکر کہا کہ حکیم صاحب کی وفات نہیں ہم لوگوں کی وفات ہے اور یہ بات آگے چل کر صحیح بھی ثابت ہوئی۔ مولانا عبدالحی نے بھی نزہتہ الخواطر میں یہی لکھا ہے کہ حضرت فخر العلماء نے ۱۳۱۵ھ میں وفات پائی ہمولانا انوار الحسن شیر کوٹی اور دوسرے بزرگوں نے حضرت فخر العلماء کے سن وفات کے بارے میں جو قیاس آرائیاں کی ہیں وہ نادانستہ طور پر غلط ہیں اور صحیح سن وفات ۱۳۱۵ھ ہی ہے اس لئے کہ آپ کی رحلت کے بعد آپ کے دوسرے صاحبزادے مولانا حافظ فیض الحسن گنگوہی کی ہدایت پر ابوداؤد شریف کا جو حاشیہ مطبع مجیدی سے شائع ہوا اس میں بھی ۱۳۱۵ھ کا سن پڑا ہے۔

عجیب وغریب خواب

یہ سال اس لحاظ سے حضرت فخر العلماء کے خاندان اور احباب پر بھاری تھا کہ اس سال یکے بعد دیگرے کانپور میں چار اموات ہوئیں، خاندانی روایات کے مطابق مولوی عبدالجلیل کے خاندان میں ایک خاتون نے انہیں ان کے رشتہ کے ایک عزیز قاضی احمد حسین اور حضرت فخر العلماء کو ایک سرسبز باغ میں کھانا کھاتے ہوئے دیکھا، یہی چاروں دوست یکے بعد یگرے اسی سن ۱۳۱۵ھ میں سوا سوا مہینہ کے وقفہ سے انتقال فرما گئے۔ اور چاروں کا مرض الموت ایک تھا، لیکن پہلے ایک پھنسی نکلتی تھی جو بڑھ کر ناسور بنتی تھی، یہاں تک کہ یہ مرض جان لیوا بن جاتا اس روایت سے اس بیان کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ آپ کا انتقال ذیابطیس کی وجہ سے ہوا بہرحال یہ سال کانپور کے مسلمانوں پر بہت بھاری تھا۔

حلیہ

آپ کے پوتے دور ہاشمی کانپوری نے تحریر فرمایا ہے کہ فخر العلماء میانہ قد، گداز جسم،

آنکھیں خوشنما اور جاذب، دانت بے حد حسین یعنی چہرہ بھرا ہوا، رنگ گندمی، داڑھی گھنی نصف ماہ کامل کی صورت میں۔" مولانا عبدالحئی نے نزہتہ الخواطر کی جلد آٹھ کے صفحہ ۲۵۴ میں ارقام فرمایا ہے کہ حضرت فخر العلماء صورتاً حسین وجمیل اور خوش مزاج انسان تھے" اور یہی بات دوسری کتابوں میں بھی مرقوم ہے۔

حضرت فخر العلماء کی اولاد واپس گنگوہ میں

آپ کی رحلت کے بعد آپ کے خاندان میں بے حد غم منایا گیا آپ کی والدہ بھائی اور بہن سب صدمہ سے غم جاں ہو گئے، اور آپ کے بھائی کانپور آکر اپنے دونوں بھتیجوں کو گنگوہ لے گئے، چھوٹے بھتیجے جو بہت ہی کم سن تھے، اپنی والدہ کے ساتھ کانپور ہی رہے جنھوں نے کانپور کے قاضی خاندان میں عقد ثانی کر لیا تھا، لیکن آپ کے فرزندوں کا گنگوہ میں دل نہ لگا اور یہ لوگ پھر کانپور واپس آگئے، کانپور آنے کی ایک وجہ مسماۃ بتولن کا انتقال بھی تھا جو اپنی دوسری شادی کے بعد ایام زچگی میں ہی فوت ہوگئیں۔ بات یہ تھی کہ جب حضرت فخرالحکماء کے یہاں ولادت ہوئی تھی تو حضرت والا نے زچگی کے دوسرے دن ہی انہیں ساتھ دستر خوان پر بٹھا کر کھانا کھلایا تھا مرحومہ یہ سمجھیں کہ یہ بات معمول کے مطابق ہے، وہ یہ بھول گئیں کہ حکیم صاحب نے انہیں گولیاں بھی کھلائی تھیں جن کے باعث وہ زچگی کے دوسرے دن ہی کھانے پینے کے قابل ہوگئیں تھیں۔ جب دوسرے عقد کے بعد ان کے یہاں زچگی ہوئی تو انہوں نے دوسرے دن معمول کے مطابق کھانا پینا شروع کیا جو سم قاتل بن گیا اور ان کی رحلت کا سبب بنا اب یہ دونوں بھائی تھے اور ان کے تیسرے چھوٹے بھائی جن کا واحد سہارا اب یہی دونوں رہ گئے تھے۔

مرثیہ

حضرت فخر العلماء کے یہ دونوں فرزند ابھی پوری طرح جوان بھی نہیں ہوئے تھے کہ انہیں اپنے والد کے حادثۂ رحلت سے دوچار ہونا پڑا، پھر اپنے تیسرے بھائی کی تربیت اور پرورش اور سب میں اہم بات یہ کہ تعلیم تکمیل کا مسئلہ، ایسے عالم میں جس قدر غم کیا جائے کم ہے۔ آپ کے فرزند ثانی حضرت مولانا حافظ فیض الحسن نے اس عالم میں اپنے والد کی رحلت

پر جو مرثیہ کہا وہ اصول الشاشی مع عمدۃ الحواشی میں شائع ہو چکا ہے جس سے ان کے دلی کرب اور قلبی افسوس کا اظہار ہوتا ہے۔

بیعت

حضرت فخر العلماء جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے حضرت قاسم العلوم کے عاشق تھے، لہٰذا انہیں اپنی روحانی تسکین کیلئے بھی کسی اور کے سامنے دامن پھیلانے کی ضرورت نہیں ہوئی، لہٰذا آپ دوران طالب علمی میں ہی اپنے استاد مکرم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو گئے تھے، یہ اور بات ہے کہ حضرت قاسم العلوم کے تمام سوانح نگاروں نے حضرت فخر العلماء کا نام ان کے مریدوں میں نہیں لکھا ہے، ان کی تسکین کیلئے حجۃ الاسلام کی اس ابتدائی عبارت کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے جس میں حضرت فخر العلماء نے اپنے استاد مکرم کے نام کے ساتھ مرشد کا لفظ بھی استعمال کیا ہے، یہ عبارت اپنے مقام پر نقل کی جا چکی ہے اور یہ عبارت جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے انوار قاسمی کے صفحہ ۴۴۹ میں بھی نقل کی ہے اور یہ کتاب حضرت قاسم العلوم کے دوران حیات میں طبع ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس کے غلط ہونے کا شبہ نہیں کیا جا سکتا، البتہ حضرت قاسم العلوم کے انتقال کے بعد حضرت فخر العلماء نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے دوبارہ بیعت کی اور اسی بیعت کے سلسلہ میں انہوں نے اپنے سگے خالہ زاد بھائی حضرت مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کی امداد حاصل کی، یہ وہ زمانہ ہے جب حضرت فخر العلماء حضرت قاسم العلوم کی وفات کے بعد گنگوہ سے دہلی تشریف لے گئے تھے، اور ایک طرف معارف قاسمی کی اشاعت میں مصروف و منہمک تھے اور دوسری جانب وہ حکیم محمود خان سے طب کی تعلیم حاصل کر رہے تھے یہ دور ۱۲۹۷ھ سے لے کر ۱۳۰۳ھ تک کا ہے۔ انکی حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے دوبارہ بیعت کا تذکرہ ان متعدد خطوط میں ہے جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے اپنے خلیفہ حضرت مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کو لکھے، جو اس زمانہ میں بسلسلہ درس و تدریس دہلی میں مقیم تھے، یہ خطوط مکاتیب رشیدیہ میں نمبر ۲۲، ۲۳، ۲۷، اور ۳۶ میں موجود ہیں، ان خطوط سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت گنگوہی حضرت قاسم العلوم کے متبعین کیلئے بیحد ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے۔

مکتوب نمبر ۲۲، میں جس میں ۴/ رجب ۱۳۰۱ھ کی تاریخ درج ہے۔

حضرت گنگوہی نے مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کو تحریر فرمایا ہے کہ میں بخیریت ہوں جواب آپ کے چار خط کا سابق روانہ کر چکا تھا اب ایک اور خط آیا ہے جس میں مولوی فخر الحسن صاحب کا خط ہے، اس کا جواب تو وہی جواب ہے جو پہلے لکھ چکا ہوں (گویا دوبارہ بیعت کا مسئلہ پہلے سے چل رہا تھا) اور اگر (وہ) خوامخواہ مجھ سے تعلق بلاواسطہ چاہتے ہیں تو اب کے ملاقات تک ملتوی رکھیں اور چند بار استخارہ کر لیویں بعد استخارہ قرار رائے بروقت دیکھا جائے گا کچھ جلدی کی بات نہیں" اتنا لکھنے کے بعد اور معاملات میں اظہار کیا گیا ہے، آگے چل کر پھر اسی خط میں تحریر فرماتے ہیں اور اس مرتبہ مولانا فخر الحسن سے براہ راست تخاطب ہے کہ پیر جی فخر الحسن اگر آپ سے (مولانا صدیق احمد) بیعت کر لیویں تو بہتر ہے ورنہ جواب اول لکھ چکا ہوں اسی پر عمل کریں، پیر جی صاحب کو بعد سلام مسنون مضمون واحد ہے مستطیل خط کی ضرورت نہیں" خط نمبر ۲۳ میں جو مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کے نام ہے اور جس پر ۶ر شعبان ۱۳۰۱ھ کی تاریخ درج ہے۔ مولانا رشید احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ مولوی فخر الحسن کے واسطے جیسا آپ نے مناسب جانا بہتر ہے، اب سردست ان کو ذکر جہر بارہ تسبیح معمول چشتیہ تلقین فرماویں وہ کرتے رہیں پھر وقت ملاقات دیکھا جائے گا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ بیعت کے بارے میں گفتگو جاری ہے اور بیعت کا انحصار حضرت فخر العلماء کے گنگوہ جانے پر ہے۔ خط نمبر ۲۷ سے پتہ چلتا ہے کہ فخر العلماء گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد سے مل لئے اور مل کر دہلی واپس چلے گئے گویا بیعت ہو گئی، اس خط میں جو اس سے پہلے کے خطوں کی طرح حضرت مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کے نام ہے حضرت گنگوہی فرماتے ہیں کہ "یہاں سب طرح عافیت ہے مولوی فخر الحسن جاتے تھے انکو خط نہ دے سکا، طبع نے تحریر سے کاہلی کی آج جمعہ کو لکھتا ہوں" اس خط پر ۱۳۰۲ھ کا سن دیا ہے، گویا بیعت کے تذکرہ اور بیعت میں ایک سال کا تفاوت ہے۔

اس کے بعد مولانا صدیق احمد صاحب کے نام ایک اور خط میں جس پر ۱۳۰۳ھ کا سن دیا ہے حضرت مولانا رشید احمد نے تحریر فرمایا کہ مولوی عبد الصمد صاحب کو بھی سلام مسنون فرمادیں، حافظ خیر الدین صاحب اگر ہوں سلام پہنچے اور مولوی پیر جی فخر الحسن کو بھی فقط" اس کے بعد ایک اور خط میں جو مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے نام ہے حضرت مولانا رشید احمد صاحب نے مولانا فخر الحسن صاحب کا تذکرہ کیا ہے، یہ خط مکاتیب رشیدیہ میں

نمبر ۴۲ پر ہے، ان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت فخر العلماء نے حضرت قاسم العلوم کی وفات کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت کی تھی، حضرت فخر العلماء کے دوسرے صاحبزادے حضرت مولانا فیض الحسن گنگوہی نے جو اپنے حقیقی پھوپھا حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے خلیفہ بھی تھے، سنن ابوداؤد مطبوعہ مجیدی پریس کانپور کیلئے جو مقدمہ تحریر کیا ہے اور جو سنن ابوداؤد میں موجود ہے لکھا ہے کہ حضرت فخر العلماء فخر المحدثین مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں تھے اور انہوں نے سلطان الاولیاء مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بھی شرف بیعت و تلمذ حاصل کیا" جناب محمد اسمٰعیل انصاری گنگوہی نے بعض کتابوں میں یہ بھی پڑھا ہے کہ حضرت فخر العلماء کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی بیعت کا شرف حاصل تھا، جناب اسمٰعیل انصاری کی تحریر سے متعلقہ اقتباس پیش خدمت ہے۔

جناب اسمٰعیل انصاری فرماتے ہیں کہ "حضرت والا کی بیعت کے متعلق بھی میں سند سے کوئی بات نہیں کہہ سکتا ان کی بیعت حضرت مولانا گنگوہی سے ہوئی، اگرچہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے جس کی نشاندہی کرنے سے بوجہ اپنی معذوری (علالت) کے فی الحال قاصر ہوں، بہرحال بیعت حضرت گنگوہی سے ہوئی تھی مجھے یاد ہے کہ جب میری گفتگو عزیزی الطاف سلمہ (برادر خورد راقم الحروف) سے ہوئی تھی اس وقت کوئی تذکرہ میرے پیش نظر تھا۔ جس میں حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ کی حضرت والا (حضرت فخر العلماء) کو ہدایت کا ذکر تھا، اب نہ اس کتاب کا نام ذہن میں ہے اور نہ تذکرہ کی تفصیل یاد ہے بہرحال حضرت فخر العلماء کی حضرت قاسم العلوم سے اور ان کی رحلت کے بعد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تو متذکرہ بالا حوالوں سے ثابت ہے، رہا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا معاملہ تو یہ بھی بعید از حقیقت نہیں معلوم ہوتا کہ آپ کے اکثر احباب (جن میں سید العلماء مولانا احمد حسن امروہی رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں) کی حاجی صاحب سے بیعت ثابت ہے۔

تصنیف و تالیف

جیسا کہ پہلے مختصراً بیان کیا جا چکا ہے حضرت فخر العلماء نے علوم و معارف قاسمی کی ترتیب و تشہیر کے ساتھ ساتھ علوم حدیث میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا، حضرت

قاسم العلوم کے ایک خط میں جو فیوض قاسمیہ کے صفحہ ۳۸/۳۹/۴۰/۴۱ میں موجود ہے تذکرۂ بتایا گیا ہے کہ حضرت فخر العلماء ابن ماجہ کی تصحیح کے سلسلہ میں کچھ روز کیلئے دہلی میں ہیں اور یہ کہ یہ کتاب میر معظم علی کے مطبع میں طبع ہو رہی ہے۔ مولانا سید احمد رضا بجنوری نقشبندی مجددی نے انوار الباری شرح اردو صحیح بخاری کی جلد دوم کے صفحہ ۲۲۷ میں "حضرت مولانا الحاج حافظ حکیم سید فخر الحسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کے سلسلہ میں تحریر فرمایا ہے کہ آپ حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی کے ارشد تلامذہ میں تھے، زیادہ مدت کانپور میں قیام فرمایا وہاں مطب کا مشغلہ تھا حدیث کے بہت بڑے جلیل القدر عالم تھے، سنن ابن ماجہ کا حاشیہ لکھا جو مشہور و معروف ہے اور کئی بار چھپ چکا ہے، اس میں آپ نے علامہ سیوطی اور حضرت شیخ عبد الغنی مجددی دہلوی کی شروح ابن ماجہ کو مزید اضافوں کے ساتھ جمع فرمایا ہے، سنن ابی داؤد کا حاشیہ درس محمود کے نام سے نہایت تحقیق کے ساتھ لکھا۔ ابوداؤد کے ساتھ بھی بظاہر درس کا مشغلہ نہیں رہا مطب کی مصروفیات اور وہ بھی کانپور جیسے بڑے شہر میں ان حالات میں اسقدر عظیم الشان علمی حدیثی تصنیفی خدمات کر جانا مذکور الصدور شیخین اور معلمین کی برکات و کرامات میں سے ہے۔

جس طرح ہمارے معظم و محترم مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری تلمیذ خاص حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی باوجود غیر معمولی مصروفیت مطب اور بغیر علمی درسی مشغلہ کے علم کلام و عقائد کے نہایت اہم دقیق مسائل پر اور رد شیعہ وغیرہ میں بڑی تحقیق سے فصیح و بلیغ عربی، فارسی زبان میں کتابیں تالیف فرمائی تھیں (جو شائع ہونے کے بعد نادر ہو چکی ہیں) اس دور انحطاط میں اس قسم کے نمونے! اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ ان حضرات کے اعلیٰ روحانی و باطنی کمالات کے اظہار کے عین کرشمے تھے" جناب عبد الرشید نعمانی نے سنن ابن ماجہ سے متعلق بڑی تقطیع پر جو رسالہ عربی زبان میں تحریر فرمایا ہے اور جسے نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی نے شائع کیا ہے، اس کے صفحہ ۵۲ پر حضرت فخر العلماء کے علمی کارناموں کا تذکرہ ہے جس کا اردو ترجمہ حضرت مولانا فاروق احمد انبیٹھوی کے دو صاحبزادے حضرت مولانا محمد احمد نے جن کی تبلیغی خدمات سے تمام اہل پاکستان واقف ہیں، اور جو جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے ایک معزز استاد ہیں کیا ہے۔ یہ ترجمہ ذیل میں پیش خدمت ہے "شارحین ابن ماجہ میں سے محدث فخر الحسن گنگوہی ہیں ابن ماجہ پر ایک طویل اور نفیس حاشیہ لکھا ہے۔ جس

کو انجاح الحاجتہ مصنفہ شیخ عبد الغنی دہلوی اور مصباح الزجاجتہ مصنفہ سیوطی سے جمع کیا ہے، اور پھر اس میں اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ کیا ہے اور یہ حاشیہ کتاب ابن ماجہ کے ساتھ چھپ چکا ہے اور اس حاشیہ کی عظمت وافادیت کا اندازہ شیخ فیض الحسن (حضرت فخر العلماء کے صاحبزادے) کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے۔ جو انہوں نے ابو داؤد کے مقدمہ میں ذکر کئے ہیں۔ یہ حاشیہ کئی بار طبع ہو چکا ہے اور یکے بعد دیگرے لوگ اس سے سیراب ہو رہے ہیں اور علمائے کاملین نے استفادہ اور اس کی مقبولیت کے پیش نظر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے، شیخ فخر الحسن حضرت عارف باللہ علامہ محمد قاسم نانوتویؒ اور محدث نیکو کار مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے تلامذہ میں سے ہیں ان کا ایک بہترین حاشیہ سنن ابی داؤد پر بھی ہے، جس کا نام تعلیق المحمود ہے اور یہ دونوں حاشیے ہندوستان میں طبع ہو چکے ہیں، اور ان دونوں حاشیوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ علوم وفنون حدیث میں (حضرت فخر العلماء کو) بہت اچھا مقام حاصل تھا لیکن مجھے ان کی سوانح اور تاریخ وفات کے متعلق واقفیت حاصل نہیں ہو سکی" جناب عبد الرشد نعمانی کی عربی عبارت کے ترجمہ کے بعد یہ عبارت تحریر ہے ترجمہ احقر الانام محمد احمد الانصاری الراجی الی رحمتہ بہ البارى الاستاذ فی الحدیث بالجامعہ۔

سنن ابن ماجہ

جناب عبد الرشید نعمانی نے امام ابن ماجہ اور علم حدیث میں جو کتاب تصنیف فرمائی ہے اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ صحاح ستہ کی کتابوں میں سنن ابن ماجہ کا نمبر چھٹا ہے، آپ نے فرمایا ہے کہ یہ کتاب دو حیثیتوں کے اعتبار سے تمام صحاح ستہ میں ممتاز ہے ایک حسن ترتیب، یعنی جس خوبی اور عمدگی کے ساتھ احادیث کو ابواب وار بغیر کسی تکرار کے اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے، اور دوسری کتابوں میں بیان نہیں کیا گیا ہے اور یہی اس کی وہ خوبی ہے کہ جس کو دیکھ کر ان کے شیخ حافظ ابو ذرعہ رازی کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے تھے" اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی تو فن حدیث کی اکثر جوامع اور مصنفات بیکار اور معطل ہو کر رہ جائیں گی" دوسری نمایاں خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ یہ بہت سی ان حدیثوں پر مشتمل ہے کہ جن سے صحاح ستہ کی دوسری کتابیں (یعنی صحیح بخاری، مسلم، سنن نسائی،

شرح ابی داؤد اور جامع ترمذی) یکسر خالی ہیں اور اس بناء پر اس کی افادیت اور کتابوں سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے، صحابہ کرام میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا یہ معمول تھا کہ وہ عام طور پر ایسی حدیثیں بیان کیا کرتے تھے جو اوروں کو معلوم نہیں تھیں، علامہ ابوالحسن سندھی کی رائے میں امام ابن ماجہ کا یہ طرز عمل حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے اتباع پر مبنی ہے، سنن ابن ماجہ میں بہت سی زائد حدیثوں کا پایا جانا ہی اس کا وہ امتیاز ہے کہ جس کو دیکھ کر بہت سے حفاظ وقت نے صحاح کی تعداد پانچ سے بڑھا کر چھ کر دی۔

جناب عبدالرشید نعمانی کے بیان کے مطابق "تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے سنن ابن ماجہ کو کتب ستہ کے مقابلے میں اس کو جگہ دی وہ حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی المتوفی ۵۰۷ھ ہیں۔ بعد کو تمام مصنفین اطراف رجال نے ان کی رائے سے اتفاق کیا چنانچہ حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ "پھر مصنفین اطراف ورجال نے ان ہی کی متابعت کی" اور باب رجال میں سب سے پہلے حافظ عبدالغنی مقدس المتوفی ۶۰۰ھ نے الکمال فی اسماء الرجال میں ان چھ کتابوں کے رجال کو یکجا مدون کیا ہے اس کے بعد حدیث کے علماء میں اس بات پر اختلاف ہوا کہ چھٹی کتاب صحاح میں ابن ماجہ کو تسلیم کیا جائے یا امام مالک کی کتاب موطا کو، حافظ ابن طاہر کے معاصر محدث زرین بن معاویہ عبدی زرقسطوی مالکی المتوفی ۵۲۵ھ نے صحاح کی چھٹی کتاب موطا امام مالک کو بنایا ہے اور محدث مبارک بن محمد المعروف با بن الاثیر جوزی المتوفی ۶۰۶ھ نے محدث زریں کی رائے سے اتفاق کیا، اور علامہ محدث عبدالغنی مابلسی حنفی ۱۱۴۳ھ اپنی مشہور کتاب ذخائر الحواریث کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ "چھٹی کتاب کے بارے میں اختلاف ہے اہل مشرق کے نزدیک ابو عبداللہ محمد بن ماجہ کی کتاب السنن ہے اور اہل مغرب کے نزدیک امام مالک بن انس اصبحی کی کتاب موطا۔ لیکن محدث ابوالحسن سندھی لکھتے ہیں کہ "عام مناظرین اس طرف ہیں کہ یہ (سنن ابن ماجہ) صحاح ستہ کی چھٹی کتاب ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ "ان علماء نے اس کو موطا پر اس لئے مقدم رکھا کہ اس میں کتب خمسہ سے بہت سی روایتیں زائد ہیں برخلاف موطا کے کہ اس میں یہ بات نہیں ہے ورنہ صحت وقوت روایات کے لحاظ سے سنن ابن ماجہ کیا صحاح ستہ کی کوئی کتاب بھی موطا کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جاسکتی، مشہور مورخ ابن خلکان نے بھی سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ کی چھٹی کتاب تسلیم

کیا ہے، جناب عبدالرشید نعمانی نے لکھا ہے کہ "ابن ماجہ نے اپنی کتاب کی ترتیب وتدوین اور احادیث کے انتخاب میں بڑی جانفشانی اورعرق ریزی سے کام لیا ہے اور متعدد جگہ غریب احادیث کی تفصیل دی ہے، مختلف بلاد کی جو مخصوص روایات ہیں ان کی نشان دہی کی ہے۔ غرض امام ابن ماجہ نے لاکھوں احادیث کے ذخیرہ سے چار ہزار روایات کا انتخاب کر کے ان کو مختلف ابواب کے تحت پوری مناسبت کے ساتھ درج کیا ہے تاہم چونکہ سنن ابن ماجہ میں کتب ستہ کی نسبت ضعیف حدیثیں زیادہ ہیں اس لئے اس کا درجہ صحاح ستہ میں سب سے فروتر ہے، لیکن واضح رہے کہ یہ ترجیح بحیثیت مجموعی ہے یعنی صحاح ستہ کی کتابوں کو مجموعی حیثیت سے صحت کے لحاظ سے اس پر ترجیح حاصل ہے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ "سنن ابن ماجہ میں بتیس (۳۲) کتابیں پندرہ سو ابواب اور چار ہزار حدیثیں ہیں جو تھوڑی سی روایات کے علاوہ سب کی سب عمدہ ہیں، لیکن بقول مولانا عبدالرشید نعمانی سنن ابن ماجہ پر جتنا کام ہوا ہے وہ صحاح ستہ کی تیسری کتاب سنن نسائی پر بھی نہیں ہوا" آپ نے جو فہرست دی ہے اس کے مطابق سنن ابن ماجہ پر ۹ر مختلف محدثوں نے کام کیا ہے لیکن اس میں حضرت فخر العلماء کی شرح کے بارے میں آپ نے یہ لکھا ہے کہ حاشیہ بر سنن ابن ماجہ مولانا فخر الحسن گنگوہی نہایت مشہور اور مقبول حاشیہ ہے جو بارہا طبع ہو چکا ہے اس حاشیہ میں علامہ سیوطی اور مولانا عبدالغنی دونوں کی شرحوں کو مع مزید اضافہ کے جمع کر دیا ہے، یہ کام علامہ نعمانی کی بیان کی ہوئی دیگر آٹھ کتابوں میں نہیں ہے، علامہ نعمانی کے بقول علامہ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ء کے حاشیہ کا نام مصباح الزجاجہ سنن ابن ماجہ ہے جو بقول ان کے "یہ بھی ایک مختصر سا حاشیہ ہے شیخ علی بن سلیمان نے اس کا بھی اختصار کیا ہے جس کا نام نور مصباح الزجاجہ ہے یہ اختصار مصر میں طبع ہو چکا ہے۔"

علامہ نعمانی نے شیخ عبدالغنی بن ابی سعید مجددی دہلوی حنفی المتوفی ۱۲۹۵ء کی شرح کا نام بانجاح الحاجہ بہ شرح سنن ابن ماجہ بتایا ہے اور لکھا ہے، کہ یہ بھی ایک مختصر مگر جامع اور عمدہ حاشیہ ہے "حقیقت یہ ہے کہ فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن محدث گنگوہی نے سنن ابن ماجہ کے حاشیہ میں اس مشہور کتاب کے بہترین حواشی کا نچوڑ پیش کیا ہے، اور نہ صرف یہ اہم خدامت انجام دی ہے بلکہ اس کے ساتھ اپنی جانب سے نہایت مفید اور عالمانہ اضافے بھی فرمائے ہیں اس لئے آج تک آپ کے اس علمی کارنامہ کی مقبولیت قائم ہے اور اس

امر کے باوجود کہ آپ کی علمی شخصیت پر اب تک ایک گہرا اور دبیز پردہ پڑا ہے آپ کی یہ تصنیف اپنی خوبیوں کی وجہ سے علمی حلقوں میں برابر قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ سنن ابن ماجہ کے متعدد نسخے شائع ہو چکے ہیں، جن میں مطبع مجیدی کا مطبوعہ نسخہ خاص شہرت کا حامل ہے، لیکن فخر العلماء نے سنن ابن ماجہ پر پہلے پہلے دہلی میں کام کیا اور اس کا ذکر حضرت قاسم العلوم کے مطبوعہ خطوط میں بھی موجود ہے، حضرت فخر العلماء کی اس ضمن میں کوششوں کا تذکرہ سنن ابن ماجہ مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی کے آخری حصہ پر بھی ملتا ہے، یہ تحریر حسب ذیل ہے "مشتاقان احادیث نبوی کو مژدہ وبشارت اور طالبان آثار واخبار خیر الانام کو نوید ونظارت ہو کہ ان دنوں میں بہ توفیق خالق لیل ونہار سنن ابن ماجہ کو جس کو جناب عالم فاضل محدث کامل مولانا مولوی فخر الحسن گنگوہی نے بہ اہتمام تمام فرمایا اور جہاں ضرورت ہوئی تو اپنی طرف سے توضیح مطالب کو کرسئ ظہور پر بٹھایا، مطالب کی تشریح ایسی ہے کہ الفاظ سے پہلے مضمون ذہن میں آجائے گا، غرض جو دیکھے گا حظ وافر اٹھائے گا، اب پھر دوسری بار بہ تصحیح کامل مولانا محمد طاہر مطبع فاروقی دہلی میں اول سے نصف تک بندہ کمترین مالک مطبع کے اہتمام سے اور نصف آخر مطبع مجتبائی دہلی میں بہ اجازت بندہ عاجز بہ اہتمام مولوی عبد الاحد نہایت کوشش اور سعی بلیغ سے چھپوائی گئی ہے۔"

اس عبارت کے اختتام پر محمد معظم مہتمم مطبع فاروقی کا نام دیا گیا ہے، اور یہ ہدایت کی گئی ہے کہ کوئی اور اس کی اشاعت کا قصد نہ کرے مگر اس حاشیہ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ یہ متواتر چھپ رہا ہے اور جیسا کہ مولانا عبد الرشید نعمانی نے اپنی متذکرہ کتاب "ابن ماجہ اور فن حدیث" میں ذکر کیا ہے یہ حاشیہ نہایت کار آمد ہے۔

سنن ابوداؤد

امام ابوداؤد سجستانی نے اپنی کتاب السنن کا انتخاب پانچ لاکھ احادیث کو سامنے رکھ کر کیا ہے چنانچہ خود ان کا بیان ہے کہ "میں نے رسول اللہ ﷺ کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں جن سے ان روایات کا انتخاب کیا ہے جو اس کتاب میں درج ہیں" چونکہ امام ابوداؤد پر فقہی رنگ غالب تھا، اس لئے "اس کتاب میں آپ کو دیگر کتب کی طرح زہد اور فضائل اعمال وغیرہ کی حدیثیں نہیں ملیں گی، اور گو اس بناء پر احادیث کے بہت سے ابواب سے یہ

کتاب خالی ہے، لیکن فقہی احادیث کا جتنا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں ہے صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں آپ کو نہیں ملے گا، چنانچہ امام حافظ ابو جعفر بن زبیر غرناطی المتوفی ۷۰۸ھ صحاح ستہ کی خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ "احادیث فقہیہ کے امور میں ابو داؤد کو جو بات حاصل ہے وہ دوسرے مصنفین صحاح ستہ کو نہیں" خود امام ابو داؤد نے لکھا ہے کہ "میں نے کتاب السنن میں صرف احکام ہی کو تصنیف کیا ہے زہد اور فضائل اعمال وغیرہ کو تصنیف نہیں کیا" امام غزالی نے اسی بناء پر تصریح کی ہے کہ علم حدیث میں صرف یہی ایک کتاب مجتہد کیلئے کافی ہے، اور محدث زکریا ساجی کے الفاظ یہ ہیں "اصل اسلام کتاب اللہ ہے اور فرمان اسلام سنن ابی داؤد" حافظ ابو محمد عبد اللہ نے لکھا ہے کہ وہ چار ائمہ کو جنھوں نے صحیح حدیث کی تشریح کی اور ثابت کو سقیم سے اور خطا کو صواب سے جدا کیا یہ چار ہیں۔ بخاری مسلم ابو داؤد اور نسائی، جناب عبد الرشید نعمانی نے لکھا ہے کہ "امام ابو داؤد نے کتاب السنن کی تکمیل اپنے عہد شباب ہی میں کر لی تھی یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ان کے شیخ امام احمد ابن حنبل زندہ تھے، امام ابو داؤد نے جب یہ کتاب امام ممدوح کی خدمت میں پیش کی تو امام ممدوح نے اسے پسند فرمایا اور اس کی تحسین کی، تصنیف ہونے کے ساتھ ساتھ ہی حق تعالیٰ نے اس کتاب کو جو قبول عام بخشا وہ صحاح ستہ میں کسی کتاب کو نصیب نہیں ہو سکا، چنانچہ امام موصوف کے شاگرد حافظ محمد بن وردی المتوفی ۳۳۱ھ کا بیان ہے کہ "جب انہوں نے کتاب السنن تصنیف کی اور اس کو لوگوں کے سامنے پیش کیا تو محدثین کیلئے ان کی کتاب قرآن کی طرح قابل اتباع بن گئی"

سنن ابو داؤد پر بہت کم کام ہوا

حالانکہ ابو داؤد صحاح ستہ کی چوتھی کتاب ہے اور اس کا درجہ بخاری مسلم اور نسائی کے بعد ہے اور اگرچہ اس کو مقبولیت عامہ حاصل ہوئی لیکن محدثین نے اس کتاب پر بہت کم کام کیا اور اس کی کوئی قابل ذکر شرح نہیں لکھی گئی اور نہ اس کا کوئی حاشیہ اچھا دستیاب تھا، یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے ہندوستان جیسے دور افتادہ ملک کے ایک دور افتادہ ضلع کے دور افتادہ قصبہ انبیٹھہ اور گنگوہ کے دو عالموں کو جو ایک ہی خاندان کے فرد تھے اس کتاب کی سب سے بہترین شرح اور سب سے بہترین حاشیہ لکھنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ میری مراد

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی سے ہے جو رشتہ میں سالے بہنوئی ہونے کے ساتھ ایک ہی درسگاہ یعنی دار العلوم دیوبند کے پڑھے ہوئے تھے، ابوداؤد کی اچھی شرح نہ ہونے کی تصدیق خود حضرت سہارنپوری نے فرمائی ہے۔ تذکرۃ الخلیل کے صفحہ ۲۶۷/اور ۲۶۸/ پر حدیث اور فقہ کے عنوان کے تحت "سنن ابی داؤد سے خاص اعتنا" کی ذیلی سرخی کے بعد مولانا عاشق الٰہی فرماتے ہیں کہ "کتب حدیث میں ابوداؤد شریف کو بالخصوص آپ مشکل سمجھتے اور اس کے درس میں خاص اہتمام فرمایا کرتے تھے، یہ بات صاحب فن ہی سمجھ سکتا ہے کہ ابوداؤد میں دیگر کتب حدیث کی بہ نسبت کیا اشکال بڑھا ہوا ہے عوام کی فہم کو اس سے تعلق نہیں، مولانا یحییٰ صاحب بھی اس میں حضرت کے ہم خیال تھے اور اس لئے جب سے آپ مدرسہ میں (مظاہر العلوم) تشریف لائے ابوداؤد کا سبق آپ کے پاس یا مولوی یحییٰ صاحب کے پاس رہا، اور آپ نے تیسرے کے پاس اس کا جانا گوارہ نہیں فرمایا، آپ فرماتے تھے کہ ابوداؤد کی بعض عبارتیں ایسی مغلق ہیں کہ مہارت فن کے بعد بھی ان کا حل مشکل ہے نیز صاحب ابی داؤد نے ابواب فقہ کے جمع کرنے کا خود بھی اہتمام کیا اور گویا محدث وفقیہہ دونوں کا منصب پورا فرمایا ہے اس لئے اس کی شان اور بڑھ گئی، پھر اس کی کوئی شرح بھی ایسی شافی وکافی نہیں جو اس کے حل مطالب میں مدد دے سکے، غائۃ المقصود وغیرہ اگرچہ اس کی شرح کہلائیں، مگر ان کے مولف مناظرین اہل حدیث ہیں جو مقلدین کو خاطی ٹھراتے ہیں"۔

اکابرین دیوبند میں سب سے پہلی ہستی حضرت فخر العلماء کی ہے جنھوں نے اس کا نہایت عمدہ حاشیہ تعلیق المحمود کے نام سے لکھا ہے۔ آپ کے صاحبزدے حضرت مولانا حافظ فیض الحسن جو اپنے حقیقی پھوپھا حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے خلیفہ بھی تھے اصول الشاشی مع عمدۃ الحواشی کے صفحہ دوپران دقتوں کا تذکرہ کیا ہے جن کا سامنا حضرت فخر العلماء کو تعلیق المحمود کی تحریر میں کرنا پڑا، حضرت مولانا فیض الحسن فرماتے ہیں کہ "اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں کہ یہ کتاب صحاح ستہ میں جس قدر خدمت کی محتاج تھی اسی قدر بے توجہی کی حالت میں مبتلا تھی۔ (حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے بھی یہی بات فرمائی ہے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے) کسی نے اس کے اغلاط رفع کرنے کی کوشش نہیں کی، کشوری نسخہ غلط در غلط چھپتا اور بکتا رہا کیونکہ عدم سے وجود پھر افضل ہے، ترتیب متن ایسی مشکل ہو گئی تھی کہ

جس کی حد نہیں، بہت سے ابواب موخر بہت سے مقدم بہت سے ساقط ہو گئے تھے۔ سطریں کی سطریں غائب تھیں، موجودہ نسخوں کے حواشی بے حد غیر کافی تھے جن سے مطلب حل نہیں ہوتا تھا نظر براں حضرت والد ماجد مولانا حافظ حکیم مولوی فخر الحسن صاحب مرحوم گنگوہی نے اس کی درستی کی طرف توجہ کی اور بہت سے قلمی صحیح نسخوں سے کئی کئی دفعہ مقابلہ فرمایا اسی طرح متن درست فرما کر اس کے حواشی لکھنے کا ارادہ فرمایا جامع اور مبسوط حاشیہ تصنیف فرمایا جس کا نام تعلیق المحمود رکھا، خاکسار نے اس کی تصحیح اور اہتمام طبع میں دو تین سال تک عرق ریزی کی اور بہ کمال صحت وصفحات ۲۰/۲۶ر تقطیع پر مطبع نامی کانپور میں چھپوائی، حضرت مولانا فیض الحسن گنگوہی کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت فخر العلماء نے تعلیق المحمود کی تصنیف اپنی زندگی کے اواخر میں کی، حضرت مولانا فیض الحسن گنگوہی کی زندگی میں سنن ابوداؤد کی اشاعت کا اہتمام مطبع مجیدی کانپور نے بھی کیا، سنن ابوداؤد مطبوعہ مجیدی پریس کانپور کے آغاز میں حضرت مولانا فیض الحسن گنگوہی کا ابتدائیہ بھی شامل ہے جس میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ابوداؤد کی شرحوں میں علامہ الحاج الحافظ الحکیم مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا حاشیہ اپنی شرح بسط اور معانی ومفہوم کی وضاحت میں اپنی نظیر آپ ہے۔

مولانا شیر کوٹی نے بھی انوار قاسمی کے صفحہ ۵۲۶ر میں اس کا ذکر کر رکھا ہے آپ فرماتے ہیں کہ حضرت فخر العلماء ”کی تصانیف میں حاشیہ ابوداؤد شریف بھی ہے جس کا حوالہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے تذکرۃ الخلیل کے صفحہ ۱۹۲ر پر دیا ہے کہ مولانا خلیل احمد صاحب بذل المجہود شرح ابوداؤد کے لکھتے وقت جو کتابیں زیر مطالعہ رکھتے تھے ان میں سے چھ ابوداؤد کے نسخے تھے جن میں مولانا فخر الحسن گنگوہی کا حاشیہ کردہ نسخہ ابوداؤد مطبوعہ اصح المطابع بھی تھا۔

حضرت مولانا ادریس کاندھلوی جو حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے شاگرد اور بذل کی تصنیف کے وقت سہارنپور میں موجود تھے، فرماتے تھے کہ حضرت سہارنپوری حضرت فخر العلماء کے حاشیہ کی بہت تعریف فرماتے تھے، اور کہا کرتے کہ اس حاشیہ نے ان کی بہت سی مشکلات کو رفع کر دیا، ابوداؤد کا یہ حاشیہ بھی کئی بار شائع ہوا جس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے، راقم نے اس کے کئی ایڈیشن دیکھے ہیں جو مطبع مجیدی کانپور سے وقتاً فوقتاً شائع ہوئے اور مطبع نامی اور اصح المطابع کے نسخوں کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، مولانا عاشق

الٰہی میرٹھی نے بھی یہ لکھا ہے کہ تالیف شرح حدیث کیلئے بڑی ہمت درکار ہے اور اس سرخی کے تحت تذکرۃ الخلیل کے صفحہ ۲۶۸ر میں ارقام فرمایا ہے کہ "تالیف جتنا دشوار کام ہے اس کو کوئی مولفین کے دلوں سے پوچھے بالخصوص شرح حدیث کی تالیف کہ لفظ لفظ پر ادب والتجا اور صنف بشریت ہیچ مدانی کی نذر پیش کرنے کی ضرورت ہے اور وہ آزادی جس کو طبیعت کا چلنا بولتے ہیں کسی وقت نصیب نہیں ہوسکتی۔ ایسے دشوار گذار مراحل سے گزر کر حضرت فخر العلماء نے صحاح ستہ کی دو کتابوں کے معرکتہ الآرا حاشئے لکھے، جو یقیناً علم حدیث کی مہتم بالشان خدمت ہے اور جس کا اجرا نہیں ابد الآباد تک ملتا رہے گا، اور دنیا میں تو انہیں نیک نامی حاصل ہی ہوکر رہی کہ محدث گنگوہی کہلائے اور دنیا کے دینی اور علمی حلقوں میں عزت واحترام حاصل ہوا، جس کا اعتراف ان کی حقیقی بھتیجی بیگم پیرزادہ ضیاء الحق نے کیا ہے بیگم پیرزادہ بیان کرتی ہیں کہ سفر حج کے دوران جب وہ سعودی عرب گئیں اور ارباب علم کو معلوم ہوا کہ وہ حضرت فخر العلماء کی بھتیجی ہیں تو وہاں ان کا بے حد احترام کیا گیا۔

شرح تلخیص المفتاح

حضرت فخر العلماء کی تیسری اہم علمی تصنیف شرح تلخیص المفتاح ہے، جس کا ذکر حضرت مولانا عبد الحئیؒ نے نزہتہ الخواطر کی جلد آٹھ کے صفحہ ۳۵۴ر میں کیا ہے۔ مولانا عبد الحئیؒ نے حضرت فخر العلماء کی تینوں علمی کاوشوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "آپ نے سنن ابوداؤد پر نہایت تفصیلی حاشیہ لکھا ہے جس کا نام تعلیق المحمود ہے، آپ نے تلخیص المفتاح پر بھی مبسوط حاشیہ لکھا ہے اور ابن ماجہ پر بھی اختصار کے ساتھ حاشیہ تحریر فرمایا ہے" شرح تلخیص المفتاح عربی مدارس میں تواتر کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے، درحقیقت یہ کتاب عربی ادب کی ایک اہم کتاب المفتاح العلوم کی تلخیص کی شرح ہے اور مولوی عبد الرحیم ناظم مکتبہ شرقیہ دار العلوم اسلامیہ پشاور کی "فہرست کتب" کے مطابق المفتاح العلوم (عربی) فنون عربیت کے شعبہ ہائے بندگانہ متداولہ پر مشتمل ہے اور اس میں ہر ایک فن کے اصول نہایت جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اس کا ہر ایک باب ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے اس کتاب کے مصنف کا پورا نام ابویعقوب یوسف بن ابی بکر المعروف بہ سراج الدین الخوارزمی سکاکی ہے، مولوی عبد الرحیم نے لکھا ہے کہ علامہ سکاکی علم بلاغت میں کامل دستگاہ رکھتے تھے،

اور عربی فنون میں انہیں امام تسلیم کیا گیا ہے علامہ زاہدی کو بھی ان سے نسبت شاگردی ہے، کہتے ہیں کہ علم تسخیر اور دعوت کواکب میں بھی وہ ید طولےٰ رکھتے تھے۔ سلطان چغتائی خان ابن چنگیز خان کو جب ان کے فضائل کا حال معلوم ہوا تو انہیں بلا کر اپنا مصاحب مقرر کیا آخر کار حبش عمیہ جو بادشاہ مذکور کا وزیر اعظم ہے سلطان کی قربت اور احترام کی وجہ سے ان سے حسد کرنے لگا اور اس کی حاسدانہ کارروائیوں کے باعث امام سکاکی کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اور تین سال قید میں رہ کر انہوں نے ۶۲۶ھ مطابق ۱۲۲۹ء کو قید خانہ ہی میں انتقال فرمایا اور دنیائے اسلام ایک عظیم مفکر اور عالم سے محروم ہو گئی، تلخیص المفتاح اس شہرہ آفاق ادیب کی عظیم کتاب المفتاح العلوم سے اخذ کی گئی ہے اور مولانا عبدالرحیم کے الفاظ میں "تلخیص المفتاح کا ماخذ اس معرکتہ الآرا تصنیف کا فن معانی و بیان ہے اور اس کے تیسرے باب کی تلخیص ہے تلخیص الالمفتاح کے مصنف کا پورا نام جلال الدین محمد بن عبدالرحمٰن القزوینی الشافعی المعروف بہ خطیب دمشق ہے آپ کا ۷۳۹ھ میں وصال ہوا لیکن یہ تلخیص بھی اپنی ادق زبان کی بناء پر شرح کی محتاج تھی، چنانچہ حضرت فخر العلماء نے یہ کارنامہ سرانجام دیا اور اس کے ادق مضامین کو نہایت آسان الفاظ میں بیان فرمایا اور اس میں جابجا اردو اور فارسی کے اشعار کے ذریعہ معانی اور مطالب بیان کئے گئے، شرح تلخیص المفتاح حضرت والا کی زندگی ہی میں طبع ہو گئی تھی اور یہ شرح اس قدر مقبول ہوئی کہ مطبع مجتبائی دہلی کو اسے کئی بار شائع کرنا پڑا، اس کے علاوہ میری نظر سے شرح تلخیص المفتاح کا وہ نسخہ بھی گذرا ہے جو مطبع رحیمیہ دیوبند نے شائع کیا تھا۔

کوششوں کے بعد راقم الحروف کو شرح تلخیص المفتاح کا وہ نسخہ ہاتھ لگا جو مطبع مجتبائی دہلی سے چوتھی بار ماہ ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۶ء میں طبع ہوا تھا، اس نسخہ کے آخری صفحہ پر جو عبارت درج ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ شرح تلخیص المفتاح دوسری بار ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں طبع ہوئی تھی اور اس کے آخری صفحے پر مولانا غلام رسول عادل گڑھی نے تحریر کیا تھا کہ "خدائے بزرگ و برتر اور رسول اللہ ﷺ کی برکت سے شرح تلخیص المفتاح کا اہم کام پایۂ تکمیل کو پہنچا اور الفاظ کو معنی کا زیور پہنایا گیا اور یہ کتاب جو معانی اور مطالب کے لحاظ سے قدرت کا بہت بڑا معجزہ ہے قوم اور ملت کی رہنمائی کرتی رہے گی۔ اور صراط مستقیم دکھاتی رہے گی" اس کے بعد آخر میں یہ تحریر ہے کہ "الحمد اللہ علی احسانہ کہ کتاب ہذا بار چہارم

تصحیح تمام تنقیح بالا کلام بماہ ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۲۶ء بہ اہتمام احقر الانام محمد عبد الاحد عفی عنہ در مطبع مجتبائی واقع دہلی طبع گردید" لیکن افسوس ہے کہ مطبع مجتبائی اور مطبع رحیمیہ کے نسخوں میں کسی ایک کے سرورق پر یہ تحریر نہیں کہ حضرت فخر العلماء نے تلخیص المفتاح کی شرح فرمائی ہے البتہ حاشیہ میں کہیں لفظ فخر سے، کہیں فخر الحسن کے نام سے اور کہیں صرف "ف" سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ اہم مقبول تخلیقی کام حضرت فخر العلماء کا ہے، مولانا غلام رسول عادل گڑھی کی متذکرہ بالا تحریر میں بھی حضرت فخر العلماء کا نام نہیں ہے انہوں نے البتہ یہ ضرور تحریر کیا ہے کہ یہ گراں قدر نسخہ مع مختصر شرح کے تیرہویں صدی ہجری میں شائع ہو رہا ہے اور اسکی طباعت میں یہ پوری کوشش کی گئی ہے کہ یہ اغلاط سے پاک ہو، انہوں نے شرح تلخیص المفتاح مطبوعہ مطبع رحیمیہ کا دار العلوم کراچی کے کتب خانہ میں مطالعہ کیا تو انہیں بڑی حیرت ہوئی اس لئے کہ سرورق پر حضرت فخر العلماء کا نام نہیں تھا، انہیں سب سے بڑی حیرت اس بات پر تھی کہ حضرت مولانا عبد الحئی نے نزہۃ الخواطر میں اس بات کا کیسے تذکرہ کر دیا کہ حضرت فخر العلماء نے شرح تلخیص المفتاح کا کارنامہ سرانجام دیا ہے، لیکن اس وقت راقم الحروف کے پیر بھائی مولانا عاشق الٰہی بلند شہری نے مولانا عبد الحئی کی تحریر کی تصدیق کی اور کہا کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت مولانا فخر الحسن نے اس شرح میں ایک جگہ یہ شعر بھی لکھا ہے۔

مانگا کریں گے ہم بھی دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

اور تلاش کرنے پر یہ شعر شرح تلخیص المفتاح کے صفحہ چار پر مل گیا اس کے بعد تو جا بجا فخر الحسن فخر اور صرف ف نظر آئے گا اور پتہ چلا کہ یہ خطا کہ سرورق پر حضرت فخر العلماء کا نام نہیں ہے ناشرین کی قصداً نہیں بلکہ سہواً ہے، بہرحال یہ کتاب جو عربی ادب کی مشکل ترین کتابوں میں سے ایک سمجھی جاتی ہے حضرت فخر العلماء کی کاوشوں سے عام طالب علم کیلئے نہایت آسان ہو گئی ہے۔ ان تین علمی کاوش کے علاوہ جن کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے مولانا شفیق احمد انبیٹھوی نے جو حضرت مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کے صاحبزادے اور مولانا اعجاز الحق قدوسی کے استاد تھے راقم الحروف کو یہ بتایا تھا کہ حضرت فخر العلماء نے کنز الدقائق کا حاشیہ بھی لکھا تھا لیکن راقم الحروف کو کنز الدقائق کا ایک نسخہ بھی ایسا نہیں ملا جس سے مولانا شفیق احمد

انبیٹھوی کی بات کی تصدیق ہو سکے، راقم نے کنز کے بہت سے حواشی دیکھے مگر انہیں حضرت فخر العلماء کا حاشیہ نظر نہیں آیا۔

حضرت فخر العلماء کی ذہانت اور قابلیت

مولانا حکیم محمد یوسف صاحب گنگوہی حضرت فخر العلماء کی ذہانت اور قابلیت کی بہت تعریف کیا کرتے تھے اور یہ بات ان کے صاحبزادے حکیم محمد یعقوب قدوسی نے راقم کو بھی بتائی، جناب اسمٰعیل انصاری نے بھی لکھا ہے کہ "علمی حیثیت سے حضرت والا (حضرت فخر العلماء) کا مرتبہ بہت بلند تھا اور اپنے زمانہ کے متبحر اور فاضل اہل علم کہلاتے تھے لیکن ان کی ذہانت، استعداد اور قابلیت کے بارے میں جو صحیح رائے ان کے اساتذہ کی ہو سکتی ہے وہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے ان کے بارے میں سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ :۔ آپ عمدہ استعداد کے مالک ہیں، اس قسم کی بات حضرت قاسم العلوم کے کانوکیشن ایڈرس میں بھی ہے۔ جس کا تذکرہ اپنے مقام پر ہو چکا ہے، مجموعہ مکتوبات قاسمی بنام قاسم العلوم کے دس خطوں میں سے تین خط حضرت فخر العلماء کے نام ہیں۔ جن سے نہ صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت قاسم العلوم کی نگاہ میں حضرت فخر العلماء کا کیا مرتبہ تھا بلکہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ استاد اور شاگرد کے درمیان ربط خاص کا سبب حضرت فخر العلماء کی ذہانت اور قابلیت ہے۔

حضرت فخر العلماء کے نام حضرت قاسم العلوم کے پہلے خط کا آغاز جو اس مجموعہ کا نامۂ دہم ہے ان الفاظ سے ہوا، رہین منت ہائے بے پایاں احباب محمد قاسم عفی اللہ عنہ بخدمت سراپا مکرمتہ جامع کمالات عزیزم مولوی فخر الحسن صاحب دامت کمالاتہ" اس کے بعد اسی خط میں آگے چل کر فرماتے ہیں کہ "برادر من اس تمام دانشمندی کے باوجود کہ خدائے تعالیٰ نے (بقول جناب انوار الحسن شیرکوٹی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے نزدیک مولانا فخر الحسن دانشمند تھے اس لئے یہاں ان کیلئے دانشمندی کا لفظ استعمال فرمایا) آپ کو بخشی ہے پھر کیا ضرورت ہے کہ اس ناچیز کو تکالیف دیتے ہیں خیر آپ کی خاطرداری اگر ملحوظ نہ ہوتی تو ظاہری سستی ان جیسے کاموں کیلئے خود مانع ہے، مجبوراً جو کچھ میری ناقص سمجھ میں آتا ہے یہ بندہ تحریر کرتا ہے۔

حضرت قاسم العلوم کے مکتوب ہشتم کا آغاز ان لفظوں سے ہوتا ہے۔ جامع علوم مولوی فخر الحسن صاحب دامت کمالاتہ اس خط کے آغاز میں آپ حضرت فخر العلماء کو لکھتے ہیں کہ "آج احباب کے خطوط کے جوابوں کے لکھنے کی حرکت پیدا ہوئی تو آپ کے خط کا جواب لکھنا بھی یاد آیا، خط تلاش کرنے میں لگ گیا لیکن نہ ملا لیکن آپ کا دوسرا پرانا خط علامہ طوسی کا حضرت علی کی امارت کے بارے میں اور امام معصوم کی ضرورت کے دلائل پر مشتمل خیالات کے متعلق نظر پڑ گیا چونکہ اس کا آخری مضمون بھی وہی ہے کہ جو آخری خط میں تھا، اور اس طرف چونکہ یہ خط بھاگ دوڑ میں وطن پہنچا تھا تو اس کے جواب کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس لئے میری رائے یہ ہوئی کہ اس کے تمام مضامین کا جواب لکھ کر آپ کے پاس بھیج دوں، شاید آپ کے دل سے میرے لئے دعا نکل جائے، اے عزیز اس عاجز کا ہاتھ پکڑنا چاہئے کہ گناہوں کے بوجھ نے خدا جانے مجھے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اس خط کے اس حصہ کی نقل جو کہ فارسی میں ہے یہ ہے "اے عزیز دست ایں افتادہ باید گرفت بارگنا ہم ندانم کجا برد" اسی خط کے آخری جملوں میں شاگرد رشید کیلئے جو الفاظ تحریر فرمائے ہیں وہ بلاشبہ حضرت فخر العلماء کی استعداد، ذہانت اور قابلیت کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ "چونکہ اس قدر لکھنا ان عزیز کیلئے کافی ہے اس لئے اب وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ قلم کو روک لوں کیونکہ اللہ کے فضل سے آں عزیز خود عمدہ استعداد کے مالک ہیں، اپنے حسن ظن سے اس نارسا کو بیکار میں پکڑ لیتے ہیں خیر اگر پسند آئے تو اللہ کی طرف سے سمجھئے کیونکہ اس کے ہاتھ میں فضل ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور اگر میں نے غلط کہا ہو تو مجھے آگاہ فرمائیں کہ ناکارہ نے اسی طرح بے سوچے سمجھے قلم برداشتہ لکھ دیا ہے (جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے لفظ قلم برداشتہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اندازہ لگائیے کہ یہاں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان جیسے مضامین عالیہ کا فی البدیہہ بلا فکری تامل لکھنے کا اظہار کیا ہے اور واقعہ یہی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو علم لدنی سے بہرۂ وافر ملا ہوا تھا) اپنی مجلس میں بیٹھنے والوں کو میری طرف سے سلام پہنچا دیں اور مجھے اپنے مشتاقین ملاقات میں سمجھیں مجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری اور مولوی احمد حسن و مولوی محمود حسن کی طرف سے میرے دل میں کیا رکھ دیا ہے کہ اکثر مجھ کو آپ لوگوں کے کام کی طرف کھینچتے ہیں باقی دعائے خیر میں مجھے یاد رکھیں کہ نجات کا ذریعہ احباب کی دعا کے

سوا اور کچھ نہیں، غالباً مولوی محمود حسن کے نکاح کی تقریب میں دیوبند قدم رنجہ فرمائیں گے، لیکن افسوس کہ علی گڈھ راہ سے ایک طرف واقع ہوا ہے۔

قاسم العلوم کے یہ تینوں خط جن میں سے دو کے ان اقتباسات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے حضرت فخر العلماء کی ذہانت اور قابلیت سے متعلق تھے، لیکن یہ خطوط مجموعی حیثیت سے بھی حضرت فخر العلماء کی قابلیت کا ثبوت ہیں، اگرچہ یہ خطوط حضرت فخر العلماء کے خطوط کے جواب میں حضرت قاسم العلوم نے تحریر فرمائے مگر ظاہر ہے کہ جب تک حضرت فخر العلماء کے خطوط میں اچھے قسم کے نکات نہ ہوں گے اس وقت تک ان کے اتنے طویل جواب کس طرح ممکن تھے، یہ سارے خطوط قاسم العلوم مع اردو ترجمہ انوار النجوم کے نام سے ناشران قرآن لمیٹڈ نے ۳۸/ اردو بازار لاہور سے شائع کر دیئے ہیں۔ لیکن یہاں ان کا اجمالی تذکرہ جناب انوار الحسن صاحب کے مقدمہ کے اس حصہ سے جس کا عنوان تفصیل مکتوبات ہے ذیل میں کیا جاتا ہے، یہ حصہ کتاب کے صفحہ ۱۸/ سے لے کر صفحہ ۳۸/ تک پھیلا ہوا ہے اور ذیل کا اقتباس صفحہ ۲۹/ سے صفحہ ۳۳/ کے درمیان سے نقل کیا جارہا ہے مگر مکتوب کی ترتیب پروفیسر ایوب قادری کی کتاب "محمد احسن نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ" کے مطابق ہے۔

مکتوب ہشتم

مجموعہ قاسم العلوم کے چار نمبر شائع ہوئے تھے، پہلا نمبر ۱۵/ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ کو، دوسرا نمبر ۱۵/ ربیع الثانی ۱۲۹۲ھ کو، تیسرا نمبر ۱۵/ جمادی الاول ۱۲۹۲ھ کو اور چوتھا نمبر ۱۵/ جمادی الثانی ۱۲۹۲ھ میں۔ اس آخری مجموعہ میں تین مکتوب ہیں اور تینوں حضرت فخر العلماء کے نام ہیں۔ ان میں پہلا مکتوب جسے جناب ایوب قادری کی ترتیب کے مطابق مکتوب ہشتم کہا جاتا ہے "در تحقیق واثبات شہادت حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ مطابق قواعد سنیاں ہے، جناب انوار الحسن شیر کوٹی لکھتے ہیں کہ "یہ مکتوب مولانا فخر الحسن گنگوہی کے نام ہے، جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص تلامذہ میں تھے، اس خط میں حضرت والا نے سنیوں کے اصول کے موافق حضرت سید الشہدا امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کو ثابت فرمایا ہے، یہ مکتوب حضرت والا کی اجتہادی شان کا ایک خاص نشان ہے جس میں نہایت محتاط طریقہ سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی پوزیشن واضح کی گئی ہے اور حضرت شہید کربلا کی

شہادت پر مجتہدانہ رنگ میں قلم اٹھایا گیا ہے، یہ مکتوب مطبوعہ اٹھارہ صفحات تک چلا گیا ہے سچ تو یہ ہے کہ حضرت قاسم العلوم نے شہادت امام پر امام الکلام کی حیثیت سے آخری اور قطعی بحث کی ہے جس کے بعد فقہی حیثیت سے اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور جس میں یزید کا کردار متعین ہو کر واضح صورت میں سامنے آجاتا ہے۔

مکتوب نہم

قاسم العلوم شائع کردہ منشی امتیاز علی میں اس خط کا نمبر نہم ہے اور یہ دو جواب استدلالات علامہ طوسی دربارہ امامت و بیان معنی اختلاف امتی و حدیث مستخلف ہے۔ جناب انوار الحسن شیر کوٹی تحریر فرماتے ہیں کہ "اس مکتوب میں جو مولانا فخر الحسن گنگوہی کے نام ہے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اختلاف امتی رحمۃ کی صحیح حقیقت کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔ علامہ طوسی جو اپنے زمانہ کے مشہور محقق اور فلسفی ہیں شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی امامت اور امام معصوم کی ضرورت پر جو دلائل پیش کئے ہیں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے معتقدات، خیالات اور استدلالات کی دھجیاں فضائے آسمان میں اڑا کر رکھ دی ہیں اور علامہ طوسی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل کو پڑھ کر ادنی بصیرت رکھنے والا اہل علم بھی صاف سمجھ سکتا ہے کہ علامہ طوسی مولانا کے سامنے ایک طفل مکتب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، مثلاً علامہ طوسی امام کی ضرورت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "امام کی ضرورت اس لئے ہے کہ رعایا میں غلطی کا احتمال ہے اگر امام میں بھی غلطی کا احتمال ہو تو تسلسل لازم آتا ہے" یعنی دین کے سمجھنے میں رعایا سے غلطی کا امکان ہے امام میں بھی اگر غلطی کا امکان ہوگا تو پھر اس کی اصلاح کیلئے اور کوئی امام درکار ہوگا اور یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہو جائے گا جو منطق کی رو سے غلط ہے لہٰذا امام کی اس لئے ضرورت ہوئی کہ وہ رعایا کی غلطی کو درست کر سکے اور اسی وجہ سے اس کا غلطی سے معصوم ہونا ضروری ہے۔

اس کے برعکس قاسم العلوم فرماتے ہیں کہ "اگر ہم قرآن کے لفظ پر غور کریں تو جان لیں گے کہ امام کی ضرورت صرف نیکی کے حکم کرنے اور برائی سے روکنے کیلئے ہے ارشاد فرماتے ہیں" وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین میں تمکین و قدرت عطا فرمائیں تو وہ نماز قائم کریں

اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے لوگوں کو روکیں" القصہ نماز قائم کرنے اور امر بالمعروف کی حقیقت کے بارے میں اگر ہم غور کریں تو کوئی بات ایسی نہیں نکلتی جو عصمت سے وابستہ ہو بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ امام کو قدرت کے وقت امر بالعروف کیلئے تمام علوم کا حامل ہونا ضروری ہو۔ہاں اس قدر ضروری ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ذرا پہلے معروف اور منکر سے واقفیت ہو خواہ وہ دوسرے علماء کی ہی زبانی کیوں نہ ہو، چنانچہ یہ بات صاف ہے ورنہ دوسروں کی امامت خود برطرف حضرت پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی امامت بھی قابل تامل بن جائے گی کیونکہ علوم نبوی ﷺ بتدریج حضور ﷺ کو حاصل ہوئے (جو ۲۳ سال تک اترتے رہے) اگر خدا کے کلام کا سمجھنا معصوم کے سوا دوسروں کو محال ہوتا تو پھر "اے لوگو اے ایمان والو" اور اسی طرح "ان کے فرقے ہی سے کیوں نہ ایک ایسی جماعت ہوا کرے کہ وہ دین میں کچھ سمجھ حاصل کرے" اور اس طرح کی دوسری آیات تکلیف مالا یطاق کی قسم سے بن کر رہ جائیں گی، ورنہ امام کو کلام ربانی کافی ہے آخر اسی کلام کی شان میں "ہر چیز کو بیان کرنے والا" ایمان والوں کیلئے کلام اللہ "ہدایت اور خوش خبری ہے" (اور متقین کیلئے ہدایت ہے) فرمایا ہے کہ جب امام کو کلام الٰہی کا سمجھنا ادراک اور کلام اللہ ہر چیز کو بیان کرتا ہے تو پھر کیا ضروری ہے کہ امام معصوم ہو، ہاں کلام الٰہی اگر ہر چیز کو بیان کرنے والا نہ ہوتا تو پھر وحی کی ضرورت پڑتی اس وقت اگر عصمت کی شرط لگاتے جو کہ ہمارے لئے وحی کیلئے ضروری نہیں تو پھر ہم ضروری کہتے، ہاں اگر انبیاء کی طرح اماموں کے ہر قسم کے افعال کی پیروی ضروری ہوتی تو البتہ اس وقت دلیل کے بموجب آئمہ کی عصمت ضروری ہوتی، رہی یہ بات کہ تم پر میری اور میرے بعد خلفاء راشدین کی سنت لازمی ہے" جو فرمائی ہے تو مطلق تمام افعال کی پیروی اور اطاعت کو لازمی قرار نہیں دیا بلکہ ان مستعار سنتوں کی پیروی ضروری قرار دی ہے جو اصحاب اور علماء میں سے ہر آنے اور جانے والے کے پیش نظر انہوں نے کی ہے، کیونکہ خلفاء راشدین عام حکم کے ماتحت "تم اس کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے۔ اور اسکے سوا اور مددگاروں کی پیروی مت کرو" اور اسی طرح عام حکم رسول اللہ ﷺ کے مطابق کہ ہمارے اس دین کے معاملہ میں جو کوئی ایسی نئی بات نکالے گا جو اس میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے اور صحابہ اس بات کے مامور ہیں کہ وحی پر عمل کریں اور ما سوا اس کے پیروی نہ کریں۔"

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے علامہ طوسی کے استدلال کی جو دھجیاں اڑائی ہیں وہ ہم نے پوری نقل نہیں کی ہیں بلکہ اس کا ایک حصہ پیش کیا ہے، اس لئے مذکورہ بالا عبارت کو نمونہ کے طور پر سمجھا جائے جس سے ہمیں یہ بتانا مقصود ہے کہ حضرت مولانا کے عقلیہ اور نقلیہ اجتہادی دلائل کے سامنے غلط منزل کی طرف چل پڑنے والا بڑے سے بڑا محقق اور علامہ بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا اور وہ قرآن وحدیث کی روشنی میں اپنے اجتہادی قولوں کو اس طرح استعمال فرماتے تھے کہ اہل علم حیران رہ جاتے تھے اور کسی سے بھی جواب نہ بن پڑتا تھا۔ امام کے بارے میں آگے چل کر حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ دین کی بنیاد قرآن کریم ہے کہ ہاں احکام نافذ کرتے وقت دین کی فہم ضروری ہے اور اس کے لئے آمر کی خود فہمی ضروری نہیں ہے جیسا کہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے۔ (حضرت فخر العلماء کی طرف اشارہ ہے) اور اگر طوسی کی مراد یہ ہے کہ امام اقامت دین کرے تو ہم بھی کہتے ہیں کہ امام دین کا قائم کرنے والا اور شرع متین کا حامی ہوتا ہے کہ وہی مطلب نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ہم معنی ہے، لیکن اتنی بات کا علم ہونا بھی ضروری نہیں ہے کجا یہ کہ فہم میں بھول چوک سے محفوظ رہ سکے" ان عبارتی ٹکڑوں پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ حضرت قاسم العلوم کا انداز خالص اجتہادی ہے اور قرآن اور سنت پر ان کی گہری نظر ہے جو صرف ایک مجتہد ہی کی ہو سکتی ہے، وہ کسی کا سہارا لے کر نہیں چلتے۔

حضرت قاسم العلوم کے تمام تحریری کارناموں میں ان کا یہی انداز ہے خاص طور پر قاسم العلوم کے مکتوب میں مجتہدانہ قوتیں پوری شان بصیرت کی غماز ہیں، یہ مکتوبات اپنے خاص شاگردوں اور مذہبی غور وفکر رکھنے والے افراد کے نام ہیں اس لئے ان سے کھل کر بات کرنا ان مکتوبات کی اصل روح ہے، اور جب انسان پڑھے لکھے ذہین اور قابل اعتماد افراد سے تحریری طور پر مخاطب ہوتا ہے تو پھر اس کے ذہن وفکر کی تمام قوتیں بروئے کار آتی ہیں اور یہی قوتیں جن کو جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے اجتہادی صلاحیتوں سے تعبیر کیا ہے ان مکتوبات میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

مکتوب دہم

قاسم العلوم کے چوتھے نمبر کا یہ آخری مکتوب بھی جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے حضرت

فخر العلماء کے نام ہے، اور جناب ایوب قادری کے بقول (جس نے اپنے زمانہ کے امام کو نہ پہچانا وہ جاہلیت کی موت مرا ہے) جناب انوار الحسن لکھتے ہیں کہ "اب چوتھے نمبر کا تیسرا مکتوب ہمارے پیش نظر ہے یہ مکتوب انہوں نے مولانا فخر الحسن گنگوہی کو انکے خط کے جواب میں بھی لکھا ہے، جنہوں نے حسب بالا حدیث کی تحقیق دریافت کی تھی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا یہ مکتوب مطبوعہ صفحات پر سات مضمون پر پھیلا ہوا ہے جس میں مذکورہ حدیث کی تحقیقات کا رنگ غضب کا عالمانہ ہے اور اس میں بھی وہی اجتہادی شان نظر آتی ہے۔

مولانا عبدالحئیؒ کا بیان

مولانا عبدالحئیؒ نے نزہتہ الخواطر کی جلد آٹھ کے صفحہ ۳۴۵ر میں حضرت فخر العلماء کی شان میں جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ان کی علمیت، قابلیت، حضرت قاسم العلوم، مولانا رشید احمد گنگوہی اور حکیم محمود خان اعظم سے ان کی قرابت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور حضرت سید احمد شہید بریلوی کے خانوادے کے اس عظیم رکن کی گواہی کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، آپ فرماتے ہیں کہ "علمائے ہند میں شیخ الوقت علامہ فخر الحسن ابن عبدالرحمٰن حنفی گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک ممتاز شخصیت تھے جو اقران واماثل میں امتیازی شان رکھتے تھے اور علم وفضل میں ید طولی رکھتے تھے، شیخ الرجل مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اکابر تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں اور ان کے رفقاء کار اور قریبی حلقہ کے افراد میں شامل تھے۔

آپ نے حدیث شیخ العلامہ رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی، یہ گفتگو اور محاورہ کلام میں بے مثال تھے، حق گوئی اور صاف گوئی میں اپنی نظیر آپ تھے دین سے غیر معمولی شغف تھا دین سے متعلق جو درد ان کی ذات میں پنہاں تھا وہ انہیں جرأت وہمت دیتا تھا اور وہ اپنے اوقات کا بیشتر حصہ ہندوؤں اور عیسائیوں سے مناظرہ کرنے میں صرف کرتے تھے اور مناظرانہ انداز گفتگو ہی پسند فرماتے تھے۔

اُستاد کے نقش قدم

حضرت فخر العلماء کی ذہانت اور قابلیت کا ذکر اوپر بیان کیا جاچکا ہے مگر ان کی سب سے بڑی خوبی جو اول سے آخر تک ان کے مزاج پر حاوی رہی وہ خوف خدا اور اتباع سنت کے بعد

اپنے استاد مکرم کے افکار اور اعمال کی پیروی تھی، اور یہی وہ بات تھی جس کا سب سے پہلے ادراک مولانا محمد یعقوب صاحب نے کیا تھا اور جس کا اوپر کئی بار تذکرہ ہو چکا ہے، یعنی درشتگیٔ مزاج میں حضرت فخر العلماء مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے قدم بہ قدم تھے۔ مولانا انوار الحسن صاحب شیرکوٹی نے لکھا ہے کہ "مولانا فخر الحسن صاحب بہت بڑے مصنف اور مقرر تھے "لیکن تحریر و تقریر کی خوبیاں معارف قاسمی کی اشاعت کیلئے تھیں "حضرت قاسم العلوم بقول مولانا انوار الحسن شیرکوٹی جھگڑوں سے خواہ وہ دین کیلئے ہوں اور خواہ دنیا کیلئے بیزار نظر آتے ہیں اور اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت قاسم العلوم کے اس خط کا حوالہ دیا جو انہوں نے سرسید کے عقائد کے بارے میں پیر جی محمد عارف کو لکھا تھا اور خاص طور پر ان کے اس جملہ کو حوالہ دیا کہ "پیر جی صاحب یہ گمنام کبھی کسی سے نہیں الجھتا اور الجھے بھی تو کیونکر الجھے وہ کونسی خوبی ہے جس پر کمر باندھ کر لڑنے کو تیار ہو۔ ایسی کیا ضرورت ہے کہ اپنے عمدہ مشاغل چھوڑ کر اس نفسانفسی میں پڑوں "اس قسم کے خیالات کا اظہار مولانا منصور علی خان نے مذہب منصور میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں "کہ حضرت قاسم العلوم نہ کسی سے دشمنی کرتے ہیں، اور نہ کسی کو برا کہتے ہیں، باہمی نزاع بالکل پسند خاطر نہ تھا، اتفاق کو بے حد پسند کرتے تھے "ان کی یہ خوبی بھی حضرت فخر العلماء میں بدرجۂ اتم موجود تھی، آپ نے تقریر دل پذیر کے دیباچہ میں لکھا تھا کہ "اب خداوند ذوالجلال سے دعا ہے کہ مسلمانوں میں اتفاق دے اور ظاہر و باطن کی اصلاح فرمائے اور دین اسلام کا بول بالا ہو۔ "انتصار اسلام کے دیباچہ میں تو ان کا یہ جذبہ اور بھی نمایاں ہے اور یہاں اس کا تخاطب براہ راست اپنے ہم مکتبوں اور ہم درس ساتھیوں سے ہے۔ فرماتے ہیں کہ "جناب مولانا مرحوم نے شاگرد و معتقد بہت چھوڑے اب ان کو چاہئے کہ جناب مولانا مرحوم کی طرح جان و مال، عزت و آبرو کا کچھ خیال نہ کریں آپس کے جھگڑوں میں نہ پڑیں خدا اور رسول کے دشمنوں سے لڑیں حتی الوسع دین اسلام کی حمایت کریں۔ بندہ بھی ایک ادنیٰ شاگردوں میں شمار ہوتا ہے اگرچہ سب میں دانی ہے، لیکن اس انتساب کو اپنا فخر جانتا ہے ع بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

اب رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ اسلام اور اہل اسلام کو ترقی دے ہمارے گناہوں پر خیال نہ فرمائے خاک ذلت سے اٹھا کر تخت عزت پر بٹھائے اسلام کا بول بالا ہو دشمنان دین کا منہ کالا ہو۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد"

ندوۃ العلماء

بین الاسلامی اتحاد کی راہ میں ان کا سب سے آخری کارنامہ ندوۃ العلماء کی تحریک میں شرکت وشمولیت ہے، اس لئے کہ ولی الٰہی تحریک کی تائید جس طرح دارالعلوم دیوبند کے قیام سے ہوئی اسی طرح دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام سے بھی ہوئی، ہم اس ضمن میں تعلّی کا ارتکاب نہیں کر رہے ہیں بلکہ پیام ندوۃ العلماء کے نام سے جو کتاب محمد الحسنی نے اکتوبر نومبر ۱۹۷۵ء میں شائع کی اس میں تجدید علوم کے نام سے تحریر ہے کہ "آج ہم اس عہد کی تجدید کرتے ہیں، جو ہندوستان کے مخلص اور روشن ضمیر علماء نے (۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء) میں کانپور کے مدرسہ فیض عام میں کیا تھا، وہ یقیناً ایک مبارک اور تاریخی گھڑی تھی جس کو ہندوستان کی اسلامی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی" اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مبارک اور تاریخی موقع پر اس زریں فہرست پر ایک نظر ڈال لی جائے، جس میں مولانا سید محمد علی مونگیری کے علاوہ جو اس تحریک کے محرک اور بانی تھے دوسرے شرکائے محفل میں حضرت فخرالعلماء مولانا فخرالحسن محدث گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، حکیم الامت مولانا اشرف علی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی، مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا ثناءاللہ امرتسری، مولانا نور محمد پنجابی، مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا شاہ سلیمان پھلواری، مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوری، مولانا عبدالغنی خان خورشید آبادی اور مولانا شاہ تجمل حسین دیسنوی قابل ذکر تھے، آج جب ہم دیوبند اور ندوۃ العلماء کے اتحاد کی بات کرتے ہیں، تو ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کی داغ بیل ڈالنے والوں میں حضرت قاسم العلوم کے دونوں ممتاز ترین شاگرد یعنی حضرت فخرالعلماء اور حضرت شیخ الہند نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور یہ انہی بزرگوں کا کارنامہ ہے کہ آج ملت اسلامیہ کے یہ دونوں عظیم دارالعلوم خدمت اسلامی کیلئے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہوئے ہیں۔

حضرت قاسم العلوم کی رحلت کے بعد ان کے مقدس مشن کو آگے بڑھانے کیلئے اس سے زیادہ دردمند اپیل اور کیا ہو سکتی تھی، حضرت فخرالعلماء نے اس اپیل میں حضرت قاسم العلوم کے شاگردوں کو براہ راست مخاطب کر کے انہیں ان کا فرض یاد دلایا ہے، جہاں تک جان ومال، عزت وآبرو کو ترک کر کے قاسمی مشن کو کامیاب بنانے اور فرمودات قاسمی کی

ترویج واشاعت کا معاملہ ہے حضرت فخر العلماء صحیح معنوں میں یہ اپیل کرنے کے مستحق تھے اس لئے کہ انہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر کے اپنے استاد کے مشن کو آگے بڑھایا تھا اور اپنے آپ کو حضرت قاسم العلوم کا ایک ادنیٰ شاگرد اور اس انتساب کو اپنے لئے فخر لکھ کر شاگردی کا حق ادا کر دیا تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت قاسم العلوم کے مزاج کی اس کیفیت کو کہ اپنے آپ کو گمنام رکھا جائے۔ اور گمنام سمجھا جائے، تو حضرت فخر العلماء نے ان کی اس خواہش کا بھی بدرجۂ اتم تکملہ کر دیا، تمام ذہانت و دیانت، قابلیت و صلاحیت، استعداد اور علمیت کے باوجود اپنے آپ کو ایسا گمنام بنایا کہ جب آپ نے انتقال فرمایا تو جوار وطن ہونے کی بجائے کانپور کے بساطیوں کے قبرستان کے ایک گمنام گوشے کی ایک گمنام قبر میں ابدی استراحت اختیار فرمائی اور مرنے کے بعد بھی اسوۂ قاسمی کو تازہ کیا، حضرت شیخ الہند کا بڑا مرتبہ ہے اور بہت سے لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی قاسم العلوم کی زبان تھے، تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے، مگر حضرت قاسم العلوم کا مزاج دار، سفر و حضر میں ان کا ساتھی، تحریر و تقریر میں معارف قاسمی کا پیامبر، علوم قاسمی کی اشاعت کا سب سے سرگرم اور فعال کارکن اور اپنی زندگی کو ان کے قدم بہ قدم بنانے والا، ان کیلئے جینے اور مرنے والا اور ان کے گمنامی کے جذبہ کی صحیح قدر کرنے والا گمنامی کے عالم میں کانپور کے ایک ویرانے میں محو استراحت ہے۔ جہاں وہ ابد تک آرام کرے گا، اسے یقیناً اس بات کا صدمہ نہیں ہوگا کہ اس نے جس ادارے کیلئے اپنی زندگی تج دی اور اس ادارہ کے روح رواں کیلئے اس نے جو قربانیاں دیں، اس کا اس ادارے کے بزرگوں اور کارکنوں نے کوئی لحاظ نہیں کیا یہاں تک کہ جب اس ادارے کی صد سالہ تاریخ کتابی شکل میں آئی تو اس میں اس کا کوئی ذکر نہیں تھا، لیکن جو لوگ حضرت فخر العلماء کی قربانیوں، ایثار، جذبۂ عمل اور علوم قاسمی کی نشر واشاعت میں ان کے کلیدی کردار سے واقف ہیں اور خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو اس فروگذاشت کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کے وصال کے بعد یوں تو ان کے تینوں مشہور شاگردوں نے درس و تدریس کا سلسلہ ترک کر دیا، میری مراد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ، حضرت سید العلماء مولانا احمد حسن امروہیؒ، اور حضرت فخر العلماء مولانا فخر الحسن محدث گنگوہیؒ سے ہے، لیکن اول الذکر دونوں شاگرد یعنی حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت

سید العلماء امروہوی رحمۃ اللہ علیہ بعد میں اکابر علماء کے کہنے پر دوبارہ اپنے علمی کام میں مشغول ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی حیات مبارک میں توسیع بھی عطا فرمائی، اور انہیں ملک وملت اور دین کی خدمت کا موقع بھی عنایت کیا، یعنی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا وصال اپنے استاد مکرم کے وصال کے چالیس سال بعد اور حضرت سید العلماء کا وصال اپنے استاد کے وصال کے بتیس سال کے بعد ہوا، مگر حضرت فخر العلماء نے حضرت قاسم العلوم کی وفات کے بعد نہ صرف دیوبند اور گنگوہ کو چھوڑ دیا بلکہ ان دونوں علاقوں سے نقل سکونت کرنے کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کے پیشہ کو بھی خیر باد کہہ دیا اور گنگوہ اور دیوبند سے دہلی اور پھر وہاں سے کانپور تشریف لے جا کر اپنے آپ کو اپنے استاد کی خواہش کے مطابق گمنامی کی وادی میں کھو دیا۔ اور اپنی زندگی کے آخری ایام اپنے استاد کے علم اور مشن کیلئے وقف کر دیئے، مگر انہیں اپنے استاد سے جدائی کا اس قدر غم تھا کہ وہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے ۱۷ برس کے اندر ہی اندر ۱۸۹۷ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے، اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے انہوں نے درس وتدریس کے پیشہ کو پھر نہیں اپنایا، مگر تصنیف وتالیف کے مشاغل میں مصروف رہے جس کا اپنے موقع پر تذکرہ ہو چکا ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مدرسہ جامع العلوم مسجد پٹکاپور کانپور میں آمد کے موقع پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ان کی ملاقات کا تذکرہ حیات شیخ الہند مصنفہ میاں اصغر حسین دیوبندی کے صفحہ ۱۶۷ پر ہے۔ اسی طرح آپ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے کہنے پر مدرسہ جامع العلوم پٹکاپور کانپور کے آٹھویں جلسۂ دستار بندی کی صدارت فرمائی، جو ۱۷ رجب ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں منعقد ہوا تھا اور جس میں انہوں نے چھ علماء کی دستار بندی فرمائی جس میں خود ان کے فرزند ارجمند مولوی نور الحسن بھی شامل تھے، اور اس تقریب سعید میں شمولیت حضرت فخر العلماء کا آخری علمی مشغلہ تھا کہ آپ نے اسی سال وفات پائی اور بساطیوں کے قبرستان میں دفن ہوئے، میں نے ان کی قبر مبارک کی زیارت کی ہے مگر یہ قبر بھی بے کتبے کی تھی اور اب اگر مجھے کہا جائے کہ تم ان کے مزار مبارک کی نشاندہی کر دو تو یہ چیز اب میرے امکان سے باہر ہے۔

متوسلین ولواحقین

حضرت فخر العلماء کے والد ماجد، والدہ، بھائی، بہنوں اور بہنوئیوں کا اپنے مقام پر تذکرہ ہو چکا ہے اب ان کی اولاد اور ان کے بھائی اور بہنوں کی اولاد کا تذکرہ کر کے حیات فخر العلماء کو اپنے اختتام پر پہنچایا جاتا ہے۔

اولاد

حضرت والا کے صرف تین فرزند ہوئے، پہلے فرزند کا نام مولانا حافظ نور الحسن تھا جن کا شمار حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں کیا جاتا ہے اور اشرف السوانح میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے، مولانا حافظ نور الحسن نے مشہور کتاب حسامی کی تصحیح میں نمایاں خدمت سرانجام دی ہیں، جن کا اعتراف ان کے منجھلے بھائی نے بھی حسامی کے حواشی کی اشاعت کے موقع پر کیا ہے۔ مولانا نور الحسن کا نام حضرت قاسم العلوم نے تجویز کیا تھا جس کی تصدیق قاسم العلوم کے مطالعہ سے ہو جاتی ہے اور جس کا اپنے موقع پر تذکرہ بھی ہو چکا ہے، مولانا نور الحسن نے اپنی ان علمی خدمات کے علاوہ اپنی عمر مدرسہ جامع العلوم پٹکاپور کانپور کی نائب مہتممی میں گذار دی اور ریٹائرمنٹ کے بعد عمر کا باقی حصہ مادر شریف میں جو کانپور سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر کانپور جھانسی روڈ پر واقع ہے گذارا، جہاں ان کی صاحبزادی کا قیام تھا اور آپ نے وہیں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے، مادر والے ان کی روحانی عظمت اور بزرگی کے متعدد واقعات بیان کرتے ہیں۔

مولانا نور الحسن کی صرف ایک دختر تھیں جن کا نام خاتون جنت تھا، ان کی شادی اپنے حقیقی خالہ زاد بھائی علی احمد سے ہوئی تھی، ان کا بھی عین عالم جوانی میں انتقال ہوا، مرحومہ کی صرف ایک ہی صاحبزادی تھیں جن کا نام عائشہ خاتون ہے ان کی شادی مولانا حافظ فیض الحسن کے نواسے سید الطاف حسین کے ساتھ ہوئی اور ماشاء اللہ وہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہی ہیں اور کراچی میں قیام پذیر ہیں۔

حضرت مولانا فخر العلماء کے دوسرے صاحبزادے کا نام مولانا حافظ فیض الحسن تھا اور یہ نام بھی حضرت قاسم العلوم ہی کا تجویز کردہ ہے، مولانا حافظ فیض الحسن نے ابتداً مدرسہ حسین

بخش دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے اپنے چچا مولانا صدیق احمد انبیٹھوی سے مالیر کوٹلہ میں تحصیل علم کی، مولانا حافظ فیض الحسن صحیح معنوں میں اپنے عظیم والد کے جانشین تھے، آپ نے اصول الشاشی، مسلم الثبوت، حسامی اور رشیدیہ پر حاشیئے تحریر کئے اور ان تمام کتابوں کی اشاعت کیلئے مخزن العلوم کے نام سے ایک تعلیمی اور تصنیفی ادارہ بھی قائم کیا جس کے تحت یہ کتابیں شائع ہوئیں۔ اس غرض سے آپ نے اپنے مکان واقع چٹائی محل میں اپنے بڑے صاحبزادے سعید الحسن کے نام مطبع سعیدی بھی قائم کیا جو کافی عرصہ تک چلتا رہا اور راقم الحروف نے بھی اسے دیکھا ہے، مولانا فیض الحسن ایک اعلیٰ پایہ کے خوش نویس بھی تھے اور اپنی شائع کردہ کتابوں کے سرورق کا ڈیزائن وہ خود تیار کرتے تھے، مولانا فیض الحسن نے اپنے زمانہ کی سیاسی زندگی میں بھی حصہ لیا تھا اور مسجد مچھلی بازار کانپور کے سانحۂ انہدام کے سلسلہ میں ۱۹۱۳ء میں جو جلوس جامع مسجد کانپور سے نکلا تھا۔ اس میں وہ بحیثیت ایک قائد کے صرف شریک ہی نہیں تھے بلکہ اس جلوس کا تاریخی جھنڈا اور اس کی عبارت بھی ان ہی کی تیار کردہ اور تحریر کردہ تھی، یہ جھنڈا برطانوی حکومت کی کوشش کے باوجود انگریز حکام کو ہاتھ نہ لگ سکا۔ مولانا فیض الحسن تحریک پاکستان کے بھی سرگرم حامی تھے، مگر افسوس کہ ۱۹۴۲ء میں انتقال کے باعث وہ اس تحریک کو پھلتے پھولتے نہ دیکھ سکے، مولانا فیض الحسن نے اُردو اور عربی میں اشعار اور نظمیں لکھی ہیں جن میں حضرت گنگوہی کی شان میں ان کا عربی قصیدہ، اپنے والد ماجد کی رحلت کے بعد ان کی یاد میں ایک عربی نظم اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں ایک اردو نظم خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

مولانا حافظ فیض الحسن کا روحانیت میں بھی خاصا بلند مقام ہے اس لئے کہ انہیں اپنے حقیقی پھوپھا مولانا خلیل احمد سہارنپوری سے بیعت کرنے کی اجازت حاصل تھی، اور ان کا شمار حضرت سہارنپوری کے خلفاء میں ہوتا ہے۔ (ملاحظہ فرمایئے تذکرۃ الخلیل) مولانا حافظ فیض الحسن نے اپنے چچا مولانا صدیق احمد انبیٹھوی سے بھی روحانی تربیت حاصل کی تھی، مولانا حافظ فیض الحسن اپنے والد کی طرح ایک زبردست حریت پسند تھے اور انہوں نے تاحیات کہیں ملازمت نہیں کی، کتابوں کی اشاعت اور قرآن پاک اور دوسری کتابوں کی صحت سے جو رقم انہیں حاصل ہوتی تھی اس پر انہوں نے زندگی بھر تکیہ کیا اور قناعت واستغنا کی ایک ایسی روشن مثال قائم کر گئے جس کی مشکل ہی سے نظیر ملے گی۔ حضرت مولانا حافظ

فیض الحسن کے تین فرزند اور دو صاحبزادیاں تھیں پہلے صاحبزادے کا نام سعید الحسن تھا جنھیں ادبی دنیا میں دور ہاشمی کانپوری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جنھیں حضرت جگر مراد آبادی کے اکمل ترین شاگردوں میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ آپ کا کلام، کلام دور کے عنوان سے عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ دوسرے صاحبزادے کا نام وحید الحسن ہے جن کی شادی قاضی اکرم حسین مرحوم کی چوتھی صاحبزادی سے ہوئی، جناب وحید الحسن اور ان کی اہلیہ اور اولاد کراچی ہی میں مقیم ہیں۔

حضرت مولانا فیض الحسن کے تیسرے صاحبزادے کا نام حمید الحسن تھا جو اپنے بڑے بھائی کی طرح شاعر تھے اور شوق تخلص کرتے تھے، جناب دور ہاشمی نے اپنی زندگی کا کافی حصہ بنگلور جنوبی ہند میں گذارا، اس لئے ان کی ازدواجی زندگی کے بارے میں کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی مگر اپنی زندگی کے آخری ایام انہوں نے کراچی ہی میں گزارے اور یہیں انہوں نے ۱۹۷۵ء میں انتقال فرمایا اور پاپوش نگر کے قبرستان میں آسودہ خواب ہو گئے، جناب وحید الحسن بقید حیات ہیں اور ان کے چاروں بیٹوں اور دو بیٹیوں سے حضرت فخر العلماء کا سلسلۂ نسب چل رہا ہے، ان دونوں بھائیوں کے تیسرے بھائی جناب حمید الحسن شوق نے اپنی زندگی پی۔ آئی۔ اے کی ملازمت میں گزاری۔ آپ کی شادی آپ کی چچازاد بہن رقیہ سے ہوئی جن سے ان کی چھ اولاد ہیں، چار لڑکے اور دو لڑکیاں بقید حیات ہیں، مولانا حافظ فیض الحسن گنگوہی کی پہلی صاحبزادی آمنہ خاتون کی شادی اپنے خالہ زاد بھائی سید ذوالفقار حسین رضوی بن سید احمد حسین بن حکیم طالب علی بن حکیم باقر علی بن خادم علی بن پناہ علی سے ہوئی جو گڑھ مانک پور کی سکونت ترک کر کے اٹاوہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔

آمنہ خاتون کے بھی چار لڑکے اور دو لڑکیاں بقید حیات ہیں، آمنہ خاتون نے ۱۹۷۲ء میں اور ان کے شوہر نے ۱۹۷۷ء میں وصال فرمایا اور دونوں پاپوش نگر کے قبرستان میں ابدی آرام میں مصروف ہیں، مولانا فیض الحسن کی دوسری صاحبزادی محمودہ خاتون کی شادی مولانا نے اپنے چچازاد بھائی شاہ ظریف حسین گنگوہی کے ساتھ کر دی تھی جس کا ذکر حضرت فخر العلماء کے بھائی شاہ مظہر حسین کی اولادوں کے باب میں آئے گا۔ محمودہ خاتون نے چار لڑکے اور تین لڑکیاں اپنی یادگاریں چھوڑیں جن میں ایک کے علاوہ باقی سب بقید حیات ہیں۔

حضرت فخر العلماء کے تیسرے فرزند محمد احمد اپنے دو بھائیوں کے ... کا ذکر ... میں

تولد ہوئے اور حضرت والا کے انتقال کے وقت ان کی عمر صرف چھ سال تھی، آپ بہ سلسلۂ ملازمت کافی عرصہ جھانسی میں قیام پذیر رہے اس کے بعد آپ ہجرت فرما کر لاہور تشریف لے گئے اور ریلوے سے ریٹائرمنٹ کے بعد کراچی آگئے اور یہیں وصال فرمایا۔ جناب محمد احمد اعلیٰ استعداد کے شاعر تھے اور فوق تخلص کرتے تھے اور آپ کا شمار بھی خانوادۂ جگر مرادآبادی میں کیا جاتا ہے جو ان کے نزدیک ان کے مرشد کا درجہ بھی رکھتے تھے بلکہ آپ کے بھتیجے دور ہاشمی آپ ہی کی تحریک پر حضرت جگر کے شاگرد ہوئے تھے اور حضرت جگر مرادآبادی نے برسہا برس ان دونوں کو روزانہ دو غزلیں کہنے کی ہدایت کر رکھی تھی جو استاد مکرم کے سامنے پیش کرنے کے بعد ضائع کر دی جاتی تھیں، آپ کی شادی کانپور کے مشہور محلّہ فراش خانہ میں ہوئی اور آپ کے چار صاحبزادے اور ۴؍ صاحبزادیاں ماشاءاللہ سے اب بھی بقید حیات ہیں۔ افسوس کہ حضرت فوق کانپوری کا دیوان ابتک شائع نہیں ہوسکا اور ادبی دنیا اب ان کے نام تک سے آشنا نہیں رہی۔

سوانح علمائے دیوبند

دار العلوم دیوبند

اور اس کے ہم مشرب علماء و فضلا کے حالات و مجاہدات،
خدمات اور بے مثال کارناموں کا
قابل قدر اور وقیع و زرّیں سلسلہ

سوانح علمائے دیوبند

جلد اول اور دوم آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔
تیسری، چوتھی اور پانچویں جلد زیر طبع ہیں

نواز پبلی کیشنز دیوبند